اِس شمارے میں

ظ۔ انصاری — جوگندر پال — سلام مچھلی شہری
سیّدہ نشاط اکرام — براج کومل — ڈاکٹر کبیر بیدی
ضیا فتح آبادی — فرحت قمر — نثار اٹاوی
شاکر پونچھی — سید اسرار عابد — اکرام جاوید
جے پرکاش بھارتی — محمود بالیسری — کرشن موہن
رونق دکنی — بشیر ارزن — انیس رفیع
نصر قریشی — محمد منصور عالم — اختر سعید
قمر نذیر الدین — رشی پٹیالوی — جمیل شیدائی
رونق نعیم — سعید عارفی — رحمٰن جامی
سعادت رسول — ساجی قریشی

اور دوسرے قلمکار

زرِ سالانہ — ۱۰ — روپے
معاونین سے — ۲۵ — روپے
تاحیات خریداری — ۱۲۵ — روپے
ممالک غیر سے — ۲۵ — شلنگ

اس شمارہ کی قیمت: ایک روپیہ ۲۵ پیسے

[illegible]
...جانشین حضرت سیماب اکبرآبادی مرحوم
...کا چوالیس سالہ علمی ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

شاعر بمبئی

جنوری۔ فروری ۱۹۷۳ء
جلد ۴۴ ۔ شمارہ ۱-۲

...لی
...از صدیقی

معاونین:
مہندر ناتھ
ڈاکٹر محمد حسن

...تمم
...مان صدیقی

★

ترسیل زر کا پتہ
ماہنامہ شاعر، قصر الادب، بمبئی ۸-۴۰۰۰۰

خط و کتابت کا پتہ
ماہنامہ شاعر، مکتبہ قصر الادب، پوسٹ بکس نمبر ... بمبئی ۸-۴۰۰۰۰

[illegible]


خاندانی تحفظ...
اپنے کا
مستقبل محفوظ بنائیے
سمجھدار والدین جانتے ہیں کہ
دینا بینک
مائنرز سیونگس سکیم کے
تحت اپنے بچوں کے نام کھاتہ کھولنے
سے اُن کا مستقبل بہتر اور محفوظ
ہو جاتا ہے۔ اس طرح جمع رقم اُن کی
بڑھتی ہوئی ضروریات کی تکمیل
کے کام آتی ہے۔ آپ بھی اپنے بچے
کے نام سے آج ہی مائنرز سیونگ
اکاؤنٹ کھولئے۔ اس پر ۹ فیصدی
سود ملتا ہے۔
دینا بینک
(اے گورنمنٹ آف انڈیا انڈر ٹیکنگ)
ہیڈ آفس، دینا بینک بلڈنگس،

مقالات

نظمیں

[illegible]

غزلیں

ڈرامہ

شاعر
جنوری فروری ۱۹۶۲ء

یہ بیداری اور ہوشیاری کا وقت ہے

شاعر کے گزشتہ شمارہ میں اس صورتِ حال کی طرف واضح اشارے کئے جا چکے ہیں۔ جو اردو زبان کے نئے مسائل کا پیش خیمہ ہے۔ اگر ہمیشہ کی طرح اردو والے اب بھی اردو کے سلسلے کی مختلف خبریں پڑھتے رہے اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے تو اردو کا مستقبل جن کے روشن ہونے کے کچھ امکانات پیدا ہو چکے ہیں، سنور نہ سکے گا اور یہ وقت گزر جانے کے بعد ہمیں یقیناً کفِ افسوس ملنا ہوگا۔ ملک میں اس وقت ایک طرف تو یہ صورت ہے۔ سیاسی کشمکش آج کل تیز ہے تو دوسری طرف لسانی بنیادوں پر بہت سی تبدیلیاں متوقع ہیں۔

سیاست کا رُخ کچھ بھی ہو، لیکن جو بھی مواقع میسر آئیں ان سے پورا پورا فائدہ اٹھانا ہی عقلمندی ہے۔ مثلاً آندھرا اور تلنگانہ کو الگ الگ کرنے کے لئے بے اندازہ کوششیں ہو رہی ہیں۔ تلنگانہ تحریک کے رہنماؤں نے اعلان کیا ہے کہ اگر تلنگانہ کی الگ حکومت بن گئی تو اس میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے گا۔ اتر پردیش، بہار اور دہلی وغیرہ میں بھی اردو کو کچھ مراعات دینے کے منصوبے زیرِ غور ہیں۔ ہم اردو والوں کے سوچنے کے لئے سب سے اہم بات یہ ہے کہ اردو کے سرکاری اور غیر سرکاری منصوبوں کی عمل آوری یوں ہی تو نہیں ہو جائے گی۔ اس کے لئے سرگرم کارکنوں کی ضرورت ہے، کمیٹیوں کی ضرورت ہے، سوچنے سمجھنے، وقت دینے اور ملنے ملانے کی ضرورت ہے۔ کہیں سے بھی یہ اطلاعات نہیں آ رہی ہیں کہ کوئی کمیٹی قائم ہوئی، کچھ لوگ آگے بڑھے، مشاورتی جلسے ہوئے۔ انجمن ترقی اردو کی شاخوں یا مرکزی انجمن نے آئندہ کے عملی اقدامات کے لئے کوئی منصوبہ بنایا۔ صرف اردو اخبارات و رسائل میں واویلا کر لینے، مشورہ دے دینے اور انہیں محض بعض لوگوں کے پڑھ لینے سے تو کام نہیں چل سکتا۔ اس طرح تو اردو کے سارے مسائل جوں کے توں خلا ہی میں معلق رہیں گے۔ انجمن ترقی اردو کے ترجمان "ہماری زبان" میں صورتِ حال کی طرف محض اشارے کر دینا بھی کافی نہیں ہو سکتا۔ یہ تو وہ وقت ہے کہ جو مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی زبان سے اردو کے لئے کچھ نکلے اور اُسے ذمہ دارانِ اردو اس کے اطلاق اور عمل درآمد کے لئے دوڑ پڑیں۔ اراکینِ انجمن جلد ہی جلد ایک جگہ جمع ہوں۔ عملی اقدامات کا منصوبہ بنائیں۔ مختلف صوبوں کا سفر کریں اور وہاں فعال کمیٹیاں بنائیں۔ سرکاری لوگوں سے ملیں۔ اپنی بات سمجھائیں اور ان کی سمجھیں۔ جلد ایک "کل ہند اردو کانفرنس" منعقد کروائیں اور بدلے ہوئے حالات میں تمام امور کا نہایت گہرائی اور گیرائی سے جائزہ لیں۔

اب اردو کے مسائل کچھ اور ہیں۔ ہر چند بنیادیں پرانی ہیں مگر نئی تعبیرات کی متقاضی ہیں۔ اردو کے کاموں کا پھیلاؤ پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ پھر سے ہندوستان میں ایک مکمل و مضبوط تنظیم کوئی آسان کام نہیں ہے۔ جنوب میں اردو کے مسائل اور اس کی احتیاجات کچھ اور ہیں شمال میں کچھ اور۔ اگر انجمن ترقی اردو ہی کو فعال بنا کر شمالی اور جنوبی دو زونوں (ZONES) میں تقسیم کر دیا جائے تو اردو کے تنظیمی مسائل پر قابو پانے میں بہت آسانی پیدا ہو سکتی ہے اور نہایت باقاعدگی کے ساتھ موثر طریقے سے اردو کے کام ہو سکتے ہیں۔ اردو کو درپیش خطرے کو پسپا کیا جا سکتا ہے، بلکہ اس کے کاموں کی پوری طرح نگہداشت بھی ہو سکتی ہے۔

ہم اس سلسلے میں اراکینِ انجمن ترقی اردو، اور اردو کے تمام ذمہ دار اداروں، خادموں، صحافیوں، سماجی کارکنوں وغیرہ کو دعوتِ غور و فکر دیتے ہیں۔ ہماری یہ تجویز مخلصانہ ہے اور اس کے نتائج بہت خوش گوار نکل سکتے ہیں۔ شمال اور جنوب کے ذمہ دارانِ اردو کو ایک جگہ جمع ہو کر اس پر تفصیلی گفتگو کرنا چاہئے۔

اعجاز صدیقی

[illegible]

نصر قریشی

۱۹۷۳ء کا ترانہ

سوچ رہا ہوں سالِ نو کی آمد پر کیا نذر کروں
نظم، غزل، یا گیت، رُباعی یا کوئی نوحہ لکھوں

نظم کہ جس میں ماضی کی مُردہ یادیں سربستہ ہوں
غزلیں جن سے سالِ گذشتہ، سالِ رواں پیوستہ ہوں
گیت کہ جس میں مستقبل سے اُمیدیں وابستہ ہوں
ذات کی پُراسرار تہوں کا کرب رباعی سے چھلکے
نوحہ جس میں حال کی بے رحمی پر سب لب بستہ ہوں

سالِ گذشتہ کے آتشداں میں چہرے سب راکھ ہوئے
نظم، غزل، گیت اور رباعی، نوحے کا آہنگ بنے
اُمیدوں کے اُڑتے طائر تھک کر آخر بیٹھ گئے
حوصلے سارے قبر میں سوئے، محرومی کے گھاؤ لئے
سوکھے پتے قطرۂ باراں کیا، شبنم کو بھی ترسے

نادیدہ، خطرے، اندیشے، زہریلے غم کے سائے
ساگر منتھن بھی لاحاصل، امرت، وِش بنتا جائے
فردا کے کچھ خواب، سہانے، حال کمال سے گھبرائے
ٹوٹے پھوٹے، اُجڑے چہروں کے بکھرے لشکر آئے

پھر بھی اُجلے خوابوں کی اُجلی چادر سب پر پھیلے
بے خوابوں کی بستی پر بھی چاند اُمیدوں کا چمکے
خوابوں سے جنموں کا رشتہ، خوابوں سے کیوں منہ موڑیں
خواب تو اپنا سرمایہ ہیں، قرنوں سے رشتہ جوڑیں
خوابوں سے حاصل ہے مفر کب، پھر یہ دھاگے کیوں توڑیں
دُھول اُڑاتے یہ پاؤں کبھی تو وقت کی منزل پائیں گے
محرومی، مایوسی کے یہ گھاؤ کبھی بھر جائیں گے

ہم سخنو، ہم قلمو، آؤ! آگ کا دریا پار کریں
سالِ نو کو اب کے بھی ہم ہنس کر خوش آمدید کہیں

مستاک

فرحت قمر

الفاظ کی وسیع کائنات

ادب کیا ہے؟ حروفِ تہجی کی مختلف ترتیب! لفظوں کے توڑ جوڑ سے ہو تو کوئی ادیب یا شاعر صاحبِ طرز بنتا ہے۔ اور لفظوں کے استعمال و ترتیب سے ہی تو کسی کو خوش یا ناراض کیا جا سکتا ہے۔ مارک ٹوین کو اسی لئے تو امریکہ کا بہترین طنز نگار کہا گیا کہ وہ لفظوں کے ہیر پھیر کا جادوگر تھا۔ امریکن سینیٹ کے ممبران پر تنقید کرتے ہوئے جب اس نے لکھ دیا "امریکن سینیٹ کے آدھے ممبر بیوقوف ہیں" تو شور مچنا لازمی تھا اور مارک ٹوین کا معافی مانگنا بھی فطری تھا۔ مگر اس نے اپنی معذرت پر لکھا "دراصل امریکن سینیٹ کے آدھے ممبر عقلمند ہیں"۔ بات وہی تھی مگر الفاظ مختلف! اسی طرح برطانوی پارلیمنٹ کے ایک ممبر نے کسی کو "بیوقوف" کہنے پر عجیب طرح معافی مانگی اس نے کہا تھا "میں نے کہا تھا کہ مسٹر ..... بیوقوف ہیں، یہ سچ ہے اور مجھے اس کا افسوس ہے"

لفظوں کا یہ ہیر پھیر گلی کوچوں کی دیواروں، سائن بورڈوں، نوٹسوں اور پبلک مقاموں پر روزمرہ کی زندگی کا ایک دلچسپ حصہ ہے۔ ایک دفتر کے دروازے پر چاک سے لکھی اطلاع "کل دفتر کو بند رکھا جائے گا" کو ایک صاحبزادے بڑے آرام سے پڑھ رہے تھے "کل دفتر کو بندر کھا جائے گا"! ایک پارک میں کسی نے "پھول نہ توڑیں" کو "پھول نہ چھوڑیں" بنا دیا تھا اور صاحب بمبئی کے ایک بڑے اسٹینڈ کے پاس کھلم کھلا لکھا تھا۔ "لیڈیز ٹولٹ" یعنی عورتیں کرایہ پر ملتی ہیں" جب کہ بات صرف اتنی تھی کہ کسی صاحبِ عقل نے انگریزی میں لکھے "لیڈیز ٹوائلٹ" سے حرف آئی کو کھرچ دیا تھا۔ دہلی کی بسوں میں ہندی میں لکھے "کیول ہلائیں" کو بہتوں نے اچھے برے طریقوں سے بدلا ہے لیکن مجھے جو بات سب سے زیادہ پسند آئی وہ تھی "ڈ" بڑھا کر "کیول ڈگم ہلائیں"! ایک پرائیویٹ بس میں "چلتی بس میں سونا منع ہے" کو "چلتی بس میں رونا منع ہے" بنا دیا گیا تھا اور ہندی میں لکھے "عام کاٹنا منع ہیں" کو "آم سستا نہیں" کر دینا تو ایک عام بات ہے۔ آم پر ایک دلچسپ تبدیلی اور یاد آئی جو ایک مضمون میں کسی قاری نے کی تھی۔ انھوں نے ـــــ "کچھ لوگ ہیر عام کھانے کو برا نہیں سمجھتے" کو "بڑی آسانی سے "کچھ لوگ سڑے آم ..... "بنا دیا تھا۔ اسی طرح ایک دعوت نامے کے "اور کاشی گرہن کے موقع پر" کو "اسماشی گرہن کا موقع" بنا دیا گیا تھا۔ اور معنی "چھٹی" کی بجائے "موت" ہوگئے تھے۔ لفظوں کے ہیر پھیر بچے بھی کرتے ہیں اور بڑے بھی۔ بس موقع پر دماغ چل جانے کی بات ہے۔ پہاڑ گنج کی ایک سڑک کے پتھر پر "منڈے والا" کو "گنڈے والا" کر دیا گیا ہے تو نئی دہلی میں ایک کوٹھی کے باہر لگے بورڈ "نوٹس۔ ادھر سے نکلنا منع ہے" کو بہت لطیف طریقے سے "گھر سے نکلنا منع ہے" بنا دیا گیا ہے۔

الفاظ کا ہیر پھیر مذاق کے علاوہ سنجیدگی کے ساتھ ادبی اور علمی معاملات میں بھی کیا جاتا ہے۔ یا یوں کہئے کہ ہوتا رہتا ہے۔ شعوری طور پر بھی اور غیر شعوری طور پر بھی! انگریزی سے ہاسپٹل، ٹاول اور لینٹرن، اردو میں اسپتال، تولیہ اور لالٹین بن گئے تو عربی

نے "ڈاکٹر" کو "ڈکٹور" اور "ریڈیو" کو "رادیو" بنا ڈالا۔ ہندی میں "تاثر وچن" سے "نستر جن" اور "کسیجن" سے "ادشجن" بھی اسی صورت حالات پر معنی تبدیلی کے زمرے میں آتے ہیں۔ ہندوستانی سے "لوٹ"، "ٹھگ"، "سپائی"، "تپائی"، "پنڈت"، "جنگل"، "بازار"، "بنگلہ"، "جنگ" جیسے بے شمار لفظ انگریزی میں منتقل ہو گئے۔ "الجبرا" اور "کاروان" عربی فارسی سے انگریزی نے جوں کا توں لے لیا اس لین دین میں مفہوم یا لفظوں میں معمولی سی تبدیلی بھی ہو جاتی ہے، مثلاً ہندی کے "جگن ناتھ" (مالک عالم) کو انگریزی میں "جاگرناٹ" کہہ کر معنی بھی "ظالم" کر دیئے گئے۔ اسی طرح "پنڈت" کو انگریزی ڈکشنری میں "کسی خانقاہ کا مالک" اور "بابو" کو "ہندوستانی کلرک جو غلط سلط انگلش بولتا ہے" معنی دیئے گئے۔

ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل ہونے پر مفہوم میں تھوڑی بہت تبدیلی تو ہو ہی جاتی ہے لیکن بعض الفاظ کے معنی تو یکسر بدل جاتے ہیں۔ فارسی کے "مہتر" بمعنی "عالی نسب" اور ایک فوجی عہدہ "جمعدار" کو "بھنگی" بنا دیا گیا ہے۔ عربی کے "سردار قوم" "خلیفہ" کا معیار نائی اور پہلوان تک گر گیا ہے۔ اور انگریزی کے "ماسٹر" بمعنی "مالک، ماہر، صاحبزادہ یا استاد" کو تو ستم ہائے زمانہ نے گراتے گراتے درزی، موچی، اور بینڈ بجانے والے تک پہونچا دیا ہے۔ ماسٹر کے ساتھ ہی ساتھ "استاد" اور "گرو" کی بھی مٹی خراب ہو گئی ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ درس و تدریس کا کام کرنے والے کے لئے انگریزی، اردو، ہندی، تینوں زبانوں میں مستعمل الفاظ کی درگت بن گئی ہے۔ ماسٹر کا انجام تو آپ نے دیکھا ہی "گرو" "غنڈے" کا اور "استاد" "بدمعاش یا عیار" کا مترادف بن چکا ہے اور "استاد جی" کا تو کہنا ہی کیا!

تبدیلی زبان کے ساتھ الفاظ کا تلفظ بدل جانا بھی عام ہے جیسے عربی کے "سُؤال" اور "مَرَض" کو اردو میں "سوال" اور "مرض" استعمال کیا جاتا ہے اور فرانسیسی "ریستراں" کو انگریزی میں "ریسٹورنٹ" بھی کہا جاتا ہے۔ دراصل یہ بات زبان کے مخصوص مزاج اور ماحول سے تعلق رکھتی ہے۔ ایک زبان سے دوسری زبان میں لفظوں کی بعینہٖ تبدیلی ممکن بھی تو نہیں۔ ورنہ "One Man's Meat is other's poison" کا ترجمہ "ایک آدمی کا گوشت دوسرے کے لئے زہر کا کام کرتا ہے" ہوگا اور "Sixteen years old boy" کو "سولہ سال کا بوڑھا لڑکا" ترجمہ کرنا پڑے گا۔ اسی طرح ہندوستانی محاورے، "آٹھ آٹھ آنسو رونے" اور "بغلیں جھانکنے" کا ترجمہ جوں کا توں انگریزی میں کر کے سوائے مذاق کے اور کیا ہو سکتا ہے؟

ایک زبان سے دوسری زبان میں الفاظ کے انتقال کی بات تو چھوڑیئے خود ایک ہی زبان میں ایک لفظ سے مختلف پہلو نکلتے ہیں اور معنی میں تبدیلیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ کسی ایک معنی پر بضد ہونا غلط ہی ہے ورنہ تو میرے ایک دوست کی دلیل کے مطابق جس طرح "دھرم گرو" اور "دھرم شالہ" پر سب کے لئے کا پہلو نکلتا ہے اسی طرح "دھرم پتنی" پر بھی دہ بات عائد کر کے خواہ مخواہ خالص اپنی بیوی کو سب کی پتنی بنانا پڑے گا۔ بیوی کی بات پر یاد آتا ہے کہ بیوی کے لئے انگریزی میں ایک سیدھا سادا لفظ استعمال ہوتا ہے "ہاؤس وائف" House wife ایک ہی ہجے سے جب اس کو ہاؤس وائف پڑھا جائے گا تو اس کا مطلب ہوگا "گرہستن، بیوی" لیکن اگر اسی کو "ہزِف" پڑھا جائے تو اس کا مطلب ہوگا "سوئی دھاگا کا ڈبہ" (شاید اس کے پیچھے یہ خیال ہو کہ بیوی بھی تو سوئی ڈورے کا ڈبہ ہوتی ہے ــ ڈورے کی طرح الجھی ہوئی اور سوئی کی طرح چبھنے والی)

زبان کی یہ الجھنیں اور یہ دلچسپیاں اُس وقت سے بڑھتی ہی گئیں جب سے آریائی، منگولی اور سامی زبانوں سے دنیا کی تقریباً کا زبانیں نکلنی اور پھلنی شروع ہوئیں۔ مختلف قوموں کے میل جول سے، مختلف مقامی اثرات کے امتزاج سے انھیں تین زبانوں سے ہزاروں زبانیں بن گئیں۔ آج بھی آریائی زبان کی شاخوں سنسکرت، لاطینی، فارسی، انگریزی، ہندی، اردو، جرمن وغیرہ وغیرہ میں بہت سے مشترک الفاظ اس تاریخی ارتقار کی کہانی کہتے ہیں۔ "مدر، ماتر، مادر، مدر، ماں، ممی، اماں، ماتا" ایک ہی ہیں اور اسی طرح برادر، بھراتر، بیرور، بھائی، بھیا بھی ایک ہی ہیں۔ "پیٹر، پدر، پتا، فادر" بھی الگ الگ نہیں۔ "پیڈیم، پاد، دھم"، "اینڈ" اور "انت"، "خشک" اور "شُشک"، "آفت" اور "آپت"، "اختیار" اور "ادھیکار"، "شاخ" اور "شاکھا"، "ہتھ" اور "ہاتھ"، گو آج مختلف زبانوں کے الفاظ ہیں

لیکن جیسا کہ ہم آج کل اتنے چھید ہوتی، دنیا بھی ایک ہی بات کے مختلف تعبیر میں تندرستی، صحت اور عافیت میں بھی بہت فرق محسوس ہوتا ہے جیسے ایک جنگل کی چھپکلی کو سوشل کہتا ہے اور ایک شہری ماحول کو دستر!

درحقیقت آج مختلف زبانیں اس طرح ایک دوسرے میں سما گئی ہیں کہ اب ہم کو اردو ہندی بولتے ہوئے خیال بھی نہیں آتا کہ میز، تکیہ، مکان، جیسے عام الفاظ ترکی ہیں، رنگ، خیال، محل، ال، بنگلہ، سنسکرت، فارسی کے ہیں اور موت، بعد، مقدمہ، دنیا، انسان عربی کے! اور پھر الفاظ کی اس طرح کی تقسیم ٹھیک بھی تو نہیں۔ زبانوں کو محدود کرنا ان کی فطری نشوونما کو روکنے کے مترادف ہے۔ زبانیں پانی کے دھاروں کی طرح مل کر ہی بڑھتی ہیں۔ انگریزی کی وسعت کا راز یہی ہے کہ اس نے گزشتہ کچھ سال سے اپنا دامن ہر زبان کے اچھے لفظ اور اچھے موقع کے لئے کشادہ رکھا۔ انگریزی کی زبان میں ہر سال سیکڑوں نئے الفاظ ڈکشنری میں بڑھ جاتے ہیں اور ان میں سے بیشتر کی وجہ تسمیہ بہت دلچسپ ہوتی ہے مثلاً ارل آف سینڈوچ جوا کھیلنے کا اس قدر شوقین تھا کہ اس کو کھانے کا بھی ہوش نہیں رہتا تھا اور وہ ڈبل روٹی کے دو ٹکڑوں کے درمیان مختلف چیزیں رکھ کر کھاتا رہتا تھا۔ اسی کے نام پر 'سینڈوچ' لفظ بنا۔ اسی طرح ارل آف کارڈیگن کے سوئٹر پہننے کے شوق کی وجہ سے آستین والے سوئٹر کو 'کارڈیگن' کہا جانے لگا۔ بیرو، ایک عورت تھی جس نے بادی کا کام سرانجام دیا تھا اور بائیکاٹ، ایک کسان تھا جس کا سماجی مقاطعہ کر دیا گیا تھا۔ لاطینی زبان میں سیلیرہ نمک کو کہتے ہیں اور رومن سلطنت کا ایک دور تھا کہ نمک بہت گراں تھے تھی اور سپاہیوں کو زرمبادلہ کی شکل میں نمک ہی سے تنخواہ دی جاتی تھی۔ آج انگریزی میں تنخواہ کے لئے لفظ سیلری اسی کہانی کا غماز ہے۔

کسی زبان کی بتدریج فطری ترقی اس کی زندگی کا ثبوت ہے۔ کسی زبان کو زبردستی بدلنا غیر فطری ہے۔ زبان پر ظلم کرنے کی بجائے زبان کے مختلف لطیف پہلوؤں سے لطف اندوز ہونا چاہئے۔ مثلاً ایک لان پر مالک نے "گھاس پر چلنا منع ہے" کی بجائے "اس وقت تک گھاس پر نہ چلئے جب تک وہ بڑی اور ملائم نہ ہو جائے" لکھ کر لگایا تھا اور جیسے میں نے حیدرآباد میں ایک جگہ "یہاں تھوکنا منع ہے" کی بجائے "یہاں تھوکنا آپ کی شان کے خلاف ہے" دیکھا تھا یا ایک بس میں بیٹھے مسافر کی پتلون سے جب دوسرے کا جوتا چھونے لگا تھا تو اس نے کہا تھا "دیکھئے کہیں آپ کا جوتا خراب نہ ہو جائے"۔

اگر آپ لفظوں کی گہرائی و گیرائی پر غور کریں ان کے استعمال کی طرف توجہ دیں آپ کو ہر روز بہت سی چھوٹی چھوٹی مسرتیں مل سکتی ہیں۔ زبان لڑائی جھگڑے کا موضوع نہیں بلکہ سیکھنے اور پرکھنے اور لطف اندوز ہونے کے لئے ہے۔ بات میں سے بات نکالئے۔ اپنی بات کو دلچسپ بنا کر پیش کیجئے۔ دوسروں کی باتوں سے مزاح کا پہلو نکالئے، ادب کا مطالعہ کیجئے اور خوش رہئے۔ ایک دوست نے مجھ کو حال ہی میں خط لکھا تھا کہ "آپ کو زحمت تو ہوگی مگر یہ کام کر دیجئے"، میں نے جواباً لکھا تھا "مجھے افسوس ہے کہ آپ کو ٹھیک سے اردو بھی نہیں آتی۔ ایسے بجائے کسی کا کام کرنے کو زحمت نہیں، مسرت کہتے ہیں۔"

●●●

سلام مچھلی شہری

(لال قلعہ کے جشنِ جمہوریہ ۶۹ء کے مشاعرہ کیلئے)

ضیائے کعبۂ گیتی دوام ہے کہ نہیں
ہمارے قدموں پہ ماہِ تمام ہے کہ نہیں
زہے جمال و جلالِ ستارۂ عالم
مرکا رسا فلکِ تیز گام ہے کہ نہیں
بہت لطیف ہے تزئینِ خلدِ ایماں کے!
مگر یہاں بھی وہی انتظام ہے کہ نہیں
یہ کہکشاؤں کی بیلیں، یہ مہر و ماہ کے باغ
وہ خاص جنتِ نادیدۂ عام ہے کہ نہیں
جسے اُچھالی تھی ہم مے کشوں نے مستی میں
وہی شرابِ ثریا مقام ہے کہ نہیں
ہمارا قصۂ نورِ خرد شباب پہ ہے
فسانۂ ہمہ جلوہ تمام ہے کہ نہیں
ہمیں تو تیرے ہی ربط کو گیت دینا ہے
مگر تجھے بھی ابھی بسم سے کام ہے کہ نہیں
عروجِ آدمِ خاکی کا جشن ہے معبود!
تری طرف سے بھی کوئی پیام ہے کہ نہیں
لگا رہا ہے مضامینِ نو کے کون انبار
خبر کر دیہ ہمارا سلام ہے کہ نہیں!

ضیا فتح آبادی

روتا تھا اپنے دل کو جو یہ جانتا نہ تھا
اُن کی نظر سے کوئی نشانہ بچا نہ تھا
جب تک خیال و خواب کا جنگل اُگا نہ تھا
دستِ صبا میں خون تھا رنگِ حنا نہ تھا
بے سُود اپنے پاؤں کو تکلیف تم نے دی
پتھر پڑا تھا راہ میں وہ دل مرا نہ تھا
داغوں سے میں نے دل کے اجالی تھی بزمِ غم
جب شب کی تیرگی میں کوئی دیکھتا نہ تھا
آئے وہ کچھ کہا نہ سُنا اور چل دیئے
پہلے تو، کیا کہوں، کبھی ایسا ہوا نہ تھا
یہ اور بات ہے کہ رہے دُور دُور ہم
ورنہ ہمارے بیچ کوئی فاصلہ نہ تھا
بازار سے خرید کے لاتے وفا مگر
یہ جنس وہ ہے کوئی جسے بیچتا نہ تھا
تیری گلی سے نکلے تو صحرا میں آ بسے
کیا کرتے میکدے کا بھی دروازہ وا نہ تھا
دیکھا جو حسنِ طور تو تھی دیکھنے کی چیز
اس میں کوئی قصور مری آنکھ کا نہ تھا
گن گن کے ظلم ڈھائے زمانے نے، کچھ نہ پوچھ
جیسے تری خدائی میں میرا خدا نہ تھا
اے کاش مجھ کو میں نظر آ جاتا ایک دن
تھا میں ہی آئینے میں کوئی دوسرا نہ تھا
جشنِ ضیا پہ اہلِ سخن کیوں ہیں سرگراں
کہتے ہیں اپنے وقت کا وہ بھی یگانہ تھا

غزلیں

اکرام جاوید

قصہ اک خواب کا!

گزشتہ شب ایک حادثہ ہو گیا!

میری برسوں کی نیند ٹوٹ گئی۔ مجھے خود میں یاد آ گیا۔ مدت ہوئی میں نے سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ دل کے ہر دروازے کو مقفل اور سانسوں کے ہر دریچے کو بند کر لیا تھا۔ ترکِ تعلق، ترکِ تمنا، ہر نسبت سے عاری، ہر شے سے بے نیاز، معلق، مصلوب اور منجمد۔ میں نے اپنے مطلق ارادے اور اختیار کے جبر سے اپنے پیکر کو بے شکل کر دیا تھا!

گزشتہ شب مجھے یاد آیا!

میں کون تھا؟ میں کیا ہو گیا؟ میں کون ہوں؟ درد کا پھر طوفان، ظلمتِ دہر میں جلتا ہوا چراغ ختم تھا۔ آوارہ بادل ہوا کا ایک جھونکا۔ وحشی بگولہ، آزاد، متحرک، ناقابلِ شکست، ناقابلِ تسخیر۔ خوشی کی تمنا میں خون شدہ پیار بھرا، امنگ بھرا دل، پیاسی روح، بیقرار وجود جیسے پارے کا ایک سمندر یا پھر صدیوں سے خاموش یخ بستہ کوہِ آتش فشاں۔ اک آتش خاموش!

میرا آغاز عاشقانہ تھا۔ زندگی زلف کا سایہ، چشم کا رنگ، رنگین سے پُر اسرار اشاروں کا نام تھی۔ زندگی مجھ سے محبوباؤں کی شکل میں ملی۔ میں نے صد ہزار عشق کئے۔ اپنی نیند اپنے خواب اپنا چین و قرار زمانے کو دے دیا۔ کائنات کا سارا زہر پی لیا۔ لذتِ تشنگی سے آگہی کے لئے، نسلِ انسانی کے سکون و قرار کی خاطر، زندگی کی ترقی اور بقا کے لئے، محبت کے شعلوں میں جل کر راکھ بنا۔ راکھ بگولہ بنی، دشتِ وجود میں تنہائی کے لق و دق صحراؤں میں مجھے ادھر ادھر لئے پھرتی رہی ——!

غم کبھی شفیق باپ کی بے وقت موت کی صورت میں ملا تو کبھی عزیز رشتہ داروں کی بے مروتی، بے حسی اور خود غرضی کی شکل میں۔ کبھی کسی کو کھونے کا غم تھا تو کبھی کسی کو پا کر احساس ہوا تھا۔ جسے چاہا وہ نہ مل سکا اور جو ملا وہ پہچان نہ سکا ——۔ جھوٹ، نفرت اور تشدد کے اندھیروں میں مجھ اجنبی دلِ وحشی کا دم گھٹنے لگا۔ شہروں سے گھبرا کر میں نے ویرانوں کا، جنگلوں کا رخ کیا۔ یہاں مجھے زردشت ملا۔ نطشے کا زردشتِ اعظم۔ جو ایک غار کے دہانے پر تنہا بیٹھا سوچ رہا تھا۔ زردشت ضعیف ہو چکا تھا۔ اُس کی آخری گھڑی آ پہنچی تھی۔ اُسے اپنے وارث کا انتظار تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ کھل اٹھا کسی پھول کی طرح —— صبح کے نوزائیدہ طاقتور اور توانا سورج کی طرح —— وقتِ آخر اُس نے مجھے اپنا عصا دے دیا۔ اپنے جانور میرے حوالے کر دیئے۔ سانپ، عقاب، شیر اور کبوتر ——!

"تم میرے وارث ہو۔ میں تم کو وصیت کرتا ہوں۔ شہر کی طرف لوٹ جاؤ، بیماروں کو شفا دو، اندھوں کو بینائی دو، بہروں کو سماعت، گونگوں کو گویائی بخش دو لیکن خبردار! کبھی کسی کو شاگرد مت بنانا۔ زائد از ضرورت لوگوں سے خود کو بچائے رکھنا۔

میرے جانوروں کی اچھی طرح دیکھ بھال کرتا۔ زردشت کی آواز لڑکھڑا گئی۔ وہ اپنے مزدوری وجود کے ساتھ معدوم ہو گیا اور زائد از ضرورت جسم کو میرے زانو پر چھوڑ گیا۔

اس طرح میں ایک بار اور شہروں کی طرف لوٹ آیا۔ اندھیرے کی تہہ در تہہ گہرائیوں میں اُترتا گیا۔ کالی آگ کے شعلوں میں جلتا رہا۔ میرے سانپ نے مجھے ڈس لیا۔ اندھیرے میں اُس نے مجھے مور سمجھا تھا۔ شیر بہت بھوکا تھا۔ کہیں شکار کی تلاش میں نکل گیا۔ تاریکی میں میرا عقاب کھو گیا۔ زردشت کی آخری نشانی اُس کا عصا تھا جس پر چند خوبصورت اقدار کندہ تھیں۔ اور وہ عصا بھی ٹوٹ گیا گو میں نے خوش عقیدگی کے تاروں سے اس کی مرمت کر دی۔ مگر اب وہ الفاظ اور اصطلاحوں کی طرح بے کار ہو گیا تھا!

گزشتہ شب مجھے اپنی تنہائی کی بات یاد آئی ——!

اُداس رُومانی آنکھیں، سیاہ چمکدار زلفوں کے خشک پریشان بال۔ آنکھوں کی پُر اسرار چمک۔ چہرے کی دلربا مسکراہٹ۔ وہ جسم ایک خوبصورت لڑکی کا جسم تھا۔ نور کا جسم، خوشبو کا چہرہ، مجسم چاندنی، سرتاپا نغمہ۔ اُس سے مل کر محسوس ہوا جیسے پہلی بار زندگی سے آشنائی ہوئی ہو۔ وہ آشنا مہرباں، نازداں، شجرِ ہستی کا پہلا اور آخری پھول جو میرے لئے شاخ پر نمودار ہوا۔ پل بھر کے لئے شاداب رہا اور پھر مُرجھا کر، شاخِ گل سے جدا ہو کر معدوم ہو گیا۔ میں حیران رہ گیا۔ حیران۔ اُداس اور پریشان۔ تمنائے نشاط کا انجام مجھے معلوم تھا لیکن دانستہ فریب کھانے میں جو لذت ملتی ہے وہ لذت مجھے بہلاتی رہی۔ میں حیرت و حسرت سے کائناتِ احساس کو جلتا ہوا دیکھتا رہا۔ چشم حیران چشمِ تر بھی تھی اور چشمِ تماشائی بھی۔ یہ تماشہ تو شب و روز ہوتا رہا تھا۔ مٹنے پامال ہونے کے لئے میں صفحۂ ہستی پر حرفِ مکرر بن کر اُبھرتا رہا ہوں۔ اپنی بربادی کا نظارہ کوئی خاص نظارہ نہ تھا۔ نارسائی کے شعلوں میں جلتا ہے دل تو جلنے دو۔ میں اِن شعلوں کو پی سکتا ہوں۔ جی سکتا ہوں۔ میں نے سوچا تھا اور بھول گیا تھا ——!

گزشتہ شب مجھے یاد آیا ——!

میں نے اپنے آپ کو بے شکل کیوں کر دیا ——؟

ننھا پیارا پھول جیسا معصوم وجود۔ خوبصورت چہرہ، خوبصورت آنکھیں، پیارا دلنشین انداز مسکرانے کا۔ مجسم حُسن۔ مجسم معصومیت۔ مجسم محبت۔ زندگی ایک معصوم بچے کی صورت میں مجھ سے ملی۔ میری گردن میں اپنی بانہیں حائل کر دیں۔ مجھے محبت کی بلندیوں کی طرف بلایا۔ محبت —— میری محبت کیا تھی؟ کیا ہے ——؟

یہ زمین اگر اتنی تنگ نہ ہوتی۔ یہ آسمان اس قدر محدود نہ ہوتا۔ احساس کے پھیلنے کی عمر اتنی مختصر نہ ہوتی تو شاید میں کہہ دیتا کہ جہاں ساری بلندیوں کا تصور ختم ہوتا ہے، وہاں سے میری محبت کا آغاز ہوتا ہے…… میں نے اپنے وجود کے ٹکڑے پہ متاعِ دل لٹا دی۔ میرا بیٹا۔ میرا مستقبل۔ میرے وجود کے آسمان کا سب سے پیارا سب سے روشن ستارہ —— تین سال دس دن تک برابر جگمگاتا رہا۔ میری اندھیری راہوں میں بارشِ انوار کرتا رہا اور پھر ایک دن —— ایک سیاہ منحوس دن میری روح کا وہ ستارہ ٹوٹ گیا۔ موت کی فنا کی تاریکیوں میں کہیں ڈوب گیا۔ اور میں نے اپنے آپ کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا۔ ایک سیالِ لاوے کا پہاڑ یخ بستہ ہو گیا۔ میرا مستقبل بیٹے کی تین سالہ پیاری محبت بھری معصوم رفاقت کے ساتھ ختم ہو گیا تھا۔ میں نے سوچنا ترک کر دیا۔ دل کے ہر دروازے کو مقفل اور احساس کے ہر دریچے کو بند کر لیا ——!

گزشتہ شب ایک حادثہ ہو گیا ——!

مجھے میرے معصوم مرحوم بیٹے کا وقتِ سفر یاد آیا۔ چار سال قبل ٹھیک آج ہی کے دن وہ مجھ سے جدا ہوا تھا۔ میرے دل میں درد کی ایک طوفانی لہر سی اُبھری اور سارے وجود پر پھیل گئی۔ آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے۔ مجھے رونا —— خون رونا یاد آ گیا۔! میرے پیارے بیٹے۔

میرے گوہرِ شب چراغ۔ میری زندگی کے کھوئے ہوئے
اُجالے۔ تو کہاں چلا گیا۔ کہاں چلا گیا۔ آہ ـــ مجھے کچھ یاد نہیں
آتا کہ تو کیسا تھا۔ تیرا چہرہ، تیری آنکھیں، تیری رنگت،
تیری مسکراہٹ۔ تیرے چلنے پھرنے کا انداز۔ تیری بھولی،
معصوم آواز۔ لہجہ۔ تیرا رونا۔ تیرا ہنسنا۔ ہمکنا۔ لپٹنا۔ تیرے
بدن کے لمس۔ تیرے گالوں پر میرے والہانہ بوسے ...
کچھ یاد نہیں آتا۔ درد کا احساس ہی احساس ہے۔ درد
دکھائی نہیں دیتا۔ میری روح کا گھاؤ کتنا گہرا ہے کیسے بتلاؤں۔
زخم مندمل ہو چکا ہے۔ کسک مگر باقی ہے۔ مجھے کچھ یاد
نہیں آتا بیٹے ـــ کچھ یاد نہیں آتا ـــ اختیاری جبر کا
وہ زخم بہت گہرا ہے۔ بہت کاری ـــ!

گذشتہ شب میں اپنے حافظے کا ماتم کر رہا تھا کہ
کانوں میں ایک پیاری دلنشین اور معصوم آواز کا نغمہ
گونج اٹھا۔

"بابا ـــ!"

وہی آواز، وہی چہرہ، وہی انداز، خوبصورت
آنکھوں والا، معصوم اور محبت بھرا ایک ننھا سا وجود میرے
سامنے کھڑا تھا۔ میرا دوسرا بیٹا۔ جو منے کے بعد آسمانِ
وجود پر چپکے سے اُبھر آیا تھا۔ میں نے کبھی اس کی طرف
توجہ نہیں کی۔ اُس سے کبھی دل نہیں لگایا۔ اُس سے دور
دور ہی رہا۔ وہ میری توجہ اور شفقت سے بے نیاز بڑا
ہوتا رہا اور آج اُس کی پیاری محبت بھری آواز میرے
دردِ دل پہ دستک دے رہی تھی۔

"بابا ـــ!"

نفرت، جھوٹ، فتنہ و شر کے اندھیروں میں ڈوبی
ہوئی کائنات میں جیسے صد ہزار سورج اچانک نکل آئے
ہوں۔ نئی صبح کا اللہ جو زردشت کے چہرے پر اُبھرا تھا
جبکہ وہ پختہ ہو چکا تھا۔ یہ اللہ منے کے معصوم چہرے
پر چمک رہا تھا۔ زردشت کا انجام میرے منے کا آغاز تھا۔
میری آنکھیں منے پر ٹک گئیں اور میں اپنے ارد گرد سے
جانوروں کو جاگتے ہوئے دیکھ رہا تھا

"وقت آ پہنچا ہے!" کسی غیبی آواز نے میرے
کانوں میں سرگوشی کی اور میں دفعتاً ایک بادل کی طرح منے
پر چھا گیا۔ سنگلاخ چٹانوں کا جگر چیر کر پیار کا، محبت کا
طوفانی دھارا پھوٹ نکلا۔

"بیٹے ـــ!" میں نے اپنی آواز میں ہلکی سی لرزش
محسوس کی۔ "میں صدیوں سے تیری امانت کا بار اٹھائے پھر
رہا ہوں۔ لے سنبھال اپنی امانت!"

میں نے سانپ، عقاب، شیر، کبوتر اور خوش حیدگی
کے تاروں میں لپٹا ہوا عصا اس کے حوالے کر دیا۔

ننھے نے حیرت سے، وفورِ مسرت سے اُن چیزوں
کو دیکھا اور پھر ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں مچل کر بولا۔

"بابا۔ مجھے فاختہ بھی چاہیئے۔ باجی کی کتاب والی فاختہ"

اور میں سناٹے میں آ گیا۔ کاش زردشت کے پاس
کوئی فاختہ ہوتی اور میں اُسے منے کے حوالے کر دیتا۔ مجھے
اپنے ادھورے پن کا شدید احساس ہوا۔ میرا منا مچل گیا
تھا۔ ایک فاختہ کے لئے جس کی منقار میں شاخِ زیتون کی ہو۔
منا مجھے جان سے زیادہ عزیز ہے۔

گذشتہ شب جو حادثہ ہوا تو میں غفلت کی نیند سے
بیدار ہو گیا ہوں۔ مجھے اپنے پیارے بیٹے کے مطالبے کا
احساس ہے۔ مجھے فاختہ چاہیئے، اپنے منے کے لئے۔
عصرِ فردا کے انسانِ اعظم کے لئے۔ بہر صورت۔ بہر قیمت!
ـــ گذشتہ شب ایک حادثہ ہو گیا۔ مجھے خود میں یاد آ گیا۔

میں پھر گرمِ سفر ہوں۔

چلتا ہی جا رہا ہوں ـــ!

انجان لمحے کا انتظار

حرمت الاکرام

قافلے ہیں رواں ازل تا ابد
ملتے ہیں پل کے رہرو بچھڑ جاتے ہیں۔
جیسے کوئی کسی کا نہیں آشنا
چھوٹ جائے کوئی راہ میں بھی تو کیا ؟
کوئی مڑ کر کسی کو نہیں دیکھتا

یہ سفر — ایک صحرائے بیچارگی کا سفر
کس طرف جائیے، کون دے منزلِ بے نشاں کا پتہ
تھک کے دم لینے کو جو رکا پھر نہ آگے بڑھا
رہگزر ہے کہ اک قلزمِ بیکراں
تند امواج میں لمحوں کے کارواں
تنکوں کی طرح بہتے چلے جاتے ہیں
(ضرب انفاس بہتے چلے جاتے ہیں)
ذہن کی آگہی — درد کی خستگی
ہر نئے مرحلے سے الجھتی بھی ہے
ہر نئے مرحلے پر لرزتی بھی ہے
خاک تا خاک کیسی مسافت ہے، منزل ہے کتنی کڑی !
ایک دیوار ہر گام پر ہے کھڑی
اور دیوار اونچی ہی ہوتی چلی جاتی ہے
آنسوؤں، قہقہوں، قربتوں، رنجشوں کی لڑی سی پروتی چلی جاتی ہے
لیکن اک پل کو رکتے نہیں قافلے

موڑ کوئی ہو — قطعِ سفر کی اجازت کہاں ؟
نیند کی وادیوں میں بھی تھکنے کی مہلت کہاں ؟
جادۂ شب میں قندیلِ مہتاب جلوہ فشاں ہو نہ ہو
آتشیں کرنوں کے دشت میں ابرِ خوش خلق سایہ کناں ہو نہ ہو
لپٹے دامانِ جاں سے کسی سایۂ بیتاب کی راگنی
یا کھلونوں کی صورت دبکتے جزیروں کی آغوش میں خندہ زن چاندنی ۔
یہ کہے — ٹھہر جاؤ گھڑی دو گھڑی کے لئے
(قافلوں کو نہیں اذنِ نظارگی)
شامِ کہسار چمکے تو مہکا کرے
صبحِ گلزار چہکے تو چہکا کرے
(رہروانِ عناصر کو رکنے کا انداز آتا نہیں)

یہ غبارِ سفر ایک زنجیر ہے
حلقہ در حلقہ زنجیر بنتی رہے
یہ نوائے جرس ایک تصویر ہے
زمزموں کی یہ تصویر بنتی رہے۔
قافلے آئیں گے، ساعتوں کے بیاباں میں کھو جائیں گے
راہرو جزوِ خاشاک ہو جائیں گے
گنگناتی رہے گی نوائے جرس
مسکراتا رہے گا غبارِ سفر

انتظار ایک انجان لمحے کا ہے کس قدر جاں گسل!
ایک کانٹا کھٹکتا رہے تا ابد جان بجاں دل بدل!

مقالہ

ڈاکٹر ظ۔ انصاری

پروفیسر احتشام حسین کی یاد میں

پہلی دسمبر ۷۲ء کو احتشام حسین کے دل کی حرکت بند ہو گئی اور وہ چپ چاپ رخصت ہو گئے، بڑے بڑے کام اسی طرح خاموشی سے کیا کرتے تھے۔

گول چہرہ، میانہ قد، بھرے بھرے ہاتھ پاؤں، رنگ کھلتا ہوا سانولا، نظر میں روشنی اور نرمی، ہونٹوں پر مسکراہٹ، لہجے میں سنجیدگی اور سبھاؤ، لباس میں سادگی اور برتاؤ میں رکھ رکھاؤ، صاف ستھری، نپی تلی سلیقے کی زندگی اور اس خاموش زندگی پر بہت سے عزیزوں، اور دوستوں کا بوجھ لدا ہوا۔

۱۹۴۰ء کے آس پاس جب میری طالب علمی کا زمانہ تھا، وہ ادب کے ایک گمبھیر استاد اور تنقید نگار کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے، مشہور ہونے کا لفظ، میں نے یونہی رسماً کہہ دیا، ورنہ ادبی تنقید لکھنے والے مشہور آدمی نہیں ہوا کرتے۔ یہ کام تیشہ مارنے کا ہے۔ کسی ایک زبان کی تمام شاعری اور ساری نثر کھنگال لینے سے کام نہیں چلتا۔ آس پاس کی زبانوں سے بھی آگاہی رہنی چاہئے۔ پھر یورپ کی ترقی یافتہ زبانوں، خاص کر انگریزی، فرنچ، روسی اور جرمن کے ادبوں میں جو تحریکیں چل چکی ہوں یا چل رہی ہوں، اُن کی تھوڑی بہت سُن گُن لینی چاہئے۔ ایک آدھ غیر ملکی ادب پر اچھی خاصی نظر نہ ہو تو خود اپنے ادب کی اُبھرتی اور دُھندلاتی، کجلاتی قدروں کی قدر و قیمت کا بھرپور اندازہ نہیں ہونے پاتا۔

نہ زندگی کوئی تالاب ہے، نہ ادب اِس تالاب کا نیل کمل کہ اُوپر سے پھول اُتار لو، یہاں تو بہت سارے دھارے ایک دوسرے کو کاٹتے، ریلتے پیلتے، گزر رہے ہیں!۔ وہ جن کا براہ راست ادبی سرگرمی سے تعلق ہے، تاریخ اور فلسفہ، اُن سے اچھی طرح باخبر ہوئے بغیر ادب کی زیریں لہروں کا بھی پتہ نہیں چلتا۔ اِن سب کو اپنا کر، اِن میں اُتر کر، کہیں کوئی اک آدھ اہلِ علم اور اہلِ ذوق اس قابل ہوتا ہے کہ ادبی تنقید کا حق ادا کر سکے۔

احتشام حسین مرحوم واقعی اِس قابل تھے۔ اُن کے مزاج میں سمائی تھی، طبیعت میں رسان۔ تنقید کے قلم کو انھوں نے نوکِ نشتر بننے دیا، نہ حجام کا اُسترا۔ وہ اِس سے صرف سُرخ پنسل کا کام لیتے تھے۔ کسی خوبی یا خامی کو اُبھارنے یا جتانے کی خاطر سُرخ پنسل سے نشان لگانے کا سلیقہ اُنھیں آتا تھا۔

اتنے وسیع علم، ایسے گہرے ذوق، بے مروّتی کے باوجود اتنی دل جوئی و دلداری کی سادہ تنقید لکھنے والا ہماری زبان میں کوئی اور نظر نہیں آتا۔ وہ چپکے سے اُٹھ گئے تو اب اُن کی قدر کھلی ہے۔ ایسا باخبر اور صاحب نظر ہمارے درمیان سے گیا ہے کہ نظر

یا نظم میں کہیں بھی کوئی کونپل پھوٹتی ۔ وہ اس کی چٹک کے راز دروں سے آشنا ہو جاتا تھا ۔ اپنے مضامین میں، مقالوں اور تجزیوں میں، آل انڈیا ریڈیو پر نئی کتابوں کے تبصروں میں جب وہ اس کا ذکر کرتے تو کچھ اس طرح کہ ان کی آواز دوسروں کے الفاظ پڑھ کر بھی پہچانی جاتی۔ خدا جانے یہ شرافت، یہ بھلمناہٹ گہرے اور وسیع علم سے نصیب ہوئی ہے یا بزرگوں کے ڈر سے؟ خدا کے ڈر سے یا باپ دادا کے ڈر سے؟ خدا سے ڈرنے والے آدمی تو نہیں تھے احتشام صاحب، البتہ خدا ترسی ان میں بھری ہوئی تھی۔ اس میں کچھ فیضِ صحبت بھی ضرور ہے کیوں کہ ایک طرف انھیں پروفیسر ڈاکٹر اعجاز حسین کی شاگردی اور ہم نشینی میسر آئی، دوسری طرف ڈی پی مکرجی کی نگاہِ ذرہ نواز۔ دونوں مارکسی دونوں عالم، دونوں استاد اور مربی۔ دونوں انتہا درجے کے بردبار۔ اور روشن خیال۔

پچھلے سال میں نے احتشام صاحب سے ان کی زندگی کی تفصیلات طلب کی تھیں۔ جواب آیا:

... ... یہ سوچ کر خوشی ہوئی ہے کہ آپ ہم آشفتہ سروں میں سے ہیں ....

نام سید احتشام حسین ولد سید ابو جعفر۔ پیدائش واقعی ۲۱ اپریل ۱۹۱۲ء، سرکاری کاغذات میں ۲۱ جولائی ۱۹۱۲ء۔ مکتب اور مدرسہ ماہل ضلع اعظم گڈھ (یوپی) ... انٹرمیڈیٹ، گورنمنٹ انٹر کالج الہ آباد ۱۹۳۲ء۔ بی اے، الہ آباد یونیورسٹی ۱۹۳۴ء۔ بہترین اردو طالب علم ہونے کا تمغہ۔ ایم اے الہ آباد یونیورسٹی ۱۹۳۶ء۔ فیکلٹی آف آرٹس کے بہترین طالب علم ہونے کا تمغہ۔

ملازمت ۱۹۳۸ء تا ۱۹۶۱ء تک شعبۂ اردو فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی۔ ۱۹۶۱ء سے تا حال الہ آباد یونیورسٹی صدر و پروفیسر شعبۂ اردو۔

ممبر:۔ ساہتیہ اکادمی، ہندوستانی اکادمی، ترقی اردو بورڈ، انجمن ترقی اردو، ایفرو ایشین رائٹرز کانفرنس وغیرہ۔

سفر:۔ ۵۲-۱۹۵۳ء۔ امریکہ اور یورپ۔ ۱۹۶۹ء روس۔ بسلسلہ غالب کی صد سالہ تقریبات۔

کتابیں:۔ (۱) سب سے پہلے افسانوں کا ایک مجموعہ چھپا، 'ویرانے'، پہلے ہندوستانی بکڈپو، الہ آباد سے، ۱۹۴۳ء میں، پھر فروغِ اردو، لاہور سے ۱۹۴۷ء میں

(۲) تنقیدی جائزے۔ بار اول ۱۹۴۴ء۔ دار الاشاعت حیدرآباد، پھر الہ آباد اور لکھنؤ سے کئی بار

(۳) روایت اور بغاوت، بار اول ۱۹۴۷ء۔ حیدرآباد سے، پھر اور اڈیشن نکلے۔

(۴) ادب اور سماج بار اول ۱۹۴۸ء، کتب پبلشرز بمبئی۔

(۵) تنقید اور عملی تنقید۔ بار اول ۱۹۵۲ء۔ آزاد کتاب گھر، دلی۔ بعد میں لکھنؤ سے دو اڈیشن۔

(۶) ذوقِ ادب اور شعور۔ بار اول ۱۹۵۵ء۔ فروغِ اردو، لکھنؤ۔ تین اڈیشن

(۷) ساحل اور سمندر (سفر نامہ امریکہ) بار اول ۱۹۵۵ء۔ سرفراز پریس لکھنؤ۔

(۸) اردو ساہتیہ کا اتہاس ۱۹۵۵ء۔ انجمن ترقی اردو ہند۔ علی گڑھ۔ دوسرا اڈیشن ۱۹۷۰ء میں نکلا اردو ساہتیہ کا آلوچناتمک اتہاس۔ لوک بھارتی۔ الہ آباد۔

(۹) عکس اور آئینے ۱۹۵۹ء
(۱۰) افکار و مسائل ۱۹۵۹ء
(۱۱) اعتبارِ نظر ۱۹۶۰ء
} یہ تینوں تنقیدی مجموعے لکھنؤ سے شائع ہوئے۔

(۱۲) تنقیدی نظریات ۱۹۵۹ء، ۱۹۶۰ء } دو جلدوں میں ترتیب دی۔ اس کے کئی اڈیشن نکل چکے ہیں۔

ان بارہ کتابوں کے علاوہ تین کتابوں کے انگریزی سے ترجمے بھی کیے ہیں: "سوامی وویکا نند" از [illegible] ساہتیہ اکادمی دہلی سے "بنگال" از رادھا کرشنن، نیشنل بک ٹرسٹ سے اور "گنجی کی کہانی" (جاپانی کلاسیک) ۱۹۷۰ء میں ساہتیہ

اسمادی، دہلی سے شائع ہو چکے ہیں۔

پروفیسر احتشام نے کسی ایک موضوع پر مطالعہ سے مستقل تصنیف نہیں چھوڑی، اُن کی مستقل تصنیف وہ لائق شاگرد اور احباب ہیں جنھوں نے اُنہی کی نگرانی اور رہبری میں D.Ph کے لئے خاص علمی موضوعات پر وہ جن پر تحقیقی تھیسس لکھے اور اب وہ تحقیقی تھیسس علمی تصانیف کا درجہ رکھتے ہیں۔

کبھی کبھی وہ شعر بھی کہتے تھے اور شعر میں بھی غزل۔ جو بعض اوقات رسائل میں شائع ہوتی اور کہیں مشاعرے میں سنائی جاتی۔ لیکن یہ محض تفریحِ طبع کی خاطر، یا ذہن کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے۔ جس طرح عمر خیام نے کیا کہ فلسفہ، الٰہیات اور نجوم و ریاضی کی بھٹی سے نکل کر رباعیات کا پنکھا جھلا کرتا تھا۔

خطوں میں، ورنہ جلسوں میں، جہاں بھی وہ ہاتھ آجاتے ہیں اُن کو پکڑنے، کریدنے یا گدگدانے کے لئے کوئی نہ کوئی کٹیلا جملہ کہے بغیر نہ رہتا۔ ذاتی معاملات میں وہ اِس قدر موم کی ناک تھے کہ کبھی دو بدو کچھ نہ کہا۔ یوں جواب دیتے جیسے اُن سے کوئی خطا ہو گئی اور اب اپنی صفائی دے رہے ہیں۔

مارکسی نقطۂ نظر سے اُن کی تنقید ہی مستند کا درجہ رکھتی ہے۔ "اُردو ساہتیہ کا اتہاس"، اور دوسرے کئی مضامین روسی زبان میں شائع ہو کر اہلِ علم سے داد پا چکے ہیں۔ کسی دور میں بھی انھوں نے اپنے پڑھنے والوں کو محروم یا مایوس نہیں ہونے دیا۔ جو طرزِ نظر اختیار کیا، اُسی کو مستقل مزاجی سے برتتے رہے اور جدید ادب کی تحریک کے سامنے بھی اُسی استقلال سے آئے۔ جدیدیت کی بعض انتہا پسندانہ تحریروں پر سب سے مدلل اور کڑی گرفت انھوں نے ہی کی۔

زندگی میں کوئی اُن کا دشمن نہ تھا۔ کیوں کہ وہ کسی کے دشمن نہیں تھے۔ جو اعتبارِ نظر انھوں نے اپنے مطالعے، ریاضت اور تنقیدی صاف گوئی سے قائم کر لیا تھا وہ ۱۹۴۰ء سے آج تک جوں کا توں قائم ہے۔ اور پروفیسر احتشام کو رہتی دنیا تک اُسی اعتبار سے جانچا اور یاد کیا جائے گا: "ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جوانِ میر بھی تھا"

اُن کا آخری مضمون غالباً وہ ہے جو ماہنامہ "شاعر" بمبئی کے سالنامے ۷۲ء میں "جمالیات، فنکار اور قاری" کے عنوان سے چھپا۔ جو یوں تمام ہوتا ہے:۔

"۔۔۔۔ غرض کہ حُسن کا دیکھنا اور محسوس کرنا ذوقی اور نفسیاتی کیفیت کا تابع ہوتا ہے، جسے ظاہر کرنے میں فنکار کبھی کامیاب ہوتا ہے اور کبھی ناکام۔ اِس عجز و ناکامی کی ایک خوبصورت کیفیت تلسی داس نے رامائن میں پیش کی ہے [جب رام اور لچھمن سیتا جی کے سوئمبر کی تقریب میں جنک پوری پہونچے تو ان شہزادوں کے حُسن سے سبھی متاثر ہوئے۔ سیتا جی کی سہیلیوں نے انھیں باغ میں ٹہلتے دیکھا اور چاہا کہ اُن کے حُسن کا ذکر کسی طرح سیتا جی سے بھی کر دیں۔ چنانچہ ایک شوخ سہیلی نے اس کی کوشش اِس طرح کی،

دیکھن باگ کنور دوؤ آئے — دے کشور سب بھانت سہائے
سیام گور کم کہوں بکھانی — گرا انین نین بن بانی

۔۔۔ زبان کے پاس آنکھ نہیں اور آنکھ کے پاس زبان نہیں۔ فنکار کی یہ اُلجھن کہ جس حُسن کو وہ دیکھتا ہے وہ دوسروں کو بھی دکھا سکے، اس کی سب سے بڑی آزمائش ہے، اور قاری کی بھی کہ وہ اپنے جذباتی اور ذہنی تعصبات سے الگ ہو کر شاعر کے احساسات میں شریک ہو جائے۔۔۔۔"

جذباتی اور ذہنی تعصبات سے الگ ہو کر شاعر کے احساس میں شریک ہونا تو محض ایک آدرش ہے اور مرحوم پروفیسر بھی اسی آدرش

(باقی صفحہ ۲۶ پر دیکھئے)

غزلیں

نثار اٹاوی

کیا شے ہے دردِ زہرہ جمالوں کو کیا خبر
آغوشِ انبساط کے پالوں کو کیا خبر

برسوں سے اک کرن کو ترستی ہے میری رات
اس سیم گوں بدن کے اُجالوں کو کیا خبر

کتنے ہی نے نواز لہو تھوکنے لگے!
مستِ صدائے سازِ غزالوں کو کیا خبر

پردے پہ عکس دیکھ کے رِیجھے ہوئے ہیں لوگ
پیچھے ہے کون دیکھنے والوں کو کیا خبر

آوارۂ ازل ہوں کہاں تک مجھے کا سا تھ
لیکن یہ میرے پاؤں کے چھالوں کو کیا خبر

دریا اُدھر بہے گا سمندر ہے جس طرف
خالی ہے کس کا پیٹ نوالوں کو کیا خبر

سوچیں یہ بات جشنِ چراغاں کے مہتمم
ظلمت کہاں کہاں ہے اُجالوں کو کیا خبر

بے حس دلوں کو عشق کی عظمت کا کیا پتہ
شربت ہے یا کہ زہر پیالوں کو کیا خبر

دادِ ہنر نثار سرورِ سخن میں ہے
بدبخت ناصبور کمالوں کو کیا خبر

اختر سعید

دفترِ غم کا ماحصل ہی سہی
کچھ تو سُنئے کوئی غزل ہی سہی

عشق بن کیا ملا زمانے کو
فطرتِ عشق میں خلل ہی سہی

ایک اک سانس کا حساب نہ لے
زندگی محشرِ عمل ہی سہی

کون سُنتا ہے دُور کی آواز
زندگی نغمۂ ازل ہی سہی

ہوں تو ان انکھڑیوں کے سائے میں
خیر وہ سایۂ اجل ہی سہی

عمرِ رفتہ پلٹ نہیں سکتی
نگہِ فتنہ زا خجل ہی سہی

کل گذر جائے گا یہ دورِ خزاں
ہم تو کیا ہونگے خیر کل ہی سہی

نہ سہی یہ زباں زباں والو
اس زباں کا کوئی بدل ہی سہی

خواب کیا کیا دکھا گئی اختر
عمر اک [illegible]

جوگندر پال

شناخت

شیطان کے دفتر پہنچ کر میں نے اپنا وزیٹنگ کارڈ اندر بھیجا، اپنی ٹائی اور کالر کو درست کیا اور جی ہی جی میں آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر اپنا اطمینان کر لیا کہ پورا جنٹلمین نظر آ رہا ہوں۔

مجھے امید تھی کہ شیطان میرا کارڈ دیکھتے ہی مجھے بلا بھیجے گا، لیکن وہاں کھڑے کھڑے میرے کئی سال بیت گئے اور اس نے مجھے اندر نہ بلایا۔ میں سوچنے لگا کہ کیا تدبیر کی جائے اور سوچ سوچ کر تھک گیا تو اچانک مجھے اپنی حماقت پر ہنسی آ گئی۔ اندر جانے کے لئے ایک چور دروازہ بھی تھا، جس کا مجھے خیال ہی نہ آیا تھا۔

میں چپکے سے دفتر کے اندر آ گیا۔

"مجھے آپ سے ——" میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو ٹھٹھک کر رہ گیا۔

شیطان کی کرسی خالی پڑی تھی۔ شاید وہ میرے پیچھے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ میں نے سرعت سے اپنا سر موڑ لیا اور پھر شرمندہ سا ہو کر اپنے سامنے ایک پردے کی جانب دیکھنے لگا —— پردے کے پیچھے وہ —— وہ کچھ نظر آ رہا ہے —— نہیں تو —— میں جھجک کر پردے کے قریب آ گیا اور اسے ذرا سا کھول دیا اور میری آنکھیں کمرے میں ادھر ادھر گھومنے لگیں اور —— اور میں اچانک اچھل پڑا —— نہیں! یہ تو میرے اپنے ہی پاؤں ہیں! —— اپنی ہنسی سے مجھے وہم سے جاگنے کا احساس ہوا اور میں نے قریب ہی شیطان کی خالی کرسی کے بازو کا سہارا لیا اور بیٹھ گیا۔

شیطان کی کرسی پر بیٹھ کر میں نے سامنے سے پانی کا گلاس اٹھا لیا اور گھونٹ بھرتے ہوئے یک لخت اپنی حماقت پر میرے منہ سے فوارہ چھوٹ پڑا —— میں —— میں —— آپ یقین نہ کریں گے، کہ گزشتہ کئی سال میں بڑے دنوں نے مجھے ہی گھٹا گھٹا کر آدمی بنا دیا تھا!

بلراج کومل

نائٹ ٹرین

رات کی گاڑیوں میں سفر کے لئے
نرم بستر ضروری نہیں،
تیسرے کا مسافر
مسافت کی سنگیں طوالت کا عادی ہے، اِس کو
سفر سے گزرنا ہے۔
منزل پر اپنے فرائض کو انجام دینا ہے، گھر لوٹنا ہے
نہ وہ اجنبی ہے،
نہ اس کے لئے ہم سفر اجنبی ہیں،

تعلق کی ہر عارضی ساعتِ مختصر، منتشر ہو رہی ہے۔
بہت خوب ہے گفتگو رات کے ہم سفر کی
پڑوسن مگر خوابِ خرگوش کے رفتہ رفتہ مزے لے رہی ہے

جو اعلان کچھ دیر پہلے ہوا تھا
اگرچہ وہ دلچسپ تھا، نیم خوابی نے لیکن سُنا اَن سُنا کر دیا
دُور بے رحم بپتیوں کی یلغار ہیں
جسم سے سر جُدا ہو گیا — کون ہو ؟
تم کہاں کے ہو؟ — کس دیس کو جاؤ گے ؟

جب یہودی کی لڑکی سے
گیتا سے، سیتا سے، راجہ سے جانی سے واقف ہو
جب قتل، بلوے، فسادات کی آگ سے بچ گئے ہو
تو اِس حادثے کے تصوّر سے کیوں سر بُریدہ ہو
جو دستِ امکاں میں ہے — میری منزل
قریب آ رہی ہے۔ اگر زندگی ہے۔
یقیناً کبھی پھر ملاقات ہو گی!!

[۱۱]

محمود بالیسری

تامل ادب - ابتدا اور ارتقا

تامل ادب کی تخلیق اور اس پر غور و فکر کے لئے ۱۰ر جولائی ۱۹۷۰ء کو پیرس میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس میں چالیس ملکوں کے نمائندے شریک ہوئے۔ یہ اپنی نوعیت کی پہلی کانفرنس تھی۔ تامل ادب ہندوستان کے ایک محدود علاقہ کا ادب ہے لیکن کانفرنس کا بین الاقوامی سطح پر انعقاد اُس کے عظیم ہونے کا ثبوت ہے۔ یہ کانفرنس کئی اعتبار سے امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ بڑے بڑے دانشوروں کے علاوہ مدراس کے وزیر اعلیٰ اور وزیر مالیات بھی شریک ہوئے تھے۔ اتفاق رائے سے یہ طے پایا کہ ہر سال مختلف ممالک میں یہ کانفرنس منعقد ہوتی رہے اور مرکزی دفتر پیرس میں رکھا جائے۔

کہا جاتا ہے کہ تامل آج کی دنیا میں بولی جانے والی تمام زبانوں سے زیادہ قدیم ہے۔ چنانچہ دنیائے ادب میں سنسکرت، لاطینی اور یونانی کو جو درجہ حاصل ہے تامل کو بھی وہی درجہ نہ دیا گیا تو حق تلفی ہوگی۔ مبصرین کا کہنا ہے کہ لفظ "تامل" لفظ دراوڑ سے بنا ہے۔ ان کے خیال میں دراوڑ سے ڈرمڈ، ڈرمیڈا، دمیڈا، تمیرا، تمیل اور پھر تامل ہوا ہے۔ مگر اس قسم کے خیالات کو بیشتر تامل مبصرین قبول نہیں کرتے۔

تامل ادب کی تاریخ کے ابتدائی دور میں ایک ادیب تولکاپی کا نام آتا ہے۔ تامل ادب کی قدیم گرامر تول گاپیم، کی تصنیف چار سو سال قبل مسیح ہوئی تھی۔ اس کتاب میں لفظ تامل کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ لفظ کتنا قدیم ہے۔ تامل دراوڑی زبان کے قبیلوں میں سے ایک قبیلہ ہے جو سب سے قدیم ہے حالانکہ یہ اب تک طے نہیں ہوسکا کہ یہ زبان کب وجود میں آئی۔ مورخوں کا خیال ہے کہ تامل زبان قبل مسیح صرف بھارت ہی میں نہیں بلکہ سیلون، افریقہ کے چند علاقوں اور بحر ہند کے دوسرے جزیروں میں بھی بولی جاتی تھی اور آج تامل زبان بولنے والوں کی تعداد تین کروڑ سے بھی زیادہ ہے۔

تامل ادب کی ڈھائی ہزار سالہ تاریخ میں بہت سی اچھی ادبی کتابیں لکھی گئیں، مگر یہ کتابیں نابود ہوگئیں یا نایاب ہیں۔ جو کتابیں دستیاب ہوسکی ہیں انہی میں تول گاپیم بھی ہے۔ دوسری کتاب کوراڑ ہے جو دو سو سال قبل مسیح لکھی گئی تھی۔

جس طرح ہر زبان کے ابتدائی دور کے ادب پر مذہبی رنگ غالب ہوتا ہے اسی طرح تامل زبان پر بھی برہمن دھرم نیز بدھ اور جین مذہب کے آدرشوں کا اثر اچھا خاصا گہرا ہے۔ پانچ یا چھ سو سال قبل مسیح تامل علاقے میں پانڈیہ راجاؤں کی حکومت تھی۔ یہ راجا ادب نواز تھے اور ان کی ادب نوازی کی وجہ سے ادبی ادارے وجود میں آئے۔ تامل زبان میں ادبی ادارہ کو "سنگم" کہتے ہیں پانڈیہ راجاؤں کے دورِ حکومت میں یکے بعد دیگرے تین سنگم قائم ہوئے۔

تامل ادب کی تاریخ کو ہم مندرجہ ذیل ادوار میں تقسیم کرسکتے ہیں۔

(۱) قبل از سنگم (۲) سنگم کا زمانہ (۳) بعد از سنگم (۴) بھگتی کا دور (۵) دورِ کمبن (۶) دورِ وسطیٰ اور (۷) دورِ جدید۔
قبل از سنگم کے بعد سنگم کا زمانہ آتا ہے۔ پانڈیہ راجاؤں کے دورِ حکومت میں تین سنگم وجود میں آئے۔ پہلے دو سنگم کے زمانے کی کتابیں اب نایاب ہیں۔ پرانوں سے پتہ چلتا ہے کہ رشی اگستی نے شمالی ہند سے دکن جاکر آریہ سنسکرتی کا پرچار کیا تھا۔ تاریخ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ تامل زبان کی پہلی گرامر رشی اگستی نے لکھی تھی۔ سنگم دوئم کے زمانہ میں تامل ادب کے مشہور مصنف تیل کپیار رہے۔ یہ اگستی کے شاگرد مانے جاتے ہیں۔ انھوں نے اگستی کی لکھی ہوئی گرامر کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اپنی گرامر تلکاپیئم مرتب کی۔ اس کتاب کے مطالعے سے اس زمانے اور اس سے قبل کے زمانے کے سماجی حالات کا پتہ چلتا ہے۔ قدیم مصنفوں اور شاعروں کے نام سے بھی واقفیت ہوتی ہے۔ تیل کپیار کی لکھی ہوئی گرامر تلکاپیئم تین حصوں میں منقسم ہے۔

(۱) اژدادھیکارم (حروف پر بحث)
(۲) سلودھیکارم (الفاظ پر بحث)
(۳) پورولودھیکارم (معانی پر بحث)

اس کتاب میں گرامر کے اصول فارمولوں کی شکل میں ترتیب دیئے گئے ہیں۔
مبصرین کا خیال ہے کہ دورِ سنگم سوم عیسیٰ مسیح کے ایک سو پچاس سال قبل کا دور ہے جس کو تامل ادب کا سنہرا دور کہا جاتا ہے۔ اس دور کی چند بیش بہا ادبی تخلیقیں ڈھونڈ نکالی گئی ہیں۔ نام یہ ہیں۔

(۱) ایٹو توگے۔ (آٹھ نظموں کا مجموعہ)
(۲) پتو پاٹو۔ (دس نظموں کا مجموعہ)
(۳) پدی نوڑکیلو کنڑکو۔ (اٹھارہ چھوٹی چھوٹی نظموں کا مجموعہ)

یہ تمام نظمیں رومانی اور رزمیہ شاعری ہیں۔ ایٹو توگے کی نظموں سے اس زمانے کے راجاؤں کی طاقت، جاہ و جلال اور ان کی فتوحات کا پتہ چلتا ہے۔ پتو پاٹو، دس حسین نظموں کا مجموعہ ہے۔ تامل زبان میں لفظ "پاٹو" کثیر التعداد مصرعوں پر مشتمل نظم کو کہتے ہیں۔ اس کتاب میں چند ایسی نظمیں ہیں جو چھ سو سے زیادہ مصرعوں پر مشتمل ہیں۔ یہ کتاب شیو دھرم کے ماننے والوں کی نظر میں ایک مقدس کتاب ہے۔ اس کتاب سے اس زمانے کے سماجی حالات کا پتہ چلتا ہے۔ اس دور کی تیسری کتاب پدی نوڑکیلو کنڑکو، اخلاقی نظموں پر مشتمل ہے۔ دورِ سنگم سوم کے زمانے میں کم و بیش ۸ کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اس دور کی ایک مشہور عالم کتاب "تیرکرل" اور اس کا ترجمہ مختلف ہندوستانی زبانوں میں کیا جا چکا ہے۔ یہ کتاب تامل زبان کا وید کہلاتی ہے۔ جسے آج سے دو ہزار سال قبل "تیرو ولوور" نے سپردِ قلم کیا تھا۔ یہ مندرجۂ ذیل تین ابواب میں منقسم ہے۔

(۱) اوردپو پال (باب مذہبیات)
(۲) پوروٹ پال (باب معاشیات)
(۳) کامتو پال (باب جنسیات)

مندرجۂ بالا کتاب تیرہ سو تیس مصرعوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں انسانی کردار کا گہرا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کا ترجمہ سنسکرت میں "سونیتی کسم مالا" کے نام سے ہوا ہے۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جسے شیو دھرم نیز بدھ اور جین مذاہب کے پیرو اپنے مذہب سے منسوب کر رہے ہیں۔ حالانکہ یہ اب تک طے نہ ہو سکا کہ کتاب کا مصنف کس مذہب یا کس عقیدے کا تھا۔
دورِ سنگم کے بعد کا دور تامل ادب میں رزمیہ دور کہلاتا ہے۔ اس دور میں تامل علاقوں میں بدھ اور جین مذاہب کے پیرو

پر تھی۔ یہ وقت وہ تھا جب سنسکرت کا پرچار کرنے والے برہمن اور شمالی ہند سے آئے جین اور بدھ پالی بھاشا میں پرچار کر رہے تھے۔ تمیل ادب کا یہ دور سنسکرت اور پالی بھاشا کے اثر میں رہا۔ سنسکرت اور پالی بھاشا کے کئی الفاظ و خیالات تامل زبان میں منتقل ہو گئے۔ اس دور کی پانچ مشہور رزمیہ نظمیں حسب ذیل ہیں:

(۱) سیلپ ادی کارم
(۲) منیمے کلئی
(۳) جیوک چنتامنی
(۴) ولیا پدی
(۵) کونڈل کیسی

سیلپادی کارم تامل ادب کی پہلی رزمیہ نظم ہے۔ اس کے مصنف کا نام 'النگو ادی گل' ہے جو چیرا راج ونش کے تھے اور جین دھرم کے پیرو تھے۔ اس نظم کا مرکزی خیال ستی کا تقدس اور صداقت کی فتح ہونے کی وجہ سے سینکڑوں سال گذرنے کے بعد بھی عوام میں اس کی مقبولیت باقی ہے۔ اس کتاب کے چند حصے نثر میں بھی لکھے گئے ہیں۔ اس لئے یہ کتاب تامل ادب کی پہلی رزمیہ نظم ہونے کے ساتھ ساتھ نثری ادب کا بھی پہلا سنگ میل ہے۔ مندرجہ بالا رزمیہ نظموں کے علاوہ متعدد چھوٹی چھوٹی نظمیں مثلاً نیلاکیسی، سولامنی، یسودھرا کاویم، ناگ کمار کاویم اور ادیانن کتھئی وغیرہ بھی لکھی گئی تھیں۔ رزمیہ شاعری کے دور میں جین دھرم کا اثر زیادہ نظر آتا ہے۔

شیو دھرم اور ویشنو دھرم کے پرچار کرنے والوں کو بالترتیب 'نائینار' اور 'الوار' کہتے ہیں۔ ان دو جماعتوں کی وجہ سے تامل ادب میں بھگتی تحریک کا اضافہ ہوا۔ ۹۰۰ء سے ۱۳۰۰ء تک چولا راجاؤں کی حکومت رہی تھی۔ چولا راجاؤں کی ادب نوازی کی بنا پر 'نائینار' اور 'الوار' جماعت والوں کی کافی ہمت افزائی ہوئی۔ نائینار کے چار مشہور شاعر 'مانکو واچکر'، 'تیرو گیان سمبندر'، 'اپر' اور 'سندر مورتی' سوامی گل ہیں۔ اسی طرح 'الوار' جماعت نے بھی گیتوں کا ایک مجموعہ 'نالا یرا دیویہ پربندھم' لکھا جس میں تقریباً بارہ ہزار مصرعے شامل ہیں۔

تامل ادب کا پانچواں دور 'دورِ کمبن' کے نام سے مشہور ہے۔ اس دور میں کمبن نے بارہ ہزار مصرعوں پر مشتمل سری رامائن کی تصنیف کی۔ تامل زبان کے مشہور طویل نظم 'نل ونبا' کی تخلیق بھی اسی دور میں ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ بہت سی سوانح عمریاں بھی لکھی گئی تھیں۔ اسی دور میں سنسکرت کی کتابیں مثلاً رامائن، مہابھارت اور بھگوت گیتا کے بھی ترجمے ہوئے تھے۔

۱۶۵۰ء سے ۱۸۵۰ء تک دو سو سال کا زمانہ تامل ادب میں 'دورِ وسطیٰ' کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس دور کو تامل ادب کا نثری دور بھی کہا جاتا ہے۔ اس دور میں زیادہ تر ترجمے اور تشریحی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ پریمل گر کی کتاب 'بل پورانم' جو تامل ادب کی ابتدائی گرامر 'تول کپیم' کی تشریح پر مشتمل ہے اسی دور میں شائع ہوئی تھی۔

نثری ادب کی ترقی میں عیسائی پادریوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ اس ضمن میں 'فادر بسکی' کا نام لیا جا سکتا ہے جو ۱۷۱۰ء میں اٹلی سے تشریف لائے تھے۔ انھیں متعدد ہندوستانی زبانیں سیکھنی پڑی تھیں۔ انھوں نے تامل، فارسی اور سنسکرت کے علاوہ دوسری زبانیں بھی سیکھیں۔ سنسکرت میں ان کا نام 'سوامی گل' تھا، تامل زبان میں 'ویرماموینر' اور فارسی میں 'ہمہ دستی' کے نام سے مشہور تھے۔ چرچ والوں کی مخالفت کے باوجود وہ تامل معاشرہ میں گھل مل گئے۔ انھوں نے ہندوستانیوں کو اپنانے کے لئے خود بھی گوشت اور مچھلی کھانا ترک کر دیا تھا۔ [illegible] کے بجائے گاڑی [illegible] پالکی میں بیٹھ کر تبلیغ کے لئے [illegible] جاتے تھے۔ [illegible] ہندو اور مسلمان دونوں یکساں چاہتے تھے۔ فادر بسکی [illegible] تامل زبان کی

متعدد نظموں کا ترجمہ لاطینی زبان میں کیا ہے۔ انھوں نے تامل زبان میں ایک طویل نظم "تمباوانی" خود کہی ہے۔ اس میں حضرت عیسیٰ کی سوانح عمری بیان کی گئی ہے۔ انھوں نے تامل زبان کی گرامر میں چند تبدیلیاں لاکر اس زبان کو آسان بنا دیا ہے۔ جس وقت تامل زبان کے نثری ادب کی کوئی ترقی نہیں ہوئی تھی، فادر ویسکی نے اس کو اس وقت بھی مالا مال کیا۔ انھوں نے ایک کتاب "ویدی ودوجوکم" کی تصنیف کی جو آج بھی مقبول ہے۔ ان کی تصنیف "پرمارتھا گورو کتھئی" ظریفانہ نثری ادب میں شمار کی جاتی ہے۔ مبصرین فادر ویسکی کو تامل نثری ادب کے بانی کا مرتبہ دیتے ہیں۔ فادر ویسکی دنیا میں نہیں رہے مگر وہ ہمیشہ تامل ادب کے لئے امر ہیں۔

بیسویں صدی کے آغاز سے تامل ادب میں دورِ جدید کا آغاز ہوتا ہے۔ مغربی ادب اور مغربی تعلیم سے اثر پذیر ہوکر دوسری علاقائی زبانوں کی طرح تامل ادب میں بھی نئے رجحانات پیدا ہونے لگے۔ اس دورِ جدید کے بانی "سبرامنیم بھارتی" ہیں۔ سبرامنیم بھارتی صرف تامل ادب کے نہیں بلکہ ہندوستانی ادب کے بھی مشہور شاعر مانے جاتے ہیں اور انھیں کے نام سے تامل ادب کا یہ دور "بھارتی" کہلاتا ہے۔ اس دور میں مروجہ رجحان کے مطابق بہت سے افسانے، نظمیں اور ناٹک لکھے گئے۔ تامل ادب مہاتما گاندھی کی قیادت میں چلنے والی قومی تحریک سے کافی متاثر ہوا اور "دیسیکا ونائکم پلائی" اور "نامکل رام لنگم پلائی" وغیرہ نے قومی شاعروں کی حیثیت سے قومی نظمیں کہیں۔ ان کے علاوہ "آر کرشنا مورتی" (جو "کلکی" کے نام سے مشہور ہیں) ایم بھارت راجن اور کے۔ وی۔ جگناتھن وغیرہ نے تامل ادب کو ناول، افسانے اور دیگر انشائیوں سے مالا مال کیا۔

یہ ضرور ہے کہ انگریزی کے سرکاری بھاشا ہونے کی وجہ سے تامل زبان کی طرف سے کسی حد تک بے اعتنائی برتی گئی تھی مگر انگریزی ادب کے اثر سے تامل ادب میں نئے نئے تجربے بھی ہوئے۔ جدید شعرا کے زمرہ میں "سندرم پلائی" اور "کرشنا پلائی" کے نام بھی لئے جاتے ہیں۔ شاعرِ اعظم سبرامنیم بھارتی نے سادہ اور سلیس زبان میں زمانے کے رجحان کے مطابق بہت سی نظمیں لکھی ہیں، جن سے تامل علاقے میں ایک نیا ادبی انقلاب وجود میں آیا۔ انھیں وجوہ کی بنا پر بھارتی کو قومی شاعر کا خطاب ملا ہے۔

دورِ جدید میں تامل زبان میں ناول اور افسانوں کے علاوہ ادب کی دوسری اصناف کو بھی خاصی ترقی ملی۔ انگریزی ناول کی اساس پر رومانی ناول لکھے گئے۔ تامل دنیا کی مشہور تخلیقوں کے ترجمے کئے گئے۔ تامل ادب اس طرح افسانے، ناول اور سائنسی دور کے مختلف شعبوں میں اپنا قدم آہستہ آہستہ جماتا چلا جا رہا ہے۔ مختصر یہ کہ جس طرح تامل ادب کا ماضی عظیم رہا ہے اسی طرح اس کا حال ترقی پذیر و متحرک اور مستقبل روشن نظر آتا ہے۔

بقیہ: "پروفیسر احتشام کی یاد میں" صفحہ ۱۹ سے آگے

کے تمنائی ہوں گے۔ البتہ وہ کسی کے ذاتی دشمن نہیں رہے اور ان کا بھی کوئی دشمن نہ تھا۔ جو اعتبار نظر انھوں نے اپنی رواداری، گہرے مطالعے، بے غرضی اور صاف گوئی سے پیدا کر لیا تھا، رہتی اردو تک انھیں اسی اعتبار سے جانچا اور یاد کیا جائے گا۔ ان کے ساتھ یہ رشتہ بھی قابل فخر ہے کہ "ہم بھی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا!!" (بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو بمبئی)

سروش موہن

مختصر نظمیں

زنجیریں

ہم کہ صرف لفظوں کی دلکشی کے رسیا ہیں
اور ہیں معانی کی دلبری سے بے پروا
ہو گئے ہیں ہم شیدا رنگِ سطح پر، ہم نے
شاعری کی دیوی کے پاؤں میں توانائی کی
ڈال دی ہیں زنجیریں

دھند الفاظ کی

جیسے خورشیدِ درخشاں بہ دم صبح دم
دھند سے مرعوب آتا ہے نظر
ایسے ہی اکثر معانی پر بھی چھا جاتی ہے دھند الفاظ کی
لیکن آخر ہو کے رہتے ہیں معانی جلوہ گر

کام پاتال

کارِ معیوب ہے شغلِ مرغوب
گھاس میں سانپ کئی
کھیلتے اور مچلتے ہیں خوب
روپ رنگ اپنا بدلتے ہیں سنبھلتے ہیں، بہلتے ہیں خوب
کام پاتال میں جاتے ہیں ڈوب

بھرے پیٹ کی ڈکار

ذوقِ ادب بھی تو ہے بھرے پیٹ کی ڈکار
کہتے ہیں احتیاج ہے جسے اس کے جسم سے
سچ بات تو ہے یہ کہ نکلتے ہیں جو شرار
کرتے ہیں بھسم آرٹ کو، کلچر کو، اور پھر
ہوتی ہے در بدر
افلاس اور بھوک سے تہذیب بے وقار

رونق دکنی سیمابی

پیش گوئی

سالِ نو سے دنیا کے خدّ و خال جاگینگے
ماہ و سال سوئے ہیں ماہ و سال جاگینگے

واقعات ماضی پر، ہوگا ہنسر مستقبل
حال پیش رَو ہوگا۔ نیک فال جاگینگے

پھر اُفق سے صبح نو مسکراتی جھانکیگی
ہوں گے بام و در روشن، نونہال جاگینگے

بھوک ایک عُقدہ ہے جسکا حل نہیں آساں
اک سوال کی خاطر سو سوال جاگینگے

فکر و فن کی راہوں سے، منحرف جو ہیں راہی
خال خال جاگے ہیں، خال خال جاگینگے

ظلمتوں کے سینے سے نور پھوٹ نکلے گا
پھر اذانیں گونجینگی، پھر بلال جاگینگے

اور ضَو فگن ہوگی، مہر کی درخشانی
اور چاند ابھریں گے اور ہلال جاگینگے

قومیت کی یکجہتی پھر بنے گی مشاطہ
پھر عروسِ اُردو کے خدّ و خال جاگینگے

اُن سے پھر تصوّر میں، ہوگی گفتگو روَنق
یاد لے گی انگڑائی، ماہ و سال جاگیں گے

کہانی

ہندی

جے پرکاش بھارتی
مترجمہ کلدیپ نلواڑ ایم، اے،

فطری، غیر فطری

شری جے پرکاش بھارتی ماہنامہ نندن (ہندی) جو بچوں کا ایک مشہور پرچہ ہے، کے ایڈیٹر ہیں۔ انکی درجنوں کہانیاں ہندی کے اچھے اچھے پرچوں میں چھپ چکی ہیں۔ ایک ناول "کہرے میں کھوئے ہوئے چاندی کے پہاڑ" اور بچوں کے ۵ ناول شائع ہو چکے ہیں۔ آپ کی کتاب "ہمالہ کی پکار" پر Unisco انعام بھی ملا ہے۔ ابھی حال ہی میں حکومت ہند نے آپ کی کتاب "چلو چاند پر چلیں" پر نقد انعام دیا ہے۔

دسمبر کا مہینہ تھا۔ ہاں مجھے اچھی طرح یاد ہے اُس دن ۲۸ تاریخ ہی تھی۔ چھایا نے مال روڈ کے دوسرے کنارے والے ریستوران میں ملنے کا وعدہ کیا تھا — شام چھ بجے۔ کتنی رنگینی تھی میری کلپناؤں میں۔ کتنی اُمنگ تھی میرے دل میں! ہاں یہی تو طے ہوا تھا — شام کو سب سے پہلے ریستوراں میں ہلکی چائے، پھر انگریزی فلم کا شو، اس کے بعد ڈی لا روڈ میں ڈنر!

اس دن دوپہر دو بجے ہی سے میں نے تیاری شروع کر دی۔ گہرے بھورے رنگ کا سوٹ بڑا میلا تھا۔ مکھنی رنگ کے امریکن کوٹ اور کالی پینٹ کے ساتھ 'لو' بھی اُس دن دل پر نہ چڑھی۔ یوں وہ آسمانی رنگ کا سوٹ بھی کچھ خاص نہیں جچ رہا تھا لیکن کسی طرح کام تو چلانا ہی ہوگا۔ پندرہ بیس دن ہو گئے تھے اُسے دھلوائے۔ ساری کریز ٹوٹ گئی تھی — بڑا عجیب لگ رہا تھا وہ سوٹ۔ جو بھی ہو اتنی جلدی نہیں دھلوایا جاتا۔ سوچا پریس کرنا ہی کافی ہوگا۔ پریس کرنے سے سوٹ میں تو کچھ جان پڑی لیکن ٹائی کوئی بھی ایسی نہیں لگی جو سوٹ پر پوری طرح کھلے۔ آخر دوڑا دوڑا بازار پہنچا۔ پندرہ بیس جگہ ڈھونڈ کر ایک ٹائی پسند کی — نیلے سلیٹی رنگ کی۔ بیچ میں اس کے نیلی دھاریاں کھنچی ہوئی تھیں۔ اُس ٹائی کو پسند کرنے کا سبب شاید وہ دھاریاں تھیں۔ اُن سفید ترچھی دھاریوں کا کوئی مطلب میری سمجھ میں نہیں آیا۔ ٹھیک جدید طرز کے خام نامعلوم نمونوں کی طرح۔

جوتے کالے پہنوں یا گہرے یا ہلکے بھورے رنگ والے؟ کالے رنگ کا جوتا اچھا ہے لیکن اس کی ٹو نئے فیشن والی نہیں ہے۔ گہرے بھورے رنگ کا جوتا آسمانی سوٹ کے ساتھ میچ نہیں کرے گا، تب؟ تاکولن کے موزے اور ہلکے رنگ والے جوتے ہی اپ ٹو ڈیٹ بننے کے لئے ٹھیک سمجھے۔

تیار ہوتے ہوتے گھر ہی پر ساڑھے پانچ ہو گئے۔ اسکوٹر نکالا تو بڑی جھنجھلاہٹ ہوئی — تین چار دن ہوئے ایک نٹھتہ ٹھیلے والے نے ٹکرا کر ہلکا گڑھا ڈال دیا تھا۔ دو جگہ سے پالش بھی اتر گئی تھی۔ میں دل ہی دل میں جھلا اُٹھا۔

بے چارے کو کوستا ہوا اسکوٹر پر سوار ہوا اور مال روڈ کی طرف چل پڑا۔

راستہ اس دن کتنا لمبا لگ رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے اسکوٹر دوڑ نہیں رینگ رہا ہے۔ بیچ بیچ میں اسکوٹر پر لگے شیشے میں خود کو دیکھ لیتا اور اپنی پوشاک کے بارے میں سوچتا۔ ایک عجیب سی بیزاری تھی میرے دل میں، جو مجھے نہ کچھ پسند کرنے دے رہی تھی اور نہ ناپسند۔

سردی کے دن۔ سنسان مال روڈ پر اسکوٹر تیز دوڑ رہا تھا اور دماغ میں اُدھیڑ بُن لگی تھی۔۔۔۔ چھایا مجھے اس پوشاک میں دیکھ کر آزردہ خاطر تو نہ ہوگی۔ دسمبر کی شام۔ ہلکا دھندلکا چھا گیا تھا۔ لیکن ابھی روشنی کا وقت نہیں ہوا تھا۔ ٹروہ بنک والے چوراہے پر کچھ مہینے ہوئے ایک کار اور ٹرک کی ٹکر ہو چکی تھی۔ اُسی سے گزرتے وقت اسکوٹر جو دھیما کیا تو سڑک کے دائیں طرف والے کنیر کے جھرمٹ سے نکل کر ایک شکل جھپٹ کر سڑک کے بیچوں بیچ آ کھڑی ہوئی۔ میں نے اسکوٹر بائیں طرف سے کاٹ کر نکالنا چاہا لیکن وہ بھی اسی طرف اس تیزی سے جھپٹی کہ اگر میں پورا بریک ایکدم نہ لگاتا تو یقیناً حادثہ ہو جاتا۔ سڑک پر رگڑ کا ایک لمبا نشان چھوڑتا ہوا اسکوٹر گہری چیں کے ساتھ رکا۔ اور جب تک میں صورت حال کو سمجھوں وہ شکل تیزی سے میری طرف بڑھی اور پیچھے اسکوٹر پر جا چڑھی۔ ایک بار تو میں دنگ رہ گیا۔ وہ شکل ایک عورت کی تھی ایک جوان عورت کی! ٹکر ہو جانے پر شاید اتنا پریشان میں نہ ہوتا، جتنا بریک لگانے کے بعد اس لڑکی پر نظر پڑنے سے ہوا۔ آج بھی اُس لمحے کا تصور کر کے میں کانپ جاتا ہوں۔ وہی جوان نسوانی جسم پر کپڑے کی ایک ہلکی سی لکیر بھی نہ تھی۔ آنکھوں کے ایک بار جھپکنے کے وقت میں اُس جھٹپٹے میں اُسے جتنا بھی دیکھ پایا اس سے میرے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ وہ نسوانی جسم ننگا ہی نہ تھا۔ عجیب خوبصورتی کی دمک بھی تھی اُس میں!

کتنا رومان پرور لمحہ تھا وہ! ایک لحظ اپنی پشت پر مجھے اس کے جسم کا گرم لمس محسوس ہوا۔ اپنے اُس وقت کے جذبات کو ظاہر کر سکنا میری بساط سے باہر ہے۔ میری گردن کو اپنی باہوں میں پیچھے سے گھیرتی ہوئی وہ بولی "نیچے اُترو!" چونکہ اور کچھ سجھائی نہیں دیا اور کچھ کئے بنا کام چلتا دکھائی نہیں دے رہا تھا اس لئے میں نے اپنی جیب سے دو روپے نکال کر پیچھے کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "یہ لو اور میرا پیچھا چھوڑ دو۔"

وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ کتنا مسحور تھا اُس ہنسی میں! اُس نے مجھے زور سے جھنجھوڑ کر کہا "نیچے اترو اور دیکھو میں کتنی اچھی لگتی ہوں اس طرح!" شرم سے میرا سر جھکا جا رہا تھا اور میں مفر کا کوئی موقع تلاش کرنا چاہتا تھا۔ "نیچے اتر کر میری طرف دیکھو اور یہ بتاؤ کہ میں کیسی لگتی ہوں!" ذرا اور زور دے کر وہ بولی۔۔۔۔ "جب تک تم میری طرف نہیں دیکھو گے میں نیچے نہیں اتر سکتی۔"

شکست تسلیم کر کے میں اسکوٹر کی گدی سے اُترا اور سڑک پر ہی نظر جمائے رہا۔ وہ ایک بار پھر ہنسی۔ "شرماتے ہو! شرمانے کی بات ہی کیا ہے اس میں؟ یہی تو فطری روپ ہے انسان کا۔ بعینہ ویسا جیسا اُسے اپنی ماں سے ملتا ہے۔"

کیسی تھی وہ گھڑی! چھایا میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ کہاں پھنس گیا میں آج! تمام پروگرام بگڑا جا رہا تھا۔ میں نے گلو خلاصی کے لئے ایک بار پھر اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا اور کہا "حقیقت میں تم بہت اچھی لگ رہی ہو اس روپ میں۔" وہ کود کر اسکوٹر سے اتر گئی اور تالی بجا کر خوب زور سے ہنسنے لگی۔ ہنستے ہنستے دوہری ہو گئی۔ پھر بولی۔

"پاگل انسان، جاؤ میں نے تم کو چھوڑ دیا"
کہ ایک سے آزاد ہوتے ہوئے کبوتر کی طرح پھڑ پھڑا کر اسکوٹر پر سوار ہو میں وہاں سے بھاگا۔ بار بار وہ واقعہ وہ ننگا نسوانی جسم رہ رہ کر میرے ذہن میں کوند اٹھتا تھا۔ میں عقدۂ لاینحل میں پڑ گیا — وہ کون تھی؟ اس طرح ننگی کیوں تھی؟

اس دن چھایا بہت اہتمام سے سنور کر آئی تھی لیکن اس کے اُن اُجلے چمکیلے کپڑوں میں کوئی کشش مجھے نہ لگی۔ میں چھایا کے ساتھ گھوما پھرا۔ سینما بھی ہم نے دیکھا اور بعد میں ڈی لارڈ کے ڈنر کے ساتھ رقص و سرود کے پروگرام بھی دیکھے سُنے۔ لیکن ذہن گھوم پھر کر ان دو سوالوں ہی پر منڈلاتا رہا — وہ کون تھی اور اس طرح ننگی کیوں گھوم رہی تھی؟

چھایا کے ڈیڈی شخصی آزادی کے حامی ہیں۔ ذات پات کے فرق کو نہیں مانتے — شادی بیاہ میں لڑکے لڑکیوں کی پسند ہی کو اوّلیت دینے کے حق میں ہیں۔ انصاف کی بات وہ تسلیم کرتے ہیں۔ مجھے چھایا کو سونپنے میں اُنہوں نے کسی قسم کا تعرّض نہ کیا۔ ویسے سوچا جائے تو اُنہیں نقصان ہی کہاں تھا؟ وہ میئر ہیں تو میرے ایک چچا بھی نائب وزیر ہیں اسٹیٹ سرکار کے — پتاجی کو چار بھٹیوں کے لائسنس حاصل ہیں۔

شادی کے بعد گرمیاں بتانے ہم کشمیر گئے۔ بھارت کا شاید ہی کوئی خاص شہر میں نے چھوڑا ہو۔ شمالی ہند کے شہروں سے لے کر جنوب میں حیدر آباد میسور تک۔ خوبصورت اور تعلیم یافتہ رفیقۂ حیات اور پیسے کی افراط — کون ہوگا جو ایسے میں پر لگا کر آکاش میں نہ اُڑ جانا چاہتا ہو۔ میں چھایا کو ہمیشہ نئے روپ میں دیکھنا چاہتا تھا اور وہ بھی ان تھرکتے بدلتے رنگوں میں محو تھی۔ دنیا بھر کا کوئی فیشن، کوئی بناؤ سنگار نہیں چھوٹا۔ چھایا — ہمیشہ بدلتی چھایا۔ چھایا خوش تھی اور میں اُس کی خوشی میں خوش۔!

جب اس سیر سپاٹے کی شان و شوکت نے جیب پر کافی بار ڈال دیا تو میں اپنے شہر لوٹ آیا۔ ایک علیحدہ فلیٹ لے کر ہم دونوں رہنے لگے۔ کتنا سکھ تھا، کتنی مدہوشی تھی! چاندی کے سکے پر روپہلی چمک۔ خوبصورت بیوی، آرائشِ حُسن کے لوازمات اور بھڑکیلا فیشن۔ میں ڈوبا رہا اُسی سب میں! اپنی چھایا میں، ہمیشہ بدلتی چھایا میں۔

اور پھر ایک دن اسٹیشن روڈ سے گزرتے ہوئے میں نے بچوں کی شور مچاتی بھیڑ کے بیچ ایک عُریاں عورت کو دیکھا۔ میں حیران رہ گیا اُسے دیکھ کر۔ یہ وہی تھی جو مجھے مال روڈ پر مل چکی تھی۔ کتنا تغیّر آ گیا تھا اُس میں۔ سا جسم کا رنگ میل کی موٹی تہہ کے سبب کالا لگ رہا تھا۔ بال اُلجھے ہوئے اور چہرہ سیاہ! رُوپ گھُل گیا تھا۔ جوانی ڈھلی ہوئی تھی۔ فاقہ زدہ، گرمی سردی کی چُبھن۔ اُس کا حُسن گویا مصائب کی آگ میں پگھل گیا تھا۔ بچ گیا تھا ہڈیوں کا ایک پنجر۔!

بعد میں سڑک پر آتے جاتے اُسے کئی بار دیکھا۔ شیطانی لڑکوں کی تالی بجاتی شور مچاتی بھیڑ کے علاوہ بالغوں کی گڑتی پھسلتی نظروں کی پرواہ کیے بنا وہ فٹ پاتھ پر ایک کنارے بیٹھی رہتی۔ اکثر ایک ہلکا باریک دو بیتہ نما کپڑا ہی اُس کے پاس رہتا جسے وہ دُور کھسکاتی اور جب پُورا کپڑا اُس کے جسم سے ہٹ جاتا تو بڑے فخریہ انداز میں گردن کو خم دیے کر کسی ایک خاص سمت میں ایک ٹک دیکھنے لگتی بنا ہلے جلے۔ اُس وقت اُس کے

چہرے پر رعونت اور نفرت کا ملا جلا تاثر ابھر آتا اور وہ بڑی گھناؤنی لگنے لگتی۔

اُس کے بارے میں اور بھی بہت سے لوگوں سے سن چکا تھا۔ لوگ کھانے پینے کو کچھ دیتے تو کھا لیتی، لیکن ستر پوشی کے لئے اگر کوئی اسے کپڑے وغیرہ دیتا تو اس سے پوچھتی ــــ میں اس طرح کیا کم حسین لگتی ہوں؟ اور وہ اس کپڑے کو دور پھینک دیتی۔ اُس کے اس طرزِ عمل سے سبھی حیران تھے۔ میرا ذہن اُس کے اِس عجیب طرزِ عمل کا مطلب سمجھنے کے لئے جانے کیوں بے قرار ہو جاتا۔

چھایا کے بڑے بھائی مشہور فن کار ہیں۔ اُن کے آرٹ کی نمائش ملک کے بہت سے شہروں میں ہو چکی ہے۔ کئی سرکاری و غیر سرکاری نمائشوں میں ان کے آرٹ پر انعام بھی مل چکا ہے۔ پہلے وہ اپنی فیملی کے ساتھ یہیں رہتے تھے لیکن چھایا کا کہنا ہے کہ وہ یک لخت سب کو چھوڑ کر یہاں سے چلے گئے اور الہ آباد میں قیام پذیر ہو گئے۔ وہاں سے خط و کتابت تو کرتے، لیکن گھر لوٹ کر نہیں آتے۔ چھایا کے بیاہ میں بھی وہ نہیں آئے تھے۔ مجھے الہ آباد ایک ضروری کام سے جانا تھا۔ چھایا کے اصرار پر میں اُس کے بھائی صاحب سے جا کر ملنے کو تیار ہو گیا۔

وقت نکال کر میں راکیش بابو کے یہاں پہنچا۔ چھایا کے حوالے سے اپنا تعارف کرایا تو بہت اپنائیت اور خلوص سے ملے اور بڑی خاطر مدارات کی۔ کھینچ کر اپنے اسٹوڈیو میں لے گئے اور بڑے جوش و خروش سے اپنے آرٹ کی گہرائیوں پر بحث کرنے لگے۔

پہلے کمرے میں پنسل اسکیچ تھے۔ اُس کے بعد کچھ آئل پینٹنگز تھیں۔ راکیش بابو نے مجھے بتایا کہ وہ انکی ابتدائی کاوشیں ہیں۔ تصاویر متاثر کرنے والی تو تھیں، مگر میں نے اُن کے انداز میں کوئی نیا پن نہیں دیکھا۔

دوسرے کمرے میں کینوس پر کچھ تصاویر میں قدرتی مناظر تھے۔ کچھ دھندلے دھندلے، کچھ مبہم، کچھ اُلجھے ہوئے۔ اُن تصاویر کو دیکھنے سے لگا کہ فن کار قدرتی حسن میں کوئی پُراسرار چیز تلاش کرنا چاہتا ہے۔ جس چیز کی اسے تلاش ہے وہ اُسے دکھائی تو دیتی ہے لیکن اس کی گرفت میں نہیں آتی۔ ان سبھی تصاویر میں اُسی مبہم دھندلے اسرار کو پکڑنے کی کوشش جھانک جھانک جاتی تھی۔

تیسرے کمرے کی تصاویر کینوس ہی پر تھیں۔ سب سے پہلی تصویر میں ایک دیہی خاتون اپنی دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ پھولوں سے لدی ایک جھاڑی کے سہارے بیٹھی تھی، حالانکہ اُس کی آنکھیں کچھ کم کھلی ہوئی تھیں۔ تاہم لگتا تھا کہ وہ ان سے بہت دُور تک دیکھ رہی ہے۔ سر کا دوپٹہ اس طرح تھا کہ آگے کے بال ہی دکھائی پڑ رہے تھے۔ کانوں میں اس کے خم دار بالے تھے اور اس نے کشمیری زرتار والا کرتہ زیب تن کر رکھا تھا۔ ان پھولوں میں گھری وہ بذاتِ خود ایک خوبصورت پھول کی طرح کھِل رہی تھی۔ اس تصویر کے نیچے لکھا تھا۔ 'جنگلی پھول'۔

اس تصویر کو دیکھ کر میری کلپنا دور کشمیر کے پہاڑی علاقوں میں جا پہنچی اور اپنے کشمیر کے سفر کے بہت سے مناظر آنکھوں کے سامنے آ گئے۔ محسوس ہوا جیسے اُس تصویر کی حسینہ کو کہیں دیکھا ہے۔ دوسری تصویر میں ایک نوجوان حسینہ تھی بہت ہی خوبصورت رنگوں میں۔ ایک حسینہ جو زندگی کے اندر قدم رکھنے سے قبل معنی خیز

تجسس سے پُر، نیم خوابیدہ آنکھوں میں اعتبار تھا اور ہونٹوں پر ہلکی مسکراہٹ۔ ماتھے کے اُوپر بالوں کو بڑی ادا سے گوندھ کر اس طرح سنوارا گیا تھا کہ وہ ریشم کی لچھی کی طرح سر پر دھرے معلوم ہوتے تھے۔ بالوں کا رنگ کالا بھونرا۔ تصویر کا عنوان تھا ــــ 'سفر کی تیاری'۔ مجھے پہلے والی تصویر اور اس تصویر میں بے حد یکسانیت دکھائی دی۔ پوشاک کے فرق کے علاوہ سب ہی کچھ یکساں تھا۔ میں نے اپنی نظر اسٹوڈیو میں رکھی مختلف تصاویر پر گھمائی۔ حالانکہ ان تصاویر کے تاثرات میں اختلاف تھا۔ انداز علیحدہ علیحدہ تھے اور ایک دوسرے سے متضاد پوشاکیں اُن کے زیبِ تن تھیں لیکن ایک بات سب میں یکساں دکھائی پڑی۔ وہ یہ کہ سبھی تصاویر ایک ہی شکل کا پیکر تھیں۔ دل کی گہرائیاں کہہ رہی تھیں کہ اس شکل سے میں متعارف ہوں۔

اپنا تجسس دور کرنے کے خیال سے میں نے کہا "معلوم ہوتا ہے ان تصاویر کا انسپریشن دینے والا محرک ایک ہی ہے" راکیش بابو نے مثبت انداز میں گردن ہلا کر کہا "ہاں یہ ایک ہی عورت کی متضاد خیالی تصاویر ہیں"۔ یہ کہتے کہتے اُن کے چہرے پر بڑا عجیب سا تاثر عود کر آیا۔ "یہ دیکھو وہ تصویر جسے قومی نمائش میں فرسٹ پرائز ملا" انہوں نے میری توجہ ایک تصویر کی طرف خاص طور سے منعطف کی۔

غیر ملکی پوشاک میں ایک حسینہ کی تصویر کشی کی گئی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں گہرائی تھی۔ ایک حسنِ مجسم خاتون متضاد زاویوں پر ایستادہ پانچ آئینوں میں اپنے حسن کی زیبائش سے محظوظ ہو رہی تھی۔ سنجیدہ وہ کہ گہرائی تک دیکھنے والی آنکھوں کو آئینوں کو منعکس حسن نے شوخ اور چنچل بنا دیا تھا۔ تعجب، یقین اور ذاتی تعارف کا نرالا امتزاج تھا اس تصویر میں! عنوان تھا ــــ "خود نمائی"

راکیش بابو اس تصویر کو پیاسی نظروں سے دیکھے جا رہے تھے۔ مجھے بھی وہ تصویر بہت پسند آئی تھی۔ بہت زیادہ پُرکشش! دوسری تصاویر کو بھی دیکھنے کے عام تجسس سے اگلی تصویر کی طرف میں بڑھا۔ پھر وہ عورت ــ نیم عریانیت میں ہلکے باریک آنچل سے اپنے اعضا کو چھپاتی۔ کتنی حیا عود کر آئی تھی اُس کے سُرخ گالوں پر کھولنے کے باوجود خواب آلود ہونے والی آنکھیں! نیچے لکھا تھا ــــ "چاند شرما گیا"۔

اس تصویر نے دل کی گہرائیوں میں مخفی بات اُبھار دی۔ ہاں میں نے اس خاتون کو دیکھا ضرور ہے! کب؟ کہاں؟ کس مرحلے پر؟ نہ جانے کیسے یکلخت اس شام کا واقعہ ذہن میں کوند گیا۔ اس پگلی سے ملاقات والی شام ــــ ہاں' وہی تو آنکھیں ہیں۔ وہی پتلی، نوکیلی، لمبی ناک اور وہی سنترے کی رسیلی قاش جیسے رس بھرے ہونٹ! راکیش اُس وقت بھی آئینوں والی تصویر کو بغور دیکھ رہے تھے۔ میں نے دھیرے سے اگلی تصویر کی طرف کھسک کر دیکھا۔ تصویر میں ایک عورت تقریباً نیم عریاں حالت میں تھی۔ شفاف آنچل بھی اعضاء پر پوری طرح نہیں پڑا تھا۔ بے بسی اور ناراضگی کا تاثر فن کار سے چھپائے نہ چھپ سکا۔ شاید وہ اُنہیں پوری طرح مٹانے میں ناکام ہو چکا تھا۔ تصویر کا عنوان تھا "فطری حسن"۔ جو اپنی بدقسمتی پر تمسخر کرتا ہوا مجھے محسوس ہوا۔

اس تصویر نے تو میرے شک کو اور بھی توانائی بخش دی۔ یقیناً وہ پگلی ہی ان تصاویر کا محرک رہی ہوگی۔ راکیش بابو کے خیالات میں رکاوٹ ڈالتے ہوئے میں نے کہا ــــ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں نے اس شکل کی عورت کو کہیں دیکھا ہے۔ کیا بتا سکیں گے آپ کہ یہ کون ہے؟

فن کار اس وقت اپنے فن کے بہت قریب تھا۔ وہ بولے "کاش میں آپ کو اس سے متعارف کرا پاتا۔"

جذبات سے مغلوب ہو کر انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور اُس تصویر کو چھوڑ کر اندر کی طرف بڑھے
کی طرف اشارہ کر کے بولے۔۔۔ "دیکھئے ان تصاویر کو۔ میرے خطوط کتنے اُلجھ گئے ہیں۔ اگر وہ میرے پا
یہ الجھی، مبہم اور ادھوری تصاویر کبھی نہ بناتا! لیکن جب سمت کا ہی تعین نہ رہے تو جہاز کا بھٹ
آخر کیوں فکر پیدا ہوا یہ خیال؟ کہاں گئی اِن تصاویر کی رُوح؟" میرا تجسس انتہا کو پہنچ چکا تھا۔
انہوں نے گہری نظر سے اس عریاں تصویر کو دیکھا اور غم آلود آواز سے بولے۔ "اِس تصویر نے اُسے مجھ سے الگ کر دیا۔" بڑا عجیب معمہ تھا۔۔۔ ایک تصویر فن کار کی اندرونی کیفیت ظاہر کرتی ہے اور وہ بھی خود اسی کی تیار کردہ۔۔۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ میں نے بہت معنی خیز انداز میں پوچھا۔ "آخر کیسے؟"

راکیش بابو مجھے تیسرے کمرے کی سب سے پہلی تصویر کے سامنے لے گئے۔ وہاں سے آئینوں والی تصاویر تک رک رک کر بڑھتے ہوئے بولے۔ "اِن تصاویر میں آپ ایک خاص تسلسل محسوس کریں گے۔ جب ادیبہ سے میرا پہلا تعارف ہوا تو وہ اس روپ میں تھی۔ ادب اور آرٹ کی دلدادہ۔۔۔ ایک کشمیری لڑکی۔ مجھے اپنے لئے ایک زندہ پورٹریٹ کی اشد ضرورت تھی اور اُس ادیبہ کو دیکھ کر مجھے محسوس ہوا کہ میری دیرینہ خواہش کی وہ تکمیل کر سکے گی۔"

وہ قدرے رک کر بولے۔ "یہ سبھی تصاویر میں نے اسے اپنے سامنے بٹھا کر بنائی ہیں۔ میں اُسے جس رُوپ میں چاہتا تصویری پیکر میں ڈھال لینے میں آزاد تھا۔ میرا اُس سے اِس معاملے میں معاہدہ ہو گیا تھا۔ اس نے اِس اقرار کو پُوری طرح نبھایا بھی۔ جو تاثر میں ابھارنا چاہتا تھا اسے بڑی ہوشیاری سے ادیبہ اپنے چہرے پر لے آتی اور میں برش کے وسیلے سے اُسے کینوس پر اتار لیتا۔۔۔۔ آئینوں والی تصویر کے تاثرات بڑے غیر واضح ہیں لیکن اس نے انہیں بڑی کوشش سے اپنی آنکھوں کے ذریعے ظاہر کیا ہے۔ اپنے ہی رُوپ پر عاشق، حیران آنکھوں کی گہرائی کو میں جتنا بھی پکڑتا اتنی ہی کشش تصویر میں آ جاتی۔ تعجب اور خوشی کے تاثرات کو میں کلی طور پر تو نہیں پکڑ پایا لیکن جتنی بھی میرے خطوط میں سکت تھی میں نے اُسے ابھارا۔ اِس تصویر کے لئے انعام کی حقدار ادیبہ ہے میں نہیں۔۔۔"

میرا اصلی تجسس تو بدستور موجود تھا۔ میں نے راکیش بابو کو ٹوکتے ہوئے کہا۔ "لیکن آخر وہ آپ سے یکلخت علیحدہ کیوں ہو گئی؟"

"علیحدہ ہو نہیں گئی وہ، درامل میں نے ہی اسے علیحدہ ہونے پر مجبور کیا۔ فن کار کی زندگی کا دامن جن دھاگوں سے بُنا جاتا ہے اُن میں بے حد گانٹھیں ہوتی ہیں۔ میری ہی ایک ضد نے، میری ہی ایک سنک نے اُسے مجھ سے چھین لیا۔۔۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔۔۔"

اُن کی آواز قدرے بھرا گئی۔ پھر جذبات پر قابو پا کر انہوں نے کہا۔۔۔ "مجھ میں ایک ضد تھی کہ میں حُسن کی انتہا تک، اُس کی اصلیت تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ مجھے لازوال حُسن کی تلاش تھی۔ لازوال حسن، جس کی تخلیق کنول کی پنکھڑیوں سے نہیں، چنگاریوں سے ہوتی ہو۔ جو انسان کے سامنے ایک بُلاوے کی صورت میں نہیں، ایک چیلنج، ایک للکار کی شکل میں آئے۔ جو اُس کے شعور کے سب تاروں کو پوری طرح جھنجھنا دے! اِس مرحلے کی تہذیب ملا کے اسے از سر نو حیات بخش دے!۔۔۔۔

"میں اِن سب پیش بندیوں کو پار کر کے حقیقت کی تہہ تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ مصنوعی ملبوسات کی اِن تہوں سے

سے تو [illegible] میری سانس گھٹ رہی تھی اور میں پاگل ہوا کی طرح امر لتاؤں کو جھنجھوڑتا ہوا جنگلوں میں بہہ جاتا [illegible] اور وہاں تک پہنچنے کے لئے واحد راستہ تھی ادیبہ۔"

میں نے اُسے ہر لباس میں، ہر لباس میں مقیّد کیا مگر لباس تو انسان نے بنائے ہیں، اس لئے ملبوسات میں مقید اس کا حسن مجھے غیر فطری، انسانی ہاتھوں سے تخلیق کیا ہوا لگا۔ مجھے انسانی مصنوعات سے چڑ سی تھی، میں حقیقت کی تلاش میں تھا اور اپنے تجربے کا واسطہ بنایا میں نے ادیبہ کو ...... میں نے کپڑوں کو کم سے کم رکھنے کے تجربات شروع کر دیئے۔ ادیبہ میرے فن کے لئے سبھی کچھ برداشت کرتی رہی۔ مگر آخر پاگل پن کو برداشت کرنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔" چاند شرما گیا ـــــ تصویر پر آکر وہ رک گئی۔ اس سے آگے بڑھنے کو وہ تیار نہ تھی۔ لیکن میں نے اسے مجبور کیا اور عریاں تصاویر تیار کرنے کی ضد نہ چھوڑی۔ 'فطری حُسن' کے لئے مناسب تاثرات لانے میں اُسے بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ وہ بار بار جھنجھلا کر اٹھ جاتی اور اپنے کمرے میں جا کر کپڑے پہن لیتی۔ وہ مجھ سے بار بار کہتی کہ ایسی تصاویر کے لئے میں اُس پر دباؤ نہ ڈالوں۔ میں نے اسے سمجھا کر کہا ـــ یہ تو انسان کا فطری روپ ہے۔ بھگوان نے اسے اِسی شکل میں تخلیق کیا ہے۔ شہوانیت نہیں، اِن تصاویر کے ذریعے میں پاکیزگی ظاہر کروں گا......"

"لیکن اِس شاہکار میں ویسا جذبہ ظاہر نہیں ہو رہا ہے ـــ" میں نے اپنا خیال ظاہر کیا۔ راکیش بابو بولے ـــ "ہاں، آپ کی بات درست ہے۔ اور میں اِس بات کی حقیقت کو تب سمجھ پایا جب وہ بہت دور ہو چکی تھی۔"

ایک گہرا سانس لے کر راکیش بابو گویا ہوئے ـــ آخر یہ تصویر بن کر تیار ہوئی، اور میں نے اسے ایک نمائش میں رکھا۔ میری حیرت کی حد نہ رہی، جب میں نے یہ دیکھا کہ میری تصویروں میں لوگ سب سے زیادہ وقت اِسی تصویر کو دیکھنے میں لگاتے ہیں۔ نمائش کے آخری دن ایک سیٹھ جی نے اُس تصویر کو خریدنے کی آرزو ظاہر کی۔ وہ اِس کے لئے دو ہزار روپے دینے کو تیار تھے۔ میں نے فخر اور خوشی میں سرشار ہو کر سبھی کچھ ادیبہ کو سُنایا۔ جس تصویر کو وہ پسند نہیں کر رہی تھی اسے سیٹھ جی دو ہزار میں خریدنے کو تیار تھے۔

راکیش بابو اس وقت گھٹن سے پُر ہو گئے تھے اور ان کی آواز میں بڑی چبھن محسوس ہو رہی تھی۔ پھر بھی اُنہوں نے اپنی بات جاری رکھی۔" ادیبہ اس خبر سے قطعاً محظوظ نہیں ہوئی، بلکہ اس نے مجھ پر اپنا غصّہ انڈیل دیا کہ آخر کیوں میں نے اِس تصویر کی نمائش کی۔ لیکن اس کی بات کی پرواہ کئے بغیر میں نے سیٹھ جی کو وہ تصویر دو ہزار میں دینے کا وعدہ کر لیا۔ بس اس بات نے ادیبہ کا ذہنی توازن بگاڑ دیا۔ وہ اس دن صبح سے رات تک مجھ پر بگڑتی رہی۔ وہ کہتی۔ "جسے آپ فطری حُسن کہتے ہیں وہ سیٹھ جی کی ترستی تڑپتی نظروں کی ہوس کو سکون بخشنے کے لئے اُن کے شب خوابی کے کمرے میں لگے گا .... عورت کی عریانیت آپ کے فن کی بلندی ہے کیا خوب! عریانیت، بے شرمی اور شوخی یہی تو بھوکے بھیڑیوں کو چاہیئے۔ میں اُن کی پُر ہوس آنکھوں کی تسکین کروں گی اور آپ ہیں کہ اِسے انسان کا حقیقی پرتو بتلاتے ہیں۔"....

"ادیبہ کے اصرار پر تصویر کو کچھ دن اور نہ بیچنے کے لئے میں تیار ہو گیا۔ سیٹھ جی اُس تصویر کے لئے بہت بے چینی دکھا رہے تھے۔ میری انا کانی کا مطلب اُنہوں نے یہ لگایا کہ میں کچھ زیادہ چاہتا ہوں۔ وہ اس کے لئے پانچ ہزار تک دینے کو تیار ہو گئے......

ادیبہ کی یہ حرکت ہی تھی کہ وہ کسی بھی تصویر کے لئے پوز دے دیتی تھی۔ ہر وقت اس کے چہرے پر آوارگی اور بے یقینی چھائی رہتی تھی۔ بار بار وہ الٹی سیدھی حرکات کرتی۔ اس نے جانے کتنی بار مجھ سے کہا کہ کیا عریانی فن ہے؟ عورت کی عریانیت میں کون سا ازلی حسن آپ پر ظاہر ہوتا ہے؟

" اسے سمجھانے کی میری سبھی کوششیں بیکار گئیں۔ ایک دن وہ کلی اسٹیج پہ کسی طرح عریاں ہو کر میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اس کے چہرے پر ذرا بھی شرم و حجاب نہ تھا۔ اس نے مجھ سے بڑے ہی عجیب انداز میں کہا ــــ اگر عریانیت ہی انسان کا اصلی متبرک پرتو ہے تو اسے ہمیشہ ہی کے لئے عریاں رہنا چاہیئے۔ میری حالت بہت نازک ہو گئی۔ میں نے ادیبہ سے اپنے کمرے میں جا کر کپڑے پہننے کو کہا لیکن وہ تیار نہ ہوئی۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ زور زور سے بولنے لگی گویا پاگل ہو گئی ہو۔ میں چیخ پڑا ــــ ادیبہ یہ پاگل پن چھوڑو اور جا کر کپڑے پہنو ......

" ادیبہ کی بھدی ہنسی کمرے میں گونج گئی۔ وہ بولی ــــ اب اسے پاگل پن نہ کہیئے۔ یہی تو آپ کی خواہش تھی میری عریانیت ہی آپ کو پسند ہے نا! تو اب آپ یا سیٹھ جی ہی نہیں ساری دنیا میرے عریاں روپ کو دیکھے ......"

" ادیبہ پاگل ہو گئی اور شہر میں ننگی گھومنے لگی۔ میں اسے دوبارہ پہلی حالت میں نہ لا سکا! میرا مشاہدہ جیسے مجھ پر ہی طنز کر اٹھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ننگا ہو جانا بہت آسان ہے مگر عریانیت کے تئیں بے تعلقی ظاہر کرنا بہت مشکل ہے۔ ہم سب کے اندر جو ایک جانور مقید ہے اس کی زنجیریں تو ڈھیلی کی جا سکتی ہیں لیکن اسے آزاد نہیں کیا جا سکتا۔ بے تعلقی کے خوف سے انسان کے پر جھلس جاتے ہیں اور ضرورت سے زیادہ آزادی انسان کو گمراہ کر دیتی ہے۔ اس نے ادیبہ سے لیے، میرے فن کے لئے سبھی کچھ برداشت کیا لیکن فن کے نام پر ہوس ناک گندے پاگل پن کو برداشت نہ کر سکی۔ میں نے اپنے جوش اور ولولے کا گلا گھونٹ ڈالا تھا......

" اب جو کوئی بھی ادیبہ کے بارے میں بتاتا تو میں پریشان ہو جاتا۔ مجھے محسوس ہوتا کہ میں بھی پاگل ہو جاؤں گا۔ اس کی یہ حالت مجھ سے دیکھی نہ گئی اور میں شہر چھوڑ کر الٰہ آباد آ گیا۔ سنا ہے اب اس کی حالت بہت افسوسناک ہے .... لیکن میں ہی اب کون سا ٹھیک ہوں۔ میرے اندر کا فن کار مر گیا ہے اور میرے برش کے رنگ بکھر گئے ہیں۔"

میرے منہ سے یکلخت نکل گیا ــــ اس تصویر کا عنوان 'فطری حسن' کے بجائے 'فن کی موت' ہونا چاہیئے ــــ

راکیش بابو وکیلوں جیسی آواز میں بولے ــــ "نہیں، یہ ٹھیک نہیں۔ فن کبھی نہیں مرا کرتا۔"

میرا جواب تھا: "لیکن اس کو قتل تو کیا جا سکتا ہے۔"

راکیش بابو نے شاید اس موضوع کو ختم کر دینے کے پیش نظر کہا: "آپ تھک گئے ہوں گے۔ اس بحث میں کیا رکھا ہے۔ آئیے ایک ایک کپ کافی پی لیں۔" میں نے دیکھا تھکان مجھے نہیں راکیش بابو کو ہو گئی ہے ــــ تھکان جسمانی اور روحانی۔ ــ

الٰہ آباد سے واپس آیا تو چھایا اسٹیشن پر مجھے لینے کے لئے آئی ہوئی تھی۔ اس نے نائلون زیب تن کر رکھا تھا۔ اونچا، چست، لمبی تراش والا بلاؤز ــــ باہیں بالکل عریاں۔ جسم کا آدھے سے زائد حصہ ننگا سا تھا اور جو اعضاء کپڑوں سے ڈھکے ہوئے تھے وہ بھی شفاف نائلون میں جھلک رہے تھے۔

آج چھایا کو اس طرح کے ملبوس میں دیکھ کر پہلی بار مجھے برا محسوس ہوا۔ میں نے اسٹیشن سے فلیٹ تک پہنچنے میں بہت ہی جلدی کی اور فلیٹ پہنچتے ہی چھایا سے ان کپڑوں کو تبدیل کرنے کے لئے کہا۔ مجھے خوف محسوس ہو رہا تھا کہ کہیں میری چھایا بھی [illegible] پاگل نہ ہو جائے۔

غزلیں

راہی قریشی

سرِ جولس پہ کچھ رنگ حِنا پھیلاؤ
شب کی تنہائی میں خوشبوئے قبا پھیلاؤ

دن کے کہرام میں بکھرے ہیں بہت خواب گر
رات خاموش ہے یادوں کی رِدا پھیلاؤ

کچھ تو ٹوٹے غمِ تنہائی کا بے درد سکوت
اِس اندھیرے میں کہیں نورِ صدا پھیلاؤ

ہر مُناجات تو بکھری ہے خلاء میں، لیکن
دِل کی تسکیں کے لئے دستِ دعا پھیلاؤ

شہرِ بیداد میں ہے سر پہ ستم کا سُورج
اب یہاں سایۂ آوازِ دعا، پھیلاؤ

ایک ہنگامۂ فریاد ہے قریۂ قریۂ!
یہ جو تھم جائے تو پھر اپنی صدا پھیلاؤ

شہر کے نام پہ بے رُوح مکینوں کیلئے
دُور تک یُوں نہ اک آباد خلاء پھیلاؤ

کوئی سُنتا نہیں منزل کی صدائیں راہی
نیند کے دشت میں آوازِ دِرا پھیلاؤ

آذر بارہ بنکوی

اِن رشک کے ماروں کی دیکھے کوئی بے دردی
جس راہ سے ہم گذرے دیوار کھڑی کردی

پہلے کی طرح اب بھی ہم لوگ ہیں فاقہ کش
آنکھوں میں وہی حلقے، چہروں پہ وہی زردی

ہر نقش قدم میرا تھا بیش بہا لیکن
میرے ہی رفیقوں نے قیمت مری کم کردی

انسان کو منزل تک پہونچا نہ سکی یارو
برسوں کی عرق ریزی، صدیوں کی جہاں گردی

اب کون سی مجبوری حائل ہے خدا جانے
کیوں اہلِ کرم اب بھی کرتے نہیں ہمدردی؟

مُفلس سے ہیں وابستہ زردار کی اُمّیدیں
دولت نے دماغوں میں اسطرح ہوس بھردی

خود میں نے رہائی کی تدبیر نہ کی آذر
اور تہمتِ ناکامی تقدیر کے سر دھردی

ڈاکٹر اکبر حیدری

مرزا یوسف علی خاں عزیزؔ شاگردِ غالبؔ

کا انتخابِ کلام

مرزا یوسف علی خاں نام عزیزؔ تخلص، سراج الشعرا سلطان الذاکرین خطاب، شاگرد مرزا غالب۔ عزیزؔ کی ولادت بنارس میں ہوئی۔ سنہ ولادت معلوم نہ ہو سکا۔ وہ مرزا نجف علی خاں المتخلص بہ جنوںؔ کے صاحبزادے اور مرزا محمد علی خان دیوانہؔ کے پوتے تھے۔ جناب مالک رام صاحب نے عزیزؔ، جنوںؔ اور دیوانہؔ کے نام سے پہلے لفظ "میرزا" لکھا ہے[1] جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سیّد تھے۔ اس کی تصدیق اور کسی ذریعے سے نہیں ہوتی ہے۔ "میرزا" سیّد اور "مرزا" مغل کو کہتے ہیں۔ راقم الحروف کے پیش نظر شیفتہؔ کے گلشنِ بیخار کا ایک قدیم قلمی نسخہ سنہ ۱۲۶۱ ہجری کا مکتوبہ ہے[7]۔ اس میں جنوںؔ اور دیوانہؔ کے نام سے پہلے "مرزا" درج ہے جو اُن کے مغل ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ گلشن ہمیشہ بہار[2]، طبقات شعرائے ہند[3]، اردوئے معلّیٰ[4]، عودِ ہندی[5] اور سخنِ شعرا[6] میں بھی "مرزا" لکھا ہوا ہے۔

عزیزؔ کے دادا مرزا محمد علی خان برٹش گورنمنٹ کی طرف سے ممتاز عہدوں پر فائز تھے۔ جب روشن الدولہ گولبرگ ناظر دہلی کے ساتھ بنارس سے دلّی آئے تو شیفتہؔ سے بھی ملاقات کی تھی اور ان کے ہمراہ ایک دعوت میں بھی شریک ہوئے تھے[8]۔ نصر اللہ خاں خویشگی اپنے تذکرے میں اُن کا حال اِن الفاظ میں لکھتے ہیں:

"دیوانہؔ تخلص۔ مرزا محمد علی خاں نام۔ از ثقات بنارس است۔ بمراتب علیائے انگریزی سرافراز ماندہ بعہد نظارت روشن الدولہ گولبرگ برجہان آباد می بود بہ عہدۂ تحصیلداری محالات کھیر و چنڈوسی متعلقہ ضلع علیگڈھ خوش گذران بود۔ حالا از حالش مطلع نیستم کہ کجاست و چونست۔"

مرزا عزیزؔ کے والد شیفتہؔ کے دوستوں میں سے تھے۔ گلشن بیخار میں اُن کا حال یوں مندرج ہے:

"جنوںؔ تخلص، مرزا نجف علی خاں خلف مرزا محمد علی خاں دیوانہؔ تخلص است کہ پدر و پسر ہر دو از بنارس اند۔ مرزا محمد علی خاں بعید آن را ہنگامیکہ وارد دہلی بود بسررشتہ داری بورڈ مامور۔ با من ملاقات ہا رو دادہ۔ علاقہ تحصیلداری و سررشتہ داری وغیرہ کہ مناصب جلیلہ سرکار انگریزیست بیشتر با وے ماندہ[9]۔"

---

۱ تلامذۂ غالب ص ۲۲۷۔ ۲ تذکرۂ گلشن ہمیشہ بہار ص ۱۰۵، ص ۱۴۱ نصر اللہ خاں خویشگی

۳ طبقات شعرائے ہند مولوی کریم الدین ۴ اردوئے معلّیٰ ص ۱۵۶ مطبع مصطفائی دہلی ۱۸۹۹ء ۵ عودِ ہندی ص ۱۰۰

۶ سخنِ شعرا ص ۳۲۹ مولوی عبد الغفور خاں۔ ۷ مخطوطہ گلشنِ بیخار مکتوبہ ۱۲۶۱ھ

۸ گلشن ہمیشہ بہار ص ۱۴۱۔ ۹ مخطوطہ گلشنِ بیخار۔

شاعر پیشہ

عزیز کو شعر و شاعری ورثے میں ملی تھی۔[1] اُن کے والد اور دادا بھی شاعر تھے اور تذکروں میں اِن دونوں بزرگوں کا کلام درج ہے۔

جنتوں بنارس چھوڑ کے علی گڑھ میں آ رہے تھے اور وہاں کچھ جائداد بھی پیدا کر لی تھی۔ وہ مدتوں دہلی کے اطراف میں سررشتہ داری اور تحصیلداری کے عہدوں پر مقرر رہے۔ جب جنوری ۱۸۵۴ء میں اُن کا انتقال ہو گیا تو عزیز ان کے وارث ہوئے۔ لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ اپنی ناتجربہ کاری یا کسی اور وجہ سے یہ جائداد کھو بیٹھے اور بہت جلد انہیں روزی کی فکر لاحق ہو گئی۔ آخر دہلی پہنچے اور یہاں کوشش کرنے لگے۔[2]

بقول نساخ عزیز غدر کے بعد دہلی کے اسکول میں معلم تھے اور اسی سے دلّی میں ملاقات ہوئی تھی۔[3] مالک رام کہتے ہیں کہ انہیں بلّی ماران کے ایک ہندو رئیس کے لڑکے کو پڑھانے کا شغل بھی رہا تھا۔[4] اِس سلسلے میں مرزا غالب مرزا حاتم علی مہر کو لکھتے ہیں۔

"مرزا یوسف علی خاں آٹھ دس مہینے سے مع عیال و اطفال اسی شہر میں مقیم ہیں۔ ایک ہندو امیر کے گھر پر مکتب کا سا طور کر لیا ہے۔ میرے مسکن کے پاس ایک مکان کرایہ کو لے لیا ہے۔ اس میں رہتے ہیں۔ اگر اُن کو خط بھیجو تو میرے مکان کے پتے پر لکھ دینا۔"[5]

قیام دہلی میں عزیز مرزا غالب کے حلقۂ تلامذہ میں آ گئے تھے۔ انہیں مرثیہ گوئی کا بڑا شوق تھا۔ انیس و دبیر کے مرثیوں میں اکثر جگہ جا و بیجا غلطیاں نکالی تھیں۔ عرصۂ دراز تک حضرت غالب کی خدمت میں رہے۔ انہیں کے توسط سے قلعے میں رسائی ہوئی۔ احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خاں بہادر نے بہادر شاہ ظفر سے بہ نذر مرثیہ و قصیدہ خلعت چار پارچہ مع گوشوارہ و خطاب "سراج الشعراء و سلطان الذاکرین" دلوایا اور تیس روپیے ماہانہ وظیفہ مقرر ہو گیا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جب وظیفہ بند ہو گیا تو محض مُدرّسی ذریعۂ معاش رہ گئی۔[6]

عزیز واقعۂ غدر کے بعد پراگندہ حال رہے۔ بوجہ مفلسی مرزا غالب نے بھی اُن کا کچھ مہینہ مقرر کیا تھا۔ اِس سلسلے میں غالب مولوی مفتی حبیب اللہ خاں ذکا کے نام دوشنبہ ۱۶ شعبان ۱۲۸۳ ہجری مطابق ۲۴ نومبر ۱۸۶۶ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

یوسف علی خاں شریف و عالی خاندان ہیں۔ بادشاہ دہلی کی سرکار سے ۳۰ روپے مہینہ پاتے تھے۔ جہاں سلطنت گئی وہاں تنخواہ بھی گئی۔ شاعر ہیں۔ ریختہ کہتے ہیں۔ ہوس پیشہ ہیں مضطر ہیں۔ ہر مدعا کے حصول کو آسان سمجھتے ہیں۔ علم اِسی قدر ہے کہ لکھ پڑھ لیتے ہیں۔ ان کا باپ میرا دوست تھا۔ میں ان کو بجائے فرزند سمجھتا ہوں۔ بقدر اپنی دستگاہ کے کچھ مہینہ مقرر کر دیا ہے مگر بہ سبب کثرت عیال وہ

---

[1] تلامذۂ غالب ص ۲۳۷ ۔ [2] سخن شعرا ۳۲۹ ۔ [3] تلامذۂ غالب ص ۲۳۷ ۔
[4] عودِ ہندی ص ۱۸۰
[5] خمخانۂ جاوید ص ۵۸۷ ۔ جلد پنجم۔
[6] تلامذۂ غالب ۔ ص ۲۳۷

ان کو حق نہیں، تم ان کی درخواست کے جواب سے قطع نظر نہ کرو گے تو کیا کرو گے۔"[1]

مرزا عزیز اور مرزا غالب کے درمیان بڑے خوشگوار تعلقات تھے اور دونوں کے مابین خط و کتابت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ ایک مرتبہ غدر کے بعد انھوں نے مرزا غالب سے کلام کی فرمائش کی تھی۔ اس کے جواب میں مرزا غالب کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"بھائی تم کیا فرماتے ہو۔ جان بوجھ کر انجان بنے جاتے ہو۔ واقعی غدر میں میرا گھر نہیں لٹا۔ مگر میرا کلام میرے پاس کب تھا کہ نہ لٹتا۔ ضیاء الدین خاں صاحب اور تاظر حسین میرزا صاحب ہندی اور فارسی نظم اور نثر کے مسودات مجھ سے لیکر اپنے پاس جمع کر لیا کرتے تھے۔ سو ان دونوں گھروں پہ جھاڑو پھر گئی۔ نہ کتاب رہی نہ اسباب رہا۔ پھر اب میں اپنا کلام کہاں سے لاؤں۔ ہاں تم کو اطلاع دیتا ہوں کہ مئی کی گیارھویں ۱۸۵۷ء سے جولائی کی اکتیسویں ۱۸۵۸ء تک پندرہ مہینے کا حال میں نے لکھا ہے اور نثر فارسی زبان قدیم میں ہے۔ کہ جس میں کوئی لفظ عربی نہ آئے اور ایک قصیدہ فارسی متعارف عربی اور فارسی ملی ہوئی زبان میں حضرت فلک رفعت جناب ملکہ معظمہ انگلستان کی ستائش میں اس نثر کے ساتھ شامل ہے۔ یہ کتاب مطبع مفید خلائق آگرے میں منشی نبی بخش صاحب حقیر اور مرزا حاتم علی بیگ مہر اور منشی ہرگوپال تفتہ کے اہتمام میں چھاپی گئی ہے۔ فی الحال مجموعہ میری نظم و نثر کا اس کے سوا اور کہیں نہیں۔ اگر جناب منشی امیر علی خان صاحب میرے کلام کے مشتاق ہیں تو نسخہ موسوم بہ دستنبو مطبع مفید خلائق سے منگالیں اور ملاحظہ فرمائیں۔"[2]

مرزا غالب ایک اور خط اصلاحِ سخن کے سلسلے میں عزیز کو لکھتے ہیں:

"میاں کل زین العابدین خاں عارف کا خط مع اشعار کے شکستہ دار لفافے کے اندر رکھ کر بسبیل ڈاک بھجوا دیا ہے۔ آج صبح کو تمہارا خط آیا۔ دوپہر کو میں نے جواب لکھا۔ تیسرے پہر کو روانہ کیا۔ موتیوں کا پھیکا البتہ بہت مناسب ہے۔ خیر موتیوں کا نوالہ بھی سہی۔ حافظ کے شعر کی حقیقت جب سمجھو گے جب قواعد مقررۂ اہلِ سخن دریافت کر لو گے۔ قاعدہ یہ ہے کہ اگر مطلع میں یا اور اشعار میں قصیدہ کی احتیاج آ پڑے اور اس کی اطلاع ایک شعر میں کر دیں تو وہ عیب جاتا رہتا ہے جیسا کہ استاد کا قطعہ ہے۔ اس میں زلیو و غیر لیو و کالیو قافیہ ہے اور شعر اخیر قطعہ کا یہ ہے۔ شعر

غلط کردم دریں معنی کہ گفتم ز نخدان نگار خویش راسیو

حالانکہ صحیح سیب ہے بیائے موحدہ۔ شاعر نے اطلاع دی کہ میں نے غلط کیا جو سیو لکھا۔ اسی طرح حافظ فرماتا ہے۔ مصرعہ

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

حاصل اس کا یہ کہ دیکھو کتنا تفاوت ہے۔ ایک جگہ حرف روی ساکن اور ایک جگہ متحرک، مگر یہاں ابھی معترض کو گنجائش ہے کہ وہ یہ کہے کہ ہاں تفاوت کو ہم بھی جانتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ تفاوت تم نے کیوں لکھا

---

[1] اردوئے معلیٰ ص ۲۲۷۔ حصہ اوّل۔ [2] اردوئے معلیٰ ص ۱۸۹

اس کا جواب پہلا مصرعہ ہے۔ مصرعہ

صلاح کار کجا و منِ خراب کجا

یعنی حافظ فرماتا ہے کہ "میں عاشق زار و دیوانہ ہوں۔ صلاح کار سے مجھ کو کیا کام"۔ پورب کے ملک میں جہاں تک چلے جاؤ گے تذکیر و تانیث کا جھگڑا بہت پاؤ گے۔ سانس میرے نزدیک مذکر ہے لیکن اگر کوئی مؤنث بولے گا تو میں اس کو منع نہیں کر سکتا خود سانس کو مؤنث نہ کہوں گا۔ سیف کو عدو کش اور کمند کو عدو بند۔ سیف عدو بند نہیں ہو سکتی۔ تم کو کہتا ہوں کہ تم تلوار کو عدو بند نہ کہو۔ کوئی اور اگر کہے تو اس سے نہ لڑو۔ زلف کو شب رنگ اور شب گون کہتے ہیں۔ شب گیر زلف کی صفت ہرگز نہیں ہو سکتی۔ شبگیر اس سفر کو کہتے ہیں کہ پہر چھ گھڑی رات رہے چل دیں۔ نالۂ شبگیر آہ و زاریٔ آخر شب کو کہتے ہیں۔ زلف شبگیر نہ مسموع نہ معقول۔ سخن کا قافیہ بَن بھی درست ہے اور تن بھی جائز ہے۔ یعنی سخن کا دوسرا حرف مضموم بھی ہے اور مفتوح بھی ہے اور اس پر متقدمین اور متاخرین اور اہل ایران اور اہل ہند کو اتفاق ہے۔ قبۂ خشخاش پوست کے ڈوڈے کو کہتے ہیں۔ اس میں کچھ تامل نہ چاہیئے۔ تم اپنے تکمیل کی فکر میں رہا کرو۔ زنہار کسی پر اعتراض نہ کیا کرو۔ والدعا۔ [1]

عزیز آخر عمر میں تلاش معاش کے سلسلے میں بھوپال گئے اور وہیں ۱۲۸۹ھ مطابق ۱۸۷۲ء میں انتقال کیا۔ شاہ بہاء الدین شبیر نے تاریخ کہی ؎

جب عزیزِ سخن سرا کا شبیر — باغِ فردوس میں مقام ہوا
اہلِ معنی کے لب پہ مثلِ جرس — آہ و نالوں کا اژدحام ہوا
شہرۂ مرگ اوستادِ زماں — ہند سے تا بہ روم و شام ہوا
روئے صبحِ الم سے ہے فق فق (کذا) رنگ شب کا سیاہ فام ہوا
یہی صدمہ جہاں میں حسرتِ دل — باعثِ رنجِ خاص و عام ہوا
فکرِ تاریخ جب ہوئی مجھ کو — سر بزانو برائے نام ہوا

ناگہاں غیب سے صدا آئی
آج کسبِ سخن تمام ہوا

۱۲۸۹ھ

ایضاً ؎

چوں عزیزِ سخنورِ کامل، — در جناں شد ز عالمِ فانی
کلک تاریخ رحلتش بہ نوشت — شاعرِ بے عدیل کاشانی

۱۲۸۹ ہجری

ایضاً ؎

عزیز یوسفِ مصرِ معانی — بہ جنّت نقل کرد از دارِ دنیا
شبیر از منِ سنینِ رحلتش گفت — امام شاعراں تاجِ المعلّے [2]

۱۲۸۹ ہجری

---

[1] عودِ ہندی ص ۱۰۱ مطبوعہ الہ آباد۔ [2] خمخانۂ جاوید ص ۵۸۷ جلد پنجم۔ [3] کنز تواریخ قلمی بحوالہ اردوئے معلیٰ غالب نمبر کراچی۔

عزیز بڑے پُرگو تھے۔ اُن کے شاگردوں میں سیف الحق ادیب وہ شاگرد تھے کہ جن کو فخرِ استاد کہا جائے تو بجا ہے۔ غزل خوانی کا ڈھنگ بہت اچھا تھا۔ کلام میں رنگینی تھی۔[1]

افسوس ہے کہ اُن کا کلام نہیں ملتا ہے۔ گلستانِ سخن[2]، گلستانِ بے خزاں[3]، سخن شعرا[4] اور خمخانۂ جاوید[5] میں اُن کے صرف ۹ شعر درج ہیں۔ جناب مالک رام نے بھی یہی اشعار نقل کئے ہیں۔[6] راقم الحروف کو اودھ اخبار لکھنؤ کے چند شمارے دستیاب ہوئے ہیں ان میں ۱۲ اگست ۱۸۶۳ء مطابق ۲۶ صفر ۱۲۸۰ ہجری روز چہارشنبہ نمبر ۳۲ جلد ۵ کا شمارہ بھی شامل ہے۔ اس میں صفحہ ۵۶۴ پر مرزا یوسف علی خان عزیز کی ایک طویل نظم "قطعہ وبائیہ" کے عنوان سے درج ہے چونکہ اُن کا کلام عنقا کے برابر ہے اس لئے ذیل میں مالک اخبار منشی نولکشور کی نثری عبارت کے ساتھ یہ نظم درج کی جاتی ہے۔

"قطعہ وبائیہ"

"طبع زاد سراج الشعراء مرزا یوسف علی خان عزیز تخلص شاگرد نجم الدولہ اسد اللہ خان غالب دہلوی بذریعۂ نامۂ مشفقی مولوی محمد حسین صاحب مہتمم مطبع مصطفائی واقع دہلی بغرض انطباع پہنچا لفریحاً درج ہے۔"

ہے عجب مرگِ مفاجات آج کل — ٹوٹتا دم بھر میں ہے تارِ نفس
مرغِ رُوحِ اہلِ عالم آن میں — چھوڑتا ہے جسمِ خاکی کا قفس
کیا پس و پیش اس سخن کی فہم میں — ایک سے ہے ایک گویا پیش و پس
رشتۂ جاں تن میں جل جاتا ہے یوں — جس طرح آتش جلا دیتی ہے خس
جو کہ ہیں اس عصر میں اہلِ دول — کرتے ہیں فریاد مانندِ جرس
سچ کہ ان سے چھوٹتا ہے مال و زر — کیوں نہ چاہیں زیست اپنی ہر برس
اور جو ہیں مفلس و مظلوم و خوار — موت ہی ہے زندگانی اُن کو بس
مار مرنا زہر کھانا ڈوبنا — ہے حرام اِس پر نہیں ہے دسترس
بس یہ عالم خوب ہے ان کے لئے — ایک گھر میں فوت ہوں گر آٹھ دس
کوئی سمجھا بھی کہ کیا ہے یہ کلام — لو سنو ہے شرح اس کی ملتمس
ہے سے ہمت یٰ سے یادِ خلق ہے — ضاد سے ضربت ہے پھر ہے سی ہوس (ہیضہ)
ہمت اس کی یہ کہ ہر جا ہے رسا — یادِ خلق ایسی کہ آوے ہر برس
ضربت اُس کی یہ کہ مارے خلق کو — اور ہوس ایسی کہ پھر بھی ہو ہوس
دل کرے مالش کہ استفراغ ہو — یہ نہیں وہ قے کہ ہو کھا کر مگس
دست سے انساں کو کیوں ہو پیچ و تاب — یہ نہیں پیچش کہ ہو تکلیف بس
وہ طبیب آتا ہے اس کو دیکھنے — لطفِ حق سے ہاتھ میں ہے جس کے جس

---

[1] خمخانۂ جاوید ص ۵۸۸ جلد پنجم۔ [2] گلستانِ سخن ص ۳۶۶ مرزا قادر بخش صابر ۱۲۷۱ھ۔ [3] گلستانِ بے خزاں ص ۱۶۹۔ قطب الدین ۱۲۶۵ھ۔ [4] سخن شعرا ص ۳۲۹۔ نساخ۔ [5] خمخانۂ جاوید ص ۵۸۸۔ [6] تلامذۂ غالب ص ۲۳۸

منفعت ہے اس سے ہر عطار کو — زر لیا جاتا ہے دے کر خار و خس
فائدہ ہے اس سے ہر بزاز کو — تھان گر دیں ہوں تو بیچے دن کے دس
استفادہ اس سے ہے غسّال کو — غسل دے کر لے وہ جتنی ہو ہوس
فیض یاب اس کے سبب سے گورکن — لے لیا کھودی اگر قبر ایک نفس
حاصل اس سے ہے بہت معمار کو — لے کے گنبد پر چڑھاتا ہے کلس
چال اس کی دھر میں مثلِ صبا — دوڑ اس کی خلق میں شکلِ فرس
گرچہ ہو برسات کے موسم میں پر — اشک کے باراں سے کہتا ہے برس
مارتا ہے اس طرح تیرِ قضا — نیزہ مارے جس طرح ابن انس[1]
دبتی ہے اس دیو سے رستم کی رگ — کھینچتی ہے اس گیو سے عالم کی نس
پھر اسے تکلیف دینا چھو نہ جائے — جس کو یہ اچھی طرح کر جائے مس
گر کسی انگریز سے پوچھوں اسے — یا اگزانڈر ہو یا ہو سانڈرس
معرفت میں اس کی جرأت کیا کہے — لاکھ بار اپنی زباں سے وہ کہ بس
ہے قضا کے گھر کا جس کو اختیار — ہے یہ بازارِ اجل کا ہے عسس
قلزم ایسا ہے کہ لیتا ہے ڈبو یا — شعلہ ایسا ہے کہ دیتا ہے جھلس
کافر ایسا ہے کہ گر بہرِ ثواب — کھائے کوئی ایک ذرا دالِ عدس
مار ڈالے اس کو فوراً بے دریغ — توڑ ڈالے اس کا بس تارِ نفس
ہے یہ دریا جسمِ خلق اس کے سبب — صاف ہے خار و خسِ رُودار لس
ایک عالم میں بندھے اس کی ہوا — لکھنؤ دلّی بنارس ہاترس
یوں در آتا ہے یہ جسمِ خلق میں — جیسے اترے پاؤں میں تو سن کے رس
چوٹ گر ہو یہ تو ہو اس کا علاج — پیس کر کوئی لگا دے موچرس
کشتہ ہو جاتا ہے نیلا اس کا یوں — جیسے جاتا ہے کسی کو سانپ ڈس
مار کر کہتا ہے مضطر دل کو یہ — تب میں جانوں اپنی جا سے اب اوکس
قصہ کوتہ ہے یہ مشہورِ جہاں — چوں ازیں آگہ نباشد ہیچ کس
کس کی فرمائش میں یہ بیتیں عزیز — کون ہے یاں رمزدان و نکتہ رس
میم و حا و میم و دال و حا و سین — یا د نوں سے اسمِ پاک اسکا ہے بس
خان والا شان والا منزلت — صاحب روشن دل و روشن نفس

دیکھئے گا دے صلہ اس کا مجھے
دولت و زر پہ ہے اس کو دسترس

---

[1] سنان ابن انس۔ فوج یزید کا ایک سپاہی جس نے امام حسینؑ کو نیزہ مارا تھا۔ (حیدری)

رحمٰن جامی

نام کا فتنہ

تمہاری ہماری محبت کا فتنہ
(اِسے رہنماؤں نے فتنہ کہا تھا) اُٹھا تو
قیامت کا اک سا سماں تھا

شریفوں کو اپنی شرافت کی بگڑی سنبھالنی تھی۔
رذیلوں کو اپنی رذالت پہ خود ہی ہنسی آ رہی تھی
کئی ٹھیکیداروں نے مذہب کی اپنے دہائی بھی دی تھی
ہر سمت تہذیب و اخلاق کا واسطہ دینے والوں میں ہلچل مچی تھی
بالآخر
تمہاری ہماری محبت کا فتنہ
فقط نام کے فرق سے مٹ گیا تھا۔

میں اب تک یہی سوچتا ہوں
اگر ہم پُرانے ہی ناموں سے ملتے
تو کیا فرق پڑتا
(مگر ان میں صدیوں کا اک فاصلہ تھا—
زمانے کو ہم سے یہ ابر گلہ تھا)
اگرچہ کہ ہم آج تک بھی وہی ہیں
وہی جسم ہیں اور وہی جذبہ جاں سپاسی
نہ تم میں کوئی فرق آیا نہ مجھ میں
فقط نام بدلے ہوئے ہیں ہمارے
کہ تم سشیلا سے ہو گئی ہو فلورا
گرداوردے سے ہو گیا ہوں میں ڈیوڈ

ذوقی نعیم

چوبیس گھنٹے

کھول دیتی ہے کالے دھاگوں کو
کھینچ لیتی ہے مجھ کو بستر سے
چھوڑ دیتی ہے راہ میں تنہا
طنز کرتی ہے مسکراتی ہے۔
بیٹا یہ کہہ کے بھاگ جاتی ہے۔
جاؤ!
اپنی دکان تم کھولو
باٹ دا بٹ ناپ تول کر لو
دوپہر
پینٹ، شرٹ، بنیائن، برقعے، موزے، رومال کی تہہ میں
دب کے رہ جاتی ہے نہ جانے کدھر
اس کو کس زاویے سے میں دیکھوں
کیا کروں کس کی کس کی تہہ کھولوں
شام
منہ چھٹ ہاجنوں کو لے جب بھی میری دکان تک آئی۔
کیش کے بکس ہی سے ٹکرائی
روک کر اس سے بات کر نہ سکا
ذہن میں کوئی رنگ بھر نہ سکا
رات سے تھوڑی آس مجھ کو تھی
وہ بھی کم بخت سر پھری نکلی
اونچے اونچے پہاڑ پر کیسے مسکراتے ہیں کھل کے برف کے پھول
کیسا جھرنوں کا راگ ہوتا ہے۔
کیسے جچتی ہے گھاٹ پہ کائی
کتنی گہرائی ہے سمندر میں
سوچنے بھی مجھے نہیں دیتی
باندھ لیتی ہے کالے دھاگوں سے
پھینک دیتی ہے مجھ کو بستر پہ



سیّد اشرف عابد

دوسری عورت

میں اپنے ہاتھ دھولینا چاہتی ہوں۔

مجھے صاف و شفّاف پانی چاہیے۔ صابن کی ایک ٹکیہ بھی ۔ کھونٹی پر لٹکا ہوا تولیہ مجھے نہیں چاہیے ۔ کیا دوسرا تولیہ ابھی تک دُھل کر نہیں آیا ۔ یہ لوگ کس قدر لا پرَدا ہیں ۔ ایک تولیہ تک نہیں دھلا سکتے ۔ ارے ! مجھے ہاتھ دھونے ہیں ۔ میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ دُودھیا رنگ کا صاف و شفّاف دوپٹہ الماری میں رکھ دیا ہے ۔ اُس پاک و صاف دوپٹے میں اپنا جسم کس کے بھر لینا ہے ۔ اِسی لئے مجھے اپنے ہاتھ دھولینے ہیں۔ دوپٹہ مَیلا ہوگیا تو کیا ہوگا ۔ ؟

میں بہت خوبصورت ہوں ۔ گلاب بھی مجھے دیکھ کر شرما جاتا ہے ۔ میں بہت تندرست ہوں ۔ ایک ٹھوکر ماروں تو یہ دیوار ابھی ڈھیر ہو جائے ۔ !!

یہ بدبُو کیسی ہے ۔ ؟

میرا کمرہ تو صاف ہے ۔ ! کھڑکی سے بھی صاف ہوا آرہی ہے ۔ !!

بچّی ۔ !

دیکھو کہیں کوئی چوہا تو نہیں مرا ۔ ؟ یہ بدبُو کیسی ہے ۔ ؟؟

بچّی کچھ نہیں سُنتی ۔ ! وہ کیوں سُننے لگی ۔ !! وہ میری اصلی بچّی تھوڑی ہی ہے ۔ !!! وہ تو شبو، زہرہ اور آبرو کی بھی بچّی ہے ۔ بچّی نہیں ڈائن ہے ڈائن ۔ !!!

بُھوک لگی ہے ۔ روٹی ۔ ذلیل چیز ۔ !!! پاؤڈر، اسنو ۔ غازہ، کریم ۔ عطر، کپڑے ۔ کنگھی، پھول نہیں نہیں ۔ بچاؤ ۔ بچ ۔ ب ۔ ۔ !!!

اب کبھی میرا گھر نہیں بنے گا ۔ ! گھر نہیں ۔ آنگن نہیں ۔ ! بابا نہیں نہیں ۔ بچّہ نہیں ۔ !!

کیا موگرے کی بیل سُوکھ گئی ۔ ؟ مجھے موگرے کے تازہ پھول چاہئیں ۔ موگرے کی بیل نہیں سوکھتی ۔ کبھی نہیں ۔ !!! اِس تکیہ کا غلاف بدل ڈالو ۔ کمہلائے ہوئے پھولوں کی دبیز بُو اِس میں رچی بسی ہے ۔ مجھے تازہ پھول چاہئیں ۔ کیا بیل کو کسی چڑیل نے چھو لیا ہے جو وہ سوکھ جائے گی ۔ میں انسانوں کے اِس کھنڈر میں کب سے پڑی ہوئی ہوں ۔ بگڑی ہوئی نسل کی ٹوٹی ہوئی تہذیب کی طرح ۔ خاک میں ناک رگڑتی ہوئی کھوپڑی کی طرح !!! ۔ یہ چھپکلی پھر چھت پر آگئی ہے ۔ اے خبیث ! تو چھت سے کہیں دُور کیوں نہیں چلی جاتی ۔ ؟ کیا میں

قصاب خانے کی کوئی حاملہ مکھی ہوں ۔؟ اذاں ہو رہی ہے ۔ موذن اذان کیوں دیتا ہے ۔؟ بھولتا کیوں نہیں
وہ ۔ یہ عشاء کا وقت ہے ۔ نہیں !۔! مغرب کی نماز ہوگی ۔ خدا کرے موذن اذان دینا بھول جائے ۔ آمین!
اوف ۔ ایہ بدبو کہاں سے آ رہی ہے ۔؟ شاید کوئی مرا ہوا چوہا سڑ گل کر پھٹ گیا ہے ۔ کوئی ڈھونڈ کر
ہٹائیے وہاں سے ۔ گلا سڑا چوہا ۔ ہُرب ۔!!! کیا یہ لوگ بے حس ہیں ۔؟ کیا یہ خود گل سڑ گئے ہیں جو انہیں
یہ بدبو محسوس نہیں ہو رہی ۔؟؟
یہاں راتوں کو بہت سے چوہے آتے ہیں ۔ گیہوں کھانے کے لئے ۔ رات ۔ گیہوں ۔ چوہے ۔!!!
۔ میری کھڑکی پر مسجد کے گنبد کا وہ سفید کبوتر کیوں نہیں آ رہا ۔؟ کیا اسے کسی خونخوار باز نے مار گرایا ہے ۔؟
بہت دن ہوئے میں نے باز نہیں دیکھا ۔ پھر وہ سفید کبوتر کیوں نہیں آ رہا ۔؟ کسی نے ایئر گن سے مارا ہوگا ۔!
ہاں! کسی کو لیپرسی (Leprosy) کا مرض ہوگا ۔ لیپرسی کے مریض کو بھلا کبوتر سے کیا کام ۔؟ لیپرسی ۔
جذام ۔ نہیں نہیں ۔ کیا کہتے ہیں اُسے ۔ جسم کا کوئی عضو معطل ہو جاتا ہے ۔ میں بار بار بھول جاتی ہوں ۔
یہ بُری بات ہے ۔ بہت بری ۔ فالج ۔!
ہاں ہاں ! فالج ۔!!! انگریزی میں کیا کہتے ہیں اسے ۔ پیرلیسس (Paralysis) ۔ بالکل
ٹھیک ! پیرلیسس ۔ خبردار ! اب کے بھولنا نہیں ۔ پیرلیسس ۔!!!
چھی ۔!
تم سنتی کیوں نہیں ۔ یہ چھپکلی پھر دیوار پر آ گئی ہے ۔ اسے بھگاؤ ۔ بھگاؤ یہاں سے ۔ لائٹ بجھادو ۔
مجھے اندھیرا اچھا لگتا ہے ۔ اندھیرے میں چھپکلی نظر نہیں آتی ۔ مجھے بیئر پلاؤ ۔ بیئر کی خالی بوتل ۔ عورت ۔
ہاہاہا ۔!!!
شراب پینا گناہ ہے ۔! نیکی ۔؟ ایک حسین وہم ہے ۔!
گناہ ۔؟ کڑوی حقیقت ۔!! جہنم ۔؟ ۔!!!
میرا جسم گرم ہے ۔ سچ مچ گرم ہے ۔ کیا کوئی جہنم میرے جسم میں چپکے سے سُلگ رہا ہے ۔؟
خدا ہی جانے ۔ وقت کی دیو پیکر سُولی پر مجھے کس نے لٹکا دیا ہے ۔ کون اتارے گا مجھے ۔؟! اِن ہی
لوگوں نے اُسے بھی مہیب صلیب پر چڑھا دیا جس نے مجھے معاف کیا تھا ۔!!!
میری چھاتیوں کو کیا ہو گیا ہے ۔؟ سُوکھ کیوں رہی ہیں یہ ۔؟؟ کیا ان سے دودھ کا سوتا نہیں پھوٹے گا
۔؟؟
وقت کے دو کانٹوں تلے کتنے لوگ لٹکے ہوئے ہیں ۔ ڈاکٹر صاحب آ گئے ۔ موٹر سائیکل ہی کی تو آواز
ہے یہ ۔ آداب عرض کرتی ہوں ڈاکٹر صاحب ۔ کیا آپ بیمار ہیں ۔؟ مجھے دیکھ کر آپ کا چہرہ کیوں اُتر
جاتا ہے ۔؟؟ آنکھیں کیوں دھندلا جاتی ہیں آپ کی ۔؟؟؟ کیا ۔؟ میں بیمار ہوں ۔؟! مجھے تو آپ بیمار
نظر آ رہے ہیں ۔ آپ یقین کیوں نہیں کرتے میری بات کا ۔ اچھا صاحب ۔ چلیے ، میں ہی بیمار سہی!
لیکن مجھے کونسی بیماری ہے نہ ۔؟ کیا ۔! میں کسی خوفناک بیماری کا شکار ہوں ۔؟ شٹ اَپ ۔ کیا میں
آوارہ عورت ہوں ۔ کہیں آپ کا دماغ تو نہیں چل گیا ۔ آپ تنتنے کیوں سکیڑ رہے ہیں ۔؟ اچھا ۔!

یہ بدبو کیسی ہے —— یہ دیکھو کہاں سے آرہی ہے ——؟؟ ڈاکٹر صاحب! ان لوگوں کا علاج کیجئے نا آپ —— انہیں بدبو محسوس ہی نہیں ہوتی —— کیا بک رہے ہیں آپ —— میرا جسم کیوں سڑنے لگا ——!!

چچی —— ڈاکٹر صاحب کو یہاں سے لے جاؤ —— کسی اسپتال میں داخل کرا دینا —— گٹ آؤٹ ——!!

وعلیکم السلام! آئیے —— آپ کھڑے کیوں ہیں —— بیٹھئے نا —— آپ لوگوں کے چہروں پر سفید نقاب کیوں پڑے ہوئے ہیں —— آپ لوگ کچھ کہتے کیوں نہیں —— طاؤس نہیں لائے ——؟ سانپ کو کہاں چھوڑ دیا ——؟ انسانوں کے اس کھنڈر میں لاتعداد بل ہیں —— کہیں گھس گیا تو نہیں ملے گا ——!!!

سفید کبوتر —— زیتون کی ٹہنی لائے گا —— میں کسی دن پکڑ لوں گی —— کریہہ الصورت چھپکلی —— اس چھپکلی سے مجھے بچاؤ —— میں مکھی نہیں ہوں —— پسّو نہیں ہوں میں —— بچاؤ —— بچاؤ —— مجھے بچاؤ ——!!! اس چھپکلی کے پاؤں کاٹ دو —— دُم رہنے دو —— کبھی کبھی چھت سے گرتی ہے تو خود بخود ٹوٹ جاتی ہے —— خوب اُچھلتی ہے ٹوٹی ہوئی دُم ——!!!

زہرہ کتنی بھولی ہے —— روٹی کے لئے بکی تھی —— پگلی کہیں کی —— بکنے کے بعد کھانے کو روٹی ملتی ہے —— گوشت ملتا ہے —— بے وقوف لڑکی —— اس کے بعد جسم کا گوشت سڑنے لگتا ہے۔!!!

آپا! موری صاف رکھو —— کیڑے رینگتے پھرتے ہیں —— ہاں! موری کا منہ بند کر دینا —— سانپ گھس آتا ہے —— سانپ —— فساد کی جڑ ——!!!

چچی ——!

میں نہانا چاہتی ہوں —— مجھے نہلاؤ —— خوب نہلاؤ —— گرم گرم پانی سے —— کہاں مر گئیں تم ——؟ شاید تجوری کے پاس کنڈلی مارے بیٹھی ہو گی ——!!!

شیتو بار بار تجوری کو گھورا کرتی ہے —— میں بھی پہلے گھورتی تھی ——!!!

ارے! چچی چڑیل ہے چڑیل —— نری ڈائن —— جادوگرنی ——!!! دیکھو نا! کس طرح اس نے ہماری عصمتوں کو اپنی تجوری میں بھر لیا ہے —— ٹھنڈا گوشت —— گرم گوشت —— پھیکا گوشت —— نمکین گوشت —— گوشت گوشت ——!!! مجھے اس دیوار پر کس نے لٹکا دیا ہے —— میں تو پہلے ہی سے وقت کے کانٹے سے لٹکی ہوئی ہوں —— دیکھو نا —— مجھے اس دیوار سے اُتار لو —— گر گئی تو چور چور ہو جاؤں گی ——!!!

وہ دیکھو —— وہ چھپکلی پھر ادھر آ رہی ہے —— وہ مجھے کھا لے گی —— کھا لے گی ——!!!

میں دیوار پر نہیں لٹکی ہوں ——! پلنگ پر لیٹی ہوئی ہوں ——!!

پھر دیوار پر کون لٹکی ہوئی ہے ——؟ یہ تو میری ہم شکل معلوم ہوتی ہے ——!!

ہاں! ٹھیک ہے —— وہ میرا فوٹو ہے —— کیا یہ نگوڑی چھپکلی اُسے چٹ کر نہ جائے گی ——؟

وہ فوٹو میرے جسم کا پرنٹ ہے —— ہے نا ——؟ میرا جسم کس کا پرنٹ ہے ——؟؟؟ کیا —— کسی خواہش کا —— خواہش جسم پیدا کر سکتی ہے ——؟ یا پھر اس کے روح نگیٹو ہو گی !!!

یہ کیا بکواس کر رہی ہوں میں ——؟

میں تو چپ ہوں ——!

(بقیہ صفحہ ۵۵ پر دیکھئے)

نئی سحر کا استقبال

مہدی پرتاب گڑھی

نئی سحر نے کیا ہے جہاں میں آج جلوس
پھر ایک اور سفر کا چلو کریں آغاز
یہ سچ کہ زخموں سے ہیں چور چور اپنے بدن
ہے سدِّ راہ، خود اپنی ہی آبلہ پائی
ملے ہے حدِ نظر تک سماں تباہی کا
ہزار وہم ہیں ذہنوں میں سر اُٹھائے ہوئے
سروں پہ اُڑتی ہیں تخریب کی ابابیلیں
اُٹھائے پنجوں میں، چونچوں میں اپنے کنکریاں
ہیں منتظر کہ ملے اذنِ خشت باری انھیں
زمیں پہ پھیلے تو کچھ اور زہرِ وحشت کا
کریہہ فضائے جہاں اور بھی ہو کچھ مسموم
کچھ اور تنگ ہو انساں پہ عرصۂ ہستی
دلوں میں اور بھی کچھ درد کے شگوفے کھلیں
فضائے دہر میں پھیلے کچھ اور بُرے فساد
ہر ایک گام پہ فردا کی راہ ہے مسدود
ہمارے پیچھے ہے ماضی کی ریت جلتی ہوئی
ہمارے "حال" کے رُخ پہ بھی ہے ڈر کی گرد

اُٹھو! کہ مل کے اُجالیں نقوشِ فردا کے
ہٹا کے ذہنوں سے اپنے ردائے مایوسی
دلوں میں لے کے اُٹھو! ایک عزمِ گل بیزی
حصارِ ذات کے اندھے کنوئیں کے حبس سے
نکل کے دیکھو کہ کتنی وسیع ہے دُنیا
ہمیں پہ ٹوٹی نہیں ہیں قیامتیں تنہا

بہت سے لوگ ہیں تہذیبِ نو کے مارے ہوئے
پھر ایک ہم ہی ہیں کیوں زندگی سے ہارے ہوئے
اُٹھو! کہ ایسے عناصر کو ختم کرنا ہے
ملیں جو راہِ ترقی میں سنگ کی صورت
اُٹھو! کہ ایسے عوارض سے جنگ کرنی ہے
بشر سے چپکے ہوئے ہیں جو زنگ کی صورت

بہت کٹھن سہی منزل بھی، راہ بھی دشوار
ہر اک شکست پہ ہم اپنی مسکراتے جائیں
جہاں تلک بھی چلے سلسلہ شکستوں کا
چراغِ حکمتِ ذہنِ بشر جلاتے جائیں

نئی سحر کا کریں اس طرح سے استقبال
کہ زخمِ ماضی کے گل کی طرح مہک اُٹھیں
ہر ایک چہرے سے گردِ ملال چھٹ جائے
وفورِ امن و مسرت سے دل چھلک اُٹھیں

ڈراما

جمیل شیدائی

سہارا

افراد

۱۔ عائشہ
۲۔ جوّاد۔ عائشہ کا بیٹا
۳۔ صفدر۔ عائشہ کا شوہر
۴۔ نسیم۔ پڑوسی کی لڑکی

(عائشہ ادھیڑ عمر کی قبول صورت عورت ہے۔ وہ کرسی پر بیٹھی ہوئی کسی ناول کے مطالعے میں غرق ہے۔ کبھی کبھی وہ ناک پر پسینے سے پھسلتی ہوئی عینک کو اوپر کر لیتی ہے۔ کمرے کا فرنیچر قیمتی ہے اور ہر چیز نہایت سلیقے سے رکھی ہوئی ہے۔ کچھ وقفہ بعد باہر کا دروازہ کھلتا ہے اور جوّاد داخل ہوتا ہے۔ اوسط قد کے اس جوان کی عمر پچیس چھبیس سال کے لگ بھگ ہے۔ اس کا رنگ صاف اور پیشانی کشادہ ہے۔ آنکھیں کسی قدر چھوٹی اور زیادہ روشن ہیں۔ یہ دُبلا پتلا ہونے کے علاوہ عائشہ سے بہت ملتا جلتا ہے۔ وہ ہانپتا ہوا اپنی ماں کی طرف بڑھتا ہے۔ عائشہ اپنے بیٹے کی طرف دیکھتی ہے ــــ)

عائشہ۔ کیا ہوا؟

جوّاد۔ کچھ نہیں ماں۔ آج اس غنڈے نے پھر لڑکی کو چھیڑا (سانسوں پر قابو پاتے ہوئے) دو دو ہاتھ ہوگئے۔

عائشہ۔ ارے یہ کیا! (وہ اپنی جگہ سے اُٹھتی ہے) بشرٹ کے سارے بٹن ٹوٹ گئے ہیں اور یہ خون کیسا ہے؟ تو ذرا یہاں بیٹھ میں ابھی آیوڈین لے آتی ہوں۔ کتنی بار منع کیا منگو کو تو میری سنتا ہی نہیں۔ ملاکر اگر کسی نے چھیڑا تھا تو ملک کے لوگ تھے وہ اس سے نپٹ لیتے۔ (وہ آگے بڑھ کر آیوڈین کی شیشی اور روئی نکالتی ہے)

جوّاد۔ ویسے میں نے کوئی بڑی بات بھی نہیں کہی تھی ماں۔ سمجھا رہا تھا کہ وہ آپے سے باہر ہو گیا اور میری بشرٹ پکڑلی۔ عجیب سچویشن تھی۔ لوگ دیکھ رہے تھے اور کسی نے چھڑانے کی کوشش تک نہیں کی۔ مجھے غصہ آگیا۔ (عائشہ اسپرٹ سے روئی بھگو کر گردن پر لگی خراش کو دھوتی ہے) میں نے ایسا مُکّا رسید کیا کہ وہ تلملا اُٹھا اور اُس کی (وہ آیوڈین لگاتی ہے) .... اُبا۔ ماں۔ جلن ہو رہی ہے۔

(وہ اِدھر اُدھر ٹہلتا ہے)

عائشہ۔ اِسی لئے میں نے تجھے غیر ضروری جھگڑوں میں نہ پڑنے کی ہمیشہ تاکید کی ہے۔ غنڈے پولیس سے مل گئے ہیں۔ اُن کے خلاف رپورٹ کی جاتی ہے تو پولیس کوئی کارروائی نہیں کرتی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ہمّتیں بڑھ گئی ہیں۔

جوّاد۔ اس سے پہلے فوّاد نے اسے بہت پیٹا تھا ماں۔ شاید اُس نے مجھ سے انتقام لے لیا۔ اگر میں وہاں سے نہ بھاگتا تو پتہ نہیں مجھے کیا ہو جاتا۔

عائشہ: فوّاد کی بات الگ تھی، وہ تیرے باپ کی طرح طاقتور تھا۔ تو کمزور ہے۔

جواد۔ یہ بات تو ہے۔ اب دیکھو نا کتنی محنت سے میں نے
JUDO سیکھی۔ وقت پر سارے THROWS
ذہن سے نکل گئے۔

عائشہ۔ اپنے باپ سے تو اُن غنڈوں کے بارے میں کہہ۔
وہ انہیں ضرور ٹھیک کر دیں گے۔

جواد۔ نہیں اماں۔ اب میں کسی بات کا تذکرہ ابا سے نہیں
کروں گا۔ میں تو کوشش بھی یہی کر رہا ہوں کہ اُن
سے بات بھی کم کروں۔

عائشہ۔ کیوں؟

جواد۔ جس انسان کو دوسرے کے جذبات اور احساسات
کا پاس نہ ہو اُس سے کیا توقع رکھی جا سکتی ہے۔

عائشہ۔ اپنے باپ کے بارے میں ایسا کہتے ہوئے تجھے
شرم نہیں آتی۔

جواد۔ شرم کیسی۔ اِس گھر میں میں محض تمہاری وجہ سے
ہوں ورنہ کبھی کا چھوڑ چکا ہوتا۔ جہالت سے
مجھے شروع ہی سے نفرت رہی ہے۔

عائشہ۔ تیری عمر مشکل سے چھبیس سال ہوگی اور تو اپنے
باپ سے اس قدر دل برداشتہ ہے۔ میں نے کس
طرح ایک عمر اُن کے ساتھ گذاری ہوگی؟

جواد۔ ماں یہ تمہاری بلند ہمتی تھی۔ تمہاری جگہ میں ہوتا
تو خودکشی کر لیتا۔

عائشہ۔ یہ بات نہیں۔ تو نے اُن کی اچھائیوں کے بارے
میں کبھی غور نہیں کیا۔

جواد۔ وہ جس انداز سے ہر ایک کو DOMINATE
کرتے ہیں وہ مجھے بھلا نہیں لگتا۔ اب زمانہ بدل
گیا ہے۔ ضرورت زمانے سے ہم آہنگ ہونے
کی ہے۔

عائشہ۔ میں نے کہا نا۔ وہ پڑھے لکھے نہیں ہیں۔ جو آدمی
پڑھا لکھا نہیں ہوتا اُس کے دماغ میں وسعت
نہیں ہوتی۔ یہی بات تیرے باپ میں بھی ہے۔
اِس ایک خرابی کو نظر انداز کر دیا جائے تو تو دیکھے گا
کہ اُن میں کتنی اچھائیاں ہیں۔ وہ اپنی ذمہ داریوں
کو خوبی سے نبھاتے ہیں۔ انہوں نے خاندان کے
لئے کیا کچھ نہیں کیا۔ یہ جائداد یہ دولت انہی کی
محنت کا نتیجہ ہے۔

جواد۔ ماں یہاں بھی تم جذباتی ہوتی جا رہی ہو۔ اگر تم نے
ملازمت ترک نہ کی ہوتی تو آج تم کالج کی پرنسپل
ہوتیں اور اتنی دولت تمہارے پاس بھی ہوتی۔ کیا
یہ ابا کی تنگ نظری نہیں تھی کہ انہوں نے تمہیں
ملازمت سے الگ ہونے کے لئے مجبور کیا۔

عائشہ۔ وہ زمانہ ہی ایسا تھا۔ ملازمت کرنے والی لڑکیوں
یا عورتوں کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔
شروع شروع مجھے بھی بڑی تکلیف ہوئی تھی مگر
بعد میں مجھے محسوس ہوا کہ اُن کی وہ تنگ نظری میرے
لئے نیک فال رہی۔ میں تیری اور فولاد کی تربیت
اچھے ڈھنگ سے کر سکی۔ دورانِ ملازمت یہ ممکن نہ تھا۔

جواد۔ آج پھر اشفاق کا خط آیا ہے۔ وہ مجھے وہاں آنے
کے لئے مجبور کر رہا ہے مگر ابا مجھے مسلسل مایوس
کرتے جا رہے ہیں۔ ایک بار اور اُن سے کہوں گا
اگر وہ پھر بھی انکار کریں گے تو میں کسی صورت چلا
جاؤں گا۔ اُس وقت مجھے تمہیں چھوڑنے کا غم رہیگا۔
(اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں)

عائشہ۔ (اپنے بیٹے کی طرف مشفقانہ نظروں سے دیکھتی ہوئی)
تو پاگل ہے۔ میں خود چاہتی ہوں کہ تو باہر جائے۔
پڑھے لکھے اور بڑا آدمی بنے۔

جواد۔ تم ابا کو مجبور کیوں نہیں کرتیں؟

عائشہ۔ وہ مانتے نہیں۔

جواد۔ یہی تو مشکل ہے (مکان کے اندرونی حصے سے
قدموں کی آواز ہے) شاید وہ آ رہے ہیں۔ میں تو
چلا۔ (وہ اٹھتا ہے۔ ابھی وہ دو قدم [illegible]

ہوتا ہے کہ صفدر داخل ہوتا ہے۔ اس کی عمر ساٹھ سال کی
چھ فٹ دو انچ کے اس طویل انسان کی ساخت
اسپونسن جیسی ہے۔ شکار گاہ کا منتظم ہونے
کی وجہ سے اس کی زندگی کا بیشتر حصہ جنگلوں میں
گذرا ہے۔ وہ اندر داخل ہو کر اپنی بیوی اور بیٹے کی
طرف سوالیہ نظروں سے یوں دیکھتا ہے جیسے دونوں
کی یکجائی کچھ اس کے خلاف سازش کی باعث ہو۔
جواد باہر نکل جاتا ہے۔)

صفدر۔ کیا کہہ رہا تھا؟

عائشہ۔ کچھ بھی تو نہیں۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہو رہی تھیں۔
(صفدر کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

صفدر۔ تم سے معمولی سا کام بھی نہیں ہوتا۔ ہیٹر (HEATER) خراب ہوئے دو دن ہو گئے ہیں۔ جواد سے کہہ کے درست کروا دیا ہوتا۔

عائشہ۔ میں بھول گئی تھی۔

صفدر۔ فجر کے وقت مجھے ٹھنڈے پانی سے وضو کرنا پڑتا ہے۔

عائشہ۔ میں ابھی جواد کو بلاتی ہوں۔

صفدر۔ وہ اندر چلا گیا ہے، یہ وقت اس کے سونے کا ہے۔

عائشہ۔ یہ بات تو ہے۔

صفدر۔ یہ آیوڈین کی شیشی اور روئی تم نے کس لئے نکالی؟

عائشہ۔ بس یونہی۔ میں سی رہی تھی کہ سوئی کی نوک انگلی میں پیوست ہو گئی۔ خون رسنے لگا تھا۔

صفدر۔ کہیں تمہاری عینک کا نمبر تو نہیں بدل گیا؟

عائشہ۔ نہیں ایسی بات نہیں ہے۔

صفدر۔ پھر کیا بات ہے۔ (وہ مسکراتے ہوئے اپنی بیوی کی طرف دیکھتا ہے۔ عائشہ کی نظریں اس سے ملتی ہیں، وہ بھی مسکراتی ہے)

عائشہ۔ آج آپ بہت اچھے موڈ میں نظر آ رہے ہیں۔

صفدر۔ شاید اس کی وجہ تمہارا موڈ بھی ہے۔ (عائشہ اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتی ہے)

عائشہ۔ جواد کہہ رہا تھا کہ اشفاق کا خط آیا ہے، وہ اسے وہاں آنے کے لئے مجبور کر رہا ہے۔

صفدر۔ (پیشانی پر بل پڑنے لگتے ہیں) میں نے کہہ دیا وہ کہیں نہیں جائے گا۔

عائشہ۔ ایسی ضد بھی کس کام کی۔ ہماری زندگی ختم ہو گئی۔ اب بچوں کا دور ہے۔ انہیں آگے بڑھنے کا موقع ملنا چاہیئے۔

صفدر۔ (اداس ہو جاتا ہے) کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ میں ایسا نہیں چاہتا۔ تم کیسی ماں ہو، کیا تم نے اس کی حالت نہیں دیکھی۔ اس کی صحت اچھی نہیں رہتی۔ کیا وہ وہاں کی سردی برداشت کر سکے گا۔ اِن فواد ہوتا تو میں اجازت دے دیتا۔

عائشہ۔ اگر وہ وہاں اڈجسٹ (ADJUST) نہیں ہو سکا تو واپس آ جائے گا۔

صفدر۔ جب تم سب کچھ جان کر بھی انجان بنتی ہو تو مجھے غصہ آ جاتا ہے۔ وہی تو ہمارا سہارا ہے۔ میری عمر کافی ہو گئی ہے۔ میں کچھ ہی دن کا مہمان ہوں۔ تمہیں شاید علم نہیں عجیب و غریب وسوسے آنے لگے ہیں۔ کبھی کبھی رات کو نیند نہیں آتی اور میں ٹہلنے باہر نکلتا ہوں تو خوف سا لگتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی اندھیرے میں چھپا بیٹھا ہے اور مجھ پر حملہ کرنے والا ہے۔ کیا تمہیں معلوم ہے ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ محض ضعف کی وجہ سے۔ اس قسم کا خدشہ مجھے اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں ہوا۔ میری ساری عمر تو گھنے جنگلوں میں گذر گئی۔

عائشہ۔ (اپنے شوہر کی طرف غور سے دیکھتی ہے) مگر آپ کی کمزوری سے جواد کے جانے کا کیا تعلق ہے؟

صفدر۔ ہمیں سہارا چاہیئے۔ ہماری موت تک وہ ٹھہرا

رہے تو یہ کونسی بُری بات ہے۔ ہم نے ساری زندگی بچّوں کی بھلائی کے لئے وقف کردی اور بڑے ہونے کے بعد اُنہیں ہمارا ذرا بھی خیال نہیں۔ پتہ نہیں یہ کیسی دنیا ہے۔

عائشہ۔ ہمارے بچّے وہی تو کرتے ہیں جو ہم نے کیا۔

صفدر۔ تمہاری باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں۔ میرے بچپن میں ایک خاندان جس خلوص و محبّت سے رہتا تھا، ویسا خلوص تمہیں اب نہیں ملے گا۔

عائشہ۔ یہ بات تو ہے مگر اُس کی ضد کو کیا کیا جائے۔ فوآد کے انتقال کے بعد وہ ہماری واحد اولاد ہے اگر ہم نے اُس کی یہ خواہش پُوری نہ کی تو ہوسکتا ہے اُس کے دل میں ہماری طرف سے نفرت پیدا ہو جائے۔

صفدر۔ مجھے رات عجیب عجیب خواب آنے لگے ہیں۔

عائشہ۔ شاید اِس کی وجہ فوآد کی موت کا صدمہ ہے۔

صفدر۔ ہوسکتا ہے۔ میں جہاں تک اپنا تجزیہ کرتا ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ضعیفی نے مجھے پُوری طرح جکڑ لیا ہے۔ انحطاط بڑی تیزی سے رُونما ہو رہا ہے۔ میں پست ہمتّی کا شکار ہوں۔ مجھے بعض اوقات اِس خیال سے نیند نہیں آتی ہے کہ میری موت کے بعد تمہارا کیا ہوگا۔ جوآد کے سَر پر باہر جانے کا بھُوت سوار ہے۔ کچھ عرصہ بعد تم بھی عمر کی وجہ سے اِس قسم کی پست ہمتّی کا شکار ہو جاؤ گی۔ کمزوری کی وجہ سے تمہیں بھی طرح طرح کے وسوسے آئیں گے۔ تم تنہا اِن حالات کا کیسے مقابلہ کرو گی ؟

عائشہ۔ آپ ناحق میری طرف سے پریشان ہو رہے ہیں۔

صفدر۔ کیا تم بھی یہی سمجھتی ہو کہ میں جوآد کی تعلیم کا مخالف ہوں۔ تعلیم کی طرف سے میری محرومی اُسے اور زیادہ تعلیم یافتہ بنانا چاہتی ہے۔

(وہ اُٹھتا ہے) کچھ دیر آرام کرلوں (وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا اندر کی طرف چلا جاتا ہے۔ عائشہ پھر سے کتاب پڑھنے میں مشغول ہو جاتی ہے۔ جوآد اندر دالی دروازے سے داخل ہوتا ہے)

جوآد۔ ابا نے کیا کہا ؟

عائشہ۔ اُنہوں نے کہا کہ وہ اِس مسئلے پر غور کریں گے۔

جوآد۔ اُن کا جواب ہر بار یہی ہوتا ہے۔

عائشہ۔ تو ادھر آ۔ (وہ اُس کے قریب آتا ہے) یہاں بیٹھ (وہ کرسی کے ہتّے پر بیٹھ جاتا ہے) کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ تو کچھ عرصے کے لئے باہر جانے کے خیال کو دل سے نکال دے۔

جوآد۔ جب مجھے کچھ عرصے بعد جانا ہی ہے تو خیال کو دل سے نکال دینے کا کیا مطلب ہوسکتا ہے۔

عائشہ۔ کیا تو اتنا نہیں سمجھ سکتا کہ اب ہم بوڑھے ہو چلے ہیں۔ ہمیں سہارے کی ضرورت ہے۔ کسی لمحے بھی ہماری صحت خراب ہوسکتی ہے۔

جوآد۔ اماں تم سمجھتیں کیوں نہیں۔ دنیا بڑی مختصر ہو گئی ہے۔ فاصلے گھٹ گئے ہیں۔

عائشہ۔ مشکل تو یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کو سمجھ نہیں رہے ہیں (صفدر پھر داخل ہوتا ہے، جوآد کرسی کے ہتّے سے اُٹھ جاتا ہے)

صفدر۔ میری تسبیح کہاں ہے ؟

عائشہ۔ دیوان خانے میں ہوگی۔

صفدر۔ (جوآد سے) تم سوئے نہیں۔

جوآد۔ جی نہیں۔ مجھے نیند نہیں آرہی ہے۔

صفدر۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ اشفاق نے تمہیں خط لکھا ہے :

جوآد۔ جی ہاں۔

صفدر۔ کیا لکھا ہے ؟

جوآد۔ وہ مجھے وہاں آنے کے لئے مجبور کر رہا ہے۔

صفدر۔ تم نے کیا جواب دیا ؟

جواد۔ (جو یہاں تک بات پہنچ چکی ہے) میں نے لکھا ہے
کہ میں بہت جلد اس سے جا ملوں گا۔

صفدر۔ تم نہیں جا سکو گے۔

جواد۔ میں جاؤں گا۔ آپ یہ نہ سمجھئے کہ میں آپ کو کرایے کے لئے مجبور کروں گا۔ میں نے اپنا بندوبست کر لیا ہے۔

صفدر۔ تو بات یہاں تک آ پہنچی ہے۔

جواد۔ جی ہاں۔ میں نے آپ سے متعدد بار گزارش کی، مگر آپ نے کوئی توجہ نہیں دی۔ مجھے مجبوراً یہ قدم اُٹھانا پڑا۔

صفدر۔ تم نے تعلیم فضول حاصل کی۔ جس تعلیم سے تم اپنے بزرگوں کے لئے ادب و احترام پیدا نہ کر سکے اس تعلیم سے تمہیں کیا ملے گا۔ بڑوں کے حکم سے سرتابی کرنا کہاں تک درست ہے۔

جواد۔ جب بڑے چھوٹوں کا لحاظ نہ کریں تو کیا کیا جائے۔

عائشہ۔ (کتاب رکھ دیتی ہے) جواد۔ یہ کس قسم کی زبان درازی ہے۔

جواد۔ میں نے کوئی زبان درازی نہیں کی۔

صفدر۔ شروع ہو جاؤ۔ (وہ عائشہ سے مخاطب ہوتا ہے) یہ تمہاری تربیت کا نتیجہ ہے۔ میرا بیٹا مجھ پر آنکھیں نکال رہا ہے۔ (جواد سے) اس قسم کی گفتگو کوئی دوسرا کرتا تو میں اس کی کھال اتار لیتا۔

جواد۔ وہ تو آپ میری بھی اُتار سکتے ہیں۔ زندگی بھر آپ کا طرز عمل باپ سے زیادہ ایک ڈکٹیٹر (DICTATOR) کا رہا۔ اب اس عمر میں آپ سے تبدیلی کی امید فضول ہے۔ مجھے افسوس تو اس بات کا ہے کہ میں یہاں اپنی زندگی تباہ کرتا رہا۔ مجھے بہت پہلے ہی یہ گھر چھوڑ دینا چاہئے تھا۔ مجھے اس گھر میں سوائے کوفت اور تکلیف کے کچھ نہ مل سکا۔

ر۔ سگار پیتا ہے۔

جواد۔ میں نے کہا نا۔ میں نے ابھی زبان درازی نہیں کی۔

صفدر۔ (جو بہت زیادہ غصے میں ہے) بدتمیز۔ میں بہت سُن چکا۔ (اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا ہے اور وہ مٹھیاں بھینچ لیتا ہے) اب اگر کچھ کہا تو.......

(وہ رک جاتا ہے)

جواد۔ آپ میری کھال اتار لیں گے یہی نا۔ اس قسم کے کام آپ جوانی سے کرتے آ رہے ہیں۔ جنگل کے معصوم حیوانوں کو آپ گولی کا نشانہ بناتے رہے۔ اُن پر ظلم ڈھاتے رہے اور اب اولاد آپ کے ظلم و تشدد کا نشانہ بن رہی ہے۔ فواد کی موت بھی محض آپ کی ترش روئی اور سخت گیری کی وجہ سے ہوئی۔

صفدر۔ (فواد کی موت کے حوالے پر وہ بے چین ہو جاتا ہے) تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ میں آج ہی یہ گھر چھوڑ دوں گا۔ میں اس زہریلے ماحول میں سسکنا نہیں چاہتا۔ (وہ ہینگر سے شیروانی نکالتا ہے۔ عائشہ شیروانی چھیننے کی کوشش کرتی ہے)

عائشہ۔ بچوں کی باتوں کا بھی کوئی اتنا اثر لیتا ہے۔ (وہ عائشہ کو پرے دھکیل دیتا ہے اور وہ تخت پر جا گرتی ہے)

صفدر۔ (عائشہ سے) مجھے تم سے نفرت ہے۔ میں تمہاری صورت تک دیکھنا نہیں چاہتا۔

عائشہ۔ میں نے کیا کیا ہے؟

صفدر۔ تم نے کیا کیا ہے؟ اپنی تعلیم سے لونڈوں کے ذہنوں میں زہر بھرتی رہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ (جواد کی طرف اشارہ کرتا ہے) میرے مقابل کھڑا ہو گیا۔ یہاں میری کوئی عزت نہیں۔ (وہ آگے بڑھ کر چھڑی اٹھا لیتا ہے) اب تم دونوں آرام سے یہاں رہو۔ (وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھتا ہے دفعتاً بھاگتی ہوئی نسیم اندر آتی ہے۔ یہ لڑکی

بارہ تیرہ سال کی ہے)

نسیم۔ خالہ جان وہ غنڈہ جس سے جوّاد بھیا کا جھگڑا ہوا تھا لشہ لئے انہیں مارنے آرہا ہے۔

صفدر۔ کون سا غنڈہ ؟ (وہ سوالیہ نظروں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھتا ہے)

عائشہ۔ کچھ دیر پہلے جوّاد کا کسی غنڈے سے جھگڑا ہوا تھا۔

صفدر۔ مجھے کیوں نہیں بتایا ؟ (عائشہ خاموش ہے) میں پوچھ رہا ہوں مجھ سے کیوں نہیں کہا گیا ؟ (جوّاد دروازے کی طرف بڑھتا ہے) ٹھہرو۔ (وہ رک جاتا ہے) تم باہر نہیں جاؤ گے۔

جوّاد۔ (جو ابھی تک غصے میں ہے) میں ضرور جاؤں گا۔ (وہ آگے بڑھتا ہے۔ صفدر اسے بازو سے پکڑ لیتا ہے۔ جواد بڑی بے بسی سے اُس کی آہنی گرفت سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔ صفدر اسے گھسیٹتا ہوا کمرے کے دروازے تک لے آتا ہے اور پھر اسے اندر دھکیل کر باہر سے دروازہ لگا لیتا ہے۔)

صفدر۔ (شیروانی اتارتے ہوئے) ذرا اندر سے کلہاڑی تو لے آنا۔

عائشہ۔ کیوں نہ پولیس کو اطلاع دی جائے۔

صفدر۔ میں کہتا ہوں کلہاڑی لے آؤ۔ (وہ زور سے چیختا ہے، پھر عائشہ کا انتظار کئے بغیر باہر نکل جاتا ہے عائشہ دروازے کی طرف عجیب نظروں سے دیکھتی ہے)

جوّاد۔ (اندر سے) ماں دروازہ کھولو (وہ خاموش ہے) ماں (وہ پھر بھی خاموش ہے) ماں۔

عائشہ۔ ذرا صبر کر۔

جوّاد۔ ماں دروازہ کھولو۔ نہیں تو میں دروازہ توڑ دوں گا (وہ شدّت سے دروازہ پیٹتا ہے۔ صفدر اندر آتا ہے)

صفدر۔ کمبخت کہیں کا۔ ایک تھپّڑ بھی برداشت نہ کر سکا۔ (وہ آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیتا ہے جوّاد باہر نکلتا ہے۔ جوّاد سے) اس کی ہمت اتنی بڑھ گئی تھی کہ وہ تمہیں مارنے آیا تھا۔ شاید اُسے علم نہیں کہ میرے زندہ رہتے ہوئے کوئی میرے بچوں پر ہاتھ نہیں ڈال سکے گا۔ صرف ایک ہی تھپّڑ میں گر گیا۔ (جواد اپنے قد آور باپ کی طرف دیکھتا ہے۔ صفدر مضمحل سا کرسی پر بیٹھ جاتا ہے) تمہیں ٹکٹ کے لئے کتنا روپیہ چاہیئے۔

جوّاد۔ پانچ ہزار۔

صفدر۔ (عائشہ سے) میری چیک بک لے آؤ۔ (وہ اندرونی حصّے کی طرف بڑھتی ہے۔ جوّاد اُسے آواز دیتا ہے)

جوّاد۔ ماں۔ (وہ رک جاتی ہے) میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے اب میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ (صفدر کرسی سے اُٹھ جاتا ہے۔ جوّاد اس کی طرف بڑھتا ہے۔ صفدر اُسے سینے سے بھینچ لیتا ہے۔ عائشہ اپنے آنچل سے آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو پونچھ لیتی ہے)

(بقیہ ۷۵)

بقیہ افسانہ "دوسری عورت" صفحہ ۱۴

پھر یہ کون ہے جو اتنی ڈھیر سی باتیں بناتی رہتی ہے ؟ —؟

کب پیدا ہوئی وہ ——— ؟؟

ہش اہیری تو چھاتیاں سوکھ گئی ہیں ——— !!!

پھر میرے اندر کون ہے — ؟ کون — کون ہے تو — ؟ بول — بول — بول نا — ؟؟

دوسری عورت ——— !

تو کب پیدا ہوئی ——— ؟

پہلے گناہ کے بعد ——— !

بچی ——— !

دیکھو دیکھو ——— دیکھو ! میں اسکی ماں ہوں ——— ماں ہے ——— !!

کسے میری چھاتیوں سے دھم پیدا ہو [illegible]

پھر کے پتے لاؤ ——— !!

غزلیں

اسرار اکبرآبادی

اے مرے عزمِ سفر وقتِ سفر ہے سامنے
رات پیچھے جا چکی ہے اور سحر ہے سامنے

ہم تو اپنی جستجو میں جا رہے تھے بے خبر
ہوش میں آئے تو دیکھا اُن کا گھر ہے سامنے

کیوں نہ ہم اِس سے بنا لیں اک نیا ہی آسماں
کاروانِ وقت کی گردِ سفر ہے سامنے

ابتدا معلوم ہے اِس کی نہ کوئی انتہا
دیکھتا ہوں میں جدھر بس رہگزر ہے سامنے

تشنگی کا کرب اور موجوں کے یہ تشنہ ہجوم
آگ میں جلتا ہوا پانی کا گھر ہے سامنے

منتشر ہونے پہ بھی بڑھتا رہے گا دمبدم
جسم کا اسرار اک ایسا سفر ہے سامنے

فاروق شفیق

اب کے پیدا ایسے کچھ اسباب ہوئے
وہ خود ابھرا اور نہ ہم غرقاب ہوئے

تیر رہی ہیں آنکھیں سطحِ آب پر اب
سارے مناظر اک اک کر کے خواب ہوئے

کیسا انوکھا دردِ جُدائی تھا، یعنی
وہ خود تڑپا اور نہ ہم بے تاب ہوئے

دریا ندی نالوں پہ بن آئی ہے
صرف سمندر کہنے کو بے تاب ہوئے

کب تک یوں ہی اور نہ جانے رہنا ہے
مدت گذری آنکھوں کو بے خواب ہوئے

دل کے خطے مدت سے جو بنجر تھے
آج مری آنکھوں میں وہ شاداب ہوئے

حمید نایاب

کون سا درد ہے، کیا کرب نہاں ہے مجھ میں
ہوں وہ لمحہ کہ چھپی برقِ تپاں ہے مجھ میں

کس کو کہیئے گا گہر، کس کو صدف کہیئے گا
اک مکاں میں ہوں میں اور ایک مکاں ہے مجھ میں

تو ہے اک کشتِ یقیں، میں ہوں گماں کا صحرا
تجھ میں جو بات ہے وہ بات کہاں ہے مجھ میں

مجھ کو آئینۂ اخلاص سمجھنے والو
یہ نہ بھولو کہ اک اپنا بھی جہاں ہے مجھ میں

جب سے اُس چشمِ سبک سار کی بجلی چمکی
ایک جلتے ہوئے گلشن کا سماں ہے مجھ میں

کہانی

انیس رفیع

بلڈ پریشر

بیچ کے فاصلوں کو ہر لمحہ لمبا کرتا میں بس اسٹینڈ کی طرف تیرتا جا رہا تھا۔ اچانک ہوائیں رُک گئیں۔ پسینے چلنے لگے۔ قدم گڑ گڑا اور اُٹھے نہیں۔ BUS STOP ٹین کے گول شیٹ SHEET پر بیٹھا میری آنکھوں میں لڑھک جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ادھر سانسوں کی دھک پک میرے جسم کو ڈیزل انجن کی طرح گھگھیانے پر مجبور کر رہی تھی۔ بس اسٹینڈ کو گھیرے میں لئے ہوئے لوگ مجھے بھوت دکھائی پڑ رہے تھے۔ اِن بھوتوں کی کھوپڑیاں عجیب و غریب آنکھوں کا گھونسلہ معلوم پڑ رہی تھیں۔ یہ آنکھیں جیسے آنکھیں نہ تھیں گولڈا میئر کی اسرائیلی زمینیں تھیں، جو زبردستی لاکر ان کھوپڑیوں میں دھنسا دی گئی تھیں۔ ان آنکھوں کے LENS نے جیسے اپنی NORMALCY ترک کر دی ہو اور عکسوں کی پذیرائی ان تک مفقود ہو گئی ہو۔ بس کا انتظار کرنا تھا۔ کیا کرتا کہاں بھاگتا۔ میں اپنے قدموں کو بڑی سختی سے سڑک کے کھردرے جسم پر مسلنے لگا۔ میرا یہ عمل جاری تھا ہی کہ ٹرام کے برقی تاروں کے ٹکراؤ سے ایک زبردست اسپارک ہوا۔

تار ٹوٹ گیا۔ ہاں تار ٹوٹ گیا۔

تار کے ساتھ ایک بڑھیا بھی اکڑ کر ٹوٹ گئی۔ وہ بڑھیا کس کس طرح سے ٹوٹی اور کیوں ٹوٹی پر سوچ بھی نہ سکا تھا کہ زبردست دھکے نے مجھے آگے ڈھکیل دیا۔ سڑک میرا منھ چوٹتے چوٹتے رہ گئی۔ پھر جو ذرا سیدھا ہوا تو دیکھا ۳-بی ڈبل ڈیکر بس سامنے کھڑی تھی۔ اور میں نہ جانے کس طرح ــــ بس کے اندر تھا۔ ایک عورت مسلسل میری پیٹھ پر اپنا ELBOW PREASSURE ڈالے جا رہی تھی۔ اور بھیڑ کی گتھم گتھا نے کچھ ایسا کر دیا تھا کہ میں اپنا آپ بھی نہ سنبھال پا رہا تھا۔ کنڈکٹر نے گھنٹی بجائی۔ بس لپلپاتی آگے کی طرف بڑھنے لگی۔ ہچکولے ڈوبتے اور اُبھرتے رہے۔ ذہن جب اپنی طرف لوٹا تو پتہ چلا کہ میرا سب کچھ کہیں اور ہے۔ اور جب اپنا سب کچھ کہیں اور ہو تو لُٹ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ کیوں نہ انھیں سمیٹ لیا جائے۔ یہ سوچ کر اپنے آپ کو جمع کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ ACCUMULATION PROCESS جب اختتام پر پہنچا تو محسوس ہوا کہ اب میں اپنے آپ کو پھر سے INVEST کرنے کا پلان مرتب کر رہا تھا۔

سب سے پہلے ــــ

میں نے اپنے آپ کو کئی ٹکڑوں پر تقسیم کر لیا ایسے جیسے میرا جسم ANATOMY کے مبادیات سے یکسر خالی ہو۔ میرا آپ تھلتھلاتا ہوا گوشت سا ایک نرم لوتھڑا ہو اور کسی ہوئی جگہ کے خالی SPACE میں ربڑ کی طرح پیوست ہوتا جا رہا ہو۔

ٹکڑا ــــ ایک

میرا ایک ٹکڑا آفس کے باس کے پاس حاضر ہو گیا۔ اور دفتر میں موجود اور مجھے باس کے خلاف دن بھر میں ہو سنے والی سازشوں

او اپنے UPPER CHAMBER سے نکال نکال کر میز پر رکھے ہوئے پیپر ویٹ کے نیچے دبانے لگا۔ اور میری آنکھوں کے کٹوروں میں ریت آتی ہوئی۔ چونکہ کہ وہ سب کچھ بتا رہا تھا جو ایک خارش زدہ کتا بتا سکتا تھا۔ اور پاس اپنے چند لے اور بھدّے سر پر تین چار انگلیاں ڈال کر اپنے دماغ کے اُس کونے کو کھولنے کی کوشش کرتا جس میں اُس کا اپنا شکار کی دندہ قید تھا۔

ٹکڑا ــــ دو

یہ بھرا ٹریڈ یونین کے دفتر میں بیٹھا اپنے دُکھی لباس کو تار تار کرتا اور پھر تار تار کر اپنے فیکٹری کے ملازمین کی گردنوں سے لپیٹ دیتا جب اُس کا اپنا گلا اُن کی گردنوں میں پھانسی کی طرح لٹک جاتا تو وہ اسے اور آزاد ہو کر CO-WORKER جس پر بھاگ کے ہونٹوں پر بوسوں کا جلوس سجاتا اور جلوس کے جبڑوں میں دبے SLOGANS اُن کی انتڑیوں میں اُتر کر سڑ گل جاتے۔ ایسے SLOGANS کے مرنے کی اُسے ایک دھیلا پروا نہیں۔ SLOGANS جو انتڑیوں میں اُتر جاتے ہیں وہ مُردہ ہی ہوتے ہیں۔ اُن کا سڑ جانا نیکی ہے۔ اور نیکیوں کا مر جانا عین نیکی ہے۔ بس پر بھا میز پر اپنے پرس سے بنے ہوئے تثلیث کو اپنی ہتھیلی کے دباؤ سے میز کی پالشوں میں دبا دیتی۔ اور جب اُس کی ہتھیلی اس کے گالوں کو چھوتی تو وہ تثلیث، تثلیثی منصوبہ بن کر اُس کے گالوں پر اشتہاری رقص کا آغاز کرتا۔ بس پر بھا اپنے گول گول شیشے میں وہ مثلث دیکھتی جو اس کے گالوں پر بیٹھا اُسے جیومیٹری کے دنے رٹائے پچھلے تمام اسباق بھول جانے پر مجبور کر رہا ہوتا۔ خطِ منحنی سے بنا ہوا یہ مثلث اُس کی مربوط سوچ کو پان کی چھالو دُکان میں فٹ بال کی طرح اچھال دیتا۔

ٹکڑا ــــ تین

تیسرا ٹکڑا ایچ پاؤس کے کسی REAR STALL یا FRONT STALLS کی کھٹمل زدہ کرسیوں میں دھنسا سنہرے شہر کے فاتح کے ساتھ خود کو بھی مفتوح کی اداؤں پر چٹکیاں بھرتا پایا۔

ٹکڑا ــــ چار

باسٹرڈ پیٹی بورژوا!

تجربہ کے بہت سے چھوٹے ٹکڑے۔
چھوٹی چھوٹی اور بڑی بڑی چھینکیں ــــ !!!

بس کے ایک سنجیدہ بریک نے مجھے پھر ایک بار لا کر بس میں جمع کر دیا۔ اُس عورت نے اپنی پوری کہنی میری پیٹھ میں اس طرح ڈبو دی کہ میں اکڑ گیا، اگر کہنی کے ڈوبنے میں اور گہرائی ہوتی تو شاید ریڑھ کی ہڈی رو پڑتی۔

"میڈم دیکھنے کے لئے لیڈیز سیٹ تو بالکل بھری ہے۔ آپ کی کوشش شاید بیکار جائے گی۔ اتنی بھی کیا جلدی ہے" میں نے محتاط لہجے میں کہا۔ شاید مجھے یقین تھا کہ وہ اسی طرح میری باتوں کو دھیان سے سنے گی جیسے میری بیوی یا بیٹی سنتی ہے۔ مگر اُس نے بہت ہی نرم اور مختصر جواب دیا۔ جس کے لئے میں تیار نہ ہوتے ہوئے بھی تیار ہو گیا۔ جواب تھا ــ " SHUT UP " تھوڑی سی کوشش کے بعد میں نے تاریخی لہجہ اپنایا۔ "آپ نے شاید میری باتوں کو بُرا منایا۔ میں دنیا کی ہر شے کو دستو سمجھتا ہوں۔ اور ہر دستو کو اپنا ایک انگشت مانتا ہوں۔ یوں سمجھئے کہ ہم سب ہی دستو ہیں اور ہم سب ایک دوسرے کے گرد انگشتوں کی طرح پھیلے ہوئے ہیں۔ اب آپ ہی بتائیے سب کو اپنا نہ سمجھوں تو کیا کروں۔ میں نے آپ سے جو کچھ بھی کہا آپ کو اپنا مان کر کہا ہے۔ اور اس کے علاوہ میں ایسے شبدوں کی لین دین کو سفر میں ہر ہمسفر کا حق سمجھتا ہوں۔"

"دیکھئے مسٹر، اپنے پن کا اُپدیش کسی اسٹاپ پر اُتر کر فٹ پاتھ پر دیجئے۔ ہر چیز کو اپنا سمجھنے والا اچھا مین نہیں ہوتا۔ بس میں بڑی گرمی ہے۔" اُس کا یہ جملہ مجھے ایسا لگا کہ کوئی بہت بڑا منچلا بہت بڑا مجرم آدمی میری سانسوں کی نلی میں آکر بیٹھ گیا ہو۔ اور میری شریانوں میں موت کے وقت اُٹھنے والی ٹیس بھر گئی ہو۔ اور پھر جیسے ANANKY کے تمام عبادیت آکر مجھ میں گھس گئے ہوں۔ اور آدمی کے بیچ رہنے کے لئے

[illegible]ات کی مزیت ہو تی ہے وہ سب کے سب میرے پاؤں کے تلووں میں آکر دفن ہو گئے ہوں۔ گرمی کا فارن ہائٹ جیسے یکایک بڑھ گیا ہو۔ میں نے اپنے دا ہنے ہاتھ کی کہنی کا ہل بنایا اور لوگوں کی پیٹھوں ا پیٹوں کو بے رَس زمین کی طرح جوتتا ہوا بس کے PASSAGE میں بیٹھے ہوئے لوگوں کے درمیان جا اٹکا۔

اس عورت کا چہرہ اب تک میری آنکھوں میں FLASH کر رہا تھا۔ جیسے میرے بدن میں سوراخ ہو گیا ہو اور اس سوراخ سے اُس عورت کا چہرہ دائرہ بن بن کر پل پل میری آنکھوں کی جانب اُچک رہا ہو۔ پھر میں نے دیکھا کہ جو خلا میرے ہٹ جانے کی وجہ سے اُس عورت کے سامنے پیدا ہو گیا تھا اسے ایک لمبوترا نپ کے نوعمر چھوکرے نے پُر کر دیا۔ وہ نوعمر چھوکرا مجھے ایک ایسا دا ٹوریا نٹیلیکچول لگ رہا تھا جیسے گندے اور واہیات تجربے کرنے کا چسکا پڑ گیا ہو۔ چند لمحوں کے گیپ کے بعد میں نے پھر اُس عورت کی طرف دیکھا۔ وہ نوعمر چھوکرا اپنے تجربوں کی بیساکھی کے سہارے اس عورت کے ابھرے ہوئے خطوط کو اپنی ہتھیلیوں سے مٹانے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ خطوط مٹتے اور ابھرتے رہے۔ میں اُس عورت کے چہرے پر بےانتہا کوشش کے باوجود کوئی ابھری ہوئی لکیر نہ دیکھ سکا۔ اُس کی آنکھوں میں PROTEST تھا نہ PRETENTION سپاٹ بے لکیر اندھا چہرہ۔ کراہیت اور حقارت کی جتنی بھی قسمیں میرے اندر ہو سکتی تھیں سب کو جمع کر میں نے یہ جملہ اپنی سوچ کے جبڑے پر دے مارا۔

" یہ عورت امانت کا لال ٹیگ لگا کر بھی کتنی بے ایمان ہے " غصے نے میری تمام قوتوں کو جیسے میری ایڑیوں میں لاکر جمع کر دیا تھا۔ میں زور زور سے اپنی ایڑی کو بس کے تختے پر رگڑنے لگا۔ اچانک ایک دُبلی مگر لمبی چیخ نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے گردن جب نیچے جھکائی تو دیکھا ایک بچہ بری طرح رو رہا تھا۔ جو ذرا اور جھک کر نیچے دیکھا تو پتہ چلا کہ میرے جوتے کی ایڑی نے اس بچے کے انگوٹھے کو بری طرح مجروح کر دیا تھا۔ انگوٹھے سے خون رِس رہا تھا۔ اتنے میں کوئی دھکے دیتا آگے بڑھ آیا۔

وہی عورت میرے سامنے کھڑی تھی۔

" کیا ہوا راجو بیٹے "

راجو اس عورت سے لپٹ کر گہری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ اور وہ عورت بڑی مشکلوں سے راجو کے انگوٹھے کی طرف جھکی۔

اور جب اُس کا چہرہ اوپر اُٹھا تو میں نے دیکھا۔ اُس عورت کا چہرہ بے شمار موٹی موٹی اور سُرخ لکیروں سے بھر گیا تھا۔

اگلے اسٹاپ پر میں بس سے اُتر گیا۔

میرا بلڈ پریشر بہت نیچے گر چکا تھا۔ !

اگر آپ "شاعر" کے خریدار ہیں تو اسے ضرور پڑھئے

یہ جنوری۔ فروری ۷۳ء کا شمارہ ہے۔ اس کے ساتھ جن "شاعر" نوازوں کا سالِ خریداری ختم ہو رہا ہے انہیں اسی شمارہ میں کسی دوسری جگہ سُرخ نشان لگا کر یہ اطلاع دی جا رہی ہے۔ اگر آپ کا نام بھی اس میں شامل ہے تو آپ سے درخواست ہے کہ آپ تجدیدِ سالِ خریداری ضرور فرمائیں اور کسی بھی حالت میں "شاعر" سے اپنا تعلق ختم نہ کریں۔ آپ کے پُرخلوص تعاون ہی سے "شاعر" کی زندگی ہے۔ دسمبر ۷۲ء کے شمارہ کے ساتھ جن کا سالِ خریداری ختم ہوا تھا۔ اگر انھوں نے اب تک اپنا سالانہ چندہ نہیں بھیجا ہو تو ان سے بھی جلد بھیج دینے کی درخواست ہے۔

کم از کم ایک سال (۱۹۷۳ء) یا دو سال، تین سال، جتنی مدت کے لئے بھی آپ بہ آسانی زرِ سالانہ بھیج سکیں، وہ اس شمارہ کے پہنچتے ہی بھیج دیں۔ اگر آپ اپنے زرِ سالانہ کے ساتھ ایک نئے خریدار یا چند نئے خریداروں کا زرِ سالانہ بھی شامل فرما دیں تو یہ کرم مزید ہوگا۔ "شاعر" کی بقاء و ترقی صرف آپ کی نگاہِ توجہ پر منحصر ہے۔ امید کہ آپ ہمارے عزم و ہمت کو حوصلہ بخشیں گے۔

(ادارہ)

رشی پٹیالوی

کہاں گئے وہ زمانے ؟

کہاں گئے وہ زمانے کہ جب وطن کے لئے — وطن پرست لگاتے تھے جان کی بازی
انھیں خیال تھا بہبودِ ملک و ملّت کا — وطن کی راہ میں ہوتی تھی کارواں سازی

کہاں گئے وہ زمانے کہ جب وطن والے — متاعِ زیست وطن پر نثار کرتے تھے
جنون و جذبۂ سودائے سرفروشی میں — وطن کے نام پہ دیوانہ وار مرتے تھے

کہاں گئے وہ زمانے کہ جب بہ نامِ وطن — جفا و جَور کے صدمے اٹھائے جاتے تھے
ہر انجمن میں محبت کی روشنی کے لئے — چراغ اپنے لہو سے جلائے جاتے تھے

کہاں گئے وہ زمانے کہاں گئے وہ دن — وطن میں لوٹ کے پھر کیا کبھی نہ آئیں گے؟
حیات بخش بہار آفریں حسیں لمحے — چمن میں لوٹ کے پھر کیا کبھی نہ آئیں گے؟

دلاورانِ وطن وہ مجاہدانِ وطن — وہ سرفروش کہاں ہیں، کہاں ہیں دیوانے
وطن کا درد رہا جان سے عزیز جنھیں — وہ جاں نثار وہ شمعِ وطن کے پروانے

جنھیں تو مدِ نظر تھا مفادِ قوم و وطن، — مرے تو اُن کو ملا رتبہ سرفرازی کا
بصد خلوص بٹھائے گئے سر آنکھوں پر — مقام اُن کو میسّر ہوا "ایازی" کا

جنھوں نے مِٹ کے کیا حق ادا شہادت کا — ہم اُن سے اپنی عقیدت کا حق ادا کر دیں
کہیں ملیں تو رشی جان وار دیں اُن پر — نظر پڑیں تو نظر اُن پہ ہم فدا کر دیں

بدل گئے ہیں زمانے بدل گئے انسان — وطن کے نام پہ مرنے کی رسم و راہ گئی
کسی کو اب نہیں سودا وطن پرستی کا — صعوبتوں سے گذرنے کی رسم و راہ گئی

بجا ہے یہ تو کہ آزاد ہیں وطن والے — یہ مانتے ہیں کہ سب راج کاج بدلا ہے۔
خطا معاف! اگر ہم کہیں برائے سخن — وطن کے درد کا مفہوم آج بدلا ہے

وہ لفظ جس میں ہو شامل خلوص کی گرمی — وطن کے ذکر میں اب بھول کر نہیں آتا
وطن کے حال و گر کا خیال ہو جس کو — وطن میں ایک بھی ایسا نظر نہیں آتا

محمد منصور عالم

سوانح نگاری کے اصول

انسان کو انسان سے اکثر نقصان پہنچا ہے ـــــ آدمی نہیں سنتا آدمی کی باتوں کو۔ ورنہ پیکرِ عمل بن کر غیب کی صدا ہونے کی تلقین ضروری نہ تھی ؎

آدمی نہیں سنتا آدمی کی باتوں کو　　　پیکرِ عمل بن کر غیب کی صدا ہو جا

اس کے باوجود، ہر انسان معاشرہ پسند ہے۔ وہ تنہا نہیں رہ سکتا۔ لمحہ بہ لمحہ اُسے دوسروں سے ملنے کی ضرورت ہوتی ہے، کچھ اپنے احتیاجات کے تحت اور کچھ تقاضائے فطرت کی وجہ سے ملاقات اور قُرب و قرابت کی آرزو ہر شخص کو ہے۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ وہ نت نئے افراد سے ملے، ان کی صحبت اُٹھائے۔ اُن کے احوال و آثار جانے۔ ہم روزانہ سیکڑوں لوگوں سے ملتے ہیں، مگر خوش بھی ہوتے ہیں۔ تاہم ہماری تسکین نہیں ہوتی۔ وجہ یہ ہے کہ یہ افراد معمولی اور عام قسم کے ہوتے ہیں۔ ان کی دیرینہ دید سے ہم آسودہ حال ہو جاتے ہیں۔ اور یہ آسودہ حالی پھر بے توجہی میں بدل جاتی ہے۔ آہستہ آہستہ ہم ایسے افراد کے احوال و آثار سے بھی بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ اُن کی شخصیت میں کوئی بات وجہِ کشش نہیں ہوتی۔ ہم تو ایسے افراد سے ملنا چاہتے ہیں جو ہمارے لئے اجنبی اور عجوبہ ہیں اور جن کی شخصیت میں زبردست کشش ہوتی ہے، اک سحر ہوتا ہے اور یہ محض فریبِ نظر نہیں ہوتا، بلکہ مثلِ عصائے موسیٰ سچے جادو جیسا ہوتا ہے ـــــ ایسے لوگ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو ہماری اس دنیا میں بستے ہیں۔ دوسرے وہ جو اس عالمِ رنگ و بو سے سامانِ سفر باندھ کر آگے بڑھ چکے ہیں۔ اور جن کا ملنا اب یہاں ممکن نہیں۔ غالب نے کہا تھا ؎

سیکھے ہیں مہ رُخوں کے لئے ہم مصوری　　　تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیئے۔

ممکن ہے، غالب کو مہ رُخوں کی تصویریں دیکھ کر ہی سچی صحبت کا لُطف مل گیا ہو۔ ہم تو تصویروں سے آسودہ نہیں ہوتے اور نہ ہو سکتے ہیں۔ کسی انسان، دُور دراز خطے میں بسنے والا انسان یا انسانِ رفتہ سے رفاقت اور معیت کا واحد ذریعہ فنِ سوانح نگاری ہی ہے۔

سوانح نگاری ادب کی ایک ایسی صنف ہے جس میں کسی بزرگ و بالا انسان کی مہد تا لحد پوری زندگی اپنے تمام کارناموں کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ یہاں ہم ایک سچے انسان سے ملتے ہیں۔ حالی، آزاد یا خواجہ سگ پرست کی طرح اُسے ہم فرض نہیں سمجھتے اور نہ اُس کی شخصیت پر ہمیں کوئی وہم گزرتا ہے۔ وہ تو عناصرِ اربعہ کا واقعی ظہورِ ترتیب ہوتا ہے۔ ہم اُسے اپنے آس پاس کی دنیا میں سانس لیتے دیکھتے ہیں اور اپنا محب سمجھتے ہیں۔ اور اگر وہ اجزائے پریشاں شدہ ہے، ہماری آنکھوں سے دُور، بہت دُور، ایک دوسری دنیا میں جا چکا ہے تو ہم اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ کل ہمارے اسلاف نے اُسے دیکھا تھا۔ اُس کی صحبت بھی اختیار کی تھی۔

ابھی کہا گیا کہ سوانح نگاری ایک ایسی صنف ہے جس کے ذریعہ ہم کسی بُزرگ و بالا انسان سے ملتے ہیں۔ الفاظ "بزرگ و بالا" توجہ طلب ہیں۔ کارلائل، جانسن، مارشل سوب وغیرہ مغربی نقادوں کا خیال ہے کہ سوانحی فرد کا بلند و بالا انسان ہونا شرط نہیں۔ یہ کوئی معمولی اور ادنیٰ انسان بھی ہو سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عام بشری زندگی میں بھی کامیاب سوانح نگاری کے مواد موجود ہوتے ہیں۔ ایک سوانح نگار کے لئے ضرورت صرف یہی بات

کی ہوتی ہے کہ کسی سے فنکارانہ تعریف لے۔ اُن کی رائے میں کسی بھی انسان کی زندگی اُس کے اشتغال اور فضائل کے منصفانہ اظہار اور فطری خصوصیات سے قابلِ قدر سوانحِ حیات مرتب ہو سکتی ہے۔ لیکن مسٹر سٹریچی، لی، کوپر، آندرے موروس وغیرہ نے اس خیال پر سخت نکتہ چینی کی ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ یہ خیال محض نہیں، اس میں رنگ ہے۔ رنگ یہ ہے کہ معمولی انسان کی زندگی میں ایسی کوئی خاص بات نہیں ہوتی جو قاری کی توجہ کا مرکز بن سکے نیز اُس کی زندگی کے اکثر حالات تلاشِ بسیار کے بعد بھی معلوم نہیں ہو پاتے۔ وہ اپنی محرومیت کے سبب مٹ جاتے یا دھندلے پڑ جاتے ہیں اور دوسرے لوگ انہیں ہمیشہ ناقابلِ اعتنا سمجھتے ہیں۔ ایسی زندگی، زندگی کے مٹے مٹے نقوش پر سوانحِ حیات کیسے مرتب کی جا سکتی ہے؟

اس خیال سے یقیناً اتفاق کیا جائے گا کہ سوانح نگاری کے لئے ایسا ہی فرد منتخب کرنا چاہئے جو نامور ہو جس کے کارنامے بلند اور دلکش ہوں۔ مسٹر سٹریچی کے خیال کو دُہراتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ سوانحی موضوع کو سنجیدہ، مکمل، دلچسپ اور باوقار ہونا چاہئے۔

اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ موضوع کی اہمیت کی بنیاد محض خوبیوں کی بہتات پر ہو اور خامیوں سے نظریں بچالی جائیں۔ خوبیاں اور خامیاں تو انسانی فطرت میں داخل ہیں۔ بات یہ ہے کہ "ہر آدمی بجائے خود ایک محشرِ خیال" محشرِ خیالی میں وہ قسم قسم کی حرکات کرتا ہے۔ مختلف راہیں اپناتا ہے۔ کبھی راہِ مستقیم پر چلتا ہے اور کبھی گمراہیوں میں سے ہو جاتا ہے۔ وہ جس معاشرہ کا فرد ہے، اُس سے اُس کے گونا گوں تعلقات ہوتے ہیں۔ اپنے تعلقات کو کبھی وہ حسن و خوبی سے نبھاتا ہے، کبھی شرّی قوت بن کر انہیں منتشر کر دیتا ہے اور یہ سب اُس کی مزاجی کیفیت اور تقاضائے گردشِ ایام پر منحصر ہے۔

جب ہم سوانح عمریوں کی بات کرتے ہیں تو ہمارے پیشِ نگاہ ایسا ہی انسان ہوتا ہے۔ یقیناً وہ ڈھیر ساری خوبیاں رکھتا ہے۔ لیکن دوسری جانب اُس کی سیرت میں خام و پُر تضاد اور ناقص پہلو بھی ہوتے ہیں۔ اُن سے اغماض ہرگز مناسب نہیں بلکہ یہ بددیانتی ہے۔ یہ ادبی جرم ہے کہ اس کی وجہ سے شخصیت حقیقت کی ترجمان ہونے کی بجائے پُر فریب ہو جاتی ہے۔ "شخصیت کی تصویر کشی میں بشریت کے رُخ و رُخسار" کا خیال لازمی ہے اور یہ صرف اس وجہ سے نہیں کہ ہم دوسروں کے بھید جاننے کی تاک میں رہتے ہیں، بلکہ اس وجہ سے بھی کہ سوانح نگاری کا ایک مقصد یہ بہت بڑا مقصد ــــــ کوئی ایسی زندگی ہمارے پیشِ نظر ہو جسے ہم اپنے لئے مشعلِ ہدایت سمجھیں اور جو ہمیں صداقت، شجاعت اور عدالت کا سبق پڑھائے۔ یا پھر ایسی زندگی جو ہمارے لئے عبرتناک ہو۔ جس کے مطالعہ کے بعد ہم غار میں گرنے سے بچ جائیں اور آئندہ کے لئے سلامت روی کی قسم کھالیں۔

یہ ہے سوانحی موضوع کا انتخاب۔ سوانح نگار کو لازم ہے کہ وہ اپنے ہیرو (سوانحی شخصیت) کی زندگی کے تمام احوال و کوائف اکٹھا کرے۔ یہ کچھ آسان کام نہیں ہے۔ اسے بڑے صبر و تحمل سے تحقیق کرنی ہوگی، اصولِ تحقیق بھی جاننا ہوگا۔ اگر وہ کوتاہ کار ہے اور تحقیقی بصیرت بھی نہیں رکھتا تو نتیجہ ہرگز سود مند نہ ہوگا ــــــ اچھا سوانح نگار ایک اچھا محقق بھی ہوتا ہے۔ وہ مختلف جہتوں اور نئے نئے پہلوؤں سے اپنے ہیرو کی زندگی، اُس کے کارنامے اور عادات و اطوار کا سُراغ لگاتا ہے۔ مثلاً فرض کیجئے، سوانحی فرد کوئی ادیب یا شاعر ہے۔ تو اُس کی ادبی تخلیقات کے علاوہ اُس کے روزنامچوں، ملفوظات، ڈائری، خطوط، مطائبات، معاصرانہ خیالات، حلقۂ احباب، دوستانہ تعلقات وغیرہ کا جائزہ اُس کی شخصیت کو پہچاننے کا مفید ذریعہ ہو سکتا ہے۔ علاوہ ازیں، اُس شخص نے اپنی زندگی کے دن کہاں کہاں اور کیسے گزارے، کیسی صحبت ملی۔ کیسے واقعات پیش آئے؟ زندگی میں کیا دِقتیں حائل ہوئیں؟ پھر یہ کیسے دُور ہوئیں؟ ناموری کی کیا سہولتیں تھیں؟ پستی اور گمنامی کے کیا اسباب تھے۔ کیسا خاندان تھا؟ خاندان کے مراسم کیسے تھے؟ وغیرہ وغیرہ جیسے اُمور سے زندگی اور سیرت پر پوری روشنی پڑتی ہے۔ اس لئے اُن کی تفصیلات میں جانا ناگزیر ہے۔

سوانحی فرد کی زندگی کے سارے احوال فراہم کر لینا ہی سب کچھ نہیں ہے۔ بہت ممکن ہے اُن میں اغراق و اہمال کی فراوانی ہو مستند باتوں کے ساتھ افواہیں بھی شامل ہوں۔ اس لئے واقعات کا انتخاب سنبھل کر کرنا چاہئے۔ سوانح نگار اگر بصارت و بصیرت سے کام نہ لے تو دھوکہ کھا سکتا ہے۔ واقعات کے انتخاب و ترتیب میں اُسے ہمیشہ ثبوت اور دلائل ڈھونڈھنے چاہئیں۔ اور بغیر ثبوت یا سند کے کوئی واقعہ ہرگز نہ لکھنا چاہئے، خواہ اُس سے ہیرو کی شخصیت

بعض کی مخالفت کیوں نہ پڑتی ہو۔ اس سلسلے میں سوانح نگاری کے ناقدین ہڈسن کے اس قول کو زور شور سے نقل کرتے ہیں کہ سوانح میں ساری باتیں لکھنے کی ضرورت نہیں۔ اعلیٰ سوانح نگار صرف اُنھیں باتوں کو لکھتا ہے جن سے ہیرو کی شخصیت پر روشنی پڑتی ہے" لیکن یہ غور نہیں کرتے کہ ہڈسن کے خیال میں کتنی سطحیت ہے! ہڈسن کا یہ خیال محض ایک حد تک تو درست کہا جا سکتا ہے لیکن اُسے مکمل سوانحی اُصول کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ غور تو کیجئے۔ سوانح نگار صرف اُنھیں باتوں کو لکھتا ہے جن سے ہیرو کی شخصیت پر روشنی پڑتی ہے

غالب کے متعلق میں نے سُنا کہ ایک صاحب کہتے ہیں: غالب خستہ جاں کو آتشِ سیّال نے روسیاہ کیا، ورنہ وہ آدمی تو کام کے تھے۔ وہ ہمیشہ جام و مینا سامنے رکھتے۔ موج مے کی انگڑائیاں دیکھتے۔ اُسے نوش فرماتے اور پیچ و تاب کھانے لگتے۔ جہاں جاتے ساتھ رکھتے۔ مسجد میں نہیں پیتے، احترامِ حرم تھا۔ مگر ایک بار دل میں کیا خیال گزرا کہ منبر و محراب کے آگے بیٹھ گئے۔ مئے ناب جام میں ڈھالی۔ قلقل کی آواز پیش امام وغیرہ نے کہا ہائے! یہ کیا حماقت ہے۔ للہ مسجد میں نہ پیجئے۔ نمازیوں نے بھی منع کیا پر طبیعت ضد کی اور زبان سے یہ شعر ادا کیا ؎

زاہد شراب پینے دے مسجد میں بیٹھ کر　　　یا وہ جگہ بتا دے جہاں پر خدا نہیں

مجبوراً حبوں نے دھکّے دے کر باہر کیا۔ غالب کو بعد خفت ہوئی۔ اس سے قبل بھی وہ دَیر، دَر اور آستانہ سے نکالے گئے تھے۔ اُن کے حرم میں ان کی رُسوائی ہوئی۔ چل اُٹھے اور بڑبڑاتے ہوئے آگے بڑھ گئے کہ یا خدا، یہ کیسے تنگ نظر اور متعصب دیندار نا مسلمان ہیں! بہر صورت سامنے والی رہگزر پر بیٹھنا چاہیئے۔ وہاں کسی کا کیا؛ بس یہ خیال کر کے بیٹھے ہی تھے کہ کارپوریشن کا جاروب کش آیا۔ اُس نے دیکھا کہ ایک شکستہ دل شخص اُونچی بوٹی والی ٹوپی پہنے، اپنی گرد آلود داڑھی کھجلا رہا ہے۔ اور کچھ بولتا نہیں۔ سر نیچے کئے کسی خیال میں غرق ہے۔ اُس نے کہا، بڑے میاں! یہاں سے اُٹھئے، جھاڑو لگاؤں گا۔" غالب جھنجھلا اُٹھے۔ اُس سے جھگڑ بیٹھنے کے سے انداز میں بولے ؎

دَیر نہیں حرم نہیں دَر نہیں آستاں نہیں　　　بیٹھے ہیں رہگزر پہ ہم، کوئی ہمیں اُٹھائے کیوں؟

جاروب کش سمجھ گیا کہ یہی مرزا نوشہ ہیں جن کی قدر سے لوگ بیگانہ ہیں۔ فوراً اُس نے اپنا سر قدموں میں ڈال دیا۔

دیکھا آپ نے؟ یہ ایک لطیفہ ہے۔ مگر غالب کی سیرت پر کیسی صاف و شفاف روشنی ڈالتا ہے۔ اس سے غالب کی سیرت پر پوری روشنی پڑتی ہے، تو کیا ہم غالب کی سوانح عمری مرتب کرنے میں بلا چون و چرا اس لطیفہ سے کام لیں گے؟ اور فرض کیجئے یہ لطیفہ نہیں۔ حیاتِ غالب کا ایک سچّا واقعہ ہے تو کیا ہم صرف اس کے ذکر پر اکتفا کریں گے! پھر ہمیں یہ کیسے معلوم ہو گا کہ یہ محض ایک لطیفہ ہے، یا ایک سچّا واقعہ ہے؟ ہڈسن کے خیال میں ہمیں اس سوال کا جواب نہیں ملتا۔ یعنی، یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ سوانح نگار تحقیق و تنقید سے کام لے اور دلائل پیش کرے۔ سچّی بات یہ ہے کہ کسی واقعہ کے ذکر میں تمام متعلقہ اُمور پر تحقیقی نگاہ ڈالنا انتہائی ضروری ہے اور جب وہ واقعہ محقق ہو جائے تو ہم اُسے لکھیں گے، ورنہ اُس کا رقم کرنا زبردست نادانی ہو گی۔

سوانح نگار اپنے ہیرو کی زندگی کے تمام واقعات فراہم کر لیتا ہے۔ اُن میں سے مدلّل اور مثبت واقعات کو چھانٹ بھی لیتا ہے۔ تب اُس کے سامنے ایک نئی ضرورت آتی ہے۔ یعنی، وہ اُن واقعات کو کس ترتیب سے پیش کرے۔ ایک بلند پایہ سوانح نگار ہمیشہ حسنِ ترتیب کا خیال رکھتا ہے۔ اس سے خود اُس کی تہذیب و شائستگی ظاہر ہوتی ہے۔ حسنِ ترتیب کے متعلق آندرے موروس نے پلوٹارک کے سوانح پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ پلوٹارک نے پہلے ہیرو کے کارناموں کے اعداد لکھے، پھر اُن واقعات کو جن سے شخصیت منکشف ہوتی ہے۔ یہ طریقہ غلط ہے۔ آندرے موروس کا خیال ہے کہ اس طریقۂ کار سے قاری اُن دلچسپیوں سے محروم ہو جاتا ہے جو شخصیت میں پنہاں ہوتی ہیں۔ اس لئے سوانح نگار کو چاہیئے کہ پہلے پوری زندگی، زندگی کے واقعات اور نشیب و فراز پر روشنی ڈالے۔ اور مختلف حادثات و سانحات جو اُس کی زندگی میں رونما ہوتے رہے ہیں۔ اُن کے سہارے سیرت کو اُجاگر کرے۔ اُس کے کارناموں کا ذکر آخر میں ہونا چاہیے۔

یہ ہیں سوانح نگاری کے چند اُصول۔ اب طرزِ نگارش کے لحاظ سے دیکھئے۔ سوانح میں اسلوب یا اندازِ بیان کی اُصولی بحث بھی ہوتی ہے

ــ یہ میرے نزدیک ایک اہم اصول ہے۔

سوانح کی طرح تاریخ کا موضوع بھی انسان ہی ہے۔ تواریخ میں بھی ہم کسی انسان سے ملتے ہیں۔ لیکن سوانح اور تاریخ میں فرق ہے۔ اور جتنی باتیں ان دونوں میں امتیاز پیدا کرتی ہیں اُن میں ایک اظہار کا ادبی و غیر ادبی پیرایہ ہے۔ تواریخ میں ادبی اظہارِ خیال پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ سوانح کا پیرایۂ بیان سراسر ادبی ہوتا ہے۔ سوانح نگار کا اسلوب اگر ادبی لطافتوں سے بری ہے، زندگی کے کوائف محض خشک پھیکے اور بے جان انداز میں پیش کیے گئے ہیں تو سوانح کی حیثیت واقعات کی کھتونی سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔

سوانحی اسلوب ادبی لطافتوں سے پُر ہونے کے ساتھ ساتھ نیرنگ ہوتا ہے۔ اُسلوب کی نیرنگی اِس فن کا تقاضہ ہے۔ مگر افسوس کہ ہمارے بہت سے سوانح نگاروں نے اِس اہم تقاضہ کی جانب نگاہِ غلط انداز بھی نہیں کی ہے۔ اُنھیں اِس کا علم نہیں کہ واقعہ اور بیان میں ناگزیر ربط ہے۔ ہر واقعہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے بیان چاہتا ہے۔ اگر واقعہ کی نوعیت کے مطابق زبان و بیان کو اختیار نہ کیا جائے تو یہ کلام کا نقص ہے۔ سوانحی اسلوب پر میں تفصیل سے اظہارِ خیال کرنا چاہتا ہوں۔

جس طرح ایک انسان کی زندگی کے تین ادوار ہوتے ہیں ـــــــ طفلی، شباب اور پیری۔ یعنہٖ سوانح نگاری کا اسلوب بھی تین ڈھب کا ہوتا ہے۔ سوانحی فرد کی طفلی کے ذکر میں سوانح نگار صاف سادہ الفاظ، غیر استعاراتی فقرے اور چھوٹے چھوٹے رواں جملوں کے استعمال سے ایک معصوم فضا پیدا کرتا ہے۔ عہدِ شباب کے ذکر میں ادائے نگارش رنگین، مرصّع اور شوخ ہوتی ہے۔ حَسین تشبیہات، نادر استعارات لطیف اشارے اور کنائے، دلنشین ترکیبیں، چُست فقرے اور جچے ہوئے خوبصورت جملے قاری کو جوانی کے دن یاد دلاتے ہیں۔ اِتنا ہی نہیں ان سے عزم، ہمت اور حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔ سوانح نگار اگر چالاک ہے، اگر وہ "ہر سخن جائے و ہر نکتہ مکانے دارد" کے بھید سے واقف ہے تو ذکرِ شباب میں اُس کا قلم ضُعف سے گریہ کُناں نظر نہیں آسکتا۔ بلکہ جلال کی شعلہ سامانیاں اور جمال کی دلفریبیاں پیدا کرتا ہے۔ یہاں یہ خیال نہ کیجئے کہ پیری میں تو قویٰ مضمحل ہو جاتے ہیں، اِس لئے سوانح نگار کا قلم بھی ایسا چلے جیسے معلوم ہو کہ بیمار ہے۔ میرا مقصد یہ نہیں ہے۔ پیری کے بیان میں اُسلوب نہایت سنجیدہ، پختہ و پُر وقار ہونا چاہئے۔ جیسے خود پیری سنجیدہ، پُختہ و پُر وقار ہوتی ہے۔ یہاں لفاظی اور سطحی انشا گری سے کام نہیں چلتا۔ تشبیہیں اور دیگر صنعتیں مستعمل ہو سکتی ہیں، مگر وہ جن سے چھچھلی جذباتیت ظاہر نہ ہو، بلکہ جن میں مشاہدہ کا عمق ہو۔ کچھ ظرافت بھی پیش کی جا سکتی ہے مگر دیوانہ قہقہہ کی گرمی کرنی مناسب نہیں، ایسی ظرافت جس کے تبسّم میں تجربہ پنہاں ہو۔

اِس تصریح سے مغالطہ کا احتمال ہے۔ اس لئے ایک بات اور عرض کر دوں۔ سوانح نگار یہ کبھی نہ بھُولے کہ وہ ایک سچے انسان کی زندگی رقم کر رہا ہے۔ اُسے ایسی کوئی بات ہرگز نہ لکھنی چاہئے جو فرضی ہو۔ اور یہی حال اُسلوب کا ہے۔ تحریر میں کوئی ایسا لفظ تشبیہ یا استعارہ استعمال کرنا خطرہ سے خالی نہیں، جس کا مفہوم متعین اور واضح نہ ہو۔ رنگین، مرصّع اور شوخ تحریر سے میری یہ مراد نہیں کہ الفاظ و تراکیب کی رنگینی کا چربہ ڈالا جائے یا جھوٹی اور بے مزہ شاعری شروع کر دی جائے۔ جیسے یہ شعر ہے ؎

جو میٹھی میٹھی نظروں سے وہ دیکھے سمجھوں آنکھوں کو میں بادامِ شیریں

میٹھی میٹھی نظریں ـــــ آنکھیں ـــــ بادامِ شیریں، کیسے میٹھے میٹھے الفاظ ہیں! لگتا ہے، اُن میں قند کی مٹھاس، گلاب کی خوشبو اور شراب کی تاثیر ہے۔ مگر کچھ اصلیت نہیں۔ میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھنے سے آنکھیں کبھی بادامِ شیریں نہیں ہو سکتیں۔ سوانح میں یہ لفاظی کبھی نہیں کی جاتی۔ سوانحی فرد کی زندگی کی مختلف منزلیں جس نوعیت کی ہوں، اُسی طرح کا اُسلوب اپنانا چاہئے۔ یوں تو جوانی میں طبیعت کچھ نہ کچھ رنگین ہوتی ہی ہے۔ اگر سوانحی شخص کی زندگی میں شباب کی رنگینیاں مطلق نہیں تو اُسلوب سے رنگینی بکھیرنا عبث ہے۔

سوانح نگار سے مختلف اسالیب کی توقع رکھنا مشکل تو ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں۔ مولانا شبلی ہی کو لیجئے۔ شبلی اپنے زمانہ کے نہ اچھے اور بلند پایہ نثر نگار تھے۔ اُن کی مشہور تصنیف سیرۃ النبیؐ جلد اوّل دیکھئے۔ اس کا وہ حصّہ جو مغربی مصنفین کے اعتراضات کے جواب میں ہے،

جس میں مخالفت کا نام و نشان نہیں، کہ گھن گرج کی بھی کیفیت ہے۔ پھر اسی جلد اوّل کا وہ حصہ ملاحظہ کیجئے جہاں مولانا شبلی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سعید کا ذکر چھیڑا ہے۔ آپ کو احساس ہوگا کہ جب ایک ناقص دنیا کا خاتمہ ہو رہا ہے اور ایک مکمل و متوازن دنیا، امن اور بہبود کی دنیا پھیل رہی ہے۔ ہر طرف چمن ہے، سبزہ ہے، بہار ہے، نور کی برسات ہے۔ چاند ستارے [illegible] ہیں، گلشن مہک رہا ہے۔ ملائکہ کرم فرما رہے ہیں۔ گویا ایک مسرت کا عالم ہے اور چاروں طرف شگون ہی شگون ہے ——— [illegible] محبوبِ حمت ہے اور یہ ساری کیفیتیں شبلی نے اپنے اسلوب سے پیدا کی ہیں۔

یہ وہ خصوصیت ہے جس کے باعث ایک سوانح نگار ایک مورخ سے ممتاز ہوتا ہے۔ اور اس خصوصیت کے فقدان کا نمونہ حالی کی تصنیف یادگارِ غالب میں دیکھئے۔ حالی کا نثر یک رنگ ہے۔ جو ڈھنگ یا انداز وہ مقصدی شعر و شاعری میں اپناتے ہیں، وہی ڈھنگ یادگارِ غالب میں بھی نظر آتا ہے۔ حالی اپنے خیالات کو واضح اور متعین الفاظ میں ظاہر کر دیتے ہیں لیکن طرزِ تحریر سے غالب کی شخصیت کا عکس نہیں جھلکتا۔ غالب کی فطرت میں ایک شوخی تھی، جمال پرور خیال تھا، رنگینی تھی۔ اور حالی اس سے واقف تھے لیکن اپنی رفتارِ قلم سے کہیں بھی آرائشِ جمال و خیال نہ کر سکے۔ غالب کہتے ہیں ؎

ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا — بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

" اور بیاں اپنا " ——— غالب کے شاگردِ رشید ہونے کے باوجود حالی میں یہ خصوصیت نہیں۔ وہ اپنے زورِ بیان سے رفیق کو رقیب یا رقیب کو رفیق بنانے کا حال نہیں جانتے۔ سوانح نگار محض واقعہ نویس نہیں ہوتا۔ وہ ایک صاحبِ طرز ادیب بھی ہوتا ہے اور قلم سے " جادو " جگانے کا گر جانتا ہے۔ حالی میں اگر یہ صلاحیت ہوتی اور اس سے مدد لیتے تو یادگارِ غالب کی ادبی حیثیت زیادہ سے زیادہ بلند ہو جاتی۔ دیکھئے، غالب کی سیرت کو اُبھارنے میں انھوں نے لطیفوں سے کام لیا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ غالب کی فطرت میں شوخی تھی۔ بات کو برجستہ و برمحل اس طرح کہنے کی عادت تھی کہ سننے والا چونک پڑتا، پھر تا دیر محظوظ ہوتا۔ شاہ و ملازم، پیر و گدا سب کو غالب مناسب جواب دیتے اور ہنس کر ٹال دیتے۔ حالی اتنا ذکر کر سکتے تھے کہ غالب کی اس خصوصیت کو اُجاگر کرنے میں سودا کا یہ شعر لکھ دیتے۔ ؎

بات اس لطف سے ہے کہ تجھی کہ دہن سے اُس کے — بادہ جوں ساغرِ لبریز سے جاتا ہے چھلک

اس ایک شعر کے پیش کر دینے سے قاری غالب کی طرزِ گفتگو سے ایسا ہی محظوظ ہو سکتا ہے جیسے کوئی اپنے بے تکلف دوستوں کی صحبت سے ہوتا ہے۔ یادگارِ غالب میں حالی کے اسلوب کی یہ بہت بڑی کمزوری ہے۔

سوانحی اسلوب کے سلسلے میں ایک اور بات قابلِ ذکر ہے اور وہ ہے منصفانہ اظہار۔ منصفانہ اظہار مگر کچھ سہل نہیں۔ مت سہل ایسے جانو۔ یہاں اکثر سوانح نگار خطرہ میں پڑ جاتے ہیں۔ اگر وہ حقیقت پسندی برتیں، ہیرو کے نیک اور بد پہلوؤں کے ساتھ اُس کے بُرے عمل پر بھی خامہ فرسائی کریں تو " تعلقات کے نازک شیشے ٹوٹ جانے کا خوف ہوتا ہے۔ اس لئے وہ اُن سے اغماض کر لینا ہی مناسب سمجھتے ہیں۔ اگر سوانح نگار ادبی دیانت سے کام لیں تو تعلقات کا نازک شیشہ " نہیں ٹوٹ سکتا۔ اس کے دو راستے ہیں : ۔

(۱) اطلاق بے تعلقی (۲) خارجی طریقۂ کار

(۱) مولانا سید سلیمان ندوی اپنی تصنیف " حیاتِ شبلی " کے مقدمہ میں لکھتے ہیں :

" خاکسار کو یہ دعویٰ نہیں ہے کہ یہ تالیف سوانح عمریوں کے اُصول پر پوری طرح منطبق ہے، تاہم یہ کوشش کی گئی ہے کہ جو کچھ معلوم ہو سکا بلا کم و کاست سپردِ قلم کر دیا جائے۔ مولانا کے سوانح میں بعض ناخوشگوار اور معاصرانہ [illegible] بھی ہوا ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ اس کشمکش کے تلخ اظہار و واقعات کے نشتروں کو قلم کی بے احتیاطی سے نشتر نہ لگنے پائے اور کسی [illegible] کے ذکر کے موقع پر دامن کو راہ کے کانٹے سے بچا کر نکالا جائے۔ ... محبت اور عقیدت کی نظر خرد ہو رہی [illegible] کو ظاہر کیا کر

دیکھنے سے قاصر رہتا ہے۔

اس اقتباس کی خاص باتیں یہ ہیں:

(الف) کوشش کی گئی ہے کہ جو کچھ معلوم ہو اُس کو بے کم و کاست سپرد قلم کر دیا جائے۔

(ب) کوشش کی گئی ہے کہ اس کشمکش (مولانا کے سوانح میں بعض رفقائے کار اور معاصرین سے کچھ الجھاؤ بھی رہا ہے) کے تاریخی اظہار میں تعلقات کے شیشوں کو قلم کی بے اعتدالی سے ٹھیس نہ لگنے پائے اور کسی ناگوار واقعہ کے ذکر کے موقع پر دامن کو راہ کے کانٹے سے بچا کر نکالا جائے۔

(ج) محبت اور عقیدت کی نظر مخدوموں کی بہت سی خامیوں کو دیکھنے سے قاصر رہتی ہے۔

سوانح نگار مصلحت اندیش نہیں ہوتا۔ وہ زندگی کے پختہ اور خام عمدہ اور ناقص دونوں پہلوؤں پر نظر رکھتا ہے اور دونوں کو زیر قلم کرتا ہے۔ اُسے کچھ خوف و خطر نہیں ہوتا وہ بے خطر انسانی حیات کی قلمبندی کرتا ہے۔

سید سلیمان ندوی یوں کہتے ہیں کہ "مولانا کے سوانح میں بعض رفقائے کار اور معاصرین سے کچھ الجھاؤ بھی رہا ہے" مگر اس "الجھاؤ" کا ذکر نہیں کرتے کہ "تعلقات کے شیشوں کو قلم کی بے اعتدالی سے ٹھیس" لگ جانے کا خطرہ ہے۔ سچے پوچھئے تو تعلق کوئی ایسا کوئی نازک شیشہ نہیں کہ ہلکی ٹکر سے بھی ٹوٹ پھوٹ جائے اور اگر ایسا ہی ہے تو ایک بلند پایہ سوانح نگار اپنے ہیرو کی کشمکش میں ان "شیشوں" کا خیال نہیں کرتا۔ پھر، معاصرین سے "الجھاؤ" اور زندگی کی خامیوں کا ارقام "قلم کی بے اعتدالی" ہرگز نہیں ہے۔ قلم کی بے اعتدالی تو یہ ہے کہ خواہ مخواہ شخصیت پر تہمت آجائے یا عقیدت کے جوش میں بہت سی باتیں اَن کہی رہ جائیں۔

سوانح نگار اپنے ہیرو کے جتنے اور جس نوع کے حالات جانتا ہے انھیں بعد تحقیق سے منزہ کر کے قاری کے سامنے پیش کرتا ہے۔ پردہ پوشی یا عیب جوئی اُس کی عادت نہیں ہوتی وہ ایک مخلص اور شفیق دوست ہوتا ہے اور اپنے ہیرو کو بھی محب ہی سمجھتا ہے اس لئے جرأت مندانہ اقدام کرتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ سوانح ہر عام و ادنیٰ انسان کے نہیں لکھے جاتے۔ سوانحی شخص علوم و فنون کے ایک یا کئی شعبوں میں ماہر اور نادر ہوتا ہے۔ جس کی ہستی نادرِ زمانہ ہوتی ہے۔ اُس کی تخلیق کے لئے فلک برسوں پھرتا ہے۔ ایسے "عظیم المرتبت" اور "غالی فطرت" انسان کی "لائف" لکھنے میں سوانح نگار کا پوری طرح اثر پذیر ہونا یقینی ہے مگر وہ اُسے اپنا "مخدوم" نہیں سمجھتا۔ "مخدوم" سمجھ لینے پر اُس سے مرعوب ہو جانا بھی لازمی ہے۔ سوانح نگار اگر اپنے ہیرو سے متاثر اور مرعوب ہو جائے تو اخلاقی بے تعلقی قائم نہیں رہ سکتی۔ مولانا سید سلیمان ندوی کے مذکورہ بالا اقتباس میں جن باتوں کی جانب اشارے کئے گئے وہ اخلاقی تعلقات کے نتائج ہیں۔ اور اسی وجہ سے حیاتِ شبلی میں مولانا شبلی نعمانی کی سچی تصویر نظر نہیں آتی۔

اس اخلاقی تعلق کی وجہ سے یادگارِ غالب میں مولانا حالی نے بھی لغزش کھائی ہے۔ لکھتے ہیں:

"راقم کو مرزا کے کلام کے ساتھ جو تعلق عہدِ شعور سے آج تک برابر چلا آرہا ہے، اُس کو جا بجا معتقدانہ جوشِ محبت کا نتیجہ سمجھو جو انسان کو اندھا اور بہرا کر دیتا ہے اور چاہو اُس یقین کا ثمرہ خیال کرو جو نہایت زبردست شہادتوں سے حاصل ہوتا ہے۔"

الفاظ خط زدہ توجہ طلب ہیں:

(الف) ... اس کو چاہو معتقدانہ جوشِ محبت کا نتیجہ سمجھو ....

(ب) ..... اور چاہو تو اس یقین کا ثمرہ خیال کرو ....

یہ یادگارِ غالب کی تصنیف کے اسباب ہیں تم جو چاہو، سمجھو

حالی نے "معتقدانہ جوشِ عصبیت" قائم کیا یا "زبردست شہادتوں سے یقین کا ثمرہ" حاصل کیا ـــــــ جو کچھ کیا وہ مرزا کے کلام کے "ساتھ" ہے۔ خود مرزا کے ساتھ نہیں۔ اس لئے خیال ہوتا ہے کہ مرزا کے احوال کے بیان میں حالی نے "اخلاقی بے تعلقی" برتی ہوگی لیکن سچائی یہ ہے کہ ایسی بات نہیں۔ غالب کی زندگی کے چند سچے واقعات حالی نے چھوئے تک نہیں۔ مثلاً غالب کے من گھڑت استاد ملا عبدالصمد کا ذکر یا مرزا کے عشق کا تفصیلی حال۔ یہ واقعات "معتقدانہ جوشِ عصبیت" ہی کی وجہ سے پردۂ خفا میں رہ گئے ہیں۔

(۲) اب دوسری راہ پر آئیے۔ یہ اسلوب کا خارجی طریقۂ کار ہے ـــــ سوانح نگار، ایک بے باک سوانح نگار ہمیشہ بیانیہ انداز اپناتا ہے۔ گو وہ اپنے ہیرو کے احساسِ پنہاں کو چھوتا ہے، اس کی جانچ پڑتال بھی کرتا ہے مگر اپنے احساس کو اس میں نہیں ملاتا۔ بات یہ ہے کہ ہر ایک انسان کی زندگی میں نشیب و فراز آتے ہیں۔ پھر سوانحی انسان جو عام انسانوں سے بالا ہوتا ہے، اس کی زندگی تو مسلسل فتح و شکست کا شکار رہتی ہے۔ عام انسانوں سے سوانحی افراد کے احساسات زیادہ نازک ہوتے ہیں۔ ان نازک احساسات کی شکست و ریخت سے اگر سوانح نگار بھی تڑپ اٹھے تو اندازِ بیان میں داخلیت کا آجانا عین ممکن ہے۔ ایسی صورت میں سوانحی فرد کے جذبات سے کہیں زیادہ خود سوانح نگار کے تاثرات ابھرنے لگتے ہیں اور یہ بڑھتے ہی جاتے ہیں۔ سوانح نگار اگر اپنے احساسات کی روک تھام نہ کرے تو سوانح حیات افسانہ بن جاتی ہے۔ اس لئے اسے اپنے جذبات پر کڑی نگاہ رکھنی چاہیئے۔ رقیق القلب ہونا اس کے لئے انتہائی مہلک ہے

سوانح نگار کو طنز و تشنیع سے بھی بچنا چاہیئے۔ سمجھدار سوانح نگار طناز نہیں ہوتا۔ طنزیہ نگار کی طرح مسخرہ پن اس کا شیوہ نہیں۔ سوانح نگاری ایک سنجیدہ صنفِ ادب ہے۔ سوانح نگار کو سنجیدگی سے لکھنا چاہیئے۔ نثری ادب میں سنجیدہ صنف ادبی تنقید بھی ہے۔ مگر یہاں نقاد کو آزادی ہے۔ وہ نکتہ چینی کرتا ہے۔ ذاتیات پر حملے بھی کر سکتا ہے۔ سوانح نگار ذاتیات پر کبھی حملے نہیں کرتا اور نہ تحقیر آمیز جملے لکھتا ہے۔ وہ تو بس نیک و بد ساری باتیں بتا دیتا ہے۔

سوانح نگاری کے صحیح اصولوں پر اردو کی بہت کم سوانح عمریاں اترتی ہیں اور اس طرف ہمارے ادیبوں نے بھرپور توجہ نہیں دی ہے۔ کاش ہمارے نئے سوانح نگار اس صنفِ ادب کے فنی امکانات سے پوری طرح معرف لیں اور منصب سوانح نگاری کو پورا کریں۔ ▲

بقیہ افسانہ "روح کا رشتہ" صفحہ ۔۔

کچھ خرید کر سیڑھیوں پر سے اتر رہی تھی۔ اور تم دکان میں جانے کے لئے سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ تمیں دیکھتے دیکھتے جذبات سے مغلوب ہو کر اچانک میرا پیر پھسل گیا اور میں لڑکھڑائی۔ تم نے بڑھ کر مجھے سنبھالتے ہوئے کہا کہ ماں سنبھل کر اترئیے۔ اس دن تمہاری زبان سے اپنے لئے ماں کا لفظ سن کر میری کوکھ کی تڑپ کو ابدی سکون مل گیا تھا ـــــــ ایک ماں کی تمام چیزوں کا وارث اس کا بیٹا ہی ہوتا ہے۔ اس لئے میں اپنا سب کچھ تمہارے نام کر رہی ہوں ......"

خط پڑھ کر میرا تمام بدن جھنجھنا اٹھا ہے۔ ممتا کے پیار میں ڈوبے ہوئے اس کے بوسوں کی حدت مجھے اپنے رخساروں پر محسوس ہو رہی ہے اور مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے سچ مچ میری ماں مر گئی ہو! یہ سچ ہے کہ رشتے صرف خون ہی کے نہیں ہوتے کچھ رشتے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا تعلق انسان کی روح سے ہوتا ہے۔ اس دن میں نے اسے ماں ضرور کہا تھا مگر جان بوجھ کر نہیں۔ سیڑھیوں پر اسے لڑکھڑاتے ہوئے دیکھ کر اچانک غیر ارادی طور پر میری زبان سے "ماں" نکل گیا تھا۔ غیر ارادی طور پر ہم سے جو بھی حرکت سرزد ہوتی ہے اس کا تعلق شعور سے ضرور ہوتا ہے۔ مگر لفظ 'ماں' کا تعلق شعور سے ہرگز نہیں ہوتا۔ یہ لفظ تو روح کی گہرائیوں سے نکلتا ہے۔ ▲

سید عارفی

جسم کی تلاش

جسم بھی ٹوٹ چکا، کون اِسے پہچانے
رُوح میری مجھے آواز نہ دے پائی کبھی
راستے بھی مری پرچھائیں سے آگے نہ بڑھے
اور احساس کی قندیل بجھی شام ڈھلے
رات گذری تو ہوا یہ محسوس
نیم وحشی سی کہانی تھی سُنانے کو جسے
صبحِ نو جیسے دبے پاؤں چلی آئی مرے کمرے میں

اور

میں شہرِ خموشاں میں کئی صدیوں تک
یہی سوچا کیا، جیسے مرا ٹوٹا ہوا بکھرا ہوا جسم
اِسی فرسودہ کہانی میں چھُپا بیٹھا ہے
میں نے سوچا کہ۔ اسے ڈھونڈھوں
اِسے اپنے قریب تو لاؤں
اور پوچھوں کہ مری ذات سے ہو کر تو جُدا
کیوں اساطیر کے زندان میں رہا ہے محبوس ؟

سطوت رسول

گیت

اِس بھیڑ میں، ہو نہیں اکیلا
آگے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ انسانوں کا ریلا
ٹھاٹھیں مارتی سڑکیں اُس پر
انسانوں کی فوج
کاریں، سائیکل، رکشے، تانگے
موج سے ملتی موج
چاروں اور ہے۔ پَر پھیلائے، دُکھڑا نیا نویلا
اِس بھیڑ میں، ہو نہیں اکیلا

ایک اک سے میں پوچھ رہا ہوں
اپنے دل کی بات
کہاں ہے میری منزل راہی
کون ہے میرے ساتھ
جتنے دکھ بھی مجھ پر آئے، سب ہنس کر میں جھیلا
اِس بھیڑ میں، ہوں میں اکیلا

تھک کر بیٹھ گئی ہیں سطوت
اب ساری آشائیں
ساری سمتیں، ایک سی سمتیں
خالی ساری دِشائیں

بستی بستی گھوم رہا ہے، شہروں کا البیلا
اِس بھیڑ میں ہوں میں اکیلا۔

کہانی

ش۔ نذیر الدین

روح کا رشتہ

کل میرے گھر کے سامنے کی حویلی نما کوٹھی میں رہنے والی بڑھیا طوائف مر گئی تھی۔ محلے کے لوگ مل کر اُس کی لاش کو سپردِ خاک کر آئے تھے۔ اُس کا کوئی ہمدرد کوئی اپنا نہ تھا۔ ایک بوڑھی طوائف کو کون اپنا کہے گا! اُس کی موت اُس حادثہ کی طرح تھی جو راہ چلتے ہوئے کسی کو نظر آجاتا ہے اور راہی چلتے چلتے ایک لمحہ کے لئے رُک کر افسوس کرتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے۔ اِس حادثہ کا کرب اُس پر لمحاتی ہوتا ہے۔ اِس لئے دوسرے لمحہ وہ اُس حادثہ کو بھول جاتا ہے۔ بوڑھی طوائف کی موت کا کرب بھی لمحاتی تھا۔ اُس کی لاش کو سپردِ خاک کرنے تک مجھ پر اُس کی موت کا کرب چھایا رہا۔ اُس کے بعد میں اُسے بالکل بھول گیا۔ رات کو اطمینان سے سویا بھی تھا۔ مگر آج صبح وہ بڑھیا کسی بدروح کی طرح میرے دل و دماغ پر چھا گئی ہے۔ اُس نے اپنی موت کے بعد آج اچانک اپنائیت کا اظہار کیا ہے۔ یہ اظہار اُس کے وکیل کی معرفت ہوا ہے۔ وکیل نے یہ انکشاف کیا ہے کہ بڑھیا کی وصیت کے مطابق اُس کی کل جائداد (جو پانچ لاکھ کے قریب تھی) اُس کے علاوہ جو کچھ بھی اُس کا ہے۔ اُس سب کا میں تنہا مالک ہوں۔ یہ خبر میرے وجود کو جھنجھوڑتی ہوئی، عورت کی جوانی کی طرح سارے محلہ میں پھیل گئی ہے۔ اور مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے کسی نے مجھے سرِ بازار ننگا کر دیا ہو۔ لوگ میرے اور اُس بڑھیا کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کر رہے ہیں۔ حالانکہ میری اور اُس کی عمر کو مدِ نظر رکھا جائے تو وہ میری ماں کی عمر کی رہی ہوگی اور جس وقت اُس کے شباب کا زمانہ تھا، تب تو میں پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔

لوگوں کی باتوں پر دھیان دینے کے لئے میرے پاس وقت نہ تھا۔ اِس لئے کہ اپنی جگہ میں خود بھی کچھ کم پریشان نہ تھا۔ اتنی ساری دولت کا اچانک تنہا مالک بن جانے کے باوجود میں بہت پریشان تھا۔ سرمایہ کبھی خالی ہاتھ نہیں آتا، اپنے ساتھ بہت سی اُلجھنوں کو بھی لے آتا ہے۔ میرے لئے یہی اُلجھن کیا کم تھی کہ اُس بڑھیا نے مجھے اپنی تمام جائداد کا وارث قرار دیا تو کیوں دیا؟ میرا اور اُس کا رشتہ کیا ہے؟؟

بہت سوچنے کے بعد میرے ذہن میں بچپن کے کچھ دھندلے دھندلے نقوش اُبھرے۔ میری عمر اُس وقت یہی کوئی چھ سات سال کی ہوگی۔ وہ طوائف سامنے کی کوٹھی میں رہتی تھی۔ اُس وقت وہ ادھیڑ عمر کی ہوگی۔ میں اکثر کھیلتے کھیلتے اُس کی کوٹھی کے قریب چلا جاتا تو وہ مجھے اشارے سے اپنے پاس بلا لیتی اور اپنی باہوں میں سمیٹ کر خوب بھینچ بھینچ کر پیار کرتی، میری جیب بہت سی ٹافیوں سے بھر دیتی۔ ٹافیوں کے لالچ میں میں ہر روز اُس کے پاس جانے لگا تھا۔ ایک دن میری ماں نے مجھے وہاں جاتے ہوئے دیکھ لیا تو مجھے بلا کر خوب ڈانٹا اور سختی سے تاکید کی کہ آئندہ وہاں نہ جایا کروں۔ وجہ پوچھنے پر مجھ سے صرف یہ کہا گیا کہ وہ بُری عورت ہے۔ بُری عورت کا مفہوم اُس وقت میری سمجھ میں نہیں آیا۔ مجھے تو صرف ٹافیوں سے مطلب تھا۔ اور میں ٹافیاں حاصل کرنے کے لئے ماں سے چھپ کر وہاں جانے لگا۔ ایک دن میری یہ چوری بھی پکڑی گئی۔ اُس دن ڈانٹ کے ساتھ مجھ پر مار بھی پڑی۔ پھر میں نے سزا کے ڈر سے وہاں جانا چھوڑ دیا۔ وہ عورت کبھی مجھے [illegible] تو میں دوڑ کر گھر آجاتا تھا۔ ایک دن وہ خود ہی مجھے لینے

کے لئے میرے گھر آگئی تو ماں نے اُسے بڑی طرح جھڑک دیا۔ اُس دن کے بعد اُس نے مجھے کبھی نہیں بُلایا۔

اُن دنوں اُسے محلّے سے نکال دینے کے لئے بہت سی تحریکیں چلیں مگر بڑھیا بھی بہت ڈھیٹ تھی۔ وہ مٹی سے اپنی جگہ جمی رہی۔ آخر لوگ ہی تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ اُن کے خاموش رہنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اب وہ طوائف بوڑھی ہو گئی تھی۔ ایک جوان طوائف ناگن کی طرح زہریلی ہوتی ہے تو ایک بوڑھی طوائف کیچوے کی طرح بے ضرر۔ ایک ناگن کے زہر کو تو محلّہ والوں نے برداشت کر لیا تھا اب ایک کیچوے کی بے بسی کو برداشت کر لینا کون سی بڑی بات تھی۔

اِن دنوں وہ ایک کیچوے کی طرح بے بس زندگی ہی گزار رہی تھی، سب سے الگ تھلگ اتنی بڑی حویلی میں اکیلی وہ اُس کا کوئی ساتھی، کوئی دوست اور کوئی اپنا نہ تھا۔ وہ دن بھر اپنی کوٹھی کے برآمدے میں بیٹھی کتاب پڑھتی رہتی یا پھر خلاؤں میں گھورتی رہتی۔ جیسے خلاؤں میں اپنے ماضی کی چلتی پھرتی تصویریں دیکھ رہی ہو —— اُس کی کوٹھی کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے اُسے بارہا دیکھا تھا۔ میرے نزدیک اُس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ ایک گزرنے والے کی طرح میں اُس پر ایک سرسری سی ڈال کر گزر جاتا تھا۔ میں نے کبھی اُس کے بارے میں سوچنے کی زحمت نہیں اُٹھائی۔ مگر آج اُس بڑھیا نے اپنی موت کے بعد اپنے بارے میں سوچنے کے لئے مجھے مجبور کر دیا ہے۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ اُس کا اور میرا رشتہ کیا ہے؟ ——، کیا میری کمسنی میں چند لمحے مجھے بھینچ بھینچ کر پیار کر لینے سے میرا اور اُس کا کچھ رشتہ قائم ہو گیا ہے؟ کیا رشتے یوں قائم ہو جاتے ہیں؟؟

بہت سوچنے کے باوجود جب میری سمجھ میں کچھ نہ آسکا تو میں نے بڑھیا کے وکیل کو بُلا کر بڑھیا کی دولت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ میں نے وکیل سے کہا کہ۔ چونکہ میرا اور اُس بڑھیا کا کوئی رشتہ نہیں ہے، اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ بڑھیا پاگل تھی جو اپنی تمام جائداد میرے نام کر گئی میری اِس دلیل پر وکیل نے وصیت پر کئے ہوئے شہر کے دو بڑے ڈاکٹروں کے دستخط اور ساتھ ہی اُن دو ڈاکٹروں کے سرٹیفکیٹ بھی دکھائے جس میں اُنھوں نے بڑھیا کی دماغی تندرستی کا اقرار کیا تھا۔ سرٹیفکیٹ دیکھنے کے بعد بھی میں نے انکار کر دیا تو وکیل حیران رہ گیا۔

میرے گھر کے افراد باری باری مجھے سمجھانے لگے۔ میری ماں جس نے مجھے بچپن میں اُس طوائف کے پاس جانے سے منع کیا تھا۔ آج مجھے اُسی بڑی کی دولت کی جائداد قبول کرنے کے لئے سمجھا رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ گھر آئی ہوئی لکشمی کو ٹھکرایا نہیں کرتے۔ مگر میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ جب تک مجھے اپنا اور بڑھیا کا رشتہ معلوم نہ ہوگا میں یہ جائداد قبول نہیں کروں گا۔ میری یہ بات سُن کر وکیل نے اپنے بیگ سے خط نکال کر مجھے دیتے ہوئے کہا کہ بڑھیا نے وصیت کے ساتھ ہی یہ خط بھی دیا تھا کہ تمہیں دے دوں۔ ہو سکتا ہے اس سے تمہیں کچھ مدد مل سکے۔

خط میں بڑھیا نے لکھا تھا۔

میرے بیٹے!

میری وصیت دیکھ کر تم حیران رہ گئے ہوگے کہ میرا اور تمہارا رشتہ کیا ہے۔؟ میں نے تمہیں بیٹا کہا ہے۔ تم نے میری کوکھ سے جنم تو نہیں لیا، مگر ایک حد تک میری کوکھ کی تڑپ کو سکون ضرور بخشا ہے۔ ایک عورت خالق کی حیثیت رکھتی ہے۔ اُس کی سب سے بڑی آرزو یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی کوکھ سے کچھ تخلیق کرے اور اُس کی وہ تخلیق اُسے ماں کہہ کر پکارے۔ اُس کی یہ خواہش جب پوری نہیں ہوتی تو اُس کی رُوح تڑپ اُٹھتی ہے۔ میں ایک طوائف تھی اور خدا کی اِس دین سے محروم تھی۔ اِس لئے جب تم چھوٹے سے تھے تو تمہیں دیکھ کر میری کوکھ تڑپ اُٹھتی تھی۔ میرے ذہن میں اپنی تخلیق کا جو عکس تھا تم ہو بہو اُس سے ملتے جُلتے تھے۔ میں تمہیں جب اپنے سینے سے لگا کر بھینچ بھینچ کر پیار کرتی تھی تو مجھے ایک عجیب سا سکون ملتا تھا۔ میں چاہتی تھی کہ تم خود صرف ایک بار مجھے ماں کہہ کر پکارو۔ مگر تم اُس وقت بچے تھے اور میرے اندر کی عورت کی ممتا کے ہیجان کو سمجھ نہیں سکتے تھے۔ اِس لئے میری یہ خواہش پوری نہ کر سکے۔ اور تمہارے ماں باپ نے بھی تمہیں میرے پاس آنے سے روک دیا۔ پھر میں تمہیں بچپن سے جوان ہوتا ہوا دیکھتی رہی۔ اور ایک دن تم نے میری [illegible]

[illegible] دکھئے

خالد شفائی

رنگِ مجبور کا اثر دیکھا
آنکھ کو خونِ دل سے تر دیکھا

جن میں عشرت کے دیپ جلتے تھے
ان نگاہوں کو غم اثر دیکھا

راہِ ہستی کی تلخیاں مت پوچھ
ہر قدم پر نشانِ شر دیکھا

وقفِ نغمہ تھی جو زبانِ احسن پر
نالۂ ماتمِ سحر دیکھا

ہم نے اس دورِ فتنہ ساماں میں
ہدفِ آلام ہر بشر دیکھا

یہ تو قدرت کی دین ہے خالد
کہ تجھے صاحبِ نظر دیکھا

نشتر اکبرآبادی

ماسوا اس کے یہاں کون کہاں جاگے ہے
اپنی بستی میں تو بس ایک جواں جاگے ہے

وہ بدن جیسے تراشا ہو ہیرا کوئی — !
جسم سوئے ہے مگر سارا مکاں جاگے ہے

ان کو [illegible] کے لئے آؤ کہ رستہ سوجھے
جن کے قدموں سے رہِ کہکشاں جاگے ہے

درد کا جب سے زمیں والوں سے رشتہ ٹوٹا
دل کے ہمراہ ستاروں کا جہاں جاگے ہے

ایک نقطے ہی میں سمٹ آتا ہے سورج کا جمال!
نقشِ پا کا ترے جب کوئی نشاں جاگے ہے

غزلیں

برق گڑلیوی

کبھی خنجر نظر آیا کبھی پتھر دیکھا
کچھ نہ کچھ وقت کے ہاتھوں میں برابر دیکھا

دن کو نکلے تھے ترے شہر کی گلیوں میں مگر
رات کا ہم نے ترے شہر میں منظر دیکھا

ہو گئے بند تو کمرے کی کھلی کھڑکی سے
جھانک کر بھی نہ کسی شخص نے باہر دیکھا

حال پوچھا نہ مرا برق کسی نے آ کر
غم کی بستی میں بھی کچھ دیر ٹھہر کر دیکھا

خودکشی سے بچنے کا راستہ ہی مل جائے
زہر اگر نہیں ملتا کچھ دوا ہی مل جائے

کیا خدا کو پاؤ گے پتھروں کی بستی میں
ہے بہت اگر کوئی دیوتا ہی مل جائے

کاش دو قدم چل کر ساتھ چھوڑ دینے کو
غم کی راہ میں کوئی بے وفا ہی مل جائے

لوگ اور کیا دیں گے برق آپ یہ غنیمت ہے
پیار کی اگر تم کو کچھ سزا ہی مل جائے

کہانی
(ہندی)

پروفیسر بشمبرارون

مترجمہ۔ امین تابش

نامعلوم فاصلے

پروفیسر بشمبرارون، ہندی کے معروف ترین ادیب ہیں۔ ملک کے طول و عرض سے نکلنے والے تقریباً تمام رسائل و جرائد میں اُن کے مضامین اور افسانے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اب تک تقریباً ۲۵ چھوٹی بڑی کتابیں لکھ چکے ہیں۔ بحیثیت ادیب ہندی کے مشاہیر میں شمار ہوتے ہیں۔ آگرہ کے کسی کالج میں ہندی کے پروفیسر ہیں۔

دیکھو ضد نہیں کیا کرتے۔ کبھی کبھی شریف آدمیوں کی طرح مان بھی جایا کرتے ہیں۔ میں نے بسنت کی ضد کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا..... بالکل غلط۔ یہ تو تمہیں سُنانی ہی ہوگی۔ آج میری بھی ضد ہے۔ بسنت کے لہجے میں ضد کی شدّت صاف جھلک رہی تھی۔ پھر بھی میں نے بات کو ٹال دینے کی خاطر کہا۔ اماں! ایسی بھی ضد کس کام کی۔ کچھ اور کام کاج کی باتیں کر دیا جائے بیٹو۔ اور میں آگے کچھ بھی نہیں پایا تھا کہ بسنت نے طیش میں آکر پیالہ اپنے سامنے سے ہٹا دیا۔ پیالے کی چائے طشتری میں چھلک گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ اُس کے جذبۂ استقلال کے سامنے مجھے جھکنا ہی پڑیگا۔ میں نے کہا۔ تم فضول ہی ذرا سی بات کو طول دے رہے ہو۔ کوئی خاص بات تو ہے نہیں، پھر بھی دوست ہیں تمہاری ضد تو پُوری کرنا ہی ہے۔ لو سُنو!۔

منورما کافی دنوں تک میرے ساتھ رہا، لیکن وہ کیسا تھا، یہ سمجھنا میرے لئے ایک معمّہ تھا۔ یہ بات سمجھنا میرے لئے ناممکن ہو تھا۔ میں کبھی طے نہ کر سکا کہ اس آدمی پر بھروسہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ اُس نے اپنے بارے میں مجھے کبھی رائے قائم کرنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ میں نے اُسے زندگی کی چھوٹی چھوٹی دشواریوں سے سمجھوتہ کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس بات سے مجھے واقعی نفرت ہوتی ہے۔ اُس میں چٹانوں سے ٹکرانے کی ہمّت بھی میں نے دیکھی — ایسی کہ پاش پاش ہو جائے اور جھکے نہیں...... کہ بسنت بول اُٹھا — اور وہ —

اُس کی آنکھوں میں شرارت ناچ اُٹھی.... میں نے اس کی بات پر دھیان نہ دیتے اور اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ہاں اور وہ۔ اُس کا نام سپر..... وہ ایسی تھی جیسے صبح کی پہلی کرن کی سرخیوں میں نہائی کنول کی پنکھڑی۔ اتنی نازک جیسے گھونگھٹ میں نئی نویلی دُلہن کی شرمیلی آنکھ — آسمان کی وسعتوں میں تیرتی ہوئی چاندنی کا خمار جیسے اُس کی آنکھوں کے نیلے پن میں کھو گیا ہو — اتنی نشیلی — وہ جیسے جذباتی ہو کر اپنی بات کہے جا رہا تھا..... کہ بسنت نے کہا بس بس اپنی راہ پر آؤ..... میں سنبھل گیا.... میں اپنے جنون میں کافی آگے بڑھ گیا تھا۔ دیکھا چائے بالکل ٹھنڈی ہو گئی ہے۔ اُس نے ایک ہی گھونٹ میں اسے ختم کر دیا اور سنبھل کر بیٹھ گیا —

بسنت نے سگریٹ بڑھائی لیکن میں نے No, thanks کہہ کر اپنی بات جاری رکھی۔ سیدھی بات یہ ہے کہ کافی دنوں پہلے اُس سے میری ملاقات شملہ میں ہوئی تھی۔ بسنت

نے بات کا سلسلہ جوڑتے ہوئے پوچھا۔ کس سے۔ منوج نے
جھنجھلا کر کہا، "تم اتنی ہو منوج شنکر سے نہیں، منجولا سے
مجھے! اچھا اب درمیان میں نہ بولنا، نہیں تو بس بات
یہیں ختم کر دوں گا۔ بسنت نے ہنس کر قسم کھائی۔ میں نے
آگے کہانی شروع کی ــ معمولی سی پریم کہانی ہے۔ ہم لوگ ملے
تو ایسا لگا کہ جیسے جنم جنم سے ملے ہوں۔ ایسا ہوتا ہی ہے۔
کوئی خاص بات نہیں۔ منوج شنکر وہاں میرے ساتھ ہی تھا
ایک مرتبہ میں اُسے بھی منجولا کے گھر لے گیا۔ اُس کی ماں بہت
دنوں سے چائے پہ آنے کی ضد کر رہی تھی۔ منوج کا تعارف
منجولا سے کرایا ــ اُس کی ماں سے جھوٹ سچ اُس کی تعریف
کی، وہ متاثر ہوئیں۔ میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ منوج
میرے اِس انتخاب پر ضرور مجھے مبارکباد دیگا۔ وہ کافی غور
سے منجولا کو دیکھ رہا تھا۔ جب ہم لوٹے تو شام ڈھل چکی تھی۔
میں نے منوج سے پوچھا۔ "تمہیں کیسی لگی منجولا؟" ــ "بہت
خوبصورت ــ مجھے سبھی انسان خوبصورت لگتے ہیں" ــ
میں دل ہی دل میں کڑھ رہا تھا کہ کس بدذوق کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔
بڑا فلسفی بنتا ہے۔ مجھے سبھی انسان خوبصورت لگتے ہیں ــ ہم
دونوں خاموش مال روڈ سے اتر رہے تھے، اچانک منوج نے
میرا ہاتھ دبایا۔ "منجولا سے شادی کیوں نہیں کر لیتے۔ کافی آرام
سے رہو گے"۔ وہ سنجیدہ تھا۔ میں چونکا۔ وہ انتہائی سنجیدگی
سے باتیں کر رہا تھا۔ تمام مستقبل کے تانے بانے ست رنگی
قوسِ قزح کی طرح میرے سامنے آ گئے۔ مگر میری مالی حالت
اچھی نہیں ہے منوج! تمہیں تو معلوم ہی ہے۔ وہ ایک مالدار
باپ کی بیٹی ہے۔ میرے دل کا وہ شبہ فطری سنجیدگی کے عکس
میں ڈوب گیا۔ پھر کیوں بیکار کا تماشہ بنا رکھا ہے تم نے۔
خود تو پریشان ہوؤ گے ہی اُسے بھی پریشان کرو گے۔
اُس کے لہجے میں قبرستان کا سا سناٹا تھا جیسے وہ اُس سناٹے
میں لیٹا ہوا بول رہا ہو ــ میں ششدر رہ گیا۔ بات آگے
بڑھانے کی غرض سے میں نے کہا۔ تم مجھے شادی کرنے کے
لئے کہہ رہے ہو مگر شادی کی اصل ضرورت تو تمہیں ہے۔
تمہارا تو دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ اس طرح تنہا کب تک
رہو گے۔ ہاں ہاں اب جلد ہی کر لوں گا۔ اس کے لہجے میں
وہی مایوسی تھی ـــــ حسرتوں کا سوزِ غم۔ اور منجولا کا انکار۔
میں چونک پڑا۔ کیا مطلب۔
مطلب صاف ہے۔ میرا سارا خاندان ٹی بی کا شکار
رہا ہے۔ میں بھی وراثت میں وہی بیماری پائے ہوئے ہوں۔
نہ معلوم کب ظاہر ہو جائے۔ اور وہ ایسے ہنس پڑا جیسے کوئی
چھت گر گئی ہو۔ اس کی ہنسی میں طنز اور دکھ کی لہر تھی۔ میرا دل
ہی دل میں کانپ گیا۔ "مگر تم اس ..... بائیس کے نیچے زندہ
کیسے ہو منوج؟" ــ منوج کی آواز ویسی ہی تھی۔ اُسی بے فکری
کے ساتھ اُس نے کہا۔ اس لئے کہ مجھے اِس زندگی سے کوئی
لگاؤ نہیں۔ میرے سامنے منوج شنکر ایک سوالیہ نشان
بن کر موجود تھا۔

اُس دن میں اور منجولا اسکینڈل پوائنٹ کی طرف بڑھ
گئے۔ شام کے جھٹپٹے میں شملہ جگمگا رہا تھا جیسے سُرمئی
ساڑی میں ٹنکے سنہری ستارے۔ منجولا اٹھلاتی ہوئی آگے بڑھ
رہی تھی۔ میں اچانک کہہ اُٹھا جو شاید میں کہنا نہیں چاہتا تھا۔
"میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں منجو۔" جیسے اس کے پاس
جواب پہلے ہی سے موجود تھا۔ ہلکی آواز میں بولی۔ یہ کیسے
ممکن ہے۔ میرے ڈیڈی اور ممی اِس کو کبھی منظور نہ کریں گے۔
میری مجبوری کو سمجھو نا؟ اس کی آواز میں ایک چھپا ہوا دکھ تھا۔
مجھے وجہ معلوم تھی۔ پھر بھی میں نے کہا۔ تو کیا ہم لوگ سماج
سے بغاوت نہیں کر سکتے۔ اور پھر تم تو کافی ترقی یافتہ ہو،
تیز ہو۔"

"اُن معنوں میں اپنے آپ کو تیز ثابت نہیں کر سکوں گی،
جن معنوں میں آپ چاہتے ہیں۔ پھر والدین کی اپنی حدیں بھی
ہوتی ہیں۔ چلتے ہوئے بھی ان حدوں کو توڑنا تکلیف دہ
معلوم ہوتا ہے۔ ان کے لاڈ پیار کا صلہ میں اُن سے بغاوت
کر کے شاید نہ دے سکوں گی۔ شاید نہیں، یقیناً نہیں دے
سکوں گی....." اور میں نے اُس کے چہرے پر ثابت قدمی
کے آثار دیکھے ــ اور میں ــ مجھے اپنے چاروں طرف کی
روشنیاں اتنی زور سے گھومتی نظر آ رہی تھیں جیسے میں

کسی ... میں گھرا ہوں ...... ایک زوردار جھنجھناہٹ سے میرا سر پھٹا جا رہا تھا۔ میں خاموش ہی رہا۔ شاید منوج نے اور بھی کچھ کہا مگر میں سن نہیں سکا۔۔۔ عورت کتنی عجیب و غریب پہیلی ہے۔ میں اِس سے زیادہ کچھ نہیں سمجھ سکا۔ ہم لوگ کافی ہاؤس نہیں گئے اور گھر لوٹ آئے۔ گھر پر منوج شنکر منتظر تھا۔ میرے دل میں ایک طوفان برپا تھا۔ میں نے منوج کو سارا واقعہ سُنا دیا۔ مگر جانتے ہو بسنت اس نے کیا کہا؟

"اس میں غمگین ہونے کی کیا بات ہے"۔

یہ سُنتے ہی میرا خون کھول گیا اور میں اُبل پڑا، تاہم اپنے لب و لہجہ پر قابو رکھتے ہوئے میں نے کہا: "میں ماتم نہیں کر رہا ہوں منوج۔ مجھے غم اِس بات کا ہے کہ تم بھی اُس کی ہم نوائی کر رہے ہو"۔ یہ کہہ کر میں اُٹھ گیا۔ میرا جی نہیں چاہ رہا تھا کہ اس کے سامنے بیٹھوں۔ اچانک وہ بڑے زور سے کِھلکھلا کر ہنسا، جیسے اچانک بندھ کے دروازے کھل گئے ہوں اور پانی اپنے بہاؤ کی پوری قوت کے ساتھ بہہ نکلا ہو۔

"اک بات بتاؤ"۔ کڑوا سا گھونٹ حلق سے نیچے اُتارتے ہوئے میں نے کہا۔

"پوچھو، لیکن کوئی احمقانہ سوال نہ ہو، مجھے تمہاری نصیحتیں بھی پسند نہیں"۔

"... تم تو کافی ترقی پسند ہو۔ اچھا۔ عورتوں کے حقوق کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے ... تم کسی بیوہ سے شادی کر سکتے ہو؟"

... وہ گڑیا سی لڑکی بیوہ بھی ہو سکتی ہے۔۔۔ منوج کیسی باتیں کر رہا ہے۔ میں نے سوچا۔ پہیلیاں مت بجھاؤ۔ صاف صاف بتاؤ کیا کہنا چاہتے ہو۔ میں نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔ وہ ویسے ہی خاموش اور مطمئن تھا۔

"پہلے میری بات کا جواب دو اور اچھی طرح سوچ سمجھ کے۔

ہاں ہاں کروں گا۔ مگر کیا یہ ضروری ہے کہ اگر میں بیوہ کی دوسری شادی کے حق کا طرفدار ہوں تو خود مجھے ہی بیوہ سے شادی کرنی ہوگی"۔ میں بے چین ہو اُٹھا۔ جو دل میں چھپے گھٹنا چاہتی تھیں وہ مجھے جھنجھلا دینے والی ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔ "میں نے یہ کوئی شرط تمہارے سامنے نہیں رکھی تھی۔ مگر اپنی بات پر قائم ضرور رہنا۔۔۔ اگر موقع آئے تو۔۔۔ اور یہ کہتے کہتے وہ اپنی خاموشی میں سمٹ گیا۔۔۔۔ اور پھر بسنت ہم لوگ سدا کے لئے بچھڑ گئے۔

تمہیں معلوم ہی ہے میں دو برس کے لئے رنگون چلا گیا تھا۔ منوج شنکر سے پھر کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔۔۔ اُس کے کئی خط میرے پاس آئے۔ بس اِس طرح ہم لوگ ایک دوسرے کے قریب ہو جاتے تھے۔ کام کاج کے بیچ زبردستی یاد آجاتی تھی۔ اُس نے تو کبھی خط بھی نہیں لکھا۔ کتنی بے مروّت لگی تھی وہ مجھے۔ میرا دل برابر انتقام کی قسمیں کھاتا رہا ..... کسی خوبصورت سی لڑکی سے شادی کر کے ایک دن منجولا کے سامنے جانے کی خواہش روز بروز تیز و تُند ہوتی رہی۔ ..... وہ اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہے۔۔۔ ہاں ایک بات مجھے بہت عجیب سی معلوم ہوئی بسنت! جب میں نے منوج کو اپنے برما جانے کے ارادے سے آگاہ کیا تو اُس نے مجھ سے ایک بار بھی یہ نہیں کہا کہ اتنی دُور کیوں جا رہے ہو۔ حالانکہ مجھے اُس سے یہ توقع نہ تھی۔ مجھے تو جانا ہی تھا۔ کوئی روکتا یا نہ روکتا ..... میں رنگون میں تھا کہ ایک دن منوج شنکر کا خط آیا۔ بہت چھوٹا سا۔ مگر میری اپنی زندگی کے لئے بہت بڑا ..... لکھا تھا ....

میری شادی ہو رہی ہے۔ منجولا کے ڈیڈی اِس بات کے لئے تیار ہیں کہ میں ہی منجولا سے شادی کر لوں۔ منجولا سے پوچھنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ اِسی ماہ کے آخری ہفتے میں مہورت ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جلد ہی ہو جائے تاکہ کوئی رکاوٹ درمیان میں نہ حائل ہو جائے۔۔۔ جانتا ہوں کہ تم اِس میں شریک نہیں ہو سکو گے، لیکن دولہا دُلہن کے لئے نیک دعائیں بھیجنے میں دیر نہ کرنا۔ اِس کی وجہ تم جانتے ہی ہو۔۔۔ اِدھر بخار پھر آنے لگا ہے۔ اِس لئے جلدی کر رہا ہوں۔ دل

کی ایک معصوم خواہش پوری نہ کر سکے بغیر کاند ودا ع ہوتا۔

میں نے خط کو کئی بار پڑھا۔ میرا دماغ قابو میں نہیں تھا میں سوچ رہا تھا: یہ آدمی خود تو مر رہا ہے، ساتھ ہی ایک لڑکی کی زندگی بھی تباہ کر رہا ہے۔ وہ بھی اُس لڑکی کی جسے میں نے اپنی زندگی سمجھا ہے۔ میری قوتِ برداشت کا بند ٹوٹ رہا تھا۔ انسان اتنا بھی گر سکتا ہے۔ اب سمجھ میں آیا کہ میرے بار ماؤ نے پر اُس نے کیوں روک ٹوک نہیں کی۔ اس قدر ذلیل آدمی شاید میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ میرا دل انتقام کی آگ میں جل رہا تھا ــــ لیکن منجولا سے بھی میں اب بدلہ لونگا۔ اُس کے ہاتھوں کی مہندی ہلکی بھی نہ ہو پائے گی کہ بیوگی کی بجلی اس کے سر پر کڑک کر مانگ کا سیندور پونچھ ڈالے گی ــــ

میں اُس دن کا انتظار کروں گا ــــ بسنت اُس دن میرا دماغ قابو میں نہیں تھا ــــ میں کہیں نہیں گیا۔ سارا دن کمرے میں بند ہو کر سگریٹ پھونکتا رہا۔ دو مہینے کے بعد منوج کا پھر خط آیا۔

"میرے سونے اندھیرے گھر کی دیپاولی سی منجولا آ گئی ہے ــــ میری صحت گرتی جا رہی ہے۔ تھوک میں اب بھی بُری طرح سے خون آ رہا ہے۔ نہ جانے کیوں منجولا کو قریب پا کر جینے کی خواہش بڑی تیز ہو گئی ہے۔ لیکن اب یہ قطعاً ممکن نہیں ــــ خط لکھتے رہا کرو۔ کیونکہ اب میں چند ہی دنوں کا مہمان ہوں" ــــ لیکن میں نے اُسے خط نہیں لکھا۔ لکھ بھی کیسے سکتا تھا ــــ ہفتہ عشرہ کے بعد پھر ایک خط آیا۔ منوج ہی کی تحریر تھی۔ پہلے کی بہ نسبت خراب اور زیادہ صاف بھی نہیں۔ میرا من کڑوا ہوا تھا ــــ جی میں آیا کہ پھاڑ کر آگ میں جھونک دوں اور اُس کی اِس بے عزتی پر فخریہ ہنسوں۔ لیکن دل نے مانا ہی نہیں۔ خط کھول ہی ڈالا۔ کافی ناصاف تحریر میں لکھا تھا۔

"پیارے بھائی! جب یہ خط تم تک پہنچے گا تب تک میں سفر کو نکل گیا ہونگا۔ سفر کی ساری تیاریاں ہو چکی ہیں۔ بس اب اُٹھ کر چل ہی دینا ہے۔ ایک بات لکھ رہا ہوں۔ تم منجو کو پیار کرتے تھے یہ میں جانتا ہوں۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ بھی تمہیں بہت پیار کرتی ہے۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہارا کاروبار گی تکلیفوں میں چلا ہے۔ تمہاری شخصیت زندگی کی دشواریوں سے ٹکرا کر بکھر گئی ہے۔ شاید تمہیں بیوہ سے بیاہ میں اعتراض نہ ہوگا، اپنی شٹلے والی بات یاد رکھنا

اچھا وداع ــ خدا کے لئے وداع

تمہارا ہمیشہ کا منوشنکر

(نوٹ) اب ہندوستان لوٹ آؤ۔ منجو تمہارا انتظار کر رہی ہے۔

منوج۔

بسنت اِس خط کو پڑھ کر رو نہیں سکا اور ہنس بھی نہیں سکا۔ ایسا محسوس ہوا کہ میں کھڑا ہوں ــــ منوج اب تک رخصت ہو چکا ہوگا۔ کلکتہ جانے والے جہاز کا دن اور وقت پوچھنے کے لئے ۲۷۵۴ پر فون کیا ــــ بسنت میری طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ میری آنکھوں میں منوج شنکر کی شخصیت وسیع سے وسیع تر ہوتی جا رہی تھی۔ آسمان کی وسعت جیسے اُس میں سمائی جا رہی تھی ــ میں خاموش ہو گیا.......

▲

شاعر ضخیم، خوبصورت اور معیاری

سالنامہ ۷۲ء

ادبی رسائل میں خصوصی اشاعتوں کے لئے

شاعر ایک نام اور ایک علامت بن چکا ہے

سالنامہ ۷۲ء

کو اس کے اندازِ پیشکش اور تخلیقات کے تنوع
کے اعتبار سے منفرد قرار دیا گیا ہے۔

۱۹۷۲ء کا بہترین ادبی و شعری تحفہ

جسے ادبی حلقوں کی طرف سے زبردست خراجِ تحسین مل رہا ہے

۱۲ ——— پُرمغز مقالات
۲۵ ——— حیات افروز نظمیں
۲۳ ——— دلچسپ نئی کہانیاں
۵۱ ——— رُوح پرور غزلیں
۷ ——— طنزیئے اور مزاحیئے
۲ ——— نئے ڈرامے
۱ ——— ناول کا باب

خاص انداز سے چھاپے گئے
۶۴ قلمکاروں کی تصاویر
آٹھ اندرونی رنگین سرورق

بیرونی دورنگا سرورق ——— امن کا اشاریہ

ضخامت تقریباً چار سو صفحات

قیمت برائے نام ـ صرف پانچ روپئے

بہت کم کاپیاں باقی رہ گئی ہیں

شاعر کا منفرد چھپا ہوا خوبصورت ضخیم اور انتہائی دلچسپ

ناولٹ نمبر

جس نے مقبولیت کی عظیم مثال قائم کی ہے۔

اردو کے مشہور و ممتاز ناول نگاروں کے

۴ طویل و مکمل ناول اور ۱۳ ناولٹ

لکھنے والے

کرشن چندر ـ خواجہ احمد عبّاس ـ کوثر چاندپوری، سہیل عظیم آبادی ـ جوگندر پال ـ جیندر ناتھ ـ لال کشمیری لال ذاکر، ستیش بترا، آمنہ ابوالحسن واجدہ تبسم ـ عفّت موہانی، حامدی کاشمیری، ستّ پرکاش سنگر، نورشاہ ـ اکرام جاوید آغا رشید مرزا

چند دیگر خصوصیات

ناولٹ نگاروں کی تصاویر
زندگی کے حالات و واقعات
ہر ناول اور ناولٹ کا فنکارانہ سرورق
رنگین و سادہ دلکش طباعت

۱۲ مصوّروں کے دست و قلم سے نکلے ہوئے شاہکار خاکے

۱۷ کتابوں کے برابر
۱۷ ناول اور ناولٹ

۵۴۲ صفحات ، قیمت ۷/- روپے

منیجر **شاعر** پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶ بمبئی ۵ بی سی

تماکس بلوچھی

ناول

(آٹھواں، نواں، گیارھویں قسط)

اب میں وہاں نہیں رہتا

دریا بہت دُور ہے اور یہ نرمدا کی روانی!

" تم اکیلے ہو۔ محمد خان کہاں ہے؟"

" وہ آجکل کسی سے نہیں ملتا۔"

" کیوں۔"

" اُسے امتحان میں کامیاب ہونے کا دُکھ ہے۔"

" اپنے لوگوں کو چھوڑنے کا اُسے رنج ہے۔"

" میں بھی نہیں۔"

" وہ کالج میں داخل ہونے جموں جا رہا ہے۔"

" تم بھی تو جا رہے ہو۔"

" دُکھ مجھے بھی ہے۔"

" مجھے تو خوشی ہے کہ تم دونوں کالج میں پڑھنے جا رہے ہو۔ اب پہلے سہارے تو رہے نہیں۔ اپنے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونا ہے۔"

" نہ جانے کیوں۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے یہ دریا سنگھ...."

" میرا نام نرمدا ہے۔ اور تم اپنے ساگر نام کی لاج رکھنا۔"

" ہم ایک دو دن جا رہے ہیں۔"

" مجھے خوشی ہے۔"

" پریشان تم بھی ہو۔"

" دریا سنگھ ابھی تک ٹھیک نہیں ہوا۔ پاپا اُسے گھر لے آئے ہیں۔"

" یہاں اُس کے دوسرے قریبی لوگ نہیں۔"

" تم کتنوں کا سہارا بنو گی"

" ترس آتا ہے۔ امتحان بھی نہ دے سکا۔ ایک برس ضائع ہو گیا۔"

" اِس بات کا مجھے بھی دُکھ ہے۔"

" سب لوگ دریا سنگھ کو دیکھنے آئے۔ لیکن تم اور محمد خان نہیں آئے!"

" میں دریا سنگھ کا سامنا کرتے ڈرتا ہوں۔ کہیں وہ بات پھر نہ ہو جائے!"

" لڑائی جھگڑا ساتھیوں سے ہوتا ہے۔ تم آگے نکل گئے۔ وہ پیچھے رہ گیا۔"

" لیکن مجھے اب بھی محسوس ہوتا ہے کہیں پیچھے رہ گیا۔ وہ آگے نکل گیا۔ یہ چھوٹے پن کا احساس ہے۔"

" احساس کی بات نہیں۔ حالات کی بات ہے۔"

" محمد خان سے کہہ دینا۔ مجھ سے ملے بغیر نہ جائے۔"

" کہہ دوں گا لیکن تم سے اب ملے گا نہیں۔"

" ایسی کیا بات ہے۔"

" کیونکہ تم اب جوان ہو۔ ایک ہندو حاکم کی بیٹی ہو۔ اور وہ مسلمان ہے۔"

" پہلے جب ملتا تھا، تب وہ ہندو تھا؟"

" اُس میں اب یہ خیال پیدا ہوا ہے۔"

" ٹھیک ہے۔ اُس سے کہہ دینا۔ جو خیال نرمدا میں پیدا ہونا تھا وہ تم میں پیدا ہو گیا۔ اور یہ بھی کہہ دینا۔ جب فرصت پڑے بلا جھجک ملنے چلا آئے۔ جیسے پہلے اپنی عمر میں آتا تھا۔ میں اُسے ضرور ملوں گی۔ اور اپنی اِسی جوان عمر میں اور سب کے سامنے اور یہ بتا کر کہ میں جوان ہوں اور وہ مسلمان ہے اور یہ بھی کہہ دینا...."

دل دریا سمندروں ڈونگھے ——!

اور فوارہ گارڈن میں یہ بانسوں کا جھنڈ اور ایک عمر کے

کم سن تھے!

،کوئی ملنے آیا تھا؟،

،ہاں،

،کون،

،نربدا،

،میں نے کچھ اور سوچا تھا،

،کیا،

،ماسٹر دین دیال آیا ہوگا،

،تم کس چکر میں پڑ گئے۔ دین دیال بڑا خطرناک قسم کا سازشی ہے،

،ہم سب ہی سازشی ہیں۔ صرف درجے کا فرق ہے،

،تم کہاں سے آ رہے ہو۔ نربدا کہہ رہی تھی کہ...،

،دریا سنگھ کے گھر گیا تھا۔ معلوم ہوا جج صاحب اپنے بنگلے میں لے گئے ہیں۔ کمزور ہو گیا ہے۔ پہچانا بھی نہیں جاتا،

،دریا سنگھ؟،

،کہہ رہا تھا۔ اچھا ہوا بیمار پڑ گیا۔ ورنہ تم دونوں فیل ہو جاتے،

،مجھے پوچھا تھا،

،بات سے بات چلی تھی،

،نربدا سے نہیں ملو گے،

،اچھا ہوا وہاں نہ تھی۔

،تم اُس سے اتنا ڈرتے کیوں ہو،

،اپنے آپ سے ڈرتا ہوں نربدا سے نہیں،

،آج کل تم پر مذہب کا بھوت سوار ہے۔ کل تم مجھ سے بھی کہہ دو گے کہ ایک مسلمان کا ایک ہندو سے میل جول بند،

،کوئی بڑی بات نہیں،

،نربدا کہہ گئی ہے ...،

،اُس نے کئی بار کہا ہے۔ میں نے کئی بار سُنا ہے، ٹھہرانے کی ضرورت نہیں،

،اتنے پتھر دل ہو۔

،دل کو پتھر بنانا اتنا آسان کام نہیں۔ اب چلو،

،کہاں،

،تم دریا سنگھ کو دیکھ آؤ۔ میں ماسٹر دین دیال سے مل آتا ہوں،

،میں دریا سنگھ سے ملنے نہیں جاؤں گا،

،ماسٹر دین دیال کے گھر چلو،

،مجھے دونوں سے چڑ سی ہے،

،تمہیں دیکھ کر آج کل مجھ میں بھروسہ سا پیدا ہو جاتا ہے،

،کیسا بھروسہ،

،یہی کہ میں ہارا نہیں۔ صرف تھک گیا ہوں،

،اور میں،

،تم اپنا سب کچھ ہار چکے ہو،

،شاید تم ٹھیک کہتے ہو،

،زندگی اور حالات سے ہار کھانے سے بہتر ہے کہ انسان خودکشی کر لے،

،میں ہر حالت میں زندہ رہنا چاہتا ہوں،

،اپاہج سوچوں کی زندگی سے موت اچھی،

،ہمیں اُداس سوچوں کے سوا ملا بھی کیا ہے،

،اُداس سوچوں اور اپاہج سوچوں میں بڑا فرق ہے،

،بات ایک ہی ہے۔ صرف عمر کا فرق ہے!

،تو آوارہ گارڈن مجھے کالج میں بہت یاد آتا ہے،

،زندگی اپنے اُن دوروں کو اکثر یاد کرتی ہے۔ جہاں اُسے سانسوں کے سہارے ملے ہوتے ہیں،

،چھٹیاں بھی ختم ہو گئیں۔ اب کی بار کوئی ہنگامہ نہ ہوا،

،پہلے یہاں بھانت بھانت کی بولیاں سُنائی دیتی تھیں،

،گھٹتے گھٹتے چھ رہ گئے،

،محمد خان بھی اب ہم سے دُور دُور رہتا ہے،

،وہ شاید اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکے،

،ایسی کیا بات ہو گئی!

،باپ شاہی خزانے سے پنشن لیتا ہے سرداری کا خطاب۔

"اس سے محمد خان کی تعلیم کا کیا تعلق،"

"ہماری ہر بات کا تعلق شاہی دربار سے ہے،"

"لیکن محمد خان کا ابّا...،"

"وہ بھی آگیا ہے،"

"محمد خان سے ملا ہے،"

"محمد خان تین سے غائب ہے۔ ماسٹر دین دیال سے مل کر اب اپنے راجہ صاحب کو وہ جلسوں میں کھلم کھلا بُرا بھلا کہہ رہا ہے۔ دونوں لوگوں کو ورغلا رہے ہیں،"

"میں اُس کے ابّا سے کہاں مل سکتا ہوں،"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ لیکن اُس کے ابّا نے پولس سے کہہ دیا ہے کہ میرا اپنے بیٹے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں،"

"محمد خان آرہا ہے اُس سے کوئی بات نہ کرنا،"

"میں جانتا تھا،"

"کچھ بھی ہو۔ کیسا ہو۔ اپنا بچپن کا ساتھی ہے،"

"لیکن...،"

"کیا یہ سب سچ ہے،"

"سارا شہر جانتا ہے،"

"پھر زبدا بھی جانتی ہوگی،"

"کم سے کم زبدا کا باپ ضرور جانتا ہے،"

فتاوہ گارڈن

سوچوں کے سوتے سوکھے ہوئے،

خیالوں کی دُنیا اندھیری، اور اُمیدوں کی ٹمٹماتی ہوئی لَو بجھتی سی!

پانچ چھ کالج کے ساتھی، بدلا ہوا ماحول، اُلجھے ہوئے حالات، ہندو شورش، مسلمان شورش، سکھ شورش کے ہنگامے صرف ذہن کی سوچوں کی پیداوار، سوچیں اور سیاست۔

آج کے انسان کی زندگی۔ کہیں مذہب کے رنگ میں رنگی ہوئی۔ کہیں شیلنت کا لبادہ اوڑھے ہوئے۔ لیکن انسان ننگا ہے انسانیت عُریاں۔ یہ ترقی ہے، ذہنی اور علمی ترقی یا ترقیِ معکوس؟

میں اپنی سوچوں میں گم ہوں۔ محمد خان میرے پاس بیٹھ جاتا ہے۔ چارپائی میں بیٹھ کر رب کو مسکراتی ہوئی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ مجھ سے مخاطب ہوتا ہے،

"تمہارا چہرہ تمہارے دل کا آئینہ ہے،"

"کیسے،"

"جب کبھی چوری کروگے۔ پکڑے جاؤگے،"

"تم آج ضرورت سے زیادہ خوش ہو،"

"پہلی خوشی کی بات یہ ہے کہ ابّا آیا ہوا ہے۔ دوسری خوشی کی بات یہ ہے کہ کالج کی پڑھائی کا سلسلہ شاید جاری نہ رہ سکیگا"

"کیوں،"

"جن لوگوں کا ہم نے نمک کھایا ہے۔ آج تک کھا رہے ہیں۔ اُنھیں میری عادتیں اور باتیں پسند نہیں،"

"ایسی باتیں چھوڑ دو،"

"دریا سنگھ نے ایک بار بڑے پتے کی بات کہی تھی،"

"کیا،"

"عادتیں دیر کی ہیں۔ جاتے جاتے چلی جائیں گی،"

"کہاں سے آرہے ہو،"

"پہلے تمہارے پاپا جی کے پاس گیا تھا،"

"کیوں،"

"پیشی تھی،"

"کس سلسلے میں،"

"یہ بات بتانے کیلئے کہ ماسٹر دین دیال کو آج گرفتار کر لیا گیا ہے۔ وہ بھی غدّاری کے الزام میں اور مجھے کسی وقت بھی حوالات میں بند کیا جاسکتا ہے۔ اور میری گرفتاری سے میرے دوستوں اور اُن کے گھر والوں کو بھی نقصان پہنچ سکتا ہے،"

"اتنی بڑی سازش پکڑی گئی،"

"صرف ایک چھوٹی سی میٹنگ کو راجہ صاحب کے خلاف سازش بنا دیا گیا۔ بلکہ ایک ہندو مسلمان سوال بنا دیا گیا،"

"لیکن ماسٹر دین دیال تو ہندو ہے،"

"اسلامیہ ہائی اسکول میں پڑھاتا ہے۔ وہاں مسلمانوں کی

فہرست میں آ گیا۔ کتنا بڑا مذاق ہے،

،تم نے کیا سوچا،

،کل یہاں سے جا رہا ہوں،

،کہاں،

،واپس جموں۔ وہاں کے شاہی دربار کا میرے بزرگوں سے ابھی تک نہیں چھوٹا،

،کالج کی پڑھائی،

،اب تمہارے پاپا نے پڑھائی کا ذمّہ لیا ہے۔ شرط پر،

،تم نے شرط مان لی،

،اپنے ابا کے سامنے اکڑ سکتا ہوں۔ لیکن...،

،ماسٹر دین دیال کی گرفتاری کے سلسلے میں شہر کے لوگ جلسہ کر رہے ہوں گے،

،مسلمان شریک نہیں ہو رہے ہیں۔

،ہندو راجہ کی مخالفت کرنے والا تو مسلمان کا دوست ہونا چاہئے۔

،لیکن گرفتار ہونے والا تو ہندو ہے،

،ہندو مسلمان کا سوال پہلے تو یہاں کبھی نہ تھا،

،اس سوال کا تعلق ضرورت سے ہے،

،مارے تو معصوم غریب جاتے ہیں،

،ایسے لوگوں کو جینے کا کوئی حق نہیں،

،یہ سب کیا ہو رہا ہے،

،مذہب دھرم کے نام پر کچھ لوگ اپنی لیڈری چمکانا چاہتے ہیں۔ اور کچھ مذہب دھرم کے نام پر بے موت مرنا چاہتے ہیں،

،اور تم جو...،

،میرا شک آج یقین میں بدل گیا کہ دراصل میں ایک مسلمان ہوں۔ اور میرے بیشتر دوست ہندو۔ اور یہ ساری ریاست ہندو ہے۔ اور میرے لئے یہاں کوئی جگہ نہیں۔

،تمہارا مطلب ہے،

،آج کے بعد ہم ایک دوسرے سے نہیں ملیں گے۔ اس میں ہمارے خاندانوں کی بھلائی ہے۔

محمد خان کا گلا بھر آتا ہے، ہم سب ساتھی اپنی ساری باتیں بھول کر بچّوں کی طرح رونے لگتے ہیں۔ گھر کے لوگ ہماری تلاش میں وہاں آجاتے ہیں۔ محمد خان کو گھور گھور کر دیکھتے ہیں جیسے کوئی بیگانہ ہو۔ چور ہو۔ قاتل ہو۔ پوری ریاست کا قاتل۔ سرگوشیانہ انداز میں باتیں ہوتی ہیں۔ ساتھیوں کے رنگ اُڑ جاتے ہیں۔ ایک ایک کر کے وہاں سے چلے جاتے ہیں۔

محمد خان زور زور سے ہنسنے لگتا ہے۔

،فریاد کی سزا،

میں بمشکل آواز نکالتا ہوں،

،شاید آج تمہیں بھی گرفتار کر لیں گے۔

محمد خان خاموش رہتا ہے۔

ایک اور ساتھی تیرتھ رام ترتر دآجاتا ہے — ترتر د، ایک ہرمجن، کسی کا کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی سب کچھ۔ اپنے دُکھ سمیٹے سب کی خوشیوں میں شریک۔ اپنی خوشیاں سمیٹے سب کے دکھوں میں شریک — محبت چلی گئی۔ زندگی صرف اِک تارا بن کر رہ گئی۔

میں اس سے پوچھتا ہوں۔

،بات کیا ہوئی،

،غریب نواز...،

زبان بند ہو جاتی ہے۔ اس کا اک تارا رونے لگتا ہے۔

اِک تارا کو انگلیوں سے چھیڑتے ہوئے بمشکل آواز نکالتا ہے۔

،آپ کے پاپا جی بڑے غصّے میں ہیں۔ زیبا جی بیٹھک میں بیٹھی رو رہی ہیں۔

،کیوں،

،پولس اور گرفتاری کی باتیں ہو رہی ہیں۔ سردار بہادر بھی وہیں ہیں،

،محمد خان کے ابا،

،ہاں،

،بات کیا ہے،

،کوئی سازش پکڑی گئی ہے۔

،کس کے خلاف،

، راجہ صاحب اور ان کی حکومت کے خلاف،
محمد خان پوچھتا ہے۔
، اُنہوں نے کیا کہا،
بتر دوائی رنگ میں جواب دیتا ہے۔
، تھانیدار صاحب کو کہہ دیا ہے۔ آپ کو گرفتار کر لیں،
میں بھی پوچھتا ہوں۔
، بزدل کیوں رو رہی تھی،
، محمد خان آپ کے دوست ہیں شاید اس لئے،
محمد خان اپنے آپ سے کہتا ہے۔
، ظلم کے خلاف فریاد، سازش۔ اور سازش کی سزا اپنے نظام میں۔
اور ماسٹر نے ٹھیک کہا تھا۔ یہاں سے بھاگ جاؤ،
میری آواز گلے ہی میں پھنس کر رہ جاتی ہے۔
وہ بتر دسے کہتا ہے۔
، بتر دبادشاہ۔ آج فقیروں کی مدد کرو،
، کیسی مدد غریب نواز،
، میرا ٹیچی اور کمبل گھر سے لے آؤ۔ چپکے سے کسی کو معلوم نہ ہو۔ اور کمرے کا دروازہ کھلا رہنے دینا،
، ابھی،
، ہاں ابھی،
، میں ابھی جاتا ہوں،
، میں ڈر رہا تھا ہوں۔
، اگر کسی کو معلوم ہو گیا۔ تو جانتے ہو۔ پھانسی کی سزا ہو گی،
بتر د اپنے ایک تارا کو اپنے لمبے کوٹ کی جیب میں ٹھونس دیتا ہے۔
، غریب نواز۔ میں بھی مرنے کا بہانہ ڈھونڈ رہا ہوں۔ اس سے اچھی موت اور کیا ہو گی،
میں محمد خان سے پوچھتا ہوں۔
، اور کوئی راستہ نہیں،
، راستے تو بہت سے تھے۔ لیکن انہوں نے میرے لئے بند کر دیئے۔

پہلے دلوں میں ہر ظلم سے چنگاری تھی۔ چھپائی بجھائی جا سکتی تھی۔ یہ شعلہ بن گئی ہے۔ دبا دی گئی ہے۔ اب اسی میں جل جانا ہے،
، تم راجہ صاحب کے خلاف ہو،
، میں صرف اُس نظام کے خلاف ہوں جو راجہ صاحب کا ہے،
، ماسٹر دین دیال،
، وہ میرا گرو ہے،
، اگر اُسے پھانسی کی سزا ہوئی،
، ماسٹر دین دیال جیسے لوگ نہ اپنے لئے جیتے ہیں اور نہ ہی اپنے لئے مرتے ہیں۔ اُن کی زندگی اور موت دوسروں کے لئے ہوتی ہے۔ انسانوں سے پیار کرنے والے صرف انسانوں سے ڈرتے ہیں۔ خدا، بھگوان، موت، حکومت، حاکم کو وہ کچھ نہیں سمجھتے،
، یہ مذہب،
، صرف خدا اور بھگوان کا مذہب ہے۔ انسان کا کوئی مذہب نہیں،
میں وہیں بیٹھ جاتا ہوں۔ فوارہ گراؤنڈ کا خنک ٹھنڈا مخملیں فرش میرے لئے ایک تپتا جھلستا صحرا بن جاتا ہے!

سترہ اٹھارہ کوس کا فاصلہ اور اندھیری برستی رات۔ میں اور بتر د محمد خان کو ریاست پونچھ کی سرحد پر چھوڑ آئے۔ ہم تینوں چور تھے۔ شاہی دربار کے مجرم تھے۔ ایک باغی اور غدار تھا اور باقی دو اُس کے ساتھی پکڑے جاتے۔ ہمارے ساتھ گھر کے افراد بھی ریاست بدر کئے جاتے۔ ایسا ہی قانون تھا۔ ایک عجیب سے ڈر کے زیر اثر ہم نے پیاسے بھیگتے بھیگتے سفر طے کیا۔ بٹر گاؤں ریاست کی سرحد کا نشان تھا۔ محصول چنگی کا دفتر تھا۔ سب ہمیں جانتے تھے۔ لیکن برستی رات بچا گئی۔ ریاست کی سرحد پار کر کے ہم ایک پرانے کھنڈر میں بیٹھ گئے۔ بارش تھمنے کا انتظار کیا۔ پیچھے کیا ہو رہا تھا۔ آگے کیا ہونے والا تھا۔ اس کا علم تھا۔ راجہ صاحب اور اُن کی حکومت کے خلاف کب سے سازش پک رہی تھی۔ سازش کیا تھی۔ شورش کا نام پہلی بار سن رکھا تھا۔ سازش کا نام پہلی بار سنا۔ تپ دق کا مریض سوکھا سڑا ماسٹر دین دیال اور ایک ادھ پکی جوانی کی عمر کا محمد خان۔ جنہوں نے

سے پہلے میں نے محمد خان سے پوچھا۔

"سازش کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

اس نے جواب میں میرا کندھا تھپتھپاتے ہوئے تنبورے پہاڑی گیت کی فرمائش کی۔

کھیڈن دے دن چار گے

پل بھر بہی جا اوماؤ آ

یہ گیت پہلے بھی کئی بار سنا۔ سنتے ہی اپنے لڑکپن کے خیالوں میں کھو گئے۔ لیکن گیت کا اصلی مفہوم، اصلی درد پہلی بار معلوم ہوا۔ محسوس کیا۔ باہر برستی رات تھی۔ کھنڈر کے اندر آنسوؤں کی جھڑی اور ان گنت یادوں کے جلتے بجھتے دیئے اور ناقت اور جدائی کا احساس۔

کھیڈن دے دن چار گے!

گیت ختم ہونے پر ہم سے بغلگیر ہوا۔ کمبل کندھے پر ڈالا۔ اٹیچی کیس اٹھایا اور ہنستے مسکراتے ہوئے اندھیروں میں گم ہو گیا۔ ان روشنیوں کی طرف بڑھ گیا۔ جو ان اندھیروں میں چھپی بیٹھی تھیں۔ اور جنہیں وہ اپنے لوگوں کی تاریک زندگیوں کی گھٹتی ہوئی سانسوں کے لئے باہر نکالنا چاہتا تھا۔

ایک بھرے پیٹ انسان نے غربت کا عذاب دیکھا تھا۔ بس اتنا سا قصور، صرف اتنا سا جرم۔ اور سزا کتنی اذیت ناک کتنی ہولناک۔ جرم کے نام کتنے گھناؤنے، کتنے مکروہ۔

شام سے رات ہوئی چلتے چلتے اور رات سے صبح ہوئی چلتے چلتے۔ شہر میں رات بھر محمد خان کی تلاش ہوتی رہی۔ سب ساتھیوں سے پوچھ تاچھ ہوئی لیکن سب کی زبان بند رہی۔ ویسے بھی کسی کو کچھ معلوم نہ تھا۔

واپسی پر مجھ سے بھی پوچھ تاچھ کی گئی۔ دو تین لاتیں پڑیں۔ حوالات میں بند کرنے کی دھمکی دی گئی۔ میں خاموش رہا۔ محمد خان اب اپنی ریاست کے آہنی ہاتھوں کی گرفت سے نکل چکا تھا۔ میں اور میرے ساتھی کے نام کہاں گئے کسی کو معلوم نہ ہو سکا۔

دن کو جج صاحب نے عدالت ہی میں بلا بھیجا۔ اپنے پاس بٹھا کر ایک نظر مجھے دیکھا۔ دل کی بات بھانپ گئے۔ صرف اتنا کہا۔

"جو ہوا ٹھیک ہوا۔ آگے محتاط رہنا۔ خاندانی لوگوں کو ہر بات میں اپنی خاندانی روایت کو یاد رکھنا پڑتا ہے۔ یہ ہمارا پہلا سبق ہے!"

پہلا سبق ـــــ خاندانی روایت!

یہ خاندانی روایت کیا ہوتی ہے۔ میں آج تک سمجھ نہ سکا۔ لیکن اس روایت کے صدقے جہاں میں نے ظلم و تشدد، ذات پات، اونچ نیچ اور چھوت چھات کے مظاہرے دیکھے۔ وہاں میں نے جاگیرداروں اور خاندانی سفید پوش، اپنے لوگوں کو ایک وقت اندھیروں کا سہارا لیتے دیکھا۔ حویلیوں کا پردہ دہ ستر پوش عورتوں کو اپنے عزت دار مردوں کے لئے عریاں دیکھا وہ بھی مرنے کے لئے۔ جینے کے لئے ہوتا تو بات سمجھی جا سکتی تھی۔ حویلیوں کی تاریک چار دیواری کے اندھیرے، دوستوں کے اعتماد اور دودھ کے رشتوں کو بھی نہ پہچان سکے۔ وقت وقت کی بات ہے۔

پہلا سبق ـــــ اور خاندانی روایت!

لیکن وقت کسی کا دوست نہیں۔

زہرا کو شاید سب کچھ معلوم تھا۔ وہ شاید رات بھر روتی رہی تھی۔ مجھ سے ملنے گھر آئی۔ اپنی پریشانی قابلِ برداشت تھی۔ زہرا کو غمگین اور پریشان دیکھ کر دل میں ایک انوکھی سی چبھن سا احساس ہوا۔

بڑی مشکل سے آواز نکالی۔

"تم نے دوستی نبھائی۔ میرے دل میں تمہاری عزت بڑھ گئی۔"

"محمد خان کے لئے میں اپنی زندگی سے بھی کھیل سکتا ہوں۔"

"جو راستہ اب اپنا لیا ہے۔ اسے چھوڑنے کا نہیں۔ میری بات نہیں مانی اور کسی کی کیا سنے گا۔"

زہرا منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

میں نے کئی بار زہرا کی آنکھوں [illegible] دیکھے۔ چھوٹی عمر میں اس کی آنکھوں [illegible] رونے لگے۔ روتے روتے [illegible] خشک ہو جاتی۔



رفتار

(ادبی اور تہذیبی خبریں)

[illegible] کے چانسلر منتخب کئے گئے

[illegible] شہری [illegible]۔ مولانا آزاد [illegible] اور جامعہ [illegible] ڈاکٹر [illegible] کو تین سال کے لئے جامعہ اردو علیگڑھ کا [illegible] چانسلر منتخب کیا گیا ہے۔ شیخ الجامعہ پروفیسر [illegible] ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی علمی تعلیمی اور ثقافتی خدمات [illegible] کی [illegible] ہیں۔

جامعہ اردو کی بنیاد آگرہ میں پروفیسر [illegible] فاروقی اور چند دیگر اردو دوستوں نے ڈالی ہے۔ تقسیم کے بعد جامعہ کو علیگڑھ منتقل کر دیا گیا جس کے چانسلروں میں سر تیج بہادر سپرو، بابائے اردو مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر ذاکر حسین جیسی ہستیاں رہ چکی ہیں۔

جامعہ اردو، ادیب، ادیب ماہر اور ادیب کامل کے امتحانات کا ملک بھر میں انتظام کرتی ہے۔ اب تک جس کے امتحانات میں ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ امیدوار شریک ہو چکے ہیں۔

سلام مچھلی شہری کو پدم شری کا اعزاز

ہر سال کی طرح جشن جمہوریہ (۲۶ جنوری ۷۲) کے موقع پر حکومت ہند نے مختلف شخصیتوں کو جو اعزازات دئے ان میں اردو کے مشہور شاعر سلام مچھلی شہری کو پدم شری کا اعزاز دیا گیا۔ سلام مچھلی شہری آل انڈیا ریڈیو دہلی میں اردو کے پروڈیوسر ہیں۔ [illegible] اور رومانی شاعری میں ان کا ایک خاص مقام ہے۔

کیفی اعظمی پر فالج کا حملہ

[illegible] ترقی پسند شاعر کیفی اعظمی پر فالج کا نہایت سخت حملہ ہوا۔ دماغ کی نس پھٹ گئی اور جسم کا ایک طرف کا حصہ ماؤف ہو گیا۔ بریچ کینڈی اسپتال [illegible] کے ڈاکٹروں کی فوری توجہ سے تین دن بعد کیفی خطرے سے باہر ہوئے۔ [illegible] جاری ہے۔

ڈاکٹر محمد حسن بمبئی میں

[illegible] ڈاکٹر محمد حسن [illegible] اردو [illegible] یونیورسٹی [illegible] بمبئی کے [illegible]

[illegible]

"شاعر" کے چار گرانقدر خاص نمبر

کرشن چندر نمبر

اردو کے شہرۂ آفاق افسانہ نگار کرشن چندر کی شخصیت اور اُس کے ہمہ گیر فن پر ایک عظیم و حسین خصوصی اشاعت ۲۴۰ صفحات پانچ رنگ کا نفیس سرورق [illegible] صفحات پر یادگار تصاویر۔ چند کاپیاں باقی رہ گئی ہیں۔

قیمت ۲۵ روپے۔

غالب نمبر

غالب کی شخصیت فن اور زندگی پر ہندو پاک کے ممتاز نقادوں کے تازہ و فکر انگیز تنقیدی و تحقیقی مضامین۔ غالب نمبروں کی بھیڑ میں ایک سنجیدہ، متنوع اور منفرد خصوصی اشاعت گیارہ ابواب۔ چار رنگ کی غالب کی سنہری تصویر، غالب کے مختلف ادوار کی تمام یادگار تصاویر، رنگین بارڈر کے ساتھ غالب کے اردو فارسی کلام کا انتخاب۔

چند کاپیاں باقی رہ گئی ہیں۔

۲۳۰ صفحات قیمت ۱۲ روپے

گاندھی نمبر

ہندوستان کے عظیم رہنما تحریک آزادی کے سب سے بڑے قائد مہاتما گاندھی کی شخصیت اُن کی زندگی اور سیاسی و سماجی کارناموں کا بھرپور جائزہ گاندھی صدی پر کسی زبان نے ایسا یادگار نمبر پیش نہیں کیا ہے۔

لاجواب سرورق ۲۸۲ صفحات قیمت ۱۲ روپے

افسانہ و ڈرامہ نمبر

اس نمبر کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اردو کے ۴ افسانہ نگاروں اور ۵ ڈرامہ نویسوں کے علاوہ ہندوستان کی دوسری زبانوں کے گیارہ مشہور افسانہ نگاروں کے معیاری افسانے بھی اردو میں ترجمہ کرکے شائع کئے گئے ہیں۔ ۳۳۴ صفحات قیمت ۳ روپے

مکتبہ قصر الادب

[illegible]

محفل اپنی

[illegible] خیر مقدم

[illegible] کی آمد کے [illegible] "شاعر" کے عام شمارے [illegible] "شاعر" [illegible] صفحات [illegible] "شاعر" کا کوئی خاص نمبر [illegible] کے توقعات پر [illegible] دی جائے گی [illegible] "شاعر" [illegible] جاری رکھیں گے۔

قلمی معاونین سے پھر ایک بار

قلم کاروں سے درخواست ہے کہ وہ "شاعر" کے لئے بلند معیار اور [illegible] تخلیقات [illegible] مضامین اور افسانے [illegible] اردو [illegible] ادب میں [illegible] معیار تخلیقات کی اشاعت پر [illegible] کیا جائے۔ [illegible] "شاعر" کے [illegible] صفحات [illegible] "شاعر" [illegible] اہل علم اور بلند ذوق [illegible] معیار کو بلند سے بلند تر رہنا چاہیے [illegible] اردو کے [illegible] "شاعر" کے [illegible] زبانوں کے [illegible] مضامین کے تراجم [illegible] ہے۔

اُردو کے پانچ غیر مسلم طلباء کے نام "شاعر" جاری کرنا ہے

[illegible] ایک سال کے لئے پانچ غیر مسلم [illegible] کے نام "شاعر" جاری کرنا ہے [illegible] اردو [illegible]

[illegible]

آئندہ شمارے میں

مارچ [illegible]

مقالات

- ہمارا ادبی ورثہ — بشیر [illegible] — ڈاکٹر محمد حسن
- اسالیب نثر — ایک جائزہ — عبدالخالق ایم اے
- حیات جاوید — مبشر علی صدیقی ایم اے
- اشفاق حسین — خاکہ — طیب انصاری ایم اے

کہانیاں

- اور پتھر رو دیئے — جوہر تاپوری
- میں نہیں کہہ سکتا... — م۔ ق۔ خان
- تین کلیاں — محمود بالیسری
- آخری تصویر — ایس ٹی ایم عالم

ریڈیائی ڈراما

- دعوت — سلام بن رزاق

نظمیں

سلام مچھلی شہری — ناوک انصاری — حیدر نایاب — تنہا تماپوری — منظر [illegible] — سلیمان رضوی — عبدالقادر ادیب — ممتاز شکیب — اختر [illegible]

غزلیں

حرمت الاکرام — ضیا فتح آبادی — مظفر حنفی — [illegible] — نذیر فتح پوری — شاعر حکیم — غلام مرتضیٰ راہی — [illegible] — حبیب الرحمن [illegible] — مختار [illegible] — ندیم [illegible] — مظفر [illegible]

ناول

- اب میں وہاں نہیں رہتا — شاکر [illegible]

معتوبات — نقد و نظر — گفتار

[illegible] اپنے شہر کے [illegible] کے یہاں [illegible]

میں مقالات سب ہی خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ ڈاکٹر سید احتشام حسین نے ہماری تنقید نگاری کی منزل پر نئے چراغ روشن کئے تھے۔ افسوس اخبار کی تازہ خبر کے مطابق وہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مجھے اردو کے موجودہ نقادوں میں موصوف کے اسلوب تنقید سے کافی عقیدت تھی اور ان کا طرزِ نگارش بے حد پسند تھا۔ مجھے مرحوم سے صرف ایک ہی بار ملاقات کا موقع ملا تھا مگر اس مختصر سی ملاقات ہی میں اُن کی شخصیت اور علمیت نے مجھے بہت متاثر کر دیا تھا۔ خدا جنت نصیب کرے۔ نظموں میں سلام تارشش اور حرمت الاکرام ـــ غزلوں میں مکش، جمیل مظہری، جاں نثار اختر، علی جواد زیدی، اعجاز صدیقی، ضیا فتح آبادی اور رونق دکنی پسند آئے۔ کہانیاں سبھی اچھی ہیں۔ آپ نے ہندوستان کے سب ہی ممتاز افسانہ نگاروں کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔

ان تمام باطنی خوبیوں کے بعد سالنامہ کے حسنِ ظاہر کا کیا بیان کیا جائے۔ سبحان اللہ یہ آب و تاب کہ حسینوں کی نظر جھپک جائے۔ کاش اُردو کے شیدائی آپ کی مساعی کی قدر کریں اور رسالہ کی معاونت کے لئے کوئی قدم اٹھائیں۔"

نامی انصاری $\frac{9}{41}$ ہریڈ ـ سانچور

"شاعر" کا سالنامہ سخت انتظار کے بعد موصول ہوا۔ مگر دیکھ کر انتظار کی ساری کلفت ختم ہو گئی۔ "دیر آید درست آید" کا مقولہ اکثر صحیح ثابت ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید نے سردار جعفری کی شاعری پر بڑے متوازن انداز سے بحث کی ہے، اس سے پہلے میں اُن کی کتاب رشید احمد صدیقی پر بھی پڑھ چکا ہوں جو مجھے بے حد پسند آئی تھی۔ ڈرامے کی نوعیت کے بارے میں ڈاکٹر مسیح الزماں کا مضمون اور وزن و آہنگ کے بارے میں کرامت علی کرامت کا مضمون بہت معلومات افزا اور فکر انگیز ہے۔ آپ کی غزل حسبِ معمول فکر و نظر کے بہت سے گوشوں کو بے نقاب کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ؎

جس سے وابستہ ہو اک سلسلۂ بے رنگی
ایسی رنگینئ دامانِ نظر کیا معنی؟

کتنی گہری بات ہے کتنے خوبصورت انداز سے کہی گئی ہے۔ لطف آ گیا۔ محسن زیدی کی غزل بھی بہت خوبصورت اور مرصع ہے۔ ساری غزل میں ایک شعر بھی ناہموار یا غیر معیاری نہیں ملتا۔ بہت اچھی غزل ہے۔ برادرم نثار اٹاوی نے کچھ جدید اور کچھ قدیم عناصر کے امتزاج سے ایک اعلیٰ درجے کی غزل تخلیق کی ہے ؎

خون آلود کفن باندھ کے سر سے نکلے
نوجواں ہیں تری بستی کے سجیلے کتنے

اس شعر میں جو بانکپن ہے وہ دنیا کے کسی نہ کسی حصے میں کبھی نہ کبھی نظر آ ہی جاتا ہے۔ خوب شعر ہے۔ جاں نثار اختر، شمیم کرہانی، واثق جونپوری، ریاض بجنوری، شاذ تمکنت اور ساغر نظامی جیسے کہنہ مشق شعرا کی تخلیقات اعلیٰ معیار کی ہیں۔ مظہر امام صاحب کہنہ مشق اور خوش فکر شعرا میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے مگر جدیدیت کو انھوں نے اس طرح اوڑھ لیا ہے کہ اُن کی اصل شخصیت ہی جیسے غائب ہو گئی ہے ؎

اُس کی دہلیز کے سورج کو اٹھا لے آتے
اپنی دیوار کا سایہ جو گھنیرا ہوتا!

یعنی چہ؟ براج کومل کی نظم "زنگیروں کے بیچ" بہت جاندار ہے۔ کمار پاشی، راج نرائن راز، بازش پرتاب گڑھی اور حرمت الاکرام کی نظمیں بھی قدروں اور ندرت نگاہی کی آئینہ دار ہیں۔ سالنامے کا یہ سرسری جائزہ بھی نامکمل اور تشنہ رہے گا۔ اگر جناب یوسف ناظم کے مزاحیہ مضمون "سیر کر دنیا کی" معرضِ بحث میں نہ آئے۔ ایسی خوبصورت، نرم لطیف اور خوشبو بکھیرنے والی تحریریں شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتی ہیں۔ "اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ"۔ رشید احمد صدیقی کے بعد اتنی لطیف اور شوخ تحریر شاید ہی کسی نے لکھی ہو۔ طنز و مزاح کا میدان یوں بھی اِن دِنوں خالی سا ہے۔ خواجہ عبدالغفور اور یوسف ناظم کی شخصیتیں فقط ایسی ہیں جو اس خلا کو پُر کر سکتی ہیں۔ جس میں خورشید ایلی چپن کی گذر باش ہے۔ مجتبیٰ حسین کا مضمون بھی بہت دلچسپ اور شگفتگی سے بھرپور ہے۔ بہت پسند آیا۔ بانیات کا حصہ جس میں راقم الحروف کو بھی ٹانک دیا گیا ہے خاصا دلچسپ ہے۔ قمر قریشی کی نظم "جستجو کا کرب" بہت پسند آئی۔ اتنے خوبصورت سالنامے کی اشاعت پر مبارکباد قبول فرمایئے۔

سہیل عظیم آبادی، جیلانی بانو، مہندر ناتھ، جوگندر پال، قاضی عبد الستار، اقبال متین، ستیش بترا، رضوان احمد، رضوان شفیق اور انور قمر کی کہانیاں خوشگوار تاثر قائم کرنے میں کامیاب ہیں۔ ڈاکٹر ست پرکاش سنگر کی کہانی طنز و مزاح کے گوشے میں ہونا چاہئے جس کی دیگر تخلیقات دلچسپ، پُر لطف اور پُر معنی ہونے کی وجہ سے طنز و مزاح کا حسین نمونہ پیش کرتی ہیں۔ ڈراموں میں اظہر افسر کا ڈرامہ پسند آیا۔ ٹھاکر پونچھی کے ناول کے ابواب دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔ وجود کی پُر اسرار اور تہ دار شخصیت زبان و بیان کے سہارے دلوں پر منکشف ہوتی جا رہی ہے اور احساس کی گہرائیوں میں مجروح قلم کا المیہ دیرپا تاثر چھوڑتا جا رہا ہے۔ میرے خیال میں ٹھاکر پونچھی کے سابقہ ناولوں سے یہ ناول قدرے مختلف اور ادبی اہمیت کا حامل ہوگا۔

سطوت رسول　　　　جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

"شاعر" کا سالنامہ ملا۔ آپ نے اُسے بڑی محنت و کاوش سے ترتیب دیا ہے۔ برادرم کرامت صاحب کا مضمون "جدید شاعری وزن اور آہنگ" سالنامے کا سب سے اچھا مضمون ہے۔ بہت دنوں کے بعد ایک اچھا مضمون پڑھنے کو ملا۔ احتشام صاحب، سلام صاحب، گیان چند صاحب، مسیح الزماں، سید حامد حسین، محمد حسن صاحب کے مضمون بھی محنت سے لکھے گئے ہیں۔ خصوصاً عظمت حسین بیکش صاحب کا مضمون پُر از مغز و معلومات سے بھرا ہوا ہے۔ موسیقی اور اصناف موسیقی پر اتنا اچھا مضمون ابھی تک نظر سے نہیں گزرا تھا۔ ستار شہاب سرمدی صاحب نے اس صنف پر دو ایک مضمون لکھے ہیں۔

نظموں کا حصہ خاصا جاندار ہے۔ سلام، کومل، حرمت، ناز، تشنہ، تحسین، نعا، شہریار، رفتار کی تخلیقات بہت اچھی ہیں۔ غزلوں کا انتخاب بھی بہت پیارا ہے بعض جدید شعراء برابر ترقی کر رہے ہیں۔ اب ان کا فن نکھر اور سنور گیا ہے (میں ان کے نام لکھ کر طویل فہرست میں اضافہ نہیں کرنا چاہتا جس کی سبب معذرت چاہوں گا)

آج کا افسانہ بھی اس دور کے منفی اور جدید ذہن قاری کو اپنا گرویدہ بنا لیتا ہے آج کے افسانے میں سیاسی مصلحت نہیں زندگی کا کرب ہے جس میں آج کا انسان ہر لمحہ اور ہر آن نبرد آزما ہے اور تنہائی کا

وہ گھٹن ہے جو اس کی ذات کو بکھرے بکھرے شہر میں چاٹ رہا ہے اور سڑکوں پر رسوا کر رہا ہے، طنز و مزاح، ڈرامے، ناول اور باقیات کا حصہ بھی خوب سے خوب تر ہے۔ غرضکہ آپ نے ذہنی غذا کا بہت سا سامان اکٹھا کر دیا ہے!

آذر بارہ بنکوی۔ بی اے ایل ایل بی　　　　کٹرہ امام باڑہ۔ بارہ بنکی

"شاعر" کا سالنامہ ۷۲ء انتظار کے عالم میں ملا اُلٹ پلٹ کر دیکھنا شروع کیا۔ اچانک نظر آپ کی غزل کے حسن مطلع پر جم کر رہ گئی سبحان اللہ کیا خوب کہا ہے۔

نقشِ پائے دیگراں، نقشِ سفر کیا معنی؟
سب چلیں جس پہ، وہی راہگزر کیا معنی؟

سالنامہ کا حصۂ نظم پڑھ چکا ہوں اب مقالات پڑھ رہا ہوں۔ ظاہر ہے کہ اس میں وقت لگے گا لیکن اس وقت تک کے مطالعے سے میرے اس خیال کو تقویت ہوتی جا رہی ہے کہ سالنامہ آپ کے اسی حسن مطلع کی عملی تشریح ہے۔ حقیقتاً سالنامہ کے تمام مضامین صوری اور معنوی خوبیوں سے متصف ہیں اور ادبی دنیا میں اس کی انفرادیت چیلنج نہیں کی جا سکتی، بلکہ یہ سالنامہ دوسروں کے لئے خود ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے۔

سید منجو قمر　　　　ہرسکن۔ بیگم بازار حیدرآباد۔ اے پی

"شاعر" ۷۲ء کا ہنگامہ پرور سالنامہ دیکھ کر سارے ہنگامے بھول گیا۔ اس قدر محویت اور اس کی حلاوت بھی کہاں نصیب ہوتی ہے؟ وہ تو کہئے کہ آپ کے دیدہ و دل کا اعجاز تھا، جب ہی تو کہتا ہوں ؎

چلتے ہیں ناشناس زمانے کے ساتھ ساتھ
تم یوں چلو کہ ساتھ تمہارے جہاں چلے

نثار اٹاوی ایم اے　　　　اسلامیہ کالج اٹاوہ

اس کامیاب حسین نمبر کے لئے آپ کو کیا داد دوں، امید تو "شاعر" کے خاص نمبروں نے ہندوستان کے ادبی حلقوں میں ممتاز جگہ بنالی ہے اور صحافت کے لئے قابل قدر راہ بنا دی ہے۔ حیرت ہے کہ آپ اپنی خرابی صحت اور ذہنی پراگندگی کے بعد یہ سب کچھ کیسے کر لیتے ہیں، ماشاءاللہ

نے کچھ باقی نہیں رکھا ہے۔ بڑا تفصیلی، مدلل اور پُرمغز مضمون سپردِ قلم کیا ہے۔

آخر میں یہ "گنجہائے گرانمایہ" پیش کرنے پر دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔ واقعتاً اس "آبِ حیات" میں "ہفت خواں" طے کرنے پڑیں گے۔ کبھی کبھی میں سیاست دانوں کی طرح سوچتا ہوں آپ کے بعد کون؟ کون ایسا گلدستہ پیش کرے گا؟ خدا آپ کو تادیر زندہ و سلامت رکھے۔ آمین۔

رازی قریشی — مہتر کالونی گلبرگہ

"شاعر" کا سالنامہ ۲۰۰۲ء بعد صد حسرت انتظار نظر نواز ہوا۔ اس ضخیم متنوع اور وقیع سالنامے کے باب میں یہی عرض ہے کہ ؎

"حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں"

گردو کے اس تیرہ دور کے باوجود آپ کا خلوص، اس کے مستقبل سے مایوس نہیں ہونے دیتا جن جانکاہ دشواریوں کا آپ نے تذکرہ فرمایا ہے، ان کے باوصف فکر و فن کا یہ شاہکار ادبی دنیا میں یقیناً آپ کا ایک معجزہ ہے۔

آپ کی انفرادیت پسندی نے واقعی یہ ثابت کر دیا کہ ؎

"سب چلیں جس پہ وہی راہ گزر کیا معنی؟"

قمر قریشی — یہ مہ پٹیا بہادر گنج الہ آباد

"سویرا"، "نقوش"، "ادب لطیف" اور "فنون" جیسے جرائد کے خاص نمبروں کو دیکھ کر رشک کا جذبہ اُبھرتا تھا کہ ہمارے یہاں بھی اوراقِ مصور کا نمونہ لفظ و معنی کی جاگیر سجانے والے ادبی مرقعے پیش کئے جائیں۔ چنانچہ بایں اسمالالہ ذہنیت رکھنے والے اداروں، ادبا و شعرا بھی معترف ہیں کہ "شاعر" کے خاص نمبر گوناگوں خوبیوں سے پُر، صالح ادب کی ترجمانی کے ذریعہ ادب کے تعمیری رول کو اُجاگر کرتے ہیں ——

شاعر کا تازہ سالنامہ بھی افراط و تفریط اور انتشار کے اس بحرانی دور میں اہلِ فکر و نظر سے دادِ تحسین وصول کر رہا ہے جس کی تزئین و ترتیب میں محقق ذہن اور تجربہ کار ہاتھوں کی دریافت کارفرما نظر آتی ہے۔ آپ نے ہر زاویے سے صالح ادب کی ترجمانی کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔ یہ نمبر بھی سابقہ نمبروں کی طرح ادبی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

مقالات کا حصہ آج کے ادبی کینوس پر اُبھرنے والے فنکاروں کی ایک جاندار تصویر ہے۔ سبھی مقالے اپنے موضوع کے اعتبار سے انفرادیت اور ندرتِ فکر و نظر رکھتے ہیں۔ پروفیسر سید احتشام حسین، ڈاکٹر مسیح الزماں ڈاکٹر محمد حسن اور کرامت علی کرامت نے آج کی ادبی قدروں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے فنکار اور قاری کی ذہنی کشمکش کی تصویر کشی کے ساتھ مسئلہ کا حل بھی واضح انداز میں پیش کیا ہے۔ نظموں میں بلراج کومل کی نظم "صدائے آرزو کا کرب" شدتِ احساس اور تجربے وجود کا کرب سموئے ہوئے ہے اور تمام نظموں پر بھاری ہے۔ دیگر نظموں میں سید حرمت الاکرام، تارش پرتاب گڈھی، بشر نواز، عتیق مرکش، ملک کچھی، راج نرائن راز، صدف نیتیم، ناتی انصاری، بدیع الزماں خاور اور اختر بستوی کی نظمیں پسند آئیں۔ محمود سیمانی کی نظم "خبروں میں جو کھنڈ ہے" کا انداز و آہنگ، ابن انشا کی نظم "کورنا کی خبروں سے مناسبت رکھتا ہے" کرشن موہن کی نظم کا عنوان صہبا اختر کے منظوم فسانے "رنگ محل میں آگ لگی ہے" سے ملتا جلتا ہے مگر نظم جدا انداز رکھتی ہے اور ان کے مخصوص رنگ ڈھنگ کی مظہر ہے۔

غزلوں میں بیکش اکبرآبادی، نشاط آبادی، جمیل مظہری، غلام ربانی تاباں، مرحوم علیم اختر، علی جواد زیدی، جمال نثار اختر اور آپ کی غزلیں تعدیدِ غزل کی عمدہ مثالیں ہیں۔ جدید معنوی حسیت کو اپنے پیکر میں سمونے والی غزلوں میں حسن نعیم، منیر نیازی، مظفر حنفی، مظہر امام، ادیب احمد عمدان، ظہیر غازی پوری، منیر احمد صوفی، باقی، عزیز قیسی، سلطان اختر، تفضل دکنی، بشیر بدر، منوہر تیغ، یوسف جمال، تابش قریشی، بیدی، پرتاب گڈھی اور ساغر پالمپوری کی غزلیں پسند آئیں۔

مظفر شبلی کی غزل کا مطلع میری غزل مطبوعہ دیوان "مرد جنوں" کے مندرجہ ذیل شعر کا پس منظر لئے ہوئے ہے۔ ؎

نہ کوئی ابر کا ٹکڑا نہ کوئی پیڑ گھنا
یہ دشتِ زیست بھی اب کربلا لگے ہے مجھے

سلطان رسول ندا فاضلی کی تقلید سے دامن بچانے سے ہے تو اچھے گیت نئے انداز میں پیش کریں گے۔

کہانیوں کا حصہ آج کی کہانی کا ساتھ دیتا نظر آتا ہے۔ [illegible] سے زندگی کا قاری اور بے سمتی کا [illegible] کہیں بھی نہیں پایا جاتا۔

ابراہیم یوسف   حیدرآباد ۔ ادبی گوشہ بھوپال

سالنامہ "شاعر" کی روایات کے عین مطابق ہے اور شاعر نے خاص نمبروں کے سلسلے میں جو معیار قائم کیا ہے اُردو رسائل میں وہ امتیازی ہے۔

سالنامہ ۷۶ء میں قاضی عبدالستار کا افسانہ "ایک کہانی" بے حد پسند آیا۔ یہ کہانی میرے نزدیک کئی کہانیوں پر بھاری ہے۔ قاضی صاحب کا موضوع کے ساتھ انصاف بے پناہ ہے۔ اس بار رام لعل نے بڑا اچھا کردار تراشا ہے جو متاثر کرتا ہے۔ آمنہ ابوالحسن کا پورٹریٹ اور سہیل عظیم آبادی کا پہاڑی بھی معیاری ہیں۔

ڈاکٹر مسیح الزماں کا مقالہ "ڈرامے کی نوعیت" مضمون کے اعتبار سے تو بہت اچھا ہے، مگر اس کی گہرائی میں جانے کی اور گنجائش تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے اس خیال سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ڈرامے کا تعلق خالص اسٹیج سے ہوتا ہے مگر ڈاکٹر صاحب نے ہمارے بڑھتی ملک میں جو ترسیلی ڈراموں کا چلن بڑھ رہا ہے اُس کے مستقبل پر روشنی نہیں ڈالی کہ کیا ترسیلی ڈرامے اسٹیج کی کچھ مدد کر سکتے ہیں یا نہیں۔ میں خاص طور پر یہ کہنا چاہوں گا کہ ترسیلی ڈرامے اگر معیاری ہوں تو لوگوں میں ڈرامے کا ذوق پیدا کر سکتے ہیں جس سے اسٹیج کی دلچسپی پیدا ہو سکتی ہے۔ ترسیلی ڈراموں کو اسٹیج کو مقبول کرنے کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے۔ پتہ نہیں ڈاکٹر صاحب اس سے متفق ہیں یا نہیں۔ علی جواد زیدی کا مقالہ "مفروضہ ادبی اسکول" غور و فکر کی دعوت دیتا ہے، کرامت علی کرامت کا "جدید شاعری میں وزن و آہنگ کے مسائل" خالص علمی اور تکنیکی ہے اور اس فن سے تعلق رکھنے والوں کے لئے دلچسپی کا سبب ہوگا۔ انور افسر نے عرصے کے بعد اسٹیج کو سامنے رکھ کر ڈرامہ لکھا ہے۔ [illegible] ایڈیٹنگ ہر صفحے کے بجائے گنگش کا زیادہ خیال رکھیں، جس قدر کاغذ کا سالانہ پر بری طرف سے بیمار کیا وقت لگایا ہے۔

نظمی صدیقی   ۳۰۰ بھوچنا ۔ بلرہ بنسکی

سالنامہ ملا ۔ سالنامہ کیا ہے ایک گلدستہ ہے جس میں رنگ برنگ کے پھول ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان پر جدید رنگ غالب ہے۔ مجھے آپ کا یہ مطلع بے حد پسند آیا۔

نقش پائے دگراں نقش سفر کیا معنی؟
سب چلیں جس پہ وہاں راہ گزر کیا معنی؟

لیکن "اور احساس تمازت میں اضافہ ہوگا" ــــ میں لفظ تمازت[1] بُری طرح کھٹکا کیونکہ محققین نے اس کا ماخوذ "تموز" بتایا ہے جو عربی لفظ ہے، فارسی لغات میں اس کا کہیں پتہ نہیں ملا۔ اب آپ نے استعمال کیا ہے تو جائز ہی ہوگا۔ جاں نثار اختر کی دونوں غزلیں بہت ہی خوب ہیں۔ شمیم کرہانی کی ایک غزل اچھی ہے۔ جس کا مطلع ہے ؎

جہانِ مہر و ماہ سے میں چھوٹتا چلا گیا
گرا زمیں پہ ٹوٹ کر ٹوٹتا چلا گیا

بہت شاندار ہے۔ مہندر پرتاب چاند کا بھی ایک شعر پسند آیا۔ کیا خوب کہا ہے ؎

ظلم سہنا بھی تو ظالم کی طرفداری ہے
تم بھی موسیٰ بنو گر وقت ستمگر ٹھہرے

نثری تخلیقات میں سید احتشام حسین صاحب کا مضمون "جمالیات، فنکار اور قاری" تخلیقی اور نہایت بصیرت افروز ہے۔ علی جواد زیدی کا مقالہ "مفروضہ ادبی اسکول" بڑا دو ٹوک ہے۔ اس پر دو رائیں کیا ہو سکتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ادبی اسکول قائم کرنے وقت اگلے وقتوں کے تاریخ نگاروں کے ذہن میں مشاہیر میں پائی جانے والی چند مشترک خصوصیات یا مشترک اقدار رہی ہوں گی، وہ اسکول سے اُن کا مقصود مرکز ہی رہا ہوگا۔ بہرحال ؎

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو

قدریں بدلتی رہتی ہیں۔ نظریئے بدلتے رہتے ہیں۔ اور پھر فیصلے کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں۔ ہاں اگر کچھ کہا جا سکتا ہے تو کرامت علی کرامت صاحب کے مقالہ "جدید شاعری، آہنگ اور اُس کے مسائل" ویسے انھوں نے کہنے کے

---

[1] تمازت ۔ شدت کی گرمی ۔ عربی لفظ "تموز" سے فارسیوں نے بنا لیا ہے۔ (نور اللغات) ــ ادارہ ــ

کے تحت مسکراہٹ، ہنسی، آہاہا، قہقہہ، قلقاری، زیرِ لب تبسم۔ ذیل آنے والی "کے تحت ہجو، ہجا، استہزا، خندۂ استہزا، (یعنی استہزا) بمنزلہ تضحیک، تعریض، تنقیص، فقرہ بازی، چھیڑ خانی، پھبتی، اچھال، گالی گلوج، جھگڑا بازی، کلا درازی، زبان درازی، دلکیک، ہتک، پوچ، لغو، ضلع جگت، پھبتی، ٹھٹھا، مخول، پیتا مار دینا، ریٹ، بھنڈئی، غرض تمام بڑے عنوانات کے تحت اسی طرح بے شمار ذیلی عنوانات دیئے گئے ہیں۔ طنز و مزاح کے اتنے زیادہ مفاہیم، اتنے اقسام و مماثل اور رنگی جزئیات اس سے پہلے دیکھنے میں نہیں آئیں۔ خواجہ عبدالغفور صاحب نے مزاح کے ردِ عمل سے اُبھرنے والے نازک خطوط، اُن کی کیفیات اور حرکات کو بعض نئے نام دیئے ہیں اور اُن کے لئے انگریزی کے متبادل الفاظ منتخب کئے ہیں۔ فلسفۂ مزاح کی اصطلاحات کی ترتیب و تدوین ہی بجائے خود ایک مشکل کام تھا۔ اس پر اُن اصطلاحات کو مناسب انگریزی مترادفات کا جامہ پہنا دینا یا انگریزی میں طنز و مزاح کی جو اصطلاحات ہیں اُن کے لئے اُردو ناموں کی تلاش ایک تحقیقی اور علمی کارنامہ ہے۔ علاوہ ازیں، جابجا لطائف و ظرائف سے اِن سب کی مثالیں بھی دے دی گئی ہیں۔

آخری تین ابواب، اُردو صحافت اور ظرافت کے تحت ۱۸۳۰ء سے اب تک کے تمام اخبارات و رسائل کی فہرست دی گئی ہے جو یا تو بالکل مزاحیہ مواد پر مشتمل رہے یا جن میں جزوی طور پر با التزام مزاحیہ کالم ہوتے تھے۔ پھر "مزاحیہ شاعر" کی سُرخی کے تحت مزاح نگار شعراء کا ذکر ہے اور بطور مثال اُن کے ایک دو اشعار بھی دیئے ہیں۔ اِس کے بعد مزاح نگاروں "یعنی مشہور نثری مزاح پارے لکھنے والوں کے احوال ہیں۔ گویا طنز و مزاح کا کوئی گوشہ فاضل مُصنّف نے چھوڑا نہیں ہے۔ "کارٹون" کے باب میں مضمون اور لطیفوں کے ساتھ ۱۳ صفحات کے کارٹون بھی بنوا کر پیش کئے گئے ہیں۔ اِس درجہ محنت و تحقیق واقعی قابلِ داد ہے۔ "شگوفہ زار" طنز و مزاح کے ادب میں قابلِ قدر اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے اور اِس میں معلومات کا ایک خزانہ بند ہے۔

ہاں کتاب میں چند ایسے جنسیاتی لطائف شامل ہوگئے ہیں جو اگر نہ ہوتے تو یہ کتاب طلباء اور خواتین کو بھی بلا جھجک پیش کی جاسکتی تھی اور اُنھیں بھی اِس سے بہت فائدہ پہنچتا۔ دوسرے ایڈیشن میں ایسے لطائف حذف کر دیئے جائیں تو اچھا ہے۔ کتابت کی بھی نمایاں اغلاط ہیں۔ اِن دو جُزوی باتوں سے قطعِ نظر، یہ کتاب ایک مُستقل نصاب کی حیثیت رکھتی ہے اور اُردو میں اپنی نوعیت کی پہلی تصنیف ہے۔

سرِ ورق تجریدی آرٹ کا اچھا نمونہ ہے۔ ۴۱۰ صفحات۔

قیمت دس روپے۔

ملنے کا پتہ:۔ ہندوستان بھر کے تمام کُتب فروشوں سے یا

مکتبہ قصر الادب۔ پوسٹ بکس نمبر ۵۲۲۶۔ بمبئی ۲

مکتبہ جامعہ لیمیٹڈ پرنسس بلڈنگ بمقابل جے جے اسپتال۔ بمبئی ۳

(ادارہ)

حاصل کریں، اُن کے لئے تعلیم کی ضرورت کیوں ہے؟ دوسرے حصّے میں ماں کے فرائض (جس میں لڑکوں کی دیکھ ریکھ اور تعلیم و اخلاق کی طرف اُنھیں راغب کرانے کا کام ہے) پر روشنی ڈالی ہے۔ کتاب کا اندازِ بیان حد درجہ سادہ، بے تکلف اور پُر اثر ہے۔ کہیں پر واعظانہ خشکی اور نصیحت کی تلخی نہیں ملتی، پوری کتاب میں ایک ہمدردانہ اور دوستانہ ماحول چھایا ہوا ہے۔ اِس کتاب کو شائع کر کے مکتبہ نے اُردو والوں کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے۔

قیمت طلبہ ایڈیشن دو روپے پچاس پیسے، لائبریری ایڈیشن تین روپے۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ دہلی ۶/۲۵ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی ۳ (محمد ایوب واقف)

شگوفہ زار

از ——— خواجہ عبد الغفور

اصنافِ ادبِ اُردو میں طنز و مزاح کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ یہ پہلے غیر محسوس تھی۔ پھر محسوس ہوئی اور اب گزشتہ پچیس تیس سال میں اس نے ایک مستقل صنفِ ادب کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اُردو میں بہت سے طنز و مزاح نگار پیدا ہوئے، اُن میں سے اکثر نے اپنے اسلوبِ نگارش میں انفرادیت پیدا کی۔ مزاح نگاروں نے کہانیوں کے رُوپ میں، واقعات کے پس منظر میں یا اشعار کی صورت میں ہنسنے، مُسکرانے، قہقہہ لگانے اور طنز کے نشتر چلانے کی شعوری کوششیں کیں اور اس طرح ایک مربوط فلسفۂ طنز و مزاح پیدا ہو کر ادبی حیثیت اختیار کر گیا۔ لطائف اور چٹکلوں کو کبھی کوئی فنی یا ادبی حیثیت نہیں دی گئی تھی اور نہ فن کے درُون میں جھانکنے کی کوشش کی گئی تھی۔ خواجہ عبد الغفور کی پہلی کتاب "قہقہہ زار" جب شائع ہوئی تو ادبی حلقوں کو لطائف کی اہمیت اور اُن کی فنی حیثیت و افادیت کا احساس ہوا۔ خواجہ صاحب کا یہ ایک جراءت مندانہ اقدام تھا کیونکہ اُنھوں نے لطائف کی قدر و قیمت متعین کی اور طنز و مزاح کے باب میں اُنھیں ممتاز جگہ دیئے جانے پر اصرار کیا۔

"قہقہہ زار" کے بعد "شگوفہ زار" کی اشاعت خواجہ عبد الغفور کا پہلے سے بھی زیادہ اہم اقدام ہے۔ یہ کتاب طنز و مزاح کے نظری اور عملی دونوں پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہوئے ظرافت سازی کے فن پر اس کی تمام تر جزئیات کے ساتھ بھرپور روشنی ڈالتی ہے۔ لُطف کی بات یہ ہے کہ بُنیاد لطیفہ ہی ہے۔ اس میں فنِ ظرافت کی مختلف اصناف و اقسام کو اُن کی نوعیت، میلان اور اظہار و ترتیب کے اعتبار سے منضبط کیا گیا ہے۔ کرشن چندر نے اس کتاب کے تعارف میں ایک جگہ لکھا ہے:

"فنِ ظرافت کی اتنی اقسام اور اُس کی اس قدر مثالیں مشرق و مغرب سے جمع کر کے گنوائی ہیں کہ خاکسار کے علاوہ، وہ لوگ جن کا اوڑھنا بچھونا ظرافت ہے اور جو اس میدان کے کھلاڑی سمجھے جاتے ہیں، اُنھیں خود بھی اس پر حیرت ہوگی اور وہ عبد الغفور صاحب کی فنی عرق ریزی، نظرِ انتخاب اور متنوع ذہانت کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔ چٹکلوں، لطیفوں، [illegible] اور مثالوں سے قطع نظر، فنِ ظرافت کی انواع و اقسام کے اعتبار سے "شگوفہ زار" ایک چھوٹی موٹی انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے۔"

اس کتاب کے مندرجات کی فہرست دس صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ مزاح، خالص مزاح۔ مزاحیہ صورتِ واقعہ۔ بے تُکی مزاح کے بعد۔ ظرافت۔ ہنسی اور قہقہے کی مختلف اشکال۔ دل آزاری۔ حُسن و عشق۔ پیشہ ور مسخرے۔ بھانڈ۔ دوسروں کا مذاق۔ ہنسانے والی شخصیتیں۔ پھبتا ہوا مذاق۔ فاش غلطیاں۔ دماغی کیفیات۔ مضحکات۔ بے ہم آہنگی کا فقدان۔ [illegible] تماشا۔ [illegible] کی سُرخیوں کے تحت بے شمار ذیلی عنوانات ہیں۔ مثلاً ظرافت کے تحت طنز، شگفتہ طنز، مذاق، عملی مذاق، لطیفہ، شگوفہ، چٹکلہ، ذہنی گُلّی، دوسری زبان کے الفاظ سے۔ ایجاز، رعایتِ لفظی، تحریف نگاری، سخن چینی (لفظی گرفت)، آورد گوئی، تجنیس، ایہام، [illegible]، نکاتِ مطائبات، خاکہ اُڑانا، سرقہ، تفنن، بذلہ سنجی، [illegible] شوخ بیانی، استہزا، طنزِ لطیف، [illegible] ہنسی اور قہقہے کی مختلف اشکال

ترتیب [illegible] سلسلے کی پانچ کڑیاں معلوم ہوتی ہیں [illegible] مجموعی طور پر اُس ادب کی پوری تاریخ و تنقید [illegible] ادب کے زوال کے بعد جدیدیت، جدید ادب [illegible] شاعری کے نام سے اُس کی خالی جگہ کو پُر کرنے کے لئے آگے بڑھتا ہے۔

تیسرے حصّے میں غالب کا فکری پس منظر، مطالعۂ انیس کے چند مقامات، آتش [illegible] شعر و فن اور فراق ماسوائے غزل کے نام سے چار مضمون ہیں، جیسا کہ عنوانات سے خود ہی ظاہر ہے، اِن میں غالب، انیس، جگر مرادآبادی اور فراق گورکھپوری کی بعض ایسی فکری و فنی خوبیوں اور خامیوں پر سے پردہ اٹھایا گیا ہے جو اب تک معرضِ بحث میں نہیں لائی گئی تھیں۔

مجموعی طور پر آدھے مضامین ادب کی فلسفیانہ نوعیت سے متعلق ہیں تو آدھے محض فکری و فنی پہلوؤں کے حامل۔ فاضل تنقید نگار کی فلسفہ اور ادب کے باہمی رشتوں پر نظر گہری ہے، بقولِ خود اُنھوں نے فلسفہ کا مطالعہ ادب کی خاطر کیا ہے، گویا وہ فلسفہ تک ادب کے توسط سے پہنچے ہیں اور اِس سے اُنھوں نے ادب کو وسیع تر ذہنی فضا میں رکھ کر دیکھنا سیکھا، اُن کا خیال ہے کہ نفسیات کے عالموں کی تحقیقی تصانیف اور رسالہ ناموں میں انسان کے متعلق جو بصیرت ملتی ہے اُس سے زیادہ گہری بصیرت ناولوں، افسانوں اور شاعری میں اب بھی موجود ہے، فرق اتنا ہے کہ فلسفہ اور نفسیات میں علوم بنا لئے جاتے ہیں، ادب علوم بنانے کا روادار نہیں۔ اُنھیں اِس پر بھی یقین ہے کہ ادب فلسفہ سے قریب ہے اِسی لئے فلسفہ کی تحریکوں نے ادب کی تحریکوں کو متاثر کیا ہے اور تنقید کے لئے بعض خاص نظریات، تصورات اور اقدار کا وافر ذخیرہ فراہم کیا ہے، اِس طرح تنقید میں ادب مقدم اور فلسفہ مؤخر ہے۔

اُن کا عقیدہ ہے کہ "نقاد کا منصب حکم لگانا یا رہنمائی کرنا نہیں بلکہ تخلیق کی تفسیر و تفہیم ہے" اِسی لئے وہ اپنی تنقیدوں میں مصلح اور ہادی کا منصب نہیں دھارتے بلکہ محض ایک شارح اور مفسّر کی طرح [illegible] سے تخلیقات اور ادب کے مختلف مسائل پر سیر حاصل بحث کر کے اچھے اور بُرے کا فیصلہ قاری پر چھوڑ دیتے ہیں۔

جدیدیت اور جدید شاعری و ادب سے متعلق بحث کا آغاز اُن سے ہوا اور اُردو تنقید کو فلسفیانہ تصورات کی مدد سے نیا آہنگ اُنھوں نے بخشا، اُن کے یہ مضامین اپنی ایک انفرادی نوعیت رکھتے ہیں۔ صفحات ۲۵۴۔ قیمت ۱۲/۵۰ ـ ملنے کا پتہ: نصرت پبلشرز وکٹوریہ اسٹریٹ، لکھنؤ۔۳ (حامد اللہ ندوی)

مجالس النساء

مرتبہ ــــــ صالحہ عابد حسین

مجالس النساء تاریخ، ادب، اور معاشرت کے موضوع پر لکھنے والے روشن و درخشاں مصنف مولانا الطاف حسین حالی کی ایک گراں قدر تصنیف ہے۔ اس کا سنِ تصنیف [illegible] ہے، اگرچہ اِس کے ۲۰ سے زائد اڈیشن چھپ چکے ہیں، لیکن عرصہ سے یہ گراں قدر تصنیف نایاب تھی۔ مکتبہ جامعہ نے اس کی ضرورت کے پیشِ نظر اسے دوبارہ شائع کیا ہے۔ صالحہ عابد حسین صاحبہ نے جو اِس عہد کی معروف شخصیت ہیں، اِس کتاب کو ایک گراں قدر اور معلوماتی تعارف کے ساتھ ترتیب دیا ہے، حالی مرحوم ایک زبردست مصلحِ قوم بن کر اُبھرے، اُنھوں نے ہمارے سماج اور سوسائٹی کے ہر رُخ کو بیدار ذہن کی دُوربین آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اُنھوں نے دیکھا کہ ہمارے سماج میں عورتوں کو جو مقام ملنا چاہیئے وہ نہیں ملا ہے، اور علم و زبان میں اُنھیں کورا دیکھ کر تو اُنھیں بہت افسوس تھا، وہ عورتوں کا بڑا احترام کرتے تھے، اُنھیں زندگی بھر عورتوں کی تعلیم اور بہتر تربیت کا شوق رہا۔ اِس شوق کے پیشِ نظر عملی طور پر اُنھوں نے عورتوں کی تعلیم و تربیت کا نہ صرف انتظام ہی کیا تھا بلکہ عورتوں کے لئے چند کتابیں بھی لکھی تھیں جنھیں پڑھ کر عورتیں اپنے فرضِ منصبی سے آگاہ ہو سکتی تھیں، مجالس النساء حالی مرحوم کی ایسی ہی کوششوں کا نتیجہ ہے، یہی کتاب تکمیل کر اُن کے شاہکار کی داد میں ڈھل سنور کر سامنے آئی۔ مجالس النساء کو مولانا حالی نے دو حصّوں اور نو مجلسوں میں منقسم کیا ہے۔ پہلے حصّے میں اُنھوں نے یہ بتایا ہے کہ [illegible] تعلیم کو کس غرض [illegible]

جو لوگ اسلامی نظامِ تصوف کو سمجھنا چاہتے ہیں اور وحدت کی صوفیانہ شاعری سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لئے یہ کتاب ایک اہم تحفہ ہے۔ صفحات ۳۰۰، قیمت ۱۵ روپے۔ ملنے کا پتہ: انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ۔

(حامد اللہ ندوی)

انتخابِ میر

مرتبہ: ——— رشید حسن خاں

گہری دردمندی، بے پناہ گھٹن اور اپنی مسلسل کشمکشوں کو شاعری کے آبگینے میں ڈھال کر میر نے اپنے سرمایۂ کلام کو زندگی کے کیف و نشاط کا ہوش ربا مرقع بنا دیا۔ میر نے اگرچہ اپنی ہی زندگی کے نشیب و فراز، اپنی ہی آرزوؤں اور حسرتوں کی ناکامی اور اپنے ہی قلبی واردات کو شعر کے قالب میں ڈھالا، لیکن اس کے اسلوبِ بیان کی انفرادیت اور اس کے لہجے کے ترنم اور لطیف انداز نے اسے میر کی آپ بیتی کے بجائے جگ بیتی بنا دیا۔ ہر پڑھنے والے کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میر نے اس کی ہی دکھتی رگوں پر انگلی رکھ دی ہے۔ قاری کا یہی احساس میر کو اردو کی پوری شاعری میں ایک الگ مقام عطا کرتا ہے۔ میر نے اپنی شاعری میں جس حسین کیفیت کا رنگ بھرا ہے وہ ابدی ہے، اس کی روایات ہر عہد کی روایات ہیں، اس لئے ان سے ناطہ توڑنے کے بجائے اور مستحکم ہونا چاہئے۔

مکتبہ جامعہ نے اردو کے اس لازوال شاعر کی اعلیٰ روایتوں کو برقرار رکھنے کے لئے انتخابِ میر شائع کر کے اردو کے طالب علموں کے لئے بہت اچھا کام کیا ہے۔ کلیاتِ میر تو بہت سوں نے اپنی پسند اور اپنی خواہش کے مطابق شائع کئے ہیں، لیکن یہ امر مسلّم ہے کہ ان سے میر کی اصل شکل واضح نہیں ہوتی۔ اس کا خاص سبب یہ ہے کہ وہ کلیات ایسے قابلِ اعتبار نسخوں جو مستند مخطوطات پر مبنی ہوں کی مدد سے طبع نہیں ہوئے ہیں۔ مگر مکتبہ جامعہ کا انتخاب اس وجہ سے اہم ہے کہ اس میں میر کے رنگ و آہنگ کے تقریباً سبھی اہم گوشوں کو ابھارا گیا ہے۔ اس انتخاب کو پڑھ کر میر کا طالب علم نہ صرف مطمئن ہوتا ہے بلکہ اپنے ذہن میں میر کی مکمل تصویر کھینچ لیتا ہے۔ یہ حاصل مکتبہ کے انتخابِ میر کے مستند اور کارآمد ہونے کا ثبوت ہے۔ قیمت مجلد [illegible]

دو روپے پچیس پیسے، لائبریری ایڈیشن تین روپے پچیس پیسے، ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، [illegible] بمبئی — ۳

(محبوب واقف)

فلسفہ اور ادبی تنقید

از ——— ڈاکٹر وحید اختر

یہ ڈاکٹر وحید اختر کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ فاضل تنقید نگار نے اپنے ان مضامین کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے: پہلا حصہ: نظریات و مباحث، دوسرا حصہ: جدیدیت اور ادب، تیسرا حصہ: تنقیدی مطالعے۔ پہلے دو حصوں میں پانچ پانچ مضامین ہیں اور تیسرے حصے میں صرف چار۔ اس طرح یہ مجموعہ کل چودہ مضامین پر مشتمل ہے۔

ابتدا میں حرفِ آغاز کے نام سے ایک تعارفی مضمون ہے، جس میں ڈاکٹر وحید اختر نے تخلیق و تنقید کے اہم رشتوں کی نشاندہی کی ہے جن کی روشنی میں انھوں نے دورِ حاضر کی تخلیقات اور ادب کے عام رجحانات و تصورات کو دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے خود ہی مختصراً یہ بھی بتا دیا ہے کہ یہ مضامین کب اور کیسے وجود میں آئے اور ہر مضمون کا مرکزی خیال کیا ہے۔

پہلے حصے میں تحلیلِ نفسی کی بنیادیں، ادب کی جمالیاتی قدریں، کلچر، مذہب اور ادبی روایت، تفہیمِ شعر کا مسئلہ، اردو زبان و ادب کے متعلق کچھ سوالات، جملہ پانچ مضمون ہیں۔ ان مضامین میں انھوں نے نظریۂ تحلیلِ نفسی، فلسفہ، جمالیات، اردو کی ادبی روایت، شعری ذوق کی تربیت، اردو زبان و ادب کی بے مائیگی جیسے مسائل پر ان کے تاریخی، سماجی اور ادبی پس منظر کے ساتھ بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔

دوسرے حصے میں ہمارے عہد کا ادبی مزاج، جدیدیت کے بنیادی تصورات، انسان ایک مسئلہ (جدید شاعری کا ایک سوالنامہ کی روشنی میں)، جدید شاعری کا تنقیدی مطالعہ اور [illegible] کی روشنی میں کے عنوان سے پانچ مضمون ہیں۔ یہ سارے مضامین مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں اور ایک دوسرے سے الگ [illegible]

نقد و نظر

تبصرے کیلئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں

خواجہ میر درد، تصوف اور شاعری

از : ——— ڈاکٹر وحید اختر

ڈاکٹر وحید اختر فلسفہ کے طالب علم ہیں، جب انھوں نے پی ایچ ڈی میں داخلہ لینا چاہا تو ڈاکٹر میر ولی الدین نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ مغربی فلسفہ کے کسی اسکول پر کام کرنے کی بجائے مشرق کے تہذیبی ورثہ کو اہمیت دیں اور اسی سے متعلق کسی موضوع پر کام کریں۔ اس مقصد کے لئے انھوں نے درد کی معرکۃ آلارا تصنیف "علم الکتاب" کی طرف ان کی توجہ مبذول کرائی چنانچہ اس پر انھوں نے کام کیا اور انھیں جامعۂ عثمانیہ سے ڈاکٹریٹ بھی ملی۔ لیکن چونکہ موضوع کی پابندی کی وجہ سے وہ اس مقالہ میں درد کے ادبی کارناموں کی طرف توجہ نہ کر سکے تھے، اس لئے ان کی پیاس نہ بجھی اور انھوں نے اپنے اس کام کو جاری رکھا اور درد کے ادبی کارناموں کا اس میں اضافہ کر کے اس مقالہ کو ایک نئی شکل دے دی۔ چنانچہ "خواجہ میر درد تصوف اور شاعری" کے نام سے ایک جامع اور مبسوط کتاب ہمارے سامنے ہے۔

یہ کتاب ایک مقدمہ اور دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ درد کے تصوف سے متعلق ہے اور دوسرا حصہ ان کی شاعری سے متعلق۔ مقدمہ میں درد کے حالات، تصانیف اور ان کے عہد سے بحث کی گئی ہے۔ درد اردو دنیا میں ایک ایسے شاعر کی حیثیت سے متعارف ہیں جن کے کلام میں تصوف کا رنگ غالب ہے۔ ان کی متصوفانہ تصانیف کی طرف لوگوں کی نظر بہت کم گئی۔ فاضل مصنف نے پہلی بار اس پر سے پردہ اٹھایا ہے اور انھوں نے نہ صرف ان کی متصوفانہ شاعری کی خصوصیات تفصیل سے بیان کی ہیں، بلکہ ان کے صوفیانہ نظریات پر بڑی تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔

زیر نظر کتاب کے تین ابواب خصوصیت کے ساتھ بہت اہم ہیں، دوسرا، تیسرا اور چوتھا۔ ان ابواب میں پہلے تو ابن عربی اور شیخ مجدد کے نظریات توحید کی روشنی میں درد کے نظریۂ توحید کو واضح کیا گیا ہے اور پھر وجودیاتی، کونیاتی، علمیاتی اور اخلاقیاتی مسائل کے سلسلہ میں درد کے مخصوص نظریات کی وضاحت کی ہے، اس طرح ان ابواب میں نہ صرف تصوف کے بنیادی عقائد وحدت الوجود اور وحدت الشہود پر تفصیلی بحث ملتی ہے، بلکہ یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ ان دونوں میں درد کا رجحان کس طرف تھا۔

پانچواں اور چھٹا باب بھی اس لئے اہم ہے کہ یہ کتاب درد پر ہے جو صوفی کے علاوہ شاعر بھی تھے۔ ان دونوں میں شاعری کی صوفیانہ روایات پر روشنی ڈالنے کے بعد بہت سے صوفیانہ مسائل جیسے توحید و معرفت، صفائے قلب، بے اعتباری دنیا، توکل و فقر اور درویشی، جبر و اختیار وغیرہ پر خود درد کے اشعار کی مدد سے بحث کی گئی ہے، آخر میں درد کی انفرادیت اور ان کے تلامذہ کا ذکر ہے۔

صوفیانہ مسائل کو سمجھنے اور سمجھانے اور انھیں جدید فلسفیانہ مباحث سے ہم آہنگ کرنے کے لئے بے پناہ قوت افہام و تفہیم، بے انتہا باریک بینی اور زبان و بیان پر کامل عبور کی ضرورت ہے۔ وحید اختر فلسفہ کے استاذ ہیں اور سالہا سال سے فلسفیانہ مسائل کو سمجھتے سمجھاتے انھیں اس میں مہارت حاصل ہو گئی ہے۔ چونکہ فلسفہ ہی مذہب کا لبادہ اوڑھ کر تصوف بن گیا ہے۔ اس لئے یہاں بھی ان کی یہ مہارت اپنا جادو جگا گئی ہے۔ اور درد کا معاملہ کہ انھوں نے تصوف کے پورے نظام کو آئینہ کر دیا ہے، بحیثیت مجموعی اس کتاب کے دو پہلو ہیں۔ ایک طرف اس میں اسلامی نظام تصوف کے بنیادی اصول و عقائد کی تفصیلات ہیں تو دوسری طرف درد کے صوفیانہ عقائد و افکار کی تفصیل اور ان کے کلام کی صوفیانہ تشریح۔ دونوں ہی پہلو فاضل مصنف نے بڑی خوبی اور سلیقے سے واضح کئے ہیں۔

ویسے بھی تصوف ایک اہم موضوع ہے اور ہر خاص و عام کے دل میں اس کو سمجھنے کی ایک غیر شعوری سی خواہش رہتی ہے۔

[illegible]


LAHMINA
LAHMINA

[illegible]

[illegible]

[illegible]

بہت خیال رکھا۔ مفلر بھی [illegible] اُنھیں گرم چادر اُڑھا کر لے گئے۔ سری نگر میں ہم دونوں علی جواد زیدی کے یہاں ٹھہرے تھے۔ دوسرے شعرا ٹورسٹ بلڈنگ میں۔ زیدی صاحب سے فرقت کے تعلقات بے حد بے تکلفانہ گھر کے سے تھے۔ کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ مگر جاتے ہوئے جب بانہال کے درّے سے اِدھر بس رُک گئی تھی اور رات ڈاک بنگلہ میں گزارنی پڑی تھی تو مجھے اُنھیں سردی سے بچانے کے لئے بڑے جتن کرنے پڑے تھے۔ پان بکثرت کھاتے تھے۔ اُن کے ہاتھ [illegible] پان کی پُڑیا رہتی تھی۔ میرے ساتھ ہوتے تو میرا سفری پاندان، میرا بٹوہ اُن کے قبضہ میں رہتا۔ پان اگر ختم ہو جائیں تو کہتے: اب موت واقع ہونے والی ہے: پان سے ہر وقت مُنہ بھرا رہتا۔ بات کرتے تو پچکیں اُڑتیں۔

ضیق النفس (دمہ) کے مریض تھے۔ رات کو سو نہیں سکتے تھے۔ کبھی بیٹھے بیٹھے اُونگھ لئے، یا ایک آدھ خرّاٹا لیٹ کر لے لیا، بس۔ اُن کے ساتھ ٹھہرنا [illegible] تھا۔ بے حد باتیں کرتے تھے اور بہت جلدی جلدی۔ گرمی ہو یا سخت سردی، ریل ہو یا پہاڑ، ٹرین ہو یا گھر، وہ صبح چار پانچ بجے سرد پانی سے گھنٹہ آدھ گھنٹہ نہاتے تھے اور اِسی عمل سے جگار کے اضمحلال کو دُور کر دیا کرتے تھے۔ بالوں کو مہندی یا خضاب سے رنگتے تھے۔ سانس کی تکلیف کی وجہ سے بہت زور سے بولنے کے عادی تھے۔ مگر لہجہ بڑا شُستہ و رَفتہ تھا۔ "ہاں" تکیہ کلام تھا۔ مجھ سے سال دو سال چھوٹے تھے۔ عموماً آپ ہی کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ دہلی سے [illegible] جاتے ہوئے میرے ساتھ ہی تھے۔ ٹرین کی روانگی سے پہلے اندھیرے میں میرا سُوٹ کیس غائب ہو گیا اور جب بڑی پریشانی اور بھاگ دوڑ کے بعد وہ ایک دوسرے مسافر کے سامان میں ملا تو میں اور فرقت آ کے اپنی برتھ تک واپس۔ ابھی سُوٹ کیس اوپر برتھ پر رکھا بھی نہ تھا کہ بولے: "ہاں پان کھلایئے"

۱۹۶۳ء میں لکھنؤ یونیورسٹی میں کل ہند اُردو سمپوزیم اور مشاعرہ ہوا تھا۔ دونوں کی صدارت کا بار مجھ پر ڈالا گیا تھا۔ بمبئی سے ندا فاضلی میرے ساتھ گئے تھے۔ دہلی سے نریش کمار شاد۔ شہاب جعفری اور فرقت کاکوروی۔ بھوپال سے شفا گوالیاری۔ راجستھان کے بھی کئی ممتاز شاعر اور ادیب آئے تھے۔ ندا فاضلی نے اِس سمپوزیم اور مشاعرہ پر رپورتاژ لکھا تھا ——— وہ لکھتے ہیں۔

"(پانچ بجے شام کو سمپوزیم کے افتتاح کے وقت) ...... کسی نے پیچھے سے کہا، فرقت کاکوروی بھی تشریف لے آئے ہیں۔ فرقت صاحب میرے پیچھے ہی [illegible] کے پاس کسی تکلف کے بغیر آ کر بیٹھ گئے (ہزاروں آدمیوں کا مجمع تھا، اسٹیج پر بھی تل دھرنے کی جگہ نہ تھی) مُنہ میں پانوں کی بدولت بیس گلوریاں۔ چہرہ پر کئی سال کی [illegible] جگالیوں کی تھکن اور سر پر بکھرے چھوٹے چھوٹے بال۔"

"دوسرا دن کافی مصروف گزرا۔ دو مقالات کی نشستیں۔ پھر رات کو آل انڈیا مشاعرہ۔ فرقت کاکوروی نہائے دھوئے معصوم اور اُجلے نظر آ رہے تھے۔ اُنھوں نے اپنا مضمون پڑھا اور تمام محفل کو قہقہوں سے لوٹ پوٹ کر دیا۔ ایک تو موضوع ہی خود ایک قہقہہ تھا۔ اس پر [illegible] انداز۔ [illegible] سے خط کھو رہے ہیں۔ بات میں بات نکالنا اور لفظوں اور جملوں کے گھروندے بنا کر مزاح پیدا کرنا فرقت کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔" (سمپوزیم)

"فرقت کاکوروی اپنا نام سنتے ہی کرسی پر نہیں بیٹھے۔ اپنے بارے میں کہے گئے ایک ایک لفظ کو مسکراتے ہوئے سُنتے رہتے ہیں ..... فرقت صاحب نے [illegible] سیاسی موضوعات پر نظم پڑھی ہے۔ "برجستہ غزل دولہا": سامعین زبان کی صفائی، سیاسی طنز اور شوخ بیانی کی داد دیتے دیتے بے قابو ہوتے جا رہے ہیں۔

"مشاعرہ کے بعد ۔ جاگیں تمام رات جگائیں تمام رات۔ والی صورت بن گئی۔ میں، شہاب جعفری، عابد حسین ادیب، فضل المتین اور خلیل تنویر لطفاً اِس انتظار میں کہ فرقت صاحب جو لطیفہ سُنا رہے ہیں، وہ ختم ہو تو محفل برخاست کی جائے۔ مگر لطیفہ تھا کہ شیطان کی آنت۔ بات میں بات۔ جملے میں جملہ۔ میں وہاں سے [illegible] غائب ہو گیا۔ کافی دیر بعد جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ سامعین کی اکثریت شکست خوردہ فوج کی طرح گردنیں ڈالے پڑی سو رہی ہے اور اکیلے فرقت صاحب اپنی تیغ گفتار سے [illegible] شہاب جعفری پر لگاتار حملے کئے جا رہے ہیں۔"

فرقت مرحوم [illegible] تھے۔ [illegible] نظم دیں اور [illegible] کی تحسین اور سمپوزیم کے لئے مقالہ بھی دیدیا گیا تھا سفر میں اگر کچھ تازہ کہتے تو سُنا دیتے [illegible] تو ترمیم بھی کر دیا کرتے تھے۔ ان سے تعلق رکھنے والوں میں برحق صرف شمیم کرہانی، علی جواد زیدی اور مجھے حاصل تھا۔ دہلی جاتا تو [illegible]

[illegible]

اعجاز صدیقی

فرقت کاکوروی مرحوم ——— چند یادیں

مجھے جس بات کا اندیشہ تھا، بالآخر وہ ہو کر رہا۔ غلام احمد فرقت کاکوروی نے عالمِ غربت اور انتہائی کسمپرسی میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ ایسی المناک اور پُراسرار موت کہ میں آج تک اسی سوچ اور ایک ایسے عجیب رنج و اندوہ میں مبتلا ہوں جو عزیزوں اور دوستوں کی موت کے عام غم سے کچھ مختلف اور ماورائی قسم کا ہے۔ میں نے اپنے بہت سے خیالوں اور اندیشوں کو اسی شکل میں پورا ہوتا ہوا دیکھا ہے، جس طرح وہ کبھی لاشعور میں پیدا ہوئے۔ شاید یہ میرے تجربے، تجزیے، نفسیاتی مطالعہ و مشاہدہ اور حساس دل کا نتیجہ ہو۔ جو کچھ بھی ہو ——— فرقت کاکوروی کی موت دہلا دینے والی ہے۔ ہوا گویا کہ میں لرز کر رہ گیا اور میرے وہ جذباتِ نفرت جو دورِ جدید کے معاشرے، سماج، نظامِ حکومت اور غلط بخشیوں کے سلسلے میں مجھے ہمیشہ مضطرب و متالم رکھتے ہیں، کچھ اور بھڑک اٹھے۔ ۱۱ جنوری ۷۳ء کو فرقت بھوپال کے مشاعرے سے واپس ہو رہے تھے۔ جب ہی خبر آئی کہ اسٹیشن ماسٹر نے پولیس کو اطلاع دی کہ سیالدہ ایکسپریس کے تیسرے درجے میں ایک لاش ملی ہے۔ جامہ تلاشی پر ایک ڈائری برآمد ہوئی۔ دہلی اطلاع دی گئی اور قبل اس کے کہ دہلی سے فرقت مرحوم کے عزیز و احباب پہنچیں، ان کی لاش بنارس کی کسی مسلم انجمن کو دے دی گئی اور اس نے اپنے کارِ ثواب سے عہدہ برآ ہونے کے لئے سوچے سمجھے بغیر سپردِ خاک کر دیا۔ شرعی مجبوری یہ کہ لاش کو قبر سے نکال کر دوسری جگہ لے جایا بھی نہیں جا سکتا۔ ہائے یہ ہمارے ملک کی پولیس، یہ لاوارث لاشوں کی تجہیز و تکفین کرنے یا جلانے والے ادارے۔ کوئی دوسرا ملک ہوتا تو چند منٹ ہی میں مرنے والے کے واقفین یا اس شہر کی پولیس سے رابطہ قائم ہو جاتا، جہاں کا وہ تھا اور یہ جاننے کے بعد کہ اس کی شخصیت کیا ہے اس کی لاش حکومت کے خرچ پر دفن کے لئے گھر بھیج دی جاتی۔ یہی نہیں، موت کی پیچیدہ تحقیقات بھی کی جاتی۔ آخر یہ ڈائریاں، یہ شناختی کارڈ (IDENTITY CARD)، بستر بند اور سوٹ کیسوں پر نام اور پتے کس لئے ہوتے ہیں؟

کیا ایک ممتاز ادیب و شاعر کی اس المناک موت پر صدائے احتجاج بلند کی گئی۔ پولیس سے باز پرس ہوئی؟ کئی زبانوں کے ادیبوں اور شاعروں کے ضمیر جاگے؟ ماہرینِ ساز و موسیقی، فلم کے آرٹسٹوں اور مختلف کھیلوں کے کھلاڑیوں کے لئے بے شمار سہولتیں، بے اندازہ انعام و اکرامات۔ ہوائی جہازوں میں سفر کریں اور ادیبوں، شاعروں، معلموں کو تیسرے درجہ میں بھی بمشکل جگہ ملے۔ ان کی موتیں اس طرح واقع ہوں۔ یہ معاشی بدحالی کے شکار رہیں۔ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مریں ——— ؟!!

غلام احمد فرقت کی موت کے دو ہی سبب ہو سکتے ہیں یا تو ان پر کھانسی کا شدید دورہ پڑا ہوگا اور سانس گھٹ گئی ہوگی یا سردی کی شدت سے ان کی موت واقع ہوئی ہوگی۔ مگر ٹرین میں وہ تنہا تو نہ ہوں گے۔ وہ بھی تیسرے درجہ میں۔ کیا کسی نے ان کو تڑپتا اور کراہتا ہوا نہ دیکھا ہوگا؟ کیا ایک مرتے ہوئے انسان کو تنہا چھوڑ کر سارے مسافر ڈبے سے اتر گئے ہوں گے۔ کیا ہندوستانی ریلوں میں سفر کرنے والے اتنے کٹھور ہو گئے ہیں ——— !! بھوپال سے روانگی کے وقت ان کی حالت کیا تھی۔ کس نے انھیں سوار کرایا تھا۔ مرحوم کے پاس کیا سامانِ سفر تھا اور سردی سے مدافعت کے لئے کتنے کپڑے تھے؟

فرقت مرحوم کے ساتھ کئی بار موسمِ گرما اور سرما میں بھی طویل سفر کا اتفاق ہوا۔ جو ان کا مختصر سامانِ سفر ان کے ساتھ ہوتا تھا [illegible] ایک بار [illegible] گئے اور ایک بار [illegible]

[illegible]

[illegible]

The SHAIR' Bombay 8. Jan./Feb. 1973
THE MOST POPULAR OLDEST LITERARY & CULTURAL URDU JOURNAL
44 Years of Publication) (Telephone No. 359
Publishing Dates, 15-16
Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No. 14482/57

علامہ سیماب اکبرآبادی

کی چند حیات افروز تصانیف

کلیم عجم	(غزلیات)	چار روپیہ آٹھ آنے
سدرۃ المنتہیٰ	(غزلیات)	چار روپیہ
کارامروز	(نظمیں)	چار روپیہ آٹھ آنے
شعر انقلاب	(نظمیں)	تین روپیہ
عالم آشوب	(رباعیات)	تین روپیہ
میر غم (عزائی نظمیں اور سلام)		ایک روپیہ

جلدوں پر خوبصورت اور رنگین گردپوش

(مکمل سیٹ کی خریداری پر نصف محصول ڈاک معاف)

منیجر شاعر، مکتبہ قصرالادب پوسٹ بکس ۲۵۲۶ بمبئی ۸

Cover Printed at JAYA ART PRINTERS, Bombay-8.

اردو کا جو الیس سالہ علمی ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

شاعر بمبئی

مارچ ۱۹۷۳ء

جلد ــــــ ۴۴
شمارہ ــــــ ۳

مدیر
اعجاز صدیقی

معاونین
[illegible]
ڈاکٹر محمد حسن

مہتمم
ناظر نعمان صدیقی

[illegible]	[illegible]
عبدالمشتاق	بشیر علی صدیقی
عصمت الاکرام	طیب انصاری
شفیق آبادی	ثمر کرتپوری
جوہر بستاپوری	م۔ ق۔ خاں
مظفر حنفی	نامی انصاری
مجیب الیسری	قیصر [illegible] پوری
ایس۔ ڈی۔ ایم۔ عالم	سلیم [illegible]
غلام مرتضیٰ راہی	مسعود سبزواری
شاطر حکیمی	تنہا تماپوری
جمیل نایاب	شوکت پردیسی
ظفر گوری	اختر بستوی
حبیب الرحمٰن	عبدالقادر ادیب
مختار تسیم	ممتاز شکیب
سلطان [illegible]	ندیم [illegible]
حسرت [illegible]	ظفر [illegible]

فون ـ ۳۵۹۹۰۷

Tagdeer

زر سالانہ ــــــ ۱۰ ــــــ روپے
معاونین ــــــ ۲۵ ــــــ روپے
تاعمر خریداری ــــــ ۱۲۵ ــــــ روپے
ممالک غیر ــــــ ۱۵ ــــــ شلنگ

اس شمارے کی قیمت ایک روپیہ

منی آرڈر ارسال کرنے کا پتہ
ماہنامہ شاعر قصر الادب بمبئی ۴۰۰۰۰۸

خط و کتابت کا پتہ
ماہنامہ شاعر، مکتبہ قصر الادب، پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۷
بمبئی ۴۰۰۰۰۸

کیا آپ

کسی یونیورسٹی کے طالب علم

یا

تعلیم یافتہ

بیروزگار ہیں؟

ہمیں آپ ہی کی تلاش ہے!

[illegible]

[illegible] 71% [illegible]

[illegible] 1.75% [illegible]

[illegible]

[illegible]

جُرعات

اُردو جاننے والے ۳ کروڑ

اور اُردو اخبارات و رسائل کا سرکیولیشن صرف ۱۵ لاکھ !؟

لوک سبھا میں نائب وزیر داخلہ جناب ایف ایچ محسن نے یہ انکشاف کیا کہ ملک میں اُردو بولنے والوں کی تعداد ۲ کروڑ ۸۶ لاکھ ۱۰ ہزار ہو گئی ہے۔ اور لسانی آبادی کے اعتبار سے اُردو زبان چھٹے نمبر پر ہے۔ سب سے بڑی تعداد ہندی بولنے والوں کی ہے۔ اس کے بعد تلگو، بنگالی اور مراٹھی کا نمبر آتا ہے۔ اس گوشوارے میں انگریزی زبان شامل نہیں ہے۔ ظاہر ہے یہ اعداد مردم شماری کے لسانی خانے سے حاصل کئے گئے ہوں گے۔ کسی زبان کے بولنے اور اس کے مادری زبان ہونے میں بڑا فرق ہے۔ لاکھوں لوگ ایسے ہیں جن کی مادری زبان ہندی یا اور کچھ ہے۔ مگر وہ اُردو بولتے ہیں۔ اگر محض تھوڑی سی اُردو بولنے کی بات ہے تو یہ تعداد کسی طرح آٹھ دس کروڑ سے کم نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہاں یہ سوال ہی نہیں ہے۔ سوال کمّل طور پر اُردو جاننے، پڑھنے، لکھنے اور بولنے والوں کی تعداد کا ہے۔ نائب وزیر داخلہ کے دیئے گئے اعداد و شمار مادری زبان کی بُنیاد پر ہی معلوم ہوتے ہیں۔

جو کچھ بھی ہو ـــ یہ ماننا پڑے گا کہ اُردو والوں کی تعداد بڑھی ہے اور یقیناً اس سے کچھ زیادہ ہی ہوگی جو سرکاری طور پر بتائی گئی ہے۔ اب بعض صوبوں میں اُردو تعلیم کی سہولتیں دی جا رہی ہیں، اس لئے تعداد میں مزید اضافہ متوقع ہے اور اس اضافہ کا اندازہ چند سال بعد ہو سکے گا۔

اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے یہ مان لیں کہ اُردو جاننے اور بولنے والوں کی تعداد ملک بھر میں تین کروڑ ہے اور ان میں سے دو کروڑ کی سب سے بڑی تعداد ایسے لوگوں کی نکال دیں جو برائے نام اُردو جانتے یا بولتے ہیں تو تقریباً ایک کروڑ ایسے بچ جاتے ہیں جو بخوبی اُردو لکھنا پڑھنا جانتے ہوں گے اور آج کے دور میں جو لوگ کما حقہٗ کوئی زبان جانتے ہیں، وہ اس زبان کے اخبارات و رسائل ضرور پڑھتے ہیں۔ اس تجزیے کے اعتبار سے اُردو اخبارات و رسائل کا مجموعی (حلقہ اشاعت) ایک کروڑ تو ہونا ہی چاہیے۔ لیکن پریس رجسٹرار کی رپورٹ کے مطابق یہ حلقہ صرف چند لاکھ ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ہندی زبان کے بعد اُردو اخبارات و رسائل اپنی تعداد کے لحاظ سے تمام دوسری زبانوں سے زیادہ ہیں۔ ان کی مجموعی تعداد ۸۹۸ ہے۔ ۱۰۰ روزنامے، ۲۹۹ ہفتہ وار اور بقیہ پندرہ روزہ اور ماہانہ ہیں۔ لیکن ان سب کی تعداد اشاعت CIRCULATION بہت کم ہے۔ دہلی میں ۴ء۴ لاکھ، اتر پردیش میں ۱ء۹۱ لاکھ پنجاب میں ۸۶ء۱ لاکھ۔ بہار، بنگال، مہاراشٹر، مدھیہ پردیش، آندھرا اور میسور کے چھ صوبوں میں مجموعی سرکیولیشن ۳ء۳ لاکھ ہے۔ چونکہ یہ اعداد و شمار کچھ پرانے ہیں اس لئے ان میں لاکھ ڈیڑھ لاکھ کا اضافہ مزید ہوا ہوگا۔ پھر بھی یہ گیارہ بارہ لاکھ سے زیادہ نہ ہوں گے۔ اس اشاعتی تعداد کو مزید بڑھا کر پندرہ لاکھ کر لیجئے۔ تو بھی ایک کروڑ معقول اور باقاعدہ اُردو پڑھے لکھے لوگوں میں پندرہ لاکھ کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اسی وجہ سے اُردو اخبارات و رسائل کا شمار متوسط درجے کے اخبارات کے زمرے میں ہوتا ہے اور قومی زندگی میں انہیں وہ مقام حاصل نہیں ہے جو دوسری زبانوں کے اخبارات و رسائل کو حاصل ہے۔ اُردو اُردو کی رٹ لگانے والوں کے لئے یہ کتنی شرم اور افسوس کی بات ہے۔

باقاعدہ اُردو پڑھے لکھے لوگوں کی کم از کم تعداد ایک کروڑ مان لینے کے باوجود اگر READERSHIP پڑھنے والوں کی مجموعی تعداد پچاس لاکھ تک بھی نہ پہنچے تو یہ کتنے تعجب کی بات ہے۔ یقیناً یہ ایک بہت پیچیدہ مسئلہ ہے اور اس کے اسباب و علل کی کھوج بیحد ضروری ہے۔ اس سلسلے میں محض قیاس آرائیاں کام نہیں دے سکتیں۔ اُردو صحافت اتنی پیچھے کیوں ہے؟ اُردو مطبوعات کی کھپت کیوں نہیں ہے؟ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اب تک اُردو اخبارات و رسائل جو وابستہ رہے کرتے آئے ہیں وہ محض "اٹکل" کا ہے۔ ایسے معاملات میں صحت مند، منظم اور آگہانہ نہیں کہا جا سکتا۔ اگر پڑھنے والوں کے حلقوں کا صحیح سراغ لگا لیا جائے تو رسائل و اخبارات کے علاوہ کتابوں کی کھپت کے امکانات بھی واضح ہو سکتے ہیں۔

ذمہ داران اُردو اس پر غور کریں گے۔ ہم اس بارے میں کوئی حل نکالیں۔ ہم انہیں شاعر کے صفحات میں اظہار خیال کی دعوت دیتے ہیں۔

سلامت علی مہدی

اتنی قربت اتنی دوری

— تمام چیزیں قریب تر ہیں
بغیر پاؤں چلے ہوئے بھی
سفر سارے ختم پا لیے گئے

عناصر خمسہ کی یہ قربت!
علاوہ اِن کے کرۂ پانی
ہم ان سے بے حد قریب ہیں اور یہ بھی ہم سے قریب تر ہیں
اگر یہ قربت نہ ہوتی اِن میں
تو کیسے انسان زندہ رہتا
تمام چیزیں قریب تر ہیں۔
تمام چیزیں قریب تر ہیں
— کئے ہیں پار جس نے سات قلزم
بس ایک طیارے ہیں کہ جس کو
اُڑان بے بال و پر کی کہیے۔
یہ ریڈیو — جس نے دی ہے حرکت!
زمین اور آسمان کو
تاکہ ان کو بخشیں
گھر دلوں میں وہ انبساط کی ساری دولت —
تمام چیزیں قریب تر ہیں —
یہ راکٹ،
اسپوتنک
ستاروں کی سمت تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔

قریب مہتاب آ گیا ہے
قریب اتنا کہ جیسے "بیل" کے قریب ہی وہ
شگفتہ پھولوں سے کھیلتا ہے۔
تمام چیزیں قریب تر ہیں۔
یہ مادر دہر کی ساری آنکھیں
کہ نذر مژگاں ہیں جن کے دم سے
ہماری دھرتی کے دائرے بھی
عظیم دھرتی کا پیدا کردہ عقیدہ
ہوا ہے ایسی عظیم قوت کا خوش نصیب
کہ اس نے بیابانوں کو بھی آج ہم سے نزدیک کر دیا ہے
تمام چیزیں قریب تر ہیں،
تمام چیزیں قریب تر ہیں —

یہ سچ ہے انساں کے کارنامے بہت ہی نزدیک آ گئے ہیں
مگر یقیناً،
اور یقین محکم ہے آج انسان سے گریزاں۔
تمام چیزیں قریب تر ہیں،
مگر خود انسان آج انساں سے اجنبی ہے
ہم اپنی ذات اور اپنی ہستی سے اجنبی ہیں۔
یہی کمی ہے۔
وگرنہ یہ ماننا پڑے گا۔
تمام چیزیں قریب تر ہیں
تمام چیزیں قریب تر ہیں

(اس نظم کو [illegible]) سلامت

ڈاکٹر سید احتشام حسین

ہمارا ادبی ورثہ

[illegible] بات چیت [illegible] لفظوں کی کہانی [illegible] ہمارے ادبی ورثہ کی [illegible] ہماری کیا مراد ہوتی ہے [illegible]
[illegible] رہتا ہے۔ بات یہ ہے کہ [illegible] ہم کی ہے اور اس ہم [illegible]
[illegible] کیا ہم کسی ایک علاقے کے رہنے والے ہیں اور ہمارا [illegible] ہم کسی ایک خاندان کے ہیں کسی ایک [illegible]
[illegible] کسی ایک زبان [illegible] کسی ایک مذہب کے ماننے والے [illegible] کسی ایک کلچر [illegible] سے بندھے ہوئے ہیں [illegible]
[illegible] مگر [illegible] اور [illegible] پارہ پارہ ہو سکتے ہیں [illegible] ایک
[illegible] انسانیت، قرابت اور [illegible] کے سارے بندھن توڑ سکتے ہیں۔ مذہب، زبان، علاقہ اور
[illegible] کی پہچان [illegible] نہیں ہوتی۔

[illegible] ہندوستانی کہتے ہیں [illegible] کے رہنے والے، کسی دھرم یا مذہب کے ماننے والے [illegible]
[illegible] ہندوستانی [illegible] ہندوستان کی تہذیب [illegible] نہیں
[illegible] ہندوستان [illegible] کو بنیاد کیا ہے۔ کیا اس کی بنیاد [illegible]
[illegible] تنگ نظری اور [illegible] آج جب کہ زبان اور دوسری
[illegible] ہندوستان [illegible]
[illegible] کیا ان کی کوئی الگ کلچر [illegible]
[illegible] ہمارا الگ نہیں ہے۔ [illegible]
[illegible] کے دعوے، [illegible]
[illegible] ہندوستانی کلچر کی بات کریں [illegible]
[illegible] ہندوستانی کلچر کا [illegible] کیا آج کے ایک [illegible]
[illegible] ہے؟

[illegible] ہندوستانی کلچر [illegible] وقت [illegible]
[illegible] رہے ہیں اور [illegible]
[illegible] اپنے کعبے اور کاشی
[illegible]

بقیہ اداریہ

ہندوستان کی کوئی تصویر سامنے رکھئے، یہ سوال پھر بھی باقی رہتا ہے کہ قوم کی بنیاد کیا ہے؟ زبان ہر صوبے کی الگ الگ ہے۔ اس لئے یہ ایک زبان کی بنیاد پر اکائی نہیں بنتا۔ موسم، لباس، کھانا پینا، رسم و رواج، مذہب سب کچھ ہر صوبے میں الگ ہے۔ ایسا کہ مدراس کا آدمی کشمیر پہنچ جائے تو اپنے کو اجنبی پائے اور آسام کا رہنے والا گجرات جا کر اپنے کو مشکل سے پہچانے۔ پھر ان رنگ برنگے حصوں کو ایک اکائی میں ڈھالنے اور ایک نام دینے والی طاقت کیا ہے۔ ایک مذہب اور دھرم کا ناطہ ہوتا تو بنگلہ دیش اور پاکستان ایک رہ جاتے۔ خیال شاید بھارت کا حصہ ہوتا۔ نسل اس کی بنیاد ہوتی تو آریہ اور دراوڑوں کا سا اتحاد نہ بنتا۔ کبھی نے قوموں کی تعریف دیکھا کہ نئے پانچ اصول بنائے گئے۔ ایک علاقے میں رہنا اور زبان، مذہب، تاریخ، سماجی رویے اور کلچر کا ایک ہونا قوم کی پہچان بنی تھی۔ مگر ہندوستان تو ان میں سے تقریباً سبھی شرطوں کو توڑنے والی اکائی ہے۔ رنگ برنگوں کا ملک۔ الگ الگ کلچرل اکائیوں کی اکائی جس کی بنیاد اگر ہے تو صرف سیاسی اتفاقات پر ہے، تاریخ کی ان دیکھی طاقتوں پر ہے۔

تاریخ کی ان طاقتوں کو دیکھئے تو ہر زمانے میں ملانے والی اور بانٹنے والی طاقتیں ایک دوسرے سے ٹکراتی نظر آتی ہیں۔ ایسے بھی لوگ رہے جنہوں نے تھوڑا اپنے علاقے کو پورا ہندوستان سمجھ لیا، اپنے کلچر ہی کو ہندوستانی کلچر جانا اور باقی سب کو یا تو جنگلی ٹھہرایا یا بدیسی۔ فقط اپنی زبان کو زبان کہا، اسی سبب دیہاتوں اور علاقوں کو بھی سانچے میں ڈھل جانے کو کہا۔ چھوٹی وفاداریاں بڑی وفاداریوں سے ٹکرائیں اور اس ٹکراؤ کا زہر دور تک چلا گیا۔ اسی لئے آج جب گزرے ہوئے کل پر نظر ڈالتے ہیں تو سب سے پہلے یہی سوال سامنے آتا ہے کہ اس کے کس حصے سے ہم اپنا رشتہ جوڑتے ہیں۔ اس میں زہر بھی ہے اور امرت بھی، کہیں دونوں مل بھی گئے ہیں۔ ان میں سے زہر کو کیسے چھانٹ کر الگ کریں اور امرت کو کس طرح اپنائیں۔ یہ سوال آج کے کلچر کا بڑا اہم سوال ہے۔

پھر 'ہم' کا لفظ فقط قومی حد بندی تک بھی تو نہیں ٹھہر سکتا۔ آج دنیا بہت چھوٹی ہو گئی ہے۔ اخبار، ریڈیو اور سفر کی آسانیوں نے دور دور کے ملکوں کو ایک دوسرے کے قریب کر دیا ہے، اتنا قریب کہ ویت نام کا دھماکہ ہمیں اپنے آنگن میں سنائی دیتا ہے۔ امریکہ کا فیشن [illegible] میں رائج پایا جاتا ہے۔ ایسے میں ایک ملک کا کلچر دیسی اور بدیسی کے خانوں میں گھرا نہیں رہتا اور جانے ان جانے دنیا بھر کا ایک کلچر بننے لگتا ہے۔ دنیا کے اس [illegible] کو توڑ کر کوئی ملک آج زندہ نہیں رہ سکتا۔ ہر قومی کلچر آج دنیا کے کلچر سے جڑا ہوا ہے اور آج 'ہم' کا لفظ فقط قومی نہیں دنیا کے کلچر کی کڑی ہے۔ ایسے میں کوئی ملک اور کوئی قوم بھی اپنے دیسی کلچر سے آگے نہ بڑھنے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ سوچ بچار سے لے کر ادب اور آرٹ تک، پہناوے سے لے کر کھانے پینے اور بات کرنے کے انداز تک سب میں عالمی کلچر کی ایک گہری چھاپ موجود ہے۔ گویا آج کے زمانے میں 'ہم' کا لفظ اپنے علاقائی رشتے، قومی رشتے اور عالمی رشتے سے مل کر بنتا ہے اور ان تینوں میں سے کسی سے بھی اپنے کو کاٹ نہیں سکتا۔ یہ تینوں رشتے ملتے بھی ہیں، جیسے آدمی کے اندر الگ الگ خواہشیں INSTINCTS اور ضرورتیں ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں اور ان کے ٹکراؤ کو کم کر کے انہیں ایک دوسرے سے ملا کر اکائی میں ڈھالنے سے شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے۔ اسی طرح علاقائی، قومی اور عالمی رشتوں کو ایک دوسرے سے ملا کر ان کے ٹکراؤ کے بجائے ان کے میل کو اپنانا ہی زندہ قوموں کی پہچان ہے۔

اب دوسرے لفظ کو لیجئے۔ ادبی، ادب، تہذیب یا کلچر کا حصہ ہے۔ تہذیب یا کلچرل معاملوں کا جو چاہت ہے، سو جو بوجھ کر۔ مولانا محمد علی نے کہا ہے کہ [illegible] کے ہر لفظ سب سے بڑا شہید ہے جو جس طرح چاہتا ہے اس طرح برتتا ہے، جو معنی چاہتا ہے پہنا دیتا ہے۔ لفظوں کے اس قافلے میں کچھ لفظ دوسروں سے زیادہ شہید ہوئے ہیں اور بار بار شہید ہوتے ہیں۔ کلچر بھی انہیں میں سے ایک ہے۔ ادب کلچر کا حصہ ہے، اس لئے ادب کا [illegible] ادب کے دو پہلو ہیں، ایک خیال دوسرا زبان۔ خیال ہوتا تو لکھنے والے کا ہے لیکن اس کی سوچ کے پیچھے اس کے پورے سماج سے رشتے ہوتے ہیں۔ اسی لئے میر نے اپنی شاعری کو صرف دل کا نہیں دلی کا مرثیہ بھی کہا تھا۔ سماج کی سوچ [illegible] گہری کا رشتہ اس سے پہلے [illegible] جا کر ملتا ہے، اسی لئے ایک زمانے کا ادب دوسرے زمانے میں بھی پڑھا اور پسند کیا جاتا ہے۔ ادب کے ان دونوں پہلوؤں کو لیجئے۔

پہلے زبان کو جس کے نام پر پچھلے دس پندرہ سال سے پورے ملک میں فتنہ و فساد جاری ہے۔ انگریزی کے خلاف [illegible] کی لڑائی کا حصہ تھی۔ ذہن اور زبان آزاد نہ ہوں تو ملک اور قوم آزاد نہیں، لیکن [illegible] انگریزی کے [illegible] تھی

یہ لڑائی بہت ... کے مختلف طبقوں کی زبانوں کو قریب لانے کی لڑائی تھی اور آج کی ... ملک میں یہ لڑائی جاری تھی اس سے [illegible]
مختلف طبقوں اور فرقوں کے درمیان ایک نئے طبقے اور ایک نئے میل جول کی بنیاد ڈالی۔ آج یا ... سے نہیں اگر تین ہم تہذیب اور [illegible]
جل سے اور زندگی کی لڑائی ساتھ لڑنے سے بنتی اور بڑھتی ہیں۔ یہی میل ملاپ کی زبان ملک کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک ہر جگہ تھوڑی بہت
خود بھی اور بولی جاتی تھی۔

زبان اور کہاوت کی بات ایسے ملک میں کرنا عجب سا ہے جہاں پڑھے لکھے ۲۰ فیصدی سے کم ہیں، جہاں اور ۸۰ فیصد آدمی پڑھنا لکھنا نہ جانتے ہوں۔ یوں بھی پڑھے لکھے سماج میں بھی اب دن بدن چھپا اور لکھا ہوا لفظ اپنی حیثیت کھو رہا ہے اور بولا جانے والا لفظ یا تصویر یعنی فلم، ٹیلی ویژن اور ریڈیو کے ذریعہ ہمارے سماج کے دماغ کو ڈھال رہے ہیں۔ جس طرح ہندوستان میں الگ الگ قومیتوں کے مل جل کر ایک قوم بننے کا عمل سست اور پیچیدہ تھا، اسی طرح اس زبان کے بننے کا عمل بھی پیچیدہ تھا۔ اس زبان کی بنیاد سب سے زیادہ کھڑی بولی سے قریب تھی گو اس کے لفظ سنسکرت سے بھی آئے، فارسی عربی، ترکی سے بھی اور بعد کو پرتگالی اور انگریزی سے بھی۔ ملک آزاد ہوا تو آزادی کی لڑائی میں نکھرنے والی اس زبان کو ہند کے دستور میں جگہ نہ ملی اور اسے کاٹ کر دو الگ زبانوں کا روپ دے دیا گیا۔ ہندی اور اردو۔ ان دونوں کے ادبی رنگ روپ کے الگ الگ ہونے کی بات اوّل تو اتنی آسانی سے ماننے والی نہیں ہے لیکن اگر مان بھی لی جائے تو بھی یہ صرف اس کو ثابت کرتی ہیں کہ کسی زبان کی بنیاد سے اوپر اٹھ کر اس کے ایک سے زیادہ روپ ہو سکتے ہیں۔ ایک پردیسی بولیوں کا اثر زیادہ گہرا ہوگا، دوسرے پر باہر سے کلچر کا جو ایرانی کلچر کا ایک روپ تھا۔ پھر اگر یہ دونوں ادبی روپ دو الگ الگ کہاوتوں میں لکھے جاتے ہیں تو کیا [illegible] ہے جبکہ ایک کہاوت کو سیکھ کر قریب قریب سبھی ہندوستانی زبانوں کے پڑھنے میں مدد مل سکتی ہے اور دوسری کہاوت کو سیکھ کر کچھ ایشیا کی زبان اور کلچر سے رشتہ جڑ جاتا ہے۔ دو کہاوتوں والی ہندوستانی کو ملک نے آزاد ہو کر دیس نکالا دے دیا۔ اس کی پیدائش کی وجہ تھیں، جنھیں سب جانتے ہیں، مگر مذاق مذاق میں کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ ان وجہوں سے غصے میں آکر ملک نے اپنی زبان کاٹ لی۔ اردو کو اس کا حق نہیں ملا یہ الگ بات ہے۔ مگر اس سے زیادہ دکھ کی بات یہ ہے کہ ہندوستانی جس مخلوط کلچر کی نشانی تھی اور اس کلچر میں جو حصہ غلط یا صحیح اردو کے نام سے پہچانا جانے لگا تھا وہ حصہ بھی مرجھانے اور کمہلانے لگا۔

آج ہندی اور اردو کی الگ الگ TERMS تیار کرنے کے کام پر لاکھوں روپیہ خرچ ہو رہا ہے۔ دونوں زبانیں الگ الگ سنسکرت اور عربی فارسی کے خزانوں سے لفظ چھانٹ رہی ہیں اور عام بول چال کی ہندوستانی اپنا ذخیرہ لئے ایک کنارے [illegible] بے چاری کھڑی ہے۔ یہ آسانی سے کہہ دیا جاتا ہے کہ بڑی بات کہنی ہو تو ہندوستانی ساتھ نہیں دے سکتی۔ اونچی اڑان بھرنی ہو تو اس سے کام نہیں چل سکتا، مگر یہ بات بھلا دی جاتی ہے کہ بولی جانے والی زبان کا بھنڈار لکھی جانے والی زبان سے کہیں بڑا ہوتا ہے اور ہندوستانی کو ابھی تک ملک میں پورا موقع ہی نہیں دیا گیا ہے۔ Air Conditioned Train جیسی ٹرین کا ترجمہ سنسکرت سے ڈھونڈا گیا۔ مگر عام ہندوستانی نے اسے ٹھنڈی گاڑی کہہ کے اپنا مطلب ادا کر لیا۔ [illegible] جنرلسٹ نے "Horse shoe" کے لئے سارے لغت چھان مارے، ایک جاہل کو Horse shoe دکھایا، وہ بے ساختہ بولا "گھر نال"۔ ایسے نہ جانے کتنے لفظ کتنے ٹکڑے۔ کیسے کیسے پیارے محاورے اور ترکیبیں ہماری عام بول چال میں ہیں یا ان سے بنائے جا سکتے ہیں۔ ملک ایک طرف میل ملاپ کی بات کرتا ہے اور دوسری طرف میل ملاپ کی جو نشانیاں پروان چڑھ چکی ہیں ان کو بھی کاٹ کر الگ الگ ٹکڑیوں میں بانٹ دینا چاہتا ہے۔ جو مل رہے ہیں انھیں دور کر رہا ہے۔ ۱۹۴۷ء تک کم سے کم یوپی اور بہار میں ہندی جاننے والوں کے لئے اردو اور اردو جاننے والوں کے لئے ہندی جاننا ضروری تھا۔ ہر اسکول میں اس کا انتظام تھا۔ آج دو سال سے یہ لین دین بند ہے اور اپنے کلچر کے ایک بڑے بھنڈار میں تالا لگا کر ہم سمجھ رہے ہیں کہ ہم قومی کلچر کی سیوا کر رہے ہیں۔

اس کا ایک بڑا نقصان یہ بھی ہوا کہ لکھی پڑھی جانے والی زبان بولی جانے والی زبان سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ اردو کی ادبی روایت ہی کو لیجئے، غالب اور اقبال کو چھوڑ دیجئے، ان کی روایت بولی جانے والی زبان سے کچھ دور تھی، مگر اس کے ساتھ ساتھ میر، نظیر، انیس، شوق، [illegible] اور آرزو

[illegible] ہے۔ [illegible] انسان [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] ہے۔ ہندوستانی سماج [illegible] نے اپنے [illegible]
اس روایت کے [illegible] کر کے انہیں بھی [illegible] رنگ [illegible] کر دیا [illegible] ہندوستانی [illegible] بیٹھے۔

خیال رکھنا ہے کہ یہی ادب کی اس روایت کی دو جہتیں ہیں۔ ادب تجربے کی پیداوار ہے، جو علم بھی دیتی ہے اور خیال کے [illegible] انسان [illegible] ایک زمانے [illegible] اور بکھرتے رہتے ہیں [illegible] سے ادب بنتا ہے۔ اس لئے ادب کا رشتہ اپنے زمانے [illegible] سے ہے [illegible] جو خیال [illegible] بھی اس میں شامل ہیں۔ فلسفہ بھی، خواب بھی، ارمان بھی۔ اس لئے بھی کہ ادب سماج کا اثر [illegible] نہیں۔ بنیادوں میں جو تبدیلیاں آتی ہیں وہ ادب کو بھی بدلتی رہتی ہیں۔ اس کے رنگین پردوں پر سماج کی [illegible] آپ بیتی [illegible] تاریخ بھی ہوتی ہے [illegible] سماج کی کروٹوں اور انسان کی [illegible] دنیا پر ان کی [illegible] کی کہانی ملتی ہے۔ اس آئینے میں ہندوستانی قوم کی شکل پہچانی اور کلچر کی چھاپ دیکھی جا سکتی ہے۔

ہمارے ادب کے بدلتے دھاروں پر نظر ڈالئے تو پوری داستان تین لفظوں میں ادا ہو سکتی ہے۔ خانقاہ۔ دربار اور بازار۔ خانقاہ میں معرفت اور بھگتی کے سارے سلسلے آ جاتے ہیں جن کا رشتہ AGNOSTICISM سے جڑا ہوا ہے۔ معرفت اور بھگتی کا کوئی ایک مذہب نہیں اور [illegible] مذہب [illegible] کلچر دراصل باہر کی زندگی کے سوالوں سے انسان کا مقابلہ کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ ایک طرح فطرت اور انسان کے ٹکراؤ کا نتیجہ ہے۔ یا یوں کہئے کہ فطرت پر قابو پانے کی لڑائی کی دین ہے۔ ادب کلچر کا حصہ ہے، اس لئے وہ بھی اپنے طور پر یہ لڑائی لڑتا ہے اور طرح طرح سے لڑتا ہے۔ اپنے زمانے کا بوجھ جب اسے کھلنے لگتا ہے اور جب سماج کی بناوٹ اور ترتیب اس کی [illegible] کو پورا کرنے میں ناکامیاب ہو جاتی ہے تو وہ یا تو آگے بڑھنے کی تقاضے سے بے قرار ہو کر نئے راستے اور نئے ارمان تک پہنچتا ہے، یا پھر اس بوجھ کو کم کرنے کے لئے کوئی اور ڈھنگ اختیار کرتا ہے۔ گویا ہر زمانے کے چیلنج کا جواب ڈھونڈتا ہے۔

معرفت اور بھگتی بھی اپنے زمانے کے چیلنج کا جواب تھے۔ جب مذہبی کٹرپن اور حکومت دونوں مل کر ایک سماجی نظام کو سنبھالے ہوئے تھے اور سماجی نظام اس زمانے کے انسان کی فردیت کو پورا کرنے سے قاصر تھا تو [illegible] خلاف آواز کا اٹھنا لازمی سا تھا۔ اس طرح معرفت میں [illegible] کی ایک آواز بھی چھپی تھی۔ جب مذہبی کٹرپن اور حکومت سب سوالوں کے جواب جاننے کے دعوے دار تھے اس وقت صوفیوں کا بار بار یہ کہنا کہ دنیا کی اصلیت شاید جانی ہی نہیں جا سکتی اور جو لوگ سب کچھ جانتے ہیں وہ بھی زیادہ سے زیادہ یہ جانتے ہیں کہ وہ کچھ نہیں جانتے۔ معرفت [illegible] معرفت کا اثر ہندوستان میں عام ہوا اس کا خلاصہ [illegible] حافظ کی غزل اور خیام کی رباعی [illegible] اور [illegible] ادا کر دیا تھا۔

زمانہ وہ تھا جب سماجی نظام کو بدلنے کی بات سوچنا مشکل تھا۔ بادشاہ [illegible] بدل سکتے تھے، نظام کو کوئی دوسرا سامنے نہ تھا۔ بادشاہت میں [illegible] تھی اور بادشاہ کی طاقت کے آگے کسی کی چل نہ سکتی تھی۔ صوفیوں نے [illegible] کرنا چاہا کہ وہ اس [illegible] میں شریک نہ ہوں [illegible] مگر انہوں نے اس زمانے کے بڑے بڑے دعوے داروں کے سامنے جو سوالیہ نشان [illegible] اس سوالیہ نشان [illegible] کی روایت آگے بڑھی۔ سوچنے کی بات [illegible] اس کی [illegible] اور [illegible] انسان دوستی کا [illegible]

[illegible] بہت کم [illegible] سے [illegible]
[illegible] ہے کہ [illegible] روایت [illegible] سے ہمارے ادب [illegible]
بازار کے [illegible] کی طرح [illegible] اور [illegible] ہے [illegible] انھیں [illegible] ہیں [illegible] ایک [illegible]
[illegible] سے زیادہ اچھا جانا گیا ہے [illegible]
طرح [illegible] سمجھا گیا۔

[illegible] نہیں تھا اس میں بہت کی خوبیاں بھی تھیں۔ محبت اور انسانیت کے سوا اس میں [illegible] کے بعد [illegible] بڑھ لینے کی کمزوری بھی تھی۔ اپنے پر بھروسہ کرنے کے بجائے سب کچھ قسمت اور اتفاق پر چھوڑ دینے کی خرابی بھی [illegible] اتنی قوت تھی کہ [illegible] تک کے ادبی خزانے پر اس کا اثر پڑا اور ایسا گہرا [illegible] سے [illegible] کے [illegible] جیسے [illegible] کی [illegible] کہہ سکتے ہیں۔

درباری روایت کو سمجھنے کے لئے اُس زمانے کا نقشہ اپنی نظروں کے سامنے پھیلانا ہوگا، جب سماج کے سارے [illegible] دربار کے [illegible] زمانے کا مزاج اُسی سے بنتا بگڑتا تھا۔ جاگیرداری اپنے زمانے کی لعنتوں ہی کی نہیں، بہت سی اچھائیوں کی بنیاد تھی۔ ادب اور آرٹ کی [illegible] تھی [illegible] نہیں امیروں اور درباریوں میں بھی۔ کلاسیکی روایت کی [illegible] گئی۔ لباس اور پوشاک کی نفاست [illegible] زمانے نے جاگیرداری کا ورق اُلٹا تو بھی [illegible] زمانے کی [illegible] طرز [illegible] نفاست [illegible] ہر خاندان [illegible] ان گنت [illegible] جاگیرداروں نے شاعروں اور لکھنے والوں کو خریدا تو کم سے کم [illegible] سے اپنے قصیدے لکھوائے۔ تعریفیں بھرے دربار میں پڑھوائیں اور اس کی قیمت [illegible] دی گئی۔ آج کے زمانے [illegible] کیسا اچھا، کیسا بُرا [illegible] جاگیرداری نے شاعری کو [illegible] دی اور [illegible] تعمیر [illegible] ہر چیز [illegible] ہر بات [illegible] ادب ہی پر نہیں [illegible] ہے۔

پھر بازار تھا [illegible] انسانی [illegible] کا سمندر تھا [illegible] خوانچے والوں کی آوازیں [illegible] کسان تھے جو اپنی [illegible] ادب [illegible] ادب میں [illegible] ادب کا اثر [illegible] انگریزی [illegible] ڈھنگ سے سوچنے اور بات کرنے کا ہنر تھا [illegible] انگلستان [illegible] اس [illegible] روایت [illegible] حقیقت [illegible] اثر لینے والے [illegible] نئے [illegible] انگریزی راج کے زمانے [illegible] سرسید احمد خاں [illegible]

ہے کہ بنیادی اکائی اب بھی گاؤں ہی تھے اور وہاں وہی صدیوں پرانا اپنا اپنے پیارے پرانے رشتوں کے ساتھ موجود تھا۔ کیونکہ پنچ چھوت چھات ذات برادری بھاری پنچایت سوسائٹی شہر اور دیہات کے اس فرق میں بٹ کر رہ گئی تھی اور نئے کلچر اور نئے سوچ کی ساری روشنی صرف شہروں میں جگمگاتی تھی۔ اس کا رشتہ اصل ہندوستان سے نہ تھا۔ اس لئے ہمارا مزاج کلاسیکی گرفت اور شہری والی پکڑ سے آج بھی آزاد نہیں ہو سکا ہے۔

آزادی کو پچیس برس گزر گئے مگر آج بھی ادب اور سماج کی یہ صورت اسی طرح قائم ہے، وہی ڈھانچہ ابھی تک بدلا نہیں گیا ہے۔ بنیادی اکائی اب بھی دیہات ہے اور وہاں وہی پرانے سارے تعصبات اور برائی و چار دھارا کے بہاؤ آج بھی موجود ہے۔ کوشش کی گئی ہے تو اتنی کہ چرخے اور ہل کے اس کلچر پر اٹیمی طاقت کا پیوند اور جگہ جگہ صنعتی نظام کا نشان لگایا جائے، اسی لئے ہماری پوری سماج دقیانوسیت سے سمجھوتہ کرنے کے پھیر میں لگی ہے۔ ایسے فلسفے کی جھلک اب بھی اس میں نہیں ہے۔ اس اندرونی تبدیلی کا نشان بہت کم کہیں ملتا ہے جو قوموں کی زندگی کا ثبوت ہوتی ہے۔

آخر میں ورثے کی بات۔ ورثہ مُردوں کا ملتا ہے، لیکن گزرا ہوا کل مُردہ کہاں ہے، وہ تو ہماری بستی کے ہر حصے میں زندہ ہے۔ ہم گزرے ہوئے کل کو بھی تو اپنی ہی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ آج کا لمحہ گزرے ہوئے کل کو اپنے طریقے سے جنم دیتا ہے۔ ان میں جو کچھ ہے وہ حال ہے ہم صرف اسی اپنے پن کی بات کر سکتے ہیں جو صدیوں پر پھیلا ہوا ہے۔ اس ورثے کے بارے میں پہلا سوال یہ ہے کہ یہ ورثہ کس کے لئے ہے؟ اور کیسا ہے؟ ہمارا ادب آج بھی ایک نقلی اور بناوٹی دنیا میں سانس لے رہا ہے۔ تعلیم صرف اوپری سطح تک ہے اور پڑھنے لکھنے والوں کی پہنچ اسی حد تک ہے چھپا ہوا لفظ اس سے آگے نہیں پہنچا اور یہ اوپری سطح بھی شہروں ہی کی ہے جو گاؤں کا رشتہ اس سے بڑی حد تک ٹوٹا ہوا ہے۔ اسی وجہ سے ہمارا ادب نقلی اور بناوٹی گھیرے میں بند ہے۔ گہرا اور زیادہ بناوٹی اور نقلی اس وجہ سے ہو گیا ہے کہ چاروں طرف جو سماج بکھرا ہوا ہے وہ خود اسی بناوٹی پن کا شکار ہے۔ ہم ایک ساتھ کئی صدیوں میں سانس لے رہے ہیں، ایک طرف پرانے خیالوں اور عقیدوں کا وہ اکھڑ کھنگر ہے جو شاید موہنجوداڑو اور ہڑپا کے زمانے سے ہمارے ساتھ ہے اور اس اکھڑ کھنگر کو ہٹانے کا کوئی انتظام ابھی تک نہیں ہوا ہے۔ ہمارے پاؤں اس دلدل میں پھنسے ہیں اور ہمارے جسموں پر مغربی لباس کی چمک دمک ہے۔ ہمارے دماغوں میں آج کی دنیا کی روشنی کی کچھ کرنیں پہنچ رہی ہیں اور ہمارا ادب اس چوکھٹے ورثے کی طرف کوئی کھرا رویہ اپنانے پر تیار نہیں دکھتا۔ اگر بہت ہوا تو ہمارے ادب میں فقط درمیانی طبقے کے تعلیم پائے ہوئے نوجوان اپنی تصویر ڈھونڈھ سکتے ہیں۔ اس آئینے میں انہیں صرف اپنا ہندوستان ملے گا، سکڑا سمٹا ہوا ہندوستان جو چند شہروں میں بستا ہے اور جس کی تلاش صرف کتابوں میں کی جا سکتی ہے۔ ہمارا ادب ہمارے پورے سماج کی آواز نہیں بن پایا ہے۔

اس کا ایک نتیجہ دو رنگی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ ایسی دو رنگی جس کے اب ہم عادی ہو چلے ہیں۔ جب نیا سماج بنتا ہے تو وہ صرف چند کارخانوں اور فیکٹریوں یا چند اونچی عمارتوں یا بڑے باندھوں کے ذریعہ نہیں بنتا، اس کا جنم تو لوگوں کی بھیتری زندگی میں ہوتا ہے۔ جب دل اور دماغ بدلتے ہیں اور ایک نیا انسان جنم لیتا ہے تب ایک نیا سماج بھی بنتا ہے اور جب تک بھیتر سے آدمی نہیں بدلتا۔ اس وقت تک سماج کھوکھلا رہتا ہے اور اس میں ہر تبدیلی اوپری اور بناوٹی رہتی ہے۔ ایک آدھ آدمی جو سچی تبدیلی کی تلاش کرتا ہے اس کی آواز اونچی دیواروں سے ٹکرا کر ڈوب جاتی ہے یا خود وہ فرار کا کوئی راستہ ڈھونڈھ نکالتا ہے۔

یہ ورثہ کیسا ہے؟ اس کا جواب صرف یہ ہے کہ اس میں سب کچھ اچھا اور اعلیٰ نہیں ہے، اس میں بہت سی ایسی بیماریوں کے کیڑے بھی ہیں جن سے ہمیں بچ کر رہنا ہوگا۔ مدتوں تک ہندوستان کی روحانیت کا قصیدہ پڑھا جاتا رہا۔ پھر یورپ کو اسی بھرم میں رکھنا چاہا جاتا تھا کہ یورپ اپنی آتما کے چکر میں پڑ کر بے کھینچی بازی میں لگا رہے، صنعتی ترقی نہ کرے اور عالمی کلچر کے دھارے سے کٹ کر فقط کچا مال پیدا کرتا رہے۔ آج بھی یہ قصیدہ جاری ہے۔ ہندوستان سے جو جوہر نکلتا ہے، دنیا اسے سر آنکھوں پر بٹھاتی ہے۔ اس سے خود ہندوستانیوں کو بھی دھوکا ہو جاتا ہے کہ شاید ان کے پاس کوئی دولت ان کے پاس بچا تھا۔ اس امانت کو گزرے ہوئے کل کی بات جان کر وہ گزرے ہوئے کل ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے ہیں اور اپنی ہی سمجھ کا اپنا ہندوستانی سمجھتا اور اپنے ہی اس میں شک نہیں کہ وہ بھی ہندوستانی سمجھتا کا ایک روپ، ایک منزل تھی، مگر اسی کو سب کچھ لینا اور اس سے آگے [illegible] صرف [illegible] دیکھیں

غزل

حرمت الاکرام

رکھنا تھا ہم کو دولتِ بیدار کی طرح
کیوں کھو دیا ہے ساز کی جھنکار کی طرح

بنتا بھی بیکرانیٔ دل کا حریف کون
دل زندگی کے ساتھ ہے پتوار کی طرح

بکنے چلا تو جاگ اٹھی افتادِ بے زری
رستے میں خود کھڑا ہوں خریدار کی طرح

کانٹوں نے دی جو راہ تو کٹنے لگے ہیں پاؤں
ہر رہگزر دراتی ہے تلوار کی طرح

ناکردہ گناہ تھے کرتے بھی اور کیا
سر کو جھکا لیا ہے گنہگار کی طرح

وحشت سرائے جسم میں تنہا ہوں کس قدر!
خود چونک چونک جاتا ہوں بیمار کی طرح

دورِ خزاں کی تند ہواؤں کا شکریہ!
دل جھومتا ہے شاخِ ثمربار کی طرح

بازارِ کائنات نے مبہوت کر دیا
تکتا ہوں چار سو کسی نادار کی طرح

جائے اماں تھی دل کے سوا اور کون سی
وہ بھی لٹا کے بیٹھے ہیں گھربار کی طرح

لٹ جائے بھی تو ہو نہ تہی دست آدمی
دولت کہاں ہے اور کوئی پیار کی طرح

یہ رات، آنسوؤں سے جو کھیلی ہے تا سحر
سر پر گرے نہ بھیگتی دیوار کی طرح

حرمت قدم بڑھاتا ہوں پیڑوں کی چھاؤں میں
[illegible] کھڑے ہیں راہ میں [illegible] شجار کی طرح

افسانہ

چوہدری [illegible] پوری

اور پتھر رو دیئے

بیدہ کی بھاپ پانی پر بیٹھا گردھاری سامنے بندھی بھوک
سے بے تاب گائے کو حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ موٹی تازی
گوشت بھری گائے آج ایک مریل سے ڈھانچے میں تبدیل ہو چکی
تھی۔ دودھ دینے والے تھن آج سکڑ کر ایسے ہو گئے
تھے جیسے جسم میں سے سب نکال دی گئی ہو۔ اس کا دل
سسکیاں لینے لگا۔ بچھڑا تو بھوک سے تڑپ کر مر گیا تھا
اور گائے ۔۔۔ پتہ نہیں کیا حشر ہو جائے گا۔ گردھاری کی آنکھوں
میں آنسو آ گئے کہ کتنا بے بس اور لاچار ہے وہ۔ کچھ بھی تو نہیں
کر سکتا تھا۔ جو خود ہی بھوکا مر رہا ہو اور اپنی چاند جیسی خوبصورت
بچی کا پیٹ نہ بھر سکے، بھلا وہ ایک بے زبان گائے
کے لئے کیا کر سکتا تھا۔

کئی دنوں کے بعد گھر میں چولہا جلا تھا، وہ بھی صرف
چائے کے لئے۔ پڑوس میں رہنے والی بڑھیا کاکی تھوڑا سا دودھ
دے گئی تھی اور سونے گھر میں روتی بیٹی چائے بنا رہی تھی،
کبھی کبھی خالی پیٹ دھوئیں کی بو سے کھانسی آ جاتی تو یوں
محسوس ہوتا جیسے کوئی پرانا مریض کھانس رہا ہو۔

اس سال بارش نہ ہونے کی وجہ سے بستی والوں کا
برا حال تھا۔ [illegible] زمین میں بوئے
ہوئے بیج پڑے پڑے گل گئے تھے جیسے زمین کو بارش نے ناکارہ کر دیا
گیا ہو۔ [illegible] اس نے

بیج بوئے تھے۔ مگر بارش !!!؟ ۔۔۔ آسمان صبح سے شام
تک نیلا ہی رہتا۔ کہیں کہیں تیرتے ہوئے سفید بادل [illegible]
والوں کو منہ چڑھاتے نظر آتے۔ گاؤں والوں سے زیادہ
گردھاری کی قدر کرنے والے زمیندار نے آج ایسے
منہ پھیر لیا تھا جیسے پہچانتا ہی نہ ہو۔ اس نے صاف صاف
کہہ دیا تھا کہ جب تک بارش نہ ہو وہ ایک پھوٹی کوڑی بھی دینے
کو تیار نہیں ہے۔

آج تیسرا مہینہ چل رہا تھا۔ گذشتہ سال کا جتنا بھی اناج
تھا وہ سب ایک ڈیڑھ مہینہ پہلے ہی ختم ہو گیا تھا۔ پھر [illegible]
بدحالات سے مجبور ہو کر اس کو اپنی بچی کے بیاہ کے لئے رکھے ہوئے [illegible]
آج گھر میں کچھ بھی تو نہ تھا نہ کھانے کے لئے اناج نہ [illegible]
لئے چارہ، نہ بیچنے کے لئے کوئی چیز۔ اگر کچھ تھا تو بس ایک چھوٹا
سا گھر اور کچھ باپ کی چھوڑی ہوئی زمین اور ایک گائے [illegible]
جسے مالک نے اس وعدے پر اسے دیا تھا کہ وہ [illegible]
کبھی تنگ نہیں کرے گا! نہ جانے کیوں [illegible]
بھگوان اس سے لے رہا تھا، اکثر لوگ گاؤں چھوڑ [illegible]
مجبور ہو گئے تھے، مگر گردھاری گاؤں [illegible]
کچھ سوچنا بھی پاپ سمجھتا تھا۔ اس کی نظر [illegible]
بھگوان کی طرف سے دی ہوئی ایک سزا [illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible] ہو گئی۔

چونکہ [illegible] سامنے نکلیں

[illegible] تھا۔ جب

[illegible]

[illegible] کہ روشنی

اس [illegible]

[illegible]

ریشمی [illegible] سے دیکھنے لگی۔

"ہائے، گردھاری" مجھ نے چونک کر سر اٹھایا۔ سامنے رسوتی چائے کی پیالی لیے کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس نے خاموشی سے پیالی لے کر ہونٹوں سے لگا لی۔ اچانک [illegible] پیالی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر گئی۔ [illegible] نظروں سے دیکھتے ہوئے دم بخود رہ گئی۔ اس کی آنکھیں شکایت سے بھر گئیں۔ اس کا دل کانپ اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ [illegible] سسکیاں لینے لگی۔ رسوتی کی سسکی [illegible] اس کے سینے سے لگ گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ خاموشی سے الگ ہو گئے۔ اور نہایت [illegible] نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

"ایک بات کہوں گردھاری" رسوتی نے سکوت توڑا۔

"بول رسوتی" گردھاری نے اسے [illegible] دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہ ہم [illegible] بیچ دیں" رسوتی نے [illegible] لہجے میں کہا۔

"رسوتی" گردھاری کی آواز [illegible] ابھر آیا۔ "کیا [illegible]"

"نہیں گردھاری [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] دیکھ سکوں گی [illegible] گردھاری [illegible]

[illegible] اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"ٹھیک ہے رسوتی ٹھیک ہے" گردھاری نے [illegible] بستی کو [illegible] گردھاری [illegible] کو [illegible] رسوتی [illegible] گردھاری نے [illegible] کر اس کو کھڑا کیا اور اس کی رسی پکڑ کر [illegible] سے نکل گیا۔ چوکھٹ سے لگی کھڑی رسوتی [illegible] دیکھتی رہی جب وہ [illegible] کی بستی کو [illegible] ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گیا تو رسوتی [illegible] چلتی ہوئی آ کر چارپائی پر لیٹ گئی اور گردھاری [illegible] سوچنے لگی۔ کتنی محبت کرتا ہے گردھاری اس سے [illegible] اسے اب تک یاد تھی۔ شادی کے [illegible] جب گردھاری کی ماں [illegible] ہو گیا تھا تو برادری والوں نے [illegible] پھیلا رکھا تھا۔ سب یہی کہتے تھے کہ لڑکی [illegible] ہے۔ کوئی اس کے سامنے [illegible] گردھاری [illegible] کوئی اثر نہ لیا تھا۔ الٹا اس کو تسلی دیتا کہ لوگوں کی باتوں کا کچھ خیال نہ کرنا۔ لوگ یہی کچھ تو کہتے ہیں [illegible] شاید کو جلتا ہوا دیکھ کر انہیں خوشی محسوس ہوتی ہے۔ گردھاری کے [illegible] کتنا [illegible] شادی کے دو تین سال [illegible] گزر گئے۔ لیکن [illegible] اولاد نہ ہوئی۔ [illegible] گردھاری نے انہیں کرارا جواب دیا تھا کہ [illegible]

[illegible]

[illegible]ارمی تم کتنے اچھے ہو!!؟"
[illegible] سوچتے اُس کی آنکھ لگ گئی۔ پھر تو گردھاری کے جاگنے پر ہی اُس کی نیند ٹوٹی۔ سورج مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔

"تم آگئے گردھاری؟" اُس نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔ "کیا ہوا؟"

"بیچ آیا رسونتی۔ گاؤں والوں نے گائے کی اتنی کم قیمت لگائی کہ میرا دل بیچنے پر راضی نہ ہوا۔ اس لئے میں لکشمی کو ایک پیڑ سے باندھ آیا ہوں۔ بھگوان سے پرارتھنا کر کے کہ وہ کسی ایسے آدمی کے ہاتھ لگے جو اُسے پیٹ بھر چارہ دے سکے۔"

"بہت اچھا کیا گردھاری تم نے۔ میری ممتا کی لاج رکھ لی۔ اگر تم مجھ باؤلی کی بات سُن کر لکشمی کو بیچ دیتے تو تمہاری ماں کی آتما ہمیں بددعا دیتی۔" رسونتی گائے کے خالی کھونٹے کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔!

سورج ڈھل رہا تھا۔ رسونتی اور گردھاری گائے کے خالی کھونٹے کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے۔ اچانک رسونتی کی آنکھیں سڑک کی جانب اٹھ گئیں تو وہ اُچھل پڑی۔ سڑک پر اُن کی لکشمی آ رہی تھی۔ اس کے گلے میں بندھی ہوئی رسی اگلے پیروں کے بیچ میں جھول رہی تھی۔ اس کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔ ٹانگیں کپکپا رہی تھیں۔ پیٹ پچک کر پیٹھ سے لگ گیا تھا۔

"گردھاری!" اُس نے ہلکی سی چیخ کے ساتھ پتی کو اس طرف متوجہ کیا۔ گردھاری بھی حیران رہ گیا۔ گائے دروازے کے سامنے آکر رُک گئی اور شکایت بھری نظروں سے اُن کی طرف دیکھنے لگی۔

"یہ تمہاری ممتا کی زنجیریں ہیں رسونتی جو اِس کو واپس کھینچ لائی ہیں۔ مگر میں کیا کروں؟ رسونتی میں کیا کروں؟؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ دیکھو رسونتی اس کے منہ سے جھاگ نکل رہے ہیں۔ شاید بھوک برداشت سے باہر ہو گئی ہے۔ میں کتنا بے بس ہوں۔ خود بک کر بھی تو اس کے لئے گھاس کا انتظام نہ کر پاؤں گا۔" گردھاری نے [illegible] سر تھام لیا۔

"ایسے گرو جی رکھ کے گھاس لے آؤ گردھاری [illegible] گلے سے منگل سوتر نکالتے ہوئے بولی۔

"کیوں میرا مذاق اُڑانا چاہتی ہے رسونتی؟ یہ تو [illegible] بندھن کی نشانی ہے۔ میں دھرم کی دی ہوئی [illegible] کو گروی رکھ کر پاپی نہیں بننا چاہتا۔ اگر ایسا کروں تو مجھے نرک کی آگ بھی جلانا گوارا نہ کرے گی۔"

"لے لو گردھاری لے لو۔ یہ وقت اتنا کچھ سوچنے کا نہیں ہے۔ جاؤ ورنہ لکشمی مر جائے گی۔ میں اتنا بڑا دُکھ نہ سہ سکوں گی۔" رسونتی نے منگل سوتر اس کے ہاتھوں میں دے کر اُس کو دروازے کی طرف دھکیل دیا۔

جب گردھاری بنئے کے گھر کے قریب پہنچا تو اُس کے قدم ٹھٹھک کر رہ گئے۔ کیونکہ گاؤں کا مشہور جواری اور شرابی رامو بنئے کے گھر میں داخل ہو رہا تھا۔ [illegible] وہ کانپ گیا۔ اگر رامو نے مجھے منگل سوتر گروی رکھتے ہوئے دیکھ لے گا تو وہ مجھ پر خوب ہنسے گا اور سارے گاؤں میں میری عزت کا ڈھنڈورا پیٹتا پھرے گا۔ میں گاؤں میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گا۔ مگر دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھوں کے سامنے اپنی بھوک سے نڈھال لکشمی کا چہرہ گھومنے لگا۔ اور رسونتی کی بے چین نگاہیں اور ہچکی سسکتی ہوئی ممتا اُس سامنے سوالیہ نشان بن گئیں۔ اور وہ دل کو مضبوط کر کے بنئے کے گھر میں داخل ہو گیا۔ جب وہ اندر پہنچا تو سامنے ہی رامو سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ رامو کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی ہنسی اُبھر آئی جس کو گردھاری کوئی معنی نہ دے سکا۔ اُس نے جیب میں رکھے ہوئے منگل [illegible] لیا اور سر جھکا کر آگے بڑھ گیا۔ [illegible]

"[illegible] گردھاری [illegible]

"[illegible] گردھاری [illegible]
[illegible]

"یہ لو جی یا صرف ہے کیا پچھلے کا حساب ہے باقی کر سکے آگے بڑھو۔"

"نہیں لالہ جی ذرا یہ منگل سوتر گروی رکھنا ہے۔" گردھاری نے منگل سوتر جیب سے نکال کر لالہ جی کی طرف بڑھا دیا۔

منگل سوتر لے کر تجوری میں رکھتے ہوئے لالہ جی نے کہا،

"جاؤ گردھاری جاؤ۔ ایک پیسہ نہیں ملے گا"! یہ لے کر تو تمہارے سود کے روپے ادا نکلتے ہیں۔ ایک دو روز میں اس کا بھی انتظام کر دو۔ نہیں تو آدمی بھیج کر وصول کر لوں گا!۔

"رحم کرو لالہ جی! رحم کرو۔ میں نے اب تک جتنا سود دیا ہے اصل سے کہیں زیادہ ہے۔ اس کے باوجود میں تمہاری رقم ضرور ادا کر دوں گا۔ مگر اب مجھے کچھ روپے دے دو۔ میں اپنے لئے نہیں بلکہ اپنی گائے کی کشتی کے لئے اپنی پتنی کا سہاگ گروی رکھ رہا ہوں۔ تم بھی تو بال بچوں والے ہو۔ لالہ جی! اگر تم روپے نہیں دو گے تو میری کشتی دم توڑ دے گی۔ کیا تم گوارا کر سکو گے کہ تمہاری وجہ سے گائے ماتا کی کمزور سانسوں کی ڈور ٹوٹ جائے۔ اگر وہ بھوک سے تڑپ کر مر جائے گی تو اس کی آتما تمہیں چین نہ لینے دے گی۔ بھگوان تمہیں کبھی سکون سے جینے نہیں دے گا!"

"بھگوان! گائے ماتا! میں کچھ نہیں جانتا جاؤ تمہاری کوئی اولاد نہیں تم یہ باتیں سوچ کر اپنا پیٹ بھر لو۔ میں ایک بڑے کنبے والا بال بچوں والا آدمی ہوں۔ اگر یہ سب سوچتا بیٹھوں تو مجھے اپنا سب کچھ بیچ کر تمہارا کشکول پکڑ کے جانا پڑے گا۔ چپ چاپ چلے جاؤ! نہیں تو نوکروں کو آواز دینی پڑے گی!"

گردھاری کا تھا مرشی سے باہر نکلا [illegible] ناامید و نامراد۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی پتنی اور کشتی کی بھوک کا مسئلہ پھیلا رہا تھا۔ اس کی کشتی مر جائے گی۔ اُف! کیا رسوتی یوں گھٹ گھٹ کر [illegible] اس کے دماغ میں بجلی سی کوند گئی۔ [illegible] اس کے سامنے ایک [illegible] سی

گائے میں چلی گئی۔ گردھاری کا خون کھول گیا۔ نہ جانے کتنی [illegible] سے گھسیٹ رہا ہے۔ گائیں نے جا کر زمیندار سے اپنے جیب سے کچھ ترسے ہوئے نوٹ نکالے اور اس کے ہاتھوں میں رکھ کر غصہ اتنا کہا "میں نے سب کچھ سن لیا ہے گردھاری جاؤ! پھر کبھی واپس لے لوں گا" اتنا کہہ کر وہ دوسری طرف مڑ گیا۔

سر پر گھاس ڈھوتے گردھاری گھر کی طرف جا رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اپنے آپ کو ملامت کر رہا تھا۔ جس بچے کو اس نے پتھر سمجھ لیا تھا، نہ جانے کتنے برے وچار تھے لالہ کے متعلق اس کے دل میں۔ مگر وہ تو دیوتا نکلا۔ سچ ہے بھگوان! مصیبت کے وقت سب اپنے اپنے اصل روپ میں نظر آتے ہیں۔

جب وہ گھر پہنچا تو گھر میں نہ اس کی پتنی تھی اور نہ اس کی گائے، چارپائی پر بوڑھی ماں کی بیٹھی کھانس رہی تھی۔ اس نے دروازے ہی پر سے پوچھا۔

"رسوتی کہاں ہے ماں جی؟"

"کیا بتاؤں بیٹا؟ تیری گیا شاید بھوک سے بیتاب ہو کر زمیندار کی حویلی کی طرف چلی گئی تھی اور جب وہ گھاس سے بھری ہوئی بیل گاڑی کی طرف جانے لگی تو زمیندار نے اپنے غنڈوں سے بہاری کو مارا پیٹا کہ وہ وہیں دم توڑ گئی ہے!"

"نہیں!!!؟" وہ پوری قوت سے چیخ پڑا۔ اس کا گردوں لرزاں کا ... اس کا دماغ پاگل پن کی حد تک گرم ہو گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ سڑک پر تھا۔ جوں ہی وہ سڑک پر پہنچا ایک ٹرک کے ساتھ پلٹ پڑا۔ اس کے سر پر سے گھاس پھسل کر دور تک بکھر گئی۔ اور وہ سڑک کے کنارے خون میں لت پت تڑپ رہا تھا۔ اس کا سر پھٹ چکا تھا۔

اور سامنے ہی گھاس سے لدا ہوا ٹرک دھول اڑاتا ہوا زمیندار کی حویلی کی طرف جا رہا تھا —٭

اس وقت بھی بادل گرجنے لگے۔ بجلیاں کڑکنے لگیں اور اتنی زور کی بارش ہوئی کہ کہتے ہیں گاؤں کی تاریخ میں آج تک اتنی تیز بارش نہیں ہوئی تھی!! شاید گردھاری کی موت نے آسمانوں کو بھی رونے پر مجبور کر دیا تھا!

ثنائی انصاری

آرزو

رات ڈھلتی ہے کہیں، صبح کہیں ہوتی ہے
زندگی یونہی کشاکش میں گزر جائے گی
چند لمحے بھی مسرت کے، بڑی دولت ہیں
آؤ اس دولتِ نایاب کو ارزاں کرلیں
اپنے خوابیدہ دریچوں کو ذرا وا کر دو
اور میں بادِ صبا کی صورت
مسکراؤں کبھی زلفوں کے گھنے جنگل میں
اور کبھی لعلِ نگاریں پہ تبسم بن کر
جلوۂ صبح کو بیدار کروں
غنچہ و گل سے چرا کر خوشبو
بر و در و بام کو نادیدہ مہک سے بھر دوں
چند لمحوں کی مسرت جو مجھے مل جائے
زندگی کتنی سبک رو ہو جائے۔

حیدر نایاب

ماضی

ایک بوسیدہ عمارت
وسط میں کھنڈروں کے استادہ ہے یوں
موجزن جیسے سمندر پہ ہو عکسِ ماہتاب
اوپری منزل کے کمروں میں چلتی ہیں شبیہیں
کچھ سیہ اور کچھ سپید
رات کے ڈھلنے سے پہلے
جھانکتی ہیں روزنوں سے چھتاؤں کی طرف
صحن میں ہیں ایک جانب کچھ مزار
جن کی بالیں پر ابھی باقی ہیں محرابی نشاں
شام سے جن میں سلگ اٹھتے ہیں یادوں کے چراغ
ایک چشمہ ہے مزاروں کے قریں
مدتوں سے غیر مستقل ہے [illegible]
[illegible]

مقالہ

عبدالخالق ایم اے

اسالیبِ نثر ——— ایک جائزہ

قدرت نے انسان کو جو گوناگوں صلاحیتیں ودیعت کی ہیں، ان میں ایک عظیم، جس پہ ادب بیرقابل قدر عطیہ نطق یعنی گویائی کی قوت ہے جو انھیں
قدرت ہے جو اُسے دوسرے حیوانات سے ممتاز کر کے منفرد و ممتاز بناتی ہے۔ انسان اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لئے جس ذریعہ کا سہارا لیتا ہے
وہ وسیلہ نطق یعنی زبان ہے۔ زبان بولی یا لکھی جانے والی اُس باقاعدہ و مرتب صوت کا نام ہے جس کی صوتی ترتیب و تنظیم اور تہذیبی عمل سے ادب
ظہور پذیر ہوتا ہے۔ زبان و ادب کے درمیان ایک اٹوٹ رشتہ اور ناگزیر رابطہ ہوتا ہے۔ زبان کے تانے بانے سے ادب کے نقوش ابھرتے ہیں اور اسی
کے بل بوتے پر ادب کا تصور قائم کیا جاتا ہے۔ جب ہم کچھ کہتے ہیں تو ہمارا مطمح نظر ہوتا ہے کہ دوسرے ہماری بات سنیں، اُس سے متاثر ہوں اور ہم
اُس کا ردِ عمل بھی دیکھیں۔ ایک فن کار بلاواسطہ طور پر اپنے فن میں کچھ کہنا چاہتا ہے اور فن کے مطابق میڈیم اس لئے اختیار کرتا ہے کہ وہ اظہار و ابلاغ
کا وسیلہ بن جاتا ہے جو کہ ہر حقیقی اپنے ساتھ طریقِ اظہار بھی لاتی ہے۔

اظہار و ابلاغ کی صورت شاعری میں بھی ہوتی ہے اور نثر میں بھی۔ لیکن عوام کے لئے اظہار و ابلاغ کا نہایت مقبول، سہل اور بہتر وسیلہ نثر ہے۔
نثر کی اہمیت و افادیت مسلّم ہے کیونکہ عوام کے علاوہ فن کار بھی اپنے مافی الضمیر کا بہتر اور سہل اظہار نثر ہی میں کر سکتے ہیں۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ
ہم شاعری کی عظمت و افادیت کے منکر ہیں۔ لیکن یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ شاعری میں جذبات و احساسات کی ترجمانی میں کچھ رکاوٹیں سدِ راہ ہوتی ہیں۔ مثلاً
بحر و وزن کی پابندی کے علاوہ شعر میں تخیل، ذکاوت اور انتخابِ الفاظ کا بھی لحاظ رکھنا ہوتا ہے۔ لیکن نثر (عمومی) میں ان کے اہتمام کی کوئی خاص اہمیت نہیں
ہوتی اور یہ عوام و خواص سے قریب تر بھی ہوتی ہے۔ سائنس، ٹیکنالوجی، علم معاشیات و سیاسیات غرض دنیا میں جتنے علوم و فنون ہیں ان کی وضاحت
اور صراحت کے لئے نثر ناگزیر ہو جاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ دنیا کی کتابیں بھی نثر ہی میں آئیں۔ جب نثر کو ہم ادبی مفہوم میں استعمال کرتے ہیں تو لاشبہ
یہ فروعی سطح سے بلند ہو جاتی ہے کیونکہ یہ نثر نہ تو محض جذبات کا اظہار ہوتی ہے، نہ خشک حقائق ادبی اور سائنسی کے تار سے بُنی ہوتی ہے کو برابر ثابت کرتی ہے
زبان اپنے الفاظ کی ساخت اور اس کی کارکردگی کی وضاحت کرتی ہے بلکہ ادبی اور سماجی ضرورت کو اپنے دامن میں سمیٹ کر فنی کارستانی کے ساتھ پیش کرتی
ہے۔ ایسی نثر ادبی مقصد و قیمت کی حامل ہوتی ہے اور اکثر اوقات شاعری کی سرحد سے جا ملتی ہے یہی وہ نثر ہے جس کے متعلق ہربرٹ ریڈ نے کہا ہے کہ
ایسی نثر شاعری سے قریب تر ہوتی ہے۔ ایسی ہی نثر اور شاعری کے بیچ خطِ فاصل کھینچنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے کیونکہ جو عناصر شاعری کو عظیم اور
بلند قیمت بناتے ہیں وہی نثر کو عظمت و اہمیت بخشتے ہیں۔ گویا ادبی معیار کی اعلیٰ نثر میں انتخاب و تصرفاتِ الفاظ، الفاظ کی فن کارانہ
ترتیب و تنظیم اور ان کے درمیان تسلسل، الفاظ کی حسن کارانہ تنظیم سے فقروں کی ساخت۔ فقروں کے درمیان مناسب ہم آہنگی اور تراش
خراش، پیراگراف کی ترتیب و ترکیب اور تخیل کا اظہار اور ان کے درمیان کی ربط، عنوان کے تصرف میں سلیقہ مندی وغیرہ کی بڑی اہمیت
ہے کیونکہ ان اجزاء کی ترتیب و تنظیم اور فن کاری سے ہی اسلوب کی تشکیل ہوتی ہے، مطالعہ و محاسبہ، مشق و مزاولت، شخصیت کا
رچاؤ اور نکھار بھی، غرض ان سب کے مجموعہ کا نام ہم آہنگی ہے، جسے ہم اسلوب کہتے ہیں

میں تو اظہار کا ہر وسیلہ کسی نہ کسی اسلوب کا حامل ہوتا ہے۔[1]

لفظ و معنی زندگی لازم و ملزوم ہیں۔ ادیب و فن کار حیات و کائنات کی تعبیر، تشریح، تفسیر اور تنقید پیش کرتا ہے۔ وہ زندگی اور سماج کے تجربات و مشاہدات اور افراد و معیار کا مطالعہ و مشاہدہ کرتا ہے۔ اسی مشاہدہ و تجربہ کو اپنے فن پاروں میں منعکس کرتا ہے۔ فن کار زندگی کا عکس ہوتا ہے۔ اس کی نگاہیں دور بین، قوتِ مشاہدہ تیز و توانا اور تخیل شاداب ہوتا ہے۔ لہٰذا زندگی اور سماج کے تمام گوشوں پر اس کی نگاہیں ہوتی ہیں۔ غرض ادیب اور فن کار کے سامنے دو منزلیں آتی ہیں ــــــ ایک مطالعہ و مشاہدہ اور دوسری اظہارِ مشاہدہ و تجربہ کی منزل ہوتی ہے۔ مشاہدہ و تجربہ کا تعلق فن کار کے احساس، ادراک، تخیل اور فکر و شعور سے ہوتا ہے جو کہ یہی وہ عناصر ہیں جو ادیب اور فن کار کے داخلی محرکات کہے جا سکتے ہیں۔ البتہ تجربہ و اظہارِ تجربہ کی منزل بڑی پُر خطر اور دشوار گذار ہوتی ہے۔ یہ جیسا کہ میں نے کہا مطالعہ و محاسبہ، مشق و مزاولت، فکر و نظر کی گہرائی، شخصیت کے نکھار اور زبان و بیان پر پوری قدرت چاہتا ہے اگر فن کار میں یہ سلیقہ، یہ ہنر، یہ مہارت اور صفت موجود نہیں تو وہ اظہار و ابلاغ کا حق ہرگز ادا نہیں کر سکتا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلوب کیا ہے؟ میرے خیال میں کسی بھی شے کی جامع و مانع، مکمل اور مستند تعریف مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے کیونکہ الفاظ کے ذریعہ کسی مخصوص شے کی حیثیت و صفت کا مکمل احاطہ ممکن نہیں۔ مشرق و مغرب کے فن کاروں نے اپنے اپنے طور پر اسلوب کی تشریح و توضیح کی ہے۔ ان تشریحات سے قارئین کے ذہن میں اسلوب کا مخصوص مفہوم ضرور متعین ہو جاتا ہے۔ پھر اسلوب یا طرزِ نگارش کا مسئلہ ایسا نہیں جس پر کوئی فیصلہ کن اور دوٹوک بات کہی جا سکے۔ یہ تو افکار و خیالات کے اظہار و ابلاغ کا ایسا پیرایہ ہے جو دل نشین بھی ہے اور منفرد بھی۔

انگریزی میں اس کے لئے اسٹائل کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ یہ لفظ لاطینی کے STYLOS یا STILUS سے بنا ہے جس کا مطلب لکھنے کا قلم ہوتا ہے۔ غالباً قدیم رومن عہد میں لوہے کے قلم سے کاغذ یا موم کی تختی پر لکھا جاتا تھا، وہی بعد میں اظہار و ابلاغ کی علامت بن کر طرزِ تحریر یا اسلوبِ بیان کے لئے مستعمل ہوا۔ اپنی وسعت کے لحاظ سے یہ لفظ اتنا مقبول ہوا کہ کئی مفاہیم کو ادا کرنے کا ذریعہ بن گیا اور ادب کے علاوہ عام بول چال میں بھی مختلف مواقع کے لئے استعمال ہونے لگا۔ مثلاً گفتگو کا اسٹائل، رقص و موسیقی کا اسٹائل، رفتار و گفتار کا اسٹائل وغیرہ۔

اردو میں اسٹائل کے لئے کئی الفاظ مستعمل ہیں۔ طرز، اسلوب، انداز، ادا وغیرہ۔ اور ان کا استعمال بھی کئی معنوں میں ہوتا ہے، جیسے اندازِ گفتگو، اندازِ بیان، ادائے رقص، طرزِ اظہار، طرزِ تکلم، اسلوبِ نگارش، اسلوبِ زندگی وغیرہ۔

جدید فارسی اور عربی زبانوں میں اسٹائل کے لئے سبک استعمال ہوتا ہے۔ اصل میں یہ عربی لفظ ہے جس کے لغوی معنی ہیں دھات کو پگھلا کر سانچے میں ڈھالنا ..... اس لفظ کے لغوی معنوں کی خصوصیات پر غور کیجئے تو دھات کو تپانا، اسے حشو و زوائد سے پاک کرنا، نکھارنا پھر ایک سانچے میں ڈھالنا اور کوئی خوش نما شکل دے دینا۔ ایسا عمل ہے جو اچھے اسٹائل میں اسی طرح لفظوں کے ساتھ بھی دہرایا جاتا ہے۔[2]

سنسکرت میں اس کے لئے پہلے ریتی (रीति) کا لفظ مستعمل تھا جو (रीङ्) سے بنا ہے اور جس کا مطلب متحرک ہونا یا چلنا ہے اس لفظ کو ادبی اصطلاح میں پہلے پہل آچاریہ وامن نے استعمال کیا۔ قدیم سنسکرت کے عالموں نے اس لفظ کا استعمال تراش خراش، زبان، تہذیب و سلیقہ کے لئے کیا ہے۔ ہندی میں پہلے یہی لفظ مستعمل تھا لیکن بعد میں اس کے لئے لفظ (शैली) کو زیادہ مناسب سمجھا گیا

[1] "The pen scratching on the wax or paper, has become the symbol of all that expressive, all that intimate in human nature not only ornament with but man himself has yielded to it." (WALTER RALEIGH: STYLE. P. 2)

[2] نظار احمد فاروقی: دید و دریافت، صفحہ ۲۰

یوسنسکرت کا شلوک [illegible] اسلوب کی تشریح ان لفظوں میں ملتی ہے:

[illegible] । [illegible]
[illegible] :

جس کا مطلب جس نے لفظ اور معنی کا حسن اور خوبی، ترتیب و ساخت وغیرہ ہوتا ہے۔ شیلی کا مفہوم جس وہی ہے جو عربی میں اسلوب اور انگریزی میں اسٹائل کا ہے۔ ان الفاظ کی ترتیب و تحقیق کی اس مثال سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اسلوب کے لئے سنسکرت، لاطینی، عربی، فارسی، انگریزی اور اردو میں جو الفاظ مستعمل ہیں وہ یہی ظاہر کرتے ہیں کہ کوئی اسلوب بغیر تراش خراش، کاوش و محنت اور آورد کے نہیں بنتا یہ اور بات ہے کہ فن کار کا سلیقہ اس تصنع اور آورد میں آمد کی کیفیت پیدا کر دے۔

میرا خیال ہے اردو میں ادبی نقطۂ نگاہ سے سب سے پہلے اسلوب کی اہمیت کو وجہی نے تسلیم کیا۔ اسلوب کے لئے انھوں نے "بات" کا لفظ اختیار کیا، جس کا مطلب وہ طرز ادا ہوتا ہے لیکن اسے انداز اور وزن کے لئے بھی استعمال کرتے ہیں۔ گو وجہی نے "بات" کا استعمال وسیع معنوں میں کیا ہے۔ اپنی قابلیت خود کتاب میں وجہی کہتے ہیں:

"وو فرہاد ہو کر دونوں جہاں تے آزاد ہو کر دانش کے تیشے سوں پہاڑاں اٹھایا تو یو شیریں پایا تو یو ذوقی بات پیدا ہوئی تو یو بات آیا۔ نادان اپنی باتاں میں یو بی ایک بات کر جانے، وے یو بات کیوں کاٹے اکس وضع سوں نکلی محنت نئیں بلکہ مشقت تیں پیا لے... دانا تو حل ہے دانش کی آگ پر گئے گا، دانا جانتا ہے ہمارا حکم اس پر چلے گا۔ دانا جتنا رہا کر جانے گا۔ یادی ہے کر پہلانے گا۔ یو بات نہ تھی مرنگلی۔ اتال تو یو ہیا ایک چلنے کس کا بھول۔ دو ندش ہو جو بیٹھتے دل کے گویاں میں چھپنے آتا ہے تو یو بات پاتا ہے:"

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ وجہی کو اس امر کا شعوری احساس تھا کہ انھوں نے اپنی تحریر میں مخصوص اور منفرد اسلوب برتا ہے۔ یہ تعلّی نہیں حقیقت ہے۔ اسلوب کی مرصع کاری، مینا نگاری، جاذبیت اور شگفتگی کے تحفظ سے یہ اپنے عہد کی تقریباً واحد تصنیف ہے۔ مصنف کا یہ بھی کہنا تصنیف ہے، نادان کے نزدیک اس کی اہمیت نہیں، اس کی اہمیت تو دانا اور دانشوروں کی نگاہ میں ہو گی کہ کس محنت و مشقت سے انھوں نے نئی راہ نکالی ہے۔ وجہی کے بعد میر نے نکات الشعراء میں "انداز" لفظ کا استعمال کیا ہے اور اس کی جو خصوصیات بیان کی ہیں ان پر غور کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس لفظ کا اطلاق بڑے وسیع مفہوم میں کرتے ہیں۔

اگرچہ اظہار و ابلاغ کا تعلق بظاہر خارجی اجزا کو فنکارانہ سلیقہ مندی کے ساتھ برتنے سے ہے لیکن یہ مسئلہ جتنا خارجی ہے اتنا ہی داخلی بھی ہے۔ دونوں کے درمیان ایک ناگزیر رابطہ اور لازمی رشتہ ہے، دونوں کو ایک دوسرے سے علاحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہی سبب ہے کہ کارلائل نے کہا ہے کہ "زبان خیال کا لباس نہیں بلکہ اس کی جلد ہے۔" میرے خیال میں خارجی اور داخلی ساتھ ہی خط امتیاز دی ہے اسلوب دونوں کے متوازن تال میل اور حسین آمیزش کا نام ہے۔ یہ رابطہ اور ہم آہنگی جس قدر متناسب ہو گی اسلوب بھی اسی قدر اہم اور جاندار ہو گا۔

اسلوب کے سلسلے میں دو نکتۂ خیال سے لوگ نظر آتے ہیں، کچھ مصنفین اور محققین نثر کے اجزا کو طرب، مسرت اور حسن کاری سے برتنے کو اسلوب کا لبادہ دیتے ہیں اسے تسلیم کرتے ہیں۔ یہ تقاضا ہے کہ کسی مصنف کی طرز تحریر کی جو عام روش، عام ڈگر اور عام پیچ ہوتی ہے اُسی مخصوص روش اور پیچ کا تذکرہ کرتے ہیں، وہ یہ کی لفظی دنیا کو مان لیتے ہیں کہ فلاں ادیب نے آسان اور عام فہم، سادہ اور سلیس انداز بیان اختیار کیا ہے، فلاں مصنف کی طرز تحریر گنجلک، مغلق اور پیچیدہ ہے اور فلاں کا طرز ادا رنگین، مرصع اور مقفیٰ ہے۔ یہ تصنیف میں نثر اور ہیں سے اسلوب کا مفہوم تو واضح ہو جاتا ہے لیکن ہم حق بجانب ہیں کہ اگر کہیں کہ یہ علم ہم کو ملی ہے۔ یہ صورت اسلوب طرز، شیلی اور اسٹائل کے لغوی مفہوم کے پیش نظر یا اس کی قدر و قیمت کے سبب ہے کہ خارجی اجزا پر زیادہ زور دیتے ہیں۔

کہ اشعار کی تعریف میں [illegible] اسلوب کی وضاحت کرتے ہیں اور انتخاب الفاظ، طرز ادا، حسن آفرینی کو بنیادی اسلوب کہہ کر تعیین

۔۔۔ مطبوعہ ادبیات، عادت، طرز نگارش، خاص اسلوب، بیان، شاعر یا مصنف کا وسیلۂ ترکیب کلمات و انتخاب الفاظ و طرز تعبیر وغیرہ — یہ یک اثر انفرادی بخشتا ہے اور الفاظ و مضامین کو منفرد بناتا ہے۔ [illegible] دبستانِ بیان [illegible] اسلوب کو سمجھنے اور پرکھنے کے سلسلے میں یورپی مستشرقین کی کاوشیں قابلِ تحسین ہیں۔ ان حضرات نے باقاعدہ اسلوب کی اہمیت، ماہیت اور افادیت پر روشنی ڈالی ہے۔ کچھ دانشوروں نے نثر کے اجزاء کو خوبصورتی اور سلیقہ مندی کے ساتھ برتنے پر زور دیا ہے اور اسے فن کی ترتیب و تحسین کا نظریہ اور واسطہ قرار دیا ہے اور اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ انسانی شخصیت میں جو اہمیت تہذیب، سلیقہ، ادب اور اخلاق کی ہے تحریر میں اسلوب کو بھی وہی اہمیت حاصل ہے۔ غرض ان کا مدعا اسلوب کا بنیادی مفہوم بتانا ہے۔ مڈلٹن مرے لکھتا ہے:

"What manner is the individual, Style is to the write. It is right, therefore to say that is the man in the same sense and with the same reservations as we say, "manners makyth man."

یہی آواز بازگشت آرتھر کوئلر کے یہاں سنائی دیتی ہے وہ کہتا ہے:

"What style in writing is much the something as good manners in other human intercourse."

اور ڈاکٹر مسعود حسین اسلوب کو الفاظ کی طلسم بندی کا موجب بتانے کا خیال ہے۔

"Style is the qualities of language which communicates pricely emotions or thought or a system of emotions or thoughts peculiar to the authors."

(The Problem of Style: P.W. J.M. Murry

غرض اسلوب کو سمجھنے اور پرکھنے کے سلسلے میں تہذیب، سلیقہ، تمیز، اخلاق و آداب وغیرہ الفاظ کا استعمال کیا جا سکتا ہے اور یہ حقیقت ہے اس سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا کہ انسانی ظاہر، گفتار اور نشست و برخاست میں تہذیب، سلیقہ اور اخلاق و آداب کو بڑا دخل ہے اپنے خیالات، حرکات و سکنات اور اقوال و افعال کے سبب انسان وحشی بھی کہلاتا ہے اور مہذب بھی۔ وحشی کی حرکتیں بھی وحشیانہ ہوتی ہیں اس کا شعور ناپختہ ہوتا ہے جس سے فہم و فکر کی قوت کا فقدان ہوتا ہے، اس کے برعکس مہذب اور تعلیم یافتہ افراد غور و فکر کی صلاحیت رکھتے ہیں اور ہمیشہ اس بات کا لحاظ رکھتے ہیں کہ ان کی حرکات و سکنات کا انداز فراخدلانہ ہو۔ انسان کے بااخلاق و باادب ہونے میں اس کی شخصیت کا بھی حصہ ہوتا ہے لہٰذا اسلوب اگر نام ہے تحریر کو سلیقہ اور زیب و زینت عطا کرنے کا تو اس کی سرحد آگے چل کر شخصیت سے مل جاتی ہے۔

مصر کے مفکر [illegible] اسلوب اور شخصیت کو لازم و ملزوم قرار دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اسلوب شخصیت کا عکاس اور ترجمان ہے جس طرح انسانی شخصیت پیچیدہ ترکیب اور تہہ دار ہے جس کو کسی ایک پہلو سے سمجھنا آسان نہیں ہے اسی طرح اسلوب بھی کئی عناصر کی ترکیب ہے جو مصنف کے ذاتی ذوق و وجدان، انفرادی طرز فکر کی نمائندگی کرتا ہے جس طرح انسانی شخصیت کی تعمیر میں خارجی اور داخلی عوامل کار فرما ہوتے ہیں اسی طرح اسلوب کی تشکیل میں بھی یہ تمام عوامل کارفرما ہوتے ہیں ۔۔۔ [illegible] نے اسلوب کے بارے میں جو [illegible] کہا ہے [illegible] [illegible] ایک شخص [illegible] کی [illegible] ہو [illegible]

[illegible] Judgement in Literature; [illegible]

ہونا فرد کا ہے [illegible] ہے [illegible] ایک مخصوص انداز میں اُن کی ترتیب کو پیش کرتا ہے ردِ عمل [illegible] شخصیت [illegible] اسلوب کسی کی شخصیت کا [illegible] آئینہ ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ [illegible] اسلوب مصنف کے ذہن کا عکس ہے۔ یہی پیش کش کی منزل وہ منزل ہے جہاں فن کار کا ذاتی شعور و ذوق، پسند و ناپسند، جذبات و میلانات اور [illegible] کا اظہار [illegible] جا سکتا ہے۔

اسلوب وہ آئینہ ہے جس میں فن اور فن کار [illegible] نقش و نگار کے ساتھ منعکس ہو جاتے ہیں۔ یہ فن اور فن کار دونوں کی گہرائی و گیرائی میں اتر کر حیرت انگیز اور عجیب تر [illegible] کرتا ہے [illegible] سے اگر علم و فن کو ابدیت حاصل ہوتی ہے تو یہ فن کار کی [illegible] شخصیت کی [illegible] ہے [illegible] اس کا رشتہ فن کار کی شخصیت سے جوڑنے کا سہرا فرانسیسی بوفان کے سر ہے جنھوں نے [illegible] میں فرانسیسی اکادمی کے افتتاحی جلسے کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:۔

"Style is the man (Le Style est l'homme man) Style consists in the order and the movement whic we introduce into other thought." (Discourse of style)

اُس کا خیال ہے کہ اُسلوب ہی انسان ہے [illegible] خیال کی تحریک کو [illegible] دیتا ہے۔ اس تعریف سے اس کا مقصد یہ تھا کہ مصنف کی شخصیت الفاظ میں منتقل ہو کر تحریر کے لباس میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ واقعی یہ فقرہ کہ "اسلوب ہی انسان ہے" نہایت بلیغ اور معنی آفریں ہے۔ یہ ادب اور نفسیات کے رشتے کی بھی نشان دہی کرتا ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ ادیبوں کے مشاہدات و تجربات میں مماثلت و مطابقت ہو لیکن طرزِ اظہار میں یکسانیت اور مطابقت ناممکن ہے۔ ہر ادیب کا انداز فکر اور اُسلوب اظہار جداگانہ ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ [illegible] مصنف کے ذہن و شعور کا مکمل ترجمان بتلاتے ہوئے تفصیل سے اس طرح پیش کرتا ہے۔

"Style is never a seperate quality but rather the amalgm and issue of all the mental and moral qualities in a man's possession and which bears the same relation to those that light bears to the mingled elements that make up the orb of the sun. And style, after-all, rather thought, is indefinable, yet all subduing just as fine manners are in social life. In reality it is not so much consequence what you say, as how you say it. (SMITH BEALER: ESSAY P. 14)

اور اپنی کتاب The Making of Literature میں اسکاٹ جیمس نے کہا ہے کہ "اسلوب مصنف کی شخصیت کے عکس سے زیادہ کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ پُر تاثیر اور دلکش اس وقت ہوتا ہے جب مصنف کے [illegible] الفاظ اس کی شخصیت اور ذوق کی نمائندگی کریں۔"

میرے خیال میں مندرجہ بالا تعریفات قابلِ تسلیم ہیں لیکن اُسلوب نام ہے [illegible] کے حسین توازن کا۔ یہاں خارجی اجزا بھی اہم ہیں اور داخلی محرکات بھی [illegible] فن کار کی شخصیت کے ردِ عمل [illegible] سے جو اسلوب بنتا ہے وہ [illegible] آفاقی ہوتا ہے۔ اسلوب [illegible] الفاظ [illegible] ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ جو اسلوب [illegible]

(باقی صفحہ ۱۴۳ پر دیکھیں)

غزلیں

ضیا فتح آبادی

جلے گی شمعِ داغِ دل کہاں تک
اندھیرا ہے زمیں سے آسماں تک

محبت ٹھوکریں کھائے گی در در
نہ تھا اس بات کا وہم و گماں تک

گزر کر پیش و کم کی منزلوں سے
میں آ پہونچا حدِ سود و زیاں تک

تم اس سے پہلے آجاؤ کہ پہونچے
جنوں کا ہاتھ دامانِ زماں تک

زمیں کی آنکھ کا آنسو بنا ہے
وہ نالہ جو نہ پہنچا آسماں تک

کسی کے نقشِ پا پر گام زن ہوں
مگر یہ راہ جاتی ہے کہاں تک!

تجلّی ہی تجلّی ہے مسلسل
دلِ سوزاں سے برقِ آشیاں تک

ضیا پُر پیچ ہے راہِ محبت
چلو گے ساتھ تم میرے کہاں تک

مظفر حنفی

جتنی متاعِ درد تھی ہم نے سمیٹ لی
چادر پھر اُس کے دستِ کرم نے سمیٹ لی

لازم ہیں برگ و بار یہ لاؤں کہاں سے میں
ساری نمی تو دیدۂ نم نے سمیٹ لی

چلنے میں منہمک ہوں مجھے کچھ خبر نہیں
کتنی زمین نقشِ قدم نے سمیٹ لی

جب خاکدانِ دل سے رہا کر دیا گیا
سب کائنات آتشِ غم نے سمیٹ لی

شہ رگ مری کھُلی تھی کسی ہاتھ کی طرح
جو بوند گر پڑی وہ قلم نے سمیٹ لی

لوگوں کے پاس دولتِ کونین ہو تو ہو
مٹھی میں ریت میرے بھرم نے سمیٹ لی

بیشک جہاں نمائی کرے گی نئی غزل
جاگیر تھی کہ ساغرِ جم نے سمیٹ لی

افسانہ

م ۔ ف ۔ ...

میں نہیں کہہ سکتا......

جون کی چلچلاتی دھوپ میں چاند کی شیتل کرنوں کے لمس کا احساس! ساون رات، اماوس کی رات کے گھور اندھیرے جیسے گھپ کی گھٹا ٹوپ گھٹا میں سورج کی چمک، چند روشنی! سہاگ کے گجرے میں پڑے سُرخ مخملی بدن پر برسوں کے پھول جیسے بوڑھی سہاگن کی آغوش سیمیں سیمیں [illegible] لب پر ہنسی لہروں کی گدگدی سی شعاعوں کی زر دوزی!

کیچڑ سے سارنگی خشک زبان کا کانٹا کہیں پر شبنم سے پانی کے قطرے جیسے نوکِ خار پر قطرۂ شبنم کا تاج! جزیرہ ویراں سنسان [illegible] آباد دنیا کا حسن، زندگی کا شور ... یا دنیا کی گہما گہمی میں غیر آباد جزیرہ کا سکون، ریگستان میں نخلستان اور سرسبز شاداب وادی میں ریگ زار کا سکوت، بے کراں خاموشی لامتناہی سناٹا!

حیاتِ جاوداں ..... یا ..... مسلسل موت!

کچھ عجیب حالات سے وہ گھبرا تھا زندگی کا پہیہ کب رُکا تھا [illegible] کا چکر کب بند ہو سکتا تھا [illegible] احساسِ پریشانی کی [illegible] ... سلام! سلام!! سلام!! [illegible] سب کچھ [illegible] مشینی زندگی کی مشین چلانے کا خیال [illegible] چلتی رہی تو تیز [illegible] اور تیز [illegible] تو تیز ترین چلنے [illegible] ماحصل ... [illegible] مقصدِ حیات! لیکن [illegible] پانچ گھنٹوں سے [illegible] مسلسل پانچ گھنٹوں سلام [illegible] لیکن اس مجبوری

اُس کے ارادوں یا اختیارات کو کیا دخل تھا بلکہ مجبوری تھی [illegible] ایسی بے سر و سامانی جس سے کبھی خواب میں بھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ کھڑکیاں بھی بند تھیں لیکن یہ بھی اس کی مرضی سے تھوڑے ہی بند تھیں ..... وہ ان بند کھڑکیوں سے بھی خوف کا عفریت جھانک رہا تھا۔ خوف کا، موت کا، عزت کا.....

آہٹ سے [illegible] جاتی تھی۔ [illegible] نگاہیں روشن دان کی جانب گئیں، سامنے روشن دان سے [illegible] زدہ سورج جھانک رہا تھا۔

مسلسل پانچ گھنٹے ہونے کو آئے تھے! پانچ گھنٹے جو پانچ یُگوں، پانچ صدیوں، پانچ جنموں پر بھاری تھے! پانچ گھنٹے جتنی دیر میں زمین اپنے محور پر ہزاروں میل کی مسافت طے کر لیتی ہے، جتنی دیر میں [illegible] خون کھول سکتا ہے، جل کر خاکستر ہو سکتا ہے یا گرم [illegible] ہو سکتا ہے! ساتھ ساتھ اس کا ذہن [illegible] [illegible] اور خون جوش مار رہا تھا، ابل پڑنے کو بے چین ہو رہا تھا لیکن وہ شکست پر پہنچ چکا تھا، مغلوب اور [illegible] تھا۔ چونکہ ہر وقت تقدیر کے [illegible] کی طرح [illegible] باہر [illegible] گھر کا دروازہ کی [illegible] کر رہا تھا۔ ٹیلیفون بھی [illegible]! اور ... اور اس کا اپنا تعلق بھی [illegible] دنیا سے منقطع تھا! ٹیلیفون کا [illegible] لاش کی طرح [illegible] بے زبان [illegible] آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ [illegible] کی گرفت ہر وقت اس کی گردن پر [illegible]

بیٹھے تھے۔ آخر وہ ایک کمرے کے قریب جا کر رک گئے کہ نیچے خیمہ بنا ہوا تھا۔
اس کا ایک دروازہ ... تھا جس پر ... لٹک رہے تھے
کہ اس کے کونے میں پہلا سازوسامان کا کمرہ تھا جس میں وہ ...
شام کے وقت کے جنگل کے بیچ ایک چھوٹا سا مکان ...
پہلے ... اندر داخل نہیں ہوا کہ کہیں وہ بھی ...
یاد ہیں کہ وہ سب کو اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ یہ قبل ازیں
تھا یا بعد ازاں کا ...... ؟

وہ پہلا گھنٹہ! معاف کرنا!! مشتعل ہجوم، نعرے لگاتے ہاتھ
بڑھتے قدم۔ پھر اسے خیال آیا کہ جیسے ہی اس نے ٹیلیفون اٹھایا
تھا تو پولیس کو خبر بھی کر دی تھی لیکن اس کے اندر بیٹھا انسان جاگ اٹھا
تھا اس کا ہاتھ رک گیا تھا۔ اس نے خود ہی تو اسے منع کر دیا تھا۔
پتہ نہیں پہلا گھنٹہ کیسے گزرا تھا، لیکن جو بھی ہوا اس نے
محسوس کیا تھا کہ جان بچ گئی لیکن دوسرے گھنٹے کا سکوت،
تعلق کہاں لے جاتا تھا۔ چند منٹ تو سکون سے گزرے لیکن
پھر یکایک اس کے ذہن و دماغ پر ایک ناقابل برداشت
بوجھ کی طرح مسلط ہو گیا۔ وہ سکوت اسے مضطرب کر رہا تھا۔
وہ شور و غل دور سے آتی آوازیں بدل گئے تھے اور قدموں
کی چاپ نہایت مدھم ہو گئی تھی لیکن کہیں یہ تو ان کا یہ آہستگی
سے ... تو نہیں ... کوئی کمین گاہ سے بیٹھا اسے دیکھ تو نہیں
رہا ہے؟ اس کے قدم رک گئے۔ کچھ ہی دیر پہلے اس نے سوچا تھا
وقت کے ... کھڑے ہو کر ... کر دوں اور حالات
سے زیادہ خود پر ... ٹیلیفون پر رکھا تھا۔ ٹیلیفون کی
گھنٹی بج چکی تھی ...... اور ٹیلیفون خاموش زبان سے اس کی
... اسے ... تھا۔ جو انسانیت کا افلاق اٹھا
... تھی اور ... کر رہا تھا۔
... گھنٹہ ... نہیں اور پیا۔ ... پیٹ میں
... سامنے اخبار پڑا
تھا۔ اخبار اٹھا کر ... لیکن کچھ دیر تک ... انہاک سے
اخبار ... پڑھتا رہا۔ ... جاتے خبروں کو پڑھنے لگا۔
وہ چاہتا تھا کہ ... کر سب کچھ بھول جائے۔ لیکن خبریں

بہر حال ملک کی باتیں ... نہ ... کو ... بنا دیا تھا۔
پھر ٹیلی! مگر ... کے ... پر ... وقت کی شکست ... کا پہلا
... تک ... تھا اور کئی وقت ... گھوڑے کا لمحہ
تھا ... اٹھا یا پھر ... تھا جیسے ... پہلا ... تو ... پہلا
پہلے ... کا ... کر جانا ... سامنے ... تھے
اس کے ذہن پر جیسے ... کر ... ہیں ... تھے۔ ... کے
پاس گیا۔ کمرے کے ... کا ... کی ... اب بھی
موجود تھی۔ وہ لوٹ آیا۔ اب اس کا رخ الماریوں کی جانب تھا۔
الماریوں کے دونوں پٹ کھلے تھے۔ اس کا ارادہ نظریں میز ... فائیلوں
پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ وہ انہیں اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے ان میں
... کچھ ہو جس کا ... کے ... ہو سکتا ہے اور اس
جہنم کدہ سے نجات پا سکتا ہے۔ لیکن ... انتشار ...... ! آخر تنگ
آ کر وہ کرسی پر آ دھمکا ... اس کا ... نیچے دبا اور
پھر اسے اچھال دیا جیسے کرسی نہ ہو ... کا ... اور ...
کرسی پر ... تھی۔ چرچراہٹ ... کی ... سائی اور کرسی ... ہو
گئی۔ وہ بیٹھ کر تو بیٹھ گیا لیکن اس نے محسوس کیا کہ کرسی کی گرمی
کی طرح چکر کھانے لگی ہے۔ یہ اس کا وہم تھا۔ ذہنی انتشار۔!
میز پر بیٹھا آفس سے آئے کاغذات سانپ کی طرح بل کھا رہے تھے
"فیکٹری خسارے میں چل رہی ہے۔ اس لئے ... یا ...
کی کوئی گنجائش نہیں۔ مزدور ... ہیں تو فیکٹری میں
تالا لگا دو"
"یعنی بندوق کا دہانہ بند کر دوں۔ ... کا قتل
کر دوں۔ بھوک پیدا کر دوں؟ ... خوشی آمدید
خوش آمدید۔ وہ زیر لب بڑبڑایا۔
یہ بند کا چوتھا گھنٹہ تھا۔ سامنے میز پر بکھرے کاغذ کے
الفاظ ... کی طرح ... لگے۔ حالات نے ان میں ... کی
پیدا کر دی تھی۔ تازہ خون کی امید ہو چلی تھی۔ یہی ... بھی
... سے لپٹ جائیں گی۔ ... کی
... کی ... مٹ جائے گی۔
... پیٹ ... بجتا تھا۔ ...

سے پانی اُچھل کر اُس کی آنکھوں سے ٹکرایا اور آنکھیں جھلس کر رہ گئیں۔ پانی کی دھار اُس کی پیشانی پر لپک کی طرح سیدھی
پڑیں۔ وہ گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ پسینے کی بوندیں پیشانی پر چمکنے
لگیں۔ بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ جیسے بے شمار چیونٹیاں اس کے جسم پر رینگنے
لگیں۔ تشنگی اور بڑھ گئی۔ دھڑکن تیز تر ہو گئی۔
زبان سے بے اختیار کسی کا نام نکلا۔ "یا مولا!"
جیسے فرعون کے منہ سے نکلا تھا "موسیٰ مجھے بچا لو!" جب وہ
نیل کی گہرائیوں میں گھِر گیا تھا۔
لیکن اُس کی آواز دیواروں سے ٹکرا کر واپس آ گئی۔ اور
انسانی ہمدردی کے جذبے سے اُس کا دِل سرشار ہو اُٹھا۔ کھڑکی
بند ہو گئی تو باہر اندھیرے میں مزدوروں کا کیا بنے گا؟ اُن کے ننھے معصوم
بچے، بچیاں، اُن کی مدقوق چہرے والی بیویاں، ضعیف اپاہج
ماں باپ، بہن بھائی ...."
لیکن میز پر کھلی فائل کی تپش کے آگے سارے جذبے بھاپ
بن کر فضا میں تحلیل ہو گئے۔
یہ پانچواں گھنٹہ تھا۔ گھر جانے کا وقت قریب تھا۔ زرد
دھوپ روشن دان سے دیوار پر اُتر رہی تھی۔ سورج زرد
چادر اوڑھے کوہ قاف کی وادیوں میں گم ہونے جا رہا تھا، جیسے بُدھ بھکشو ہمالہ کی ترائی میں نروان کی تلاش
میں جا رہے ہوں ....!
بھلا گھر پر منتظر ہو گی۔ لیکن .... ؟
اُسے بہت ادھورے کام یاد آنے لگے۔ دفتر کے، گھر کے،
ذاتی۔ ادھورے کام، تشنہ تکمیل آرزوئیں!
"لیکن کمل کیا چیز ہے؟" وہ سوچنے لگا۔
"بیڈ آفس کا فیصلہ؟ کیا واقعی یہ آخری اور قطعی فیصلہ
تھا؟ کمل!" اور پھر نالی میں پانی ڈالنے کے بعد جس طرح کیڑے
کلبلانے لگتے ہیں، اسی طرح کئی سوال اُس کے ذہن میں سر اُٹھانے
لگے، رینگنے لگے اور جب وہ اِن سوالوں پر غور و فکر کرنے لگا تو
منتشر ذہن مرکوز ہو گیا۔
"کیا سچ مچ نالی کے کیڑوں کی طرح اُن کو ختم کرنے میں ہی چارہ ہے؟"
نفع اور نقصان .... وغیرہ!!
اِنا للہ و اِنا الیہ راجعون!!
تم کیا کہتے ہو بکٹ ٹیک؟ یا وہ جو مجھے
وِرثے میں ملا؟ جس حقیقت سے مراد ہے ہر
حرکت کو متغیر کرنے پر قادر ہے۔ کوئی شے برباد نہیں ہوتی
اُس میں صرف تغیر و تبدل ہوتا ہے۔ شکلیں بدلتی ہیں؟
تغیر و تبدل؟ نفع اور نقصان؟ لازم و ملزوم کیا
ضدین۔ ؟؟؟
انسان ... پانی میں پیدا ہونے والے، پرورش پانے والے
جراثیم ... اصولِ ارتقاء ... اور ... اور ... !!!
مجبوری اور حسرت؟ قوتِ حیات؟ خود کا حال؟؟؟
— زندگی ... وجود ... آدرش ... غم، خوشی ...!
لیکن یہاں اپنے گریبان سے باہر گردن نکال کر دنیا کا جائزہ
لینے کی کسے پڑی ہے؟ فرصت جیسی متاع کہاں نصیب ہے؟
کتابِ زندگی کے سنہری اصول .....!
"اپنی بقا و بہتری کے لئے جدوجہد کرنا فطرت کا
اشارہ ہے"
ارشادِ الٰہی ہے"
یہ حقیقت ہے اور ایک ٹھوس حقیقت کہ نقصان ہو تو
پورا کہاں سے مل سکتا ہے؟
اِس بند کمرے اور ہڑتال سے کون سا فائدہ ہے۔ بھوک
روٹی [illegible] اِس کا حل؟ بھوک، مرض، [illegible]
امراض اور .... اور .... دعوتِ اجل۔! انسان کے
دوش بدوش .... اِن ہی کی آغوش میں پرورش پانے
والے اِن کی کوکھ سے جنم لینے والے، اُن کے دامن سے چمٹے
والے .... اُن کے ہمزاد۔؟
شور، غوغا، افراتفری، کانفرنس، لکچر بازی ....!
بدیت کا دعویٰ، سرمایہ بازی، لیڈری، حیلہ سازی۔
— زندگی اتنی سستی، کا مسئلہ انسانی ہے یا مسئلہ ملکی۔؟ اور
شام کے دھندلکے سارے اُفقِ زیست پر [illegible]

[illegible] ڈالنے سے بچنی، کیسے کیسے خطرناک تاشے ہیں
انسان کے؟؟

پولیس، مجبور، مزدور، ہم، مرض، ناکامی، مسافر، گرسنگی کی بستیوں میں لٹکے پنجرے، کوکیوں کے جالوں جیسے ٹین کے چھپّر، روٹی، [illegible] گھومتا موت، عصمت، سو دگنا کڑک، زیان، آنکھوں میں چوس، پیاس، بھوک، انتقام، شہوت، خوف، ظلم، استحصال — زندگی اور موت کے ریوڑ اور پیستے ہیں اس قدر ایک!!

"قدرت کا سپورٹ اعلیٰ تعلیم کے لئے" آج وہ جینیک کا اعلا [illegible] وقت کے لئے یہ سب میرے ساتھ اسی کمرہ میں دفن ہو جائیں گے۔ پھر میری کالج کا ساتھی، ہمیشہ میڈیکل کا طالب علم سے کامنی کی شادی کا سرگرداں [illegible] جس کی چھت ناکامی

......

"کارخانہ میں آگ لگا دو۔ جس کارخانہ میں بھوک اُگے وہ کارخانہ کس کام کا ......" باہر سے سنسناتی آواز اُس کے سر سے ٹکرائی۔

"نہیں نہیں! اس سے کچھ فائدہ نہیں، کچھ فائدہ نہیں۔"
اس نے دروازے پر اپنی ہتھیلیاں پیٹ ڈالیں۔ لیکن پنچھی کے قفس میں پھڑ پھڑانے سے صیاد کو کب رحم آیا ہے؟

"آگ لگا دو، آگ لگا دو" کی آواز آتشیں لپٹ جیسی گرم پگھلے سیسے کی طرح اس کے کانوں میں اترنے لگی۔ اس نے اپنے کان بند کر لئے اور سر میز پر پٹک دیا۔ وہ میز کے شیشے پر اپنی پیشانی اس طرح رگڑ رہا تھا جیسے کالی کی بھاری مورتی کے سامنے بلیدان چڑھانے کے بکرے کا ابھی ابھی دھڑ سے الگ کیا گیا سر!

"میں مجبور ہوں بہکا — مجبورِ محض، ایک مشین، ایک پرزہ"

"تم مجبور ہو اور تم نفع نقصان نہیں جانتے؟"

"جانتا ہوں، جانتا ہوں، ہمارے سارے اکاؤنٹس اپ ٹو ڈیٹ ہیں۔"

"خاک جانتے ہو۔ صاف صاف کیوں نہیں بتلا دیتے۔ بتا دو سب کو جو حقیقت ہے"

"میں نہیں کہہ سکتا کہ، میں نہیں کہہ سکتا کہ ...."

"میں نہیں کہہ سکتا کہ ..... وہ ایک کرخت گرجدار آواز سے اُس کے چونک اُٹھا — اور وہ یہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا کہ پولیس [illegible] تھا اور اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھایا تھا اور اس اندھیرے میں چند سائے ادھر ادھر گردش کر رہے تھے۔ وہ چلا رہا تھا "میں بے قصور ہوں، بے قصور ہوں، بے گناہ ہوں"!

"جی ہاں آپ بے قصور ہیں" یہ آواز مسٹر مرزا پولیس انسپکٹر کی تھی۔ وہ کیسے نہ پہچانتا وہ رات ہی تو کلب کی میز دونوں کے درمیان مشترک تھی اور کچھ بھی ..... اشتراکیت کا بہترین نمونہ پیش کر رہے تھے دونوں ....!

"او ہو مرزا! میں تو ڈر ہی گیا تھا۔ بھائی تم یہاں کیسے؟ کیسے؟ کیوں؟ کیا تم نے [illegible] فون نہیں کیا تھا؟"

"میں؟"

"کیوں؟"

"فون تو ڈس کنکٹ تھا"

"واہ! وہ تو دو دن کے ہنگامے میں پہلے نہیں آ سکا — کیونکہ ہمارے پاس آ کر [illegible] نہیں لگتی"

"آ ... ہو، وہ کس لئے؟"

"آپ بھی خوب ہیں — تو کیا آپ نے مجھے یہاں [illegible] کے لئے دعوت دی تھی — آپ کو کچھ پتہ بھی نہیں —؟"

"آخر ہوا کیا؟"

"ہونا کیا؟ میں نے چاہا آپ پہلے پہنچ سکے [illegible] اور مزدوروں سے رکنا چاہا، پتھراؤ کیا۔ نتیجہ ظاہر تھا پانچ واصلِ جہنم ہو گئے، بیس اسپتال میں، چار کی حالت [illegible] ہو رہے ہیں اور قریب ستر حوالات کی ہوا کھانے لگے۔ خیر چھوڑیے۔ یہ بتائیے — یہ شروع کیسے ہوا؟"

اُس کی آواز [illegible] لگیں، جہاں پانچ مزدوروں کا خون [illegible]

تشنہ ارتضا پوری

بھول

آدم سے پہلے کیا تھا،
یہ کس نے دیکھا؟
میں نے!؟
تم نے!؟
ہم سب نے تو کچھ بھی نہ دیکھا
یہی تو ہم سے بھول ہوئی ہے

اِسی لئے تو اپنا جیون،
ٹوٹا ٹوٹا بکھرا بکھرا، اُلجھا اُلجھا اور ادھورا سا لگتا ہے
آدم سے اُس پار کی دنیا دیکھی کس نے؟
آدم سے اِس پار تو ہم سب دیکھ رہے ہیں
اِسی لئے تو کرب یہ سارا جھیل رہے ہیں

کاش کہ ہم آدم سے پہلے جنمے ہوتے
شاید ہم آدم سی غلطی کبھی نہ کرتے
یہ دنیا کچھ اور ہی ہوتی!

مظہر الدین مظہری

جاگتی دہلیز

پھر "الیکشن" آگیا
مسجدوں اور مندروں کے صحن کی ویرانیاں گھٹنے لگیں
ہر گلی کوچے کی دیواروں پہ
ہاتھی، اونٹ، گھوڑا، شیر، بکرا، گائے بچھڑا
اک جگہ چرنے لگے۔
اپنی اپنی بولیوں میں کچھ نہ کچھ کہنے لگے

سر پہ سورج کو اٹھائے
جسم پہ لے کر غبار و گرد
چائے کی کچھ پیالیوں پر
صبح سے گھوما کیا
ایک اک کی خصلتیں گنتا پھرا
اک تھکے ماندے مسافر کی طرح

رات کو جب
گھر گیا تو

پیر میرا
اونگھتی بیوی کے سر سے
جاگتی دہلیز پہ
ٹکرا گیا — !

صغیر علی صدیقی ایم اے

حیاتِ جاوید

حالی اُردو ادب میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ وہ مرزا غالب کے شاگرد تھے اور سرسید کے رفیق۔ اِن معروف باکمالوں کی ابتدائی تصویریں حالی ہی کے ذریعہ عوام تک پہنچی ہیں۔ یادگارِ غالب اور حیاتِ جاوید دونوں کی اُردو ادب میں کافی اہمیت ہے۔ جدید اردو شاعری کا بانی حالی کو تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ جدید اردو نثر میں یہ درجہ سرسید کو حاصل ہے۔ ایک نقاد نے کیا خوب کہا ہے "سرسید کے بعد اگر کوئی اُن کے رنگ میں قلم ہاتھ میں لے سکتا ہے تو وہ بڑی حد تک حالی ہیں"۔ حالی نے بھی ابتدا میں مذہبی موضوعات پر کتابیں لکھی ہیں لیکن اُن کی ادبی اہمیت نہیں ہے۔ اُردو نثر میں حالی تین حیثیتوں سے ہمارے سامنے آتے ہیں (۱) سوانح نگار (۲) ادبی نقاد (۳) صاحب طرز ادیب۔ اِس وقت اُن کی سوانح نگاری اور خاص طور پر حیاتِ جاوید پر ایک نظر ڈالنا ہے۔ حالی پہلے سوانح نگار ہیں جنھوں نے اُردو ادب کو تین معیاری سوانح عمریاں دی تھیں۔ حیاتِ سعدی۔ یادگارِ غالب اور حیاتِ جاوید۔ اِس سلسلہ میں شیخ چاند ایک مضمون (مطبوعہ رسالہ اُردو۔ جنوری ۱۹۳۵ء) میں لکھتے ہیں۔

"انھوں نے جہاں سوانح عمری کی داغ بیل ڈالی وہاں اپنے ہاتھوں سے اِس کو پروان بھی چڑھایا اور اس میں وہ مقدور وسعت، جامعیت اور استحکام پیدا کیا کہ اُن کی تصانیف ہمارے لئے نمونہ بن گئیں"۔ اسلاف کی سوانح عمری لکھنا نسبتاً آسان کام ہے لیکن حالی نے دو سوانح عمریاں معاصرین کی لکھی ہیں۔ معاصرین کے حالات لکھنا آسان کام نہیں ہے۔ یہاں مختلف واقعات کو ایک خاص ترتیب سے پیش کرنا ہوتا ہے۔ جیسے کہ ایک جیتا جاگتا انسان بنا کر پیش کرنا ہوتا ہے۔ تاکہ ہر ایک اُس کو آسانی سے پہچان لے۔ حالی کے دونوں ہیرو یعنی غالب اور سرسید اپنے زمانے کی سطح سے بلند تھے۔ اور اعمال و خیالات کے لحاظ سے اپنے زمانے کے ماحول سے مختلف تھے۔ اِن کا انتخاب حالی کو ایک کامیاب سوانح نگار کی سند عطا کرتا ہے۔ حیاتِ سعدی اُن کی پہلی کوشش ہے اور یہاں سوانح نگاری کے آداب پُورے طور پر نہیں تھے۔ وہ آداب جو حالی نے بعد میں سیکھے۔ انھوں نے شیخ سعدی کو ایک معمولی انسان کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور وہ حفظِ مراتب یہاں نہیں ملتا جو یادگارِ غالب اور حیاتِ جاوید میں نمایاں ہے۔ یادگارِ غالب کی تصویر حیاتِ جاوید سے زیادہ دلکش اور دلچسپ ہے۔ غالب پر سوانحی اور تنقیدی مواد پچھلے چند سالوں میں کافی جمع ہو چکا ہے لیکن پھر بھی کوئی دورِ جدید کا نقاد یادگار کے بیانات کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔ اِس کی اہمیت اب بھی کافی ہے۔ حالی حیاتِ جاوید کو اپنا کارنامہ [illegible] وسعت، ضخامت، جامعیت اور مضامین کی نوعیت اِس کو ممتاز اور بلند درجہ

دیکھئے۔ حیاتِ جاوید کے دیباچہ میں لکھتے ہیں: "زمانۂ سلف کے مشاہیر کی بیوگرافی منفعت سے خالی نہیں۔ [illegible] میں جو اُن سے کوئی عملی اسوۂ حسنہ یا شاہراہ موجود نہیں ہے جس پر ہم آنکھیں بند کرکے اپنی دشوار گذار منزل جو آج ہم کو درپیش ہے طے کرتے چلے جائیں۔ البتہ سرسید کی لائف ایسی مثال ہے جس کی پیروی سے ممکن ہے ہماری قوم کی یہ کٹھن منزل آسانی کے ساتھ طے ہو جائے"۔ ایک اور جگہ لکھتے ہیں: "ہم نے جو دو ایک مصنفوں کا حال اب تک لکھا ہے اس میں جہاں تک ہم کوشش کر سکے ہو سکیں اُن کی اور اُن کے کلام کی خوبیاں ظاہر کیں اور اُن کے پھوڑوں کو کہیں ٹھیس نہیں لگنے دی۔ اوّل تو اُن کا پایہ اُن کی چند روزہ ہونے کے لحاظ سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی، لیکن اس کے سوا اُن ہی لوگوں کے حالات سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے جنھوں نے اس دنیا کے پُرشور کارخانے سے اپنا ناتا نہیں لگا لیا ہے۔ اور کنارے کنارے صحیح سلامت جا رہے ہیں۔ اُن کو سب نے بھلا جانا کیونکہ اُن کو کسی بھلائی یا برائی سے سروکار نہ تھا۔ وہ کہیں راستہ نہیں بھٹکے، چونکہ انھوں نے اگلی پگڈنڈیوں کی لیک سے کہیں اِدھر اُدھر قدم نہیں دھرا۔ لیکن ہم کو اس کتاب میں اُس کا حال لکھنا ہے جس نے چالیس برس تک جہالت اور تاریکی کی جڑ کاٹی۔ تقلید کی جڑ کو اُکھاڑا۔ عامیوں اور علماء سے اختلاف کیا ہے۔ قوم کے پکّے پھوڑوں کو چھیڑا ہے اور اُن کو کڑوی دوائیں پلائی ہیں جن کو مذہب کے گروہ کے لحاظ سے ایک نے صدیق کہا ہے تو دوسرے نے زندیق خطاب دیا ہے۔ اور جب وقت کے لحاظ سے کسی نے [illegible] سمجھا ہے تو کسی نے نہایت راست باز لبرل جانا ہے۔ ایسے شخص کی لائف چپ چاپ کیونکر لکھی جا سکتی ہے۔ ضرور اس کا سونا کسوٹی پر کسا جائے اور اس کا کھرا کھوٹا ٹھوک بجا کر دیکھا جائے۔ وہ ہم میں پہلا شخص ہے جس نے مذہبی لٹریچر میں نکتہ چینی کی بنیاد ڈالی اس لئے مناسب ہے کہ سب سے پہلے اُس کی لائف میں اُس کی پیروی [illegible] جائے اور نکتہ چینی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے"۔

اِن اقتباس سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ حالی سرسید کی اہمیت اور قدر و منزلت سے واقف تھے اور دوسری یہ کہ وہ ان کی سوانح ایک بلند نصب العین کے تحت لکھنا چاہتے تھے۔ اُن کو معلوم تھا کہ سرسید کا سوانح نگار اُن کے ذاتی حالات سے لکھنے پر قناعت نہیں کر سکتا۔ حالی سرسید کی قومی کارکردگی اور اُن کے کام پر ناقدانہ نظر ڈالنا ضروری سمجھتے تھے۔ لیکن انھوں نے جس نکتہ چینی کی طرف دیباچہ میں اشارہ کیا ہے آخر تک اُس کو نبھا نہ سکے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حیاتِ جاوید ایک اعتذار کا پہلو لئے ہوئے ہے۔

حیاتِ جاوید کے متعلق شبلی کا خیال ہے "حیاتِ جاوید کو میں مدلل مداحی سمجھتا ہوں"۔ یہ [illegible] سے لیکن حیاتِ جاوید صرف مداحی نہیں ہے۔ اور شبلی کی اس مختصر تنقید کو اُن تصانیف کے مقابلہ میں جن کو مداحی نہیں کہا جا سکتا شبلی نے حیاتِ جاوید کو کتاب المناقب اور یک رخی تصویر کہا ہے۔ ان اعتراضات کے خلاف شبلی کے ایک معتقد یعنی مہدی افادی نے صدائے احتجاج بلند کی اور اِس کو شبلی کی حد سے بڑھی ہوئی زیادتی بتایا۔

سوانح نگاری کے اصول ہر زمانے میں مختلف رہے ہیں۔ ایک زمانہ میں تصویر کا روشن پہلو نمایاں کرنا اور عیوب کا پردہ ڈالنا سیرت نگار کا کمال سمجھا جاتا تھا۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد تصویر کے دونوں رُخ پیش کرنا ضروری سمجھا گیا۔ سوانح نگاری میں بعد میں جتنی بھی ترقی ہوئی ہے، انہی دونوں اصولوں کی ترمیم سے ہوئی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ سوانح عمریاں [illegible] کے مطابق پر روشنی ڈالتی ہے لیکن کوئی طریقہ قطعی نہیں کہا جا سکتا۔ یہ سوانح نگار اور ہیرو دونوں کی شخصیت پر منحصر ہے۔ اگر سوانح نگار نے ہیرو کی شخصیت کو جاوید کر دیا اور اپنی آزادی کو [illegible] کہا جا سکتا ہے۔ حالی پہلی بات میں تو مکمل طور پر کامیاب ہیں لیکن دوسری کے متعلق یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا۔

حیاتِ جاوید کا دوسرا حصہ زیادہ اہم ہے۔ پہلا حصہ جس میں سرسید کی زندگی کے تمام واقعات تفصیل سے

بیان کئے ہیں۔ یعنی پیدائش سے لیکر وفات تک کے تمام واقعات اور کارناموں کا ذکر آگیا ہے۔ دوسرے حصے میں اُن کے کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے، کسوٹی پر کس کر دیکھا گیا ہے۔ سرسیّد کی ترقی کے اسباب، علمی اور قومی خدمات۔ اُن کی مضمون نگاری، اسلوبِ تحریر، اخلاق و آداب، ٹرسٹی بل پر اُن کا ہنگامہ، کانگریس، اُردو، ہندی کی مخالفت، علوم اور تہذیب الاخلاق کے فوائد پر تفصیلی نظر ڈالی گئی ہے۔ سرسیّد کے تمام کارناموں کا محرک مذہب تھا۔ وحید الدین سلیم جو اُن کے لٹریری اسسٹنٹ رہ چکے تھے، اِس رائے سے اتفاق کرتے ہیں۔ سرسیّد کو اُردو ادب سے براہِ راست دلچسپی نہ تھی، وہ مذہبی اصلاحات چاہتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ اُن کی تحریروں سے اُردو ادب کا دامن وسیع ہوا۔ حالی نے سرسیّد کی مذہبی خدمات کا ذکر بہت تفصیل سے کیا ہے اور غیر معمولی قوتِ استدلال سے کام لیا ہے۔ خطبات احمدیہ اور تفسیر القرآن دونوں پر سیر حاصل بحث کی ہے جگہ جگہ اُن کے نقطۂ نظر سے اختلاف کیا گیا ہے۔ سرسیّد نے معتقدات کی صداقت، قدیم روایات سے بے نیازی اور بے دھڑک اظہارِ خیال اور علومِ جدیدہ سے مطابقت کی کوشش کی ہے۔ حالی نے اِن سب کو نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ حالی کے بیان میں ہمدردی خلوص، محبت اور ایک حد تک عقیدت پائی جاتی ہے، جو ایک اچھے سوانح نگار کے لئے ضروری ہے۔ اِسی لئے یہ کہا گیا ہے کہ ایک شریف انسان نے ایک شریف تر انسان کی سوانح عمری لکھی اور آشنائے فن ہو کر لکھی۔ حیاتِ جاوید کا موازنہ انگریزی کی مشہور بیاگرافی بوسول کی "لائف آف ڈاکٹر جانسن" سے کیا جا سکتا ہے۔ بوسول کی شہرت کا دارومدار تمام تر اُس قلمی تصویر پر ہے جو ڈاکٹر جانسن کے بالکل مطابق ہے۔ اور جزوئیات و تفصیلات کی تصویر زیادہ اُبھر آئی ہے۔ باسول نے اِس سوانح عمری میں واقعیت بھر دی ہے۔ اور اُس عقیدت و خلوص نے جو قدم قدم پر جھلکتا ہے، کتاب کی صداقت اور اثر میں اضافہ کر دیا ہے۔ یہی کیفیت حیاتِ جاوید کی ہے۔ ڈاکٹر جانسن اپنے زمانہ کا سب سے بڑا ادیب اور اٹھارہویں صدی کا اپنے عہد کی سب سے اہم شخصیت کا مالک تھا۔ لیکن آج اُس کی تصانیف بہ استثنائے چند صرف ادب کے طالب علم کے لئے ہیں۔ عوام کو اُن سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انھیں امتدادِ زمانہ سے "زنگ" لگنا شروع ہو گئی ہے۔ لیکن باسول کی وجہ سے جانسن کی شخصیت ویسی ہی زندہ جاوید ہے جیسی پہلے تھی۔ سرسیّد کو بھی باسول کا سا بیاگرافر ملا ہے۔ سرسیّد کی تصانیف میں سے بہت سی ایسی ہیں جو زندہ رہنے والی نہیں ہیں۔ امتدادِ زمانہ کا اثر اُن پر بھی پڑا ہے لیکن حیاتِ جاوید اُن کے کارناموں کو روشن رکھے گی۔ اِس سلسلہ میں آلِ احمد سرور لکھتے ہیں "سرسیّد ایک خاص شخصیت اور نصب العین کے مالک تھے۔ اُن کی زندگی اور کارنامے آنے والی نسلوں کے لئے نہایت اہم تھے۔ یہ حالی کا کارنامہ ہے کہ انھوں نے سرسیّد کی سوانح عمری کو ایک خاص اُصول اور ضابطہ کے تحت علمی طریقہ سے مرتب کیا اور اِن مسائل کو اِس استادی سے سب سے اوّل قلمبند کیا کہ یہ کتاب اُردو میں پہلی سائنٹیفک سوانح عمری کہلائی اور زبان و بیان، انداز اور اصولِ فن کے اعتبار سے ایک مکمل نمونہ بن گئی اور اچھے اچھے ادیب و انشا پرداز اِس سے رہبری حاصل کرنے لگے۔

بقیہ کہانی "میں نہیں کہہ سکتا" صفحہ ۳

سواد بغیر تاجا شبینہ کالی کوٹھڑیوں میں ڈھکیل دیئے گئے تھے۔

مرزا نے پھر اپنا سوال دہرایا تو وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مرزا کا مُنہ دیکھنے لگا — جیسے مرزا کا چہرہ دھندلا سا کنواں ہو جس میں بے شمار اشیاء گھوم رہی ہوں۔ مرزا نے شانے پکڑ کر ہلایا۔ تو وہ چیخ اُٹھا "میں نہیں کہہ سکتا کہ ..." اور کرسی سے اُٹھ کر چوکڑیاں بھرتا ہوا میدان میں نکل گیا۔ وہ خاک اُڑاتا، گھومتا اور پھر چیخ اُٹھتا "میں نہیں کہہ سکتا کہ" اور ٹکٹکی باندھ کر خلاء میں دیکھتا اور پھر بھاگ کھڑا ہوتا جیسے کوئی گولی اُس کی طرف آ رہی ہو۔

اک کرب بیکسی کی صدی میں اسیر ہوں
میں تازگیٔ فکر و نظر کا سفیر ہوں

ایسا نہ ہو کہ چھونے سے ہو جاؤں منتشر
اک خوابناک فرشِ زمیں کا خمیر ہوں

پیالہ کو سمندروں سے بھی شاید نہ بھر سکے
کشکولِ فن ہے ہاتھ میں پھر بھی فقیر ہوں

نا آشنا ہوں رشتۂ آہنگ و صوت سے
خود آگہی کا اپنی میں تنہا سفیر ہوں

اب تو نہ مجھ کو شوخیٔ غم سے نوازیے
میں شہرِ نطق و لب میں سکونت پذیر ہوں

خود اپنی پستیوں پہ اٹھی ہی کبھی نظر
زندانِ ارتقا میں ابھی تک اسیر ہوں

ہوں حاملانِ فکر و صدا آشنا ظہیر
شاید میں اپنے عہد میں پسندِ ضمیر ہوں

ظہیر غازی پوری

مشفق سوپوری

امکان بازگشت کے دھندلا گئے یہاں
نقشِ قدم چرا لئے کس نے مرے یہاں

تنہائی کا مہیب سفر ناگزیر ہے
جنگل میں چھوڑ آتے ہیں سب راستے یہاں

میں بے کسی کی دھوپ ہوں سب کی پناہ گاہ
اک دن مجھے پتا تھا کہ تم آؤ گے یہاں

بے مہر موسموں کی شکایت فضول ہے
ہم قلعۂ شباب تھے بس ڈھ گئے یہاں

دکھ اب مرے بکھرنے کا تو بھی اٹھائے گا
اب مجھ سے جڑ گئے ہیں کئی حادثے یہاں

ہم دربدر بھٹکتے ہوئے تھے جہاں وہی
جن کے مسافروں سے [illegible] یہاں

چلنے مسکن میں نقش [illegible] ہی ہوں
بے بال و پر [illegible] یہاں

محمود بالیسری

تین کلیاں

ناہید — !

میری طرف سے اپنی امّی اور منّا کو پیار کرو۔ تم نے کہا تھا کہ میرے خط نہ لکھنے کی وجہ سے تم کافی پریشان ہو۔ تمہارا سوال کو کوفت سی ہوتی ہے۔ طبیعت ہمیشہ بے چین رہتی ہے جب ان دنوں میں بھی کم بے چینی نہیں، میرے دل میں بھی ایک قسم کا کرب پیدا ہو رہا ہے کہ کسی کام میں جی نہیں لگتا۔

میری اچھی ناہید!

تم نہیں جانتی ہو، ان دنوں مجھ پر کیا گزر رہی ہے اور میں کس کسمپرسی کی حالت میں وقت گزار رہا ہوں۔ تم سنو گی تو بے ساختہ رو دو گی۔ میں نے ایک ایسی چیز محسوس کی ہے جسے مجھے [illegible] میں نے اپنا طول دماغ کو دیا ہے۔ ایک ایسا خواب [illegible] کہ زندہ رہنے کو جی نہیں چاہتا۔ میری سانس [illegible] معلوم ہوتی ہے ایسا لگتا ہے کہ دل کی دھڑکنیں پہلے سے تیز تر ہو کر یک نہ جائیں۔ کہیں خون کی رفتار اتنی نہ بڑھ جائے کہ رگیں پھٹ جائیں۔

ناہید —!

میں اُسے اتنا ہی چاہتا تھا جتنا تمہیں چاہتا ہوں۔ جس طرح میں اب تم سے اور منّا کی جدائی برداشت نہیں کر سکتا، اسی طرح اُس کی جدائی بھی مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی ہے۔ مجھ سے ایک ایسا گناہ سرزد ہو گیا ہے جس کی تلافی [illegible] میں یہ بھی نہیں جانتا کہ میں اُس کی طرف کیسے اور کیوں کھنچتا چلا گیا اور مجھے اُس سے ایک اُنس سا ہو گیا [illegible] ہوتا ہے اُسے [illegible] سے

پیار کرنے لگے تھے، مگر دونوں کو اس کی خبر تک نہ تھی۔ ہم دونوں اجنبی تھے۔ ایک دوسرے کو جانتے تک نہ تھے۔ نام بھی معلوم نہ تھا۔ مذہب اور ذات پات کے متعلق کوئی خبر نہ تھی۔

ناہید!

تم تو جانتی ہو میں نے یہاں ایک بڑے مکان 'شانتی محل' کا سامنے والا ایک کمرہ کرایہ پر لے رکھا ہے۔ کمرے کی کھڑکیاں ایک تنگ گلی میں کھلتی ہیں۔ میں تین بچوں کو روزانہ اسی راستے سے گزرتے دیکھتا تھا۔ ایک لڑکی تھی جو سب سے بڑی تھی اور دو خوبصورت لڑکے تھے۔ اُن کے ننھے ننھے معصوم چہروں سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ بھائی بہن ہیں۔ اُن کا لباس سادہ مگر یکساں ہوتا۔ وہ جب دور سے آتے ہوئے نظر آتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ گویا سا خوبصورت [illegible] گلدستہ قدم سے قدم ملائے چلا آرہا ہے۔ جب وہ آنکھ مٹکا کرتے ہوئے میری کھڑکی کے سامنے سے گزرتے تو مجھے محسوس ہوتا کہ اس پتلی سی گلی میں ان کا ننھا منا جو ایک شاخ کی کھلی ہوئی تین کلیوں کے مانند ہے۔ ان میں جو سب سے چھوٹا تھا وہ بہت چنچل تھا۔ جب وہ میری کھڑکی کی برابر پہنچتا تو نہ جانے کیوں مڑ مڑ کر کھڑکی کی طرف دیکھتا رہتا۔ کبھی کبھی پیچھے مڑ کر بہن کی جانب دیکھتا، مگر اُس کی بڑی بہن ڈانٹ دیا کرتی۔

ناہید —!

[illegible] تم سے یہ واقعہ بیان کر رہا ہوں اور میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی ہیں۔ یہ دیکھو میری گھڑی میں سات بج رہے ہیں اگر یہ شام کے سات بج رہے ہیں، صبح کے سات بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ گھڑی مجھے [illegible] تحفہ کا احساس دلاتی ہے۔ نہ جانے سکنڈ کی سوئی کہاں اٹکی ہوئی ہے

اب یہ ننھی ننھی کلیاں رہ گئی ہیں۔ کاش تمھی سوتی نہ کھوتی۔ اُن دنوں میں صبح اُٹھتے ہی ضروری کاموں سے فارغ ہو کر سات بجے سے پہلے ہی کھڑکی کے قریب آ جاتا تھا اور گھڑی کی سوئیوں کو دیکھتا رہتا کہ سات کب بجیں گے؟ یہ تین سوئیاں، اُس وقت مجھے وہ تین بچے نظر آتے تھے جو میرا چھوٹا چنچل اور متحرک تھا۔ کبھی کبھی میں پریشان ہو جاتا تھا اور وہ گھڑی پر غصہ آتا تھا کہ نہ جانے کیوں سات نہیں بج رہے ہیں۔ میں نے زندگی میں کسی کا انتظار نہیں کیا۔ کہا جاتا ہے کہ انتظار کی گھڑیاں صبر آزما ہوتی ہیں۔ مگر میں نے محسوس کیا ہے کہ انتظار کی گھڑیاں بڑی پریشان کن ہوتی ہیں۔ یہ کبھی مسرت نہیں دے سکتی۔ میں بار بار گھڑی کی جانب دیکھتا رہتا اور آخر وہ تینوں بچے دفعتاً دور سے قدم ملاتے آتے دکھائی دیتے اور جب وہ میری کھڑکی کے سامنے سے گذرتے تو میرا دل مسرت و انبساط سے لبریز ہو جاتا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ دور چلے جاتے یہ روزانہ کا معمول بن گیا تھا۔

ناہید —!

اُن سے میرا کوئی واسطہ نہ تھا۔ میں اُن کے لئے اجنبی تھا۔ میں انھیں جانتا بھی نہیں کہ وہ کہاں کے رہنے والے ہیں، اُن کے نام کیا ہیں، مگر نہ جانے کیوں ایک نامعلوم کشش کے تحت میں اُن کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ اتوار یا کسی دوسری چھٹی کے دن ادھر سے نہ گذرتے تو میں دن بھر بے چین رہتا وہ روزہ کر یاد آتے۔ اُن سے میرا خون کا رشتہ تھا نہ کوئی اور سروکار۔ میں انھیں صرف جانتا تھا اور پہچانتا تھا تو صرف اُن کے لباس سے — اُن کے چہروں سے اور سات بجے کے معین وقت سے۔ ہو سکتا ہے ہمارے اندر انسانیت کی وہ بنیادی کشش کارفرما ہو جس نے ماضی البعید میں سماج کی تشکیل کی تھی، جس سے جنگلوں میں سرگرداں رہنے والے انسانوں نے باہم مل جل کر رہنے کا سبق حاصل کیا تھا۔ میرے چند دوست — اِس اجنبی لگاؤ کو تاپسند کرتے اور اِس کا مذاق اُڑاتے تھے۔ شاید انھیں —! نہیں کہ یہ لگاؤ، یہ کشش، یہ اُنس نئی چیز نہیں ہے۔ یہ روزِ اول سے تخلیق کا بنیادی اُصول بنی ہوئی ہیں۔ اِس کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا، اگر یہ نہ ہوتا تو کوئی گھر نہ بستا، سماج کی تشکیل ممکن نہ ہوتی، انسانیت کا وجود نہ ہوتا۔ ہو سکتا ہے کہ زمان و مکان کی حدود میں تبدیلی ہیئت کی بنا پر اُس کو پہچاننے میں دشواری پیش آ رہی ہو مگر یہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔

ناہید —!

میں اسی طرح انھیں دیکھتا رہا اور پھر ایک دن ایسا ہوا کہ میں حسبِ معمول کے مطابق سات بجے کھڑکی کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے اُن کا انتظار تھا نہ جانے کیوں اُس دن سات بج جانے کے بعد بھی وہ نظر نہ آئے۔ میں بیتاب ہو گیا۔ طرح طرح کے وسوسے دل کو گھیرنے لگے تھے کہ وہ دور سے آتے دکھائی دئے۔ وہ تین کے بجائے دو تھے۔ تیسری کلی غائب تھی۔ میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ میں اُن سے دریافت کرنا چاہتا تھا مگر ایسا نہ کر سکا میں سوچنے لگا کہ کہیں وہ بُرا نہ مان جائیں۔ شاید وہ جواب نہ دیں، کیونکہ میں اُن کے لئے بالکل اجنبی تھا۔ دل و دماغ کی اِس جنگ میں کبھی دماغ کامیاب ہوتا تو کبھی دل۔ یہی کشمکش چلتی رہی، وہ دور چلے گئے اور میں یوں ہی پیچ و تاب کھاتا رہا۔ [illegible] کوئی کام نہ ہو سکا۔ بار بار اپنے کمرے میں پڑا سوچتا رہا کہ وہ کہیں چلا تو نہیں گیا، بیمار تو نہیں ہو گیا۔ بیماری کا خیال آتے ہی میں پریشان ہو گیا اور دل میں تہیہ کر لیا کہ اسکول کی چھٹی کے بعد فوراً اُن سے دریافت کروں گا۔

ناہید —!

تمہیں یاد ہے نا، جب منّا بیمار تھا تو ہم رات رات بھر اُس کے قریب بیٹھ کر اُس کا منہ تکا کرتے۔ جب اُس کی حالت زیادہ خراب ہو جاتی تھی تو تم پاگل سی ہو جاتی تھیں، اُس سے لپٹ کر رو پڑتی تھیں۔ میں تمہیں دلاسا دیتا تھا مگر اُس وقت میرا دل بھی بیقرار ہو جاتا تھا کیوں نہ ہو، یہ بچے تو ہمارے دل و جگر ہیں، دست و بازو ہیں، ہماری قوت ہیں، اور قوم کی طاقت ہیں۔ یہ ننھی ننھی کلیاں ہمارا سرمایہ اور مستقبل ہیں۔ انسان جب اکیلا ہوتا ہے تو خود کو کمزور سمجھتا ہے۔ اُسے کمزوری کا احساس شدت سے ہوتا ہے یہی احساس اُس کو اپنے اندر کے جوہر بکھیر دینے کی ترغیب دیتا ہے۔ ایکتا ہی ہے جو بکھرا وجود اُس کے بازوؤں کو مضبوط بناتا ہے۔ بالکل اِسی اصول کے تحت کہ جب مادہ میں انجماد ہوتا ہے تو وہ صرف شے کہلاتا ہے لیکن یہی شے جب بکھر جاتی ہے تو لاکھوں ذرات میں تبدیل ہو جاتی ہے جو ایک عظیم قوت کے مترادف ہوتے ہیں۔ دنیا کی ہر شے میں یہی اصول کارفرما ہے۔

آج معمول کے خلاف اسکول کی چھٹی دس بجے ہو گئی [illegible] بچے اسکول سے آ رہے تھے۔ میں کوٹ سے باہر نکل [illegible] سڑک پر کھڑا ہو گیا۔ وہ دونوں بچے دور سے آتے نظر آئے [illegible]

کوئی نیا کرب باقی تھا اللہ بھی سوچ رہا تھا کہ شاید وہ شخص اُن سُنی کر کے آگے بڑھ جائیں گے مگر وہ قریب آ گئے اور میں بکا بکا سا بیٹھا۔

"آج تم سب اسکول سے اتنی جلدی کیوں واپس آ گئے ہو؟"

"ڈاکٹر ذاکر حسین کی موت ہو گئی ہے!"

میرا دل دھک سے ہو گیا۔ میں یہ خبر سننے کیلئے تیار نہیں تھا میرے دل کو طرح طرح کے شکوک پریشان کرنے لگے۔ پھر بھی میں نے دل کو مضبوط کر کے دریافت کیا۔

"تمہارا تیسرا ساتھی آج کہاں ہے؟"

بڑی لڑکی کا چہرہ مغموم ہو گیا۔ جیسے کلی مرجھا جائے۔ وہ بڑے دھیمے لہجہ میں کہنے لگی۔

"آپ دلیپ کی بات کرتے ہیں۔ وہ ہمارا چھوٹا بھائی ہے۔ روزانہ ہم اسی راستے سے گذرتے ہیں۔ شانتی محل کے نیچے والے کمرے میں ایک صاحب رہتے ہیں۔ روزانہ صبح ۸ بجے وہ صاحب کھڑکی کے قریب بیٹھے رہتے ہیں۔ دلیپ وہاں جانے کے لئے ہمیشہ لپکتا رہتا تھا، مگر ہم اُسے ڈانٹ کر اپنے ساتھ لے جاتے تھے کیونکہ ہماری اُن سے کوئی جان پہچان نہیں تھی، ہم سوچتے تھے کہیں وہ برا نہ مان جائیں۔ مگر کل اسکول سے واپس آتے وقت دلیپ ہماری بات نہ مانی اور اُن کے کمرے کی جانب دوڑ گیا اور اچانک ایک کار سے ٹکرا گیا وہ زخمی ہو گیا ہے۔ اس لئے آج اسکول نہ آ سکا!"

ناہید!

یہ بات سنتے ہی میرے دل و دماغ ساکت ہو گئے۔ جیسے حادثہ مجھی پر گذرا ہو۔ میں بے چین ہو گیا۔ نہ جانے اب اُس کی حالت کیسی ہو گی کہیں کچھ ہو گیا تو اس کا ذمہ دار میں ہی ہوں گا۔ "کیا تم مجھے اُس کے پاس لے چلو گے۔" اور جواب کا انتظار کئے بغیر میں اُن کے پیچھے ہو لیا۔ دلیپ مجھ سے ملنے کے لئے کتنا بیتاب تھا۔ کتنی محبت تھی اُسے۔ یہی محبت اس حادثہ کا باعث بنی۔ گویا اُس نے اپنی محبت کا خون ہوتے ہوئے دیکھ لیا اور میں اُسے دیکھنے تک نہ جا سکا۔ بچے بھی اُس سے شناسا تھے وہ میں پیچھے رہ گیا اور اُس کی جیت ہوئی وہ خاموشی سے چلے جا رہے تھے۔ میں بھی اُن کے پیچھے پیچھے ہو جاتا تھا۔ شاید وہ سوچ رہے تھے کہ میں دلیپ کے لئے کیوں بیقرار ہوں۔ حادثہ کی خبر سن کر میری آنکھوں میں آنسو کیوں آ گئے تھے؟ انہیں کیا پتہ تھا کہ میں ہی وہ شخص ہوں جس کے لئے دلیپ پر یہ حادثہ گذرا ہے۔ قریب آدھ میل جانے کے بعد پتہ چلا ہے کہ پاس ایک چھوٹا سا خوبصورت مکان نظر آیا۔ وہ بچے اُس مکان کی طرف لپک گئے۔ میں بھی اُن کے ساتھ جلدی جلدی مکان کے احاطہ میں داخل ہو گیا۔ برآمدہ میں کچھ لوگ جمع تھے۔ اُن کے درمیان کفن میں لپٹی ہوئی ایک ننھی سی لاش پڑی تھی۔ بچے چلا اُٹھے اور مجھے پکڑ کر لاش کے قریب لے گئے اور بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگے۔

"بابو جی یہ ہمارا دلیپ ہے۔"

تھوڑی دیر کے لئے منہ سے کفن ہٹا دیا گیا۔

اُف ناہید!

میرا سر چکرانے لگا۔ یہ تھا دلیپ۔ اُس کے چہرے کی مسکراہٹ اب بھی میرا مذاق اُڑا رہی تھی اور کہہ رہی تھی "شانتی محل کے بابو کیوں کیسے رہے۔ میں تم سے روٹھ گیا ہوں۔ میں پھر کبھی تمہاری کھڑکی کی طرف نہ دیکھوں گا۔ آخر بے وفا کون نکلا۔ میں یا تم۔ میری جیت ہوئی نا بابو؟"

اُس کا منہ ڈھانپ دیا گیا اور لوگ اُس کی میت اٹھائے گئے۔ یہ گلی گلی میں گھوم رہا تھا۔ آگے آگے دلیپ کی لاش جا رہی تھی۔ برآمدے میں دو معصوم بچے کھڑے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ اُن کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اُن کا ننھا سا ساتھی بچھڑ گیا تھا۔ شاخ سے ایک کلی جدا ہو گئی تھی۔ میں بیچ میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ آگے بڑھوں یا برآمدہ کی طرف چلوں۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ دوپہر کے وقت بھی گھڑی میں سات بجے تھے۔ گھڑی کی ٹک ٹک متحرک اور چنچل سوئی غائب تھی۔ میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ متعدد سوالیہ نشان اُبھر اُبھر کر مٹتے رہے۔ ان دونوں بچوں سے اُن کے ساتھی کو کس نے جدا کیا؟ دلیپ روٹھ کیوں گیا؟ ذمہ دار میں ہوں یا ایک اتفاق یا پھر کوئی پوشیدہ آسمانی ہاتھ؟

ناہید!

دیکھو میری آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔ اب مجھ سے لکھا نہیں جا رہا ہے۔ میں جب آؤں گا تو تم پہچان بھی نہ سکو گی۔ میں کتنا بدل گیا ہوں۔ دلیپ کی موت میرا داخلی توازن بگاڑ گئی ہے۔ میرے دل کی دھڑکنیں اجنبی اجنبی سی لگ رہی ہیں، میری تمام حس مفلوج ہو گئی ہے مجھے اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا ایک ننھا سا ہم سے بچھڑ گیا ہے۔

تمہارا

جمیل

اختر بستوی

معجزے تمناؤں کے

غالب نے کہا بس اتنا یہ معجزے کے ہاتھ میں
ملا نہیں جہان میں اسے جب کوئی مقام
بنتا ہے بلبلہ آب پہ کوئی وہ بدنصیب
جس کا نہ کوئی مرحلہ فرصت ، نہ کوئی کام
لیکن یہی تو حال تمناؤں کا بھی ہے
پاتیں نہیں کہیں بھی وہ جب منزلِ سعید
ان کی بات ہوتی ہے آہ کی شاخ پر
محروم منفعت سے، مفادات سے بعید

محمد شکیب

نقشِ فریادی

کسمساتے ہوئے ماحول کے ذہن میں کبھی
بدلتا چہرہ مجھے یوں مسخ نظر آتا ہے
زندگی جیسے پکاسو کی بنائی تصویر
پھر دہکتے ہوئے زخموں کی نمایاں تفسیر
مقتلِ فکر پہ مصلوب مسیحے کی طرح
وقت کے ہاتھوں نے تعزیرِ مسلسل کیلئے
ظرفِ احساس کی دیوار پہ لٹکائی ہے،

غم کا آسیب

دور سے ایک اجنبی آواز !
شب کے طوفاں زدہ جزیرے سے
ہُو کے عالم میں ایسے آتی ہے
جیسے ایک غول کچھ پرندوں کا
غم کے صحرا کی سمت سے بڑھکر
سونی بستی کے پیڑ پر آ کر
نیچے شاخوں میں گاڑ دیتا ہے

اندر کا شیطان

اک ہیولیٰ مرے احساس میں پوشیدہ ہے
لگ رہا ہے جو ابھر آتا ہے شیطاں بنکر
مجھ میں آجاتی ہے تو نخوت و رعونت کی صفت
وار کرتا ہوں میں ہر فرد پہ جھنجھلا کر
حیرت یہ ہے کہ تعمیر کی قوت کے طفیل
ایسی حالت سے میں ہوتا ہوں ہمکنار
ورنہ اس قسم کے لمحے ہیں خطرات لئے
یہ بھی ممکن ہے کہ میں خود ہی بنتا ہی شکار

طیب انصاری

اشفاق حسین

۱۹۴۳ء کی جامعہ عثمانیہ کا تصور کیجیے۔ شہر کی نئی مضبوط بلند قامت اور جاذبِ نظر عمارات میں تعلیم پانے والے طلبہ بھی جو
بڑی دلکش ہے جہاں کبھی ماہ و سال چند کی رنگا رنگ محفلیں جاری رہتی تھیں۔ آج وہاں فکر و دانش کے چراغ فروزاں ہیں جہاں کبھی
داستان مدہوشی اور سرمستی کے عالم میں مجبور ہو کر تیز قدم اٹھاتے نوجوان سینہ تان کر زندگی کے شعور کے ساتھ ترقی اور بلندی کی
شاہراہ پر گامزن ہیں۔ کبھی یہاں جوان اسفند یار دیوانہ وار گھوما کرتے تھے۔ اب وہاں ہر فرد جوہر سے آراستہ نظر آتا ہے۔ کالج
کی یہ تبدیلی در حقیقت قدیم و جدید حیدرآباد کے درمیان کا فرق ہے اور تمدنی ماحول کی نئی زندگی کی نشان دہی کرتی ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے
قیام سے حیدرآباد کی تہذیب و تمدن کو نیا رنگ و آہنگ دیا ہے۔ اسی نئی تہذیب کے علمبرداروں میں اشفاق حسین ممتاز
مقام رکھتے ہیں۔ اشفاق صاحب نے اپنے مقالہ معنونہ "یادِ ماضی" میں جامعہ عثمانیہ کی عظمت اور برتری کا اعتراف کیا ہے۔ لکھتے ہیں

> "وقت گزرتا گیا اور جامعہ کی نئی زندگی کا قافلہ نت نئی منزلیں طے کرنے لگی۔ طالب علموں کے قافلے آتے اور
> جاتے رہے مگر علم کی شمعیں روشن ہوتی رہیں۔ جو طالب علم تہی دست آئے تھے وہ متاع ہنر لے کر بھاگے لیکن
> انہوں نے خود کو روشنی دی اور اپنے وطن کو روشن کیا۔ دل کی گہرائیوں میں ڈوب کر انہوں نے زندگی کا سراغ پایا اور
> عرفانِ حیات حاصل کیا جو جامعہ ہی کا فیض ہے بلکہ زندگی کو ایک فضیلت و منزلت بخش سکے۔"

(ماہنامہ "شاعر" جلد ۳۹ شمارہ ۵)

اشفاق حسین صاحب کے نام کے ساتھ ہی اختر کی منظوری کی لائن یاد آتی ہے "چمکتا ہے کتابِ اشتیاق" ..... اپنی بذلہ سنجی، ظرافت اور
زندہ دلی کے ذریعہ ساری محفل کو زعفران زار بنا دیا ہے۔

اشفاق حسین صاحب کے نام کے ساتھ ہی "مقامِ اقبال" کا خیال آتا ہے یعنی "متینِ اشفاق" ..... اپنی تمام تر ذہنی اور فکری
صلاحیتوں کے ذریعہ شاعر مشرق علامہ اقبال کے مقام کو متعین کر رہا ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے کلام اقبال میں ڈوب گیا ہے۔ کہیں ادب
کی لوحت، جذبہ و فکر کا دیدہ حال ہے۔ شب بیداری پر خیال ہے کہ "انھیں بدلنے والے اقبال کہاں ہیں اردو ہی کے نہیں بلکہ مشرق کے عظیم
شاعروں میں گنے جاتے ہیں۔ اقبال نے ملت اسلامیہ کو پیغام دیا انسانی احترام پر اس کا جو تقاضا ہے وہ کسی زمانے کا مقدر بن گیا ہے۔"

(روزنامہ "سیاست" ۱۰ اکتوبر ۷۲ء)

واقعہ تو یہ ہے کہ اشفاق صاحب کی شخصیت کے یہ دو نمایاں پہلو اس وقت کے حیدرآباد کی زندہ یادگار ہیں۔ اس حیدرآباد کی
جو جاگیردارانہ ماحول سے ہٹ کر علم و ادب کے ماحول کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کردار کے یہ دو پہلو صرف اشفاق صاحب

بھی کی نمائندگی نہیں کرتے بلکہ اس وقت کے ہر نوجوان کا نمائندہ ہے۔ اشفاق صاحب اپنے دورِ طالب علمی میں بھی نمائندہ شخصیت رکھتے تھے اور آج بھی ان کی ذات اپنے دور کی نمائندگی کرتی ہے۔ اب ایسی شخصیتیں ایک ایک کرکے اٹھتی جا رہی ہیں جو ہیں وہ قابلِ احترام ہیں۔ اشفاق صاحب اسی لئے بھی نمائندہ شخصیت ہیں کہ انھوں نے اعلیٰ ڈگری کو جو ۱۹۶۰ء کے جامعہ عثمانیہ اور قاضی زندگی کی بھرپور نمائندگی کی اور "مقامِ اقبال" لکھ کر اس حیدرآباد کی یاد کو تابندہ بنا دیا جو اس وقت کے درمیان زندہ و تابندہ تھا۔ اور جو اقبال کے زیرِ اثر تدبر و فراست کے ایک نقطۂ نگاہ کو قبول کر چکا تھا۔ آج ہم اس اندازِ نظر کی تردید اور تکذیب کر سکتے ہیں لیکن اس زمانہ میں یہ اندازِ نظر تو حیدرآبادیوں کا مقدر ہو چکا تھا جس سے اختلاف کو بغاوت اور انکار کو غداری سمجھا گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ حیدرآباد کے انڈین یونین میں انضمام سے قبل کے دس سالوں میں حیدرآباد پر دو شاہوں کی حکومت تھی۔ ریاست حیدرآباد کی سرزمین پر شاہ عثمان کا قبضہ تھا اور نئی نسل کے ذہنوں پر اقبال کی حکمرانی! شاید اسی وجہ سے اس دور میں عوام ایک طرف تو "شاہ عثمان زندہ باد" کے نعرے بلند کر رہے تھے تو دوسری طرف اقبال کے خیالات کی روشنی میں سیاست و فراست کی نئی راہوں کا تعین کیا جا رہا تھا۔ اقبال تو ان کا روحانی رہنما بن گیا تھا۔ اقبال کی جتنی قدر و منزلت حیدرآباد میں ہوئی شاید ہندوستان بھر میں کہیں ہوئی ہو۔ لاہور میں بھی نہیں جو اس کی ابدی خوابگاہ بن گیا۔ ۹ جنوری ۱۹۳۸ء میں مسلم کلچر سوسائٹی کے زیرِ اہتمام فخر یار جنگ نے پہلا یومِ اقبال ٹاؤن ہال باغِ عامہ میں منعقد کیا اور اس یوم سے حیدرآباد میں اقبال کے نئے دور کا آغاز ہوا۔ حسن یار جنگ کے زیرِ صدارت بزمِ اقبال قائم ہوئی۔ بہادر یار جنگ نے درسِ اقبال کا نیا سلسلہ شروع کیا۔ اس طرح حیدرآباد کی ساری فضا پر اقبال ہی چھا گئے خصوصاً اقبال کے اثر سے کوئی نوجوان بچ نہ سکا۔ حد تو یہ کہ کامریڈ مخدوم نے بھی اسی جذب و کیف کے زیرِ اثر اقبال کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

شعلہ زمیں کا عرش کی گودی میں سو گیا
اُمت کا شب چراغ اُجالے میں کھو گیا

مخدوم

جامعہ عثمانیہ کے تو تقریباً سبھی نوجوان اقبال کو اپنا پیر و مرشد مان چکے تھے۔ ان نوجوانوں میں لطیف، زور، اکبر، خاقانی، بدر شکیب، دبیر، مخدوم، شاہد صدیقی، میکش، نظر حیدری، اور اشفاق بھی شامل تھے۔ آگے چل کر مخدوم و شاہد کے اندازِ نظر میں تبدیلی ہوئی اور وجد اور اشفاق نے ملازمت اختیار کرلی تو سیاست میں وہ قدم جما نہ رکھ سکے اور انھوں نے سیاسی طور پر اقبال کے افکار کا مطالعہ نہیں کیا تھا اسی لئے ذہنی اور علمی طور پر ان کی وابستگی جو اس وقت تھی آج بھی باقی ہے۔ اس دیرینہ وابستگی کی وجہ شاید یہ تھی کہ اشفاق صاحب ابتدا عمری سے اقبال کا مطالعہ کیا کرتے تھے اور اس مطالعہ کے دوران ان پر جذب و سرور کی ایک وجدانی کیفیت طاری ہو جایا کرتی تھی۔ انھوں نے ذہنی طور پر بھی اقبال کو اپنا "پیر رومی" منتخب کر لیا تھا چنانچہ اسی اٹوٹ ذہنی وابستگی نے انھیں اقبال پر قلم اٹھانے پر مجبور کیا تھا۔ "مقامِ اقبال" کے بعد ادب میں دائمی جگہ پانے کے لئے کسی دوسری تصنیف کی انھیں چنداں ضرورت نہیں رہی شاید اسی وجہ سے وہ مزید لکھنے لکھانے سے بے نیاز ہو گئے! ۱۹۴۵ء میں ادارۂ اشاعت اردو حیدرآباد نے "مقامِ اقبال" شائع کیا۔ اس وقت تک حیدرآباد سے ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی معرکہ آرا تصنیف "روحِ اقبال" چھپ چکی تھی۔ اس کے علاوہ رضی الدین صدیقی، زور، مولوی عبدالحق کی کتابیں بھی شائع ہو چکی تھیں۔ لیکن اس نوعمر طالب علم کی تصنیف نے ادبی حلقوں کو چونکا دیا اور قاضی عبدالغفار نے یہاں تک لکھ دیا کہ "اقبال کے متعلق یہ پہلی تصنیف ہے جسے پڑھ کر میں مقامِ اقبال کو سمجھ سکا" اس مقبولیت عام میں جہاں اشفاق صاحب کی فکر آفرینی کو دخل ہے وہیں ان کے تیکھے اور اثر انگیز اندازِ تحریر کا بھی نتیجہ ہے۔ اس مقالہ کی وجہ سے انھیں ریسرچ اسکالر کی ڈگری بھی ملی اور شہرتِ دوام بھی۔

اشفاق صاحب کا اندازِ تحریر بڑا ہی پیارا اور نکھرا ہے۔ وہ تحریر میں جو محویت کی کیفیت طاری کر دیتا ہے خاطر کی نہیں۔ یہ اندازِ ان

[illegible] ہوتا ہے۔ جس میں اُن کی شخصیت جھلکتی ہے۔ زیادہ [illegible] ——— اس اقتباس سے
انداز تحریر کے چٹخارے کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اشفاق صاحب اور ان کی تحریر میں کتنی دلکشی تھی۔

• یہ تحریر اُن کی جوانی کی ہے۔ اُن کی بہت پرکشش اداس ہے۔ وہ اداس ہے کہ وہ نغمہ نہ گا سکی جو فضاؤں میں رنگ رنگ کی بارش کر سکتا تھا۔ اپنی پیاس بجھا نہ سکا۔ وہ اداس ہے کہ اس کا محرم [illegible]۔ کس سے سرگوشیاں کرے اور کس کو اپنا درد دل دکھائے۔ وہ اداس ہے کہ شہر میں ایک اچھا شاعر تھا دیا۔

• یا اس شعر نے اس کی رنگا رنگ شخصیت کے سارے ہی پہلو بے نقاب دیکھے۔ اس کی کج روی اور بے راہ روی کو دیکھا اور اس کی شرمندگی بھی آنے تھے پھر اس کی دیکھا اور گل بداماں بھی اس کی آشفتہ سری کو دیکھا اور محبت کا اسیر بنتے اور نم و منتظر بھی دیکھا۔ آخری سفر کا منتظر بھی اور اس سوگوار اداس کے آنسوؤں میں شریک بھی۔ ہزار دفعہ دل کا دھڑکنیں لئے اس کا آخری دیا بجھا اور وہ شعر جو شعلہ بنا اور پھر آفتاب بن کر ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ (دنیا آدم۔ مخدوم نمبر)

زبان کی یہ رنگینی اور انداز کی یہ تیکھا پن اب کس کو نصیب ہے؟۔ اس قسم کی تحریریں تو اب ہمارے لئے تبرک بن چکی ہیں۔ بہ حیثیت اشفاق صاحب روز ہی لکھتے اور روز لکھ لکھ کر ادب کے دامن کو گوہروں سے بھر دیتے۔!!

محترمہ زینت ساجدہ نے حیدرآباد کے ادیبوں کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ جن لوگوں نے اشفاق کی ابتدائی تحریریں خاص کر اختر کی ڈائری پڑھی ہے اُن کی چونکا دینے والی ذہانت کے چرچے۔ اور اُن سے منسوب باغ و بہار لطیفے سُنے ہیں وہ لوگوں کے ذہن میں اشفاق کی شخصیت کی جو تصویر بنتی ہے اس کے خطوط بڑے تیکھے اور رنگ بھرے اور شوخ ہوتے ہیں۔ اور اُن کی ذات سے متعلق لکھتی ہیں۔ "اشفاق حسین پربھنی میں ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے۔ اور یہیں اُن کی ابتدائی تعلیم و تربیت ہوئی۔ اُن کے والد بڑے پاک باطن بزرگ تھے جن کی قلندری اور درویشی کی ایک جھلک دنیاداری کے باوجود اشفاق کے کردار میں موجود ہے۔" اشفاق صاحب کے بارے میں مزید یہ کہ اورنگ آباد سے انھوں نے انٹرمیڈیٹ اور جامعہ عثمانیہ سے ایم اے کیا اور دکن ریڈیو سے وابستہ ہو گئے۔ ان دنوں یہ آل انڈیا ریڈیو بمبئی کے اسٹیشن میں ڈائرکٹر ہیں۔

• یادش بخیر۔ حال ہی میں ان کا مضمون شائع ہوا ہے اگر وہ جامعہ عثمانیہ کی زندگی سے متعلق تفصیلی مضمون کتابی صورت میں لکھیں تو یقیناً ادب میں قابل قدر اضافہ ہوگا۔

بقیہ: "اسالیب نثر" صفحہ ۲۵

ہم آہنگ نہ ہو وہ ناقابل اعتنا اور سپاٹ کہلائے گا اور یہاں ہم ہربرٹ ریڈ کی زبان میں کہہ سکتے ہیں کہ یہ نہ تو زیور ہے، نہ ہی کرتب و مشق سے اسے حاصل کیا جا سکتا ہے، نہ تو یہ ایک کھیل ہے نہ ہی کسی قسم کی پیچیدگی، یہ اس صلاحیت کا ترجمان ہے کہ اپنے مافی الضمیر کا اظہار موزوں ترین الفاظ میں کس طرح کیا جائے۔"

ا۔ "Style..... is not an ornament; it is not an exercise, not a caper nor complication any sort. It is the sense of one's self, the knowledge of what one wants to say and saying of it in the most filling words." (Herber Read & Dobree: London Book of Eng. Prose P. 318)

شاکر حکیمی

جانے کیا نظر آیا پیار کی نگاہوں میں
غم کی روشنی پھیلی آنسوؤں کی راہوں میں

یوں نہ تم ملو جیسے پہلی بار ملتے ہیں
اجنبی سا لگتا ہوں شہر کی نگاہوں میں

کل تمہاری محفل میں ذکرِ خیر تھا کس کا
درد نے اماں پائی رات میری آہوں میں

یوں گزر گیا کوئی مڑ کے بھی نہیں دیکھا
غم کا ایک دیوانہ رہ گیا نگاہوں میں

پاس تم جو آ بیٹھے یاد آ گیا مجھ کو
فاصلوں کا گم ہونا حقیقت کی نگاہوں میں

کیا ہوئے خدا جانے خوش روی کے ہنگامے
حکمراں ہے سناٹا آج شاہراہوں میں

کیوں اچٹ گئیں نیندیں خار تھا کہ بستر میں
کروٹیں بدلتے ہیں لوگ خواب گاہوں میں

بجلیوں کے سائے میں امن کا نشیمن ہے
مل گیا سکونِ دل مضطرب نگاہوں میں

جذبۂ مسلسل نے عزم تو دیا شاکر
زندگی نکھر آئی تجربے کی راہوں میں

شوکت پردیسی

تن کی عریانی لباس بن گئے
اپنی غربت ہی سے ہم خوش ہو گئے

کوئی سناٹا ہوا اپنا گھر گئے
پیڑ کا سایہ بھی اک چھپ گئے

اس قدر سہما ہوا ہے اعتماد
آدمی بھی سائے سے پیکر گئے

یہ سلگتی سانس یہ جلتا بدن
نیند ایسے میں بھلا کیونکر گئے

آ متاعِ غم تجھے بھی بانٹ دوں
یہ بھی اک الزام میرے سر گئے

یہ کشاکش، یہ تحیر، یہ خیال
مجھ کو تنہائی کی اک نشتر گئے

بستیاں ویران ہو کر رہ گئیں
ایسے میلے بھی تو دھرتی پہ گئے

ہائے تنہائی کہ دشمن بھی نہیں
دوستوں سے اور زیادہ ڈر گئے

جب سے شوکت غم کو اپنا لیا
مجھ کو ہر اک اجنبی سا لگے

غزل

ایس۔ جی۔ ایم عاصم

آخری تصویر

لمحوں کا بجو وقت کا خنجر زندگی کا زہر اور محبت کا اثر ہمیشہ بنا جانا ہوا ہوتا ہے۔ کون ہے جو اس سے بچ کر نکل سکتا ہے؟ شاید کوئی بھی نہیں..... پتہ نہیں جانے کیا سوچتے سوچتے میں اچانک گنگنانے لگتا ہوں....

زندگی لطف بھی ہے زندگی آزار بھی ہے
ساز و آہنگ بھی، زنجیر کی جھنکار بھی ہے
زندگی دید بھی ہے حسرت دیدار بھی ہے
زہر بھی آب حیات لب و رخسار بھی ہے
زندگی دار بھی ہے زندگی دلدار بھی ہے

آج کی رات نہ جا....

شاید کہ اب تک میں بھی اس کو بھی گنگناتا رہوں گا گاتا رہوں اور روکتا رہوں وہ رکنے والا نہیں۔ وہ تو وقت کے ساتھ قدم ملا کر چلتی ہے وقت..... جو کبھی نہیں رکتا۔ اور نہ کبھی ایک نقطہ پر ٹھہرتا ہے۔ اگر ٹھہر جائے تو موت ہی آ جائے۔ دنیا ختم ہو جائے اور کائنات نیست و نابود ہو جائے وہ کہتی ہے اس کا اور میرا ساتھ کبھی ختم نہیں ہو سکتا ٹھیک ہے۔ میں نے بھی اب یہ حقیقت مان لی ہے۔ لیکن حیرت ہے کہ اس حقیقت کے مان لینے کے باوجود اب اس کا تصور کیوں ہے۔ خیال کیوں ہے۔ اور دل بیقرار کیوں ہے..... یہ ہی سوچتے سوچتے پھر اپنے ہی گرد میں بھٹک جاتا ہوں۔ کمرے میں اندھیرا ہے۔ دروازے کے دونوں پٹ کھلے پڑے ہیں۔ جیسے دروازہ کھل گیا ہو۔ بستر پر سگریٹوں کی راکھ بکھری پڑی ہے۔ ایش ٹرے میں سے سگریٹ کے ٹکڑے نکل کر فرش پر پھیل گئے ہیں۔ باہر کوئی چوڑی کی طرح چاند اپنی چمک کر داستان کہہ رہا ہے۔ اس داستان کو سن کر اچانک اُس کا جملہ میرے ذہن میں گونجنے لگتا ہے.......

"کاش آپ نہ ہوتے، یا پھر مر جاتے تو میں روز روز کے رونے کے بجائے ایک دن رو کر چپ ہو لیتی۔ اگر میں پر بھی لوگوں کی انگلیاں اٹھتیں تو شاید زندگی کی سیاہی انہیں ڈھانپ لیتی اور انہیں مجھ پر ترس آ جاتا۔ آہ..... دل اُن دنوں کے تصور کی جرأت بھی تو نہیں کر سکتا.....!!"

اچانک نظر سنسان سڑک پر جاتی ہے۔ دور دور تک کوئی آہٹ بھی نہیں ہے۔ میں سوچتا ہوں یہ گلی بڑی منحوس اور تاریک ہے۔ اسی گلی سے میری سیاہ بختی کا جنم ہوا ہے۔ اور آج وہ مجھے ٹھکرا کر چلی گئی ہے تو پھر یہ کتنی بار بار میرے ذہن سے چمٹتا جا رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں رات کی تاریکی مجھے پناہ دے دے۔ برائے نام روشنی دیتی چاندنی بھی اپنے آپ میں چھپ کر رہے۔ اور سنسان و ویران سڑک کاش اپنی بانہوں میں مجھے سمیٹ لے۔ لیکن پتہ نہیں کیوں پیڑ منجمد ہو گئے ہیں۔ آنکھیں پتھرا گئی ہیں اور دل ٹھہر سا گیا ہے..... کاش دل سدا کے لئے ہی ٹھہر جاتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ کم از کم اُس کی ایک آرزو تو پوری ہو جاتی۔ لیکن دل ہے کہ ٹھہر ٹھہر کر پھر دھڑکنے لگتا ہے۔ ذہن خزاں کے سوکھے پتے کی طرح بھٹک گیا ہے۔ ذرا سا بوجھ ڈالو اور ریزہ ریزہ ہو جائے۔ اسی لئے میں نے بھی اُسے آزاد چھوڑ دیا ہے.....

سوچتے سوچتے پھر مجھ کو خیال آتا ہے
وہ مرے درد و مصائب کا مداوا تو نہ تھی
رنگ افشاں تھی مرے دل کی خلاؤں میں مگر
ایک عورت تھی علاج غم دنیا تو نہ تھی

اچانک سامنے دیکھنے لگتا ہوں کہ قبرستان کا ایک ہجوم گھر کے [illegible]

... ہر ایک کو میرے سکھی ہونے کا یقین دلا کر رخصت کرتی جا رہی ہے۔ میں اُسے روکنے لگتا ہوں۔ لیکن قرضداروں کا سامنا کرنے کی مجھ میں ہمت بھی نہیں ہے۔

"ارے خدا کے لئے اتنا جھوٹ نہ بولو۔ کسی نے اگر مجھے گھر سے باہر نکلتا ہوا دیکھ لیا تو پھر راستہ چلنا دوبھر ہو جائے گا..... رہنے دو۔ اگر اتنے ہی سچے بنے رہنا چاہتے ہو تو چکا دو سب کے قرض۔ روز تو سویرے سویرے گھر سے نکل جاتے ہو اور رات گئے گھر آتے ہو تم تو خیر منہ چھپا لیتے ہو۔ لیکن میں.....؟؟ ان کا روز روز سامنا کرنے سے تو تنگ آ گئی ہوں۔ کاش کسی دن صبح آنکھ ہی نہ کھلے۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ صبح اٹھتے ہی کھٹ کھٹ اور شام ہوتے ہی کھٹ کھٹ....

کیا کریں بغیر قرض کے زندگی کٹتی بھی تو نہیں.... قرض ہی تو ہے، خیر صدقہ نہیں کر رہا کوئی نہ جانے۔ آج نہیں تو کل ہی سہی۔ اور کل کس نے دیکھا ہے۔ کم از کم میں تو کل کے انتظار میں یہ عذاب نہیں سہہ سکتی.....!!

ذہن بھٹکتا ہی رہتا ہے اور اسی بھٹکتے ذہن کے ساتھ میں کہنے لگتا ہوں

سُنا تم نے۔ میں نوکری چھوڑ رہا ہوں.....!!

الٰہی خیر!! یہ اچانک کیا ہو گیا آپ کو.....؟؟

تم ہی تو کہتی تھی کہ اس تنخواہ میں اس جان لیوا گرانی کے سبب گھر کا خرچ نہیں چل سکتا.....

تو پھر ــــ ؟؟

تم خود ہی سوچو ہندوستان میں پہلے ہی سے کتنے ان گنت بے روزگار محنت و ذہانت کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ اگر میں نے نوکری چھوڑ دی تو کسی ضرورت مند کو حق بجانب ہونے کا آسرا تو مل جائے گا۔ اور میں ـــ میں ہندوستان سے باہر نکل کر کچھ کمانا چاہتا ہوں۔ تم نے سُنا نہیں کہ حیات کو یہاں سے جا کر ابھی ایک سال بھی نہیں ہوا کہ اُس نے اب تک ہزاروں روپئے گھر بھیج دئے ہیں۔ اگر وہ میری طرح یہیں اپنی عمر گنوا رہا ہوتا تو شاید ہزاروں کی صورت بھی نہ دیکھ پاتا...

لیکن آپ جائیں گے کیسے ـــ؟؟ روپے کا انتظام بھلا کیسے ہو گا اور میں قرضداروں کو کیا منہ دکھاؤں گی....

تم اس کی فکر نہ کرو۔ پہلے جانے کی بات تو پکی ہو جائے۔ وہاں سے (IMMIGRATION) امیگریشن تو آ جائے پھر خدا نے چاہا تو روپے کا انتظام بھی ہو جائے گا....

ــــ تو کیا آپ اکیلے جائیں گے.....؟؟

اور نہیں تو کیا تمہیں لے کر جاؤں گا۔ پگلی کہیں کی.... ارے تم ذرا بھی ہو۔ تم تو احمق ہو۔ پرلے درجے کی احمق ــ میں نے تمہاری بیزارگی، اپنی بدحالی و کسمپرسی اور دوست رشتہ داروں کی نظروں میں چھپی حقارت دیکھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔ میرے یہاں سے چلے جانے پر سب کو کچھ نہ کچھ سکون تو مل جائے گا.....

یہ منظر بھی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ ایک اور ہی منظر نظروں کے سامنے آتا ہے.... وہ بڑے کرب ناک اور حسرت بھرے لہجے میں مجھ سے کہہ رہی ہے....

دیکھو ـــ ایک ایک کر کے سب گہنے کپڑے تو بک گئے۔ یہ برتن تو وہ بھی گروی پڑے ہیں۔ آپ جلدی باہر چلے کیوں نہیں جاتے۔ اب تو نوکری چھوڑنے کا مسئلہ بھی نہ رہا۔ ایمرجنسی ہی کی بدولت نوکری نے خود آپ کو چھوڑ دیا ہے۔ چند دنوں میں پراویڈنٹ فنڈ کا روپیہ بھی ختم ہو جائے گا۔ اس کے بعد کیا ہو گا؟۔ اس کے لئے آخر آپ نے کیا سوچا ہے۔ دن دن بھر بیٹھ کر کہانیاں لکھتے رہنے سے بھی کہیں پیٹ بھر سکتا ہے۔ میں تو کہتی ہوں باہر جا کر بیرا گیری کرنے یا مزدوری کا کام کرنے سے آپ یہاں رہ کر بھی کوئی دوسرا کام کر سکتے ہیں۔ نہ مجھے آپ سے الگ رہنا پڑے گا اور نہ غیر ملکوں میں اپنے وطن کی رسوائی ہو گی۔ پھر اپنا پیٹ بھی بھرتا رہے گا اور کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت بھی نہیں پڑے گی۔ لوگوں سے ڈرتے ہیں تو پھر ڈرنے دیجئے۔ لیکن یہ بھی یاد رکھئے کہ زندگی کی ضرورتیں اور پیٹ کی آگ سب سے زیادہ بھیانک اور ڈراؤنی ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آج جیسے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ نچلے سے نچلا کام کرنے میں بھی کوئی عیب نہ سمجھیں گے تو پھر دوسرے ملکوں کی طرح یہاں بھی پیشے کی عظمت کا احساس پیدا ہو جائے گا.....

میں بھولنا چاہتا ہوں۔ ان باتوں کو۔ لیکن ان ہی باتوں میں جا جا کر میرا ذہن الجھ جاتا ہے۔ جیسے حلق میں کچھ پھنس جائے اور اچانک دم گھٹنے کے احساس سے جسم سر سر بل کھا کر رہ جائے..... ایک اور منظر ذہن میں در آتا ہے....

کاش تم نے شادی سے انکار کر دیا ہوتا۔ تاکہ محبت، محبت کا دم

میرے تصور میں بہت کچھ لکھا ہے میرے ساتھ چلی آتی تھیں۔ حالانکہ تمہارے آنے سے پہلے میں یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ میں تنہا ہی زندگی کا بوجھ بھی نہ اٹھا سکوں گی، میں اُس معصوم اور اُداس چہرے کو اپنی دونوں ہتھیلیوں میں بھر کر کہنے لگا ہوا تو وہ [illegible] ہو کر میرے سینے میں منہ چھپا لیتی ہے۔۔۔۔

کیا کرتی ۔۔۔؟ آپ نے خودکشی کی دھمکی دی تھی۔۔۔ آپ کے بعد میں جی کر بھلا کیا کرتی۔۔۔؟؟

لیکن اسے کیا کہا جائے کہ تم خود اب خودکشی کرنے لگی ہو۔ کبھی آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھا ہے۔ مجو چاچا کہہ رہے تھے کہ تمہیں ان کے کلینک میں داخل کرا دوں۔۔۔۔

رہنے دیجئے یہ مُنہ دیکھے کی باتیں اور جو بچے ابھی خاصی تو ہوں۔ مجھے کیا ہوا ہے۔ اگر میں کلینک میں داخل ہو گئی تو پھر آپ کے کھانے پینے کا کون خیال رکھے گا۔ ایک آیا کی طرح ایک بچے جیسا تو آپ کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔۔۔۔

اوہ ۔۔۔!! بہت خوب تمہارے ملنے سے پہلے اور اس گھر میں تمہارے قدم آنے سے پہلے شاید تم ہی میرا خیال رکھا کرتی تھیں ورنہ میں زندہ نہ رہ پاتا۔ ۔۔۔۔ کیوں یہی بات ہے نا۔۔۔۔؟؟ دیوانی کہیں کی۔۔۔۔

اچانک کتوں کے بھونکنے کی مسلسل آوازیں مجھے پھر اُسی تاریک قفس میں دوبارہ لے آتی ہیں جہاں در و دیوار پر وہ ساری تصویریں رات کے سیاہ اندھیرے میں چھپ گئی ہیں۔ جیسے میرا وجود محرومیوں اور ناآسودگیوں کے اندھیروں میں غرق ہو کر رہ گیا ہے۔ ان تصویروں کا عکس آج بھی میرے ذہن کے پردوں پر محفوظ ہے۔ اور میں تاریکیوں کے باوجود ان کے جلتے بجھتے دھندلکوں میں دیکھ رہا ہوں۔ یہ جو تصویر ہے۔ ہم دونوں کی ہے۔ زیادہ قربت سے ایک دوسرے سے چپکے ہوئے۔ جیسے ایک [illegible] قالب۔ اُس وقت ہماری شادی نہیں ہوئی تھی۔ دوسری جو تصویر ہے [illegible] سے [illegible]۔ لیکن چہروں پر فکر و تردد کے رنگ بکھرے ہوئے ہیں۔ یہ شادی کی [illegible] تھی [illegible]۔ تیسری جو تصویر ہے وہ [illegible] تھی جب اُس نے وقت پر [illegible] کے سبب ایک مردہ بچے کو جنم دیا تھا۔ اور خود بھی ماننا

کی دہلیز پر [illegible] ساتھ ہم [illegible] تھی۔ لیکن قدرت نے اُسے میرے پاس واپس بھیج دیا تھا میری مسرت کی یادگار تھی یہ۔ تیسری تصویر۔ اور آخری تصویر تھی وہ [illegible] سے ادا ہوئی [illegible] کوئی [illegible] اور [illegible] سکوت و مسرت [illegible]۔۔۔۔ یہ تصویر میرے ذہن میں اس طرح نقش ہو گئی ہے کہ میں ذہن کو ریزہ ریزہ بھی کر دوں تو شاید ہر ریزے پر یہ تصویر ملے گی۔۔۔۔۔

ایک دن میں نے اُس سے بڑا اصرار کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ اپنے میکے چلی جائے، یا پھر مجو چاچا کے کلینک میں شریک ہو جائے تاکہ میں کچھ دن سکون سے مستقبل کی تعمیر میں صرف کر سکوں تو وہ کہنے لگی۔۔۔۔

یہ شیخ چلی کی طرح منصوبے بنانا چھوڑ دیجئے۔ منصوبہ جتنا بڑا ہو گا اُس کی ناکامی پر اتنا ہی بڑا دکھ بھی ہو گا۔ آپ صاف کیوں نہیں کہتے کہ آپ مجھ سے چھٹکارا پانا چاہتے ہیں یا میرا بوجھ نہیں اٹھا سکتے، تو پھر میں کہیں بھی چلی جاؤں گی۔ آپ مجھے طلاق بھی تو دے سکتے ہیں۔ یقین کیجئے مجھے کوئی شکوہ نہ ہو گا۔ ویسے مجھے بھی یہ یقین ہو گیا ہے کہ آپ کا اور میرا ساتھ زیادہ دنوں تک نہیں نبھ سکتا۔ مشکل تو یہ ہے کہ آپ خود کچھ کرنے کی بجائے کبھی قسمت پر بھروسہ کرتے ہیں، کبھی لوگوں سے آس لگائے رہتے ہیں یا پھر قرض دینے والوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ بھلا ایسے بھی کوئی زندگی سے نباہ کرتا ہے۔ آپ کی بجائے اگر میں مرد ہوتی تا۔۔۔

بس بس۔ اپنی یہ بکواس بند کرو۔ مجھے سب پتہ ہے۔ مجھے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔ تمہاری نصیحتوں کی کوئی ضرورت نہیں۔۔۔۔ کبھی۔۔۔ میرے اس تلخ و ترش لہجے کو سن کر وہ چپ ہو جاتی۔ لیکن میں رہ رہ کر سوچتا رہتا۔ اگر نوکری چھوٹ جانے کے بعد [illegible] کے بیوی بچوں کو [illegible] باہر چلا جاتا تو [illegible] اور دوسرے کئی لوگوں کی طرح ہزاروں کا مالک بن جاتا۔ پھر اسے بھی اپنے پاس بلا لیتا۔ لیکن ان دنوں وہ بہت بیمار تھی۔ اگر میں اُسے تنہا چھوڑ کر چلا جاتا تو کوئی پرسانِ حال نہ پا کر شاید وہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتی۔ دکھ تو اس بات کا بھی ہے کہ [illegible] سے میں نے جو بھی کام کیا اُس میں گھاٹا ہی ہوتا رہا۔ ہر نقصان اور ہر گھاٹے پر وہ پیچ و تاب کھاتی۔۔۔۔

[illegible] آپ [illegible] کون سا کام کر سکتے ہیں۔ ہر کام میں گھاٹا ہر کام میں

نقصان .... کبھی کبھی تو ناتجربہ کاری کا لبادہ اوڑھنے کو دل چاہتا ہے جیسے
آپ ... دیکھ رہے ہیں۔ لیکن پھر بھی وہ تربیت یافتہ کبوتروں کی
طرح سگریٹ کے ساتھ واپس آجاتی ہیں۔ کہہ دیجئے کہ یہ بھی ناتجربہ کاری کا
کیا دھرا ہے۔ میں الجھ رہا ہوں کہ آخر آپ ایسا کام کیوں کرتے ہیں
جو ... اور ... نہ ہو سکے .....

اچھا۔ یہ تم ہی بتاؤ میں کیا کروں ___ ؟؟

کیا کروں؟ .... ارے انسان چاہے تو بہت کچھ کر سکتا ہے
لیکن ایک شخص جب کچھ کرنا نہ چاہتے ہوں تو آخر کوئی کیا کرے ___ آپ یہ
کیوں نہیں سمجھتے کہ آپ پر دھن سوار ہے یہاں سے نکل بھاگنے کی۔ دلوں
سے فرار ہو جانے کی اور مجھ سے چھٹکارا حاصل کرنے کی ..... آخر یہ
... سے ... دور ہو سکیں۔ ... کر سکیں اور قید سے آزاد ہو سکیں۔

چپ رہو۔ خدا کے لئے۔ تم اپنی یہ بکواس بند کر دو۔ تمہاری ان
بکواسوں کی کسیلی باتوں سے تو دل دکھتا ہے۔ تم پتہ نہیں آخر کیسی عورت
ہو۔ کیسی بیوی ہو اور کیسی رفیقِ حیات۔ بجائے تسلی دینے، امید بندھانے
اور حوصلہ مضبوط کرنے کے۔ نہ جانے کیا الٹی سیدھی ہانکنے لگتی ہو۔
جی چاہتا ہے .... تم سے بات کرنے کی بجائے صرف خاموشی اختیار
کی جائے۔ دیوار سے اپنا دکھ درد بیان کیا جائے۔ اگر وہ کچھ سن نہ سکیں
تو کم از کم تمہاری طرح نشتر زنی تو نہیں کریں گے ....

کچھ دنوں بعد CONFIGURATION کے ساتھ دوسرے سارے
ضروری کاغذات آ گئے تھے لیکن میں نے اُسے کچھ بھی نہ بتایا۔ اب کچھ
اس سے چھپا رہا تھا۔ اس سے کچھ پوچھنا بھی گوارا نہ تھا۔ میں نے سوچ
لیا تھا کہ جس روز بھی ٹکٹ کا انتظام ہو جائے گا۔ اسی دن میں اُسے
اپنے ایک دوست کے رشتہ دار کے پاس لے جا کر چھوڑ آؤں گا۔ فنڈ میں سے
جو کچھ روپے بھی بچ رہے تھے وہ اس کے ہاتھ میں دے دوں گا اور خود
ہندوستان چھوڑ دوں گا۔ یہ بھی ضروری ہے کہ اگر یہاں قسمت نے ساتھ نہ
دیا تو کہیں باہر ... نہ ... !

سگریٹ ختم ہو چکا تھا۔ کمرہ دھوئیں سے بھر گیا تھا اور تمباکو کی
تیز بو ... میں ... بس گئی تھی۔ اس وقت اگر وہ ہوتی تو کمرے میں
سانس بھی نہ لے سکتی .... کبھی ضد اور کبھی جانفشانی کرتے ہیں کہ
آئی ہے اور میں بستر پر نیم دراز سا لیٹا لیٹا تھک کر سگریٹ کی خواہش میں
الماری کو ٹٹولنے لگتا ہوں۔ اگر وہ سگریٹ میرے ہاتھ سے
چھین کر کپڑوں کی تہوں میں چھپا دیا کرتی تھی ... [illegible]
لگتا ہوں۔ یہ دیکھئے، دیکھئے اس کو ایک جگہ ...
پر کتابوں میں ٹک جاتی ہے ___ یہ اس کی پرانی ... کثرتِ
استعمال سے پرانے ہو کر تنگ کر چکی ہیں۔ یہ اس کے کپڑے ہیں
جو اکثر جگہ سے پھٹے ہوئے ہیں ___ اور یہ اس کے ... ہیں جو
... گئے ہیں، تاکہ انہیں بیچ کر رقم بچائی جا سکے۔ یہ خواہش
اور وارفتگی سے ایک ایک چیز کو ٹکڑوں سے ... رہا ہوں ...
... رہ رہ کر اس بات کا احساس رہتا ہے کہ اگر اُسے جانا تھا تو کم از کم
میرا انتظار تو کر لیتی میں اُسے نہ روک پاتا نہیں، اُسے روک لینے کے
جتن تو کر سکتا تھا۔ ایک ... کا ... پر کوئی رو بھی سکتا ہے لیکن
ہمیشہ کا رونا شاید مجھ جیسے سخت جان ہی رو سکتے ہیں۔ اسی تلاش اور
محویت میں کپڑوں کے درمیان سے کسی چیز کے کھٹ سے گرنے کی آواز آتی
ہے سگریٹ کی ڈبیا مل جانے کی حسرت میں میں فرش پر جھک ... پڑتا ہوں
وہ کوئی لفافہ دکھائی پڑتا ہے۔ میں چونک کر اٹھا لیتا ہوں اور تیزی سے
لفافہ کھول کر بے تابی سے پڑھنے لگتا ہوں ....

میں سمجھتی کہ آپ میرے ہیں۔ اسی ایک سہارے سے
سانس کی ڈوری باندھ رکھی تھی۔ لیکن جب یہ معلوم ہو کہ
آپ مجھے غیر سمجھ کر مجھ سے بھی رازداری برت رہے ہیں تو
مجھے کسی طرح یقین نہ آیا۔ لیکن اچانک ایک دن پاسپورٹ
ویزا اور دوسرے ضروری کاغذات پر نظر پڑی تو بے حد دکھ
ہوا۔ آہ ___ !! آپ نے مجھ کو آخر غیر ہی کیا۔ اسی لئے تا
کریں آپ کو ٹوکتی تھی۔ منع کرتی تھی۔ کبھی کبھار کچھ ایسا بھی
کرنے لگ جاتی .... کیوں؟ آخر کیوں؟ کبھی اس سوال
پر بھی آپ نے غور کیا ___ ؟ نہیں ___ !! آپ نے میری محبت،
میرے جذبے اور میری فکر ... کو کبھی نہیں سمجھا۔ آپ سے
دور ہو جانے، بچھڑ جانے اور نظروں سے اوجھل ہو جانے
کے تصور سے ہی میرا دل بیٹھنے لگتا۔ ... دنیا
میں آپ بہاروں کی تلاش میں بھٹکتے رہے ... کہ
تلاش میں ... [illegible]
[illegible]
[illegible]

مجھے یقین ہے کہ شاید خودکشی کر جانے کے بعد بھی [illegible]
کی وجہ سے آپ نے خواب میں مجھے بلا لیا چاہا بھی ہو
کر رکھی ہے تاکہ میں کچھ نہ بتلا سکوں۔ چلئے اب میں نے بھی سوچ
لیا ہے کہ کچھ نہیں بتلاؤں گی۔ آپ کی خوشیوں کو برباد نہیں
کر سکتی تو مجھے یقین ہے کہ آپ کی تمام خوشیوں کو خاک میں
ملا دیں۔ آپ کو تو کبھی بھی ستاتی تھی کہ آپ چپ چاپ رہ جاتی تھی
تو یہ بھی محسوس ہوتا تھا [illegible]
کے احساس اور [illegible] سے مگر اپنے دل کی بھڑاس
نکال لیتی تھی۔ ایسا کر لینے کے بعد کچھ لمحہ ہی سہی مجھے یک گونہ
سکون تو مل جاتا تھا۔ لیکن آپ کی خاموشی نے مجھ سے یہ سہارا
بھی چھین لیا۔ یہ غم و اندوہ یہ دکھ شاید باعث میرے
ذہن و دل میں رنج بھرتی رہی اور پھولتی رہی۔ نتیجتاً میرا
دل ایک آتش پھوڑا ہو کر رہ گیا۔ پچھلے دنوں سرکاری ہسپتال
کے ڈاکٹر نے کہا کہ میں فوراً ہسپتال میں شریک ہو جاؤں ورنہ
کسی بھی وقت مجھے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن میں آپ کے
لئے سنگِ راہ بننا نہیں چاہتی تھی۔ میں تو یہ چاہتی تھی کہ
مجھے جلد سے جلد کچھ ہو جائے تاکہ آپ کو اپنے دل کی مراد
مل جائے۔ آپ مجھ سے بے فکر ہو جائیں اور آپ کی منزل
آپ کو مل جائے......

پچھلے کئی دنوں سے آپ اتنے کچھ مصروف رہے ہیں کہ جب
گھر لوٹتے تو میں سو چکی ہوتی اور جب گھر سے نکلتے میں سوئی
ہوتی۔ اس طرح میں بڑی آسانی سے موت کی طرف
تیزی سے بڑھتے ہوئے اپنے قدموں کو آپ سے چھپاتی رہی
ورنہ آپ کا کیا بھروسہ جو [illegible] کوششوں کے [illegible]
[illegible] یقیناً سنگِ راہ بن جاتا۔ آج جب صبح سے خون
اُبل پڑا تو میں نے بڑی مشکل سے اُسے باتھ روم میں جا کر
بہا لیا [illegible] بڑی حسرت سے آپ کے بارے میں
سوچتی رہی [illegible] آپ کو دوبارہ دیکھنا مجھے نصیب نہ ہو۔
آپ جب شام کو گھر لوٹیں گے تو [illegible] کی طرح
[illegible] کی سانسیں [illegible]

نہ دینا۔ کیونکہ میری خبر...... جی تو چاہتا تھا کہ جی بھر کے
آپ کو شرمندہ کروں تاکہ آپ کی باتوں میں [illegible] نکلے
یا کاش آپ جلد لوٹ آتے تاکہ آخری بار تو آپ کو جی بھر
دیکھ لوں۔ اور آسانی سے دم نکل جائے۔ لیکن افسوس
ہوتا ہے [illegible] یہ آرزو بھی حسرت
بن کر میرے ساتھ ہی دفن ہو جائیں گی...... خدا
کرے کبھی شاید مجھ پر رحم نہیں آتا.... کیا کروں کہاں
جاؤں کہاں سے لاؤں تاکہ آپ کو.....!!

خط جیسے انگارہ بن کر میرے ہاتھوں میں دہکنے لگتا ہے اچانک میری نظروں میں منظر گھوم جاتا ہے۔ میں ایک بالکنی کے سامنے میں یہ منظر دیکھنے لگتا ہوں.... کہ میری جیب میں [illegible] کے ٹکٹ پڑے ہیں جو حشمت نے مجھے لا کر دیئے تھے اور کہا تھا۔

"جانتے ہو۔ میں تمہیں ٹکٹ کیوں دے رہا ہوں۔ اگر میں نے تمہیں ٹکٹ نہ دیئے ہوتے تو شاید تم ان روپوں کو خرچ کر ڈالتے یا پھر بیمار بیوی پر لٹا ڈالتے۔ چلو اب جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ تمہیں صبح کی پہلی کرن کے ساتھ بمبئی کے لئے گاڑی پکڑنا ہے۔ پھر وہاں سے [illegible] پہنچ جاؤ گے"

میں حشمت سے ٹکٹ لے کر [illegible] چلا گیا [illegible] اس دنیا میں انسان بستے ہیں اور دوست بھی دوستی [illegible] میں پیچھے نہیں ہٹتے۔ میں خوشی و مسرت اور بے پناہ و ناقابلِ بیان خوشی سے سرشار ہو کر جیب میں ٹکٹ ٹٹولنے لگتا ہوں۔ تاکہ اُسے یہ خوشخبری سناؤں لیکن دیکھتا ہوں کہ گھر لوگوں سے بھرا ہوا ہے۔ آس پاس کے لوگ، عزیز رشتہ دار اور اُس کے ماں باپ بھی گھر میں موجود ہیں۔ مجھے دیکھ کر سب کی نظریں ایک ساتھ اٹھتی ہیں۔ سب کی نظروں میں ایک عجیب سی کیفیت اور ایک عجیب سا جذبہ چھپا ہوا ہے۔ میں دوڑ کر اندر پہنچتا ہوں اور گھبرائی ہوئی آواز میں اُسے آواز دیتا ہوں۔ لیکن وہ بہت دور [illegible] جا چکی ہے ہمیشہ کے لئے۔ صرف [illegible] اُس کا مردہ جسم سفید چادر سے ڈھکا ہوا بستر پر [illegible] بکھرے ہیں اور [illegible] فضا معطر ہو رہی ہے.....!!

شاہد رضوی

قرض

وہ مرا جسم ہو
یا
تمہارا جسم ہو
یا
کسی تیسرے شخص کا
سارے جسموں سے چمٹے ہوئے ہیں یہاں
اَن گنت خونی جونکوں کے کالے بدن

یہ بدن
زندگی کے ہر اک موڑ پر
خوشبوؤں کا بدن اوڑھ کر
میرے، تیرے، ہر اک تیسرے شخص کے جسم سے
آرزوؤں، اُمیدوں، اُمنگوں
کا
سارا لہو
چوس لیتے ہیں کچھ اس طرح
جس طرح
میرے، تیرے، ہر اک تیسرے شخص کے جسم پر
یہ لہو قرض ہو — !

عبدالقادر ادیب

میرا شہر (بنگلور)

روش در روش
پھول پتے شجر
جن میں شامل ہے
میرا بھی خونِ جگر

چمن در چمن
پھول کا بانکپن
اور کلیاں بھی
جیسے دمکتے ہوئے آئینے
جن پہ برسے نہ نفرت کے سنگِ گراں
اور تعصب کا پھیلا نہ کالا دھواں
یہ زمیں سازشوں کی خزاں سے بچی
اور مہکتی رہی
تا ابد یہ مہکتی رہے گی یوں ہی۔

انتخاب

مجتبیٰ حسین

سلام مچھلی شہری

شاعری کا سائنسداں

۲۶ جنوری کے اخبارات میں یہ خبر چھپی کہ سلام مچھلی شہری کو حکومت ہند نے "پدم شری" کا اعزاز عطا کیا ہے۔ ۲۷ جنوری کو انہیں مبارکباد دینے کی غرض سے میں نے ان کے آکاش وانی کے دفتر کو فون کیا۔ ٹیلیفون کا ریسیور جب دوسری طرف اٹھایا گیا تو میں نے یہ جاننے کے لئے کہ ٹیلی فون کا ریسیور اٹھانے والے صاحب کیا سلام مچھلی شہری ہی ہیں میں نے سوالیہ انداز میں پوچھا: "سلام بھائی" دوسری طرف سے فوراً آواز آئی "وعلیکم السلام بھائی" میں نے اپنے لہجہ کو مزید سوالیہ بناتے ہوئے پھر پوچھا —— "سلام بھائی؟"

دوسری طرف سے پھر آواز آئی "وعلیکم السلام بھائی! کہہ تو دیا ایک بار آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟"

میں نے کہا: "سلام مچھلی شہری ہی ہوں گے وہاں؟"

آواز آئی: "ہاں بول رہا ہوں۔"

میں نے کہا: "یہی تو میں کب سے پوچھ رہا ہوں اور آپ صرف وعلیکم السلام کہہ کر مجھے ٹالے جا رہے ہیں۔"

سلام صاحب بولے: "بھئی معاف کرنا۔ میں نے سمجھا کہ آپ سلام کر رہے ہیں۔ میں نے پہچانا نہیں۔ مگر آپ کون بات کر رہے ہیں؟"

میں بولا: "بھئی مجتبیٰ ہوں مجتبیٰ۔"

بولے: "کون سے مجتبیٰ۔ سیاست والے؟"

میں نے کہا: "ہاں بالکل ٹھیک سمجھا آپ نے۔"

انہوں نے میری آواز کو پہچانتے ہوئے بڑے تپاک سے کہا: "ارے یار! تم ہو مجتبیٰ پہیلیاں کیوں بجھوا رہے ہو۔ یہ کیوں نہیں کہا کہ آپ کا مجتبیٰ بول رہا ہے۔"

میں نے کہا: "میں نے تو صرف آپ کو مبارکباد دینے کے لئے فون کیا تھا لہٰذا میری مبارکباد قبول کیجئے۔"

انہوں نے ہنس کر کہا: "میں اس اعزاز کو پا کر تھوڑا اکسائیٹڈ ہو گیا ہوں۔ صبح سے سیکڑوں ٹیلیفون آ رہے ہیں مبارکباد کے فون آ رہے ہیں۔ اچانک زندگی میں جیسے چہل پہل ہو گئی ہے تم ہی سوچو جیسے سیدھے سادے آدمی کی زندگی میں اچانک ایک ہنگامہ برپا ہو جائے تو کیا وہ نروس نہ ہو جائے گا۔ ایمان سے کہو اور پھر سچی بات تو یہ ہے کہ میں اتنے بڑے اعزاز کے قابل نہیں تھا۔ یہ اعزاز تو میرے لئے ایک ذمہ داری بن گیا ہے مجھے اب اپنے سے زیادہ اس اعزاز کی فکر ہو گئی ہے۔" یہ کہتے ہوئے ان کی آواز مسلسل تھرتھرا رہی تھی۔

میں نے کہا: "سلام بھائی چالیس سال تک نان اسٹاپ شاعری کرنے کے لئے آپ کا یہ انکسار کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ میں تو کہتا ہوں کہ یہ اعزاز آپ کو بہت پہلے ملنا چاہیئے تھا۔"

وہ مزید تھرتھراتی ہوئی آواز میں بولے: "یار کیوں مزاح نگاری کرتے ہو۔ میں سچ مچ اس اعزاز کے قابل نہیں تھا۔"

پھر اُن سے تھوڑی دیر تک رسمی بات چیت ہوئی مگر وہ بڑے بوکھلائے ہوئے تھے یوں بھی بے چین اور مضطرب رہنا اُن کی بڑی پرانی عادت ہے۔ مجھے یاد ہے کہ اگست ۱۹۶۶ء میں جب ان سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی تب بھی وہ مضطرب اور بے چین سے تھے حالانکہ اس وقت انہیں کوئی پدم شری نہیں ملا تھا ——

اصل وجہ یہ ہے کہ وہ بڑے جذباتی واقع ہوئے ہیں زندگی میں کہیں بھی ذرا سی اونچ نیچ ہو جائے تو وہ ذہنی طور پر منتشر ہو جاتے ہیں، اور گھنٹوں کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں۔ میں نے انھیں جب بھی دیکھا اضطراری حالت میں دیکھا۔ سلام مچھلی شہری جب بھی ملیں گے پہلے "سلام" کریں گے پھر ملتے ہوئے گرمجوشی کا یوں مظاہرہ کریں گے کہ "مچھلی" بن جائیں گے۔ اور اس سارے مرحلے سے گزرنے کے بعد تب کہیں "شہری" بن جائیں گے۔ اُن کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے دوستوں سے ٹوٹ کر ملتے ہیں بلکہ اتنا ٹوٹ کر ملیں گے کہ ملنے والا خود ٹوٹنے کی منزل پر پہونچ جائے۔ میں خود دو ایک بار ان کے ہاتھوں ٹوٹتے ٹوٹتے بچا ہوں۔ وہ اپنے ملنے والے سے بغلگیر کیا ہوتے ہیں اچھی خاصی کشتی لڑتے ہیں سلام صاحب سے کئی ملاقاتیں ہوئی ہیں اور ہر ملاقات کے بعد میں ان کی سادہ لوحی، نیک نفسی، معصومیت، اور شرافت کا قائل ہو گیا ہوں،

وہ اُردو کے اُن چند بدنصیب شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے اپنی شاعری کے علاوہ شراب نوشی سے بھی شہرت حاصل کی۔ مجاز۔ اختر شیرانی اور نرلش کمار شاد کو شراب نے پی لیا اور خدا کا شکر ہے کہ سلام صاحب شراب کے چنگل سے بچ کر نکل گئے۔ اب یہ "مخلص شرابی" ایک "مخلص شاعر" بن گیا ہے۔ میں نے ایک بار اُن سے پوچھا تھا "آپ نے شراب پہلے شروع کی یا شاعری؟" وہ بولے نہیں! میں نے شاعری پہلے شروع کی۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ انھوں نے پیدا ہوتے ہی زیادہ وقت ضائع کئے بغیر شاعری شروع کر دی ۱۹۲۱ء میں وہ مچھلی شہر میں پیدا ہوئے اور ۱۹۳۵ء میں اُن کی پہلی نظم "نیرنگ خیال" میں چھپی۔ گویا وہ ۴۰ برس سے شعر کہہ رہے ہیں، انھوں نے اتنی ساری نظمیں اور غزلیں کہی ہیں کہ اگر آج کوئی اُن کے ہی سامنے ان کی ہی کوئی پرانی نظم سنانا شروع کر دے تو وہ اُس پر بے ساختہ داد دینے لگ جائیں گے۔ یوں بھی یادداشت کے معاملے میں خاصے کچے واقع ہوئے ہیں جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں وہ ہمیشہ مضطرب اور کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں، اور اس کیفیت میں ان سے بعض دلچسپ حرکتیں بھی سرزد ہو جاتی ہیں۔ گھر میں بھی اُن کا یہ حال ہے کہ جب وہ تولیہ مانگتے ہیں تو اُن کے بچے انھیں بنیان دیدیتے ہیں۔ اس میں بچوں کا کوئی قصور نہیں قصور تو سلام صاحب کا ہی ہوتا اُن کے ذہن میں بنیان ہوتی ہے۔ مگر منہ سے تولیہ نکلتا ہے وہ جوتا مانگیں تو انھیں ٹوپی پہنا دی جاتی ہے اور ٹوپی مانگیں تو انھیں جوتے پہنا دیے جاتے ہیں۔ اُن کی بدحواسی کے بڑے قصے مشہور ہیں ایک بار اپنی محبوبہ کے نام خط لکھا اور اسے اپنی بیوی کے پاس بھیج دیا اور بیوی کے نام جو خط تھا وہ اپنی محبوبہ کو بھیج دیا۔

سلام صاحب نے ابتدائی تعلیم فیض آباد میں حاصل کی۔ اُن کی ساری زندگی ایک مسلسل جدوجہد کا نام ہے۔ وہ مچھلی شہر کے ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے اور آج بھی غریبی اُن کے لاشعور میں چھپی بیٹھی ہے۔ الہ آباد یونیورسٹی کی لائبریری میں ابتدائی ملازمت اختیار کی اور اس کے بعد ۱۹۴۳ء میں آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ سے وابستہ ہو گئے۔ اور آج تک ریڈیو سے اُن کی وابستگی برقرار ہے۔ ان کی زندگی اور شاعری کا اہم ترین دور وہیں سے شروع ہوتا ہے انھوں نے ایک رومانی انقلابی شاعر کی حیثیت سے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا برطانوی اقتدار کے خلاف بے شمار نظمیں کہیں اور جیل میں جاتے جاتے رہ گئے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ لکھنؤ میں گذارا ہے اور اس "شہر نگاراں" کی گہری چھاپ اُن کی شاعری اور شخصیت پر موجود ہے۔ اُن دنوں لکھنؤ ترقی پسند تحریک کا اہم مرکز تھا یہیں اُن کی ملاقات مجاز سے ہوئی اور یہ ملاقات ایسی گہری دوستی میں تبدیل ہو گئی کہ ادبی حلقے ان دونوں کو "جڑواں شاعر" کے نام سے پکارنے لگے۔ مجاز کی دوستی کی بے شمار خوشگوار یادیں ان کے ذہن میں محفوظ ہیں وہ اب بھی مجاز کی بذلہ سنجی اور حاضر جوابی کے قصے سناتے ہیں تو آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں سلام مچھلی شہری اُردو نظم کی تکنیک میں جتنے تجربے کئے ہیں اتنے تجربے شاید ہی کسی شاعر نے کئے ہوں۔ یوں سمجھئے کہ انھوں نے "نظموں کی ایک لیبارٹری" قائم کر رکھی تھی اور اس میں نت نئے تجربے کیا کرتے تھے ان کی ہر نظم کی تکنیک اُن کی دوسری نظموں کی تکنیک سے مختلف ہوتی ہے میں تو انھیں "اُردو شاعری کا سائنسداں" کہتا ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ اپنی ہر نظم کو "امتحانی نلی" میں ٹیسٹ کرتے ہیں اور کامیابی جانچ پڑتال کے بعد اسے ادب میں لے آتے ہیں۔ جدید اُردو شاعری میں آج [illegible] ہے کہ سلام

مچھلی شہری آنندوت شاعری صاحب کے نام اور مشہور نام ہے
ان کے نام کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس سے مچھلی شہر کو جتنی شہرت
ملی ہے اتنی خود ان کے نام کو بھی نہیں ملی۔ مختلف لوگ انہیں
مختلف ناموں سے پکارتے ہیں جس دن اخبار میں انہیں پدم شری
ملنے کی خبر شائع ہوئی اس دن میرے ایک پنجابی دوست نے جو
اُردو شاعری سے واقف نہیں ہے مجھ سے کہا تھا یار اس بار
حکومت نے کسی مچھلی کو بھی پدم شری کا اعزاز عطا کیا ہے۔ آخر
ایسی کیا بات ہوگی اس مچھلی میں ؟"

اپنے نام کی وجہ سے وہ بدنام بھی ہو جاتے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو
دہلی کی کینٹین میں ایک بیرا ہے جسے سلام صاحب کا نام یاد نہ ہو سکا
ایک دن انھوں نے فون کر کے کینٹین سے چائے منگوائی تو اسی نے
لاکر پوچھا: "مچھلی صاحب کیا آپ نے چائے منگوائی ہے۔؟"
انھوں نے ٹوکا: میاں! میرا نام مچھلی نہیں ہے۔ میرا نام سلام
مچھلی شہری ہے۔ آئندہ ایسی غلطی نہ کرنا"

دوسری بار انھوں نے چائے منگوائی تو اس نے آکر پوچھا سلام
شہری صاحب آپ نے چائے منگوائی ہے۔؟

اب کی بار پھر انھوں نے ٹوکا تو وہ پریشان سا ہو گیا اس
نے نام کو یاد کرنے کی پوری کوشش کی مگر جب دوسرے دن وہ
پھر چائے لے آیا تو پوچھنے لگا "جناب شہری مچھلی آپ نے چائے
منگوائی ہے" سلام صاحب بپھر گئے اور کہنے لگے "تُو مجھے شہری
مچھلی کہتا ہے۔ دریائی مچھلی کہیں کا۔ کتنی بار کہا کہ سلام مچھلی شہری کہو مگر
تم ہر روز ایک نیا نام مجھے دیتے رہو۔

بیرے نے کہا: حضور میں خود آپ کے نام کی وجہ سے بڑا
پریشان ہو گیا ہوں۔ کینٹین کا سارا کام چھوڑ کر میں صرف آپ کا نام یاد
کرتا رہتا ہوں۔ اور ہر بار نہ جانے کیوں میرے منہ سے "شہری مچھلی"
پھسل کر آجاتی ہے۔ اب آپ مجھ پر زیادہ جبر نہ کیجئے اور مجھے آئندہ
بھی آپ کو اسی نام سے پکارنے کی اجازت دیجئے ورنہ میں پاگل
ہو جاؤں گا"

سلام صاحب بہنس کر خاموش ہو گئے اور آج تک بھی یہ
بیرا انھیں "شہری مچھلی" کہہ کر پکارتا ہے۔
سلام صاحب [illegible] آدمی ہیں۔
بلیوں نظمیں [illegible] ڈال دیتے ہیں یہ استعمال ہوتے ہیں مگر یہیں
اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ان کی نظموں سے کبھی چائے گرم کی جاتی ہے
اور کبھی نظمیں زیادہ ہوں تو کھانا بھی پکایا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ
گھر میں جب کبھی کوئی لذیذ سالن پکتا ہے تو میں یہ جان لیتا ہوں کہ
ضرور یہ میری نظموں کے مسودوں سے پکایا گیا ہے۔ ورنہ صرف
سالن تو اتنا ذائقہ دار نہیں ہو سکتا۔

سلام صاحب کی زندگی اور اُن کی شاعری میں زمین آسمان
کا فرق ہے زندگی کے کئی حادثات اور سانحات سے گزرنے کے
باوجود آج بھی اُن کا نظریۂ حیات رومانی ہے۔ ان کی نظموں میں
آپ کو آئینہ "سانپ، چاند اور شبنم کے symbols جگہ جگہ نظر
آئیں گے حالانکہ اُن کی ذاتی زندگی دکھوں اور مصائب سے عبارت
ہے۔ ایک سال پہلے وہ "نروس بریک ڈاؤن" کے بھی شکار ہو گئے تھے
اور طویل عرصے تک علیل رہے۔ زندگی کے آغاز سے لے کر اب تک انھوں
نے صرف مصائب ہی جھیلے ہیں۔ ہر حادثے کے بعد ایک نئے حادثے
کا انتظار کیا ہے۔ مگر اپنی شاعری کو ہمیشہ ان حادثوں سے محفوظ
رکھا ہے۔ "پدم شری" کا اعزاز پانے کے بعد وہ پھر علیل بھی ہو گئے تھے
ہو گئے ہیں۔ لوگ انھیں مبارکباد دے رہے ہیں۔ اور وہ "نروس"
ہوتے جا رہے ہیں۔

سب سے اہم مشکل تو یہ ہے کہ وہ اب تک اپنی بوڑھی ماں کو
یہ سمجھا نہیں سکے کہ "پدم شری" کیا ہوتا ہے وہ اسے عہدہ سمجھتی ہیں
اور یہ بھی کہتی ہیں کہ ان کے بیٹے کو خوب دولت ملے گی۔

سلام صاحب اپنی ماں کو سمجھاتے ہیں کہ:
"ماں! یہ تو صرف ایک اعزاز ہے اس سے صرف میری
عزت میں اضافہ ہوگا"

اور ماں کہتی ہیں:
بیٹا! اب تجھے عزت کی کیا ضرورت ہے، وہ تو تجھے مل گئی۔
اتنی ساری عزت لے کر تو کیا کرے گا۔ اب ذرا دولت کی فکر کر
تاکہ بچوں کے ہاتھ پیلے کر سکے۔

(روزنامہ سیاست حیدرآباد)

ڈراما

سلام بن رزاق

دعوت

مرد۔ دیکھو پونے سات بج رہے ہیں (اندر) اور بیگم ابھی تک باتھ روم سے باہر نہیں نکلیں (بلند آواز سے) ارے بیگم سنتی ہو۔ پونے سات ہو گئے ہیں۔ آخر ناشتہ کب چُنا جائے گا۔ سات بجنے میں صرف چند منٹ باقی رہ گئے ہیں۔

عورت۔ ہاں یہاں کوئی بے کار تو بیٹھی نہیں ہوں [illegible] دس سے زیادہ چیزوں کی فرمائش اور یہ دو ہاتھ۔ آخر کوئی مشین تو نہیں ہوں۔

مرد۔ میں کب کہہ رہا ہوں کہ تم بے کار بیٹھی ہو۔ مگر ذرا جلدی کرو۔ صاحب وقت کے بڑے پابند ہیں۔ وہ ٹھیک سات بجے یہاں آ جائیں گے۔ نہ ایک منٹ ادھر نہ ایک منٹ اُدھر۔

عورت۔ ہاں، ہاں میں جانتی ہوں۔ آپ کے سبھی صاحب وقت کے بڑے پابند ہوتے ہیں۔ اور ساتھ ہی اپنے وعدے کے بھی۔ وہ پچھلے سال کے شرما صاحب بھی پچاس روپے کی پارٹی نگل گئے اور آپ کو سال بھر تک ٹرخاتے رہے۔ نہ کوئی انکریمنٹ، نہ کوئی پروموشن ....

مرد۔ (گھبرا کر) ہائیں بھاگیہ وان! ذرا دھیرے بولو کہیں صاحب آ جائیں۔

عورت۔ آنے دو۔ میں کیا ان سے ڈرتی ہوں۔ زبان تو بادشاہ بھی نہیں روک سکتا۔ اور پھر میں کون جھوٹ بول رہی ہوں۔ سچی بات تو پھانسی کے تختے پر بھی کہہ دوں گی۔

مرد۔ (جلدی سے) ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ واقعی وہ شرما صاحب جھوٹے نکلے۔ مگر یہ گلکرنی صاحب بڑے دیالو ہیں۔ اور خاص طور پر مجھ سے تو بہت خوش ہیں۔ اس دعوت کے بعد سمجھو کہ اگلے مہینے پروموشن یقینی ہے۔

عورت۔ بس بس اب زیادہ گن مت گاؤ۔ تم شرما صاحب کی اس سے زیادہ تعریف کرتے تھے۔

مرد۔ ارے نہیں۔ گلکرنی صاحب پر مجھے پورا بھروسہ ہے۔ ابھی انھیں آئے ایک مہینہ ہی ہوا ہے کہ ان کی خوش اخلاقی اور دیانتداری کے آفس میں چرچے ہیں۔ اتنی جلدی کون آفیسر کسی کلرک کی دعوت قبول کر لیتا ہے۔ مگر کل میں نے جیسے ہی ان سے آج کی چائے کی بات کہی۔ اپنے مخصوص انداز میں مسکرا کر بولے۔ شیور، شیور (sure sure) ہم ضرور آئیں گے۔

عورت۔ اچھا، اچھا۔ اب جلدی سے یہ پلیٹیں اٹھا کر میز پر رکھ دو۔ ورنہ پھر خود ہی چلاؤ گے کہ جلدی جلدی۔

مرد۔ اوہ! یہ رس گُلّے تو بڑے رسیلے نظر آ رہے ہیں: (آواز دبا کر) مسکراتے ہوئے بالکل تمہارے ہونٹوں کی طرح۔

عورت۔ (بناوٹی غصے سے) ہٹو بھی۔ کام کے وقت بھی تمہارا بچپنا نہیں گیا۔

مرد۔ اچھا بیٹھے ہیں اور کیا کیا ہے؟

عورت۔ تم نے جو جو کہا۔ سب تیار ہے۔ رس گلّے، گاجر کا حلوہ، شامی کباب اور بیسن کے لڈو۔ نمکین میں مٹر بھرے سموسے اور دہی بڑے ہیں۔

مرد۔ واہ، واہ، بیگم تمہارا جواب نہیں۔ ذرا لگے ہاتھ چائے کا پانی بھی تیار کر لو۔ میں تب تک یہ سب چیزیں میز پر سجا دیتا ہوں۔ ذرا ٹک کر اسے دیکھو۔ چائے کا پانی تیار کرنے کے بعد تم جلدی سے کپڑے بدل لو۔ ساڑی وہی پہننا جو [illegible]

عورت۔ وہی ایک ساڑی تو ہے [illegible] جو تم نے آج سات برس سے [illegible]

مرد۔ [illegible] نہیں ہے تم کافی [illegible]

کے لیے [illegible] دیکھو چھ بجے ہیں

[illegible]

عورت۔ ہاں ہاں ہو گیا تم نے شکایتیں کرتے کرتے جائے گی کہ گھر والوں کی کوئی خواہش کبھی پوری نہ ہو گی۔ میرے تو بھاگ ہی پھوٹ گئے

مرد۔ تو وہ صرف تمہاری عقل ہے۔ بات سے بات نکالنا تو کوئی تم سے سیکھے۔ سب کچھ تو ٹھیک ہے آخر سب جانتے ہو۔ ذرا صبر کرو — تکلیف کے بعد راحت ملتی ہے۔ قسمت کو کوسنے سے کچھ نہیں ہوتا تم دیکھنا آج کی دعوت کے بعد ......

عورت۔ (بات کاٹ کر) ہاں ہاں آج کی دعوت کے بعد گھر کی دیواروں سے روپیوں کے چشمے پھوٹ نکلیں گے، چھت سے نوٹوں کی بارش ہو گی۔ جانے ان صاحب لوگوں میں تم نے ایسی کون سی خوبیاں پائی ہیں کہ ہر وقت انہی کے گن گاتے ہو ———

مرد۔ (تیز لہجے میں) ارے اب چپ بھی رہو گی کہ نہیں۔ بابو نہیں تو کیا گھر میں جاتا۔ زیادہ آرام چاہتی تھیں تو پہلے ہی کسی بنگلے والے کا ہاتھ کیوں نہ پکڑ لیا۔

عورت۔ (کچھ ہی بالیں گالی مت دو۔ اے میرے نوکرانی کی طرح تمہاری ہر فرمائش پوری کرو۔ تمہارے صاحب لوگوں کے لئے اچھے اچھے پکوان بھی پکاؤ۔ اور اوپر سے کڑوی کسیلی باتیں بھی سنو۔ یہ مجھ سے نہیں سہا جاتا۔ ہاں ———

(دروازے پر دستک)

مرد۔ (آواز دبا کر) ذرا چپ رہو شاید صاحب آ گئے (دروازے کی جانب)

(دروازہ کھلنے کی آواز۔ تین چھوٹے بچوں کا چہکتے ہوئے اندر گھسنے کا شور)

مرد۔ (ہکا بکا کر) ارے ارے گڈو، ببلی، منّو کہاں گھسے جا رہے ہو، ارے منگو کہ تم کیوں چلی آئیں؟

گڈو۔ پاپا! ہم نہیں سے چلی آئیں۔ یہ خوشبو وہاں دروازے پر بیٹھے ہیں اور ہمیں گھنے ماتے ہیں۔

مرد۔ (گھبرا کر) تم سب پر ہاں کو چپ کیا تم بڑی بھوک لگی ہے۔ بس آدھا گھنٹہ کھانا رکھیں ہم اپنے حصے سے کچھ نہ کچھ تمہیں کو دیں گے

گڈو۔ پاپا مجھے بھی اپنا حصہ دیں گے نا؟

مرد۔ ہاں ہاں تمہیں بھی دیں گے بیٹا۔

(منّی اور بچے ایک ساتھ) اور ہمیں پاپا؟

ارے تمہیں بھی دیں گے پاپا [illegible] باغیچے میں جاؤ۔

اب تم مجھ میرے سامنے تک نہیں کھیلو۔

گڈو۔ (معصومیت سے) پاپا! یہ گڑیا بڑی اچھی لگ رہی ہے۔

منّی۔ ہاں پاپا!

مرد۔ (جھنجھلا کر) ارے گڈو کی ماں! ذرا ان بچوں کو تو سنبھالو۔

عورت۔ (منہ چڑا کر) ارے واہ ——— واہ کیسے بچے ہیں۔ کیا میں انہیں اپنے جہیز میں لائی تھی۔

مرد۔ تم جہیز میں نہیں لائی تھیں تو کیا میں انہیں اپنی بارات میں ساتھ لے گیا تھا۔ (بچوں کا "پاپا، پاپا" چلانے کی آواز)

مرد۔ (چلا کر) چپ رہو، کمبختو! چلاؤ گے تو ایک کو بھی دس کا نوٹ نہیں ملے گا۔ سب چپ چاپ باغ میں جاؤ۔ میں تمہارے لئے وہیں رس گلے لاتا ہوں۔ دیکھو گڈو، انہیں خوب کھلاؤ، رلانا نہیں۔ (بچوں کے جانے کا شور، دروازہ بند کرنے کی آواز) کمبخت بھیجا چاٹ گئے۔ بھگوان ایسے بچے کسی کو نہ دے۔

عورت۔ تم اپنے صاحب لوگوں کے لئے میرے بچوں کو نہ کوسا کرو۔ اگر انہیں بھی ایک ایک رس گلا دے دیتے تو کیا بگڑ جاتا۔ کیا ہمارے بچوں سے بڑھ کر ہیں نگوڑے یہ صاحب لوگ۔

مرد۔ تم پھر آگئیں جھگڑا کرنے۔ ارے بچوں کو کھلا دیتے تو صاحب کے سامنے کیا رکھتے۔ وہ اکیلے تھوڑے ہی ہوں گے۔ ان کے ساتھ ان کے بیوی بچے بھی ہوں گے۔

عورت۔ کیا کہا؟ ان کے بیوی بچے بھی ہوں گے؟

مرد۔ ارے بابا! کہنا تو پڑتا ہی ہے کہ اپنے بچوں کو بھی ساتھ لائیے گا۔ ممکن ہے لے ہی آئیں۔ شاید ایک آدھ چپراسی بھی ہو۔

عورت۔ (بگڑ کر) تم ان ایسے غیروں، نکھٹو غیروں کو میرے بچوں کا پیٹ کاٹ کر کھلاؤ گے۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ میرے بچوں کا حصہ الگ نکال دو۔

مرد۔ اری کیا بکتی ہو۔ تمہیں کچھ عقل بھی ہے یا نہیں۔ بچوں کو بعد میں بٹھا کر کھلا دینا۔ اب خدا کے لئے یہ پارٹی ہو جانے دو۔ الٹے سیدھے جھگڑے کر کے میرا موڈ آف مت کرو۔ مجھے آج ہی صاحب کے سامنے باتوں باتوں میں اپنے پروموشن کی بات بھی کرنی ہے۔

(دستک ہے دروازے پر دستک)

مرد۔ (گھبرا کر) جاؤ جاؤ، جلدی سے جاکر ساڑی بدل لو۔ شاید ہم لوگ آ گئے۔ (دروازہ کھولنے کی آواز) ارے موہن تم ہو کیا بات ہے؟

موہن۔ پتا جی نے آج کا اخبار منگایا ہے۔

مرد۔ اچھا، اچھا، لو، ابھی دیتا ہوں (پیروں کی چاپ، اخبار کی کھڑکھڑاہٹ) یہ لو (دروازہ بند کرنے کی آواز) کمبخت کیا سمجھتے ہیں، کبھی سے اخبار تک خریدا نہیں جاتا اور باتیں بڑی بڑی کریں گے۔

عورت۔ (دوسرے کمرے سے) کون تھا جی؟

مرد۔ ارے وہی سیتا رام لال کا چھوکرا تھا۔ سیتا رام لال نے اخبار منگایا تھا۔ جس دیش کے لوگ اخبار تک مانگ کر پڑھتے ہوں وہ دیش کیا خاک ترقی کرے گا۔

عورت۔ اس کی بہنیں بھی روز کچھ نہ کچھ مانگتی رہتی ہے (نزدیک آتی آواز)

مرد۔ بھلک منگے کہیں کے (اچانک متعجب ہو کر) ارے واہ! آج تو تم بجلیاں گرا رہی ہو اس بنارسی ساڑی میں۔ آج اتنے برس بعد بھی نئی دلہن کی طرح پُرکشش لگ رہی ہو۔

عورت۔ (شرما کر) بس، بس، باتیں نہ بناؤ۔ اسی طرح باتیں بنا کر اپنا کام نکال لیتے ہو۔ بہروپی پورے پورے۔

مرد۔ ارے نہیں! کبھی کبھی تم خود ہی خفا اور غصہ ہو جاتی ہو

عورت۔ میں کیا غصہ ہو جاتی ہوں۔ ابھی تو تم ہی گالیاں دے رہے تھے

مرد۔ ارے یہ سب پیار میں چلتا ہے (جلدی سے) ادھر! کبھی پہنچتے ہی والے ہیں۔ چلو چلو ناشتہ میز پر لگا دیں۔

(پلیٹوں کی کھنکھناہٹ) یہ سموسے کی پلیٹ یہاں رکھو۔ ہاں ٹھیک ہے۔

عورت۔ سنیئے جی! ابھی سے لڈو لئے ہی ہیں۔ ذرا سوچ سمجھ کر کھولنا

مرد۔ اچھا، اچھا۔ دیکھو پردے ادھر رکھو۔ یہاں بیگم صاحبہ بیٹھیں گی تم ادھر بیٹھنا۔ صاحب اور بیگم صاحبہ کے بیچ میں۔

عورت۔ پھر بھی باتیں نہیں بیٹھوں گی۔ لگے تمہارے صاحب کی بغل میں یہاں تم ہی بیٹھو۔ میں اُس کونے والی کرسی پر بیٹھوں گی۔

مرد۔ ارے تم پڑھی لکھی ہو کر جاہلوں جیسی باتیں کرتی ہو۔ آج کل ماڈرن سوسائٹی کا دستور ہے میزبان خاتون کا مہمان مرد کے ساتھ بیٹھنا، ڈانس کرنا اُس کے ساتھ ڈانس وانس کرنا۔ یہ سب ماڈرن ازم کہا جاتا ہے۔

عورت۔ توبہ — پاگل ہو گئے ہو تم۔ ہوگا، تمہارا ماس تہذیب ہائی سوسائٹی میں ایسا رواج۔ مجھے نہیں کرنا یہ سب۔

مرد۔ اب تمہیں کون سمجھائے تم پڑھ لکھ کر بھی جاہل کی جاہل رہیں۔

عورت۔ ہاہاہا۔ میں جاہل ہی بھلی (دروازے پر دستک)

مرد۔ (چونک کر) خاموش خاموش وہ لوگ آ گئے۔ دیکھو زرا ذرا مسکرا کر سواگت کرنا مہمانوں کا

(قدموں کی چاپ کے بعد دروازہ کھلنے کی آواز)

ملازم۔ کیا سہگل صاحب کا مکان یہی ہے؟

سہگل۔ ہاں ہاں کیا بات ہے؟

ملازم۔ کیا آپ ہی سہگل صاحب ہیں؟

سہگل۔ (بے چینی سے) ہاں بھئی کیا بات ہے؟

ملازم۔ جی ککڑ صاحب نے یہ چٹھی دی ہے۔ میں اُن کا نوکر ہوں۔

سہگل۔ (گھبرا کر) مجھے بھیجے ہیں، مگر... مگر ککڑ صاحب کہاں ہیں؟

ملازم۔ جی، وہ فلم دیکھنے گئے ہیں۔ اچھا مجھے اجازت دیجئے نمستے۔

سہگل۔ ارے بھئی مگر.... (نوکر کے دور ہوتے قدموں کی چاپ)

(لفافہ کھولنے کی آواز، پھر چٹھی کو زور زور سے پڑھنے کی آواز)

مسٹر سہگل! ہمیں افسوس ہے کہ ہم تمہارے یہاں چائے پر حاضر نہ ہو سکے بیگم کا موڈ آج فلم دیکھنے کا تھا۔ پھر کبھی کسی دن تمہارے یہاں آ جائیں گے۔

ایم۔ ایچ۔ ککڑ

(باہر سے اندر آتے قہقہوں کا شور)

▲

بقیہ نقد و نظر صفحہ ۔۔

ہوئی ہیں۔ ملاقاتی تناسب کا خیال رکھنا ضروری تھا۔ فاضل مرتب نے اس سلسلے میں کسی اصول کی وضاحت بھی نہیں کی ہے۔ ویسے یہ کتاب نہایت مفید اور معلوماتی ہے۔ شہباز حسین صاحب نے اس پر محنت کی ہے۔

۲۲۰ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے۔ پبلشر: ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن۔ پٹیالہ ہاؤس۔ نئی دہلی۔

▲

غزلیں

غلام مرتضیٰ راہی

ہم خواب کی کیا صورتِ تعبیر نکالیں
بل جل کے کہیں لوگ تماشہ نہ بنا لیں

ذرّوں کے خاک کے ذرّوں سے لگاتے ہیں کہ شاید
صورت کوئی نکلے تو ہم آنکھوں میں بسا لیں

تیشہ لئے تیار کھڑے ہیں کہ کبھی دن
سمتوں کا تعین ہو تو ہم راہ نکالیں

یہ لوگ کہیں مر نہ مٹیں سائے کے پیچھے
گرتی ہوئی دیوار کو ہم اپنی سنبھالیں

اِس خطۂ احساس کے بارے میں نہ پوچھو
شعلہ سا لپک جائے جو ہم روشنی ڈالیں

ظفر غوری

عکسِ عریاں کے کس نگر میں ہوں
آئینوں کے پگھلتے گھر میں ہوں

رات بن کر کہاں قیام کروں
چاند ہوں میں، سدا سفر میں ہوں

خود پہ بھی کیوں یقیں نہیں آتا!
دن میں بھی خواب کے اثر میں ہوں

کٹتی جاتی ہیں وقت کی سانسیں
تیغ سا دستِ بے ہنر میں ہوں

آ- ذرا دیر بیٹھ کر دم لے
میں گھنا پیڑ رہ گذر میں ہوں

سنگ دستی تری رہا کر دے
قید اس تن کے کانچ گھر میں ہوں

حبیب الرحمٰن راہی

اب بھی تلاش کرتے ہیں اہلِ وفا مجھے
گو وقت کی ہواؤں نے بکھرا دیا مجھے

ویرانیاں بھی سنگ اٹھائے ہوئے ملیں
صحرا کا بھی مزاج شہر سا لگے مجھے

اک رسمِ التفات نبھانی تھی آپ کو
جب مِل چکی سزا تو کہا بے خطا مجھے

کچھ وقت انتظارِ بہاراں میں کٹ گیا
کچھ دیر خوابِ صبح نے بہلا لیا مجھے

اک خواب بن کے رہ گئی مرہم کی جستجو
زخموں سے چور چور مسیحا رلا مجھے

نیزے سے بچے ہیں راہی ہر اک سنگِ میل پر
مقتل سا لگ رہا ہے مرا راستہ مجھے

لہ یہ لفظ بہ سکونِ [illegible] (ادارہ)

عشرت قلیبے

اُبھرتی ڈوبتی لہریں

آج سمندر بڑا خاموش ہے۔ پتہ نہیں کیا ہونے والا ہے۔ کوئی طوفان آنے والا ہے یا پھر یہ بھی میری طرح تھک چکا ہے۔ ہنگامے کے بعد کی خاموشی ہے۔ تھکی تھکی سی اور شکست خوردہ خاموشی ———!

بغل کے کمرے میں ڈاکٹر گورش رضیہ کا معائنہ کر رہے ہیں اور میں باہر کھڑکی سے سمندر کا نظارہ کر رہا ہوں۔ معلوم نہیں آنے والے لمحات میرے لئے کیا لا رہے ہیں۔ یہ سمندر سے میرے بچپن کا ناطہ ہے جب سے کھڑکی کے پاس کھڑا رہتا ہوں۔ جب میں بچہ تھا اسی دن سمندر کی ریت سے کھیلا کرتا تھا۔ جوانی نے مجھے سمندر کی اُبھرتی ڈوبتی لہروں میں آنکھ مچولی کھیلنا سکھایا۔ اب زندگی کے پچپن سال گزارنے کے بعد بھی اکثر و بیشتر اس کھڑکی کے پاس گھنٹوں سمندر کے مد و جزر کو دیکھا کرتا ہوں۔

ابھی ابھی ڈاکٹر گورش کمرے سے باہر آئے ہیں اور انہوں نے لیڈی ڈاکٹر مسز ورسس کو بلانے کا مجھے مشورہ دیا ہے اور جیسے کہتے ہی انہوں نے خود ہی ڈاکٹر مسز ورسس کو فون کر دیا ہے اور اب ڈرائنگ روم میں بیٹھے سگریٹ پھونک پھونک کر فضا میں دھوئیں کے مرغولے بکھیر رہے ہیں۔

سمندر کا سکوت عجیب ہے اور اس کی ہر ہر موج کی پرچھائیں میری سانسوں کی کسک میں جذب ہو رہی ہے۔ گویا میری زندگی ہی سمندر کی زندگی ہے۔ سمندر کی زندگی میری زندگی اور یوں سمندر کی زندگی اور میری زندگی ایک ہی کہانی کے دو روپ ہیں۔ لیکن آج سمندر کی خاموشی کو میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا ہوں اور مجھے بڑی اُلجھن ہو رہی ہے۔ جیسے اندر کوئی بیٹھا ہے جو میری اس اُلجھن میں مزید اضافہ کر رہا ہے اور پیہم

احساسات کو ذہنیت ناک سانچوں سے مجھ کو جھنجھوڑ رہا ہے ———!

کریم کان سے سٹے کہنے آیا ہے۔ "صاحب جی! اُسے ٹال دیتا ہوں؟" جاؤ ڈاکٹر گورش کو بلاؤ اور ان سے کہنا ڈاکٹر مسز ورسس کو ایک بار پھر فون کر دیں وہ اب تک نہیں آئیں ———!

کریم جا چکا ہے اور میں سوچ رہا ہوں، اور ہو نہ ہو جلد ہی وہ چلے گئے کہ یہ لمحات پل پل اور بڑے گزرنے سے بھی زیادہ کٹھن معلوم ہوتے ہیں۔

وہ شب عروسی کی رات تھی۔ رضیہ میری دوسری بیوی کی حیثیت سے میری زندگی کے شب و روز کی ساتھی بن چکی تھی۔ میں نے حجلۂ عروسی کی کھڑکی سے جھانک کر دور نیلگوں سمندر کی وسعتوں میں دیکھا تھا ——— اور میں کانپ گیا تھا ——— وہ ———!

وہ ایک انسان ہی تو تھا جو سمندر کی تہہ میں پھنسا ہوا کسی بری کی طرح ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ اور یہ بات مجھے اس وقت تو یاد آئی ہی نہ تھی کہ سمندر میں دور تک کوئی بھنور نہیں ہے ——— تو وہ پھر کیا تھا؟ اُسے سوائے کچھ نہیں سکتا۔ (پتہ نہیں کیوں؟) ——— وہ منظر آج تک میری نگاہوں میں ہے ——— لیکن میں آج تک یہ سب کیوں سوچ رہا ہوں ———؟

شاید میں کچھ نہیں آئی ہے اور اب میں اور تقریر کے کرانے کی آوازیں بھی سنائی دے رہی ہیں۔ شاید رضیہ کی یہ کراہیں مجھ میں ایک ایسا ساز بن کر رہ گئی ہیں۔ مجھے سوائے اس کے کچھ نہیں سوجھتا اور اپنے سائے سے بھی ڈر لگنے لگا ہوں۔ شاید یہ آنے کی ان لمحات میں ہی اُسی کا ہے ———

[illegible] کے ساتھ زمین اور آسمان گھوم رہے ہیں اور سب وہ مل سکے ہیں۔ ڈاکٹر گورش میرے پاس سے اٹھ کر جا چکے ہیں۔

[illegible]

آنسو بھری [illegible] اور محسوس کیا
کہ [illegible] کہیں دور سے [illegible]
کر دیا تھا۔ [illegible] سے [illegible] اور کبھی
وہ کسی [illegible] گزرتا چلا جاتا۔ وہ کہتا تھا زندگی کے بیتے ہوئے [illegible]
سے کہیں [illegible] شامِ الم بن جائے۔
[illegible] سے [illegible] بھی کسی کی اہمیت کا [illegible] ہوا۔
پھر چند ہی سالوں بعد اُسے خاندان کے بندھن میں بندھ جانا پڑا۔ لیکن
جلد ہی قدرت نے اُسے اس بندھن سے آزاد کر دیا۔ دوبارہ اس نے
شادی باون برس کی عمر میں کی اور اپنے حسنِ انتخاب کو اس عمر میں
بھی محفوظ رکھا۔ ناہید کتنی خوبصورت تھی! ـــــ لیکن اُسے کیا
پتہ تھا یہی ناہید اس کے لئے شامِ الم بن جائے گی اور غیروں کی
باہوں میں باہیں ڈالے کناٹ پلیس کے علاقے میں بیگم آوارہ کی
مانند دیکھی جائے گی ـــــ

ڈاکٹر اور نرس [illegible] کمرے سے باہر آتی ہیں اور کریم سے
ضروری چیزیں لے کر کمرے میں لوٹ جاتی ہیں۔ آج کریم کے کسی عمل
میں تیزی اور چالاکی نہیں ہے۔ وہ پژمردگی اور بے دلی سے
سب کچھ کر رہا ہے۔

اُس روز [illegible] نے ڈاکٹر [illegible] کو بلایا تھا، ہم ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے
[illegible] نے کہا۔ "یہ جانیے صاحب
آپ تو [illegible] ہیں۔ آپ بہت بڑے
ہو گئے ـــ [illegible] نے [illegible] کی [illegible]
[illegible]۔ رقیہ نے بھی تو اس کا ساتھ دیا تھا۔ سب نے [illegible]
گرم گرم سیسہ [illegible] دیا ہو۔ پتہ نہیں میں نے اپنے
آپ کو کس طرح سنبھالا۔ غم و غصے نے مجھ پر عجیب کیفیت طاری
کر دی تھی۔ اس رات میں خود بھی نہ سو پایا تھا۔ کبھی خود کی بات مجھے
یاد آتی کبھی [illegible] کی: "حمید صاحب آپ دوائیں استعمال کیجئے،
مگر مجھے امید نہیں کہ آپ کی جائداد اور آپ کی کوٹھی کے وارث
ـــــ یہ دوائیں جنم دے سکیں ـــ!"

بغل کے کمرے سے کسی بچے کے رونے کی آوازیں آ رہی ہیں۔
اور مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میرے کانوں میں گرم گرم سیسہ اُتر رہا ہے!
ـــ ڈاکٹر کمرے سے باہر آتی ہیں اور مجھے مبارکباد دیتی ہیں
مبارک باد ـــ

اچانک سمندر متحرک ہو جاتا ہے اور ہر ایک ابھرتی اور ڈوبتی ہیں
میں نے سوچا، کہاں تک؟ ـــــ اور میری نظروں نے ان کا تعاقب
کیا۔۔۔۔ نظریں تھک گئیں اور سلسلہ بڑھتا گیا۔ کہاں تک؟
میں کیا جانوں میں تو ڈوبتی ابھرتی لہروں میں تحلیل ہو رہا ہوں۔ ▲

ـــــ بقیہ: ہمارا ادبی ورثہ صفحہ [illegible] ـــــ

ایک دور اور ایک منزل پر ختم نہیں ہوتا بلکہ اس کا دائرہ ہندوستانی کلچر کے پورے سفر پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کے کسی ایک ٹکڑے تک بھی، نئی اعلیٰ چیتنا اور نئی فکر میں [illegible] کی گتھیاں [illegible] نہیں کہ ہم صرف اپنے آپ ہی کو آئینے میں دیکھتے رہیں اور عالمی کلچر کے سارے خزانوں ہی کو نہیں خود اپنے کلچر کی رنگا رنگی کو بھی بھلا دیں۔

اس سلسلے میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ ہماری [illegible] روایت ہے تو یہیں جرأتِ انکار کی روایت بھی فراواں ہے۔ حرفِ حق کہنے [illegible] بھی [illegible] نہیں [illegible] جرأت کر سکے [illegible] زمانے میں [illegible] ہوئے۔ یہ طاقت والوں کے ہاتھوں میں نہ کھیلنے کی آزادی ہماری ادبی روایت کا حصہ رہی ہے۔ آج بھی اس کی ضرورت ہے [illegible] دنیا میں دو قسم کے [illegible] ایک وہ عقلمند لوگ ہوتے ہیں [illegible] زمانے کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں [illegible] دوسرے وہ بیوقوف جو زمانے کو اپنے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اس لئے دنیا کی ترقی بیوقوفوں کے ہاتھوں ہوتی ہے۔ ▲

مختار شمیم

رات کی رانی مہک رہی ہے مستی میں ناگن لہرائے
زہر بنا اُترے تنہائی کا اجگر یہ منظر ڈس جائے

دشتِ تخیل، سوچ کا دریا، فکر کی وادی بھی چھان آئے
لفظوں کے جنگل سے گزرے جذبوں کی خاطر تو لائے

سوچوں کا انبار لگا ہے خوابوں کے ویرانے میں
دیکھیں! اِن میں بھولی بسری کوئی کہانی ہی مل جائے

محلوں کی اونچی دیواریں کہتی ہیں راہگیروں سے
پھیل رہے ہیں سائے اُتنے، جتنا سورج چڑھتا ہے

در در کوچہ کوچہ بھٹکے، دستِ کرم کی بخششِ عام
ہم اپنے کشکول میں یارو! زخموں کے انگارے لائے

رنگِ شفق، گُل، نغمے، تارے، یادوں کے ہیں کتنے روپ!
اُن سے بچھڑے مدت گزری لیکن اُس کو بھول نہ پائے

شمیم اجمیری

سورج نکل آیا تو ملی شام کی منزل
آغاز کی محتاج ہے انجام کی منزل
کیا ہوگی کبھی رہروِ ناکام کی منزل
ہے ختم مری ذات پہ الزام کی منزل
ہر گام رہِ زیست میں یہ کرب یہ چیخیں
گویا کہ ہر انسان ہے کہرام کی منزل
وحشت نے وہاں چھوڑا جہاں اہل [illegible]
الفاظ کے پتھر لے دشنام کی منزل
چھاؤں کا تقاضہ ہے قدم تیز بڑھاؤ
پیاسی ہے ہر گام رہِ عام کی منزل
دنیا کو نہ مل پائی ندیم اور کہیں بھی،
کردار کی چوکھٹ پہ ہے اقدام کی منزل

غزلیں

ظفر عزیز (ایلچپوری)

کیا فکر اگر جسم پہ زخموں کی قبا ہے
دل درد کے سائے میں بھی ہنستا ہی رہا ہے

مدت ہوئی اِس شہر میں رہتے ہوئے لیکن
دل ہے کہ ابھی تک تو اکیلا ہی رہا ہے

میں خوش ہوں کہ اِس دھوپ میں مَیں ہی نہیں تنہا
سورج بھی تو سائے کی طرف دوڑ رہا ہے

چہرے سے مقدر کی سیاہی کو نہ پوچھو
تقدیر کا لکھا بھی کہیں ایسے مٹا ہے

تم کیوں چلے آئے ہو اِس شہرستاں میں
حساس طبیعت بھی یہاں ایک خطا ہے

شاکر پونچھی

ناول

نواں باب ۔ بارہویں قسط

اب میں وہاں نہیں رہتا

ایک ایک بات

ایک ایک ملاقات

ایک ایک چہرہ، بالکل میرے سامنے بیٹھک قریب اور چاندنی رت کی دھوپ سی پھیلی ہوئی چارسو!

یہ بُرزہ ہامہ نہیں سیاست پونچھ کی چار دیواری ہے۔

یہ بُرزہ ہامہ نہیں۔ میرے ماضی کی چار دیواری ہے۔

یہ بُرزہ ہامہ نہیں۔ میری عمر کی چار دیواری ہے۔ ایک ایسا آئینہ خانہ جہاں ماضی کے سب چہرے، عمر کی سب باتیں چھپی ہیں۔

دادا باجی جیسے دوبارہ پتھر بن گئے۔ دوبارہ مرنے والی نیند سو گئے۔ شاید تکمیل کے وہ فاصلے دُور پیچھے۔ جنہیں عبور کرنے کیلئے قدموں سے زیادہ احساس کی ضرورت ہوتی ہے۔ شاید بُرزہ ہامہ کے کھنڈر دُور پیچھے رہ گئے اور میں دُور آگے نکل آیا۔

میں دادا باجی کو پکارتا ہوں۔ لیکن وہ مجھ سے بہت دُور ہیں۔ وہاں تک شاید میری آواز نہیں پہنچ سکتی۔ لیکن میرے کالج کا ماحول میری آواز سُن لیتا ہے۔ اس کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے ظاہر ہوتا ہے۔

یہ کالج کا ماحول۔ آموں کے پیڑ، پھولوں کی روش اور ٹھنڈے یخ پانی کی نہر، بنا ہوئے بہتے جسم اور [illegible] ہوئے ریشمی آنچل اور جوان عمر کی دھوپ۔۔۔ پرکشش [illegible] جوں سے جانے پہچانے چہرے۔۔۔ اور یہ سادہ لباس سادہ طبیعت محمد خان!

اسکول کا ہیرو کالج کا بھی ہیرو بن چکا تھا۔ مخلوط تعلیم تھی۔ کالج کی لڑکیاں شہرت اور روپے پیسے کی چمک دمک سے زیادہ خوبصورت لباس پسند کرتی تھیں۔ اور کالج کے اسٹیج پر ایسے ایکٹروں کی کمی نہ تھی۔ اپنے اپنے انداز اور وضع قطع کا ہر کوئی شہزادہ تھا لیکن محمد خان اپنے موٹے موٹے کھدر کے لباس میں ایک ایسی انفرادیت لئے ہوئے تھا کہ ہر کوئی اس کا مداح تھا۔ اور مداحوں میں بڑے گاؤں کی لڑکیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ جو عام حالت میں ان کی فطرت اور حالات کے برعکس تھی۔

پیار سا کوئی پیار تھا۔ عزت سی کوئی عزت تھی۔ بڑے بڑے تن آور قد آور وجود اس کے سامنے جھکتے دیکھے۔ عجیب سی مقناطیسی کشش کا مالک تھا۔

دیا سنگھ بھی آگیا تھا۔ وہ نہ کھیل کود کے میدان میں آتا۔ اور نہ ہی دوسرے مشغلوں میں حصہ لیتا۔ جیسے سارے کالج کو اپنی رعایا سمجھتا ہو۔ اپنے سے کمتر سمجھتا ہو۔ جن کے ساتھ گھلنا ملنا جاگیردارانہ روایت کے خلاف ہو۔ اس کا اپنا ایک انداز تھا۔ ایک وضعداری تھی۔ سب اسے پسند کرتے تھے۔ لیکن وہ سب کو حسب عادت نظر انداز کرتا۔

محمد خان اسکول کا محمد خان نہ تھا۔ جو ہر وقت میرے ساتھ رہتا۔ یہاں اس کے نئے ساتھی تھے۔ کالج کے ماحول کے علاوہ بھی اس نے ایک نئی زندگی بسا رکھی تھی۔ جو میری آنکھوں سے اوجھل تھی۔ ویسے بھی میری اپنی زندگی تھی۔ نہ بدا میری انتہائی کمزوری بن چکی تھی۔

ہوسکا کہ تعلیم یا جبر ... صفر کی طرح رہتا تھا تاکہ اپنے عقائد میں کوئی تبدیلی نہ لا سکیں۔ اور اپنی مخالفانہ عادت میں بڑھاوا دیں پھر کچھ پیدا نہیں کر سکیں۔ اور اُسے اس قابل بنا سکیں کہ وہ اپنے ہاتھوں سے دنیا کو اپنا سکے۔ میری ساری زندگی کی تگ و دو کا ماحصل غریبانہ تھی۔ ہمارا ہر قدم غیر شعوری دشمن کے طور پر زہر کے لئے تھا۔

کالج کے دو برس پلک جھپکتے ہی گزر گئے۔

ریاست کی سیاسی فضا کشیدہ ہو چکی تھی۔ سیاست کے ساتھ ساتھ مذہب کے ہنگامے ہو رہے تھے۔ لیکن اُس کا اثر کالج کی چار دیواری تک نہ پہنچا تھا۔ ایک وقت تھا اور اس کا ذمہ دار محمود خاں تھا۔ اُس نے کالج کی فضا کو سیاسی شعبدہ بازی سے پاک رکھا۔

وادی میں کشمیر چھوڑ دو تحریک زور پکڑ چکی تھی۔ جاگیردارانہ نظام سے تنگ آ کر لوگ شاہی خاندان کو ریاست کی باگ ڈور چھوڑ دینے کے لئے کہنا شروع کر رہے تھے۔ ماسٹر دین دیال اور محمود خاں جو باتیں چھپا چھپا کر کرتے تھے اور جسے سازش کا نام دیا جاتا تھا۔ اب وہی باتیں ہر کوئی بلند آواز میں کر رہا تھا۔ احساس آزادی کی بات تھی۔ آہستہ آہستہ ساری ریاست میں آگ سی لگی جلنے لگی۔ کالج کی چار دیواری بھی چنگاریوں کا اکھاڑہ بن چکی تھی۔ ہندو مہاراجہ کے خلاف بغاوت تھی۔ جو ایک مسلمان لیڈر نے شروع کر رکھی تھی۔ ایک خالص سیاسی تحریک کو مذہبی رنگ دیا جا رہا تھا۔ پھر بھی تحریک میں ہندو مسلمان سکھ سب برابر کے شریک تھے۔

محمود خاں دن بھر کالج میں رہتا۔ شام کو کھیل کے میدان میں آ جاتا۔ لیکن رات کو ہاسٹل سے غائب رہتا۔ کہاں جاتا تھا کسی کو معلوم نہ تھا جب مجھے معلوم ہوا اُس روز ہاسٹل کو پولیس نے گھیر رکھا تھا۔ میں سمجھا ہی تھا کسی نے کہا۔ پولیس آ گئی۔ اور چند لڑکوں کو ہتھکڑیاں پہنا کر لے جا رہی تھی۔ میں سیدھا محمود خاں کے کمرے میں گیا۔ کمرہ خالی تھا دیا سنگھ کے کمرے میں بھی بھاگا۔ وہ جیسے سب کچھ جانتا تھا۔ اُسے محمود خاں کی گرفتاری کا کوئی رنج نہ تھا۔ محمود خاں کے کمرے میں کوئی خفیہ میٹنگ ہو رہی تھی جس میں رنبیر سنگھ [illegible] اور [illegible] شامل تھے رنبیر سنگھ [illegible] طالب علم تھا۔ [illegible] کشمیر سے [illegible] تھے۔ وہاں کے کالج کے طالب علم تھے میرے بڑے سنے

تھے۔ میں نے انہیں محمود خاں کے ساتھ کچھ کھسر پھسر کرتے دیکھا۔ اور آج معلوم مجھے پتا چلا کہ ہوسٹل کی چار دیواری کے بارے میں معلوم ہوا۔ چار یاری۔ چار چہرے محمود خاں ریاست پونچھ کا نمک خوار تھا جسے اسپرٹ کشمیر کی ایک جاگیر کا درجہ حاصل تھا۔ اور یہ تعینات کشمیر کے نمک خوار شیو سنگھ کے خاندان کا تعلق کشمیر دربار کے ساتھ بڑے قریب کا تھا۔ ہندو مہاراجہ کے خلاف مسلمان کی بغاوت تو قابل برداشت تھی۔ لیکن ایک ہندو کی بغاوت۔ وہ بھی شیو سنگھ کی ذات اور اوقات کا ہندو۔ اپنے بیگانوں نے لاتعلقی کا اظہار کیا۔ اپنی عزت یا مہاراجہ کی وفاداری یا اولاد سے زیادہ اپنی زمین جاگیر بچانے کے لئے باپ نے گھر سے نکال دیا۔ بیگانگی ٹوٹ گئی۔ وظیفہ ملتا تھا بند ہو گیا۔

ایک دن عدالت میں پیشی
دوسرے دن عدالت کا فیصلہ
عدالت مہاراجہ بہادر کی تھی
بغاوت اور غداری کا الزام
ہندو غداروں کو ایک ایک برس کی جیل
مسلمان غداروں کو چھ چھ مہینے کی جیل

جرم ایک جیسا۔ سزا مختلف۔ شاید ہندو رعایا کو ایک ہندو مہاراجہ کا مسلمان سے زیادہ وفادار ہونا چاہیے تھا۔ حالانکہ ریاست کے آئین میں ایسا کوئی امتیاز نہ تھا۔ ہندو اور مسلمان برابر کی رعایا تھے۔ سزاؤں میں اور انعامات میں بھی۔ ریاست کی عدالت تھی۔ قانون سے زیادہ مہاراجہ بہادر کا حکم چلتا تھا۔

کافی دن ہنگامہ رہا۔ کالج کی چار دیواری بھی محمود خاں کی غیر حاضری میں اُن ہنگاموں سے نہ بچ سکی۔ باہر سیاست تھی کالج کی چار دیواری میں مذہب نے سر ابھارا۔ ہندو طالب علم پکے ہندو بن گئے۔ اور مسلمان طالب علم پکے مسلمان۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑے ہو جاتے۔ مگر دیا سنگھ کے باقی سب لڑکے کسی نہ کسی دھڑے سے منسلک تھے۔ دیا سنگھ کو [illegible] سے کوئی ہمدردی تھی اور نہ ہی ہندوؤں اور مسلمانوں سے۔ جیسے وہ نہ کوئی سکھ تھا۔ جسے اپنی جاگیر چھن جانے کا غم ہو اور نہ ہی ہندو یا مسلمان جسے کسی مذہب سے لگاؤ ہو۔ بس ایک جیو کا بت تھا جو [illegible] تھا۔ [illegible] تھا اور سیاسی [illegible]

کو [illegible] تھی۔ [illegible] سخت [illegible]

تک پہنچا۔ بالخصوص [illegible] جس کی وجہ سے کالج میں اُس کا ایک خاص حلقہ بن گیا تھا جس میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ اور سب اُس کے محتاج۔ لڑکیوں کے معاملے میں [illegible] حق ان میں دیا تھا۔ نرملا اُس کے پیچھے بھاگتیں۔ لیکن وہ ان کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔

محمد خان کی گرفتاری کے بعد کالج کے لڑکوں سے پوچھ تاچھ کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا۔ میں محمد خان کے قریبی دوستوں میں سے تھا۔ سب جانتے تھے۔ لیکن مجھے پوچھ تاچھ کے لئے نہیں بلایا گیا بہرحال یہ ایک معمہ تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ دیا سنگھ نے اپنا اثر رسوخ استعمال کیا اور مجھے گرفتاری سے بچایا۔ جب مجھے معلوم ہوا میری عجیب سی حالت ہو گئی۔ دیا سنگھ عجیب سا شخص تھا عجیب سا دوست تھا۔ میں اپنی گرفتاری سے نہیں ڈرتا تھا۔ حالات نے مجھے نڈر بنا دیا تھا۔ لیکن دیا سنگھ کا احسان لینا نہ چاہتا تھا لیکن احسان وہ ہوتا ہے جو جتلایا جائے۔ اُس نے کبھی اِس کا ذکر مجھ سے نہ کیا۔

میں نے ایک دن پوچھا۔ اُس نے بڑے رسان سے جواب دیا۔

تم بھی ہو۔ میں تمہارا دوست بھی ہوں۔

محمد خان کی گرفتاری [illegible] ہو گیا اُس کا خیال [illegible] سمجھانے والا صرف دیا سنگھ۔

اس راستے کی منزل یہی ہے۔ اور [illegible] نہیں جانتا بھی تھا۔ لیکن بات [illegible] تھا۔ محمد خان کا خیال رکھتا۔ لیکن [illegible]

میں نے اس پیار [illegible] میں بکا اور [illegible] تھے عجیب سے [illegible] تھا تھا انہیں [illegible] ان کے چہروں پر ایک [illegible]

[illegible] دیا سنگھ محمد خان کو ملنے جاتے [illegible] تھے۔

دیا سنگھ کو کالج کی تعلیم ادھوری چھوڑنی پڑی۔ اس کے باپ کا انتقال ہو گیا اور اسے اپنی جاگیر کا کام سنبھالنا پڑا۔ محمد خان کی غیر حاضری میں دیا سنگھ سے میری بول چال رہی۔ محمد خان مجھے ایک اچھا انسان سمجھتا تھا۔ جیل میں جب بھی ملاقات ہوتی اُس نے دیا سنگھ کی تعریف کی کہ وہ میرے ساتھ مقابلے پر [illegible] باپ ہونے کو ہوتا جاگیردارانہ روایت کے خلاف ہے۔ لیکن دیا سنگھ مجھے اچھا کھلاڑی نہیں سمجھتا تھا اور آخری لمحوں تک جب میں جیت کے لئے ہار گیا اور وہ جیت کے [illegible] لگا تب مجھے جا پہنچے دیا سنگھ پہلی بار میرے کمرے میں آیا۔

سو روپے کے تین نوٹ مجھے دیتے ہوئے کہا۔

جیسے میرا رشتہ دار ہے۔ محمد خان کی ضرورتیں پوری کرتے رہنا۔

میں نے کہا۔

محمد خان سے تمہاری دوستی میں کچھ نہیں رکھا

اُس نے صاف بیانی سے کام لیا۔

"محمد خان اور تم میرے دوست نہیں ہو،

وہ تو مجھے معلوم ہے۔ لیکن یہ سب کیا ہے،

نرملا کی خواہش،

"تمہیں نرملا نے بتایا تھا کہ . . . .

کچھ باتیں صرف سمجھنے کی ہوتی ہیں،

"لیکن نرملا؟،

آج تک میری زندگی میں ایسی کوئی لڑکی نہیں آئی جو مجھے پسند ہو۔ البتہ [illegible] صاحب مجھے اچھے لگتے ہیں اور مجھے باپ کا پیار نہیں ملا، میں بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ میں اُسے صاف صاف بتانا چاہتا تھا کہ نرملا میری موجودہ زندگی کی منزل ہے اور تم میرے سفر کے راستے میں حائل نہیں ہو گے لیکن میں کچھ نہ کہہ سکا۔ میری زبان بند رہی اور دیا سنگھ چلا گیا۔ کالج کی چار دیواری میں پھر مجھے دوبارہ نہیں ملا۔ اپنے [illegible] ایک عرصہ بیت جانے کے بعد ملا۔ بدلا ہوا انسان تھا [illegible] سادہ [illegible] اگر اُسے بتا دیتا کہ میں نرملا کو چاہتا [illegible] زندگی میں سمو لینا چاہتا ہوں۔ ہو سکتا ہے وہ [illegible] میرے سفر کا [illegible] کبھی نہ

...ایک ... ہوا۔ ... جس نے غلامانہ ذہنیت
کی خاطر ایک قلعے کی چابلکری کرنے کے لئے اپنا ایمان دیا
تھا جہاں چار ... تھے۔ جو صدیوں پرانے ایک پختہ قلعے کی دیوار
گرانا چاہتے تھے۔ ایک ... نظام کے قلعے کی دیوار جسے بنائے
رکھنے کے لئے ہزاروں انسانوں کے منہ سے نوالا چھین لیا جاتا تھا
ہزاروں بچوں کا خوش آئند مستقبل چھین لیا جاتا تھا۔ ہزاروں عورتوں
کی عصمت چھین لی جاتی تھی۔ اور یہ چار یاری اپنی عمر اپنی زندگی اپنی
محبت کا بلیدان دے رہی تھی۔ اور اپنی ذات کے لئے کچھ بھی نہیں۔
خواب ... نہیں۔ جب ... لوگوں کی ... دنیا تھی۔ (باقی آئندہ)

تصحیح — شاعر کے گزشتہ شمارہ میں کتابت کی چند غلطیاں رہ گئی تھیں۔ ان کی تصحیح کر لی جائے۔
غزل واقف جونپوری۔ شمارہ ۱۱ صفحہ ۱۲۔ شعر ۵۔ ساغر غلط۔ ساغر صحیح
نظم نصر قریشی شمارہ ۱۱۔ پہلا بند۔ قرنوں غلط۔ قرنوں صحیح
شمارہ جنوری فروری ۷۳۔ نظم نصر قریشی۔ پہلا بند صفحہ ۸
نظر غلط۔ نذر صحیح۔
مضمون ظ۔ انصاری صفحہ ۱۸
غلط: بزرگوں کے ڈر سے، خدا کے ڈر سے یا باپ دادا کے ڈر سے
صحیح: ، کی نظر سے، ، ، ڈر سے ، ، ، ڈر سے
گیت سلوت رتسولی صفحہ ۴۸
غلط: ساری رتیں، ایک سی رتیں
صحیح: ساری سمتیں، ایک سی سمتیں
غلط: خالی ساری دشائیں۔ صحیح: خالی ساری دشائیں
غلط: اس بھیڑ میں ہوں میں اکیلا۔ صحیح: اس بھیڑ میں ہوں میں اکیلا



نقد و نظر

نسیمِ بہار

از ——— امیر چند بہار

پروفیسر امیر چند بہار اُردو کے معروف و خوش فکر شعراء میں سے ہیں۔ یہ ان کی تین سو پچاس رباعیوں کا مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے نسیمِ مغرب کے نام سے انگریزی کی ۲۹ شہرۂ آفاق نظموں کا منظوم ترجمہ پیش کر کے وہ اربابِ ذوق سے داد حاصل کر چکے ہیں۔ شاعری کے لئے تاثر اور احساس ضروری ہے خواہ وہ داخلی ہو یا خارجی۔ اپنے علم و تجربہ کی اساس پر شاعر اپنے احساسات و تاثرات کا اظہار کرتا ہے ویسے نہ علم کی کوئی انتہا ہے اور نہ تجربہ و مشاہدہ کی۔ ہر شاعر بقدرِ ہمت و طاقت اظہارِ خیال کرتا ہے۔ بیشتر گہرا، بیشتر فکری، بیشتر فلسفیانہ اور عالمانہ ــ یا تشکیک، ہلکا روایتی، سرسری، سیدھا سادہ۔ کلاسیکی، غیر کلاسیکی، مُبہم، غیر مُبہم۔ ایک سادہ شاعر سپاٹ بھی ہو سکتا ہے اور بلیغ مفہوم و معنی کا حامل بھی۔ شعر میں الفاظ و تراکیب کی حیثیت کسی تکیہ کی نہیں ہوتی اس کا تعلق خیال کی بلندی و پستی اور شاعر کی اپنی قدرتِ اظہار پر ہوتا ہے۔ بہار صاحب نے اپنی رباعیات پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"بعض نئے شاعروں کی طرح میں اپنی بات کو ابہام اور علامتوں کی تہ میں چھپانے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ میں مبہم، مغلق یا ثقیل الفاظ اختیار کرنے کے بجائے نہایت واضح الفاظ میں اپنی بات عوام تک پہنچانے کا متمنی ہوں۔"

واضح الفاظ و مفہوم کی شاعری کوئی بڑی بات تو نہیں ہے لیکن قدرے مشکل ضرور ہے اور علامت کی بھی زبردست اہمیت ہے اور بڑی شاعری کے لئے یہ چیز ضروری ہے۔ اس میں نئے اور پرانے شعراء کی کوئی تخصیص نہیں۔ بہار صاحب کی رُباعیات واضح، صاف اور [illegible] اسلوب کی [illegible] کے ساتھ ان میں جذبے کی صداقت اور احساس کی گہرائی بھی ہے۔ [illegible] نے رُباعی کا پیرہن دیا ہے [illegible] اسلوب اور فن کا حسن [illegible]

[illegible]

اے ہم نفسو! دیدہ ورو! کچھ تو کہو
انسان کے اس سفر کی منزل کیا ہے

ویرانیِ دل گلزار سے بھی ڈرتا ہے
یارانِ ریاکار سے بھی ڈرتا ہے
محفوظ ہوں میں گوشۂ تنہائی میں
ہنگامۂ بازار سے بھی ڈرتا ہے!

بادل ہے کہ اڑتا ہوا میخانہ ہے
ندی ہے کہ چھلکا ہوا پیمانہ ہے
ساون کی ہے یہ شام کہ ہے صبحِ ازل
کیا خوب یہ فطرت کا پری خانہ ہے

چونکہ رباعیات مختلف موضوعات سے تعلق رکھتی ہیں اس لئے انھیں الگ الگ ابواب میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اور یہ ابواب ہیں۔ علم و اخلاق، حرم و گل، دورِ حاضر، سائنس اور امنِ عالم، فکر و نظر، فن اور فنکار، مشاہدات، محسوسات و تجربات، سیاسیات، موسم، شباب، جوانی، جشن و دشت، ردِ عمل ــ نقوشِ یاس، جنگ و صلح، شعاعِ امید، طنز و مزاح، تسخیرِ قمر، اُردو، متفرقات۔ ان میں سے ہر باب کے تحت چند ایسی رباعیاں مل جاتی ہیں جو اپنی سادگی کے باوصف قاری کو متاثر کرتی ہیں جن میں روانی و دلکشی ہے۔ البتہ طنز و مزاح اور تسخیرِ قمر والے ابواب کی رباعیاں بے رس اور کرخت ہیں [illegible] میں طنز و مزاح کی طرح نہیں ابھرا ہے۔ مزاح کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مجموعی طور پر یہ اُردو رباعیات کا ایک قابلِ قدر مجموعہ ہے۔

ابتدا میں جناب جوش ملسیانی اور ڈاکٹر سلام سندیلوی نے بہار صاحب کی رباعیات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ خود بہار صاحب نے بھی اپنی رباعیات سے متعلق خاصا طویل مضمون لکھا ہے جس میں مغرب کے بہت سے مصنفین کے طویل اقتباسات دے کر ان سے اپنی شاعری، اپنے مزاج اور عام شعری میلانات سے بحث کی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ میں نے ان رباعیات میں اکثر و بیشتر دورِ جدید کے مسائل نظم کئے ہیں۔ [illegible] بھی [illegible] ہے کہ نہ وہ اپنی زبان سے [illegible] اور نہ شاعری انھیں [illegible] میں ہے۔ لیکن ان کا یہ احساس علم و فن کے اکتساب کے سلسلہ میں [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] چند مثالیں پیش ہیں۔

بخشے ہے [illegible] رحمت کی طلب

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] کہا جاتا ہے

[illegible]

صفحہ ۱۱۸ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ہو سکتا ہے۔

چلتی ہے وہاں [illegible]

[illegible] ہو سکتا ہے۔

[illegible]

[illegible] سے تیار

[illegible]

الفاظ کی تقدیم و تاخیر [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

احسان [illegible] کر کے [illegible]

[illegible]

اس [illegible] ہوتا۔ کیا
[illegible] مجموعے [illegible] ہیں
مجموعہ کی کتابت و طباعت کا [illegible] سے [illegible] ہونے
شائع کیا ہے۔ ۱۰۴ صفحات ہیں۔ قیمت ساڑھے پانچ روپے ہے
ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، [illegible] بمبئی ۳
(ادارہ)

تثلیثِ فن

چند قلم کاروں کی مشترکہ تخلیقات کی اشاعت کا چلن اب بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ خیال اچھا ہے یوں کہ بعض قلم کار اپنے مکمل مجموعے نہیں چھپوا سکتے۔ قلم کاروں کے مشترکہ مجموعوں کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اخراجات بٹ جاتے ہیں، کتاب کی نکاسی کے لئے بھی اپنی جگہ یہ قلم کار کوشش کر سکتے ہیں اور جہاں اس طرح کی کتابیں متنوع مواد کی حامل ہو جاتی ہیں، وہیں ان میں شامل شدہ تخلیقات کا بھی تجزیہ ہو جاتا ہے۔

تثلیثِ فن میں ظہیر غازی پوری کی ۱۰ نظمیں، نعمان ہاشمی کے پانچ افسانے اور مختار احمد آسی کی ۲۲ غزلیں شامل ہیں۔ ساتھ ہی ان تینوں قلم کاروں کی تصاویر بھی ہیں۔ اگر ایک ایک صفحہ میں ان کے مختصر سوانحی خاکے بھی شامل کتاب ہوتے تو اچھا تھا۔ ڈاکٹر وہاب اشرفی نے اپنے معروضی مقالہ میں تینوں کے فکر و فن پر اجمالاً تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ فلیپ میں سید عزت اللہ نے بھی ظہیر غازی پوری، نعمان ہاشمی اور مختار احمد آسی کی تخلیقات پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ ان کے علاوہ [illegible] رضا نقوی واہی اور [illegible] ابو فیضی کی تحریریں شامل کتاب ہیں۔ سبھی نے [illegible] کو سراہا ہے۔ نعمان ہاشمی کے افسانوں میں زندگی کی کشمکش اور سیاسی اور سماجی [illegible] کی صداقت، [illegible] اور مختار احمد آسی کی غزلوں میں [illegible] کا اعتراف کیا ہے۔

ظہیر [illegible] کے [illegible] شاعر ہیں۔ اور پچھلے چند [illegible] ہیں

[illegible] نعمان ہاشمی کے افسانوں میں جان ہے اور ان کی [illegible] برابر [illegible] معلوم ہوتی ہے۔ البتہ مختار احمد آسی کی [illegible] شاعری کسی اعتبار سے متاثر نہیں کرتی۔

صفحات ۱۱۲۔ کتابت و طباعت بہتر۔ قیمت چار روپے
ملنے کا پتہ: [illegible] اکادمی۔ [illegible] ہاؤس۔ جگ جیون روڈ۔ گیا۔ بہار
(ادارہ)

روشنی کے مینار

مرتبہ ——— شہباز حسین

اس کتاب میں ہندوستان کی ایسی تیس ممتاز شخصیتوں کے سوانح حیات اور ان کے کارنامے جمع کر دیئے گئے ہیں، جنہوں نے مذہب، سماجی اصلاح، سائنس، تاریخ، سیاست، ادب، موسیقی اور جنگ آزادی میں اپنے ملک کا نام روشن کیا۔ ان کے نام علی الترتیب یہ ہیں۔ گوتم بدھ، اشوک، [illegible] شنکر اچاریہ، [illegible] خواجہ معین الدین چشتی، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء، امیر خسرو، بھگت کبیر، [illegible] گرو نانک، [illegible] اکبر، ٹیپو سلطان، [illegible] رام موہن رائے، مرزا غالب، [illegible] سید احمد خاں، [illegible] بال گنگا دھر تلک، جگدیش چندر بوس، رابندر ناتھ ٹیگور، مہاتما گاندھی، ولبھ بھائی پٹیل، ابوالکلام آزاد، جواہر لال نہرو اور سبھاش چندر بوس۔

ان سوانح کی ترتیب و تسوید تاریخی واقعات اور حقائق کی [illegible] کی گئی ہے۔ اختصار کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ [illegible] صفحات میں ہر شخصیت کی زندگی اور اس کے [illegible] یا خصوصیات و صفات کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے [illegible] کے حالات [illegible] ہیں۔ غرض مرتب [illegible] کہ یہ مجموعہ ہائی اسکول کے طلبہ کے لئے مرتب کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ [illegible] "روشنی کے مینار" [illegible] اس [illegible] ملک کی تاریخ [illegible] ہے۔ [illegible] ہاں اس کتاب کے مطالعے کے [illegible] تیس شخصیتوں میں [illegible] ہندوستان [illegible] ہے اور اس میں [illegible]

مکتوبات

شاعر [illegible] شمارہ [illegible]

● احتشام صاحب مرحوم پر آپ کا تعزیتی مضمون پڑھا۔ یہ واقعہ ہے کہ مرحوم کے انتقال پر جس قدر بھی آنسو بہائے جائیں کم ہیں۔ اور آپ نے بالکل درست فرمایا ہے کہ اُن پر لکھنے کے لئے تو ایک کتاب چاہیئے۔ شاید کم لوگوں کو معلوم ہو کہ وہ اُردو، انگریزی اور ہندی زبانوں کے یکساں ماہر تھے۔ اُن کے علم و فضل کا یہ عالم تھا کہ "ECLIPSE WAS FIRST AND THE REST NOWHERE" جس پایہ کا ادیب اور انسان تو صدیوں میں کہیں ایک پیدا ہوتا ہے۔

[illegible] (الٰہ آباد) — واثق جونپوری

● تازہ شاعر (فروری مارچ) میں آپ نے احتشام صاحب پر جس محبت اور درد مندی کے ساتھ لکھا ہے، وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ اسے پڑھنے سے قربت اور وابستگی کا احساس جھلکتا ہے۔ مضمون کیا ہے، مرثیہ ہے۔

مسکن [illegible] (پٹنہ) — مظہر امام

● "شاعر" کا نیا شمارہ ۱۱-۱۲ ۸۰ء۔ اُردو ڈرامہ نگاری پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ اس لئے میں نے سب سے پہلے رحمٰن [illegible] کا مقالہ "اُردو ڈراما کا تاریخی جائزہ" پڑھا۔ مگر ڈراما نگاروں میں محمد حبیب صاحب کا نام نہ پاکر سخت حیرت ہوئی۔ انہوں نے کتنے ڈرامے لکھے ہیں۔ جیسے خاتون، [illegible] کی لاش، آتش بہ انجام، غازہ، جنگل، کیتی، دوسری شام [illegible] اور ان کے کئی ڈرامے یونیورسٹی کے نصاب میں بھی شامل ہیں۔ اس سلسلہ میں [illegible] کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ڈراما نگاری کے [illegible] کے وقت اُن کا نام آنا ضروری ہو جاتا ہے۔

[illegible] — (ڈاکٹر) زرینہ ثانی

● تازہ شاعر ملا۔ شکریہ! اس لئے آپ کے اُس ہاتھ اور اُس قلم کو چوم لوں جس سے آپ نے فراق صاحب [illegible] — چند یادیں لکھی ہیں۔

اس مختصر مضمون کے ایک ایک لفظ نے وہ گہرے گہرے کرشمے کر دیئے۔ شعوری احتجاج اسے کہتے ہیں۔ جس میں [illegible] کا نام ہے۔ آہ! آپ نے کتنی گہری شدت سے مرحوم کی موت کو محسوس کیا ہے!! آہ، آہ! ـــ اتنا بڑا صاحبِ علم اور معقول انسان [illegible] سے محروم! ـــ اُن کی حسرتناک موت کے جو دو اسباب آپ نے بتائے ہیں، وہ دونوں کے دونوں درست ہیں۔ یہ درست ہے کہ وہ سردی سے اکڑ گئے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ سردی کی وجہ سے اُن پر دمہ کی کھانسی کا دورہ پڑا اور ان دونوں نے مل کر اُس عظیم [illegible] کے مارے مسافر کی جان لے لی۔

آپ لکھتے ہیں ـــ "میرے وہ جذباتِ نفرت جو عہدِ جدید کے معاشی، سماجی، نظامِ حکومت اور غلط بخشیوں کے خلاف ہیں مجھے ہمیشہ مضطرب، متألم رکھتے ہیں، کچھ اور بھڑک اُٹھے۔" آپ کی اس تحریر میں جو صداقت اور احتجاج ہے، میں تہِ دل سے اُس کا خیر مقدم کرتا ہوں اور اپنے دل کے تمام غموں، دُکھوں اور شدتِ احساس و اضطراب کے ساتھ اپیل کرتا ہوں کہ اپنے قلم سے ایسے ہی جذبات انگیز و حشر خیز مضامین لکھ کر موجودہ معاشرہ کے جبر کو ٹھوکر مار دیجئے۔ اُس وقت تک جد و جہد جاری رکھئے جب تک کہ ہمارا منحوس معاشرہ سرمایہ داری کے چنگل سے رہا نہ ہو جائے۔

میرے بزرگ اور قابلِ صد احترام بھائی! میں دنیا کی زیریں لہروں سے واقف ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ آج احتجاج اور صرف احتجاج کی ضرورت ہے تاکہ صدائے احتجاج ہندوستان کے ساٹھ کروڑ [illegible] کو [illegible] اعجاز صدیقی اور ادریس احمد [illegible] کو جھنجھوڑ کر جگا دے۔ اللہ اکبر! صدیوں کی ظلم کی، انسانوں کی بیکسی کی، ناداری کی۔ ہر طرف [illegible] ہے۔ جبر ہی جبر ہے۔ جبر ہی جبر ہے۔ یہ جبری سماج کب ختم ہوگا؟ کب ختم ہوگا ـــ ؟ ہندوستان کے عوام سے پوچھئے اور ان [illegible]

آپ کے مضمون کی تاثیر نے صبر و ضبط کی حدیں توڑ دیں۔

[illegible] (بہار) — پروفیسر ادریس احمد [illegible]

● آپ یقیناً مجھ سے اتفاق کریں گے کہ عہدِ حاضر [illegible] ادب کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی بلکہ نظم [illegible] نثر کو (dominate) کرتی ہے لیکن شاعر [illegible] احتجاج [illegible] ہے اُس کی [illegible] بالخصوص [illegible] آپ [illegible]

یہ الفاظ مدت سے جو ذخیرہ شکل زبان بنانے میں لگی گا
بہت بڑا حصہ [illegible] سب تو جدید [illegible] کی اس [illegible]
[illegible] سے واپس ہوتے ہیں اور یہ ایک [illegible] ذخیرہ کا
پیش خیمہ ہے۔ مگر آپ تازہ ترین شعری تخلیقات کو دیکھیں تو میری
بات کی [illegible] گواہی دیں گے۔

حسین سید کا کردار واقعی بڑا تکلیف دہ ہے۔ میں آپ کے
دکھ کا اندازہ کر سکتا ہوں۔ آپ نے جس پر اتنی شفقت کی ہو اگر وہ
اندازے سے کم نکلے تو یہ یقیناً "انتہائی دکھ" کا مقام ہے۔ خیر خدا سے دعا
ہے کہ وہ انھیں راہ راست پر لائے۔

شملہ (ایچ۔ پی) — کرشن کمار طور

● ایک ہی مہینے کی مدت میں شاعر کے دو شمارے شاعر پسندوں
کے لیے مسرت بخش ہیں۔ پچھلے بے ترتیبی اور تاخیر کا سلسلہ
ختم ہوا اور ایسے شاعر کا قاری انتظار کی شدت برداشت کرنا بھی
جانتا ہے کیونکہ "شاعر" اس کے ذوق کی بلندی طرح تسکین کرتا ہے
انتخاب و معیار میں وہی سلیقگی نمایاں ہے جو آپ کی ذات گرامی سے
وابستہ ہو جاتی ہے۔ خدا کرے آپ انتہا پسندی، نا ہمواری اور تلخیوں
کے اس ماحول میں شاعر کو اپنے طرح شاخ نجات بنائے رکھیں
کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ آپ کا کس طرح شکریہ ادا کروں آج کے
دور میں تو گروہ بندی اور عصبیت اس قدر شدید ہے کہ کتنی آوازوں کا
خون ہو رہا ہے۔ بہرحال "شاعر" نئے لکھنے والوں ہی کا نہیں بلکہ
مستحکم فنکاروں کے لیے بھی ایک پناہ گاہ ہے۔ کتنے چہرے
ابھر رہے ہیں۔ کتنے ابھریں گے اور سنجیدہ قارئین سے اپنے
فنی خلوص کے لیے صحیح داد وصول کر رہے ہیں۔ میں تو آپ کے
خلوص کا جذبہ معترف رہوں گا اور مجھ جیسے کتنے اعتراف
کریں گے۔

رامپور ہنٹیا پہاڑ گنج۔ الہ آباد — نصر قریشی

● شاعر کا جنوری ۲۰۰۲ کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ نظموں میں
نصر قریشی کی نظم "۲۰۰۲ کا ترانہ" بہت خوب ہے۔ خصوصاً یہ مصرعے

تاریخ سفر سمٹ جائے، تعمیر بام کے سامنے
ساگر [illegible] ساحل [illegible] پر جائے

پھر اپنا آشیانہ تعلق کو سبھال کر پانی لگے
تعمیر ہے اک بنی پر سے لگی تحلیل
پھر گردش آزاد کے شہر خال پائیں گے

خوب ہے۔ بھائی رشی پٹیالوی کی نظم "کمال لگے" جو زمانے کی
جاندار ہے۔ غزلوں میں [illegible] قریشی [illegible]
بہت عمدہ ہیں۔ "شاعر" کا انتظار بڑی بے صبری سے رہتا ہے اور یہ
جب موصول ہوتا ہے تو رات کے ایک دو بجے تک نیند کافور
ہو جاتی ہے۔

اشوک لاج۔ اشوہ دکانگڑہ — منوہر شرما ساغر پالمپوری

● احتشام صاحب کی وفات پر آپ کے ادارتی مضمون نے بڑا متاثر
کیا۔ آپ کے قریبی تعلقات اور شدت احساس کو ہر قاری نے محسوس
کیا ہوگا۔ سچ پوچھئے تو احتشام صاحب کی وفات سے دل بجھ کر رہ گئے ہیں
کئی ماہ گزر جانے پر بھی یہ احساس باقی ہے۔

۵/۸۹ ربن اسٹریٹ کلکتہ ۱۲ — علقمہ شبلی

● "شاعر کے جنوری۔ فروری شمارے" میں آپ نے "جو علت کے تحت" جن
خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ بڑے کام کے ہیں۔ ہم اردو کی بے کسی اور
کسمپرسی کی حالت دیکھ کر کڑھتے ہیں اور اردو والوں سے یہ شکایت کرتے
ہیں کہ وہ اس زبان کی ترقی میں حصہ لینے میں پہلو تہی کرتے ہیں۔ یہ
شکایت اپنی جگہ بجا۔ اب مرکزی حکومت اردو کی اہمیت کو محسوس
کرنے لگی ہے اور دوسری صوبائی حکومتیں بھی اس کی طرف توجہ دینے لگی
ہیں۔ ایسے وقت میں اردو کے مخالفین کو بیدار ہو جانا چاہئے
ساز گار حالات سے فائدہ اٹھانے کی مسلسل کوشش کرنا چاہئے۔

میں آپ کے خیال سے پورا اتفاق کرتا ہوں کہ "جنوب میں اردو
کے مسائل اور اس کی حیثیت الگ ہیں اور شمال میں کچھ اور اس لیے انجمن
ترقی اردو ہند کو شمال اور جنوب دو حصوں میں منقسم کر دیا جائے
تو اردو کے تعلیمی مسائل پر قابو پانے میں بہت آسانی پیدا ہو سکتی ہے۔
اس مسئلہ کو سلجھانے کے لیے جنوب اور شمال کے ذمہ داران ایک
جگہ جمع ہو کر اس پر تفصیلی گفتگو کرنا چاہئے۔"

مزید برآں اردو کے لیے ٹیکنیکل الفاظ بنانے کے لیے جو کمیٹی مرکزی
حکومت نے بنائی ہے [illegible] مضمون [illegible] رکھنا

پلیٹ جیسا کہ ہندی تکنیکی الفاظ بنانے والی کمیٹی کی ایک میٹنگ
تھا سے پارلیمنٹ میں ۱۹۶۸-۱۹۷۰ء تک بحث ہوئی تھی۔
اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ مستقبل میں مقالات میں اردو کے لیے
جو ادیب کام کر رہے ہیں ان سے مقالات کا رخ سب کو ملے گا
اور ان کے مسائل اور مشوروں سے کچھ فائدہ اٹھا سکتی ہے

[illegible] ڈاکٹر انیس غلام رسول

ناظم محمد رسول [illegible]

● شاعر جنوری فروری ۱۹۸۲ء [illegible] ہے۔ مقالات سبھی جاندار ہیں، بالخصوص زرتشت کا دلچسپ اور پر از معلومات مقالہ "الفاظ کی دلچسپ داستانیں" بے حد پسند آیا۔ سال نو کے موضوع پر لکھی گئی مختصر نظمیں، شاذ تمکنت اور مہدی پرتاب گڑھی کی نظموں نے بہت متاثر کیا۔ حضرت اکرام کی نظم "انجان لمحے کا انتظار" نے ایک انمٹ نقش ذہن پر چھوڑا۔ جوگیندر پال کی مختصر ترین کہانی "شناخت" اور جے پرکاش بھارتی کی "غلطی" غیر فطری کا سال بھر کی بہترین کہانیوں میں شمار ہونا چاہیے۔ سب سے زیادہ مجھے جس تخلیق نے متاثر کیا وہ ہے جناب نثار احمد آبادی کی غزل [illegible] کی ہر تخلیق فکر و فن کی بلندیوں پر ہوتی ہے لیکن موصوف کی یہ غزل مجھے بطور خاص بہت زیادہ پسند آئی۔ ہر شعر دل میں اتر جانے کے قابل، ہر ترکیب نادر اور ہر خیال اچھوتا۔ [illegible] کی ترجمانی کا [illegible] ذیل کے اشعار تو [illegible] ذہن سے فراموش نہ ہو سکیں گے۔

چہرہ پہ عکس دیکھ کے رنجیدہ ہوئے ہیں لوگ
پیچھے ہے کون دیکھنے والوں کو کیا خبر
دنیا تو [illegible] سمت رہے جس طرف
خالی ہے کس کا پیٹ نوالوں کو کیا خبر
بے حس دلوں کو عشق کی عظمت کا کیا پتہ
شربت ہے یا کہ زہر پیالوں کو کیا خبر

سلام مچھلی شہری، ضیا فتح آبادی اور راہی قریشی کی غزلیں بھی قابل قدر ہیں۔

[illegible] ضلع بلند شہر — محبوب راہی

عروضی بحث

● شاعر جنوری ۱۹۸۲ء میں حکیم [illegible] کی غزل شائع ہوئی تھی۔ [illegible] نظیر فارانی نے دو شعروں پر [illegible] کا اعتراض [illegible] مارچ ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا۔ پھر اپریل مئی کے شمارے میں [illegible] نے [illegible] کی حمایت کی۔ اس کے برعکس [illegible] شمارے میں [illegible] نے ایک شعر کی تقطیع کر کے غلط ثابت کیا۔ اب نومبر دسمبر میں [illegible] صاحب پر [illegible] آمد ہو گئے۔

اول تو شاعر جیسے [illegible] میں ایسے اشعار آنا ہی نہ چاہئیں اگر [illegible] اصلاح کرنا گوارا نہیں [illegible] تو [illegible] دونوں اشعار مع اوزان لکھ رہا ہوں۔

ایک زمانہ ایسا بھی تھا۔ خورشید [illegible]
فعل فعولن فعلن فعلن فعلن فعلن فعل فعولن

اب تو [illegible]
فعلن فعلن فعل فعولن فعل فعولن [illegible]

اس دور باکمال میں ساقی۔ [illegible] کا جام پیا کرے
فعل فعلن فعل فعولن۔ فعلن فعلن فعل فعولن

انسانوں کے خون [illegible]
فعلن فعلن فعل فعولن۔ فعلن فعلن فعلن فع

دونوں شعروں کے پہلے مصرعوں میں [illegible] "تھے" اور "کر" [illegible] وزن سے زیادہ ہیں۔ اور [illegible] نظیر فارانی کا اعتراض صحیح ہے۔

میں مجبوراً یہ سطور لکھ رہا ہوں۔ اس قسم کی بحثوں کو طول دینا [illegible] "شاعر" کے منافی ہے۔ [illegible] کی مثالیں مل جاتی ہیں لیکن [illegible] "معیار فصاحت" [illegible] مستند شعراء (اردو فارسی) کے کلام سے [illegible]

[illegible] — [illegible] آبادی

[illegible]

[illegible]

غالباً [illegible]
فیض احمد فیض [illegible] ان کے اس خط سے اتفاق
کرتے ہوئے مجھے بعض دوسرے شعرا کے شعر بطور مثال دیے کہ ندیم
کے مصرعوں کا بھی جواز کیا ہے۔ پھر [illegible] موسیقی کی
تاثیر میں ہے۔ گیتوں، شعروں و دھنوں (قطب شاہ بن دیکھیے) اور
دوسری گیتوں [illegible] کے حوالے دیے گئے ہیں۔ خود ظہیر [illegible] نے تسلسل
رکھنے کے لیے ماہنامہ شاعر بمبئی (شمارہ ۱۲) میں اس کا جواب ایک خط بھیجا
ہے۔ اور اس میں لکھا ہے کہ میں بھی اپنی رائے کا اظہار کروں۔

اس موضوعی بحث کے سلسلے میں مندرجہ بالا لوگوں کے جو خطوط آئے ہیں انھیں شائع نہ کرتے ہوئے، صرف محترم علامہ عشق آبادی کا خط شائع کیا جا رہا ہے جو عروض پر ان کی نگاہ گہری ہے۔ بحث کے دوران میری رائے مناسب نہ تھی۔ اب جبکہ کوئی فیصلہ نہیں ہو پایا ہے اور بحث ناگوار موڑ اختیار کر چکی ہے تو اسے ختم کر دینا ہی بہتر ہے۔ مجھے اس سلسلے میں اتنا ہی عرض کرنا ہے کہ علمی و فنی اور عروضی مباحث کو بہت غور و فکر کے بعد اٹھانا چاہیے۔ تعجیلی فیصلے اکثر غلط راستے پر لے جاتے ہیں۔

میں نے اشاعت سے پہلے ندیم اجمیری کی غزل دیکھی تھی۔ سب ہی غزلیں نظمیں، افسانے، مقالے دیکھتا ہوں۔ کوئی بھی خلاف بحر و وزن غزل شاعر کے لیے کیونکر منتخب کر سکتا ہوں؟ ندیم اجمیری کی غزل کے صرف ایک مصرع

"اس عہدِ پاکار میں ساقی، بے کاری کے جام پلا کر"

میں کتابت کی غلطی رہ گئی تھی۔ یہاں "پلا کر" کے بجائے "پلا کے" ہونا چاہیے تھا مگر اس طرف کسی نے توجہ نہ دی۔ ندیم اجمیری کی غزل دوبارہ درج ذیل ہے تاکہ پوری غزل کے بحر و وزن کا التزام سمجھ میں آ سکے۔

یادوں کے شمشانوں میں میرا دیا کل من یوں ڈولے ہے
جیسے بن بن دھاجوگی ہو اکڑ میں آگ ٹٹولے ہے
سارے خواب بکھرتے دیکھے کرنوں والی تھالی میں
جس دم چڑھتا سورج پیڑ کے رات کا کنگن کھولے ہے
ایک زمانہ ایسا بھی تھا خوشیوں کے گودام بھرے تھے
اب ڈنگر کی کھونٹا [illegible] ہے
برسوں سال [illegible] !
اونچے اونچے [illegible] ہے !
[illegible] لگے ہیں، جنتا کی زنجیریں !
شمشان بھوت کا دیوانہ گلیوں گلیوں ڈولے ہے !
پانی کی تو کیسی ہوگی اور بڑھاپا کیسا ہو !
جیب دلی کی خاطر بابن سب کی جیب ٹٹولے ہے
اس عہدِ پاکار میں ساقی بیکاری کے جام پلا کے
انسانوں کے خون میں جیسے سرسوں کیسر گھولے ہے
دو نینن ندیم اس ڈھب سے چھپ کر اپنی آنکھ چراتے ہیں
دنیا کے پلڑے میں جیسے جینا اوچھا تولے ہے !

محترم علامہ عشق آبادی کی نظر سے غالباً ندیم اجمیری کی پوری غزل نہیں گزری اور صرف دو شعروں ہی کا انھیں علم ہو سکا۔ ان ہی کو پیش نظر رکھ کر موصوف نے ایک فیصلہ دے دیا۔

اس بحث میں توجہ طلب اور سمجھنے کی بات یہ ہے کہ بحرِ متقارب میں "مثمن اثرم محذوف" اور "مثمن اثرم مقصور" کا اجتماع جائز ہے۔

ایک زمانہ ایسا بھی تھا خوشیوں کے گودام بھرے تھے

دام بھرے تھے = فاع فعول کے وزن پر ہے (اثرم مقصور)
دام بھرے = فاع فعَل کے وزن پر ہے (اثرم محذوف)

ایک زمانہ	ایسا بھی تھا	خوشیوں	کے گو	دام بھرے تھے
فاع فعولن	فعلن فعلن	فعلن	فعلن	فاع فعول

اس عہدِ پا	کار میں ساقی	بے کا	ری کے	جام پلا کے
فاع فعولن	فعلن فعلن	فعلن	فعلن	فاع فعول

اس مصرع میں "جام پلا کر" غلط چھپا تھا۔ "جام پلا کے" فاع فعول کے وزن پر ہوگا۔ اب ندیم اجمیری کی پوری غزل کی تقطیع کر کے دیکھ لیجیے معلوم ہو جائے گا کہ غزل بحر میں ہے یا نہیں۔ اس غزل کی تقطیع مثمن اثرم کے ارکان سے نہیں کرنا چاہیے بلکہ اثرم محذوف کے ارکان سے کرنا چاہیے۔ متقارب اور متدارک بحر میں شعر کے بالائی وزن کو مجزّہ و مفرّد ارکان سے ناپنا اور بات ہے لیکن وزن کی زیریں لہر کو سمجھنا اور اس میں تدریجی کردار کا تعین کرنا ایک پیچیدہ شعور کے بغیر ممکن نہیں۔ وزن کی زیریں لہر بڑی اہمیت رکھتی ہے جو آہنگ و صوت کے باریک نکتوں اور فرق کے امتیاز کے بغیر نہ سمجھ [illegible] اور نہ اس کی تقطیع کی جا سکتی ہے۔ میں نے [illegible]

گئے ہیں لیکن کہا گیا ہے کہ [illegible] ہمارے [illegible] سکتا ہے بعض شعر
[illegible] سمجھ سکتے ہیں کہ شعر صحیح نہیں پڑھ سکتے۔
اور [illegible] کا حکم [illegible] متنازعہ [illegible]
میں [illegible] نزاکتیں ہیں [illegible] اختلاف رائے بھی ہے لیکن اقتباسات
[illegible] روایتی [illegible] کلام نہیں دیتی۔

جہاں تک [illegible] کے شعر کی خیال کا تعلق ہے، وہ اپنی جگہ صحیح ہے۔

لیکن شاہ نصیر کے پیش کردہ دو مصرعوں میں

(۱) عکس شعاع مہر نہیں یہ بیل چنبیلی لپٹی ہے

اشم مخنوف آخر (وزن دو چند) میں ہے۔ اور

(۲) سرو چمن نے کیا ہے پیدا سر پہ طرہ ہار گلے میں

[illegible] (دو چند) میں۔ لیکن [illegible] نے اس کی تقطیع [illegible] سے کی ہے۔ جو صحیح نہیں ہے۔

اس دوسرے مصرع میں شاہ نصیر نے "میں" لفظ آخر سے "ی" ماقبل نون غنہ کو گرایا ہے۔ اسی طرح قدیم انجمن کے "جام بھرے تھے" میں سے لفظ "تھے" کی یائے تحتانی کو گرایا جا سکتا ہے۔ مگر ہم یہ اصول تسلیم نہیں کرتے کہ شاہ نصیر نے مصرع کے لفظ آخر سے "ی" ماقبل نون غنہ کو گرایا ہے بلکہ ہمیں اُن کے مصرع اول میں ایک سبب خفیف کی کمی ماننا پڑے گی اور دونوں مصرعوں کا وزن مختلف ہو جائے گا۔

اعجاز صدیقی

● "شاعر" کے حالیہ شمارہ میں "توجہات کے تحت" "یہ بیداری اور ہوشیاری کا وقت ہے" پڑھا اور [illegible] آپ کے دل و دماغ میں، آپ کے قلم میں، آپ کے بیان میں اب بھی اتنی طاقت ہے جتنی اُردو کے دوسرے کسی علمبردار [illegible] آپ کی [illegible] ہم سب کو دعوتِ فکر دینے کے ساتھ ساتھ [illegible] اس سلسلے میں اور بھی وضاحت کر سکیں [illegible] تو کیجئے۔ ہماری [illegible] یقیناً [illegible] گی۔

"فرقت کاکوری مرحوم — چند یادیں" پڑھ کر جذبات سے مغلوب ہو جانے [illegible] ہمارے معاشرہ میں شاعر و ادیب کو کتنی کم اہمیت حاصل ہے! حالانکہ [illegible] ولیم [illegible] اپنے پیشے کی بلندی پر پہنچ جانے سے کوئی بڑا آدمی نہیں ہو جاتا۔

[illegible] شاعر و ادیب [illegible] ہے۔
[illegible] مجھے [illegible] اعتماد ہے۔ گنجے [illegible] (بہار) عظیم اقبال

ملکیت بیان و دیگر تفصیلات ماہنامہ شاعر بمبئی

فارم ۴ - رول ۸

۱۔ مقام اشاعت : بمبئی
۲۔ وقفۂ اشاعت : ماہانہ
۳۔ پرنٹر : اعجاز صدیقی
۴۔ پبلشر : اعجاز صدیقی
۵۔ قومیت : ہندوستانی
۶۔ ایڈیٹر : اعجاز صدیقی
۷۔ قومیت : ہندوستانی
۸۔ پتہ : دیناناتھ بلڈنگ، تیسرا منزلہ، فاکلینڈ روڈ، بمبئی ۴
۹۔ ملکیت : اعجاز صدیقی

میں اعجاز صدیقی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔ (دستخط) اعجاز صدیقی

۲۸ فروری ۱۹۷۳ء

زرِ سالانہ ختم ہونے کی اطلاع

آپ کا سالِ خریداری مارچ ۱۹۷۳ء میں ختم ہو چکا ہے۔ یہ تازہ شمارہ آپ کی مدتِ خریداری کا آخری شمارہ ہے۔ ازراہِ کرم آئندہ سال کے لئے چندہ بذریعہ منی آرڈر بھیج کر ممنون کیجئے۔

اگر آپ منی آرڈر نہ بھیج سکیں تو دفتر کو وی پی بھیجنے کی ہدایت کیجئے مگر تجدیدِ خریداری منظور نہ ہو تو بذریعہ خط اطلاع دیجئے۔ شکریہ۔

(منیجر)

محفلِ ادبی

مارچ ۱۹۷۳ء کا یہ تازہ شمارہ

مارچ کا شمارہ، اپنی تاریخِ اشاعت پر تو نہیں، لیکن مارچ ہی میں شائع ہو رہا ہے۔ بمبئی میں چند ماہ سے خاصا انتشار اور بحران ہے۔ مہاراشٹر کی خشک سالی، بجلی اور پانی کی کمی، سیاسی انتشار، تمام صنعتی ادارے اور بجلی سے چلنے والے کاروبار، بجلی کی کمی کی وجہ سے کام کم کر رہے ہیں۔ پریسوں کا بھی یہی حال ہے: "شاعر" ہر حال میں ماہ بماہ شائع ہوتا رہے گا۔

زیرِ نظر شمارہ کافی متنوع اور اہم مضامین نظم و نثر پر مشتمل ہے۔ اعلان شدہ تخلیقات کے علاوہ بھی مزید چند تخلیقات اس میں شامل ہیں۔ چھپتے چھپتے، ایک نہایت دلچسپ مضمون بطور "انتخاب" شامل کر دیا گیا ہے۔ رسالوں میں شائع شدہ مضامین تو عام طور پر پڑھ لئے جاتے ہیں، لیکن اردو اخبارات میں اگر کوئی غیر معمولی اچھا مضمون چھپے اور اسے رسالہ کے لئے منتخب کر لیا جائے تو یقیناً یہ ایک مفید اور پسندیدہ بات ہوگی۔

اگر سالانہ چندے نہ آئیں تو "شاعر" کی زندگی معلوم!

ہر شمارہ میں "شاعر" کے گرامی خریداروں سے زرِ سالانہ وقت پر بھیجنے کی درخواست کی جاتی رہی ہے۔ کئی کئی اطلاعات پر نقصان اٹھا کر بھیجا جاتا ہے۔ مگر تمام حیرت و رنج و افسوس ہے کہ پیہم درخواستوں کے باوجود سالانہ چندے اس تناسب سے وصول نہیں ہوتے، جس تناسب سے ختم ہوتے ہیں۔ کام چلاؤ کیسے چلے؟ اخراجات فی پرچہ بڑھتے ہی رہتے ہیں۔ ان ہزاروں روپے کے اخراجات کو کس طرح پورا کیا جائے۔ کسی بھی خریدار کو وی پی بھیجا نہیں جا سکتا اس لئے کہ ایک وی پی پر [illegible] روپے خرچ ہوتے ہیں۔

"شاعر" کے تمام محترم خریداروں اور خصوصیت کے ساتھ وہ تمام خریدار جن کے سالانہ چندے گزشتہ مہینوں میں ختم ہو چکے ہیں، خود اپنی اپنی جگہ سوچیں کہ "شاعر" کی اشاعت میں کتنی مشکلات پیش آ رہی ہوں گی۔ "شاعر" کے ہر خریدار پر اعتماد و اعتبار کیا جاتا ہے۔ زرِ سالانہ بھیجنے کی درخواست کی جاتی ہے انتظار کیا جاتا ہے۔ [illegible] بہتر طریقہ یہی ہے کہ زرِ سالانہ ختم ہونے [illegible] سے پہلے ہی بھیج دئے جائیں۔ اگر کسی مجبوری [illegible] نہ ہونا چاہئے کہ

[illegible] چند ماہ سے زرِ سالانہ ختم ہو گئے۔ ان تمام حضرات سے گزارش ہے کہ اگر آپ کا زرِ سالانہ ختم ہو چکا ہے تو ازراہِ کرم فوراً بھیجیں۔ یا اطلاع دیں کہ اب "شاعر" نہ بھیجا جائے۔ ایسی صورت میں صرف ارسال شدہ شماروں کی قیمت بھیج دیں۔

آئندہ شمارے میں

اپریل ۱۹۷۳ء

مقالات

اردو رسم الخط کی تہذیبی و لسانی اہمیت / جمیل احمد۔ ایم اے
ملک الشعرا ابوالفیض فیضی۔ فارسی زبان کا۔ پروفیسر ڈاکٹر نظام الدین
ایک شنوائی ______ گوریکر
مضطر خیرآبادی ______ ڈاکٹر خلیل اللہ خاں

کہانیاں

وہ کنواری سی ______ جوگیندر پال
تیرا نام کیا رکھوں۔ بی ______ ابراہیم شفیق
قبر کے چراغ ______ نیاز الدین نیازی
باطل سے ڈھکا ہوا دل ______ انور قمر

خاکہ

پھر کہہ نہ پائے گا یہ لعلِ شب چراغ کوئی ۔ احمد یوسف

ڈراما

آخری فیصلہ ______ ابراہیم یوسف

نظمیں۔ گیت

نازش پرتاپ گڑھی۔ سوہن شرما (ہندی)۔ حلقہ شبلی۔ [illegible]
عبداللہ کمال۔ سلطان رسول۔ [illegible]۔ تو قانی۔ طیب سنگرامی

غزلیات

ابوالفضل صدیقی۔ نعیم قریشی۔ شاہد ماہلی۔ کرشن کمار طور۔ مجیب ساجی

ناولٹ ______ اب یہاں کوئی نہیں رہتا ______ آخری باب ______ شاکر [illegible]

مکتوبات۔ نقد و نظر۔ رفتار

[illegible] اپنے شہر کے ایجنٹ کے یہاں محفوظ کرا لیجئے

رفتار

علمی، ادبی اور تہذیبی خبریں

پروفیسر احتشام حسین میموریل سوسائٹی کا قیام

لکھنؤ، ۱۱ فروری۔ شہر کے ممتاز ادیب، دانشور اور نقاد پروفیسر احتشام حسین [illegible] کی یاد میں [illegible] احتشام حسین میموریل سوسائٹی تشکیل دی گئی ہے۔ [illegible] میموریل سوسائٹی کے صدر [illegible] منتخب کئے گئے۔ [illegible] کو سکریٹری بنایا گیا ہے۔

یہ سوسائٹی ایک جامع کتاب شائع کرے گی جس میں احتشام حسین کے حالات زندگی اور ان کی تحریروں کے اقتباسات شامل ہوں گے۔ یہ سوسائٹی مرحوم کے دستاویزات [illegible] یکجا جمع کرے گی۔ اس کے علاوہ ہندوستانی یونیورسٹیوں میں احتشام حسین گولڈ میڈل [illegible] ہر سال کسی تنقیدی کتاب پر [illegible] اور اردو میں پوسٹ گریجویٹ تعلیم حاصل کرنے والوں کو وظیفہ بھی دیا جائے گا۔

بمبئی میں ساہتیہ اکاڈمی کی طرف سے دو روزہ سیمینار

۲۲ اور ۲۳ مارچ کو بمبئی میں ساہتیہ اکاڈمی دہلی کی طرف سے دو روزہ سیمینار ہو رہا ہے۔ سیمینار کا مرکزی موضوع "آزاد ہندوستان میں ادبی میلانات" ہے اور اس کے تحت شاعری، نثر، ڈرامہ اور ادبی تنقید کے ذیلی عنوانات دیئے گئے ہیں۔ اس سیمینار میں مختلف زبانوں کے ممتاز اہل قلم مختصر تقریریں کریں گے یا مقالے پڑھیں گے۔ سیمینار کی [illegible] نشستیں ہوں گی۔ یہ سیمینار بمبئی [illegible] ۱۲۳ [illegible] بمبئی [illegible] میں ہوگا۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی کو ساہتیہ اکاڈمی کا انعام دیا گیا

علی گڑھ [illegible]۔ ساہتیہ اکاڈمی کی طرف سے [illegible] کی اردو کی بہترین [illegible] رشید احمد صدیقی کو ان کی کتاب "غالب کی شخصیت اور شاعری" [illegible]

[illegible]

ترقی اردو بورڈ کی طرف سے پانچ اردو کتابوں کی اشاعت

دہلی۔ تعلیم اور سماجی بہبود کی مرکزی وزارت کے ترقی اردو بورڈ [illegible] مختلف موضوعات پر [illegible] پانچ کتابیں شائع کی ہیں جن کے نام یہ ہیں۔ (۱) فلسفۂ سیاسیات کی تاریخ [illegible] (۲) [illegible] (۳) [illegible] (۴) نیا لسانی مطالعہ [illegible] (۵) [illegible]۔ اس سے پہلے بھی ترقی اردو بورڈ [illegible] ایک [illegible] پر مشتمل ہوگی۔

اردو طباعت [illegible]

دہلی ۷ مارچ۔ [illegible]

[illegible]

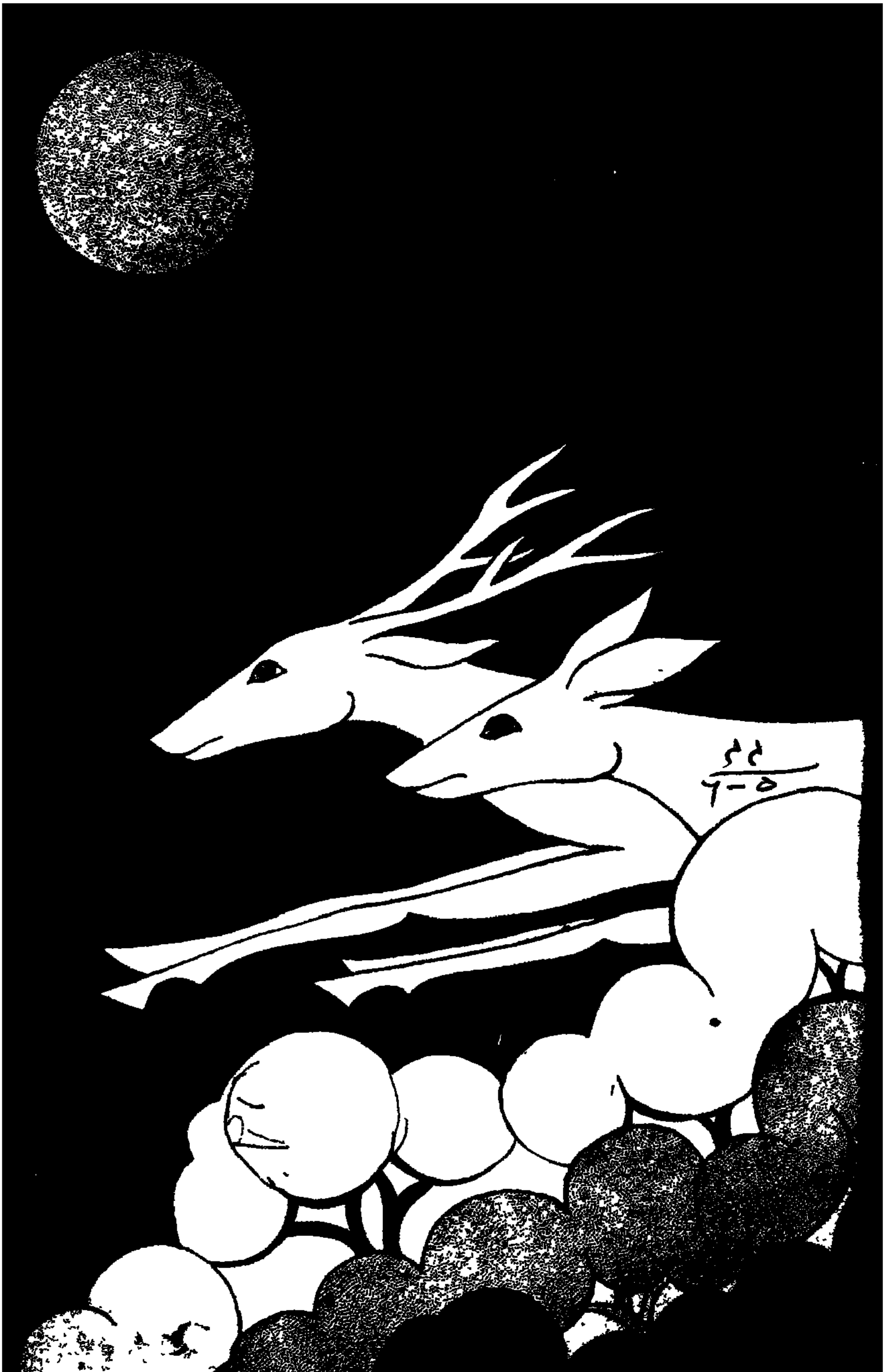
علامہ سیماب اکبرآبادی

کی چند حیات افروز تصانیف

کلیم عجم	(غزلیات)	چار روپیہ آٹھ آنے
سدرۃ المنتہیٰ	(غزلیات)	چار روپیہ
کارِ امروز	(نظمیں)	چار روپیہ آٹھ آنے
شعر انقلاب	(نظمیں)	تین روپیہ
عالم آشوب	(رباعیات)	تین روپیہ
[illegible]	(مراثی، نظمیں اور سلام)	ایک روپیہ

[illegible]

[illegible]



[illegible]

بانی علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

اردو کا واحد پینتالیس سالہ علمی، ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

شاعر

بمبئی

مئی۔جون ۷۵ء

جلد — ۴۴
شمارہ — ۵-۶

مدیر
اعجاز صدیقی

معاونین
مہندر ناتھ
ڈاکٹر محمد حسن

مہتمم
ناظر نعمان صدیقی

زرِ سالانہ — ۱۰ روپئے
معاونین سے — ۲۵ روپئے
تاحیات خریداری — ۱۲۵ روپئے
ممالکِ غیر سے — ۲۰ شلنگ

اس شمارے میں

ٹیلیفون: ۳۵۹۹۰۴

فی پرچہ:
ایک روپیہ پچیس پیسے

ترسیلِ زر کا پتہ
ماہنامہ شاعر قصر الادب بمبئی ۴۰۰۰۰۴

خط و کتابت کا پتہ
ماہنامہ شاعر مکتبہ قصر الادب پوسٹ بکس نمبر ۴۲۶۲ [illegible]
بمبئی [illegible]

بھارت ایک مرقع ہے رنگوں اور روشنیوں کا
مذہبوں کا، رواجوں اور عقیدوں کا
تہذیبوں کا، آدرشوں اور امنگوں کا
زبانوں اور پہناووں کا، کاوشوں اور کامیابیوں کا



بھارت ایک گلدستہ ہے
جس میں بہ کثرت
بھانت بھانت کے پھول
آنکھوں کو بھاتے ہیں،
دلوں کو لبھاتے ہیں،
اور ماحول کو معطر بناتے ہیں

ترتیب

جرعات

مقالات

نظمیں

ایک تاثر

کہانیاں

[illegible]

غزلیں

ڈراما

تقریب جموں

تاثرات جموں

شاعر بمبئی
مئی جون

ایک خبر

اُترپردیش میں اُردو تعلیم کے احکامات کا قتل

حکومتِ اُترپردیش نے اُردو کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے سلسلے میں کئے گئے اقدامات کا جاری شدہ مدد کے ساتھ اعلان کیا تھا اور اُن تمام احکامات کی تفصیلات شائع کی گئیں جو وہاں اُردو تعلیم کے لئے سرکاری طور پر دیئے گئے تھے۔ اُردو والوں نے ان کا خیر مقدم کیا تھا اور فطری طور پر پُر امید ہو گئے تھے کہ اب سے نظامِ تعلیم کے تحت بڑی تعداد میں اُن کے بچے اُردو تعلیم حاصل کر سکیں گے۔ لیکن اخبارات میں شائع شدہ ایک خبر نے اُردو حلقوں کو سخت فکر و تشویش میں مبتلا کر دیا ہے اور وہ خبر یہ ہے کہ

"۹ مئی کے ایک اشتہار میں ریاستی حکومت اعلان کر چکی تھی کہ جولائی ۱۹۸۲ء سے تمام پرائمری اسکولوں میں اُردو پڑھنے کی سہولت دی جائے گی۔ اس کے لئے چار ہزار ٹریننڈ ٹیچر رکھے جائیں گے۔ لیکن ان ٹیچروں کے لئے ایک سرکلر (باضابطہ اشتہار نہیں) ۱۵ مئی کو جاری کیا گیا، جس کے تحت ۲۱ مئی تک درخواستیں طلب کی گئیں۔ اس سرکلر کی اطلاع بعض لوگوں کو اس وقت ہوئی جبکہ بھرتی کی مدت ختم ہو رہی تھی۔ عام طور پر اُردو والوں کو اس سرکلر کی ہوا تک نہیں لگی۔"

اگر یہ اطلاع صحیح ہے تو ظاہر ہے کہ نئے تعلیمی سال کے لئے اُترپردیش میں چار ہزار تو کجا سو نئے اُردو ٹیچروں کا تقرر بھی نہ ہو سکے گا اور جب اسکولوں میں اُردو ٹیچر نہ ہوں گے تو اُردو تعلیم کس طرح دی جا سکے گی۔ یہ ایک سنگین صورتِ حال ہے۔ ہر صوبہ میں نئے تعلیمی سال کے لئے اساتذہ کی ضرورت کا اشتہار کم از کم ایک ماہ قبل کئی زبانوں میں صوبہ کے کثیر الاشاعت اخبارات میں بار بار دیا جاتا ہے۔ اُترپردیش میں اُردو ٹیچروں کے تقرر کے لئے محض ایک محکمہ جاتی سرکلر جاری کر دینا اور اس میں بھی صرف چھ دن کا وقفہ رکھنا اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ محکمۂ تعلیم کے افسرانِ بالا نے دیدہ و دانستہ ایسا کیا ہے۔

ہمیں علم نہیں کہ اُترپردیش کے اُردو رہنماؤں نے اس سلسلے میں کیا قدم اُٹھایا ہے۔ یقیناً وہاں کے محبانِ اُردو اس صورتِ حال سے فکر مند اور پریشان ہوں گے۔ قانون شکنی جرم ہے اور حکومتِ اُترپردیش کے احکامات کی جن افسران نے صحیح طور پر تعمیل نہیں کی اُن کی شکایت اعلیٰ سطح پر ہونا ضروری ہے۔ ہر چند اُترپردیش میں ان دنوں وزارتی انتشار ہے۔ پھر بھی وہ دروازے بند نہیں ہیں جن تک اُردو والوں کو پہنچنا ہے۔ وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی، وزیرِ تعلیمات شری نور الحسن، مرکزی ترقی اُردو کمیٹی کے سربراہ شری آئی کے گجرال، اُترپردیش اُردو اکاڈمی کی صدر بیگم حامدہ حبیب اللہ اور مرکزی انجمن ترقی اُردو کے صدر شری آنند نرائن مُلّا کو فوراً متوجہ کرنا چاہیے۔ مرکزی اور ریاستی انجمن ترقی اُردو کے اراکین کو مشترکہ طور پر بھاگ دوڑ کرنا چاہیے۔ ابھی وقت ہے کہ اس بگاڑ میں سُدھار کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔ حکومتِ اُترپردیش کو اپنے جاری کردہ احکامات کا پاس و لحاظ کرنا ہی پڑے گا۔ ایک بہت بڑی لسانی اقلیت کی آنکھوں میں یوں دھول نہیں جھونکی جا سکتی۔

یہ خاموش رہ جانے کا وقت نہیں ہے۔ ایک سخت تر احتجاجی رویہ اختیار کرنے اور اُترپردیش کے تمام اضلاع میں نگراں تعلیمی کمیٹی بنا دینے کی ضرورت ہے۔ تاکہ یہ کمیٹیاں اپنے اپنے ضلعوں کے افسرانِ تعلیمات سے ملتی رہیں اور جس حد تک بھی ہو سکے نئے تعلیمی سال کے لئے اُردو تعلیم کے انتظامات کرائیں۔ اگر اس سال سرکاری احکامات پر پوری طرح عمل پیرا نہ بھی ہوا جا سکا تو کم از کم آئندہ سال کے لئے راہیں ضرور کشادہ ہو جائیں گی اور اُن خلاؤں کو پُر کیا جا سکے گا جو اس سال رہ جائیں گے۔ واویلا اور بے دلی سے کام نہیں چل سکتا۔ بلکہ عمل، تدبیر، مسلسل اور عزم و حوصلہ کی ضرورت ہے۔

غزلیں

نثار ناری

تھی بڑی چنچل بڑی طرارہ تیرے شہر میں
نکہتِ گل ہو گئی آوارہ تیرے شہر میں

دل تماشائی تھا حسن و عشق تھے محوِ ستیز
مفت ہی مارا گیا بیچارہ تیرے شہر میں

بوالہوس بھی ہیں گلی کوچوں میں سرگرمِ نظر
لٹ نہ جائے عصمتِ نظارہ تیرے شہر میں

لاکھ کے محلوں میں کب تک مطمئن بیٹھیں گے لوگ
جھونپڑوں پر پھینک کر انگارہ تیرے شہر میں

ذلتیں جتنی مقدر میں لکھی تھیں مل چکیں،
کیا کروں گا آ کر اب دوبارہ تیرے شہر میں

دشمنِ جاں بھی ہے جانِ جاں بھی ہے اے زندگی
تجھ سے بڑھ کر کون ہے فنکارہ تیرے شہر میں

اب تو اپنے گھر کی چھت سے چار سو پتھر نہ پھینک
ہو چکا ہر آئینہ صد پارہ تیرے شہر میں

ہاتھ میں بچے کے اک ڈوری ہے کچے سوت کی
آدمی ہے گیس کا غبارہ تیرے شہر میں

کوئی رہزن کوئی قاتل کوئی معروفِ فریب
بچ گیا میں ایک ہی ناکارہ تیرے شہر میں

عامر صدیقی

جو غم گسار تھا اپنا عدو میں شامل تھا
کسی کے لطف کا جھونکا بھی لو میں شامل تھا

اسی پہ ختم ہوا سلسلہ تجسس کا!
یہ ہر نفس جو مری جستجو میں شامل تھا

اسی مقام پہ لفظوں نے ساتھ چھوڑ دیا
خود اپنا حال جہاں گفتگو میں شامل تھا

اِس آئینے کو غباروں نے ڈھک لیا ورنہ
ترا خیال مری آبرو میں شامل تھا

ہوئی اُسی سے جبینِ انقلاب کی روشن
جو ایک کرب ہمارے لہو میں شامل تھا

کھلے جو پھول تو عقدہ یہ شجر پہ کھلا،
خزاں کا ہاتھ بھی جوشِ نمو میں شامل تھا

بچائے خود کو ہم آخر کہاں کہاں اس سے
ہوس کا رنگ ہر اک آرزو میں شامل تھا

مقالہ

ڈاکٹر محمد علی زیدی

داغ کا تصورِ عشق

داغ کے نظریۂ عشق پر غور کرنے سے پہلے ان کے زمانے کے سماجی اور ثقافتی ماحول کا جائزہ لینا اور ان کے زمانے میں عشق کا کیا مفہوم تھا اور اس مفہوم کی تشکیل میں کن کن محرکات نے کام کیا۔ ان تمام امور پر غور کرنا ضروری ہے۔ ان کے علاوہ داغ کے ذاتی رجحانات، افتادِ طبع اور تاثراتِ ذہنی کا پتہ چلانا بھی ضروری ہے۔ طوالت کے خوف سے یہاں ان باتوں کا محض سرسری جائزہ لیا جائے گا۔

داغ کا آغازِ شباب اور شباب کا زمانہ قلعۂ شاہی کی ہنگامہ پرور اور رنگین فضا میں گزرا۔ ڈاکٹر مسیح الزماں لکھتے ہیں:۔

> "گھر سے باہر کا ماحول ہو یا قلعۂ معلّیٰ کا، داغ کو ہر طرف جنس پرستی، لذت اندوزی اور سرمستی نظر آئی۔ خالص جسمانی محبت اور وہ بھی ایسی نہیں کہ چھپ چھپ کر کی جائے اور گھٹ گھٹ کر بڑھائی جائے۔ اس زمانہ کا خوش حال طبقہ ایسی محبت کو فیشن میں داخل سمجھتا تھا۔ یہ محبت بھی تھی اور تجارت بھی۔ سودا بھی تھا اور جذبات کی آسودگی بھی۔ داغ نے بھی اسی رنگینی میں گزاری ہے۔"[1]

چنانچہ وہ خود کہتے ہیں ؎

ہے وہ دن کہ میسر تھی ہمیں رات نئی روز معشوق نیا روز ملاقات نئی

یہی وجہ ہے کہ ان کی طبیعت میں حسن پرستی اور لذت اندوزی رچ بس گئی تھی۔ نظارۂ حسن و شباب ان کی شاعری کا زبردست محرک تھا۔ چنانچہ تمکین کاظمی لکھتے ہیں:۔

> "داغ کا یہی عالم تھا۔ حسینوں کو دیکھتے اور شعر کہتے تھے۔ تاوقتیکہ ان کے سامنے کوئی کافر ادا نہ ہو ان کی شاعری میں حرکت پیدا نہ ہوتی تھی۔ چنانچہ اسی لئے انہوں نے طوائفوں اور رنڈیوں کو اپنا شکار بنایا تھا اور یہ سلسلہ مرتے دم تک قائم رہا۔"

وہ خود بھی اپنی اس افتادِ طبع کا ذکر کرتے ہیں ؎

نظر آئی ہے پری رو جو کوئی شوخ و شریر گدگدائی سی ہے پھر اے داغ طبیعت کیسی

یہی وجہ ہے کہ وہ ایک چابک دست مصور کی طرح ہر ادا کی برمحل تصویر کھینچ لیتے تھے۔ داغ نے جس معاشرے میں آنکھیں کھولیں، پرورش پائی اور عہدِ شباب گزارا وہ ایسا ہی تھا کہ طوائفوں سے عشق کرنا اور رنڈیوں سے دل لگانا اور محبت کی پینگیں بڑھانا تہذیب میں داخل تھا بلکہ اسے امیری سمجھا جاتا تھا۔ نمائش، حسن اور دلربائی چند سال کی زندگی کا جزوِ لاینفک ہو گیا تھا لیکن ان کی عیش پرستی اور لذت اندوزی بھی کسی قدر ادبیت کا پہلو لئے ہوئے تھی۔ انہیں اپنے جنسی، جمالیاتی، ادبی، ذہنی اور عیش کوشی کے ذوق کی آسودگی کا سامان طوائفوں یا اسی قبیل کی عورتوں کی صحبت میں ملتا تھا۔ طوائفیں بھی اسی قسم کا مذاق رکھتی تھیں اور تہذیب کا بڑا مرکز بن گئی تھیں۔ چنانچہ پروفیسر احتشام حسین لکھتے ہیں:۔

> "جاگیردارانہ نظام میں ادب کا بڑا حصہ اسی طبقہ کا ترجمان ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ شعر و ادب کی محبت بالعموم ازدواجی زندگی کا جز نہیں [illegible] کے باہر ہے اور چونکہ بعض ملکوں اور قوموں میں پردہ کا رواج بھی پایا جاتا ہے اس لئے ازدواجی زندگی سے باہر محبت اور [illegible]

[1] حرف و غزل ص ۱۴۰

"توجیہ و وضعداری ایک شعار تھا جس کا اظہار عوام و خواص کی صحبت میں ایک خاص رنگ کی تہذیب کا بنیادی جذبہ جس کی [illegible] سے بھی ملتا تھا۔ [illegible] کی زندگی میں اپنی طرح کی سماجی زندگی سے واقف تھے بلکہ ایک حد تک اس کا ہر فرد بزرگ کی حیثیت اختیار کر لیتی تھی۔"[1]

اس کے برعکس طوائفوں میں سے اکثر صاحب ذوق اور شعر کی سمجھ رکھتی تھیں اور اپنے بناؤ سنگھار نے اور اپنی ادا و آن بان سے امیر زادوں کے لئے شعر و شاعری سے بہت دلچسپی رکھتی تھیں بلکہ بعض ان میں سے اکثر شاعرہ ہوئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ حسن و شعر و نغمہ کی اس فضا میں قلب و کلام و ذہن کے ساتھ ساتھ جنسی آسودگی اور تشنہ جذبات کی سیرابی کا بھی سامان ہوتا تھا۔ ان محفلوں میں عموماً ایک عملی اور معنوی عاشق کی فضا پیدا کی جاتی تھی۔ بقول ڈاکٹر اعجاز حسین :-

"ہر شخص بقدرِ توفیق ایک ہی سے ملنے کی کوشش کرتا تھا اور اس زندگی و وابستگی کو عشق سے تعبیر کرتا تھا۔ طوائفوں کی حرکات و سکنات کو اپنی شاعری کا مرکز بناتا تھا۔ جو واقعات اپنے مزاج کے خلاف پاتا ان کو جور و جفا کے خانہ میں رکھ دیتا اور اپنی خواہشات کے تحت جو کچھ ہوتا اس کو وفا و ایثار وغیرہ سے تعبیر کرتا۔ اس طرح برائی اور عشق کی سرحد ہمارے ایک دور کی شاعری میں ملتی نظر آتی ہے۔ اگر دور شاعری کے اس دور کا جائزہ لیں جو داغ سے ذرا پہلے اور کچھ بعد تک تھا تو آسانی سے یہ محسوس ہوگا کہ اس دور کا معشوق طوائف ہے اور عاشق تماش بین ہیں۔ وفا و جفا کی حکایتیں بھی معشوق کے برتاؤ میں، لباس میں، طرزِ معاشرت میں غرض کہ اکثر باتوں میں آپ کو اسی کے تاریخی ثبوت مل جائیں گے۔"[2]

داغ اسی مسلک کی ترجمانی کرتے ہیں۔ انہوں نے اسی عہد اور اسی ماحول میں زندگی بسر کی اس لئے ان کے کلام میں بھی ماحول کے اثر اور فطری تقاضوں کے تحت محبت بازاری کا عشق ہے۔ جس عشق کے اور جس تعلق کے کہیں کچھ مخصوص اصول تھے۔ اخلاقی انحطاط کی بھی کچھ حدیں غرضی طور پر مقرر تھیں جس میں کمی بے راہ روی اور مطلق العنانی نہیں تھی۔ عبد الرزاق نے مولانا شبلی اور سر سید احمد خاں کی اس سلسلے میں ایک گفتگو نقل کی ہے وہ دیکھنے کی ہے۔

"ایک صحبت میں مولانا شبلی نے ایک عجیب سوال کیا۔ ...... وہ سوال یہ تھا کہ دلی میں جو امیر زادے طوائفوں سے تعلق رکھتے تھے، وہ طوائف بجز ایک دوسرے سے ناجائز تعلق نہ رکھتی تھی اور صرف ایک کی ہو رہتی تھی حالانکہ بازار کی مٹھائی خرید کر کے ہر شخص کو کھانے کا اختیار ہے۔ سید صاحب نے فرمایا ہے آپ اس کا تعجب نہ کیجئے یہ ادا ان میں شریف زادوں کی صحبت کی وجہ سے تھی اور اس عہد کے دوستوں کا بھی یہ حال تھا کہ طوائفوں کا بہ طور بھاوج سمجھتے تھے اور جب تک قطع تعلق نہ ہو جائے کوئی دوست اس طوائف سے ہرگز تعلق پیدا نہ کرتا تھا۔ یہ بھائی چارہ بھی مروت کا نتیجہ ہے۔"[3]

سر سید احمد خاں کے مذکورہ بالا بیان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس عہد میں طوائفوں سے تعلق رکھنا معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ اس کے خلاف شائستگی اور شریفانہ زندگی کی دلیل سمجھا جاتا تھا۔ اس تعلق کا دوست لوگ پاس و لحاظ بھی کرتے تھے۔ اس دور میں جبکہ حسن کا جلوہ عام نہیں تھا یہی عشق و محبت کے مرکز تھے۔ داغ نے اسی عشق کی ترجمانی کی ہے۔ ان کی شخصیت میں ایک رنگینی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے معاملاتِ عشق اور واردات محبت ان کی شاعری میں جا بجا نظر آتی ہیں۔ انہوں نے اپنے عشق کو نہ مجاز کی سرحدوں سے آگے بڑھایا نہ تصوف کا رنگ دیا اور نہ کوئی اعلیٰ اور خیالی معیارِ عشق پیش کیا ان کا تو اصول یہ تھا :

کیا سے کیا کرتی ہیں حسینوں نہ کہیں · جی بہل جائے گا کہیں نہ کہیں
باتوں باتوں میں سنے وہ جو آپ کی باتیں ! · [illegible] ہے تو آپ کا غلام نہیں
کوئی جب ہم سا طرف سے بھی تو الفت ہوگا · تم سا آپ سے کوئی کوئی اور ہوگا

فراق گورکھپوری نے اس زمانے کے ماحول، معاشرتی حالات اور عشق و محبت پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے :-

"داغ کے عشق و عاشقی کا تعلق کی تنگی اسی زمانے کا مسلمان جاگیردار طبقہ کی زندگی میں نظر آتی ہے۔ تہذیب کا ظاہری پہلو اس کے [illegible] اور رنگینی سے [illegible] تہذیب کی روح [illegible]۔ ایک کردار اور عشرت نے تہذیب کی [illegible]

---

[1] ذوق ادب و شعور [illegible] [2] [illegible] نمبر [illegible] صفحہ ۱۳ [3] یاد ایام ص ۱۸

غلبہ پایا ہے۔ طلسماتی میں محبت اور گھمنڈ ابل چکے ہیں۔ جس انحطاطی دور میں دلّی کی تہذیب کا طلسم ٹوٹ گیا تھا۔ جذبات کے
شاعری کا تعلق ہے عشق سے پریم اور محبت محسوس کرنے اور برتنے کے بجائے اب اس کی جگہ ابل جاتی ہیں۔ بجائے اداس یا غمگین
ہونے کے اب ایک بے جا کھسیاہٹ کا اظہار کیا جاتا ہے۔ طعنے جملے اب کھلی سرگرانی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ محبت کا جذبہ
ایک انتقامی جذبہ بن جاتا ہے۔ اب ذہنی طور پر بجائے معشوق کو گلے لگانے کے جذبے کے اس پر چڑھ بیٹھنے کا جذبہ کارفرما ہے۔ نرم یا
یا خاموش جذبہ اب چرب زبانی میں بدل جاتا ہے اور تعمیر کر کے اسے بیان کیجئے تو کہنا پڑے گا کہ محبت کے دل اور زبان پر چربی چڑھ جاتی ہے۔
مطلب کی لچک مٹ کر ایک خشک اور کرخت اکڑ پن میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ دل اور زبان دونوں ہڈی کے بن گئے ہیں یا نہایت سخت و
کثیف گوشت کے۔ اب شاعری اپنی گھلاوٹ سے بجائے نرم پڑی بوجھل ہو گئی ہے۔ داغ کے کلام میں یہ تمام خرابیاں اپنی انتہا کو پہنچ
گئی ہیں۔ سپردگی کا جذبہ ڈاکہ زنی کا جذبہ ہو گیا ہے۔ بازاری عشق نے حسن پر حملہ بول دیا ہے۔ ہم آہنگی مخاصمت میں بدل گئی ہے۔

لیکن اس تمام عمل میں ایک ہنگامہ آرائی کی شان ہے اور یہ شان اور آن بان یہ ہماہمی جس تیور کے ساتھ داغ کے کلام میں نظر آتی ہے
داغ کے پہلے یا داغ کے بعد اردو شاعری میں کہیں نظر نہیں آتی۔[1]

فراق گورکھپوری نے اس دور کی حالت کا نقشہ جن الفاظ میں کھینچا ہے کسی حد تک وہ درست ہے لیکن ان کی رائے کی وقعت و اہمیت کو نظر میں رکھتے ہوئے بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے۔ داغ معشوق کو کھری کھری سنا دیتے ہیں لیکن پتھر نہیں مارتے۔ ان کے کلام میں کنارہ کشی کے ساتھ سپردگی کا بھی جذبہ ملتا ہے لیکن ڈاکہ زنی کا جذبہ نہیں ملتا۔ ان کے عشق میں بازاریت کا ہلکا سا عکس ضرور نظر آتا ہے۔ لیکن یہ بالکل بازاریت نہیں۔ انھوں نے اپنے عشق پر تصنع اور تکلف کے پردے نہیں ڈالے، نہ پارسائی کی قسمیں کھائی ہیں۔ انھوں نے عشق کی تہہ میں جو جنسی لگاؤ ہوتا ہے صاف صاف اور بے باک انداز میں بیان کر دیا ہے۔ داغ کے زمانے میں جب معاشرتی آزادی برائے نام کیا بالکل نہ تھی۔ جب صنفِ نازک کا مردوں کے دوش بدوش اجتماعات یا مخصوص محفلوں میں شریک ہونا تصور میں بھی نہیں آ سکتا تھا۔ یہ بات قطعاً حیرت انگیز نہیں کہ ہمارے شعراء بازاری عورتوں کو اپنا محبوب بنا کر وارداتِ عشق بیان کرتے۔ ظاہر ہے کہ اربابِ نشاط کی محفلوں میں وہ معلمِ اخلاق ہو کر یا عرفانِ حقیقی حاصل کرنے کے لئے نہیں جاتے تھے۔ نہ ان کا مقصد معاشرے کی اصلاح کرنا ہوتا تھا۔ ان کا مقصد محض تفریحِ طبع حاصل کرنا اور لوازماتِ عشق کو پیش اور پورا کرنا ہوتا تھا تاکہ لذت میں اضافہ ہو سکے۔ داغ نے بھی ایسے عشق کو بیان کیا ہے۔ ان کا قصور اگر ہے تو صرف اتنا ہے کہ انھوں نے اس حقیقت کو بے جھجک اور بے باک ہو کر بیان کر دیا ہے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ان کی اس خصوصیت کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"لیکن اس اعتبار سے بھی وہ کم از کم اُن غزل کے باکمال استادوں سے زیادہ قابلِ احترام ہیں جنھوں نے اسے چھپانے کی کوشش کی اور سچا کا
سچا یا بچا پردہ ڈالا ہے جو یقیناً داغ کی صاف گوئی سے زیادہ مکروہ اور نفسیاتی اعتبار سے ایک مریض ذہنیت کا ترجمان ہے۔"

اسی اعتبار سے داغ کا عشق صحت مند عشق ہے۔ ان کے عشق میں جنسی بھوک اور تشنگی نہیں ہے بلکہ جنسی آسودگی اور صحت مند عشق ہے۔ ان کی نفسیاتِ عشق منعکس PERVERTED یا خلافِ معمول ABNORMAL نہیں ہے نہ اس میں جنسی بے راہ روی ہے۔ ان کا عشق ماحول کے مطابق بھی ہے۔ خود فراق گورکھپوری نے عشق کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

"عشق ایک شدید ترین احساس کا نام ہے۔ بنیادی طور پر یا مرکزی طور پر تو اس کا مرکز یا تعلق جنسیات یا شہوانیت ہی سے ہوگا
اور یہاں سے ابھر کر جذبات اور نفسیات کو اپنی لپیٹ میں لیتا ہوا تمام قوائے انسانی اور تمام شخصیت میں یہ احساس ایک عجیب
تحریک بھر جاتی ہے اور شش جہت سے انسان پر چھا جاتی ہے۔"

داغ بھی اسی عشق کی ترجمانی کرتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

---

[1] نگار، داغ نمبر (داغ از فراق گورکھپوری) ص ۲۶

طبیعت کوئی دن میں بھر جائے گی — چڑھی ہے یہ آندھی اتر جائے گی

وہ ہرجائی اگر ہے داغ ہو تم بھی تو آوارہ — کہیں کب مہر ہے بیٹھے ہوئے تم ایک پر کیا ہو

سنگ دل کہنے سے تو آپ برا مان گئے! — یہ جو کچھ سینے پہ ہے اس کو بھی پتھر نہ کہیں

ہم ایک کے پابندِ محبت نہیں ہوتے — ہے رنگ طبیعت کا کہیں اور کہیں اور

وہ ایک نہ ایک ہم لگائے رکھتے ہیں کے قائل تھے۔ اس لئے وہ معشوق سے دبنا یا عاجزی انکساری کرنا نہیں جانتے تھے۔ علامہ نیاز فتح پوری لکھتے ہیں۔

"وہ جس سے تعلق پیدا کرتے تھے اس کو اپنا محکوم بھی رکھنا چاہتے تھے اور اگر وہ اس پر راضی نہ ہوتا تھا تو خود کسی اور سے ہو جاتا تھا۔ الغرض داغ کی شاعری اس جنسی تعلق کی شاعری تھی جسے ہر وقت حاصل کیا جا سکتا ہے اور جس کو ترک کرکے زیادہ تکلیف بھی نہیں ہوتی۔ لیکن یہ سمجھنا کہ اس قسم کی شاعری کوئی جان نہیں رکھتی غلط ہے۔ عیاشانہ زندگی اختیار کرنا اور اسے نباہنا آسان بات نہیں۔ اس میں بھی خدا جانے کتنے نئے موڑ سامنے آتے ہیں۔ کن کن پیچدار راہوں سے گزرنا پڑتا ہے اور کتنے وار روکنے پڑتے ہیں[1]۔"

یہی وجہ ہے کہ داغ کا عشق کتابی اور روایتی عشق نہیں ہے۔ بلکہ یہ تجربات و مشاہدات ان کی ذاتی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ان کے اظہار میں داغ نے ایک دلچسپ کیفیت پیدا کر دی ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی داغ کی شاعری کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"داغ کی تمام تر شاعری جوان شاعری ہے۔ ان کے یہاں بوالہوسی بھی تندرست قسم کی بوالہوسی ہے اور اس میں ایک البیلا پن ہے[2]۔ ان کی شوخی اور البیلے پن میں ایک خاص شان ہے جسے ان کی حسنِ ادا اور خوبیٔ بیان نے دوبالا کر دیا ہے اس میں ایک تیکھی رچاوٹ ہے۔"

ڈاکٹر یوسف حسین خاں لکھتے ہیں:۔

"داغ کی شاعری کا محرک ہوس پرستی کا جذبہ ہی لیکن یہ جذبہ صحت مند ہے۔ جرأت کی طرح محض عیاشی کی آرزو نہیں ہے۔ اسے ہم بقول حسرت موہانی فاسقانہ شاعری کہہ سکتے ہیں جو لطف سے خالی نہیں اور جس میں نشاط اور شوخی کی آمیزش ملتی ہے، جسے طرزِ بیان کی چستی نے نکھار دیا ہے۔ داغ کے کلام کی جمالیاتی صداقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا[3]"

داغ کا عشق مجازی ہے ان کی محبوبہ حسن فروش عورت ہے جس میں ہم دم و ہم سفر بننے کی صلاحیت نہیں ہے۔ البتہ سامانِ عیش و نشاط بننے کی پوری صلاحیت ہے۔ بعض اوقات محبوب سے ان کا طرزِ تخاطب عجیب اور بازاری ہو جاتا ہے اور اس قسم کے عشق میں ایسا ہونا بھی چاہیئے۔

داغ کے اس انداز تخاطب کے متعلق پروفیسر وقار عظیم کا بیان دلچسپی سے خالی نہیں وہ لکھتے ہیں:۔

"محبوب کے ساتھ ان انداز تخاطب میں جو دیدہ دہنی، بے باکی اور پست درجہ کی غرض مندی ہے۔ اس کی جڑیں ہر جگہ آوارہ مزاجی اور عیاشی سے ملتی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بظاہر ایک غلط قسم کے احساس برتری میں مبتلا ہیں اور محبوب کو اپنی آتش ہوس بجھانے کا ایک وسیلہ جانتے ہیں لیکن محبوب کا ہرجائی پن اس میں مخل ہوتا ہے تو ان کے بچپنے نے برے سے قسم کی طنز، اوچھی و رنج کی دھمکیوں کی شکل اختیار کر لی ہے۔"

داغ نے اپنے محبوب کا تعارف اس طرح کرایا ہے ؎

خود نما کج نگہ بے قرار حیلہ جو شوخ — تم اپنی شکل تو پیدا کرو حیا کے لئے

ہر ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی — اف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی

۱۔ نگار داغ نمبر (علامہ نیاز فتح پوری) ص ۳ ۲۔ فکر و فن ص ۱۱۹ ۳۔ اردو غزل ص ۱۰۰

خدا کسی کو آنکھیں نہ دے جیسی پُر درد بے سر ہیں — مجھے تمام رات ہے بے چین کس کی محبت کے گھر میں
چاہنے والے اور بُرے کر بیٹھے — اُن کے دفتر میں نام ہے صاحب کا

جیسا اُن کا محبوب ہرجائی ہے اُسی طرح وہ بھی کسی ایک کی محبت کے پابند نہیں ہیں ؂

کمالِ عشق کو فرہاد و قیس کب پہنچے — وہ پختہ کار ہے دل جس کا بار بار آیا
ہم ایک کے پابند محبت نہیں ہوتے — ہے رنگ طبیعت کا کہیں اور کہیں اور

یہی وجہ ہے کہ وہ محبوب کو کھری کھری سنا دیتے ہیں۔ معشوق کے اشاروں پر چلنا اُن کے لئے ذلیل و خوار ہونا۔ اُس کی گھڑکیاں، جھڑکیاں خاموشی سے سہنا جو غزل کی عام روایات عشق میں داخل تھے اُن کے ہاں مفقود ہیں۔ وہ محبوب سے ایسی سطح پر ملتے ہیں جہاں ان کا وقار بھی قائم ہے اور معشوق بھی مگر نہ معلوم ہو جب وہ ناراض ہوتے ہیں تو محبوب کو جلی کٹی بھی سنا دیتے ہیں۔ لیکن بعد میں دل جوئی بھی کر دیتے ہیں اور معشوق کو یہ بھی جتا دیتے ہیں کہ ان کا عشق عقل و ہوش کی حدود میں رہتا ہے ؂

بے شک مجھے ہے عشق ترا پر خدا گواہ — جتنا ترے گمان میں ہے اس قدر نہیں
ہر اک سے کہتے ہیں کیا داغؔ بے وفا نکلا — یہ پوچھے اُن سے کوئی وہ غلام کس کا تھا
دنیا میں وضع دار حسیں اور بھی تو ہیں — معشوق ایک تمہیں تو نہیں اور بھی تو ہیں
جواب اس طرف سے بھی فی الفور ہوگا — دبے آپ سے وہ کوئی اور ہوگا!

وہ نہایت بے تکلفی اور بے باکی سے اس طرح کی باتیں کہہ جاتے ہیں کہ جن سے اُن کے محبوب کا شیوہ سب پر ظاہر ہو جاتا ہے اُن کے محبوب کی بے حیائی، بے حجابی اور ہرجائی پن ثابت ہو جاتا ہے ؂

تمہاری طرح بھی ہوگا نہ کوئی ہرجائی — تمام رات کہیں ہو کہیں ہو سارے دن
ہیں رخِ نازک پہ گنتی کے نشاں — کس نے بوسے تیرے گن گن کر لئے
روز سنتے ہیں نیا ایک نہ اک شیدائی — نام نکلے ترے دفتر میں چلے آتے ہیں

اُن کے محبوب کی دیدہ دلیری بھی ملاحظہ فرمائیے۔ کس بے حیائی سے جواب دیتا ہے ؂

پوچھتے کیا ہو کیوں لگائی دیر — اک نئے آدمی سے ملنا تھا
تم سے تو واسطہ ہی کچھ نہ رہا — اب طبیعت رقیب پر آئی
وہ قدِ بت کا سرکنا وہ کسی کا کہنا — آنکھیں پھوٹیں جو کوئی سینہ ہمارا دیکھے

داغؔ کے یہاں پاکبازی اور فرشتہ خصلتی کا دعویٰ نہیں ملتا۔ نہ وہ تہذیب و اخلاق کا ظاہری لبادہ اوڑھتے ہیں اور نہ اپنے محبوب اور خواہشاتِ نفسانی پر زہد و اتقا کا ظاہری خول چڑھاتے ہیں بلکہ ان کا ظاہر و باطن ایک ہے وہ اپنے جنسی تجربات اور جذباتی کیفیات و لذات کو بے کم و کاست بیان کر دیتے ہیں۔ اسی لئے اُن کے کلام میں جنسی کج روی اور مریضانہ ذہنیت نہیں ہے۔ وہ عشق کو جنسی آسودگی کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور بے باکی و جسارت سے اسے بیان کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن پر فحش گوئی اور ابتذال کا الزام لگایا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہ اُن کی شاعری میں فحش گوئی ہے نہ جنسی کج روی ہے نہ ناشائستگی ہے بلکہ چہل اور بانکپن کے ہوا کچھ نہیں ہے۔ یہاں بھی اشاروں اور کنایوں سے کام لیکر فحاشی سے اپنا دامن بچا لیتے ہیں۔ وہ مومنؔ کی طرح کبھی چھیڑ چھاڑ اور کنایے سے ہٹ کر ابتذال تک نہیں پہنچتے بلکہ زیادہ سے زیادہ شوخی اگر کرتے بھی ہیں تو "زبان تیری دہن میں میرے" کہہ دیتے ہیں۔ وہ معاملہ بندی کی تشریح نہیں کرتے۔ ان کا عشق شوخ اور بے باک ضرور ہے اور اسی انداز کے لئے انھوں نے کہا ہے ؂

میرا نصیبِ عشق جدا ہے جہان سے   چلتا ہوں چھوڑ چھوڑ کے ہر رہگذر کو میں

جس طرح اُن کا نظریۂ حیات بلند نہیں تھا اُسی طرح اُن کا نظریۂ عشق بھی بلند نہیں تھا۔ اُن کے عشق میں گہرائی اور عمق بھی نہیں ہے بلکہ سطحیت ہے لیکن اُن کے بیانِ عشق کی کڑیوں کا ایک تسلسل ضرور ہے۔ ڈاکٹر محمد طفیل ان کے عشق کے مخصوص انداز کے بارے میں لکھتے ہیں :۔

"ایک وقت میں ایک عشق کا ایک مخصوص کینوس بھی ہے اور اس درمیان میں رخنہ اندازی نہیں کی جاسکتی مگر ایک تسلسل کی تکمیل کے بعد رفتہ رفتہ دوسری منزل میں داخل ہو جاتے ہیں اور پھر اس کا تسلسل انہیں تکمیل تک کھینچ لے جاتا ہے۔ اس درمیان میں اُن کے انہماک میں وہی شان اور تڑپ رہتی ہے جو مثالی عاشق کے تصرف میں کبھی کبھی مل جاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ داغ اپنے کو ہرجائی کہتے ہوئے بھی ہرجائی نہیں ہوتے اور عشق کا معصوم جذبہ تحیّر و تذلیل کی سرحدوں میں قدم رکھنے سے بال بال بچ جاتا ہے۔"[1]

واردات و تجرباتِ عشق کو داغ نے جس بے باکی اور جسارت سے بیان کیا ہے اُس کی چند مثالیں ملاحظہ کیجئے ؎

وصل کے بعد وصل کی خواہش فزوں تھی   وہ کیا رہا جو عاشقِ دیدار ہی رہا
لے لئے ہم نے لپٹ کر بوسے !   وہ تو کہتے رہے ہر بار یہ کیا
دہن کو ہے مزا تیرے دہن کا !   زباں کو چاٹ ہے تیری زباں کی
شبِ وصال نہ ٹھہرے حیا کے آنے کی !   کہ پھر کبھی نہیں یہ رات جا کے آنے کی
وہ جو بولیں تو بات جاتی ہے   چپ رہوں میں تو رات جاتی ہے
مزا جب ہے کہ اس انداز سے ہوں پیار کی باتیں   ہمارا ہاتھ سینے پر تمہارا ہاتھ گردن میں

داغ کا رقیب بھی اردو شاعری کا روایتی رقیب نہیں ہے، جس سے عاشق ہر دم برسرِ پیکار رہتا ہے وہ محض خیالی یا برسبیلِ تذکرہ نہیں ہے۔ نہ اُن کی غزلوں میں رقیب کا ایک مخصوص روایتی کردار ہے بلکہ اُن کا رقیب ایک عام انسان ہے جس کی ناکامیوں پر کبھی وہ اُس کے دوست بھی بن جاتے ہیں اور کبھی وہ نالہ و شیون میں ان کا ہمدم و غمگسار بھی بن جاتا ہے۔ اس میں کچھ ایسی باتیں بھی ہیں جن کی داغ تعریف کرتے ہیں۔ اُس کی موت پر داغ کو افسوس بھی ہوتا ہے۔ اُن کا رقیب جاندار ہے اِس کا سبب یہ ہے کہ عشق کی جس دنیا سے داغ کا تعلق تھا اس میں اکثر سوا شے ہوتے تھے اور محبت اکثر نیلام ہوتی رہتی تھی۔ عشق کے مرکز اکثر بدلتے رہتے تھے۔ ایسی جگہ رقابت سوہانِ روح نہیں ہوتی۔ انھیں حجاب اور اختر جان کے سلسلے میں اکثر رقیبوں سے واسطہ پڑ چکا تھا۔ رقابت پر چند اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

بلائے عشق تو دشمن کو بھی نصیب نہ ہو   مرا رقیب بھی رویا گلے لگا کے مجھے
وہ اس ادا سے وہاں جا کے شرما سا آیا   رقیب پر مجھے بے اختیار پیار آیا
مرگِ دشمن کا زیادہ تم سے ہے مجھ کو ملال   دشمنی کا لطف شکووں کا مزہ جاتا رہا
کچھ تذکرۂ رنجشِ معشوق جو آیا   دشمن کے بھی آنسو نکل آئے مرے آگے
تم خواہ عداوت اسے سمجھو کہ محبت   رہتی ہے رقیبوں کی مجھے تم سے سوا یاد

داغ کے عشقیہ اشعار میں واقعیت و واقعیت کی گہری چاشنی ہے یہ اُن کے تجربات و مشاہدات پر مبنی ہے اس لئے زیادہ موثر و معرکہ آرا ہیں۔ بہت سی آرزوئیں جو دلوں میں پروان چڑھتی رہتی ہیں لیکن اُن کے اظہار کی جرأت نہیں ہوتی۔ داغ کے کلام میں ظاہر ہو کر دلوں کی تسکین کا باعث ہوتی ہیں۔ علامہ اقبال نے اس کو کس خوبی سے بیان کیا ہے۔

▲ لکھی جاتی ہیں یہ باتیں وہاں بے پردہ یاں محفل میں ہے   تھی حقیقت سے نہ غفلت فکر کی پرواز میں ہے

[1] انتخابِ کلام داغ [illegible]

حیدر نایاب

نروان

(مرکزی خیال اُپنیشد سے اخذ کیا گیا ہے)

چھوڑ کر مسلکِ نارسا کو میں جب
جادۂ آگہی کی طرف مُڑ گیا
لمحے لمحے نے کی رہنمائی مری
ذرّے ذرّے نے بخشی مجھے روشنی
پشت پر گمرہی چیختی رہ گئی۔
ماہ و انجم نے مژدہ بقا کا دیا
اور تخیلِ فنا نے چُرائی نظر
پتھروں نے مجھے دیکھ کر یہ کہا
"جانتے ہیں یہ جسم تو چلا ہے کہاں،
کاش ہم بھی ترے ساتھ ہوتے رواں!"
درد کا مضمحل سا جو احساس تھا
دل کی بستی میں تھا شور جس کا بڑا۔
وہ فنا ہو گیا
عقل کی تا مکی وہ حسین دل نشیں خام کاری کہ جس پہ مجھے کچھ دنوں ناز تھا۔

جس نے دامِ توہم بچھا کر اسیری کی دعوت مجھے بھیج دی تھی۔
اور، میرا وجود اُس طلائی قفس میں اُلجھنے کے بعد
مدتوں سے رہائی کی خاطر تڑپتا رہا۔
میں نے اس کو دیا غسل و گیان کا۔
تو غلاظت کے گندے سے وحشت زدہ نفرت انگیز شر کی جگہ

ایک ہرنی کے بچے نے پائی نمو۔۔۔!
مختلف آب و گِل سے مرے رابطے ایک اک کر کے کٹتے گئے
دل کے آئینے میں کوئی خواہش نہ کوئی تمنا رہی۔
کوئی آتش تراشا دھی رُوبرو
آگہی کی مگر تھی مجھے جستجو،
ذات کے تعمیرِ رنگیں کی بنیاد کو

اس زمیں کی کشش اور گرفتِ زماں سے سبکدوش ہو کر کسی شتہ پہ کا ملی

شہرِ امکان میں جب اُبھرتے ہوئے
میں نے دیوارِ احساس پر چڑھ کے دیکھا
تو وہ بے جان پھیکی ہنسی
اک زمانے سے میرے لبوں پر جو تھی۔
خود بخود مٹ گئی اور اس کی جگہ
ایک گہرے سنہرے تبسم نے لی۔۔۔!
دیکھتے دیکھتے میرے پانچوں حواس
مرکزِ داخلی کی طرف مُڑ گئے۔
اور سہمے ہوئے جوگیوں کی طرح
اپنے باطن میں پیوست ہونے لگے،
سند ذہن و دل جگمگانے لگی
داخلی قوتوں میں اضافہ ہوا۔
اور ظاہر مرا منتشر سا ہو گیا۔۔۔!
رفتہ رفتہ وہ باطن کا رشتہ بھی روحِ رواں سے جدا ہو گیا

میرے احساس کا کوہ اتنا گھٹا
ایک رائی کی مانند ہی رہ گیا
اور خلاؤں کی لا انتہا سرحدوں تک کوئی
جیسے مجھ کو اڑاتا ہوا لے گیا،
پھر ستاروں نے دل کو بتایا مجھے
اپنے احساس کی وہ جو رانی تھی
وہ بھی خلاؤں میں تحلیل سا ہو گئی تھی
وہ خلاؤں میں تھی اور اس میں خلائیں
خلائیں جو موجود ہیں شش جہت میں
خلائیں کہ جس میں یہ موجود ہستی ہیں ۔۔۔!!

ندیما اجمیری

کتابوں کی صلیب پر

خالد نے کتاب میز پر پھینک دی اور ...... اپنی بیوی زہرہ کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔

زہرہ بے سُدھ سو رہی تھی۔ اُس کے شاداب چہرے پر پسینے کی بوندیں ایسی لگ رہی تھیں جیسے تازہ گلاب پر شبنم کے جھلملاتے موتی۔ سیاہ اور چمکیلے بالوں کی گھنی لٹیں گورے مکھڑے پر کچھ اس طرح بکھری ہوئی تھیں جیسے دستِ قدرت نے اُس پیکرِ حُسن و جمال کو نظرِ بد سے محفوظ رکھنے کیلئے کاجل کی ریکھائیں کھینچ دی ہوں۔ چہرے کے خوبصورت و دلکش خدوخال اجنتا اور ایلورا کی عظمتِ فن کو بھی چیلنج کر رہے تھے ـــ زہرہ کا سڈول جسم بے ترتیبی سے بستر پر پھیلا ہوا تھا اور اس بے ترتیبی نے جسم کے مخصوص نشیب و فراز کو اور بھی نمایاں کر دیا تھا۔ وہ بے خبر سو رہی تھی لیکن ایسی حالت میں بھی حُسن و دلکشی اپنا جادو جگا رہے تھے۔

"اوہ! میں کتنا خوش نصیب ہوں کہ مجھے اتنی حسین اور خوبصورت بیوی ملی ہے!" اُس کا دل مسرت سے جھوم اُٹھا۔

"ہاں ..... تمہاری بیوی بہت حسین اور بہت خوبصورت ہے تمہاری قسمت پر فرشتے بھی رشک کرتے ہیں، لیکن اس حسین جسم کے اندر گندگی کا ڈھیر بھی تو پوشیدہ ہو سکتا ہے، اُس کے اندر چھپی ہوئی بے اعتمادی نے زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ کہا، تم نے ابھی ابھی جو کتاب پڑھی ہے اس میں بھی ایسی ہی خوبصورت اور معصوم عورت کی کہانی ہے جس نے خوبصورتی اور معصومیت کی اوٹ میں کیا کچھ نہیں کیا۔ اس سے پہلے جو ناول تم نے پڑھا تھا اس کی ہیروئن بھی تو بے حد حسین تھی۔ لیکن مصنف نے اس کی پارسائی کا شرافت اور وفا پرستی کی پردے میں تقدس کا گلا گھونٹ دیا۔ عورت کی عفت و پاکیزگی کو ہوس کے گہرے غار میں ڈھکیل دیا۔ خوبصورتی شیطنیت کا حسین روپ ہے۔ خوبصورت عورتیں اپنے حُسن و جمال کے نشے میں اکثر غلط راہ پر چلنے لگتی ہیں۔ یا پھر غلط راہ پر ڈال دی جاتی ہیں اور تب ان کی نگاہوں میں سارے رشتے ناطے ٹوٹ کر جنسی آسودگی کا سامان بن جاتے ہیں۔ تم نے کتنے ناولوں میں پڑھا ہے کہ ایسی عورتوں نے اپنے خاوند کے دوست احباب، بھائی بھتیجے اور عزیز و اقارب کسی کو نہیں چھوڑا،

"اونہہ ..... یہ تو سب افسانوں اور کتابی باتیں ہیں۔ ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں"

"یعنی تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ یہ افسانہ نگار، یہ ناول نگار اور مصنف سب جھوٹے ہیں اور اس دنیا کے انسان نہیں ہیں جس کے تم ہو۔ کیوں؟ یہ لوگ آسمانی یا آبی ہیں جو اس دنیا کیلئے دور از حقیقت خاکے ترتیب دیا کرتے ہیں۔ کیوں؟ نہیں یہ تمہارا خیال غلط ہے۔ مائی ڈیئر خالد ..... یہ لوگ اسی دنیا کے باشندے ہیں جس کے تم ہو۔ ان کا ذہن وہی سب کچھ اگلتا ہے جو دیکھتا اور پاتا ہے۔ جیسے کیا قمر پارہ کی کہانی تم نے نہیں پڑھی جو حقیقت پر مبنی ہے۔ کیا تم نے نہیں پڑھا کہ مینکا نے اپنے بے پناہ حُسن کے بل پر وشوامتر کی برسوں کی تپسیا ایک پل میں تباہی کے اگنی کنڈ میں جھونک دی تھی۔ زلیخا کی داستان کیا تمہیں یاد نہیں؟ ٹھیک ہے ..... ان حقیقتوں کو تم افسانوی اور کتابی باتیں مان سکتے ہو لیکن جو تمہاری اپنی آنکھوں نے دیکھا ہے"

[illegible] سکے؟ کیا تم اپنے پڑوس میں رہنے والی اُس [illegible] شریف لڑکی کو بھول سکتے ہو؟ جس نے خوب رُو خالد کو دیکھتے ہوئے بھی دوسری آغوش کی دعوتِ قبول کی مسرّ[illegible] [illegible] یہ ناول اور کہانیاں اپنے اپنے معاشرے کا وہ آئینہ ہیں جس میں ہم اپنی اور سب ہی تصویریں صاف صاف نظر آتی ہیں۔ یہ تلخ حقیقت کو تم فریب نہ سمجھو!'

لیکچرر اطہر کی اِس ٹھوس دلیل پر خالد کا ذہن اُلجھ کر رہ گیا۔ اُس کی نگاہیں زہرہ کے حسین سراپا کا جائزہ لینے لگیں۔ اور پراگندہ خیالات کے شہ زور گھوڑے ذہن کی زمین پر دوڑتے رہے۔

'تم یہ تلخ حقیقت تسلیم کرنے سے صرف اس لئے ڈر رہے ہو کہ تمہارا ایک چھوٹا بھائی ہے اور تمہارا چھوٹا بھائی اختر جوان خوبرو، صحت مند اور دلکش شخصیت کا مالک ہے۔ ہر عورت اختر کے لئے اپنے دل میں کشش محسوس کر سکتی ہے۔ اور یہ عورت تمہاری بیوی بھی ہو سکتی ہے!'

اختر کے خیال سے خالد کے ذہن میں مزید ہلچل پیدا ہو گئی۔ وہ گندے خیالات کے سمندر میں اور تیزی سے غوطے کھانے لگا۔ اُسے یاد آیا کہ وہ اختر اور زہرہ کو کئی بار چھپ چھپ کر بہت بے تکلفانہ انداز میں لپٹے ہوئے دیکھ چکا ہے۔ اِس خیال کے آتے ہی اختر کے لئے اُس کے دل میں شدید نفرت کا جذبہ اُبھر آیا۔ وہ میز پر رکھی ہوئی اختر کی تصویر کو گھورنے لگا۔ تصویر مسکراتی رہی۔ خالد اُسے گھورتا رہا۔

"نمک حرام! ذلیل!!" اُس نے اختر کی تصویر کھڑکی سے باہر کی طرف پھینک دی۔ تاہم اختر کا خیال اُس کے دماغ میں اٹک رہا تھا لیکن اختر اپنے بھائی کے ان مکروہ خیالات و جذبات سے بے نیاز زہرہ کی آغوشِ شفقت و محبت میں مطمئن تھا۔ اُسے تو بھابھی کے رُوپ میں ماں مل گئی تھی اور یہ حقیقت بھی تھی کہ زہرہ نے اختر کو ماں کی کمی کا احساس تک نہ ہونے دیا تھا۔ وہ جب بیاہ کر یہاں آئی تھی تو اختر جوانی کی دہلیز پر کھڑا معصوم مسکراہٹ سے اُسے خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ اُس کی یہ معصوم مسکراہٹ پہلے دن ہی زہرہ کے دل کی گہرائیوں میں اُتر گئی تھی۔ اور تب سے ہی زہرہ کے دل میں اختر کے لئے محبت و شفقت کا دریا بہہ رہا تھا۔ ایک ایسا دریا جس میں بھاوج کی پیار بھری بہن کا پیار اور ماں کی ممتا کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ جب بھی جذبات کی شدت سے مغلوب ہو کر وہ اختر کو اپنے سینے سے لگاتی تو ایسا محسوس ہوتا جیسے اس کی چھاتیوں میں دودھ اُتر آیا ہے۔ اُسے ایک عجیب سی لذت کا احساس ہوتا اور عجیب سا سکون ملتا۔ اُسے یہ احساس ابھی نہیں ہونے پایا تھا کہ آج بیس برس گزر جانے کے بعد بھی اس کی کوکھ سونی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ اختر اُس کے رحم سے نہیں بلکہ ممتا کی کوکھ سے جنم لے کر ... یہ تقدّس کی دیوی خالد کے پراگندہ خیالات سے بے خبر اختر پر اپنی ممتا اور شفقت کے جام لنڈھا رہی تھی۔ لیکن خالد اس مقدس دیوی کو شک و بے اعتمادی کی بھیانک آگ میں جھونکنے کے درپے تھا۔ خیالات کے زہریلے ناگ اُس کے ذہن سے پھسل کر زہرہ کو ڈسنے کے لئے بڑھ رہے تھے کہ وہ نیند میں ہی خالد کو زور زور سے آوازیں دینے لگی اور پھر گھبرا کر اُٹھ بیٹھی۔

خالد کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

"کیوں ہے ..... کیا بات ہے؟" خالد نے زہرہ کو گھورتے ہوئے پوچھا۔ زہرہ کا سانس تیز رفتار سے چل رہا تھا۔ وہ وحشت زدہ آنکھوں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کسی بہت ہی بھیانک حادثے سے دوچار ہوتے ہوتے بچی ہو۔ کچھ دیر اس کی یہی کیفیت رہی۔ جب ہوش و حواس درست ہوئے تو وہ خالد کے سینے پر سر رکھ کر سسکنے لگی۔

"ارے ارے ..... رو کیوں رہی ہو؟ کیا ہوا؟ شاید تم نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے"

"ہاں ..... آں" زہرہ نے سسکتے ہوئے کہا

"پگلی ہو تم۔ یہ تو خواب و خیال ہیں۔ ان میں ڈرنے کی کیا بات ہے"

زہرہ کی مضطربانہ کیفیت دیکھ کر خالد کے دل و دماغ میں [illegible] خیالات [illegible]

[illegible]

یہ حقیقت ... ہو گی۔

"مجھے عجیب سا خواب تھا۔ گویا کہ سبز و خوبصورت پہاڑیوں کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ پہاڑیوں کے درمیان سے گہری اور تیز تند ندی بہہ رہی ہے۔ میں اور اختر ایک اونچی پہاڑی پر کھڑے یہ دلکش منظر دیکھ رہے ہیں۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اچانک اختر کا پیر پھسل گیا اور وہ ندی میں گر پڑے۔ میں نے خوف کے عالم میں سب کو پکار پکار کر بہت آوازیں دیں۔ لیکن میری آواز پہاڑیوں میں گونج کر رہ گئی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اختر کو ندی کی اتھاہ گہرائی نے نگل لیا۔ میں نے بہت کوشش کی باوجود میں ندی میں چھلانگ نہ لگا سکی۔ ایک انجانی طاقت نے مجھے دبوچ لیا تھا۔ بس..... اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔" زہرہ خلاء میں دیکھنے لگی جیسے اس خواب کی تعبیر ڈھونڈ رہی ہو۔

"ہوں....." خالد نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ ذہن کے پردے پر اس خواب کی حقیقت دیکھنا چاہتا تھا۔ کچھ دیر پہلے زہرہ کے لئے اس کے دل میں اٹھنے والی محبت اور ہمدردی کے جذبات پر اب پھر شیطانی خیالات حاوی ہونے لگے۔ ذہن کے پردے پر رقص کرتا ہوا [illegible] کی نظروں کے سامنے [illegible] بالکل بے ہنگم رقص کرنے لگا۔ پھر [illegible] کے شیطان نے خالد کے دل و دماغ کو اپنی گرفت میں جکڑ لیا۔ جب اس نے آنکھیں کھولیں تو اس کی آنکھوں میں شیطنت کے شعلے لپک رہے تھے۔ اس نے زہرہ کو نفرت آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا: "ہوں..... تو آپ نے ایسا خواب دیکھا ہے۔ جس میں اختر کے ساتھ ساتھ آپ بھی ڈوب کے مرجانا چاہتی تھیں؟؟!"

"ہاں..... مجھے عجیب سا خواب تھا" زہرہ خالد کی طنز کو نہ سمجھ سکی۔

"یہ خواب نہیں، تمہارے دل و دماغ میں چھپی حقیقت کا عکس ہے جو تمہارے دل و دماغ میں چھپی ہوئی ہے۔ یہ خواب تمہارے دل و دماغ کی کیفیت کا وہ آئینہ ہے [illegible] صاف دکھائی دے [illegible] اس بات کا ثبوت ہے کہ تم [illegible]

یہ خواب اس بات کی دلیل ہے کہ میرا خیال اب تمہارے ذہن سے نکل چکا ہے۔ بلکہ تمہارے دل و دماغ میں صرف اختر بسا ہوا ہے۔"

زہرہ حیرت سے اپنے شوہر کو دیکھنے لگی۔ "آج آپ یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟؟"

"میری باتیں بہت دنوں سے میرے ذہن کو چھلنی کر رہی تھیں۔ میں سب کچھ دیکھ کر بھی خاموش تھا لیکن اب مجھ میں ضبط کی طاقت نہیں، جو تمہارا لیلیٰ مجنوں کا ڈرامہ اور دیکھ سکوں۔"

"خدارا مجھ پر یہ غلط الزام نہ لگائیے!" زہرہ کے لہجے میں بے انتہا کرب اور التجا تھی۔

"یہ الزام نہیں، وہ حقیقت ہے جس نے تمہیں آج بے نقاب کر دیا ہے۔ کیا تم اختر سے والہانہ محبت نہیں کرنے لگی ہو؟ کیا تمہارے دل و دماغ پر اختر نہیں چھا گیا ہے؟ کیا تم اختر کے قرب کی متمنی نہیں رہتی ہو؟ بولو..... جواب دو؟ سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے ہر وقت تمہیں اختر کا خیال نہیں رہتا؟ تم چاہتی ہو کہ میں زیادہ تر گھر سے باہر رہا کروں اور تم یہاں گل چھرے اڑاؤ! اگر تم مجھ سے بیزار ہو چکی ہو تو میں تمہیں ہمیشہ کے لئے آزاد کر سکتا ہوں۔"

"اُف..... یا خدا یا رحم!!" زہرہ نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ غم و غصہ کی وجہ سے اس کا سارا جسم لرز رہا تھا۔ آنکھوں سے کرب کے قطرے ڈھلکنے لگے۔ کاش اسے معلوم ہوتا کہ خالد اتنے تاریک خیال کا آدمی ہے تو وہ اپنی مامتا کی سونی گود میں اختر کو کبھی جگہ نہ دیتی۔

جب انسان کے ملاپ سے (?) شیشہ ٹوٹ جاتا ہے تو وہ پناہ گاہ (?) کی تلاش کرنے لگتا ہے۔ زہرہ بھی بے اختیار روتے ہوئے اپنے خدا کو پکارنے لگی۔ خالد اسے درشت نگاہوں سے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ عورت اپنے گناہوں کے بدنما داغوں کو جب چھپا نہیں پاتی تو آنسوؤں سے دھونے کی کوشش کرتی ہے۔ آدمی اکثر فریب کھا جاتا ہے لیکن وہ اس عورت (?) کے [illegible] آنسوؤں سے خوب واقف ہو چکا ہے۔

[illegible] فریب کی سیکڑوں داستانیں وہ پڑھ چکا ہے۔ پھر
[illegible] فحش کتابیں پھسل کر زہرہ کے فرش پر بکھر گئیں
اور اُن کے اوراق چیخنے لگے۔ "یہ فریب ہے، فریب!
یہ معصومیت کے آنسو ہیں!
یہ عورت گناہوں کا وہ جوہڑ ہے جس میں غلیظ پانی کے سوا
کچھ بھی نہیں! تم اسے کبھی کوثر کا پانی نہ سمجھ لینا۔"
خالد زہرہ کی پرواہ کئے بغیر اپنے پراگندہ خیالات میں اُلجھا رہا
اور زہرہ رات بھر روتی سسکتی رہی۔

—— ★ ——

زہرہ صرف ایک رات میں ہی کئی برسوں کو پھلانگ گئی تھی، بڑھاپے پر ڈھلتی ہوئی عمر کے نقوش تمام اُس کے چہرے پر نمایاں ہو گئے تھے شگفتگی اور تازگی غائب ہو گئی تھی۔ مزاج کی ساری شوخیاں ختم ہو گئی تھیں۔ ماحول کی لطافتیں دم توڑ چکی تھیں اور خوش گوار زندگی پر تلخیوں کی یلغار ہو رہی تھی۔ یہ انقلاب جو اچانک اُس کی زندگی میں وارد ہوا تھا، ایک ایسا انقلاب تھا جس نے زندگی کی تمام تر رعنائیاں اور رنگینیاں چھین لی تھیں۔ آج وہ غم و افسردگی کے تپتے ہوئے صحرا میں خاموش کھڑی سوچ رہی تھی کہ اتنا بھیانک انقلاب ایک دم کبھی نہیں آسکتا ہے اور زہرہ کا خیال غلط بھی نہیں تھا۔ اس بھیانک انقلاب کی خاموش ابتدا خالد کی کمسنی سے ہو چکی تھی۔ اُسے فحش کتابیں پڑھنے کا چسکا لگ گیا تھا۔ دھیرے دھیرے یہ چسکا اُس کی عادت بنتا گیا۔ گندگی اور فحاشات سے لبریز ان کتابوں کو مسلسل پڑھتے رہنے سے خالد کا ذہن ان فحش کتابوں کی صلیب پر چڑھتا گیا۔ دل و دماغ کے صالح خون میں اُن کتابوں کا زہر گھلنے لگا۔ ہر پل ان کتابوں کے گھناؤنے کردار دل و دماغ کی زمینوں پر رقصاں رہنے لگے۔ ذہن میں شک و بے اعتمادی کی جڑیں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئیں۔ اور آج خالد ان کتابوں کی صلیب پر لٹکا ہوا دنیا کی ہر عورت کو بدکردار، پُرفریب، عیاش اور بے وفا دیکھ رہا تھا۔ دنیا کی تمام عورتوں کے ساتھ ساتھ اس نے اپنی بیوی زہرہ کو بھی اس غلاظت کے گہرے غار میں ڈھکیل دیا تھا، جہاں بہتان کے خوف ناک اژدر اُسے نگلنے کے لئے بیتاب تھے۔ اور زہرہ اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کس طرح پھر زندگی کو از سرِ نو خوش گوار بنائے۔

وہ سوچتی رہی۔ دن شام کی منزل کی طرف بڑھتا رہا۔ جب شام کے سائے منڈیر کی دیوار پر دم توڑنے لگے تو اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اور اس ٹوٹے ہوئے سلسلے میں سے صرف ایک خیال اچھل کر اس کے سامنے آگیا۔ وہ کچھ دیر اس پر غور کرتی رہی پھر جھپٹ کر اٹھی اور ایک الماری میں سے کتابیں نکال نکال کر فرش پر پھینکنے لگی۔

"کاش! ..... یہ وقت آنے سے پہلے ہی تم ان کتابوں کے زہریلے اثرات سے واقف ہو جاتیں تو آج تمہاری زندگی میں یہ کلیاں نہ بکھرتیں!" اُس کے دل نے کہا "یہ وہ کتابیں ہیں جنہوں نے خالد سے اُس کا اعتماد، شرافت اور پاکیزگی چھین لی ہے۔ یہ وہ کتابیں ہیں جنہیں پڑھنے والا ماں، بیٹیا، بھائی بہن اور دیگر سماج کے مقدس رشتوں کو بھول جاتا ہے۔ یہ گھر، خاندان اور سماج میں پھیلنے والی بھیانک کوڑھ کے خطرناک جراثیم ہیں۔ ان کا وجود ہی مٹ جانا چاہئے۔ ورنہ یہ انسان کو ایک ایسے کھڈ میں ڈھکیل دے گی جہاں بے اعتمادی، پست خیالی اور شہوانیت کی دلدل کے سوا کچھ بھی نہ ہوگا۔" زہرہ نے کتابوں کے ڈھیر میں آگ لگا دی۔ عریانیت سے بھرپور کتابوں کے اوراق پھڑپھڑاتے ہوئے جلنے لگے۔ رفتہ رفتہ ان کتابوں کے شعلوں کا رُعب دھار لیا۔ ہوا کے جھونکوں سے جلتے ہوئے یہ شعلے بلند سے بلند تر ہونے لگے۔ اور جلتے ہوئے اوراق کمرے کے کونے کونے میں بکھرنے لگے تھے۔ پھر ان خوفناک شعلوں میں سے ایک مکروہ چہرہ نمودار ہوا جو زہرہ کی بے وقوفی پر قہقہہ لگا رہا تھا۔

"ہاہا..... آہ.. ہاہا..... میرا وجود مٹنا ممکن نہیں۔ میں ساری دنیا پر چھایا ہوا ہوں۔ صرف ایک گھر میں مجھے جلانے سے کیا حاصل ہوگا [illegible] خود کبھی [illegible] ہمیشہ [illegible] [illegible]

پہنچنے کی باعث دنیا کے بیشتر گوشوں میں پوری طرح چھا رہا ہوں
—— اور سن لے سیتا سی پاک اور مریم سی مقدس عورت،
اگر میں نہ ہوتا تو دنیا میں صرف عظمت و پاکیزگی کی مالک ہوتی
لیکن میں نے عورت کو ننگا اور مرد کو ہوس کا غلام بنا کر
گمراہ کر دیا ہے!! میں وہ شعلہ ہوں جو بہت خاموش اور
لطیف انداز میں انسان کے دل و دماغ میں سلگ کر جوالا
مکھی کی طرح پھٹ پڑتا ہے — میں شہوانیت کا دیوتا ہوں!
دنیا کے ساتھ ساتھ قائم ہوا ہوں۔ اور مجھے دنیا کے ساتھ ساتھ
ختم ہونا ہے۔ مجھے دنیا کی کوئی طاقت نہیں مٹا سکتی ہے۔ میں
قیامت تک زندہ رہوں گا۔ آہ ...... !!!...... !!!......

حالات کی اچانک اور خطرناک تبدیلی نے زہرہ کو
حواس باختہ کر دیا تھا۔ مسلسل ذہنی کشمکش نے اسے
بالکل مفلوج کر دیا تھا۔ وہ جامد و ساکت پھٹی پھٹی
آنکھوں سے ان شعلوں کو دیکھ رہی تھی۔ جو سارے گھر
میں پھیلتے جا رہے تھے۔ اس کا سارا جسم پسینے میں شرابور
ہو چکا تھا۔ شعلوں کی آدم خور سرخ زبانیں اسے کھانے
کے لئے مچل رہی تھیں۔ آج پھر بے گناہ سیتا اگنی پریکشا
دے رہی تھی۔ آج پھر مقدس مریم عفیفہ الزامات کی
آگ میں جل رہی تھی۔

شعلوں کی تپش اور دھواں دھار ماحول سے اس
کا دم گھٹنے لگا۔ پھر دہکتا ہوا سارا منظر اس کی نظروں میں
تیزی سے گھومنے لگا۔ اور وہ اپنے انجام سے بے نیاز
ایک کٹی ہوئی شاخ کی طرح شعلوں کے درمیان گر پڑی۔

▲

سعید عارفی

چلو تو درد کی منزل کو صدا دی جائے
تھوڑی راہ ذرا اور بڑھا دی جائے

کوئی گوشہ نہیں ایسا کہ میسر ہو سکوں
کیوں نہ اس شہر کو پھر آگ لگا دی جائے

ریت پر کیسے کوئی نقش ٹھہرتا تا دیر
آؤ، پتھر ہی پہ تصویر بنا دی جائے

لطف رہ جائے گا کیا، اٹھا جو فتنہ کوئی
یہ کہانی بھی تہِ خاک چھپا دی جائے

بستیاں چھوڑ کے صحراؤں کی جانب نہ چلو
آؤ ماضی کی فصیلوں کو سزا دی جائے

اپنے سائے سے بھی لگتا ہے بڑا خوف مجھے
ایسا عالم ہے تو پھر کس کو سزا دی جائے

اتنا احساس تو ہو جائے کہ وہ کیا ہے سعید
شوخ سی کوئی غزل اس کو سنا دی جائے

عشرت دھولپوری

دل کیا ہے غم کی دھوپ نے پتھر جلا دیئے
قطرے کی کیا بساط، سمندر جلا دیئے

یادوں کے بت خیال کے پیکر جلا دیئے
غم ہائے روزگار نے آذر جلا دیئے

اک کشتۂ وفا کی چتا نے بھڑک کے آج
سب قاتلانِ شہر کے خنجر جلا دیئے

تابندگیِ خوں سے فسردہ ہیں زخمِ دل
رنگینیِ شراب نے ساغر جلا دیئے

بڑھنے لگا جو خواب پریشاں کا سلسلہ
سورج نے زلفِ شام کے گھونگھر جلا دیئے،

روشن ہوئے وہ لعل دگرگوں کے وقتِ شب
صحرا میں آبلوں نے جو پتھر جلا دیئے

بیمار اب کہیں کہ مسیحا کہیں اسے
جس کے دہانِ زخم نے نشتر جلا دیئے

تھی زندگی جو ان کی پریشاں ورق ورق
کچھ انتہا پسندوں نے دفتر جلا دیئے

عشرت ہمیں زمیں کے اندھیروں کی فکر کیا
ہم نے چراغ دوشِ ہوا پر جلا دیئے

غزلیں

ڈاکٹر ست پرکاش سنگر

زمانۂ وسطیٰ کی تجارت کے میدان میں فرقہ وارانہ تعلقات

تیرہویں صدی عیسوی کے آغاز میں شمالی ہند میں اسلامی حکومت کی بنیاد کے دنوں میں یہاں کے ہندو ان بیرونی حملہ آوروں کو شکوک نظروں سے دیکھتے تھے اور انہیں ملیچھ یا ناپاک کہہ کر پکارتے تھے۔ ان کے ساتھ کسی قسم کے سماجی مراسم رکھنے کے وہ سخت مخالف تھے۔ ان کے ساتھ ملنے جلنے میں وہ خود ناپاک ہونے سے ڈرتے تھے۔

اسلام کی فتوحات کے زیر اثر اور اس کی مساوات اور اخوت کی تعلیم سے متاثر ہو کر دستکار پیشے کے لوگوں نے حملہ آوروں کے تشدد اور اونچی ذات کے جبر سے بچنے، اہلِ حکومت کی نظروں میں توقیر اور ساتھ ہی مناسب سماجی اور اقتصادی پوزیشن حاصل کرنے کے لئے اسلام کو قبول کر لیا۔

اونچی ذات کے ہندوؤں کی نظر میں یہ لوگ بھی قابلِ مذمت تھے۔

لیکن ایک صدی کے گذرنے کے بعد بیرونِ ہند سے آنے والے اور ہندوؤں میں سے تبدیلیٔ مذہب کے بعد بنے ہوئے مسلمان شمالی ہند کے طول و عرض میں پھیل چکے تھے۔ ہندوستان کے نومسلموں نے تبدیلیٔ مذہب کے باوجود اپنی پرانی روایات کو برقرار رکھا اور ساتھ ہی خود کو نئے سماجی ماحول کے مطابق ڈھال لیا۔ باہر سے آنے والے مسلمان بھی نئے قصبوں کو آباد کر کے اس نئے ماحول میں رچ بس کر ہندوستان کے باشندے بن گئے۔ ہندوستان کے [illegible] رہی۔ ہماری تاریخ کے آغاز ہی سے [illegible] انہوں نے اس ملک کو اپنا گھر [illegible] گھروں کی یاد کو بھلا کر [illegible] کر لیا۔ باہر سے آنے والے مسلمان [illegible] ہندوستان کو [illegible] تسلیم کر سکے۔

تعصبات اور گرد و نواح کے دیہات میں بسنے والے ہندوؤں سے رابطہ قائم کرنے لگے۔ وقت گذرنے پر ان تارک الوطن لوگوں کے خاندان نے اپنے پرانے وطن کی یاد سے برگشتہ خاطر ہو کر اور ہند ہی کو اپنا وطن مان کر ایک نئے مخلوط کلچر کا آغاز کیا۔

اس جدید سماجی تمدن کا عظیم ترین اور بہترین نمائندہ امیر خسرو تھا۔ اسلامی حکومت کے قائم ہونے ۱۱۹ برس بعد اس کا جنم ہوا اور محمد تغلق کی حکومت کے شروع میں ۱۳۲۵ میں وہ راہیٔ ملکِ عدم ہوا۔ اس کے آباؤ اجداد ایک ترکی خاندان سے متعلق تھے اور اتر پردیش کے ایٹہ ضلع کے پٹیالی گاؤں میں آ کر مقیم ہوئے تھے۔ وہ خود حضرت نظام الدین اولیاء کا شاگرد تھا۔ اپنی مثنویوں میں خسرو نے ہندوستان کا دلکش خاکہ کھینچا ہے اور اسے باغِ عدن سے مشابہت دی ہے۔ مسلمان اور ترک ہوتے ہوئے وہ ہندوستان کو جنت نشان قرار دے کر اسے دنیا کا بہترین ملک سمجھتا ہے اور یہاں کی آب و ہوا اور پیداوار، پھول پھل اور چرند پرند سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔ انسان کا دل خوش رکھنے کے لئے پروردگار نے یہاں سال بھر خوبصورت پھول اگا رکھے ہیں۔ ایران اور توران کے پھولوں میں یہاں کے پھولوں جیسی [illegible] کہاں ہے۔ [illegible] علم و فن، فلسفہ [illegible] دنیا [illegible] تھا۔ یہاں کے [illegible] ہندوستان [illegible] علم و فن [illegible] دنیا کے [illegible] لوگ تعلیم حاصل کرنے کے لئے آتے [illegible] جہاں سے لوگ کبھی [illegible] ملک کی طرف [illegible] نہیں کرتے تھے۔ ہندوستانی زندگی کے [illegible]

کے سادھارن قسم کے واقعات کو بھی وہ عقیدت سے پیش کرتا ہے۔ [illegible] سچا قوم پرست اور محبِ وطن مردِ خدا تھا جو یہاں کی زندگی [illegible] پہلے کی طرح مانوس تھا۔ فارسی اور ہندی زبان میں برابر دسترس رکھتا تھا۔

اس طرح مسلمانوں کی اوّلین فتح کے تقریباً سو سال بعد شمالی ہند میں ایک مخلوط تمدن اور مشترکہ تہذیب نے جنم لے لیا تھا جس کا امیر خسرو ایک نمائندہ تھا۔ اپنی زبردست اور کامل شخصیت کے سبب انہوں نے اپنے ہمعصروں اور آنے والی نسلوں پر بے پناہ اثر چھوڑا۔ تیمور کی موت کے پچیس سال اور محمد تغلق کی وفات کے بعد، دلی کی مرکزی حکومت کا شیرازہ بکھر گیا اور اس کی جگہ بنگال اور کشمیر، سندھ اور مالوہ، گجرات اور دکن میں خود مختار صوبائی ریاستوں نے جنم لے لیا۔ ان ریاستوں کے مسلمان بادشاہوں نے ایک خالص ہند مسلم یا ہندوستانی کلچر کو تقویت دینے میں نمایاں حصّہ لیا۔ اکبر سے بیشتر ہی کشمیر میں اکبر ثانی زین العابدین اور بنگال میں علاؤالدین حسین جیسے حکمرانوں نے اس جدید تمدن کو مستحکم کرنے کے لئے نمایاں کام کئے۔

خسرو کی تقلید کرتے ہوئے سولہویں اور سترہویں صدیوں کے مسلمان شعرا نے ہندی کویتا کو خوب فروغ دیا۔ یہی نہیں، انہوں نے ہندو دیومالا سے متاثر ہو کر اس پر مبنی اپنی ہندی شاعری میں خاص رس پیدا کیا۔ سترہویں صدی عیسوی کے مشہور کوی رس خان نے لکھا تھا۔

[illegible]
[illegible]

اور پھر —

[illegible]
[illegible]

سید پٹھان رس خان نے اپنی مشہور ہندی کویتا کی پستک 'سجان رس خان' میں یہ پرارتھنا کی تھی کہ اگر وہ اگلے جنم میں آدمی کا جنم لے تو گوکل گاؤں کے گوالوں کے بیچ رہ کر زندگی بتائے جن میں کرشن خود رہتے تھے۔ اگر وہ پشو ہے تو مدنی گاؤوں میں رہے جنہیں بال کرشن چرایا کرتے تھے۔ اگر پتھر بنتا ہو تو اُس پہاڑ کا بنے جسے کرشن نے اپنے ہاتھوں سے اٹھا لیا تھا اور اگر اُس کی قسمت اسے پرندہ بنا دے تو وہ اُن پرندوں کے درمیان بسیرا کرے جو جمنا کے کنارے پیڑوں پر بستے تھے۔

رس خان کے علاوہ اس زمانے میں ہندی کے متعدد مسلمان شاعروں نے ہمعصر ہندو شاعروں کے مقابلے میں نہایت حسین کویتا کو جنم دیا۔ ان میں قابلِ ذکر شاعر تھے۔ ملک محمد جائسی۔ عبدالرحیم خان خاناں۔ منجھن۔ جمال۔ غلام نبی۔ رس خان۔

سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی میں ایک شاندار مخلوط تمدن پنپ رہا تھا جہاں ہندو اور مسلمان مل کر رہتے تھے۔ دونوں حب الوطنی کے جذبے میں ایک دوسرے سے کم نہ تھے۔ ہندو مسلم فساد تو اینہ صدی کی پیداوار ہیں۔ زبان کا مسئلہ تب کسی کو پریشان نہیں کرتا تھا۔ زندگی کے ہر شعبے میں یہاں کے ہندو مسلمان اور پارسی شانہ بہ شانہ چلتے تھے۔

تجارت کے میدان میں بھی ایسا ہی تھا۔ ملازمت میں ہندوؤں کو کم لئے جانے کی وجہ سے وہ اپنی توجہ زراعت اور تجارت میں لگاتے تھے۔ کچھ پیشے ایسے تھے جن میں مسلمان ہی زیادہ کام کرتے۔ یہ خصوصاً کپڑا بننے والے جلاہوں کے متعلق درست تھا۔ ہندو سماج میں اپنے ادنیٰ رتبے کے سبب یا کسی دوسری وجہ کی بنا پر ان کی اکثریت مذہب اسلام قبول کر چکی تھی۔ ہندوؤں میں بنئے تو تجارتی کاروبار میں دنیا بھر میں شہرت رکھتے تھے۔ بڑے شہروں میں مسلمان تاجر بھی کافی تعداد میں اندرونی اور بیرونی تجارت میں مشغول رہتے۔

تیرہویں صدی عیسوی میں مسلمانوں نے ہندوستان اور اس کے جنوب مشرق میں واقع جزائر پر فتح حاصل کر کے اِن ممالک کی تجارت پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ آئندہ دو صدیوں کے دوران، ان ممالک کی تجارتی اشیاء کو وہ عدن سے بحیرۂ قلزم کے راستے سوئیز کو بھیجتے اور وہاں سے مصر اور الیگزانڈریا کو۔ قافلوں کی گذرگاہ کے راستے اس سامان کو دریائے دجلہ تک لے جایا جاتا اور وہاں سے قافلوں کے ذریعے ایلیپو اور پھر وہاں سے اٹلی کے مشہور شہر وینس تک۔ وہاں سے ہر سال ایک بہت بڑا تجارتی جہاز ہندوستان

کہ اِن گراں قدر اور بیش بہا اشیاء کو انگلینڈ لے جا کر جہاں انہیں منہ مانگی قیمت پر فروخت کر کے خاطر خواہ منافع حاصل کیا جاتا ۱۴۹۲ء میں مشہور پرتگیزی جہاز راں واسکوڈی گاما نے یورپ کے لوگوں کے لئے ہندوستان اور اس کے مشرق میں واقع ممالک کے راستے کی کھوج کی۔ بعد ازاں پرتگال کے لوگوں نے ہندوستان کے مغربی ساحل پر بہت سے اہم مقامات پر زبردستی یا معاہدوں کی رُو سے قبضہ کر کے اُن کی تجارت کو بھی اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ سو سال سے زائد عرصے تک پرتگیز اس تجارت سے پوری طرح مستفید ہوتے رہے اور ہندوستان کی قیمتی تجارتی اشیاء کو اپنے جہازوں میں لاد کر دیگر ممالک کو سپلائی کرتے رہے۔ ہندوستان کی اس بیرونی تجارت میں انہوں نے کسی اور ملک کو حصہ لینے کا موقع نہیں دیا۔ اُن کا دعویٰ تھا کہ اس راستے کی کھوج کا مشکل کام اُن ہی نے انجام دیا تھا۔ پھر کوئی غیر ملک اُن کا کیونکر ثانی بن سکتا تھا۔

سولہویں صدی کے تیسرے حصے میں انگلینڈ اور ترکی کے درمیان ایک معاہدے کی رُو سے دونوں ممالک کے مابین تجارت کا آغاز ہوا۔ اُن دنوں ترکی کے تاجران ہی کو سچا بیوپاری تسلیم کیا جاتا تھا۔ اُن لوگوں نے اسکندریہ، ایلپو، دمشق، مصر اور ترکی کے مختلف شہروں میں اپنے تجارتی اڈے بنائے تھے۔ رُوس کے راستے ایران کے ساتھ بھی تجارتی تعلقات قائم کئے تھے۔ ایران کے شاہ نے ملکہ الزبتھ کو دونوں ملکوں کے درمیان تجارت کی اجازت دے رکھی تھی۔

اِس کے بعد ہندوستان اور اس کے جنوب مشرق میں واقع ممالک کے ساتھ تجارت کرنے کے ارادے سے انگلینڈ نے اپنے جہازی بیڑے بھیجنے شروع کئے جن کا آغاز سب سے پہلے سر فرانسس ڈریک کی سرکردگی میں ہوا۔ چھ سال بعد تین انگریز تاجر ولیم فیچ، نیوبری اور لیڈز، ملکہ الزبتھ کے خطوط لیکر خشکی کے راستے ہندوستان پہنچے۔ ۱۵۸۶ء میں انگریزی کپتان کیونڈش نے دنیا کے گرد سفر انجام دیا، جو کہ اس قسم کا دوسرا بحری سفر تھا۔ ایک سال بعد جب سر فرانسس ڈریک نے مشرق سے آنے والے ایک پرتگالی جہاز پر زبردستی قبضہ کیا تو انگلینڈ کو ہندوستان کی تجارت کے متعلق اہم معلومات کا انکشاف ہوا۔ اس سے متاثر ہو کر انگلینڈ کے تاجران نے اِن ممالک کے ساتھ باقاعدہ تجارتی رابطہ قائم کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے مقصد سے اس تجارت میں پرتگال کے اپنے اجارہ کے دعوؤں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے لندن کے چند بیوپاریوں نے جارج ریمانڈ اور جیمز لنکاسٹر کی سرکردگی میں اپنے تین جہازوں پینیلوپ، مرچنٹ رائل اور ایڈورڈ بوناونچر کو ۱۵۹۱ء میں مشرق کی طرف روانہ کیا۔ اگلے سال انگریزوں نے ہند اور مشرقی جزائر کی تجارتی اشیاء سے بھرے ۱۶۰۰ ٹن وزنی ایک پرتگالی جہاز کو تسخیر کر کے ڈیڑھ لاکھ پاؤنڈز کے مالِ غنیمت پر قبضہ کر لیا۔ اس واقعہ نے ہند کی تجارت سے مستفید ہونے کے انگریزوں کے عزم راسخ کو مزید پختہ کر دیا۔

اس اثناء میں ولندیزیوں نے ہندوستان کے ساتھ ایک وسیع پیمانے پر تجارت شروع کر دی تھی۔ اسپین کے ساتھ جنگ چھڑ جانے پر انگلینڈ کے لئے لزبن کے راستے اشیاء منگوانا مشکل ہو جانے پر اُس نے ہالینڈ کے توسط سے ایسا کرنا شروع کر دیا۔ اِس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا کر ہالینڈ نے جہاز کا کرایہ میں اضافہ کر کے کالی مرچ کے بھاؤ کو از حد گراں کر دیا۔ یہ انگلینڈ کو ناگوار گُذرا۔ دوسرے ممالک پر انحصار کرنے کی بجائے براہ راست ہندوستان اور مشرقی ممالک کے ساتھ بیک وقت تجارتی تعلقات کو قائم کرنے کے علاوہ انگلینڈ کے پاس دوسرا چارہ نہ تھا۔ اس مقصد کے لئے انگریزی تاجروں نے ایک کمپنی تشکیل کی جس کی منظوری کا ملکہ الزبتھ نے ۳۱ دسمبر ۱۶۰۰ء کے باقاعدہ اعلان کر دیا۔ اس طرح ہندوستان، مجمع الجزائر شرقی اور مشرقِ بعید کے ساتھ تجارت کرنے کے لئے ایسٹ انڈیا کمپنی کو وجود میں لایا گیا۔

اس کے بعد کمپنی نے ہند کے ساتھ تجارت کرنے کے ارادہ سے سترہویں صدی کے اولین بارہ سالوں میں بارہ سمندری بیڑے ہندوستان کو روانہ کئے۔ بارہ سال کی لگاتار کاوش اور بحر قلزم میں مغلوں کے قیمتی جہازوں کو اپنے قبضے میں لینے اور مغلوں کو بحری تجارت کو نقصان پہنچانے کی دھمکی کے کارگر ہونے کے بعد

انگریزی کمپنی جہانگیر سے خاص تجارتی مراعات حاصل کرنے اور ۱۶۱۲ء میں سورت میں اپنی فیکٹری قائم کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ اس کے پانچ سال بعد ولندیزیوں کو بھی سورت میں اپنی فیکٹری قائم کرنے کی اجازت دے دی۔

اس سے قبل سو برس سے زائد عرصے تک پرتگیزی ہندوستان کی بیرونی تجارت کا اجارہ سنبھالے ہوئے تھے۔ وہی ہندوستان کے تاجروں کے تجارتی مال کو اپنے جہازوں میں لاد کر غیر ممالک میں لیجاتے تھے۔ اب ان کی جگہ ولندیزی اور انگریز آگئے تھے۔ ان کے بحری قزاق ہندوستانی جہازوں کو ان کی مرضی کے بغیر سمندر میں نہ جانے دیتے۔ سمندروں کی بحری طاقت صفر کے برابر ہونے کی وجہ سے ہندوستان کے تاجروں کو ان بدیسی کمپنیوں کا سہارا لینا پڑتا۔ وہ اپنے سامان کو ان کے جہازوں میں بھیجتے یا ان کمپنیوں سے پاس لیکر سمندری سفر کرتے۔

ان بدیسی ممالک کے بحری قزاقوں نے ہندوستان کی بیرونی تجارت کو شدید نقصان پہنچایا۔ جہانگیر کے عہد حکومت کے آخری سالوں میں آگرہ میں مقیم ڈچ کمپنی کے ایک فیکٹر پلسیرٹ نے اپنی کتاب Jahangir's India میں اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے۔ اس کے مطابق ہندوستان کے مغربی ساحل پر انگریزوں اور ولندیزیوں کی آمد سے قبل یہاں کے ہندو اور مسلم تاجران دیگر ممالک کے ساتھ ایک وسیع تجارت کرتے تھے۔ بعض سورت ہی سے ہندوستانی مال سے لدے ہوئے بادشاہ کے اپنے چار یا پانچ بڑے جہاز ہر سال جاوا، سماٹرا، فارس اور دیگر ممالک کو جاتے تھے۔ ان کے علاوہ ہندوستان کے تاجران اپنے اپنے جہازوں میں اپنا تجارتی سامان غیر ملکوں کو لے جاتے تھے۔ انگریزوں اور ولندیزیوں نے آکر اس تجارت کو سخت دھکا پہنچایا۔ پلسیرٹ کے مطابق ہندوستانی اور پرتگیزی تاجران اس صورت حال کے لئے انگریزوں اور ولندیزیوں ہی کو ذمہ دار ٹھہراتے تھے اور انہیں ہندوستان کی شاندار تجارت اس کی خوشحالی اور امارت کے سخت ترین دشمن گردانتے تھے۔

جہانگیر کے دربار میں انگریزی سفیر سر ٹامس رو نے احمد آباد سے ارسال کردہ اپنے ۱۴ فروری ۱۶۱۸ء کے خط میں لکھا تھا:

"ہندوستانی ہم سے عاجز آچکے ہیں۔ دراصل ہم نے ان کی بندرگاہوں کو سخت ضعف اور ان کی تجارت کو نقصان پہنچایا ہے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ یہاں کا گورنر مجھ کو ہندوستانی تاجروں کو اپنے جہاز غیر ممالک کو بھیجنے کے لئے مجبور کرتا ہے۔"

لیکن اس کے باوجود سترہویں عیسوی میں ہندوستان کی غیر ملکی تجارت بہت نفع بخش تھی۔ ہندوستان کے غیر ملکی سیاحوں، برنیئر، تیورنیئر اور کیریری کے بموجب، دنیا کے مختلف ممالک کا سونا چاندی سب جگہ چکر کاٹ کر ہندوستان پہنچ جاتا تھا۔ موکھا، بصرہ اور بندر عباس ہوتا ہوا ان ملکوں کا سونا چاندی دیر بدیر یہاں آجاتا تھا۔ اس کے بدلے ہندوستان کی اشیاء سے لدے جہاز مشرق میں برما، سیام، انام اور جاپان، جاوا اور سماٹرا اور بورنیو اور مغرب میں افریقہ اور یورپ کے ممالک میں پہنچتے اور وہاں سے قیمتی دھاتوں سے لد کر واپس بھارت آتے۔

ہندوستان کی اندرونی اور بیرونی تجارت کو فروغ دینے والے یہاں کے ہندو اور مسلم اور پارسی تاجران تو تھے ہی۔ لیکن ان کے علاوہ عرب اور ترک، ایرانی اور تورانی، یہودی اور ارمنی، انگریز، فرانسیسی، ہسپانوی اور پرتگیزی، اہل ڈنمارک اور ولندیزی بھی تھے۔ ہندوستان میں یہ ودیشی لوگ کافی تعداد میں موجود تھے اور ہندوستان کے بنیوں، ووہروں اور پارسیوں کے ساتھ مل کر خوش گوار باہمی مراسم رکھتے ہوئے شاندار ڈھنگ سے تجارت میں مشغول رہتے تھے۔ بنگال سے گجرات، کشمیر سے نربدا تک اور دونوں ساحلوں کے درمیان کا سارا علاقہ اشیاء خوردنی، کپڑا، ادویات، تیل اور دیگر چیزوں کو اس افراط سے پیدا کرتا کہ انہیں ایکسپورٹ کرنا لازمی تھا۔ ہندوستان کے مختلف خطوں کے محنتی، جفاکش اور کاریگر لوگ ملک کی پیداوار کو فروغ دیتے اور اقتصادی حالت کو برقرار رکھنے میں کوشاں رہتے۔ بیدار مغز لوگ ان اشیاء کو ملک کے اندر اور ملک سے باہر لے جا کر ملک کی تجارت کو بڑھاتے۔ ان دنوں ہندوستان میں پیداوار اور تجارت کے قابل ذکر حالات رہے تھے۔

صوبہ گجرات اشیائے خوردنی، کپڑا اور [illegible] کے لئے دنیا بھر

میں شمار کیا جاتا تھا۔ گجرات کا دارالخلافہ احمد آباد نہایت گھنی آبادی والا اور لندن سے بڑا شہر تھا۔ کپڑے اور نیل کا مشہور مرکز تھا۔ سوتی اور ریشمی کپڑے کے علاوہ یہاں سے افیون، ادرک، ہرڑ، مشجر، نوشادر، بورق، چاول اور مکھن بکثرت غیر ملکوں کو بھیجا جاتا تھا۔ اس شہر کے اندر ہندو اور مسلمان تاجروں کے علاوہ بیشمار انگریز، ولندیزی، پرتگیز، یہودی، ارمنی، ایرانی، ترک اور تاتاری بیوپاری بستے اور نہایت امن و چین کی زندگی بسر کرتے تھے۔

اس صوبے کا دوسرا شہرۂ آفاق شہر سورت تھا۔ انگریز اور ولندیزی، بنگال، دکن، گجرات اور ملک کے دوسرے حصوں سے لائے گئے مال کو سورت ہی سے دوسرے ممالک کو ارسال کرتے تھے۔ گوآ، ڈابھیل، بسین اور دمن کے تاجر بھی قیمتی اشیاء سے پُر اپنے جہاز ہر سال موکھا، جدہ اور دوسری بندرگاہوں کو بھیجتے۔ یہ جہاز مارچ اور اپریل کے مہینے میں یہاں سے جاتے اور ستمبر میں لوٹ آتے۔ انگریزوں کے خیال میں سارے ایسٹ انڈیز میں سورت سے بڑھ کر یہاں کی اور باہر سے آئی ہوئی اشیاء کو بھیجنے کے لئے کوئی اچھی بندرگاہ نہیں تھی۔ سورت کے قلعے کے مقابل ایک کھلا میدان تھا جسے گرین کا سل کہہ کر پکارا جاتا اور جہاں ہندوستانی اور ودیشی بیوپاری اپنا اپنا مال بیچتے۔

سورت سے دس بارہ میل کے فاصلے پر سوالی یا سوالی واقع تھا جو جہازوں سے سامان اتارنے اور ان میں سامان لادنے کے لئے نہایت موزوں مقام تھا۔ سورت کے نزدیک بڑے بڑے جہازوں کے آنے کا کوئی مقام نہ تھا۔ سوالی میں انگریز، فرانسیسی اور ولندیزی کمپنیوں نے وہاں اپنے تاجروں کے رہنے کے لئے کمرے اور سامان رکھنے کے لئے گودام بنا رکھے تھے۔ ستمبر سے مارچ تک یہاں جہاز آسکتے۔ ہندو، مسلمان، پارسی اور آرمنی بیوپاریوں نے ساحل کے ساتھ ساتھ اپنے لئے چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں بنا رکھی تھیں جہاں وہ فروخت کرنے والی اشیاء کو رکھتے تھے۔

ان کے علاوہ کیمبے یا کھمبایت، بڑودہ اور بھڑوچ گجرات کے دیگر مشہور تجارتی مراکز تھے، جہاں ودیشی کمپنیوں نے اپنی فیکٹریاں کھول رکھی تھیں اور جہاں سے گیہوں، چاول، چینی، گھی، تیل اور کپڑا مشرقی اور مغربی ممالک کو بکثرت بھیجا جاتا تھا۔ بھڑوچ میں انگریز اور دوسرے بیوپاری کافی تعداد میں بستے تھے۔ انگریز اور ولندیزی تاجر ہر سال یہاں سے پانچ یا چھ بڑے جہاز ہندوستانی مال سے بھر کر ساور کو بھیجتے تھے۔ ہندو، مسلم، انگریز، ولندیزی بیوپاریوں کے علاوہ یہاں دیگر ممالک کے تاجران بھی رہتے تھے۔

شمالی ہند میں تجارت کے مرکزوں میں آگرہ اور بنارس خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔ بنگال، بہار اور اڑیسہ سے آنے والی جملہ اشیاء پہلے آگرہ ہی آتی تھیں اور وہاں سے مغرب اور جنوب کی طرف بھیجی جاتیں۔ اس شہر کی خوب گھنی آبادی تھی اور یہاں ہندو، مسلمان، ایرانی، ترک، تاتاری، یہودی، ارمنی، انگریز، فرانسیسی، پرتگیز، ولندیزی تاجر بستے تھے۔ یہاں ہزارہا عیسائی رہتے اور پوری آزادی کے ساتھ اپنے مذہب کے مطابق پرستش کرتے۔ آگرہ میں کئی قسم کا سوتی کپڑا دستیاب ہو سکتا تھا۔ ان میں قابلِ ذکر چوتار، بافتہ، گزی، مہر گل، جاجم، خیرآبادی، دریابادی، چھینٹ، سبہون، اکبری، امرتی، ابرتی، مندل وغیرہ تھے۔ بنارس میں گنگا جلی، مندل، کمربند اور چوکھبا نام کا کپڑا بکثرت ملتا تھا۔ سونے چاندی کے کام والا کپڑا یہاں بہتات سے دستیاب ہوتا۔ ان دنوں ایک عام روایت یہ تھی کہ تھوڑا کھانا بنارس میں رہنا۔ ہندوستانی بیوپاریوں کے علاوہ یہاں یورپی تاجر بھی بستے تھے۔

اسی طرح بہار، اڑیسہ، بنگال، سندھ، پنجاب، مالوہ، گولکنڈہ، بیجاپور اور دکن کے دوسرے شہر کپڑے اور اشیائے خوردنی کے خاص مرکز تھے۔ بہار میں پٹنہ اور لکھاوری، اڑیسہ میں ہجلی، جگن ناتھ، بلاسور، بنگال میں مالدام، ڈھاکہ، قاسم بازار، ہگلی، پنجاب میں دلی، پانی پت، سمانہ، لاہور، ملتان اور کارومنڈل ساحل پر وزیگاپٹم، بملی پٹم، مچھلی پٹم، ارماگاؤں، حیدرآباد، گولکنڈہ، نرساپور، پیڈاپلی، پلی کاٹ، نیلور، سان تھوم، مدراس، پانڈیچری، کڈالور، پورٹو نوو، ٹرانکوبار، ناگاپٹم، تیگاپٹم اور ٹوٹی کورن، اور مغربی ساحل پر بمبئی، گوآ، کاروار، منگلور، تیلی چیری، کالی کٹ

کو، پیپو وغیرہ اور سندھ میں ٹھٹھہ، کنڈارا، سیہون، منزلپور، ڈر سیلا اور سکھر ــ تجارت کے مشہور مقامات تھے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں سترہویں صدی میں انگریزوں اور ولندیزوں نے ہندوستان سے پرتگیز کی تجارت کو تقریباً ختم کر دیا تھا اور ہندوستان کی بیرونی تجارت کو ضعف پہنچایا تھا، وہاں انہوں نے ہندوستان کی بیرونی تجارت سے مستفید ہونے کے لئے اسے فروغ دینے کی بھی کوشش کی۔ سترہویں صدی میں ان کی تجارت کا ایک خاص پیٹرن بن گیا تھا۔ انگریزی کمپنی لندن سے ہر سال اپنی سورت میں واقع ایجنسی کے نام ایک تفصیلی خط لکھ کر اپنی ضروریات سے مطلع کر دیتی۔ سورت میں ایجنٹ اور کونسل مختلف شہروں میں اپنی فیکٹریوں کے نام خط لکھ کر ان آرڈروں کو سپلائی کرنے کے احکام صادر کرتے۔ اپنے اپنے علاقوں سے ان اشیاء کو فراہم کرنے کے وہ ضروری اقدامات کرتے۔ وہ مقامی تاجران سے مل کر ان چیزوں کو لانے کی درخواست کرتے۔ انکی سپلائی کے لئے دونوں اطراف کے مابین باقاعدہ تفصیلی عہدنامے ہوتے جن پر ان کے دستخط ہوتے۔ انگریز یا ہندوستانی تاجر انگلینڈ بھیجنے کے لئے گھی، گیہوں، چاول، چینی، اچار، مربے، تیل، لاکھ، ادویات وغیرہ فراہم کر کے سورت بھیجتے۔

ہندوستانی کپڑے کی سپلائی کے متعلق لندن سے کمپنی اپنے سورت، ہگلی اور فورٹ سینٹ جارج میں تعینات ایجنٹوں کے نام تفصیلی خطوط ارسال کرتی۔ لندن سے سونے سے بھرے جہاز ہندوستان آتے۔ اس سونے کے ہندوستانی کرنسی میں روپے بنائے جاتے۔ وہ سارے کا سارا روپیہ ہندوستانی کپڑے کی خرید کے لئے وقف ہوتا۔ فورٹ سینٹ جارج کا ایجنٹ، ہگلی کے ایجنٹ کے نام ایسا خط لکھتا۔ وہ دونوں اپنے اپنے (بنگال اور مشرقی ساحل کے) علاقوں میں اپنی فیکٹریوں کے افسران کو لکھتے۔ یہ لوگ اس علاقے کے تاجران کو بلاتے اور کمپنی کی ضرورت کے مطابق کپڑوں کے نمونے انہیں دکھلاتے اور ان کے ساتھ تفصیلی معاہدہ کر کے اس پر دونوں دستخط کرتے۔

جنوبی ہند میں اکثر یہ تاجران ہندو تھے اور پھر وہ اپنے اپنے علاقے کے کپڑا بننے والوں سے معاہدہ کرتے اور انہیں پیشگی روپیہ دیتے۔ یہ بنکر اکثر مسلمان ہوتے۔ اس طرح یہ انگریز اور ولندیزی بیوپاری ہندوستان کے ہندو تاجران اور مسلمان بنکروں سے معاہدہ کئے بنا کپڑا فراہم نہ کر سکتے۔ ایسا بھی ہوتا کہ کمپنی کے انگریز تاجر خود کپڑے کے مشہور مراکز میں عرصۂ دراز تک قیام کرتے، خود کو حالات کے مطابق ڈھال کر اس طرح کی زندگی بسر کرتے اور وہاں سے کپڑا فراہم کرتے۔ یہی بات ولندیزوں اور فرانسیسی اور ڈنمارک کے تاجران کے بارے میں تھی۔

تجارت کے میدان میں سترہویں صدی میں ہندوستان میں جو بیوپاری حصہ لیتے، ان میں ہندو، بوہرے، پارسی، عیسائی، یہودی، ارمنی، ترک، ایرانی، تاتاری، عرب، انگریز، ولندیزی، پرتگیز، ہسپانوی اور ڈنمارک کے تاجر شامل تھے۔ ان کے باہمی تعلقات نہایت خوشگوار تھے۔ گجرات کے ہندو بیوپاری عرب اور جنوب مشرقی اور دوسرے ممالک میں جاکر بھی بیوپار کرتے تھے۔ اس معاملے میں وہ بڑے باہمت تھے۔ ہندوستان میں یہ لوگ نہایت اونچی در پر ودیشی بیوپاریوں کو روپیہ قرض دیتے۔ ہندوستانی مال خرید کر ان کے جہازوں کو بھرتے اور ان سے اپنا حصہ لیتے۔ لین دین کے بارے میں اکثر دیانتداری برتی جاتی تھی جس سے تجارتی کاروبار میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آتی تھی۔

اسی وجہ سے سترہویں صدی کے اختتام تک ہندوستان اپنے نہایت کامیاب کاروبار کی بنا پر سونے کی چڑیا بنا رہا، اور بیوپاریوں کے خوشگوار تعلقات کے سبب یہاں خوشحالی کا دور دورہ رہا۔

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو)

تنہا تماپوری

مسرت

مسرت وہ پودہ ہے جس کی جڑیں
دُور تک پھیل کر بھی
تناور درخت اُسکو بننے نہ دیں گی
یہ نازک سا پودا تمہاری نگاہوں سے مستور ہوگا۔
تمہاری نگاہیں تناور درختوں ہی سے آشنا ہیں
تمہیں ننھے پودوں سے آنکھیں ملانے کی فرصت کہاں ہے!!؟
کبھی لے کے فرصت کی دو چار گھڑیاں
میرے ساتھ آؤ؛
تمہیں دل کی دھرتی پہ ننھا سا پودا دکھاؤں گا
اُس دن ——— یہ تم جان لوگے،
کہ ماں دردِ زہ کے نتیجہ سے خوش ہے
کہ بچہ تو مٹی کے گولوں سے خوش ہے
حُسینؑ اپنا سب کچھ لٹا کر بھی خوش ہے ...!!
یہ گوتم، یہ عیسیٰ، یہ رام اور سیتا ..... کہاں تک گناؤں ؟!
یہ سب جانتے تھے؛
کبھی تول کر، بولیاں بول کر
دُور بیں، خورد بیں کی نگاہوں سے چھو کر
نفع اور نقصان کی سوچ کر .....
ہم جسے پائیں گے
وہ مسرت نہیں ہے ——— !

مومن خان شوق

آوازیں

اکیلی، سانس لیتی تیرہ و تاریک وادی میں
صدا دیتا ہے اک بھٹکا ہوا سایہ
کبھی وہ چیختا ہے اور آوازیں لگاتا ہے
وہ سنتا ہے تعاقب میں صدائے بازگشت اپنی
کوئی ہمدرد مل جائے تو
چٹانیں وادیٔ خاموش کی تنہا چٹانیں
اُسے اپنی طرف آواز دیتی ہیں
ہَوا!
مغرور، اندھی، سرپھری، برگشتہ آوارہ
یہ کہتی ہے،
مُسافِر!
تو اسی سنسان وادی میں
چٹانوں کے جگر کو چیر کر تیشے سے جوئے شیر پیدا کر۔

ڈاکٹر ظ۔ انصاری

ذکرِ یار

ذاتی اور بے تکلف، مہذب اور شگفتہ خطوں کا ایک اہم مجموعہ ہے اور اس کی اہمیت تین باتوں میں ہے :
ایک تو اُن یادوں سے محفل خالی ہوتی جاتی ہے جن کی جھلک "ذکرِ یار" میں نظر آئی، دوسرے وہ تہذیب بڑی کارسیلی، پکی ہوئی اور بگڑی ہوگی جس میں مختلف سماجی مرتبوں اور سیاسی رجحانوں والے افراد کے درمیان ایسے بے تکلفی کے، ہمدردی کے، ربط ضبط کے اور روحانی آسودگی کے خط لکھے جاتے تھے، تعلقات نبھائے جاتے تھے، وضعداری کے بجائے دلداری کا خیال رکھا جاتا ہو۔ میں تو ان خطوں کو پڑھتے وقت مکتوب اور مکتوب الیہ دونوں سے غافل ہو گیا؛ تعلقات کی سہانی فضا اپنی رَو میں بہالے گئی۔
۔۔۔ صفحے کی اس کتاب میں دو تہائی صفحات تو مرحوم سعادت علی خاں کے اُن خطوں نے لے لئے ہیں جو اس مجموعے کی جان ہیں، باقی میں مرحوم کے عزیز دوستوں اشفاق حسین اور غلام محمد خاں کے تاثرات اور سعادت علی خاں کے چند رفیقوں کے مضامین اور اشعار۔ انھوں نے لکھنے کو اپنا فن نہیں بنایا، لیکن اگر واقعی جی لگا کر اور قلم سنبھال کر ہماری زبان میں کافی کچھ لکھا ہوتا تب بھی صاحبِ قلم کی پُربہار، دلفریب، البیلی اور تیکھی شخصیت اسی طرح اُن کی تحریروں پر حاوی رہتی جس طرح وہ خطوط میں نظر آتی ہے۔
تیسرے یہ کہ ان خطوں میں مکتوب الیہ کی شخصیت اُبھر کر سامنے آتی ہے۔ اشفاق حسین کے نام خطوط میں خود اشفاق صاحب کے پورے شاداب ذہنی طور سے ہم آہنگ، خوش ذوق اور صاحبِ نظر وجود پر سے نقاب اُٹھ جاتا ہے۔
اس مرحوم کے قریب قریب سبھی بے تکلف دوستوں سے مجھے کسی نہ کسی درجے میں نیاز حاصل رہا ہے، تاہم سکندر علی وجد اور مخدوم محی الدین سے خصوصی نسبت تھی۔ اسی نسبت سے سعادت علی خاں کے بھی دیدار ہوسکے جو حیدرآباد سے دہلی نئے نئے وارد ہوئے تھے اور با اقتدار بیورو کریسی میں رشک سے دیکھے جانے لگے تھے۔ ایسی ہی ایک رکھ رکھاؤ والی بزمِ شبانہ میں سعادت صاحب اپنی طرحدار شیروانی میں چوڑی دار پاجامہ کسے ہوئے بہت دیر سے، مگر اچانک پہنچے تو تعارف کے بغیر ہی یوں محسوس ہوا گویا رم جھم دبارش) ہو رہی تھی کہ ایکدم قوسِ قزح آنگن میں اُتر آئی ہے۔ وہ خود بھی اس وقت رنگ میں تھے۔ اپنے بڑوں کا لحاظ رکھتے وقت بھی اندرونی وجود کی لطف آمیز، لطیفہ پسند، زعفرانی ہستی کو پردے میں نہ رکھ سکے۔ میں ایک سر کھا مارا، خستہ و درماندہ سا، بوڑھے گاؤ تکئے سے لگا بیٹھا تھا، تعارف ہوا تو چہک کر بولے :

دوسروں کی عافیت میں خلل ڈال کر خود عافیت سے بیٹھے ہیں،

ذرا ادھر آیئے ۔۔۔ سامنے۔

اور پھر اپنے عزیز دوست مخدوم پر لطیفے اور پھبتیاں سُنانے لگے۔ مخدوم کی نظم میں جاگیرداروں کے رنگ، غدود اور اوسے پر شدید طنز تھا۔ "عود کی، کافور کی بو آتی ہے۔" سعادت کو غصہ اس بات پر تھا کہ اپنی نجی محفلوں کا غصہ طبقۂ امراء کو کیوں ٹکا سا دے کر کیوں نکالا گیا۔
سعادت خود طبقۂ اشراف سے تھے یعنی ان امراء میں سے جنہیں عادت، نوازش اور مکارم کی میراث

قابلیت بھی میسر آئی، پاس ادب تھا، ادب شناسی بھی، وسیع مطالعہ اور چھان پھٹک کی عادت ملی۔ ددھیال اور ننھیال کی طرف سے انھیں جو کچھ میسر آیا، وہ نہ تو اُن پر شرمندہ نظر آتے ہیں نہ مطمئن، وہ جس پر مستقل ذہنی صیقل سکتے جاتے ہیں برابر اپنا مطالعہ وسیع کرتے رہتے ہیں اور جو متاع گھر سے پائی ہے اسے اپنے طنز کا نشانہ بنانے سے نہیں چوکتے۔

"حضور نظام کو پرورش کے شناختی لفظ سے یاد کر کے وہ اُن کے تعلق سے جو باتیں اپنے دوستوں کو لکھتے ہیں وہ کوئی ایسا شخص نہیں لکھ سکتا جو بیگمی کے دامن سے لپٹا ہوا ہو۔ آداب کا خیال رکھتے ہوئے انھوں نے سب سے کٹیلا طنز آخری نظام پر کیا۔ اور سقوطِ عمان کے شہزادوں کی کھوکھلی زندگی میں اُن کی مشابہت دکھائی ہے۔

سعادت نہ اپنی سیادت کو چھپاتے ہیں، نہ اُس کا رعب ڈالتے ہیں، نہ اپنے احباب سے مُدن کی لیتے ہیں۔ نہ انکساری سے بچھے جاتے ہیں۔ انھوں نے بچپن ہی سے بڑوں کی آنکھیں دیکھی ہیں اور کسی کا رعب داب نہیں مانا، وہ ہنستے کھیلتے اس عالمِ اضداد سے گزرے ہیں، لیکن ضد ضد محرومی سے بے نیازانہ نہیں گزرے۔ پُرانی دلی کے اُن بچے کھچے قرئا کا ذکر آتا ہے جن میں پچھلے ۵۰ سال کے انقلاباتِ زمانہ نے کوئی حرکت پیدا نہیں کی، نجف اور کربلا میں محرم کے ماتمیوں کا زخمی یا ڈرامائی جلوس گزرتے دیکھ کر جس ابتری اور بدذوقی کا احساس انھیں ہوتا ہے، وہ اس میں دوستوں کو شریک کرتے ہیں، خوشحال اور مفلوک الحال دوستوں کے چھوٹے موٹے معاملات سے قلبی تعلق ہے اور اُن سے مُنہ نہیں موڑتے، پاکستانی سفارت خانے والوں کی عرب ملکوں میں بے بسی پر لطف لیتے ہیں ـــــ یہ سب ہے اور ان تمام کیفیتوں کے پیچھے احساس و شعور کی ایک گہری لہر بھی چل رہی ہے: جبر و اختیار کی کشمکش اور حالات کے دست و گریباں رہنے کا مشاہدہ جسے سعادت نے ایک قدیم فلسفی اصطلاح میں سمیٹ لیا ہے، وہ ہے تداخلِ فصلین۔ جہاں بھی دیکھتے ہیں کہ صورتِ حال اور صاحبِ معاملہ دونوں کی جان ایک دوسرے سے نہیں چھوٹنے والی اور پانسہ حالات کے جبر کے حق میں پڑنے والا ہے، تو وہ مسکراتے مسکراتے برا سا منہ بناتے ہیں اور ہاتھ جھٹک کر کہتے ہیں: .....

"اشفاق نے لکھا ہے کہ حیدرآباد اتنا بدل گیا ہے کہ ہمارے قدموں کے نشان بھی مٹ گئے ہیں۔ مرورِ زمانہ ہے۔ تداخلِ فصلین ہے کیا کریں"۔ اشفاق حسین سے پوچھتے ہیں:

"حیدرآباد فرخندہ بنیاد، ریاست ابد مدت کا کیا حال ہے؟ اعلیٰ حضرت حضور نظام خسروِ دکن و برار، حکیم السیاست کی خدمت گرامی میں اس خاکسار معتوب بدنگار، خاکپائے سادات کی طرف سے آداب و قدم بوسی گزران دینا، میرے بھائی تداخلِ فصلین ہے اس کے سوا کیا لکھوں۔"

کسی کی ایک طرح سے بسر ہوئی نہ انیس
عروجِ مہر جو دیکھا تو دوپہر دیکھا۔

زمانے کے نشیب و فراز اور حالات کے اندرونی تزاحم کا یہ احساس سعادت علی خاں کی شخصیت اور تحریروں کو پارہ پارہ کرنے کے بجائے انھیں رنگین، شگفتہ اور ظرافت پسند بناتا ہے۔ وہ جبر کی چھت میں سے اختیار کے روزن نکالنے کی کوشش بھی نہیں چھوڑتے، زندگی میں جتنا کچھ رنگ و آہنگ موجود ہے اُس سے منہ نہیں موڑتے ـــــ اور اس میں برابر دوستوں کو شریک کیے جاتے ہیں

"عزیزم اشفاق۔
تم مجھے کچھ دن پریشان مت کرو۔ میں اپنی کتاب کی تکمیل میں مصروف ہوں۔ یہ کام ختم ہو تو پھر کچھ اور کروں۔ کسی حال سے یہاں سے دکیس کو چلنے کا ارادہ ہے۔ A I C C (آل انڈیا کانگریس کمیٹی) کے جھمیلے میں شریک ہوگا پھر جبل اخضر ابھی تک ہے، ... یمن کو نے جاؤں گا اور پیڈیا تراکر کے عوام کی آنکھوں میں مزید دھول جھونکوں گا اور پھر دھنیلی واپس آجاؤں گا۔"

انگلستان اور سیاحتی تجربوں کے ذریعے پیام ور پرچۂ عشق کو تیار کرنے والا سعادت، اسی طرح ان تجربوں کی رنگ رنگ سے واقف ہے یہ اکثر معلوم ہوتا ہے جب انھیں یہ توقع بھی رہی ہوگی کہ ایک روز سفارت یا وزارت کے مقام پر اسی قسم کی پرپاتیوں کا مظاہرہ، مجھ کو کر بیٹھا ہے لیکن افسوس اس آرزو کا فرق ان کی آنکھ سے اوجھل نہ ہوا۔

یہی وہ پہلو ہے جس کی بدولت مرحوم اپنے دوستوں اور قدر دانوں کے دل میں بسے رہے،

مخدوم اشفاق" ہو دیکھیں تبدیلی نے آج سے ۴۰ سال پہلے" مقام اقبال" کو کر ادب کے میدان میں قدم رکھا تھا اور جس کے مطالعے نوش باشی اور خوش فکری کی بدولت اہلِ نظر میں مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ دیباچہ اس مجموعے کے سب سے اہم مکتوب الیہ ہیں۔ دوسرے ہیں غلام عمر خان، اردو ادبیات کے منشاور، امیرزادے اور "ابنائے زمانہ" کی حرکتوں کا نشانہ جن کے معاملات کی فکر سعادت علی خان کو ہر حال میں دامن گیر رہتی ہے۔ میر حسن، مشہور ادیب مترجم اور اہلِ علم ہیں جو آج بھی حیدر آباد کی سرگرمیوں میں نمایاں نظر آتے ہیں۔

"ذکر یار" میں سعادت علی خان کے علاوہ ان کے قریب ترین احباب کے یہ رواں دواں نقوش بہت دلکش ہیں۔

ذرا مخدوم محی الدین سے ملیے:

شاید تمھیں پتہ ہوگا کہ مخدوم کا آپریشن ہوا ہے، اس کو ہرنیا کی شکایت تھی۔ آپریشن بہت معمولی تھا اور کامیاب رہا۔ اُس دن ہم لوگ میر حسن اور عمر اس کو دیکھنے اسپتال گئے۔ کچھ غنودگی کا عالم تھا مگر جب آنکھیں کھلیں تو حسبِ عادت بکواس کرنے لگا۔ ڈاکٹر واڈ نے کہا تھا کہ خاموش رہے تو مناسب ہوگا۔ پرائیویٹ وارڈ میں ہے، کہنے لگا، یہ پہلے زچگی خانہ تھا اور ہماری حالت بھی کسی زچہ کی ہے۔ کل شام مخدوم کسی کو لے کر سفارش کے لئے آیا تھا۔ تازہ غزل سنائی جس کا انداز نہایت لطیف ہے۔ کم بخت کے پتھر جیسے دل میں غضب کی نرمی پیدا ہو گئی ہے۔ شاید میرا کہنا غلط ہے کہ اس کا دل پتھر سا تھا بلکہ اس نے زمانے کی زد سے بچنے کے لئے اپنے آپ کو ایسا بنا لیا تھا، آج کل بڑا رقیق القلب بن گیا ہے۔ :

اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا — جس گھر میں سر اٹھایا اُس کو بٹھا کے چھوڑا
اک دسترس سے تیری حالی بچا ہوا تھا — . . . . . وغیرہ وغیرہ

اس کی دو غزلیں جو ابھی حال میں چھپی ہیں بہت ہی اچھی ہیں۔ کہتا تھا، تم کو بھیجے گا . . . . .

اب ماشاء اللہ تم ترقی کے مستحق قرار دئے گئے ہو، مطلب یہ کہ تمھاری آمدنی میں اضافہ ہوگا قرض بھی لینے میں اتنی دشواریاں نہیں ہوں گی۔ پھر میرے بھائی دیر کیا ہے۔ صدیق دیناطہ کہتا تھا، قرض حسنہ وہ قرض ہے جس کو لے کر بھولتے ہیں۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔ مخدوم کا قول ہے۔ القرض کلید المحبۃ (یعنی قرض محبت کی کنجی ہے) لعنۃ اللہ علی الکاذبین

ان مختصر اور ہنستے کھیلتے خطوں میں شہروں کا، کتابوں کا، خاص کر کرداروں کا، مولویوں اور پنڈتوں کا، اُن پیروں اور مُلّاؤں کا بھی ذکر آتا تھا جو جاگیرداروں کے درمیان کوئی مشترک حیثیت رکھتے تھے۔ مثلاً کابل سے جو خط لکھا گیا اس میں کابل کے بارے میں یہ تاثر ہے (۱۹۵۹ء کے کابل کا):

> میرے بھائی افغان بڑا مہمان نواز ہوتا ہے۔ یہاں سرکاری مہمان خانے میں مقیم ہوں۔ صبح و شام نوکر دست بستہ کھڑے رہتے ہیں۔ مرحوم حیدر آباد یاد آگیا۔ خدا جنت نصیب کرے۔ بحمد اللہ یہاں شاہی اور اس کے لوازمات اب بھی باقی ہیں اور یہ ریاست اور عقیدت اب بھی بوڑھے لبرے دلوں کی یاد تازہ کرتی ہے۔ یہاں کے افغان بھائیوں کو ہندوستانی کلاسیکی موسیقی کا بے حد شوق ہے۔ اعلیٰ حضرت خود اس فن کے جاننے والوں میں ہیں اس لئے بڑے غلام علی خاں باوجود کبرسنی کے یہاں تشریف لائے ہیں . . یہاں عورتیں قدیم حیدر آباد کی عورتوں کی طرح پردہ نشین ہیں۔ البتہ شرک

بہاں پرنے بکثرت نظر آتے ہیں . . .

میرے بھائی، دنیا فانی ہے، سایہ ہے، سراب ہے، برق بے تاب ہے، مگر بے حد لطیف و دلپذیر ہے۔
کابل کو خبر کہنا شاید مبالغہ ہوگا۔ روسیوں کی امداد سے کچھ سڑکیں پختہ ہو گئی ہیں مگر گرد و غبار بہت ہے۔ وقت بے وقت آندھیاں اور بگولے اٹھتے ہیں۔ کوہ و دشت و صحرا کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اسی واسطے زمانۂ سابق میں اہل افغانستان جنت ہندوستان پر حملہ آور ہوا کرتے تھے۔ اب یہ حالت ہے کہ اپنے ملک کی ترقی کی طرف توجہ کر رہے ہیں۔ جہاں خشک میوہ اور پھل بکثرت ملتے ہیں، اسی پر زندگی کا دار و مدار ہے۔

خطوط، نظموں اور مختصر مضامین کے اس بے تکلف مجموعے کی سب سے نمایاں خصوصیت تو طرز تحریر کی بے تکلفی ہی ہے، لیکن اس کے علاوہ یہ بھی کہ تمام یاران میکدہ ۔۔۔ سعادت علی خاں، غلام محمد خاں، اشفاق حسین، میر حسن اور مخدوم سے ایک وقت ملاقات ہو جاتی ہے اور جنھیں اب تک ان حضرات سے ملنے کا شرف نصیب نہیں ہوا وہ بھی ان سے بے تکلفانہ مل لیتے ہیں۔
اہل حیدرآباد کے لئے جنھوں نے پولیس ایکشن سے پہلے آنکھ کھولی اور اس کے بعد تتر بتر ہو گئے۔
- ذکر یار ایک ارمغان ہے، ایک یادداشت ہے ایک البم ہے جسے سجا کر رکھنا چاہئے۔
چاؤش عموماً افریقی ساحل اور خلیج فارس کے ان عربوں کی اولاد کو کہتے ہیں جو مرحوم حیدرآباد کی فوج میں اعلیٰ کی خدمات انجام دیتے تھے۔ سعادت علی خاں نے اس اصطلاح خاص سے بڑے کام لئے ہیں
آدمی سفارت کے عہدے پر پہنچ کر، جب یہ معلوم ہو کہ ڈاک راستے میں کھل بھی جاتی ہے عزیز سے عزیز دوستوں کو اس قسم کے خطوط نہیں لکھا کرتا، لیکن سعادت کہاں جو کھونٹوں میں قید رہنے والے تھے! ایسے جملے لکھے گئے ہیں جن کی تازگی میں تداخل فصلین سے کوئی فرق نہیں آنے والا ۔۔۔ ملاحظہ ہو یہ خط جو سفارت ہند بغداد سے ۶ر دسمبر ۱۹۶۲ کو لکھا گیا ۔۔۔

بغداد

۶ر دسمبر ۱۹۶۲ء عزیزم اشفاق

تمہارا خط ۱۹ر نومبر ملا۔ پہلی دسمبر سے یہاں مسلسل جشن منایا جا رہا ہے۔ بغداد اور الکندی کی ہزار سالہ سالگرہ اور جشن آزادی سالانہ الزعیم عبدالکریم قاسم دونوں ساتھ آ گئے ہیں۔ کئی ممالک سے معزز مہمان یہاں جمع ہوئے ہیں اور علما و فضلاء کے جمگھٹے بغداد کے شہر کو رونق بخش رہے ہیں مگر عراقیوں نے اتنی مہمان نوازی دکھلائی اور اتنا دوڑایا کہ لنگڑی کر دیا بیچاروں کو :
سارے مندوبین خستہ حال اور تھکے ماندے ہیں۔ ہندوستانیوں کا برا حال ہے۔ نورالدین MAYAR دہلی کہتے ہیں اب کندی کا نام سنا تو کندی کی چیدی کر دیں گے۔ ڈاکٹر تاراچند ضعیف و نحیف ہیں۔ ان کے لئے جشن کا پروگرام بہت بھاری ثابت ہوا۔ اس پر طرہ یہ کہ یہاں کے شعراء اور قصیدہ گو کندی کو چھوڑ کر زعیم کی مدح و ثنا کرتے ہیں۔ ہمارے وفد کا ایک پر جوش ممبر مولوی آغا بخاری جو مدراس سے تشریف لائے ہیں مگر رہنے والے حیدرآباد کا ہے نظام کالج کا گریجویٹ ہے۔ ۱۹۲۴ یا ۱۹۲۶ عیسوی میں اس نے بی اے پاس کیا اور ۱۹۳۲ء میں ہجرت کر کے مدراس چلا گیا۔ بہت دلچسپ آدمی ہے۔ خوب عربی بولتا ہے۔ مجثہ اور شکل سے ہنری ہشتم شاہ انگلستان کا بھائی معلوم ہوتا ہے۔ مرد مسلمان ہے وہ اس کی زردہ وغیرہ پہلے ہی دن سے تو لوگ سب پر چھا گیا چینیوں کی روح پھڑا ہوتی ہے۔ موقع بے موقع ان کو ڈانشا رہتا ہے۔ جب کوئی فقرہ کستا ہے تو فوراً ہاتھ ملاتا ہے اور ایک فلک شگاف قہقہہ مار کر سامعین کے دلوں کو ہلا دیتا ہے۔ کل رات میں نے ان کی ضیافت کی۔ تمہاری دہی کی کراہی، شامی کے گوشت وغیرہ، بجو خیر خیر بہت رغبت سے کھایا اور کھانے کے بعد میرے لئے دعا کی۔ کہنے لگے یہاں دعا مختصر ہونی چاہیئے لیکن بہم دکنی ہے۔ ان پھرتی کی باتیں سن کر مولوی غلام یحییٰ یاد آ گئے۔

عمر کے خواب ہمارے رہے ہیں۔ وہ خاکی ہے کہ تم کو دو خط لکھے مگر جواب نہیں آیا۔ بیرحسن کو بہت دنوں سے خط نہیں لکھا ہے، بہار کو سے کہاں ملاکانگریس سے ملیں۔ ہاں پاکستانی وفد آٹھ آدمیوں کا ہے مگر اس کا لیڈر بنگالی ہے جس نے انگریزی کا بیان تقریر کی اور بنگالی انداز میں جو کسی کی سمجھ میں نہیں آئی۔ مولوی خوب ہنسا اور کہنے لگا کہ بنگالی کو بیان بھیجنے کا کیا حاصل ہوگا۔ تین دن کے سفر سے بچ گیا تھا۔ یہاں تقریباً دو ملا کر پہنچے چند جج کیا۔ چینیوں نے بڑا ناقابلِ تنگ کیا ہے۔

سہاوت

(اقتباس صفحہ ۱۰۵)

خانگی خطوط کی اشاعت ہمارے ملک کی کئی زبانوں (خصوصاً ہندی) میں فیشن بن چکی ہے، یہاں خطوط سے فتنے نہیں بگڑے سلجھے ہیں اور نظر کے سامنے کئی معتبر شخصیتیں علم و ادب میں رقص کرنے لگتی ہیں۔ اس اعتبار سے بھی یہ خطوط مرحوم کی یادیں لیے ہوئی اس تازہ ہوا کا جھونکا لاتے ہیں جو دو لفظوں میں سے آ رہی ہو۔

اس عرصے میں ایک اور سابق سفیر ہند یونس خاں کے "قیدی کے خطوط" بھی چھپے ہیں لیکن یہ ایسے خطوط کا مجموعہ ہے جو خاص اشاعت کی غرض سے اور سیاسی تعلیم کی خاطر لکھے گئے تھے اور جن کو پڑھتے وقت یہی مقصد پیش نظر رہنا چاہیے کہ تقسیم ہند سے قبل صوبۂ سرحد کی سیاست کیا تھی۔ "ذکر یار" کے خطوط بھی غرض ذکر و فکر اور چھیڑ چھاڑ کا مجموعہ ہیں۔ ایسے مجموعوں کا شائع ہونا ہماری زبان کے حق میں فالِ نیک ہے۔ اس زبان کے حق میں جسے اکثر اہل قلم تکلف اور تصنع کی ایک بگڑ کر لکھنے لگے ہیں۔

▲

ویت نام

خالد شفائی

ویت نام کی دھرتی
لے تجھے مبارک ہو
صبحِ نو کی انگڑائی
زندگی کی رعنائی
امن کا نیا سورج
شام کی جواں محفل
شب کا نغمۂ عشرت
چاند کا رُخِ روشن
نیند کے حسیں جھولے
خواب کی دل آویزی
خلوتوں کی رنگینی،
آرزو کی سرشاری
عہدِ نو کی تابانی!

ویت نام کی دھرتی
بیت ہی گئے آخر
جنگ اور وحشت کے
تیرے وہ بھیانک دن
جب ہوا پہ اُڑتے تھے
گِدھ گِراتے تھے بارود
دندناتے پھرتے تھے
قتل و خوں کے ہرکارے
آسماں سے ہوتی تھی
ہولناک بمباری
قہقہے لگاتی تھی
موت کی ستم کاری
آندھیاں سی چلتی تھیں
ظلم و بربریت کی
ہر طرف تھی ارزانی
موت اور ہلاکت کی۔

توپ خانے روز و شب
آگ اُگلا کرتے تھے
ٹینک، کِشت و گلشن کو
بڑھ کے روندا کرتے تھے
زرنگار بندوقیں
کرتی رہتی تھیں پیہم
گولیوں کی بوچھاریں
اور قہر ڈھاتی تھیں
راکٹوں کی یلغاریں
گونجتے دھماکوں سے
کانپ کانپ جاتی تھی
تیری روح آزردہ!
گیس اور دھوئیں سے تھی
جابجا فضا تیری
زہرناک و سم آلود
تیرے سُورما بیٹے
تیری آن و عزت پر
اپنے سر کٹاتے تھے
تیری شان کی خاطر
جان و تن لٹاتے تھے
چپہ چپہ لرزاں تھا
زخمیوں کی چیخوں سے
جسم سڑتے رہتے تھے!
بکھری بکھری لاشوں کے!
شہر شہر کھنڈر تھے
گاؤں گاؤں تھے ویراں
اُجڑے اُجڑے گلشن تھے
کھیت کھیت تھے سنسان۔

ہر طرف تباہی تھی
ہر طرف تھی بربادی
خاک و خوں میں لت پت تھی
زندگی کی شہزادی

دیکھ وقت نے لیکن
لی ہے اک نئی کروٹ
اب نئی بہاروں کی
ہے ہر ایک سو آہٹ
تیرے عزم کے آگے
ٹک سکی نہ زرداری
مات کھا گئی آخر
ظلم اور جفاکاری
دیکھ، خوار و رسوا ہے
قاہری دسعتا کی
سُرخرو ہوئی تیری
خودسری وہ باکی
آ ہی پہنچے منزل تک
سرفروش دیوانے
کس قدر رجیلے ہیں!
تیرے شوخ پروانے

ویت نام کی دھرتی
بھول جا تو اب اپنا
وہ سیاہ خونی دور
جب تری فضاؤں پر
ہر طرف مسلط تھے
ظلم و جنگ کے بادل
اور موت کے سائے!

فاروق راہب

پگھلتے خواب کے آنسو

(ٹھاکر پونچھی کے نام)

پچاس سال!
نصف صدی-!!
پچاس برس —!!!

پھنکارتی ہوئی ٹرین جب رک گئی تو پلیٹ فارم کا شور ماحول پر حاوی ہو گیا! اُس نے دیکھا، چڑھتے، اور اترتے ہوئے لوگوں میں، اسٹیشن پر آئے آدمیوں کے سیلاب میں —— سارے چہرے اپنے تھے، سارے لوگ اپنے تھے—— کچھ بھی تو نہ بدلا تھا! صرف وقت کی دھول جگہ جگہ جم گئی تھی۔ راکھ میں تہہ در تہہ چھپی ہوئی چنگاریاں، اگر پہلے سے بیدار تھیں اور شعلے سے لپکنے لگے تھے۔ اُس نے سوچا— اُنہیں میرے آنے کی خبر کیسے ہو گئی؟! لہریں لہروں کے تعاقب میں چلی بھی نہ تھیں، کہ ساحل ہی اُن تک پہنچ گیا۔ ٹوٹا ہوا قافلہ، قافلے سے بچھڑے ہوئے لوگ—— جانے کون کسے ڈھونڈ رہا تھا!؟ سامنے صرف دھند کی چادر تھی اور اس پر اجنبیت چھوٹے چھوٹے ذروں میں لپٹے ہوئے چہرے چھپائے تھے—— سب میں وہ تھا، سب اُس میں تھے! اُس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ پلیٹ فارم پر دھواں سائبان تھا اور اس میں اب تک وہ موڑ لٹکے تھے اور ان سے اب بھی لہو ٹپک رہا تھا—— دھائیں!—— اس کے کان کے پاس ہو کے گولی گزر گئی—— چیخیں—— اور چیخیں—— صرف چیخیں!! اسٹیشن سے کالج نزدیک ہونے کے سبب کچھ لڑکے لیزر آور میں پلیٹ فارم ناپ رہے تھے۔ گاڑی آئی تو ٹکٹ چیکنگ شروع ہو گئی۔ بغیر ٹکٹ کے مسافر پکڑے گئے۔ اُن میں وہ لڑکے بھی تھے—— انہیں چھڑانے کے لئے کالج کے تمام لڑکے چلے آئے—— اور پھر ہنگامہ ہوا، گولیاں چلیں—— ایک گولی اُس کے قریب سے بھی گزری اور کوئی اسے اسٹیشن سے دُور تک گھسیٹ لے گیا۔

"رحمن دادا!"

اور رحمن دادا اپنی ڈھلکی ہوئی سفید بھوؤں کے اندر سے اُسے گھور رہا تھا—— اُسے کئی لوگ گھیرے ہوئے کھڑے تھے۔

"تم نے مجھے پہچانا؟"

"آنکھیں نہ بدلیں تو چہروں کے بدلنے سے کیا ہوتا ہے!"

"تمہیں معلوم تھا کہ میں آؤں گا——؟"

"جب تک تلاش مکمل نہیں ہوتی، ہم اس کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں—— تم ہمیں چھوڑ کر چلے گئے تھے، ہم ہم تمہاری تلاش میں روز یہاں تک آتے تھے۔"

"اور اب......؟"

"تمہارے بعد پھر تمہاری تلاش—— اس لئے کہ تلاش کبھی اپنے انجام تک نہیں پہنچتی۔ انجام کے بعد پھر ابتدا کا کھیل شروع ہو جاتا ہے۔"

"کتنے لوگ اُٹھ گئے؟"

"بہت سے لوگ! لیکن وہ کسی نہ کسی روپ میں تمہارے منتظر ہیں—— یقین کی شمعیں جب تک تمہاری آنکھیں، انتظار کا دیا جلتا ہی رہتا ہے۔"

اپنی طوالت کو ختم نہ کرنے والی کالی سڑک کے دونوں

جونکوں سے بھری سڑک کے کنارے بچوں کی سی آنکھیں جیسے صحت کے اسرار کے منتظر ہوں، جنہیں
اُنہوں نے کھو دیئے تھے اور اُن پر جھکے ہوئے آسمان کا نیلا
آنکھیں تھیں، الٹی جیسے پھر پر منتظر ہیں کے ساتھ جھانکتی
تھیں ——— اس کے ساتھ کی انگلیوں کے لمس نے سارے
ماحول کو توڑ دیا اور اس نے جھیلوں میں اپنے ہی عکس پر دیکھا اور
محسوس کیا ——— مرنے والوں کے سینے پر ٹوٹے ہوئے اس چھوٹے
سے خوبصورت شہر میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ سب کچھ وہی
ہے جو سب کچھ یہی تھا!

دفعتہً کوئی اس کے قدموں میں جھکا اور پاؤں چھو کر اس کے
سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا ——— پتلا دبلا سا لڑکا سانولی
رنگت، چھوٹی چھوٹی چمکیلی آنکھیں جن میں زمانے بھر کا کرب تیر
رہا تھا۔ لیکن چھوٹی سی کھڑی ناک کے نیچے پتلے پتلے ہونٹوں پر
شبک مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

"راجن ہو؟"

"نہ، کپل! اس کا لڑکا۔"

"آہ ——— !"

آنکھیں پھر چھلکیں، ہونٹ کچھ کپکپائے۔

"میرے پتا نے مرتے سمے کہا تھا کہ تم ایک دن آؤ گے،
ضرور آؤ گے! اور اس نے مجھے ہدایت کی تھی کہ میں تمہارے
چرن چھو کر کہوں گا، میں تمہارا بیٹا ہوں!"

"ہم سب ایک دوسرے کے بیٹے ہیں کپل! ہمارا جسم
ہی تمہارا جسم ہے، تمہارے جسم کا حصہ ہم سب جنتے ہیں۔ بس
ایک ننھا سا قطرہ ہی ہمارے وجود کا محرک ہے جو ہم سب
کے جسموں کی سیپ میں بند ہے۔"

"تو ہم سب ایک ہی ہیں؟"

"ہاں، ہم سب ایک ہی ہیں!"

"اور وہ بھی ایک دوسرے کا لہو چوستے ہیں ——— ؟"

"وہ آدمی نہیں ہوتے میرے بیٹے، میرے دوست!

وہ جانور ہیں، صرف جانور!"

"میرے پتا نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ تم عظیم ہو!"

"نہیں، عظیم تو تمہارا باپ تھا! سر بلند شاعر! اور جس نے
چاندنی کو پچھاڑا تھا جہاں صرف عظمتیں بسیرا کرتی ہیں، کپل! تم
اس سے بھی عظیم ہو، کیونکہ تم ان میناروں پر کھڑے ہو۔"

مفہوم ہم سماروں کے ملوں میں گنگناتے ہوئے چہرے اور
چہروں پر گزرتی ہوئی صدیوں کا رقص ——— اور بکھری ہوئی
خلق! جس پر اس کے چھوڑے ہوئے سارے نشانات گویا
ابھی جگمگا رہے تھے۔

"جب تمہیں اپنی ہی سانسیں دھوکا دینے والی ہیں تو جانے
اب کون سی داستانیں ترتیب دینے آئے ہو؟"

"اوہ، قربانی! تم آج بھی اتنے ہی جوان ہو، اتنے ہی
بوڑھے۔ جتنا کہ میں نے تمہیں اپنے بچپن میں دیکھا تھا، اپنی
جوانی میں دیکھا تھا۔"

"وقت کو شکست دینے کیلئے کوئی تو ہو!"

"اتنے عرصے بعد بھی یہاں کچھ نہیں بدلا۔"

"بہت کچھ بدلا ہے اعظم! لیکن یہاں تبدیلیاں آہستہ آہستہ
لائی گئی ہیں ——— تاکہ گئے ہوئے مسافر کبھی لوٹیں تو انہیں
اجنبیت کا احساس نہ ہو ——— ویسے تمہارا اس چھوٹے
سے شہر میں دم ضرور گھٹ رہا ہوگا۔ اس لئے کہ تم بڑے شہروں
میں گھوم کر آ رہے ہو، بڑی سڑکوں کو دیکھ کر آ رہے ہو۔"

"گھٹن تو ہر جگہ ایک سی ہے ——— جیسے کہ جب تم
مسکراتے ہو تو ساری دنیا مسکراتی ہے اور جب تم روتے ہو تو
سارا عالم روتا ہے۔"

صندل کی سوندھی خوشبو آ رہی تھی، دھرتی کے اوپر اجلی
کرنیں بکھیرتے ہوئے نیلے امبر کے نیچے اپنے ہی کاندھوں پر اپنے
آپ کو اٹھائے ہوئے تک اپنے رشتوں کی کھوج میں نکلا مگر
کا شہر برسوں بعد بھی وہیں تھے جہاں وہ چھوڑ کر چلا گیا
تھا ——— جانے وہ نہیں بدلا کہ لوگ نہیں بدلے یا وقت تھم
گیا تھا! اس کی نگاہیں فریب کھا رہی تھیں ——— !!

وہ اجنبیت کا احساس کیوں چھپا نہیں سکا؟ اسے دبا
رہا تھا ——— اسے یہی محسوس ہوا کہ جیسے سناٹا شور بن گیا ہے!

"تم بہت دنوں بعد آئے، تمہارے یہاں سے چلے جانے کا دکھ

ڈاکٹر [illegible] بولے تھا۔ تمہارے [illegible] تمہارا طریقہ اپنایا ہے۔

"[illegible] ہے!"

"خون ایک ہونے [illegible] آگ ایک ہونے چاہئیں"

اپنے ہی جسم سے [illegible] کا سلسلہ، خنجروں کی انی
چھوتی اپنی ہی سانسیں۔ بے نام خون کی بہتے ہوئے [illegible]
انجان اُداسیوں پر ڈھلی اداسی بدنامیاں اور بہتے ہوئے [illegible]
میں اپنی ہی سرخی ہوئی لاشیں ——

"یہ کھنڈر ہے؟"

"ہاں، یہ اپنے رحمود صاحب کا ہے!"
سب نے دور دیکھا [illegible] ایک لمبی سانس کھینچی، پلکوں پر پھر [illegible]
ہوئے تھرتھرائے اور فضا غمناک ہوگئی۔

"جب بنگلہ دیش مشرقی پاکستان تھا تو وہ اپنے پورے پریوار کے ساتھ وہاں چلا گیا تھا۔ شاید اُس نے اپنے خواب سے زیادہ خواب بُن لیے تھے! لیکن جب مشرقی پاکستان بنگلہ دیش ہو گیا تو وہ چلا آیا! مگر وہ اکیلا ہی آیا تھا اور اپنے کمرے میں بند ہو کر رات بھر روتا رہا تھا اور صبح ہمیں اس کا ٹھنڈا جسم ملا تھا۔ ہم نے اُسے یہیں دفن کر دیا۔ یہ کھنڈر اُس کا امین ہے اور ہم اُس کے محافظ"

"ہر کھنڈر اپنی کہانیوں کا امین ہوتا ہے اور ہم اُسکے نگہبان"

—— لیکن!

لیکن وہ اس دردناک گلی سے نہیں گزرنا چاہتا تھا جس نے اُسے شہر بدر کیا تھا۔ اُسے اپنی گھر سے دربدر کی ٹھوکریں کھانے کے لئے نکال پھینکا تھا اور اُس کی داستان وہیں سے جنم لے کر وہیں کی خاک میں لہولہان ہو کر سو گئی تھی —— شاید کبھی نہ جاگنے کے لئے!

—— لیکن نہیں!

لیکن اُسے ہر گلی کی خاک چھاننی تھی۔ ہر جگہ کو دیکھنا تھا۔ کھوئی ہوئی ہر خوشبو کی لذت سے پھر آشنا ہونا تھا —— جانے اب کب آنا ہو! پھر ایسا موقع ملے گا بھی؟!!

اور جیسے ہی وہ گلی میں داخل ہوا، تمام لڑکے اس کی طرف چیختے ہوئے دوڑ پڑے —— [illegible] بھاگا تو —— [illegible] پیچھے کی [illegible] —— گلی [illegible] مسکراتے ہوئے —— اور چاند [illegible] کبڈی کا ہنگامہ —— سب کے ساتھ وہ تھا سب اُس کے ساتھ تھے —— اور اُس کے ساتھ ساتھ [illegible] گئی جیسے وہ لڑکی اس کے سامنے چھپا سا تبسم لئے کھڑی تھی ——

"تم ——!"

لب اُس سے زیادہ نہ کبھی بول سکے، کان اُس سے زیادہ نہ کبھی سُن سکے۔ اِن آنکھیں آنکھوں میں ڈوب کر گمشدہ جانے کیا کہتیں سنا جاتی تھیں —— ذہن میں طوفان اُٹھ رہا تھا جیسے میں صرف کانٹے ہی کانٹے رینگ رہے تھے۔ اور اس کا سارا وجود بھیگتا سنگ رہا تھا۔

لیکن !!!

لیکن اب تو وہ راکھ کا ڈھیر تھا۔ راکھ [illegible] کے بعد اب اُسے اس گلی سے ملنا بھی کیا! —— اب بچا ہی کیا ہوگا؟! اس کا اپنا مکان بھی تو گر چکا تھا۔ کسی سے ملاقات تو نہ ہو سکی —— پھر بھی اُسے وہاں تک جانا تھا۔ بس آخری بار وہ اپنے تمام گمشدہ لمحوں کو اپنی مفلوج انگلیوں کے بیچ گرفتار کر لینا چاہتا تھا۔ ان کی اذیت کی لذت سے ایکبار اور دوچار ہونا چاہتا تھا —— اور اُس کے قدم اس سمت بڑھتے ہی گئے۔ جہاں سے اُسے ناکارہ کا خطاب ملا تھا، آوارگی کی سند دی گئی تھی۔ اس کے باوجود اس کی کھلنڈری طبیعت شرارتوں سے کبھی باز نہ آئی۔ اس کے ہونٹ ہمیشہ قہقہہ زن ہی رہے ——

لیکن اس دن وہ ٹوٹ گیا جب اس کی آنکھوں کے خواب بکھرنے لگے —— وہ لڑکی اس کی دسترس سے دور ہو گئی! اس نے بھی اپنے سارے خوابوں اور سارے لوگوں کو [illegible] دیا" اور ایک رات چپکے سے اس شہر سے نکل گیا تھا۔ اس وقت وہ بیس برس کا تھا —— اور آج [illegible] تھا۔ اپنے شہر [illegible] لوگوں، اپنی گلیوں کی یاد [illegible] اس [illegible]

محبت کی چاہت تھی، اس کے وجود کو اس کے جذبات سے الگ کر
دیں ... ہوا تھا ـــــ وہ ایک مکان
کے پاس آکر رک گیا۔ مکان خاموش تھا، جیسے برسوں سے یہاں
سے کوئی آواز نہ گزری ہو! تمام دروازے، تمام کھڑکیاں، اور
روشن دان بند تھے، جیسے وہاں کوئی نہ آیا ہو، کبھی کوئی چاپ
نہ ابھری ہو! لیکن اسے ایسا لگا کہ در و دیوار کے سارے اسی کی
دستک کے منتظر ہیں! وہ دھڑکتے دل اور ڈگمگاتے قدموں
سے دروازے تک آیا ـــــ اور اس کی دستک سے پہلے ہی
دروازہ کھل گیا۔ وہ خود کو سنبھالے دہلیز پار کر کے اندر آیا،
ـــــ اس کی چاہت کا مرجھایا ہوا وہ پھول اس کے سامنے
کھلا ہوا ... اپنی پامالی کا حسرت و یاس میں ڈوبا افسانہ
کہہ رہا تھا۔

"انتظار کی ساری گھڑیاں ختم ہو گئیں جب ڈوب گئیں
تو تم آئے ہو ـــــ کتنے بے درد ہو تم کتنے کٹھور!"

اس کے آخری دو قطرے جانے کب سے پلکوں کی اوٹ
میں چھپے تھے، نکلے اور لڑھک کر رخساروں پر پھیلے ہوئے وقت
کے جال میں الجھ گئے۔

"شہلا، وقت کو تم پر بھی رحم نہ آیا!"

"جب اپنے اپنے نہ رہے، جب اپنے اپنے نہ رہے، تو
وقت کا کیا! وقت تو دشمن ہوتا ہی ہے" وہ سسکی۔

"سارے لوگ مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ سب کے سب
بیگانے ہو گئے اور تم بھی ـــــ لیکن مجھے یقین تھا کہ تم آؤ گے
اس لئے انتظار کے دیے سے لگی بیٹھی تھی"

"شہلا ـــــ"

لیکن اس کی آواز شدتِ جذبات سے مغلوب ہو گئی۔ سارے
الفاظ اس کے ذہن سے نکل گئے اور زبان نے چپ رہنے کا
لبادہ اوڑھ لیا۔ پھر بھی وہ اس کے قریب بہت قریب آیا
اور اسے بانہوں کے حصار میں سمیٹ لیا۔ اور اس کے پیاسے
لرزتے ہونٹوں پر اپنے خشک ... ہونٹ رکھ دیئے ـــــ
اور ان کی آنکھیں بند ہو گئیں اور دل ساکت ہو گئے، جیسے
انہیں ابدی سکون میسر ہو گیا ہو!

▲

بقیہ: لے زبانی زبان نہ بن جائے صفحہ ۱۴

یہ باتیں وہ دراصل میں اس لئے کر رہی تھی تاکہ سنسان اور سونے
مرگھٹ اور مرگھٹ میں ڈکراتی، رمبھاتی کالی مگر معصوم بھینسوں
کو بھلا سکوں۔ مگر وہ بھینسیں تو اب مرگھٹ سے سڑکوں
اور سڑکوں سے شہروں تک پہنچ گئی ہیں۔

"اوہ ۔۔۔۔ یعنی ۔۔۔۔ ماشاءاللہ!"

بقیہ: ڈرامہ۔ آخری فیصلہ صفحہ ۴۸

چنگیزی کو دیکھتی ہے پھر کچھ سوچ کر میز کی دراز کھول کر،
اس میں دیکھتی ہے اور اس میں سے چابیاں نکال کر
پھر دوسرے کمرے میں جاتے ہوئے) میں ابھی چائے
پیش کرتی ہوں۔

(ریحانہ دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ کمرے میں کچھ
خاموشی رہتی ہے کہ سلطانہ پھر کمرے میں آتی ہے۔
اس کے بال بکھرے ہوئے ہیں۔ چال میں شکست
خوردگی ہے۔ چنگیزی اور فخری دونوں خاموش رہتے
ہیں۔ کچھ دیر دونوں کو کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھتی
رہتی ہے پھر ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاغذ کو چنگیزی کو
دکھا کر)

سلطانہ۔ یہی وہ کاغذ ہے جو وکیل نے تیار کیا تھا۔ (چنگیزی
خاموش رہتا ہے) میں اسے واپس لے آئی ہوں۔
(کاغذ پھاڑ کر کھڑکی سے باہر پھینک دیتی ہے۔ چنگیزی
اور فخری حیرت سے اسے دیکھتے رہتے ہیں کہ ریحانہ
چائے کی ٹرے لئے کمرے میں آتی ہے۔ سلطانہ اس
کے ہاتھ سے ٹرے لیکر) ارے آپ کو تکلیف کرنا پڑی۔
(صوفے پر بیٹھ کر چائے بنانے لگتی ہے)

(پردہ)

غزلیں

یعقوب راہی

(بیتے گیدرا کی یاد میں)

ہوائے دردِ غریباں گلی گلی دیکھوں
سسکتی آگ کا اندازِ برہمی دیکھوں

قدم قدم کوئی آوازِ پا بلاتی ہو!
ہر اہر کوئی اظہارِ سرکشی دیکھوں

لہو لہو کی مہک، خواب خواب کی خوشبو
پگھلتی برف میں ڈھونڈوں کلی کلی دیکھوں

تمام رات جلے آنکھ آنکھ کا کاجل،
جو صبح اٹھوں تو ہر سمت اک نمی دیکھوں

★

سُرخ لاوے کی طرح جل کے نکھرنا سیکھو
سوکھی دھرتی کی دراڑوں سے اُبھرنا سیکھو

دشت در دشت پگھل جاؤ ہوا کی مانند
ایک آندھی کی طرح کھل کے گذرنا سیکھو

کوہساروں پہ چڑھو ابرِ رواں کی مانند
آبشاروں کی طرح گر کے بکھرنا سیکھو

مقتلِ شہر میں جب حرفِ وفا کھو جائے
تم مری چیخ کی مانند اُبھرنا سیکھو

زخمی حصاری

وقت کا منشا پورا ہوگا
ذرہ رشکِ ثریا ہوگا

تاریکی تو اور بڑھے گی
رات کے بعد سویرا ہوگا

بڑھنے دو احساسِ خودی تم
بندہ اک دن مولا ہوگا

ہر ذرہ ہے سرخی مائل
خون کسی کا ٹپکا ہوگا

ہر انساں ہے دشمنِ انساں
ایسا وقت نہ دیکھا ہوگا

کتنی ناہموار ہیں راہیں
منزل تک دیکھو کیا ہوگا

ظلم کے بادل چھٹ جانے دو
اور ہی رنگِ دنیا ہوگا

آج رہی ہے زیبِ گلشن
کل جو گل آوارہ ہوگا

عشق کو کیا معلوم تھا زخمی
حسن کبھی یوں رسوا ہوگا

نجمہ شہریار

بے زبانی زباں نہ بن جائے

جدید ہندوستان میں آج ہمارا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہم سب بے زبان ہیں۔ ہماری مثال اُن جانوروں کی سی ہے جن کو خدائے رب العزت نے نہ جانے کس جرم کی سزا میں قوتِ گویائی سے محروم کر دیا ہے۔

کل جب میرا رکشا ایک مرگھٹ کے پاس سے ہو کر گزرا تو میں نے بہت سی بے حد کالی بھینسوں کو دیکھا جو عجیب طرح ڈکرا رہی تھیں۔ جیسے کچھ کہنے کو تڑپ رہی ہوں۔ زبان ہوتے ہوئے بھی سب کی سب بے زبان تھیں۔

ایک صاحب نے بڑے تعجب سے اپنے ایک دوست سے کہا۔

"تم نے کچھ سنا؟ تم کو ایک بڑی حیرت انگیز بات بتاؤں"

"کیا؟" دوست ہمہ تن گوش ہو گیا

"وہ یہ کہ سنا ہے انگلستان میں مہتر تک انگریزی بولتا ہے۔"

"انگلستان میں مہتر تو کیا بچہ بچہ انگریزی بولتا ہے۔ واقعی بڑے تعجب کی بات ہے لیکن ایسی کوئی تعجب کی بات تو نہیں۔ ہمارے بھارت دیش میں آپ کو کوچہ کوچہ میں فرفر انگریزی بولنے والے بچے مل جائیں گے لیکن آپ ان سے پوچھیں۔

"تمہاری ماں کون سی زبان بولتی ہے۔ کیا تم اُس میں لکھ پڑھ سکتے ہو؟"

تو وہ بچارہ انتہائی بے چارگی اور معصومیت سے خلاء میں تاکنے لگے گا۔ اور لاجواب ہو جائے گا۔ سفید چمڑی والی قوم جو ورثہ چھوڑ گئی تھی، انہوں نے ہماری زبان کو سب سے پہلے متاثر کیا ہے۔

ہمارے دیس میں دو طرح کے اسکول ہیں ایک کا نام انگریزی سے براہ راست ترجمہ کیا جائے تو اسے "خانقاہ" کہیں گے دوسرے قسم کے دیسی اسکول ہیں، جن میں عام جنتا کے بچے تعلیم پاتے ہیں۔ "خانقاہ" اور "عام جنتا" کو ملا دیں تو [illegible] اور انگریزی کے [illegible] converted commas میں ہوا ہو جائے۔ دو الگ طرح کے اسکولوں سے پڑھ کر جو بچے نکلتے ہیں ان کے درمیان ایک ایسی خلیج حائل ہو جاتی ہے جو لاکھ کوششوں کے باوجود پُر نہیں ہوتی۔

ایک لطیفہ نما واقعہ سنئے۔ ایک صاحب جو کہ دیسی اسکول کی دین تھے اور مختلف شعراء کے اشعار کو گنگنا کر اکثر پڑھا کرتے تھے شریف مگر مجبور بیچارے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھے۔ اپنی لیاقت سے اتنی ترقی کی کہ [illegible] مگر ماڈرن خاندان کی ایک لڑکی سے شادی ہو گئی۔ بیوی کی تربیت میں ماں باپ سے زیادہ "خانقاہ" اور "خانقاہ" سے زیادہ سوسائٹی کا ہاتھ تھا اُردو تو دور کی بات ہے انگریزی ادب سے [illegible] [illegible] سارا محلہ مرعوب تھا۔ ایک دن صاحب [illegible] بیوی صاحبہ سے بولے سنو [illegible]

شاہد مسعود [illegible]

پہلے تو بیگم صاحب کی سمجھ میں کچھ نہ آیا پھر صاحب نے کچھ تشریح کی تو ایک لمبی سانس بھر کر بولیں:

"Oh! how cruel She must have been!"

میاں بیچارے اس بات پر سر دھنتے رہے اور سوچتے رہے کہ واقعی انگریزی زبان بڑی ترقی یافتہ زبان ہے۔ اردو غزل کے معشوق کے رہن سہن کی اگر یہی [illegible] ہوتی تو ہماری پوری قوم غزل پڑھنے اور کہنے کے مرض میں مبتلا نہ ہوتی۔

ہمارے قومی مزاج کی [illegible] اور سب ہی خصوصیات ہماری زبان میں [illegible] ہے۔ [illegible] معشوق [illegible] دشمنی کی بنیاد [illegible] ہے۔ ہم [illegible] یا معشوق سے جو گفتگو کی کوشش بھی کرتے ہیں [illegible] جانے جاتے ہیں کی انتہا ہے کہ ہم [illegible] اور معشوق سے جو گفتگو کرنے کیلئے اپنی مادری زبان کا استعمال بہت کم کرتے ہیں۔

میری تعلیم و تربیت [illegible] ابتدائی تعلیم مدرسہ میں ہوئی [illegible] کے بعد ایک کالج میں [illegible] اور [illegible] انگریزی زبان و ادب کی [illegible] تربیت [illegible] لیکن تعلیم انگریزی میں [illegible] بے حال ان طالبات کی حالت زار دیکھنے کے قابل ہے۔

ابھی کچھ دن پہلے کی بات ہے کہ کالج میں ایک صاحبزادی میرے پاس آئیں۔ میں نے آنے کا مقصد دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ان کی مادری زبان اردو ہے۔ اس لئے اردو کا [illegible] بات پر [illegible] کہ وہ فنا [illegible] والی لازمی اردو کا کورس لینا چاہتی ہیں۔ [illegible] ہم کو تو بالکل اردو نہیں آتی ہم کیسے [illegible] پاس ہوں گے؟ میں نے کتاب ان کے ہاتھ سے لے لی۔ غالب کی ایک غزل کے چند اشعار پڑھ کر سنائے۔

• آپ کچھ سمجھیں؟ اس میں کیا مشکل ہے۔ آپ کی مادری زبان اردو ہے نا؟

• اتنی مشکل تو اردو ہے۔ ہم تو آسانی والا اردو کا کورس لیں گے ہمیں اردو بالکل نہیں آتی ہے۔ اردو سے [illegible] کا اظہار کرتے ہوئے لہجے میں فخر کا عنصر خاصا نمایاں تھا۔

• تمہارا خاص مضمون کیا ہے؟

• انگلش میں (English Hons) جلدی سے بولیں۔

• تو کیا انگلش نہیں آتی ہے؟" جواب یقیناً ہاں میں ہوتا لیکن [illegible] ان کی [illegible] کے ساتھ [illegible] جاتی۔ اور ان کے علمی اعمال سے ان بات کی قلعی کھل جاتی۔ مجھے غصہ آگیا۔

• آپ قابل رحم ہیں جائیے اور جا کر الف سے اردو والی کتاب پڑھیے۔

مجھے یاد آرہا ہے ایک بار باہر سے [illegible] کی طرف سے ہم سب [illegible] گئے تھے۔ راستے میں بس کا ایک پہیہ گڑھے میں چلے جانے کی وجہ سے [illegible] کا دھچکا لگا۔

• [illegible]...... کالڑکیوں نے ایک ساتھ کہا۔ میں بھی شاید سب کو ایک ساتھ چیخنے کی ضرورت پیش آگئی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ [illegible] کا برزبان انگریزی ترجمہ ہے۔

جن دنوں لکھنؤ میں پڑھتی تھی، ان دنوں میرے کالج میں چند [illegible] لڑکیاں آئیں ہم کو بڑا حیرت ہوئی وہ سب کی سب [illegible] اردو بولتی تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ ہندوستان آنے سے پہلے انہوں نے باقاعدہ اردو [illegible] سیکھی تھیں۔ ان میں ایک [illegible] تھا۔ قرۃ العین حیدر پر ریسرچ کر رہی تھی۔ اور جس کا نام [illegible] تھا، بڑی حیرت [illegible] حقارت سے بولا۔

• کیا آپ کی زبان میں [illegible] کہ آپ اس طرح بات کر سکیں۔ آپ [illegible] استعمال کر رہی ہیں۔ [illegible] کے مترادف۔ آپ کی اپنی زبان میں موجود ہیں۔ ہم تو اپنے دیس میں اردو [illegible] بات کرتے [illegible]

ہم سب پر محفلوں، پارٹیوں میں گوروں کی عادتاً تقریباً سبھی انگریزی الفاظ کا استعمال کرتے رہتے تھے جس میں ایک خاص مقصد شاید اُن لوگوں کو مرعوب کرنا تھا ہم سب بہت خوش ہوتے تھے۔ اور اُس وقت گزرتے گئے۔ جب خدا کا شکر ہم سب کو پتہ لگ گیا تھی۔ مگر اب کیا ہے کہ ہم سب آزاد ہوتے ہوئے بھی غلام ہیں۔
یہ ترکیب وقت کی کون جانے ـــــ

ایک پرانا واقعہ ذہن کے کسی گوشے سے اُبھر رہا ہے۔ ایک بار کلاس میں انگریزی کا سبق پڑھاتے وقت میں نے ایک لفظ کے مترادف الفاظ لڑکیوں سے اُن کی مادری زبان میں پوچھے۔ تو میں کچھ ان کی مادری زبان اُردو تھی کہ ہم ہندی کا کوئی [illegible] اور کسی کی سمجھ میں نہ آیا تو ایک لڑکے نے فوراً بتا دیا۔ [illegible] اس لئے کہ [illegible] رہ گیا، وہ قابلِ معافی تھا۔ لیکن جس کی مادری زبان اُردو [illegible] اور پھر [illegible] کو پہلے [illegible] کو اُس لفظ کے مترادف اپنی زبان میں [illegible] معلوم نہ تھے۔ اُس لفظ کے پورے تصوّر سے چونکہ وہ واقف نہ تھیں اس لئے اُن کو اُس کے مطالب ذہن نشین کرانا بہت مشکل ہو گیا۔

آئیے اب آپ کو کچھ ایسی شخصیتوں سے ملاؤں جن کی حالت واقعی قابلِ رحم ہے۔ یہ لوگ [illegible] سے مغرب کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ گو کہ اپنی زبان والا سے بخوبی بہرہ ور ہیں، تحقیق، کلام بھی برابر ہو جاتا ہے، پھر بھی کچھ اس قسم کی بات سننے میں آتی ہے۔

ہمارے یہاں شاعروں اور نقادوں کو یہ تک معلوم نہیں کہ علامت یا علامتی شاعری کسے کہتے ہیں۔ ان میں سے اکثر تو اشعار پڑھنے کا بہت اچھی جانتے ہوئے بھی مہذب سوسائٹی میں بر زبانِ انگریزی گفتگو کرتے ہیں۔ فیشن کے طور پر کافکا اور کامیو پر بحث اور سیموئل کی بات کرتے ہیں۔ اور وہاں سے [illegible] ہرگز پسند نہیں کرتے۔

میری آنکھوں میں سچ مچ کے آنسو آجاتے ہیں۔ یہ سوچ کر کہ اب ہم کو یہ بھی یاد نہیں کہ ہماری مادری زبان میں خالقِ کائنات کو کیا کہتے ہیں۔ اب ہم جب قسم کھانا چاہتے ہیں تو بجائے اس قسم کے الفاظ خود بخود پھسل کر ہماری زبان پر آ جاتے ہیں۔ "I swear" یا "By God" جس میں کہ دوسرے خدا کو ذرا منہ گول کر کے اور تیز آواز میں کھینچ کر لمبا کیا جاتا ہے اور پھر قسم کھا کر بڑے اطمینان سے اپنے مخاطب کو دیکھا جاتا ہے کہ اب یقیناً اُسے ہماری بات کا سو فیصد یقین ہو گیا ہوگا۔ اگر خدا نخواستہ کسی نے اُن کے سامنے خدا قسم "یا" بھگوان کی قسم" کہہ دیا تو پھر تو اُس کی شامت سمجھ لیجئے۔ انتہائی تحقیر آمیز نگاہیں اُٹھیں گی۔ اور اُس شخص کو "ان کلچرڈ" اور "ان پالشڈ" کے خطابات سے فوراً نوازا جائے گا۔ تو وہ خدا یا بھگوان کی قسم کھانے والا اس سوچ میں پڑ جائے گا کہ وہ اگر پالش کا استعمال اپنے چہرے پر کرے بھلا تو وہ کون سی پالش ہو "نیل پالش" یا "بوٹ پالش"؟

اس قسم کے "کلچرڈ اور پالشڈ" لوگوں کو اگر خدا نخواستہ کہیں ایسے حادثے سے دوچار ہونا پڑا جس میں صرف ہندوستانی بولی سمجھی جاتی ہو تو ایسے موقع پر اُن کی حالت قابلِ رحم ہوتی ہے۔ اس وقت وہ ہندوستانی بھی انگریزی لہجہ میں بولتے ہیں اور پھر وہ مزید کھچڑی پکتی ہے جس میں چاول ہی گل جاتے ہیں پر دال ذرا کچی رہ جاتی ہے!

ان میں چند شخصیتیں کئی ایسے لوگوں سے ملاقات ہوئی جو اصل میں انگریزی کے شاعر تھے۔ اور انگریزی شاعری پر اُن کو اتنا ناز تھا کہ مجھ سے بڑا شاعر اُن کے آگے ہیچ۔ حتیٰ کہ سالوں میں عجیب سے ہیں۔ یہ [illegible] بھی اُن کے نام کے بغیر ادھورا ہے۔ جنہیں بھی اُن کے لٹریچر سے [illegible] ہیں۔ مجھے یاد ہے ایک صاحب کا باقاعدہ مجموعۂ کلام انگریزی میں شائع ہوا تھا۔ پھر اُن کے کچھ خواہاں نے نہ جانے کس جذبے کے تحت اُن کے مجموعے کا خیر مقدم کرنے کیلئے رسمِ اجرا کی ـــ آرٹس فیکلٹی لاؤنج میں وہ زیرِ لب مسکرا رہے تھے وہ جب جا رہے تھے وہ سرگوشیاں۔ کوئی ایسی چیز نہیں جو بھلائی جا سکے۔ قیامت تو یہ کہ وہ حضرت اپنے پورے حلیے سے شاعر لگنے کی کوشش میں رہتے تھے۔ مثلاً یہ کہ لمبے اُلجھے ہوئے بال رہتے تھے، ایک عجیب قسم کا لباس، کمبل اور قنوطیت اپنے چہرے پر طاری کئے رہتے تھے۔ اور آنکھیں تو خدا کی پناہ کیٹس کی آنکھوں سے بھی کچھ ملتی جلتی معلوم ہوتی تھیں۔ بس اُن کی شاعری میں ایک کمی سی لگتی کہ [illegible] اور [illegible] پر وہ جان بوجھ کر زیادہ دھیان نہ دیتے تھے کہ یہ جدید شاعری کا سب سے بڑا پہچان ہے بہر حال رسمِ اجرا کے اختتام پر یہ نتیجہ نکالا گیا کہ یہ شاعری دراصل [illegible] کی گئی ہو، خوش قسمتی سے کہیں غالب زندہ ہوتے تو اُن کا سر ندامت سے جھک جاتا اور وہ خود غرقِ آب ہو جاتے۔

[illegible]

رفعت نعیم

گیت

میناروں سے ہانک کے ریوڑ آ پہنچی ہے شام
کہ سورج ڈوب گیا

جن پیڑوں پر دھوپ تھی بیٹھی ان پر ہیں اب سائے
اڑنے والے سارے پنچھی لوٹ کے واپس آئے

میرے سونے پن میں ہر سو چیخ پڑا کہرام
کہ سورج ڈوب گیا

اندھے اندھیارے میں ہر سو یگ یگ ہے کھائی
چلتی ہے سانسوں کے پتھ میں چنتا کی پُروائی

دن کا بوجھ اٹھایا دن بھر کچھ نہ ملا انعام
کہ سورج ڈوب گیا

مجھ سے میری ہو نہ سکی ہے برسوں سے کچھ بات
اپنا پتہ خود سے پوچھوں گا [illegible] رات

مجھ کو ہی معلوم نہیں ہے کیا ہے میرا نام
کہ سورج ڈوب گیا

گھوم چکا ہوں اس میلے میں کوئی نہیں ہے اپنا
اتنے پتھر مجھ پر برسے ٹوٹ گیا ہر سپنا

کیا جانے اب کیا ہوگا ان ٹکڑوں کا انجام
کہ سورج ڈوب گیا

جاگ رہی ہے ایک بھیانک جوالا میرے اندر
روٹھ گئے ہیں سارے بادل سوکھ گیا ہے [illegible]

کوئی نہیں جو مجھ سے بولے صبر کا دامن تھام
کہ سورج ڈوب گیا۔

ابراہیم یوسف

آخری فیصلہ

کردار:

چنگیزی اور سلطانہ : میاں بیوی
فخری اور ریحانہ : میاں بیوی

منظر:

کمرہ جس میں شمال کی جانب کھڑکی ہے اور جس سے ایک سڑک نظر آتی ہے۔ اس وقت اس کے پردے ہٹے ہوئے ہیں۔ کھڑکی سے ذرا ہٹ کر دائیں جانب صوفہ سیٹ ہے اور اس کے بالکل سامنے دیوار پر چنگیزی اور سلطانہ کی تصویریں الگ الگ فریموں میں آویزاں ہیں۔ اسی دیوار سے لگی دو الماریاں ہیں کتابیں سلیقے سے لگی ہوئی ہیں۔ دونوں الماریوں کے درمیان ایک دروازہ ہے جو اندرونی مکان جانے کا کام دیتا ہے۔ جنوبی دیوار میں ایک اور دروازہ ہے جو بیرونی مکان کھلتا ہے۔ مغربی جانب ایک میز رکھی ہے اس کے پاس کونے میں اسٹول پر ریڈیو رکھا ہے اور دروازوں اور کھڑکی پر سبز پردے [illegible] جس وقت پردہ اٹھتا ہے تو سلطانہ صوفے پر بیٹھی نظر آتی ہے۔ کھڑکی کے پاس فخری کھڑا ہے [illegible] دونوں بہت دیر سے [illegible] فخری کو دیکھ کر۔

سلطانہ۔ یہ بات [illegible] ادھوری ہے ساری مسٹر فخری [illegible] فخری سے آپ زندوں سے [illegible] میری زندگی ادھوری ہے ایک نامکمل زندگی۔

فخری۔ آج دنیا میں ہر زندگی نامکمل ہے مسز چنگیزی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس کی زندگی ایک مکمل زندگی ہے۔

سلطانہ۔ (نظریں اٹھا کر فخری کو دیکھ کر) مسز چنگیزی (ٹھنڈی سانس بھر کر) چند گھنٹے اور مسز چنگیزی کہہ لیجئے۔

فخری۔ دنیا کے بڑے بڑے فیصلے بدل جاتے ہیں۔

(سلطانہ خاموش رہتی ہے۔ صوفے سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس جاتی ہے اور اس میں سے باہر دیکھنے لگتی ہے۔ کچھ دیر خاموش رہتی ہے۔ پھر فخری کی طرف دیکھ کر)

سلطانہ۔ مسٹر فخری۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ جس زندگی میں روح اور جسم الگ الگ ہوں مکمل زندگی ہے۔

فخری۔ (حیرت سے) روح اور جسم کا الگ الگ وجود۔ آپ کا مطلب ہے کہ

سلطانہ۔ میرا مطلب ہے کہ چنگیزی ان ہی دو الگ الگ وجودوں کا نام ہے۔ روحانی طور پر انہوں نے آج تک مجھے قبول نہیں کیا ہے۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) اپنی روح اور جسم کا یہ سودا مجھے بہت مہنگا پڑ رہا ہے۔ احساس کی دنیا میں ایک بد ترین شاہکار ہوں۔

فخری۔ [illegible] نہیں مسز فخری۔ یہ آپ کا محض وہم ہے۔ وہ ایک مخلص انسان ہیں۔

سلطانہ۔ (آنکھوں میں آنسو بھر کر) مسٹر فخری کاش وہ مجھ سے صرف ہمدردی میں نکاح کیا ہے (ٹھنڈی سانس

خاموشی سے اُسے دیکھتا رہتا ہے۔ سلطانہ کچھ دیر خاموش رہ کر) اِسی لئے کہ میں نے آپ سے طلاق لے لی تھی۔ وہ بتانا چاہتے تھے کہ وہ فراخ دل ہیں۔ وہ خود کو میرا محسن سمجھتے ہیں۔

فرخ۔ یہ بھی آپ وہم میں مبتلا ہیں۔ اگر وہ اِس قدر چھوٹے دل کا ہوتا تو ہمدردی کی بے تکلّف ملاقاتوں پر اس کو اعتراض ہوتا۔

سلطانہ۔ اور ان کا یہ رویّہ ہی میرے لئے باعث تکلیف ہے۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر پُر حسرت لہجے میں) اِس طرح وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ذہنی اعتبار سے وہ مجھ سے بہت بلند ہیں۔

فرخ۔ مسز چنگیزی آپ زندگی کو بہت اکاڈمک انداز سے دیکھتی ہیں۔ (آہستہ آہستہ سلطانہ کے پاس جا کر چند سیکنڈ اُسے غور سے دیکھتا رہتا ہے۔ پھر آہستہ سے) آپ نے مجھ سے اس لئے طلاق لی تھی کہ میں آپ سے ذہنی طور پر بہت پست ہوں۔ کیا آپ سمجھتی ہیں کہ دو انسانوں کے ذہن ترازو کے پلڑے برابر رکھ سکتے ہیں۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) کیا اچھا ہو کہ آپ اپنا فیصلہ بدل دیں۔

سلطانہ۔ فیصلہ بدل دوں! کیوں بدل دوں؟ اور پھر تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔

(فرخ آہستہ آہستہ میز کے پاس جاتا ہے اور اس سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ پھر سلطانہ کی طرف دیکھ کر)

فرخ۔ آپ ایک ہاتھ سے بھی تالی بجا لیتی ہیں مسز چنگیزی۔

سلطانہ۔ مسٹر فرخ ـــــ

فرخ۔ آپ زندگی کو کسی بھی نظر سے دیکھیں یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے۔ مگر بعض اوقات انسان کے ذاتی فیصلے دوسروں کی زندگیوں پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔

سلطانہ۔ دوسروں کی زندگیوں پر! کس کی زندگی پر؟ آپ کی زندگی پر؟ آخر کیوں؟

فرخ۔ اس لئے کہ آپ کے فیصلے سے ریحانہ غلط فہمیوں کا شکار ہو رہی ہے۔

سلطانہ۔ کیسی غلط فہمیاں کی؟ میں کسی کی غلط فہمی کا کیا علاج کر سکتی ہوں۔ (کچھ دیر خاموش رہتی ہے پھر آنکھوں میں آنسو بھر کر) میں بہت بدقسمت ہوں مسٹر فرخ۔ بہت بدقسمت۔ کوئی بھی مجھے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا۔

فرخ۔ مسز چنگیزی آنسو قسمت نہیں بدلا کرتے۔ صرف وقتی ہمدردی ہی حاصل کر سکتے ہیں۔

سلطانہ۔ مجھے ہمدردی کی نہیں محبت اور خلوص کی ضرورت ہے۔

فرخ۔ اور آپ محبت اور خلوص کو ذہن کی ترازو میں رکھ کر تولتی ہیں۔ (میز کے پاس سے ہٹ کر دروازے کی طرف جاتے ہوئے) آپ نے مجھے جذباتی اذیت میں مبتلا کیا اور اب آپ چنگیزی کی زندگی اجیرن بنانے پر تلی ہوئی ہیں جس کی شرافت اور انسانیت دوستی کی قسمیں کھائی جاتی ہیں۔

سلطانہ۔ مسٹر فرخ۔ (فرخ دروازے کے پاس رک کر مڑ کر سلطانہ کو دیکھتا ہے) میں کیا کروں فرخ (ہچکیوں سے روتے ہوئے) میں کیا کروں۔

فرخ۔ آپ کے فیصلے کیسے ہوتے ہیں یہ میں سمجھتا ہوں (طنزیہ) اس لئے سوائے صبر کرنے کے اور کیا مشورہ دے سکتا ہوں۔

(تیزی سے کمرے سے چلا جاتا ہے۔ سلطانہ پھر صوفے پر بیٹھ کر ہچکیوں سے رونے لگتی ہے۔ کچھ دیر روتی رہتی ہے، پھر ہچکیوں پر قابو پا کر آنسو پونچھتی ہے۔ کچھ دیر خاموش بیٹھی رہتی ہے، پھر کھڑکی کے پاس جا کر باہر دیکھنے لگتی ہے۔ کچھ دیر بعد چنگیزی کمرے میں آتا ہے۔ اس کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تھکا ہوا اور نڈھال ہے۔ سلطانہ مڑ کر اسے دیکھتی ہے۔ چنگیزی آہستہ آہستہ صوفے کے پاس جاتا ہے۔ کوٹ

آتار کر اُس کی پُشت پر ڈالتا ہے۔ پھر صوفے پر بیٹھ کر
اس کی پُشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیتا ہے۔
کچھ دیر یونہی بیٹھا رہتا ہے۔ پھر آنکھیں کھول کر،
سلطانہ کو دیکھ کر)

چنگیزی۔ وکیل نے کاغذات تیار کر لئے ہیں۔ عدالت میں
گیارہ بجے چل کر اُن پر دستخط کرنا ہے۔

سلطانہ۔ لیکن ——

چنگیزی۔ (پھر آنکھیں بند کر کے قطع کلام کرتے ہوئے) شک
کی دنیا سے جس قدر جلد ممکن ہو نکل جانا بہتر ہے۔

سلطانہ۔ شک کی دنیا! (آہستہ آہستہ چنگیزی کے پاس
آتے ہوئے) آپ کو مجھ پر شک بھی رہا ہے۔

چنگیزی۔ نہیں بلکہ تم کو مجھ پر شک رہا ہے۔ تم نے نہ صرف
میری جاسوسی کی ہے بلکہ ہمیشہ اپنی نگاہوں کے حلقے
میں محصور رکھنے کی کوشش کی ہے۔

سلطانہ۔ یہ غلط ہے بلکہ آپ نے میری ذاتی آزادی کو اپنا
احسان سمجھا ہے۔ فخری سے میری بے تکلفی کو آپ نے
ہمیشہ شک کی نظروں سے دیکھا ہے۔

(چنگیزی صوفے سے اُٹھ کر میز کے پاس جاتا ہے۔ کچھ دیر
بے مقصد سامان کو دیکھتا رہتا ہے پھر مڑ کر سلطانہ
کو دیکھ کر)

چنگیزی۔ فخری کو میں تم سے زیادہ سمجھتا ہوں۔ ایک زخم خوردہ
انسان کے جذبات اور احساسات کیا ہوتے ہیں، یہ
بھی جانتا ہوں۔

سلطانہ۔ زخم خوردہ!

چنگیزی۔ جی ہاں۔ آپ کو طلاق دیکر اس کو جو شاک لگا ہے وہ
اب اُس تجربے کو دوہرانا نہیں چاہتا۔ وہ اپنی بیوی سے
محبت کرتا ہے۔

سلطانہ۔ اور اس کی بیوی؟ (نفرت سے) اس پر شک کرتی
ہے۔ مجھے اپنا دشمن سمجھتی ہے۔ مجھے آوارہ، بدچلن اور
عیاش گردانتی ہے۔ مجھے اُس سے نفرت ہے۔

چنگیزی۔ آپ کی نفرت سے اس کی حیثیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

سلطانہ۔ خیر چھوڑیئے۔ آخری لمحوں میں زندگی اور تلخ بنانے
سے کیا فائدہ۔

چنگیزی۔ کاش یہ زندگی کے بھی آخری لمحات ہوتے۔ (ٹھنڈی
سانس بھر کر) کم از کم یہ سکون تو ہوتا کہ میں دنیا کی
طنز آمیز نگاہوں سے محفوظ رہوں گا۔

سلطانہ۔ (کچھ دیر چنگیزی کو دیکھتی رہتی ہے پھر آہستہ سے)
گویا آپ مجھ سے اس قدر بیزار ہو چکے ہیں کہ میرے
وجود سے موت بہتر سمجھتے ہیں۔

چنگیزی۔ پھانسی کا پھندا گھنٹوں گلے میں پڑا رہے، اس سے
بہتر ہے کہ جلاد جلد تختہ کھینچ لے تاکہ مشکل جلد آسان
ہو جائے۔

سلطانہ۔ چنگیزی تم نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ میرا بھی کوئی
وجود ہے۔ میں بھی اپنے وجود کا احساس کر سکتی ہوں۔

چنگیزی۔ محترمہ۔ وجود کا احساس سب کو ہوتا ہے مگر کسی
کا وجود ساری کائنات کو اپنے وجود میں جذب نہیں
کر سکتا۔ جب دو رنگوں کا ملاپ ہوتا ہے تو دونوں
کو اپنے اپنے الگ الگ وجود کا کچھ نہ کچھ حصہ تیاگنا
پڑتا ہے۔

سلطانہ۔ (غصے سے) اور تم نے اپنے وجود کے کس حصے
کو تیاگا؟ وہی اپنے محسن ہونے کا شدید احساس۔
وہی میری غلطیوں کی بے وقت راگنیاں۔ وہی اپنے
مشاغل کی دلچسپیاں۔ آخر وہ کونسا وجود تھا جو تم
تیاگ کر مجھ سے تیاگنے کی توقع کرتے رہے۔

چنگیزی۔ اور تم نے کب یہ سوچا کہ میرے بھی کچھ احساسات
ہیں، جذبات ہیں۔ میں ایک مردہ لاش نہیں ہوں جو
قبر میں جانے کے لئے دوسروں کے رحم و کرم کا انتظار
کرتی رہتی ہے۔

سلطانہ۔ جب ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ الگ ہو جائیں تو
پھر شکوے شکایت ہی فضول ہیں۔

چنگیزی۔ تم اسے شکوے شکایت کہتی ہو۔ سولی پر چڑھانا تمہارے نزدیک شکوے شکایت ہے۔

سلطانہ۔ (اپنے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ کر) خدا کے لئے خاموش رہیے ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گی۔

چنگیزی۔ (نفرت سے سلطانہ کی طرف دیکھ کر) محترمہ، پاگل ہونے کے لئے بڑی غیرت کی ضرورت ہوتی ہے۔

(جواب کا انتظار کئے بغیر تیز تیز قدموں سے دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ سلطانہ کچھ دیر خاموش کھڑی رہتی ہے پھر ایکدم پاگلوں کی طرح چیخ کر)

سلطانہ۔ مجھ میں غیرت نہیں۔ میں بے غیرت ہوں۔ (پاگلوں کی طرح اپنے بال نوچتی ہے اور پھر میز پر رکھے ہوئے گلدان کو اٹھا کر چنگیزی کی تصویر پر دے مارتی ہے۔ تصویر کا شیشہ چور چور ہو کر فرش پر گر پڑتا ہے۔ پھر پاگلوں کی طرح چیخ کر تصویر کی طرف اشارہ کرکے) تم بے غیرت ہو، بے غیرت۔ بے حس۔ تم مجھے فخری سے ملنے سے نہیں روک سکے۔ تم میں اتنی ہمت نہیں۔ تم بے غیرت ہو، بے غیرت۔

(پیپر ویٹ اٹھا کر پھر چنگیزی کی تصویر پر پھینکتی ہے مگر وہ پاس لگی ہوئی خود اس کی تصویر پر لگتا ہے اور اس کا شیشہ بھی چور چور ہو جاتا ہے۔ سلطانہ اپنی بگڑی ہوئی تصویر کو غور سے دیکھتی ہے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے۔ کچھ دیر بعد ریحانہ کمرے میں آتی ہے اور سلطانہ کو اس طرح روتے دیکھ کر حیرت سے)

ریحانہ۔ مسز چنگیزی۔ (سلطانہ نظریں اٹھا کر ریحانہ کو دیکھتی ہے۔ ریحانہ چند قدم آگے بڑھ کر) مسز چنگیزی۔۔۔ آپ۔۔۔

سلطانہ۔ (پاگلوں کے انداز میں) تم۔۔۔ مسز فخری (پاگلوں کے انداز میں آگے بڑھتے ہوئے) میں پاگل ہو گئی ہوں۔ (ریحانہ سہم کر دو چار قدم پیچھے ہٹ جاتی ہے) کیوں آئی ہو یہاں۔ میرا مذاق اڑانے کے لئے! ۔۔۔ میری بربادی کا نظارہ کرنے کے لئے!

ریحانہ۔ (سہمے ہوئے لہجے میں) جی نہیں۔ میں۔ میں تو۔

سلطانہ۔ (چیخ کر) بولو کیوں آئی ہو۔

ریحانہ۔ (اسی طرح سہمے ہوئے لہجے میں) میں مسٹر فخری کو دیکھنے آئی تھی کہ وہ یہاں تو نہیں رہے۔

سلطانہ۔ مسٹر فخری کو؟ میں اُن کو لیکر بھاگی نہیں جا رہی ہوں۔ میں اُن کو بھول چکی ہوں۔ ٹھکرا چکی ہوں۔

(پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے۔ ریحانہ کچھ دیر خاموش رہ کر اپنی ہمت کو یکجا کرکے)

ریحانہ۔ مسز چنگیزی شاید آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ (سلطانہ اسی طرح روتی رہتی ہے۔ ریحانہ اس کا ہاتھ پکڑ کر صوفے پر بٹھا کر) آپ آرام کیجئے۔ (صراحی سے گلاس میں پانی لیکر سلطانہ کے پاس آ کر) آپ تھوڑا پانی پی لیجئے۔

(سلطانہ نظریں اٹھا کر ریحانہ کو دیکھتی ہے مگر گلاس نہیں لیتی) پلیز، ایک دو گھونٹ پی لیجئے۔ طبیعت سنبھل جائے گی۔

(سلطانہ گلاس لیکر دو چار گھونٹ پانی پیتی ہے۔ ریحانہ گلاس اس کے ہاتھ سے لیکر میز پر رکھ دیتی ہے۔ پھر آہستہ سے)

سلطانہ۔ مسٹر فخری کل یہاں آئے ضرور تھے مگر چلے گئے۔۔۔ (کچھ دیر رک کر) مسز فخری اب یقین مانئے کبھی نہیں ملوں گی۔ کبھی نہیں۔

ریحانہ۔ مسز چنگیزی ایسی کوئی بات نہیں۔ مجھے آپ پر کامل اعتماد ہے۔ وہ صبح سے گھر نہیں پہنچے [illegible] سوچا شاید یہاں ہوں۔ کھانے کا وقت ہو گیا [illegible] [illegible] جاتا ہے۔

سلطانہ۔ [illegible]

[illegible]

پھر انھیں دفتر جانا پڑتا ہے کہ کہیں دیر نہ ہو جائے۔

سلطانہ۔ سنا کہ آپ ان کا بہت خیال رکھتی ہیں۔

ریحانہ۔ (مسکرا کر) اگر میں ان کا خیال نہ رکھوں تو پھر کون رکھیگا۔

سلطانہ۔ آپ کو اُن سے بہت محبت ہے۔

ریحانہ۔ میں جسے فرض سمجھتی ہوں آپ محبت کہہ لیجیے۔

سلطانہ۔ (یکدم جیسے اُس پر کوئی دَورہ پڑ گیا ہو) تم جھوٹ بول رہی ہو۔ تم فخری کی نگرانی کرنے آئی ہو۔

ریحانہ۔ مسز چنگیزی آپ

سلطانہ۔ (بات کاٹ کر) تم سوچ رہی ہو کہ میں انہیں لیکر کہیں بھاگی جا رہی ہوں۔ تم مجھے آوارہ، بدمعاش اور بدچلن سمجھتی ہو۔

ریحانہ۔ خدارا مسز چنگیزی

سلطانہ۔ خدا کو بیچ میں مت ڈالو۔ تم ہی میری تباہی کی ذمہ دار ہو۔ تم نے ہی فخری پر جادو کر کے مجھ سے چھینا ہے۔ تم ہی نے میری تباہی کا سامان کیا ہے۔

ریحانہ۔ (مشتعل ہو کر) مسز چنگیزی اپنے ہوش میں رہیے۔ آپ سماجی مشین کا وہ پرزہ ہیں جو کہیں فٹ نہیں ہو سکتا۔

سلطانہ۔ (چیخ کر) چپ رہو ورنہ۔ ورنہ۔ یاد رکھو کہ میں۔

ریحانہ۔ کیوں چپ رہوں۔ میں اپنے شوہر کی زندگی میں ساجھے دار ہوں۔ اس کو تباہ نہیں ہونے دوں گی۔

سلطانہ۔ (غصے سے) دیکھو۔ دیکھو مسز فخری میں ——

ریحانہ۔ (بات کاٹ کر) تم لباسوں کی طرح اپنے شوہر بدلتی رہو اور ایک دن اکتا کر کسی گٹر کے کیڑے کی طرح زندگی گزارنے لگو۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ وقت خود تمہیں سمجھا لیگا۔

سلطانہ۔ (چیخ کر) خاموش رہو۔ خاموش —— ورنہ ——

(چنگیزی دوسرے کمرے سے آتے ہوئے)

ریحانہ۔ کیا بات ہے مسز فخری۔ یہ چیخ پکار ——

ریحانہ۔ (نفرت سے سلطانہ کی طرف اشارہ کر کے) ان ہی سے

پوچھئے۔ (چنگیزی سلطانہ کی طرف دیکھتا ہے۔ سلطانہ پھر ہچکیوں سے رونے لگتی ہے۔ ریحانہ اور چنگیزی بے تعلق سے کھڑے رہتے ہیں۔ سلطانہ کچھ دیر ہچکیوں سے روتی رہتی ہے پھر نظریں اٹھا کر ان دونوں کو دیکھتی ہے۔ ریحانہ چنگیزی کی طرف دیکھ کر سلطانہ کی طرف اشارہ کر کے) میں فخری کو تلاش کرنے آئی تھی۔ یہ مجھ سے بلا وجہ اُلجھ رہی ہیں۔

چنگیزی۔ (طنزیہ) اِن کا اپنا وجود ہے مسز فخری۔ اِنہیں معاف کر دیجیے۔ قابلِ رحم وجود کو معاف ہی کر دینا چاہیے۔

(سلطانہ پھر دونوں کو دیکھتی ہے۔ کچھ دیر خاموش کھڑی رہتی ہے پھر آہستہ آہستہ دروازے کی طرف جاتے ہوئے)

سلطانہ۔ میں گیارہ بجے عدالت پہنچ جاؤں گی۔ (چنگیزی خاموش رہتا ہے۔ سلطانہ دروازے کے پاس پہنچ کر مڑ کر، چنگیزی کو دیکھ کر) ساری چابیاں میز کی دراز میں ہیں۔

ریحانہ۔ مسز چنگیزی۔ (سلطانہ مڑ کر نہیں دیکھتی، کمرے سے چلی جاتی ہے۔ ریحانہ چنگیزی کو دیکھ کر) انہیں روکیے مسٹر چنگیزی، وہ اپنے حواس میں نہیں ہیں۔ کہیں خدانخواستہ ——

چنگیزی۔ (حسرت آمیز لہجے میں) جانے دیجیے مسز فخری۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) میں گھنٹے دو گھنٹے پہلے ہی صلیب کی اذیت سے نجات پا گیا۔

(چنگیزی خاموش ہو کر کھڑکی کے پاس جاتا ہے اور باہر دیکھنے لگتا ہے۔ ریحانہ بھی اُس کے پاس آ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ کچھ دیر بعد)

ریحانہ۔ شاید وہ واپس آنا چاہتی ہیں۔ پلٹ کر دیکھ رہی ہیں (بلند آواز سے) مسز چنگیزی۔

چنگیزی۔ (ریحانہ کے منہ پر ہاتھ رکھ کر) جانے دیجیے مسز فخری۔ (پھر یکدم جیسے اپنی غلطی کا احساس کر کے) آئی ایم سوری۔ سو سوری مسز فخری۔

(گھبرا کر اس کے منہ پر سے اپنا ہاتھ ہٹا لیتا ہے)

ہو گھبرا کر پیچھے ہٹ جاتی ہے۔ چنگیزی خاموشی سے واپس
ایک صوفے پر بیٹھ جاتا ہے اور سگریٹ جلا کر اُس کے
دھوئیں سے چھلے بنانے لگتا ہے۔ ریحانہ کھڑکی سے باہر
دیکھتی رہتی ہے۔ کچھ دیر بعد چنگیزی کو دیکھ کر)
ریحانہ۔ اب وہ سڑک پر پہنچ گئیں مسٹر چنگیزی۔ (چنگیزی کے
پاس آتے ہوئے) شاید اب وہ واپس نہیں آئیں گی۔
(چنگیزی خاموش رہتا ہے اور سامنے دیوار پر اپنی
اور سلطانہ کی ٹنگی ہوئی تصویروں کو دیکھتا رہتا ہے)
ریحانہ چنگیزی کے پاس آ کر) مجھے افسوس ہے مسٹر چنگیزی۔
چنگیزی۔ (پھیکی مسکراہٹ سے) اگر میرے صلیب سے
اترنے پر آپ کو افسوس ہے تو مجھے آپ کا شکریہ ادا
کرنا چاہیئے۔
ریحانہ۔ (کسی قدر شرمندہ ہو کر) میرا مطلب یہ نہیں تھا۔
(چنگیزی صوفے سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس جاتا ہے اور
باہر دیکھنے لگتا ہے۔ ریحانہ کچھ دیر خاموش رہ کر) مسٹر
چنگیزی کے بچے اپنے کامپلیکس تھے۔
چنگیزی۔ (اسی طرح باہر دیکھتے ہوئے) جی ہاں۔ اپنے وجود کا
کامپلیکس جس کے آگے باقی وجود وجود نہیں تھے۔
(ریحانہ خاموش رہتی ہے۔ اُس کے چہرے سے معلوم ہوتا
ہے کہ ان واقعات سے وہ الجھن میں مبتلا ہے۔ چنگیزی
اسی طرح خاموش کھڑا کھڑکی سے باہر دیکھتا رہتا ہے کہ
فخری کمرے میں آتا ہے اور ریحانہ کو دیکھ کر)
فخری۔ میں جانتا تھا کہ آپ یہیں ہوں گی۔ ارے بھئی۔ (چنگیزی
کو اور فخری کو دیکھتا ہے۔ چنگیزی کی آنکھوں میں آنسو ہیں)
ارے چنگیزی کیا بات ہے۔
(چنگیزی خاموش رہتا ہے۔ فخری سوالیہ نظروں سے
ریحانہ کو دیکھتا ہے۔ ریحانہ ٹھنڈی سانس بھر کر)
ریحانہ۔ مسز چنگیزی چلی گئیں۔
فخری۔ (حیرت سے) چلی گئیں۔ (چنگیزی کی طرف دیکھتا
ہے۔ چنگیزی خاموش رہتا ہے) کیا سچ مچ انہوں نے

آخری فیصلہ کر لیا۔
چنگیزی۔ (اثبات میں سر ہلا کر) ہاں۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر)
آج گیارہ بجے عدالت میں ہماری آخری ملاقات ہوگی
فخری۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) سلطانہ ہمیشہ ناقابلِ فہم رہی۔
عجیب الجھی ہوئی شخصیت ہے۔
چنگیزی۔ (طنزیہ) وہ خود اپنے لئے ناقابلِ فہم ہے (کچھ
دیر رُک کر، شکست خوردہ لہجے میں) تم جو کچھ ہوا
اچھا ہوا۔ (سوچتے ہوئے) دو سال پہلے تمہارے جو
جذبات تھے وہ آج میں محسوس کر رہا ہوں۔
ریحانہ۔ کاش یہ سب کچھ نہ ہوتا۔
چنگیزی۔ جو کچھ ہو گیا اُس پر غم کرنا فضول ہے مسز فخری۔
(کچھ دیر خاموش رہ کر فخری سے) فخری! تم گیارہ بجے
میرے ساتھ عدالت چل سکو گے، شاید تمہاری موجودگی
میں مجھے اپنی شکست برداشت کرنے کی ہمت
ہو جائے۔ شاید میں اپنی بربادی، بدنامی اور ناکامی کو
سہہ سکوں۔ میں ابھی سے نروس ہوں۔
فخری۔ (کچھ دیر سوچتا ہے پھر ٹھنڈی سانس بھر کر) انسان
کے لئے کتنی صلیبیں ہیں جن پر اُسے ہر لمحہ چڑھنا
پڑتا ہے پھر بھی وہ کس قدر عظیم ہے کہ صلیب کی یہ
اذیتیں بھی اس کو شکست نہیں دے سکتیں۔
چنگیزی۔ (کچھ دیر سوچتا رہتا ہے پھر ریحانہ کی طرف دیکھ کر)
مسز فخری معاف کیجئے گا! اس وقت میں آپ سے
چائے کے لئے بھی نہیں پوچھ سکتا۔
ریحانہ۔ میں اس وقت چائے پینے نہیں آئی ہوں (کچھ دیر
رُک کر) مگر ٹھہریئے میں چائے کا انتظام کرتی ہوں۔
(دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ فخری اور چنگیزی
دونوں خاموش رہتے ہیں۔ کچھ دیر بعد چنگیزی سگریٹ
نکال کر جلاتا ہے اور سگریٹ کیس فخری کی طرف
بڑھاتا ہے کہ ریحانہ واپس آ کر) مسز چنگیزی سارے
کمروں میں تالے ڈال گئی ہیں۔ کچن میں گئی۔ (پہلے تو

(بقیہ صفحہ ... پر دیکھئے)

نَذِرَحَمّون

پروفیسر رام ناتھ شاستری

خطبۂ استقبالیہ

محترم صاحبِ صدر اور دیش کے نامور ادیبو!

مجھے اِس بات کی خوشی بھی ہے اور فخر بھی کہ آج اِس اہم ادبی کانفرنس کے موقع پر ریاست کے ادیبوں اور فنکاروں کی طرف سے یہ موقع دیا گیا ہے کہ میں جموں کے اِس تاریخی شہر میں آپ کو خوش آمدید کہوں۔

دیش کے جتنے نامور اردو ادیبوں اور شاعروں نے جو ایک ساتھ جموں کی سرزمین کو اپنی آمد سے نوازا ہے، اِس کے لئے اہلِ جموں آپ کے ممنون ہیں۔ جموں وطن پرست بہادر ڈوگروں کی سرزمین ہے۔ جس جگہ پر آج ادیبوں کی یہ تاریخی کانفرنس ہو رہی ہے اُسی جگہ پر انیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں لاہور کے سکھ سرداروں کی فوج کشی کے خلاف میاں ڈیڈو اور میاں موٹا کئی بار اپنے جاں نثاروں کے ساتھ صف آرا ہوئے تھے۔ آزادی کی بقا و تحفظ کے لئے اسی طرز کی ایک عوامی مدافعت POPULAR RESISTANCE کی منظر کشی ڈوگری کے نامور شاعر دینو بھائی پنت نے اپنی ایک طویل نظم میں کی ہے جس میں توی دریا کو بھی ایک اہم کردار کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔

قربانی اور حق پرست شجاعت کی اِس دھرتی ہی پر وہ امر فنکار پیدا ہوئے جنہوں نے مصوری کی دنیا میں جموں اور بسوہلی کے نام کو آفاقی شہرت بخشی۔ اِس امر سادھنا کی ایک دھندلی سی جھلک آج بھی کئی پرانے محلوں، قلعوں اور مندروں کی دیواروں اور جموں شہر کی ڈوگرہ آرٹ گیلری میں دیکھنے کو مل جاتی ہے۔

اس سرزمین کی ادبی روایات [illegible] بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے اِس سرزمین کو بہت کم ایسے حاکم ملے جو فن و ادب کی سرپرستی کا ذوق رکھتے تھے۔ ڈوگرہ راجاؤں میں مہاراجہ رنجیت دیو (۱۷۳۵ء۔ ۱۷۸۱ء) جیسے فن پرست اور ادب نواز حکمران ایک دو ہی ہوئے ہیں۔

یہ دھرتی جہاں لوک گیتوں کی دولت سے مالا مال ہے، وہاں ڈوگری دتو، ترلوچن، شیو رام، لکھو، گنگا رام، رام دھن، [illegible] اور رگھوناتھ سنگھ جیسے پرانے شاعروں نے بھی ڈوگری زبان و ادب کو تخلیقی شعور کی نئی وسعتوں سے ہمکنار کیا ہے۔ دیش میں ۱۹۴۷ء سے پہلے تحریکِ آزادی کے ساتھ ساتھ ملک کی علاقائی زبانوں میں جو بیداری رونما ہوئی اُس نے ڈوگروں کی سرزمین کو بھی متاثر کیا۔ ۱۹۴۷ء تک ڈوگری زبان میں صرف چند ایک کتابیں ہی ملتی تھیں لیکن آج ڈوگری کا ادبی و تخلیقی سرمایہ اتنا وقیع اور وسیع ہو چکا ہے کہ ساہتیہ اکادمی نے اسے بھارت کی ایک خود مختار ادبی زبان کے طور پر تسلیم کر لیا ہے اور پچھلے تین برسوں میں [illegible] تین ادیبوں کو ساہتیہ اکادمی انعامات سے نوازا جا چکا ہے۔ [illegible] کا پہلا ساہتیہ اکادمی انعام ۱۹۷۰ء میں [illegible] کو ان کے افسانوں کے مجموعے [illegible] پر دیا گیا۔ [illegible] انعام [illegible]

[illegible]

کارنامہ ہے۔

لیکن اس کانفرنس میں ڈوگری زبان کے ادیبوں اور شعر کاروں کے علاوہ ریاست کی دوسری زبانوں کے ادیب اور فنکار بھی شامل ہیں۔ ہماری ریاست مختلف زبانوں کا گہوارہ ہے۔ ریاستی آئین میں جن سات علاقائی زبانوں کو تسلیم کیا گیا ہے وہ ہیں کشمیری۔ ڈوگری۔ بلتی۔ دادری۔ پنجابی۔ پہاڑی اور لداخی۔ اسی آئین کی ایک دفعہ کے تحت اردو ریاست کی سرکاری زبان ہے لیکن آزادی کے پہلے انگریزی زبان سرکاری کام کاج میں جس طرح استعمال ہوتی تھی اسی طرح وہ تب تک استعمال ہوتی رہے گی جب تک کہ ریاست کی قانون سازیہ نیا قانون پاس کر کے اس کی اس حیثیت کو بدل نہیں دیتی۔ ادھر سارے ملک میں ہندی کی آئینی حیثیت بھی تقریباً ویسی ہی ہے جیسی ہمارے یہاں اردو کی۔ اس طرح انگریزی یہاں ملک کے دوسرے صوبوں اور مرکز میں آج بھی اپنے پہلے کے منصب پر بدستور قائم ہے۔

ان آئینی تحفظات اور ریاستی سرکار کی پر خلوص خواہش کے باوجود ہماری علاقائی زبانیں اپنے جائز حقوق اور مناسب مقام کو حاصل کرنے میں ابھی تک پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکی ہیں۔ کشمیری زبان ہماری ریاست کی ایک اہم علاقائی زبان ہے۔ اس کی کہانی بھی ڈوگری زبان کی کہانی سے بہت حد تک ملتی جلتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کشمیری کو آئین کے آٹھویں شیڈول میں شامل کیا گیا ہے لیکن ابھی وادی کے اسکولوں میں ذریعہ تعلیم یا اس کو سرکاری کام کاج میں استعمال کرنا باقی ہے۔ ابھی تک مشکل سے اسے اسکولوں کی چھٹی ساتویں جماعتوں تک ایک زبان کے طور پر پڑھانے کا انتظام ہو سکا ہے جبکہ ڈوگری میں ابھی تک یہ بھی ممکن نہیں ہو سکا ہے۔

کشمیری زبان کا [illegible] میں موجودہ دور میں [illegible] عظیم تخلیقی کاوشوں [illegible] لیا ہے۔ انہوں [illegible] سننے کے [illegible]

اور حسن کارانہ تخیل کی وسعت عطا کی ہے۔

ہماری ریاست میں ہندی اور اردو اور پنجابی زبانوں میں ادبی کاوشوں کو ان زبانوں کی پرانی روایات اور ملک کے دوسرے حصوں میں ان کی ادبی تحریکوں سے بڑی اہم سرپرستی ملتی رہی مگر ڈوگری، کشمیری اور ریاست کی دوسری عوامی زبانوں جیسے لداخی، بلتی، پہاڑی، گوجری اور بھدرواہی وغیرہ کو اس طرح کی کوئی وراثت یا سرپرستی حاصل نہیں ہے۔ انہیں اپنی بقا اور ارتقا کے لئے اپنے طور پر ہی جد و جہد کرنی ہے اور اپنے لئے نئی ادبی روایات کی داغ بیل ڈالنی ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ ریاست میں ہندی اور اردو جیسی ملکی زبانوں کے ساتھ ساتھ ڈوگری، کشمیری اور پنجابی زبانوں میں بھی ادبی رجحان بڑھتا جا رہا ہے اور ان مختلف زبانوں کے ادیبوں میں باہمی بھائی چارے اور ایک دوسرے کے لئے پیار اور احترام کا جذبہ قابل ستائش ہے۔

اس کانفرنس میں ریاست کی مختلف زبانوں کے ادیبوں کو ملک کے کہنہ مشق اور شہرۂ آفاق ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ مل بیٹھنے کا یہ ایک نادر موقع ملا ہے۔ یہ ہماری خوش نصیبی ہے آپ لوگوں میں سے کوئی بھی نام ہمارے لئے غیر مانوس نہیں ہے۔ جموں میں شاید آپ میں سے کچھ لوگ ہی کبھی تشریف لائے ہوں لیکن اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والے نئی اور پرانی نسل کے لوگ ادبی دنیا میں آپ کی شہرت و مقام سے بخوبی واقف ہیں اور آپ کی تخلیقات سے فیضیاب ہونے کا شرف رکھتے ہیں۔

ہم ریاستی ادیب ریاستی سرکار کے بھی ممنون ہیں جس نے اپنی کڑی مصروفیات میں سے وقت نکال کر اتنا بڑا مذاکرہ کرنے کی دعوت کو اپنا کر [illegible] کر لیا۔

آپ یہاں اس کانفرنس میں تشریف لائے اس کے لئے ہم سب آپ کے تہ دل سے شکر گزار ہیں۔

۲۰ مارچ [illegible]

[illegible]

سید میر قاسم (وزیر اعلیٰ جموں و کشمیر)

خطبۂ افتتاحیہ

جنابِ صدر، خواتین اور حضرات!

جموں کے اس تاریخی شہر میں ملک کے ممتاز ادیبوں شاعروں اور فن کاروں کی تشریف آوری میرے لئے باعثِ مسرت ہے۔ کافی عرصے سے ہماری خواہش تھی کہ آپ یہاں تشریف لائیں۔ یہاں کے لوگوں سے ملیں، ان کی باتیں سنیں اور ان کو اپنی باتیں سنائیں۔ ریاست کے فن کاروں کی بھی یہ دیرینہ خواہش تھی جو آج پوری ہو رہی ہے اور یہ خوشی کا مقام ہے۔

آپ میں سے چند فن کار تو اسی خطۂ زمین کی پیداوار ہیں۔ جناب کرشن چندر، مہندر ناتھ، پدما سچدیو، ٹھاکر پونچھی تو انہی پہاڑوں میں پیدا ہوئے۔ یہاں کے خوبصورت مرغزاروں اور وادیوں میں ان کا لڑکپن گذرا۔ یہیں کے چیڑ اور چناروں کے درختوں میں وہ کھیلتے رہے۔ یہاں کے گھنے جنگلوں میں وہ گھومے۔ ندیوں اور چشموں کا شفاف پانی پیا۔ یہیں کے قدرتی مناظر نے ان کے اندر کے ادیب کو بیدار کیا۔ یہاں کی برف پوش چوٹیوں نے ان کے خیالات کو جِلا دی۔ اور یہاں کی خوبصورتی اور سندرتا کا اثر ان کے دل و دماغ پر پڑا۔ جس کی وجہ سے انہوں نے پونچھ اور کشمیر کے بارے میں اپنے غیر فانی ادبی شہ پارے لکھے۔ جناب کرشن چندر کے تو ہم بے حد ممنون ہیں۔ ان کی کہانیاں پڑھ کر ہم اکثر محسوس کرتے ہیں کہ وہ رہتے تو بمبئی کے وسیع شہر میں رہتے ہیں مگر ان کے ذہن میں ہمارے پہاڑ، ان پہاڑوں میں رہنے والے لوگ، ان لوگوں کی زندگی کے مسائل، ان مسائل کی پیچیدگیاں اور ان پیچیدگیوں کے حل تڑپتے رہتے ہیں۔ جن کو وہ دنیا اور دنیا والوں کے سامنے پیش کرتے اور ابھارتے ہیں۔ کوئی عظیم ادیب اور صحت مند ادب کو کسی خطے میں محدود نہیں کیا جا سکتا۔ کرشن چندر اور ان کا ادب ہمارا قومی سرمایہ ہے۔ لیکن ادیب چند دن ساتھ رہے ہوں تو اپنائیت کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ آپ میں سے باقی سب فن کاروں نے بھی جموں و کشمیر کی ریاست اور یہاں کے لوگوں کو جو پیار دیا ہے، اُن کے مسائل کو سمجھا ہے اور ہماری جدوجہدِ آزادی میں ہماری حمایت کی ہے۔ اس کے لئے ہم سب آپ کے شکر گذار ہیں۔ امید ہے کہ ہمسفری کا یہ تسلسل جاری رہے گا اور آپ اکثر و بیشتر یہاں تشریف لایا کریں گے۔

مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ آپ میں سے اکثر فن کاروں نے ہمارے نوجوان طبقے کے اندازِ فکر کو بہت حد تک متاثر کیا ہے اور ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہماری منزل ایک ہے۔ اس منزل تک پہنچنے کا راستہ ایک ہے اور اس راستے پر ہم قدم سے قدم ملا کر چلتے ہیں۔ ہم عوامی زندگی کی قوتوں اور ان کی ترقی کے خواہاں ہیں۔ اس عوامی زندگی پر جس طبقے کی ضرب پڑتی ہے، ہم اُس کے خلاف صف آرا ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ طبقہ اُس وقت تک ختم نہیں ہوگا جب تک دنیا بھر کے عوام ایک نہ ہوں۔ ہم دنیا میں جنگ کا خاتمہ چاہتے ہیں! امن کے متلاشی ہیں اور انسان اور انسان کے درمیان محبت کے رشتے استوار اور مضبوط دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہم نئے سماج کی تعمیر چاہتے ہیں، جہاں آدمی کو آدمی کا مقام حاصل ہو۔ لوٹ کھسوٹ کے لئے گنجائش نہ رہے، سماجی ناانصافی ختم ہو اور انسان کو ترقی کے تمام مواقع بہم پہنچیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے ادیب، شاعر اور فن کار اس دوڑ میں ہمارے [illegible] بھی سچا، حسین، خوبصورت اور ترقی کا ادب پیدا [illegible]

ادیب کو عوام کے قریب آنا چاہیئے، اُن کے جذبات کو محسوس کرنا چاہیئے اپنے فن شہ پارے کی علامت تلاش کرنی چاہیئے اور دیکھنا چاہیئے کہ عوام کیا سوچتے ہیں کیا کھاتے ہیں کیا پہنتے ہیں کس طرح رہتے سہتے ہیں اور کس طرح زندگی سے محبت کرتے ہیں۔ زندگی کی خوشی اور کرب اِسی میں ملے گا۔ اِس عوامی زندگی کا مشاہدہ کئے بغیر سچے ادب کی تخلیق نہیں ہو سکتی۔ ادیب زندگی سے بھاگ کر نہیں بلکہ اس بے قرار ہر دم بدلتی ہوئی زندگی کے درمیان کھڑے ہو کر اس کی کشاکش اور کشمکش میں حصہ لیکر زندگی کی سچائی، حسن اور خوبصورتی سے آگاہ ہو سکتا ہے۔

میں جانتا ہوں آپ سب اس انداز فکر کے حامی ہی نہیں، علم بردار رہے ہیں۔ آپ سب کا کردار میرے سامنے ہے۔ جہاں کہیں ستم رسیدہ جنتا اور دبی ہوئی مخلوق نے آواز بلند کی آپ نے اپنی زوردار آواز اُس میں ملا دی اپنے زور قلم سے اُس میں شدت پیدا کر دی اور اپنے کلام اور تحریروں سے اُن کے دل و دماغ کو گرمی عطا کی۔ اور ایک وقت آگیا کہ ہم نے غیروں کی غلامی سے آزادی حاصل کر لی۔

یہ وحدتِ فکر اور یہ سوچ کا انداز ہم کو ایک دوسرے کے قریب لاتا ہے۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں ہوتے ہوئے بھی ہمیں ایک لڑی میں پروتا ہے اور ہمارے خیالات میں مکمل ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔ اسی لئے مجھے احساس ہوتا ہے کہ ہم ایک ہیں اور ہم ایک رہیں گے۔

میرے وطن کے عظیم فنکارو! ہم تین بار جنگ اور درندگی کا شکار ہوئے ہیں۔ آج جس مقام پر آپ زندگی کو بنانے سنوارنے اور نکھارنے کی راہیں تلاش کرنے کے لئے جمع ہو گئے ہیں یہیں پر گئے سال بم برسائے گئے۔ ہر روز بمبار جہاز بم برساتے اور وحشت ناک گڑگڑاہٹ کے ساتھ واپس چلے جاتے۔ اِسی خطۂ زمین میں بے بس اور جھونپڑیوں کے علاقوں کو تباہ و برباد کیا گیا۔ یہیں سہاگنوں کے سہاگ لٹے۔ ماؤں کے لال شہید ہوئے۔ بچے اپنے باپ کی شفقت سے محروم ہو گئے۔ گھروں کے گھر تباہ ہو گئے۔ [illegible] کی درندگی کا شکار ہو گئے اب بھی ہمارے ملک کے قریب ایسے لوگ ہیں جو پھر سے اپنے لئے گھر نہیں بنا سکے ہیں اور پناہ گزینوں کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم امنِ عالم کے متلاشی ہیں۔ عالمی امن اور دائمی امن۔ مجھے معلوم ہے آپ بھی جنگ کے خلاف جنگ کرتے ہیں۔ کیونکہ جنگ جب جب ہوئی، اُس کے نتیجے میں جس طرح معصوم اور بے گناہ انسانوں کا خون ہوا۔ دنیا کے تمام گوشوں سے ادیبوں اور فنکاروں نے اِس کے خلاف آواز بلند کی اور بڑی شدت کے ساتھ جنگ کی مخالفت کی۔ جنگ کے خلاف اور امن کی خاطر جس خوبصورت مگر زوردار انداز میں ہمارے دانشوروں اور ادیبوں نے آواز اٹھائی، وہ کرشن چندر کے الفاظ میں آپ کو سُنانا چاہتا ہوں۔ جو لکھتے ہیں۔

"جنگ سے کوئی حساس ادیب خوش نہیں ہوتا جنگ اکثر حالتوں میں ناگزیر سہی لیکن اس سے کسی انسان کو مسرت حاصل نہیں ہوتی۔ کیونکہ جب جانی مرتا ہے، امجد دم توڑتا ہے یا متوبی کی موت واقع ہوتی ہے تو یہ صرف ایک سپاہی کی موت نہیں ہوتی۔ ایک واحد ہستی، ایک اکائی، ایک منفرد شخصیت کی موت نہیں ہوتی۔ ایک آدمی کے مرنے سے شاید ایک دنیا مرتی ہے۔ جس میں حسن و عشق کی ہزار رنگینیاں مستور ہوتی ہیں۔ ملک اور انسانیت کی خدمت کے ہزار ارادے ہوتے ہیں۔ شاید نئی قدروں سے شناسا ہونے اور نئے اخلاق کی سربلندیوں کو چھو لینے کی ناگفتہ آرزوئیں ہوتی ہیں۔ اور اگر یہ سب کچھ نہیں ہوتا تو وہ تمام چھوٹی چھوٹی بظاہر معمولی مگر بباطن انتہائی بیش قیمت جزئیات زندگی موجود ہوتی ہیں جو ہر انسان کی زندگی کو چاہے وہ کتنا ہی فاسق و فاجر کیوں نہ ہو پیارا بنائے رکھنے کے لئے مرغوب بناتی ہے۔ کمانے کی آرزو۔ ایک چھوٹے سے گھر میں رہنے کی آرزو۔ جوان ہونٹوں کو چومنے کی آرزو۔ فرشِ زمین پر لیٹے لیٹے بلند آسمان کی [illegible] کو تکنے کی آرزو۔ اور اسی قسم کی چھوٹی

چھوٹی چیزوں اکثروں کو مٹا دیتی ہیں۔ اسی لئے یہ بالکل سچ ہے کہ جب سپاہی مرتا ہے تو ایک دنیا مرتی ہے، ایک [illegible] ایک شہید مرتا ہے، ایک کتاب مرتی ہے، ایک نئی تخلیق، سائنس کی نئی ایجاد، حسن، سچائی اور صداقت کا ایک تخلیقی نمونہ مر جاتا ہے اور دنیا کو پہلے سے زیادہ غریب، نادار اور ویران چھوڑ جاتا ہے۔

یہ ہے ایک فن کار کا احتجاج جنگ کے خلاف جو انسان کی موت کو ایک دنیا کی موت سمجھتا ہے اور جو دنیا میں امن اور آشتی کا متوالا ہے۔

بہرحال غیروں کی غلامی سے نجات، دائمی امن اور سیاسی کارکنوں یا فن کاروں کی کاوشیں بے معنی ہیں اگر یہ سب اپنے ساتھ عوام کے لئے معاشی آزادی نہیں لاتیں۔ پُرامن فضا، بھوک کا کوئی حل تو نہیں۔ سیاسی جنگ و دو افلاس کا جواب نہیں۔ شاعروں کی شاعری سے پسماندگی ختم نہیں ہو سکتی۔ ادیبوں کی نگارشات بیماری اور بدحالی کا علاج نہیں ہو سکتیں۔ اگر کوئی علاج ہے یا ان تمام بیماریوں کا کوئی حل ہے تو وہ ہے سماج کے لئے معاشی آزادی۔ غلامی کے طویل دَور نے ہمارے سماج کے جسم پر اس قدر زیادہ اور گہرے گھاؤ لگائے ہیں کہ اس کا سارا وجود زخم خوردہ اور نحیف ہو گیا ہے جس کو دیکھ کر آدمی کہتا ہے ؎

"دل ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم"

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم سماج کے یہ داغ دھوئیں اور ان پر یلغار کریں تاکہ اس کا ضعف دُور ہو اور اس کی توانائی لوٹ آئے۔ ظاہر ہے یہ کام نہایت صبر آزما اور کٹھن ہے۔ تعمیر کا کام تخریب سے زیادہ عمل اور مسلسل عمل چاہتا ہے۔ اس کے لئے ملک کے عوام کو ایک ہونا پڑے گا۔ اس جدوجہد کے لئے آپسی اختلافات یا رنگ و مذہب کی تمیز کو بھول کر متحد ہونے کی ضرورت ہے۔ میں ملک کے فن کاروں اور ادیبوں کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ اس جدوجہد میں قافلہ سالار بن کر عوام کی رہنمائی کریں۔ وہ عناصر جن کو ابھرتی قوموں کی ترقی نہیں بھاتی، جنتا کی صفوں میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ پہلے سے واقف ادیبوں کی دُور بین اور دُور رس نگاہ ان کو پہچان جائے گی اور عوام کو ان کی گربہ مسکینی سے آگاہ کرتی رہے گی۔

صدرِ محترم۔ آپ کا آج ہماری ریاست میں یہ اجلاس منعقد کرنا ایک احسن قدم ہے۔ آپ میں سے اکثر فن کار اُردو میں لکھتے یا شعر کہتے ہیں۔ ہم اُردو کو ایک قابلِ فخر اور قابلِ قدر زبان سمجھتے ہیں جس کو ہندوستان کے لوگوں نے مل جل کے تخلیق کیا ہے۔ اس زبان کو پھیلانے، بڑھانے اور اپنانے میں ہندو اور مسلمان نے برابر برابر حصہ لیا۔ اس زبان کا ادب اس قدر حسین اور قیمتی ہے کہ اس پر ہم سب کو ناز ہونا چاہیئے۔ ہماری ریاست میں تو اُردو عام طور پر پڑھی اور بولی جاتی ہے اور ریاست میں شائع ہونے والے جرائد اور اخبارات تقریباً اُردو ہی میں شائع ہوتے ہیں۔ ہماری ریاست کی سرکاری زبان اسی لئے اُردو ہے۔ قومی زبان کی حیثیت سے ہندی کو بڑھاوا دینے کی بھی ہر ممکن کوشش کیا رہی ہے۔ علاقائی اور مقامی زبانوں جیسے کشمیری، ڈوگری اور لداخی کی طرف بھی توجہ دی جا رہی ہے۔ لیکن اُردو ادب ہماری خاص توجہ کا مرکز رہا ہے۔ ریاست کی کلچرل اکاڈمی اس سلسلے میں سرگرم عمل ہے جس کے صدر ہونے کا فخر مجھے حاصل ہے۔ گو ابھی ہماری کوششوں کی ابتدا ہے لیکن ہم ہر اُس مشورے اور خیال کو خوش آمدید کہیں گے جو اس کام کو سرعت کے ساتھ آگے بڑھانے میں ہمیں حاصل ہو۔ اُمید کرتا ہوں کہ آپ مختصر سے وقت میں آپ اس مسئلے پر غور کریں گے اور ہمیں اپنے قیمتی خیالات سے مستفید فرمائیں گے۔ اس وقت ملک بھر میں اُردو ادب کو فروغ دینے کے لئے مرکزی سرکار بھی بھرپور کوشش کر رہی ہے۔ ہماری کانفرنس اس سلسلے میں اپنا رول ادا کرے تو مجھے خوشی ہوگی۔

ان الفاظ کے ساتھ میں اس کانفرنس کا افتتاح کرتا ہوں اور آپ کی کامیابی کے لئے دعاگو ہوں۔

۲۰ر مارچ ۱۹۷۳ء

یادیں

اعجاز صدیقی

بمبئی سے جموں تک

جموں میں ۲۰-۲۱-۲۲ مارچ کو ادبی پروگرام ہو رہا ہے۔ سردار جعفری اور جاں نثار اختر دہلی سے جموں جائیں گے۔ عصمت چغتائی واجدہ تبسم اور پیا سچدیو جا چکی ہیں۔ خواجہ احمد عباس ۲۲ مارچ کو ہوائی جہاز سے پہنچیں گے اور مجروح سلطانپوری ۲۱ مارچ کو۔ کرشن چندر سلمیٰ صدیقی اور ظ۔ انصاری ۲۰ مارچ کو راجدھانی ایکسپریس سے چل رہے ہیں۔ بمبئی کے تقریباً سب ہی صفِ اوّل کے ادیب و شاعر جموں میں مدعو ہیں۔ شری اوم پرکاش گپتا، ٹریڈ کمشنر حکومتِ جموں و کشمیر (بمبئی)، سے کئی بار فون پر بات ہوئی ہے۔ ڈاکٹر ایس۔ ایس نشاط سابق ٹریڈ کمشنر جموں کشمیر کا بھی اصرار ہے کہ میں جموں ضرور جاؤں۔ کرشن چندر اور خواجہ احمد عباس سے بھی فون پر گفتگو ہوئی ہے۔ بڑی عجیب صورتِ حال ہے۔ طبیعت سفر کی طرف بوجوہ مائل نہیں ہے۔ گری ہوئی صحت اتنے طویل سفر کی کس طرح متحمل ہوگی؟۔ مارچ کا "شاعر" نامکمل ہے۔ ۲۳ اور ۲۴ مارچ کو بمبئی میں ساہتیہ اکیڈمی دہلی کی طرف سے دو روزہ کل ہند سیمینار ہے۔ "آزادی کے بعد ہندوستانی ادب کے میلانات" عام موضوعِ گفتگو ہے۔ شاعری، نثر، ڈراما وغیرہ پر الگ الگ اجلاس ہوں گے۔ بہت پہلے اس سیمینار میں "آزادی کے بعد اردو شاعری کے میلانات" کے عنوان سے پندرہ بیس منٹ کا ایک مضمون اردو میں پڑھنے کا وعدہ کر چکا ہوں۔ اکیڈمی کی طرف سے خطوط چلے آ رہے ہیں۔ بہت اہم سیمینار ہے اور جموں کا سہ روزہ ادبی پروگرام بھی اپنی جگہ بے حد پرکشش۔ عجیب کشمکش کا عالم ہے۔ ۱۶ مارچ ہو گئی ہے اور سیمینار کے لئے مقالہ تک نہیں لکھا ہے۔ فیصلہ کی گھڑیاں بڑی نازک ہوا کرتی ہیں۔ دل اور دماغ مصروفِ جنگ ہیں۔ اس بساطِ جنگ پر کبھی مہرے آگے بڑھ رہے ہیں اور کبھی پیچھے ہٹ رہے ہیں۔ بالآخر قوتِ ارادی نے جموں کی طرف سہارا دیا ہے۔ بمبئی کے دوستوں کی رفاقت اور جموں کے ادبی پروگرام کی کشش غالب آ رہی ہے۔ کرشن چندر۔ ظ۔ انصاری اور گپتا صاحب سے کہہ دیا ہے کہ میں بھی ان کے ساتھ ہی راجدھانی ایکسپریس سے ۲۰ مارچ کو جموں چلوں گا۔ ۱۷ مارچ کی رات کو ساہتیہ اکیڈمی کے سیمینار کے لئے مقالہ لکھا ہے۔ "شاعر" کے لئے بھی خود سے متعلق تحریروں کی تکمیل کی ہے۔ دفتر کے لئے ضروری ہدایات کی طویل فہرست بنائی ہے۔ سیمینار کا مقالہ عزیزی و محبی ڈاکٹر عبدالستار دلوی کے سپرد کیا ہے کہ یا تو وہ خود جا کر اسے پڑھ دیں یا عزیزی یونس اگاسکر سے پڑھوا دیں۔ اس طرح ذمہ داری کا بوجھ تو سر سے ہلکا ہو گیا ہے پھر بھی کچھ کمی محسوس ہو رہی ہے۔

بمبئی سنٹرل پر راجدھانی ایکسپریس بصد شان و شکوہ کھڑی ہے۔ ہوائی جہاز ہی کی طرح اس کے ٹکٹ اور انتظامات ہوتے ہیں۔ کرشن چندر اور سلمیٰ صدیقی پہلے سے اپنے ڈبے میں آ چکے ہیں۔ ظ۔ انصاری اور گپتا صاحب بھی آ گئے ہیں۔ سب کے لئے ڈبوں میں برتھیں ریزرو ہیں۔ ایک ڈبے میں کرشن چندر، سلمیٰ صدیقی، ان کے ساتھ [illegible] (لیکچرر انگریزی، مہاراشٹر کالج بمبئی) اور ظ۔ انصاری ہیں۔ میری اور گپتا صاحب کی برتھیں قریب ہی کے ڈبے میں ہیں۔ [illegible] ہم پانچوں مسافرانِ جموں سونے کے علاوہ؛ باقی تمام وقت ساتھ ہی گزاریں گے۔ ٹرین کے چلتے ہی ہندی، اردو اور انگریزی میں مسافروں کا استقبال کیا گیا ہے۔ ہلکی ہلکی موسیقی شروع ہو گئی ہے۔ ٹرین میں [illegible] ہماری [illegible] کا [illegible] ہو گیا ہے [illegible] کرشن چندر [illegible] ظ۔ انصاری [illegible]

گپتا صاحب ہیں اور سامنے والی نشست پر کرشن چندر، سلمیٰ صدیقی اور بچّو لال منی دوما۔ (یہ صرف یہاں تک ہمارے ساتھ رہیں گی) ہم لوگ جا رہے ہیں ڈ۔ انصاری کچھ زیادہ بے تکلف اور کھلے دل و دماغ کے آدمی ہیں۔ انداز گفتگو، دھیما ٹھہرا اور جچا تلا ہوا۔ تھوڑی ہی دیر میں سب حلقی یا طبیعت ہو گئے جبکہ قہقہے اور طنز و مزاح کے ہوتے ہو شئے لگے ہیں۔ سلمیٰ صدیقی بھی برجستہ گوئی اور چٹکلے چھوڑنے میں کسی سے کم نہیں ہیں۔ کرشن جی کیا مثلاً انصاری کے طرز فکر اور سلمیٰ صدیقی کے۔ انصاری میں بھی کتنا مزا ہے اور بیچ بیچ میں سب کچھ کہہ دینے کی جھلک بھی!! باتیں اور بحثیں اتنی دلچسپ ہیں کہ کچھ پتہ نہیں چل رہا ہے کہ وقت کدھر جا رہا ہے اور ٹرین اپنی نامحسوس رفتار کے ساتھ کس طرف بہہ رہی ہے۔ کرشن چندر کی خوش مزاجی و خوش اخلاقی اور حق گوئی سب پہلی ملاقات ہی سے نمایاں ہے۔ ہمارے ادبی پروگرام کی بدولت گپتا صاحب کی پُر مذاق شخصیت بھی کھلتی جا رہی ہے۔ ڈ۔ انصاری کو اپنی زبان دانی پر ناز ہے۔ لیکن وہ اعجاز صدیقی اور سلمیٰ صدیقی کی زبان دانی کی بھی قسم کھاتے ہیں۔ انہیں رہ رہ کر احساس ہوتا ہے کہ ایک انصاری دو صدیقیوں میں گھرا ہوا ہے۔

رات کے کھانے سے پہلے ہم جام کھنکتے ہیں۔ یہاں بھی کھنک رہے ہیں۔ کرشن چندر، ڈ۔ انصاری اور گپتا صاحب خوش گفتاری کے ساتھ مصروف نائو نوش ہیں۔ سلمیٰ صدیقی، میں اور ہماری ہم سفر بیگم (جو نہایت بھولی بھالی کم گو طالبہ سی لگتی ہیں) اپنی پاکیزگی کے غرور کو ساتھیوں کے جاموں میں انڈیل رہے ہیں۔ کتنے مسرور اور شاداں لمحات ہیں یہ !! میزوں پر سب کی الگ الگ پسند کے کھانے چن دیئے گئے ہیں۔ بڑی دیر تک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ کھانا نہیں کھایا جا رہا ہے بلکہ بمبئی کے مصروف اور اکتا دینے والے ماحول سے رستگاری کا جشن منایا جا رہا ہے۔

رات کے سائے بہت گہرے ہو گئے ہیں۔ ٹرین کی رفتار اتنی تیز ہے کہ بڑے بڑے اسٹیشنوں اور شہروں کی روشنیاں جگنوؤں کی طرح چمک سے زیادہ معلوم نہیں دے رہی ہیں۔ بمبئی سے چل کر راجدھانی ایکسپریس دس بجے بڑودہ رکی ہے اور اس کے بعد شب بخیر کہتے ہوئے سب اپنی اپنی برتھوں پر محو خواب ہو جانے کی نیت سے جدا ہو رہے ہیں۔ ٹرین اور نیند بجائے خود ایک نہایت دلچسپ موضوع ہے [illegible] اپنی جدا جدا ہوتی ہیں۔ کہتے ہیں کہ نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ یہاں تو نہایت صاف شفاف، نرم و گداز گدّے، تکیے اور کمبل ہیں پھر ٹرین کے ہچکولے اور اس کی رفتار لوری کا کام دیتی ہے، ایسے لوگ گھوڑے بیچ کر سوتے ہیں۔ ان کے خرّاٹے ٹرین کی سحر دم تک پر غالب آ جاتے ہیں۔ خاموشی سے سونے والوں پر سخت بے ہوشی کا گمان ہوتا ہے۔ مگر کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں "نیند آتی ہے، پر نہیں آتی"۔ ان کی آنکھیں بند ہوتی ہیں اور ذہن بیدار۔ وہ ہر آہٹ اور ہر آواز سنتے رہتے ہیں۔ میرا اپنا حال تو یہی ہے اور صبح ہوئی تو ڈ۔ انصاری نے بھی اپنی اسی کیفیت کا اظہار کیا۔ کرشن چندر گھر میں ہوں یا ٹرین میں، وہ دونوں وقفوں سے سوتے جاگتے رہتے ہیں۔ گھر میں کمرہ ٹھنڈا ہو تو پھر لیٹ کر کرشن کی نیند کا وقفہ (INTERVAL) ہے۔ ٹرین میں کھنکھاریں تو جانئے کہ "ڈوبی" کا خالق جاگ رہا ہے۔ اور یہ بیچاری [illegible] سلمیٰ صدیقی اور بچّو لال منی دوما۔ انہیں عورت ہونے کے ناطے نفسیاتی طور پر خود کو وہاں کا تھکا ماندا تصور کر کے نیند آ ہی جانا چاہئے۔

آج ۱۹ مارچ ہے۔ صبح بڑی اُجلی اُجلی ہے اور سورج کی نرم کرنیں شیشوں اور پردوں سے ٹکرا رہی ہیں۔ مگر انہیں اندر آنے کی اجازت نہیں ہے۔ موٹے شفاف یکطرفہ شیشے ان کی راہ میں حائل ہیں۔ شیشے جو بہترین عکاس ہیں۔ ادیب بھی ایک شیشہ ہوتا ہے۔ بہترین عکس ریز۔ سورج کا طلوع شروع ہو چکا ہے۔ ہولی کا دن ہے۔ "بچّو لال بھکاری ایسی ہاریں" کے احساس سے سلمیٰ صدیقی بہت پھیکی ہیں۔ راستے میں جگہ جگہ لوگ رنگ اور گلال میں نہائے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ راجدھانی ایکسپریس ٹھیک دس بجے دن کو نئی دہلی پہنچ گئی ہے اور یہاں سے حکومت کشمیر کی موٹروں میں کشمیر ہاؤس تک آ گئے ہیں۔ یہاں پہنچتے ہی سفری گرد جھاڑی اور ڈوگرہ، وزیر خزانہ ریاست جموں و کشمیر سے ملاقات ہوئی ہے۔ یہ کشمیر کے نہایت ممتاز اور پرانے سیاستدان ہیں۔ بڑی خندہ پیشانی سے ملے ہیں۔ ڈوگرہ صاحب کل صبح جموں آ جائیں گے۔ [illegible] کہیں آنے جانے کا سوال ہی نہیں ہے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد پلنگ پر مختصر چہل قدمی [illegible] ڈ۔ انصاری [illegible] کے لئے دیا ہے جو وہ جموں میں سنانا چاہتے ہیں۔ مسافرت کا [illegible]

ظ۔ انصاری۔ گپتا صاحب اور یہ کمترین مع دتبر (ممبر راجیہ سبھا) سے ملنے ساؤتھ ایونیو پہنچ گئے ہیں۔ دتبر صاحب بمبئی کے جانے پہچانے فلمی لوگوں میں سے ہیں۔ کچھ عرصہ سنیما اور پارلیمنٹ وغیرہ کی باتیں ہوتی رہیں۔ دتبر صاحب واقعی بخت کے سکندر ہیں، مگر دولت نے ان میں کبھی بھی پیدا ہونے کی اجازت نہیں دی۔ ان کا اخلاص ہے۔ وہی شرافت مزاج و گفتار و رفتار۔ ایک قدیم تہذیبی شائستگی اور مروت و دلداری۔ بے حد پُرذوق اور ہنس مکھ۔ گپتا صاحب، ظ۔ انصاری اور میں دتبر سے رخصت لے کر چلنے کے لئے تیار ہو رہے ہیں۔ ان کا ارادہ ابھی کچھ پرانی یادیں بیان کرنے کا ہے، جسے عرصہ میں ہی پورا کر سکتا ہوں۔ دتبر صاحب ہمارے ساتھ ہی کشمیر ہاؤس آ گئے ہیں تاکہ کرشن اور سلمیٰ سے بھی مل لیں۔ یہاں کرشن چندر کے کمرے میں ان کی بہن سرلا دیوی اور سرلا کے شوہر یعنی سرن شرما موجود ہیں۔ سرلا اپنے بھائی کرشن کے لئے ہولی کی مٹھائی لائی ہیں۔ قشقہ لگانے آئی ہیں۔ یعنی سرن شرما، اردو کے بہترین ڈراما نگار ہیں۔ یوں تو وہ کثرت سے بولتے ہیں، لیکن اُدھر شعر کہنے لگے ہیں۔ ایسے بامعنی اور خوبصورت مقطعے کہ پڑھنے اور سننے والے پھڑک اٹھیں۔ بڑے تیز گفتار اور "اپ ٹو ڈیٹ" لوگوں میں سے ہیں۔ سب نے مل کر کھانا کھایا ہے۔ ۸ بجے رات کو نئی دہلی اسٹیشن پہنچنا ہے۔ ہم لوگ تیار ہیں۔ فرسٹ کلاس ایئر کنڈیشنڈ کمپارٹمنٹ پہلے سے ریزرویشن ہو چکا ہے۔ حسنِ اتفاق کہ اسٹیشن پر کمال احمد صدیقی سے ملاقات ہو گئی ہے۔ کئی سال کے بعد اسے دیکھا ہے۔ کمال ہے کہ وہ ذرا بھی نہیں بدلا ہے۔ ویسا ہی شوخ اور نٹ کھٹ ہے جیسا جوانی میں تھا۔ اب تو اس کی جوانی ڈھل گئی ہے مگر جدت فکر بہت بڑھ گئی ہے۔ کمال میرا نہایت دیرینہ بے تکلف دوست بلکہ چھوٹا بھائی ہے۔ ساغر نظامی کے ریٹائرڈ ہونے کے بعد کمال احمد صدیقی کا سر [illegible] ریڈیو سے دلی ریڈیو اسٹیشن پر بحیثیت ڈپٹی چیف پروڈیوسر لگ گیا ہے۔ وہ جلدی جلدی غالب کے متعلق اپنی کتاب کا احوال بتا رہا ہے۔ جس کی قیمت اس نے پانچ سو روپئے رکھی ہے۔ آج کل کمال کی کتاب علمی و ادبی حلقوں میں زیر بحث ہے۔ غالب شناسوں میں غالب کے اشعار کی صحت و عدم صحت کے متعلق بھی کچھ گفتگو رہی۔ ظاہر ہے اس عجلت میں یہ معمے نہ سمجھنے کے تھے اور نہ سمجھانے کے!۔

ٹرین کے مخصوص کمپارٹمنٹ کے پاس پہنچے ہی ہیں کہ کشمیر کے شمیم احمد شمیم (ممبر پارلیمنٹ) مل گئے ہیں، وہ بھی ہمارے ساتھ ہی جموں جا رہے ہیں۔ ایک نہایت ذہین نوجوان کا نام شمیم احمد ہے۔ تہذیبی، صحافتی، سیاسی اور ادبی سرگرمیوں سے زندگی کا آغاز کر کے، کشمیر جیسی دُکھتی رگ سے متعارف ہوئے۔ یہ گرم رفتار و گفتار صحافی پارلیمنٹ میں پہنچ کر ہنگامہ آرا ہو گیا ہے۔ شمیم احمد، ظ۔ انصاری کے بہت گہرے دوستوں میں سے ہیں۔ دشمن تو ویسے بھی ہیں۔ رات کافی دیر تک ہم سب باتیں کرتے رہے ہیں۔ ہمارے کوپے میں ایک "بھنگ زدہ" تعلیم یافتہ نوجوان بھی ہے۔ عجیب عجیب حرکتیں کر رہا ہے اور بار بار کہہ رہا ہے کہ آج ہولی تھی، زیادہ پی لی ہے۔ مر جاؤں گا تو نہیں ستاؤں گا۔ ہم لوگ اپنی "سیوا" کا اسے یقین دلاتے ہیں۔ وہ اوپر کی برتھ پر بمشکل چڑھ سکا ہے۔ اندیشہ ہے کہ رات کو گر نہ جائے۔ مگر وہ کسی طرح نیچے کی برتھ پر سونے کے لئے تیار ہی نہیں ہے۔ سفید روشنیاں بجھا کر ہم لوگ بھی لیٹ گئے ہیں۔ نیلی گول روشنی ہے اور اس میں اپنے ملک کے حالات و تضادات کی نیلی [illegible] ذہن میں چلنے لگی ہے۔ پرانی نسل سخت گھبرائی ہوئی ہے۔ نئی نسل کا اخلاق و کردار گرتا جا رہا ہے۔ [illegible] سیاسی کشمکش و پارٹی گری نے ملک و قوم کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ صحت و نظافت، پاکیزگی و راست بازی، یگانگت و موانست، خلوص و محبت و رواداری کی جگہ جھوٹ، فریب، چور بازاری و نفع اندوزی، نفرت و تعصب، بے ادبی و لاقانونی اور اخلاق و کردار کی پستیوں نے لے لی ہے۔ شراب پرستی اور [illegible]؟ چھوٹے بچے منشیات کے عادی ہوتے جاتے ہیں۔ کدھر جا رہا ہے ہمارا ملک۔ ہماری سوچ کے جالے اپنے [illegible] "مستانہ زندگی" سے ہمیں کب نجات ملے گی؟ ہمارا نجات دہندہ کون ہوگا؟ ملک میں کیا نہیں ہے، کیا نہیں ہو سکتا ہے۔ [illegible] ہم کس ملک میں ہیں! ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہمارے رہنماؤں کو سیاسی رسہ کشی سے فرصت ہی نہیں ہے، ورنہ سارے مسائل حل ہو [illegible] ملک و قوم سے مخلص ہمدردی ہو تو تمام سیاسی اختلافات ختم کر کے، ایک سیاسی پلیٹ فارم بنا کر قوم کی قسمت بدل سکتے ہیں۔ مذہب [illegible] بنا رہا ہے [illegible] نہیں رہیں گی۔ تمام رات [illegible]۔ میں کئی سال سے [illegible]

کو نکلی پر لٹکا ہوا ہوں۔ [illegible] چڑھ کر سکتا۔

[illegible] سویرا پھیلنے لگا ہے۔ باہر کا منظر آہستہ آہستہ اُجلا ہوتا جا رہا ہے۔ ڈ۔ انصاری اور گپتا جی ابھی تک گہری نیند کے مزے لے رہے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ سو رہے ہیں۔ برابر والے کرشن چندر کے کھنکارنے کی آواز آرہی ہے۔ PASSAGE میں آکر کرشن چندر کے کوپے میں جھانکتا ہوں۔ وہ کھڑکی کے شیشے میں سے باہر کے منظر کا لطف لے رہے ہیں۔ صبح کی چائے کی خواہش تیز تر ہے۔ چائے کا ملنا ابھی دور ہے۔ پھر اپنی برتھ پر آکر بیٹھ گیا ہوں اور بیرونی منظر میں کھو جانے کی کوشش کرتا ہوں۔ مشرقی کنارے گلابی ہوتے ہوتے سرخ ہو گئے ہیں۔ جی چاہ رہا ہے کہ ڈ۔ انصاری کو جھنجھوڑوں، کرشن چندر کو آواز دوں۔ کسی طرح یہ [illegible]۔ باہر کی طرف بے مقصد گھورنا بھی کوئی کام ہے! سب یہی کہتے ہیں کہ انسانی نفسیات ٹرین کی تابع ہو جاتی ہیں۔ مگر میں اس کا قائل نہیں۔

پٹھان کوٹ آ رہا ہے۔ سب بیدار ہو گئے ہیں۔ کرشن چندر بھی اپنے کوپے سے نکل آئے ہیں۔ [illegible] ہیں، جیسے گزری ہوئی رات کوئی بڑا لمبا وقفہ تھا۔ سب کے [illegible] ملے اور چہکنے لگے ہیں۔ کچھ دیر بعد بہت معمولی سا ناشتہ آیا ہے۔ نسیم احمد نسیم بھی اپنے کمپارٹمنٹ سے مع سامان ہمارے ہی کوپے میں آگئے ہیں۔ کیا زندہ دل ہے یہ نوجوان۔ ہر لمحہ اس کی رگوں میں خون اچھلتا رہتا ہے! دس بجے دن کو جموں آ جائے گا۔ پہلے بس کے راستے سے دو دن میں جموں پہنچا جاتا تھا، کافی تکلیف دہ ہوتی تھی۔ اب مسافت کم ہو گئی ہے۔ ریلوے لائن کے بن جانے سے جموں کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ اسی راستے میں ہندوستان اور پاکستان کی سرحدیں [illegible] دو بار [illegible] ہو چکی ہے۔ چونکہ راستہ میں دریا کی جگہ جگہ [illegible] ہے، اس لئے چھوٹے بڑے کئی پل بنانے پڑے ہیں۔ اس وقت زیادہ باتیں جنت نظیر کشمیر ہی کے متعلق ہو رہی ہیں۔ جموں قریب ہے۔ سب کا سامان ایک جگہ اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ اس مختصر سی بارات کے دولہا کرشن چندر ہیں، جو چالیس سال کے بعد جموں جا رہے ہیں۔ جموں کے سہ روزہ ادبی اجتماع میں اتنے بہت سے ادیبوں اور شاعروں کی شرکت بھی کرشن چندر جی کے تعلق و اثر کا نتیجہ ہے۔ گپتا صاحب کا چہرہ دمک رہا ہے کہ وہ اپنی سرکاری ذمہ داریاں پورا کرنے میں سپھل ہوئے۔

ٹرین جموں اسٹیشن پر رکی ہے۔ استقبال کرنے والوں کا ایک ہجوم تیزی سے آگے بڑھا ہے۔ کرشن چندر کو ہاروں سے لاد دیا گیا ہے۔ خاص خاص لوگوں سے تعارف کرایا جا رہا ہے۔ بیشتر جانے پہچانے چہرے ہیں: ڈاکٹر گیان چند، [illegible]، ٹھاکر پونچھی، رحمن راہی اور [illegible] صہبائی وغیرہ ہی ہیں۔ جموں کے ادبی اجتماع کے منتظم اعلیٰ جناب غلام رسول [illegible] ڈائرکٹر اور سکریٹری [illegible] حکومت جموں و کشمیر اور ان کی بیگم صاحبہ سے بھی تعارف ہوا، دوسرے سرکاری افسران، [illegible] کے منتظمین اور دستکاروں سے بھی۔ استقبال کرنے والوں کی اتنی بھیڑ میں نے کبھی نہیں دیکھی۔ ابھی سے جموں کے ادبی اجتماع کی اہمیت اور عظمت کا احساس ہو رہا ہے۔ ڈ۔ انصاری [illegible] میرے ساتھ [illegible] ہوئی ہے، ہنگامہ [illegible] ہو رہا ہے۔ بے شمار شاداں و خوش حال چہروں کے درمیان [illegible] ہیں۔ ایک جلوس کی شکل میں کاروں تک پہنچایا گیا ہے۔ سامان اور مہمانوں کی کاریں تیزی سے دوڑنے لگی ہیں۔ تھوڑی دیر میں [illegible] خوبصورت راستے پر پہنچ گئی ہیں [illegible] داخل ہونے کے راستے پر JAMMU MOTEL "جموں موٹل" لکھا ہوا ہے۔ یہ اونچائی پر ایک بہت بلند اور شاندار عمارت ہے۔ اس کے دو طرف پہاڑی سلسلے اور جنگلات ہیں۔ [illegible] ہے۔ اس کے قریب [illegible] میں کشمیر کی نئی پرانی مصنوعات اور پینٹنگز سجی ہوئی ہیں۔ چند سیڑھیاں چڑھ کر [illegible] ہے۔ جس سے نیچے سامنے کے رُخ پر تہہ خانہ کی شکل میں وسیع "بار" ہے۔ اس [illegible] کشمیر کے چند [illegible] آرائش [illegible] سیڑھیاں چڑھ کر اونچائی پر ایک بہت بڑا ڈائننگ ہال ہے، جس میں [illegible]

ہوٹل ایک چھوٹا سا ہے۔ وہاں بھی میز کرسیاں لگی ہوئی ہیں۔ شیشوں اور دریچوں سے سامنے کا منظر بہت خوبصورت نظر آتا ہے۔ ہم [illegible] مہمان سب یہیں آ کر بیٹھ گئے ہیں۔ صاف ستھرے دیدہ زیب۔ جموں ٹورزم [illegible] جموں و کشمیر کا کارنامہ ہے۔ چائے آ گئی ہے۔ لوگوں کی چہل پہل جاری ہے۔ کچھ دیر بعد سب مہمانوں کو MOTEL کی [illegible] کمروں میں پہنچا دیا گیا ہے۔ تیسری منزل کے کمرے ادیبوں اور شاعروں کے لئے مخصوص کئے گئے ہیں۔ نہایت وسیع اور شاندار کمرے ہیں جن میں پلنگوں، بستروں، کرسیوں، میزوں، ٹیلی فون کنکشن، ٹھنڈے اور گرم پانی کے باتھ روموں کا انتظام ہے۔ پچھلے راستے کی پہلی [illegible] تعداد میں اوم پرکاش گپتا نے ۲۱۰ اور بیبن نے ۲۱۲ نمبر اور ظ۔ انصاری نے ۲۰۹ نمبر کے کمرے اپنے لئے منتخب کر لئے ہیں۔ PASSAGE سے گزرنے کے بعد بھی کئی کمرے ادیبوں اور شاعروں کے لئے وقف ہیں۔ ہمارے کمروں کے بالکل سامنے دوسری طرف بڑے راستہ پر جو کمرے ہیں، ان میں سے کرشن چندر اور سلمیٰ صدیقی نے اپنے لئے کمرہ منتخب کر لیا ہے۔ عصمت چغتائی، واجدہ تبسم اور ہربنس بھی پہلے سے آ چکی ہیں۔ ہمارے پہنچتے ہی یہ کمروں سے نکل آئی ہیں۔ بڑی مسرور نظر آ رہی ہیں۔ کچھ دیر بعد ہوائی جہاز کے ذریعہ جاں نثار اختر، سردار جعفری، ان کی بیگم سلطانہ جعفری اور بیگم ممتاز مرزا، دہلی سے آ گئے ہیں۔

ہر چند سردی کافی ہے، مگر غسل کئے بغیر چارہ نہیں۔ سب لوگ نہا دھو کر کپڑے بدل کر کھانا کھانے کے لئے نیچے آ گئے ہیں۔ جہاں عصمت چغتائی، ظ۔ انصاری اور سلمیٰ صدیقی ہوں، وہاں قہقہوں اور چٹکلوں کی کیا کمی۔ کھانے پر ہمیں کے ادبی اجتماع کی تفصیلات معلوم ہوئی ہیں۔ ویسے ایک مطبوعہ پروگرام بھی کمروں میں رکھا ہوا ملا ہے۔ مگر وہ محض نام کی حد تک ہے۔ یہ سہ روزہ ادبی پروگرام جموں میں ہونے والی سالانہ صنعتی نمائش کا ایک اہم حصہ ہے۔ اس میں ایک مجلسِ مقالات، محفلِ افسانہ اور بزمِ مشاعرہ کا پروگرام شامل ہے۔ نومبر سے آخر اپریل تک چونکہ حکومت جموں و کشمیر کا سرمائی سیشن جموں میں ہوتا ہے اس لئے تمام سرکاری دفاتر یہاں آ جاتے ہیں۔ وزیر اعلیٰ بھی مع اپنی کابینہ کے یہیں منتقل ہو جاتے ہیں اور جموں کی چہل پہل میں مزید اضافے ہو جاتے ہیں۔ سری نگر ہی کی طرح یہاں بھی بڑے بڑے سیاسی، تہذیبی، صنعتی اور ادبی اجتماعات ہوتے ہیں۔ ویسے جموں ایک بہت پرانا تاریخی شہر ہے۔ یہاں بکثرت خوبصورت مندر ہیں۔ یہاں کے پرانے محلوں اور قلعوں میں ڈوگرہ دور کے فنِ نقاشی و مصوری کے نادر نمونے پائے جاتے ہیں۔ اسے مندروں کی دھرتی کہا جاتا ہے۔ یہاں کے "لوک گیت" بہت مشہور ہیں۔ جموں میں ادب و شاعری کے چرچے ہمیشہ رہے ہیں۔ اس لئے کہ یہ پنجاب سے ملا ہوا ہے۔ والد مرحوم علامہ سیماب اکبرآبادی کے مجموعۂ غزل "کلیم عجم" میں جموں کے کئی طرحی مشاعروں کے حوالے ملتے ہیں۔ ۸۰ سال پہلے کیسے باذوق لوگ ہوں گے یہاں جو بلند پایہ شاعروں کو مدعو کرتے تھے۔ تہذیبی اور ادبی و شعری روایتیں زندگی میں رچی بسی ہوتی ہیں۔ دور بدل جاتے ہیں مگر روایتیں نہیں بدلتیں۔ میں خود تیسری بار جموں آیا ہوں۔ مرحوم بخشی غلام محمد کے دور میں بھی یہاں آنا ہوا تھا اور غلام محمد صادق مرحوم کے زمانہ میں بھی۔ کلچرل اکیڈمی کی دعوت پر بھی اور جموں ریڈیو کے بلاوے پر بھی۔ نمائش کا مشاعرہ بھی پڑھ چکا ہوں۔ جموں کی معاشرت اور اربابِ جموں کی مہمان نوازی اور محبت سے خوب واقف ہوں۔ لیکن اس بار ادبی اجتماع کی جو شکل ہے وہ اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔

۴ بجے شام کو جناب سید میر قاسم صاحب وزیرِ اعلیٰ ریاست جموں و کشمیر نے اپنے دولت کدہ پر ملاقات کے لئے بلایا ہے اور شام کو ۶ بجے "گلاب بھون" میں سہ روزہ ادبی اجتماع کا افتتاحی جلسہ ہے۔ کھانے کے بعد بمشکل ایک گھنٹہ آرام کے لئے ملا ہے۔ کرشن چندر کو افتتاحی جلسہ کی صدارت کرنا ہے۔ وہ خطبۂ صدارت لکھنے میں مصروف ہیں۔

شام کے ۴ بجے ہیں۔ کرشن چندر، سردار جعفری، ظ۔ انصاری، جاں نثار اختر، شمیم احمد شمیم اور میں، عزیز صاحب کے ساتھ [illegible] محترم سید میر قاسم صاحب کے بنگلے پر پہنچ گئے ہیں۔ قاسم صاحب کو منتظر پایا۔ نیلو مبر شرما، سکریٹری جموں و کشمیر کلچرل اکیڈمی اور دوسرے [illegible] سے تعلق اور خیر مقدمی ملاقات ہے۔ [illegible] بہت مسرور نظر آ رہے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں ایک خاص چمک ہے۔ [illegible] لباس سادہ۔ دھیما انداز گفتگو، ہلکی ہلکی مسکراہٹ۔ کرشن چندر اور سردار جعفری سے [illegible]

[illegible] کی پائل ہے پچھلے پچپن برس کا سفر کیسا رہا۔ چند ہی منٹ گزرے ہیں کہ خواتین کا قافلہ آگیا ہے۔ عصمت چغتائی، بیگم قدسیہ [illegible] ساجدہ تبسم، رابعہ پچولی، بیگم ممتاز مرزا کمرہ میں داخل ہو رہی ہیں۔ چھم چھم پائل باجے کی آواز گونج رہی ہے۔ یہ ساجدہ تبسم کی پائل کی آواز ہے۔ ہائے اللہ کتنے خوبصورت قالین ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ بھاگتی پھروں۔ ساجدہ کے اس جملے پر قاسم صاحب [illegible] ہیں۔ ساجدہ کی ساتھی خواتین اور ہم سب ہنستے ہنستے بے حال ہو گئے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات تھی کہنے کی۔ قاسم صاحب سے ان خواتین کا تعارف کرایا گیا ہے۔ ابھی قبل اس کے کہ وزیراعلیٰ کچھ دریافت فرمائیں

— اتنے آپ کے یہاں کے چاول سستے ہوتے ہیں۔

ساجدہ تبسم کا دوسرا جملہ۔

وزیراعلیٰ — شکریہ، خوب کہا آپ نے، آپ کے ساتھ بھی کر دئے جائیں گے۔

چائے پی جا چکی ہے اور پندرہ بیس منٹ میں یہ ملاقات ختم ہو گئی ہے۔ وزیراعلیٰ کو "گلاب بھون" میں مجلس ادب کے کل ہند سہ روزہ ادبی پروگرام کے افتتاح کے لئے تشریف لانا ہے۔ ہم سب کو بھی وہیں پہنچنا ہے۔ محترم قاسم صاحب دروازے تک رخصت کر رہے ہیں۔

یہ گلاب بھون ہے۔ شام کے ۵ بجے ہیں۔ ہال لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہے۔ کرسیوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں کے علاوہ آخری دروازے پر بھی لوگ بڑی تعداد میں کھڑے ہوئے ہیں۔ بھون کے مستقل اونچے اسٹیج پر مہمانوں کو بٹھایا گیا ہے۔ وزیراعلیٰ محترم سید میر قاسم تشریف لے آتے ہیں، سب نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا ہے۔ سامعین کے دلوں کی بے چینی اور ان کا اشتیاق ان کے چہروں سے عیاں ہے۔ کرشن چندر سب سے زیادہ مرکز کشش ہیں۔ دور دراز علاقوں سے لوگ ان سے ملنے کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ بوڑھے، جوان، ہر عمر کے۔ کرشن چندر کا تعلق ریاست پونچھ سے ہے۔ دوسرے ادیبوں اور شاعروں کی کشش بھی کچھ کم نہیں ہے۔ افتتاحی جلسہ کی کارروائی شری وید بھسین ایڈیٹر روزنامہ کشمیر ٹائمز نے اپنی تقریر سے شروع کی ہے۔ کیا عمدہ اردو بولتے ہیں بھسین صاحب۔ مہمانوں کے تعارف کے بعد انھوں نے پروفیسر رام ناتھ شاستری، صدر استقبالیہ کمیٹی کو خطبۂ استقبالیہ پڑھنے کی دعوت دی ہے۔ شاستری صاحب بہت اچھے انداز میں اپنا خطبۂ استقبالیہ پڑھ رہے ہیں۔ خطبۂ استقبالیہ ختم ہونے کے بعد وید بھسین صاحب نے وزیراعلیٰ سے درخواست کی ہے کہ وہ مائک پر تشریف لائیں اور اپنا خطبۂ افتتاحیہ ارشاد فرمائیں۔ قاسم صاحب روانی کے ساتھ خطبہ پڑھ رہے ہیں۔ آواز میں اتار چڑھاؤ اور لہجہ شستہ و رفتہ ہے۔ خطبہ بھی اچھا ہے۔ درمیان میں کئی بار تالیاں بجی ہیں۔ خطبۂ استقبالیہ کے اختتام کے بعد سامعین کی توجہ کا مرکز کرشن چندر کی طرف اٹھی ہوئی ہے۔ کرشن تالیوں کی گونج میں مائک پر آ گئے ہیں۔ اپنی رسیلی ادبی زبان میں وہ اپنا خطبۂ صدارت پڑھ رہے ہیں۔ سننے والوں کی سانسیں کبھی رک رہی ہیں، کبھی تیز ہو رہی ہیں۔ ان کی تحریر میں نیلے پانیوں کی گہرائی اور دریائے "توی" کی سی روانی ہے کہ سرے کرشن چندر کو اپنے اندر سمو لینا چاہتے ہیں۔ کرشن چندر کا خطبہ ختم ہونے کے بعد وزیراعلیٰ محترم قاسم صاحب نے خواہش ظاہر کی ہے کہ مہمان شعرا سے کچھ سن بھی لیا جائے۔ صرف تین چار شاعر اور دو شاعرات ہیں۔ پہلے بیگم ممتاز مرزا نے اپنا کلام سنایا ہے جو دہلی سے اس اجتماع میں شرکت کے لئے آئی ہیں۔ پھر جاں نثار اختر نے غزل کے چند شعر سنا کر سامعین کو بہت مسرور [illegible] بھی حافظہ پر زور ڈال کر دو غزلوں میں سے چار چار شعر سنائے ہیں۔ یہ کسی کو بھی علم نہ تھا کہ افتتاحی جلسہ میں بھی شاعر [illegible] سردار جعفری نے اپنی مشہور نظم "صبح فردا" سنائی ہے۔ اچھی نظم و غزل کتنی ہی بار کیوں نہ سنی جائے ہر بار [illegible] آخر میں پدما سچدیو سے نظم سنانے کے لئے کہا گیا ہے۔ یہ اسی خطہ کی [illegible] ڈوگری زبان کی اعلیٰ پایہ کی شاعرہ ہیں۔ انہیں ان کے نظم [illegible]

خوبصورت ترنم میں ایک بہت اچھی ڈوگری نظم سنا رہی ہیں جس کا لب و لہجہ اُن کی غیر معمولی صلاحیت ہے۔ چونکہ دو خواتین بھی کو شفٹ ہو چکی ہیں اس لئے فوراً نگاہیں عابدہ تبسم کی طرف اُٹھ رہی ہیں۔ وہ اپنی سج دھج میں سب سے الگ اور نمایاں ہیں۔ لگتا کہ عابدہ کچھ شرمائیں۔ وہ کہہ رہی ہیں کہ میں کوئی شاعرہ ہیں۔ پہلے تو عابدہ تبسم نے کچھ تامل کیا ہے اور پھر لپک کر مائک پر پہنچ گئی ہیں — "میں شاعرہ نہیں ہوں۔ افسانہ نگار ہوں۔ میں ایک گیت سنا سکتی ہوں" اور انہوں نے گانا شروع کر دیا ہے۔ گیسا پیارا گیت غیر تربیت یافتہ (UN TRAINED) مگر فطری موسیقی۔ سامعین محظوظ ہو رہے ہیں۔ عابدہ کی ساتھی خواتین اور ہم ادیب و شاعر اس حرکت سے بہت محظوظ ہیں۔ نثر و نظم کے بعد یہ افتتاحی جلسہ کشمیری "فوک سانگ" پر ختم ہوا ہے، جسے وہیں کے چند لوگوں نے اپنے روایتی لباس اور ساز و آواز میں پیش کیا ہے۔ حاضرین نے مہمانوں کو بمشکل ہال سے نکلنے دیا ہے۔ دن چھپ چکا ہے روشنیاں جگمگا رہی ہیں۔ سب لوگ "جموں ہوٹل" واپس آ گئے ہیں۔ یہاں پہنچتے ہی عصمت چغتائی اور صالحہ عابد حسین، عابدہ تبسم پر برسنے لگی ہیں۔ عصمت کہہ رہی ہیں ——

"اے لڑکی تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ ایسی دلیسی باتیں کیوں کرتی ہے۔ قاسم صاحب کے یہاں تالیں اور چاولوں کی باتیں کر دیں۔ جلسہ میں گیت گا دیا۔ تو اس لئے آئی ہے یہاں"

عابدہ تبسم روہانسی ہو گئی ہیں۔ کبھی اپنی عصمت آپا سے چمٹ کر رو رہی ہیں، کبھی صالحہ عابد حسین اور سلطانہ جعفری سے۔ ہم سب ادیب و شاعر عابدہ سے عمر میں بہت بڑے ہیں۔ وہ ہم سب کے لئے ایک بچی ہیں۔ کچھ کہہ نہیں سکے۔ مگر اُن ہی کی صنف نے اُن کی اچھی کھچائی کر دی ہے۔ پھر عابدہ کی معصومیت پر اُن ہی کو پیار بھی آیا ہے۔ سینہ سے لگایا ہے، اس پیار اور اپنے بھروسے پن کے نتیجہ میں آج رات کو جو شاندار DINNER شری رام چند مہاجن، ممبر قانون ساز اسمبلی نے اپنی کوٹھی میں دیا ہے، اُس میں عابدہ تبسم بالکل اس طرح آئی ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔ وہی کھلنڈرا پن اور اُسی طرح اپنی شوخ ذہانت کا اظہار کرتی ہوئی۔

رام چند مہاجن صاحب کی کوٹھی کافی شاندار ہے۔ ڈنر میں اُن کے احباب و اعزا بڑی تعداد میں شریک ہیں۔ چند مقامی ادیب شاعر، ہمارے میزبان خصوصی رینزو صاحب اور اُن کی بیگم کے علاوہ ادبی اجتماع کے چند دیگر منتظمین بھی ہیں۔ یہاں ایک نیرنگ شاعر کا تازہ شمارہ رکھا ہوا نظر آیا ہے۔ معلوم ہوا کہ شری رام چند مہاجن کے صاحبزادے شمشیر سنگھ صاحب شمشاد کار مہاجن اُردو شعر و ادب سے خاصی دلچسپی رکھتے ہیں۔ خاکر صاحب کے گہرے دوستوں میں سے ہیں۔ شمشاد کار صاحب بڑی محبت سے ملے ہیں اور مہمانوں کی خوب خاطر مدارات کر رہے ہیں۔ پہلے مشروبات سے تواضع ہوئی ہے۔ پھر شعر و شاعری کا دَور چلا ہے۔ پھر لطیفے و چٹکلے اور آخر میں کافی رات گئے کھانے کا۔ کئی خواتین نے میزبانی میں حصہ لیا ہے۔ رام چند مہاجن صاحب نے اپنے خلوص اور مہمان نوازی کی انتہا کر دی ہے۔

صبح ۱۹ مارچ ہے ۹ بجے صبح سب ہی ادیب و شاعر ناشتہ کے لئے نیچے ڈائننگ ہال میں آ گئے ہیں۔ جناب غلام رسول رینزو بھی مع اپنے رفقاء کے تشریف لے آئے ہیں۔ اس وقت رینزو صاحب سے صحیح طور پر متعارف ہونے کا موقع ملا ہے۔ وہ علیگڑھ کے تعلیم یافتہ ہیں، شعر و ادب سے گہرا لگاؤ ہے۔ حکومت جموں و کشمیر کے مختلف بڑے بڑے عہدوں پر مامور رہے ہیں۔ کچھ مدت تک اسپیکر اور وزیر بھی رہے ہیں۔ حکومت کے سینئر لوگوں میں سے ہیں۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ وہ سیاست کی داخلی پیچیدگیوں سے خود کو جوڑ نہیں سکے۔ انسانی شرافت نفس جب سیاسی ہنگاموں اور مصالح کو قبول نہیں کرتی تو ایک تارک شرافت کا رُوپ اختیار کر لیتی ہے۔ رینزو صاحب کے سلسلے میں میرا اپنا تاثر یہی ہے۔ رینزو صاحب کی اہلیہ محترمہ بھی مسافر نوازی میں پیش پیش ہیں۔ مہمان خواتین کے لئے تو وہ بھی جا رہی ہیں۔ یہ خود کشمیری زبان کی اچھی افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ بھی چھپ چکا ہے۔

صنعتی نمائش میں ... افتتاح ہوا۔ لوگوں کو بڑی حیرت ہے۔ کچھ اخبارات بھی ... رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ بعض مقامی ادیب [illegible]

اور شاعر خواہش ... دوست شمیم ... ایڈیٹر ہفت روزہ "آئینہ" [illegible]

جو اس اجتماع میں خاص طور پر مدعو کئے گئے ہیں، یہ شکایت ہے کہ اس ادبی اجتماع کے لئے کوئی ابتدائی تیاری نہیں کی گئی۔ بحث کے لئے موضوعات دے کر مقالات مقرر نہیں کئے گئے ہیں اور بحث میں شریک ہونے والے ادیبوں کو پہلے سے اطلاع نہیں دی گئی، تاکہ وہ تیار ہو کر آتے۔ یہ شکایات اُصولی ہیں لیکن مجھے معلوم ہوا کہ اس ادبی اجتماع کے انعقاد کے بجٹ کا کم وقت ملا ہے۔ ایک وقت صفِ اوّل کے اتنے بہت سے ادیبوں اور شاعروں کا مجمع ہو جانا ہی ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ جموں کے لوگوں کے لئے وجہ کشش یہ قربان السودن بھی ہے۔ پھر بھی منتظمین کے سامنے کوئی خاکہ ضرور ہوگا۔ اگر خاکہ نہ ہوتا تو تیرہ مقالات کے لئے ڈ۔ انصاری کو اور مختصر افسانہ کے لئے بمبئی سے افسانہ نگاروں کو بلانے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کے علاوہ افتتاحی جلسہ میں آج کی مجلسِ مقالات کا اعلان بھی کر دیا گیا تھا۔ اسی لئے تو کل شب میں ڈ۔ انصاری نے اپنے پہلے کے لکھے ہوئے ایک مقالہ کو مختصر کیا اور دوسرا لکھا۔ جموں پہنچ کر ہی سبھی ادیبوں اور شاعروں کو یہ مژدہ بتا دیا گیا ہے کہ انھیں سے کس کس کو کس کس پروگرام میں حصہ لینا ہے۔ عوام اور خواص کے لئے یہ ایک تذبذب اور تجسّس (SUSPENSE) کی بات بھی ہو گئی ہے کہ دیکھیں کیا ہوتا ہے؟ میں نے تو وہ اجتماعات بھی ناکام ہوتے ہوئے دیکھے ہیں، جن کے لئے پہلے سے زبردست تیاریاں کی گئیں۔ یوں بھی آج کی معروف زندگی میں ادیبوں اور شاعروں سے بار بار نئی تخلیقات کی توقع رکھنا عبث ہے۔ بڑی کشش تو ان کی شخصیت میں ہوتی ہے۔
منتظمین نے ایسی بڑی شخصیتوں کا انتخاب کیا ہے جن میں سے بعض کو بالکل پہلی بار اہلِ جموں دیکھ رہے ہیں یا اب ہونے والی نشستوں میں انھیں سُنیں گے۔ رہا نمائشوں میں ادبی اجتماعات اور مشاعروں کا سوال۔ تو کتنے ہی شہروں مثلاً علیگڑھ، اٹاوہ، بلند شہر وغیرہ کی نمائشوں میں پابندی کے ساتھ ہر سال مشاعرے اور ادبی و تہذیبی اجتماعات ہوتے ہیں۔ جموں اور سرینگر کی بھی یہ ایک دیرینہ روایت ہے۔ خود میں نے بخشی غلام محمد مرحوم کے زمانے میں جموں کی نمائش کا مشاعرہ پڑھا ہے۔ میرے دریافت کرنے پر مجھے بتایا گیا کہ یہ درست نہیں ہے کہ ان اجتماعات میں مقامی نمائندگی نہیں ہے۔ محدود وقت میں بیرونی ادیبوں اور شاعروں کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ جس حد تک گنجائش ہو سکتی ہے اس کے مطابق مقامی قلمکاروں کو دعوتِ شرکت دی گئی ہے۔ بمبئی کے کئی بڑے اجتماعات میں ایسا ہو چکا ہے کہ باہر سے آئے ہوئے تیسرے درجے کے شاعروں کے لئے صفِ اوّل کے مقامی شعراء نے اپنا وقت پیش کر دیا ہے۔ یہ تو مقامی رواداری کی بات ہے۔ مقامی قلمکاروں کو تو مقامی لوگ سنتے ہی رہتے ہیں وہ تو بیرونی قلمکاروں کو دیکھنے اور انھیں زیادہ سے زیادہ سننے کے لئے بڑی تعداد میں جمع ہوتے ہیں۔
آج کا دن بہت مصروفیت کا ہے۔ ۱۰ بجے سے مجلسِ مقالات ہے۔ شام کو ایک پارٹی ہے اور رات کو وزیرِ اعلیٰ کے یہاں کھانا۔ دس بجے جموں کے سلطان پوری اور شہریار بھی آگئے ہیں۔ منتظمین سب کو نمائش گاہ لے جانے کے لئے بے چین ہیں۔ گاڑیاں تیزی کے ساتھ دوڑ رہی ہیں۔ نمائش کے میدان میں وسیع و عریض شامیانوں کے نیچے بڑی تعداد میں کرسیاں لگی ہوئی ہیں۔ اسٹیج بہت معمولی ہے۔ اس پر دو تین صوفے ہیں۔ بیچ میں مقرر کے لئے مائک اور اسٹینڈ۔ اسٹیج اور سامعین کی کرسیوں کے درمیان جگہ خالی رکھی ہوئی ہے اور اِدھر اُدھر مہمانوں اور دیگر لوگوں کے لئے دو رویا صوفے بچھے ہوئے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو کی مشینیں بھی آئی ہوئی ہیں اور ریڈیو کے افسران بھی ہیں۔ آگے کی صفوں میں بیرونی و مقامی ادبا و شعرا ہیں۔ پچھلی قطاروں میں حاضرین و افسران وغیرہ۔ ڈاکٹر گیان چند، ٹھاکر پونچھی، موہن یاور اور کتنے ہی دوست جانے پہچانے لوگ انتظامی امور میں حصّہ لے رہے ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند کو آگے لانے اور بٹھانے کی کوشش کی گئی ہے مگر انھوں نے کسرِ نفسی سے کام لیا ہے۔ کرشن چندر ادبی نشستوں کے سربراہ ہیں اور اسٹیج سکریٹری شری وید بھسین، ایڈیٹر روزنامہ کشمیر ٹائمز۔ مجلسِ مقالات کو دو نشستوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلی نشست کی صدارت مشہور و ممتاز ادیبہ عصمت چغتائی کر رہی ہیں۔ ڈ۔ انصاری اپنا مقالہ پڑھیں گے۔ وید بھسین صاحب اُن کا تعارف کراتے ہوئے کہہ رہے ہیں "ڈاکٹر ڈ۔ انصاری بمبئی یونیورسٹی میں روسی زبان کے پروفیسر ہیں۔ روسی زبان [illegible] انھوں نے غالب پر گراں قدر کام کیا ہے۔ روسی اردو ڈکشنری مرتب کی ہے۔ اردو میں "غالب شناسی" لکھی ہے۔ روسی زبان کی [illegible] نظم و نثر ہی میں ترجمہ کیا ہے، بہت اچھے مقرر ہیں وغیرہ وغیرہ۔ میں سوچ رہا ہوں کیا کسی بڑے ادیب کا تعارف [illegible]

جاں سکا۔ ہمیں چین میں شرح کا اندازہ ہو سکا کہ کاشتے جو ایسے غیر معمولی ذہین ادیب سے کسے ضائع فرمائے۔ جیسا کہ ایک خصوصی لہجہ رکھتا ہے جس کا نقص یہی کہ باتوں کا ٹکڑوں میں بٹ جاتا ہے اور جس کا حسن پھر ان ہی ٹکڑوں کا مجموعہ بنتا ہے۔

ظ۔ انصاری اسٹیج پر آگئے ہیں۔ ایک نظر سامعین پر ڈالتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ وہ دو مقالے پڑھیں گے۔ پہلے مقالہ کا عنوان ادبی رجحانات میں رد و قبول کا مسئلہ ہے۔ چالیس منٹ کے مقالے کو مختصر کیا ہے۔ دوسرا مقالہ "ترقی پسندی اور جدیدیت" نیا لکھا ہے۔ ظ۔ انصاری کے مقالہ پڑھنے کا انداز ابھرتا ہے۔ کھنک دار لہجہ، کہیں تیز کہیں دھیما۔ گو وہ شاعری میں جو عناصر بظاہر غیر قومی اور غیر ملکی ہیں انہیں دکھانے کے بعد تاریخی شواہد سے ان کی تردید کرتے ہوئے رد و قبول کے مسئلہ کو واضح کیا ہے۔ مقالہ توجہ سے سنا جا رہا ہے، لیکن بعض سامعین نے سامعین کی رگوں میں خون نہیں دوڑایا ہے۔ چہرے نہیں تمتماتے ہیں لیکن جب انہوں نے اپنا دوسرا مقالہ "ترقی پسندی اور جدیدیت" پڑھنا شروع کیا تو سننے والوں میں دلچسپی کی ایک لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔ اس اجتماع میں جدیدیت کے حامی و پرستار بھی ہیں اور ترقی پسند بھی۔ خود ظ۔ انصاری بھی ترقی پسندی ہی کی پیداوار ہیں۔ ظ۔ کے اس مقالہ کے بعد دوسرا دور بحث کا آغاز ہوا ہے۔ بہت سے نام اسٹیج سکریٹری وید جیسی کے پاس پہنچ گئے ہیں۔ باری باری سے لوگوں کو بلایا جا رہا ہے۔ بحث میں [illegible] کرشن چندر، قرۃ [illegible] سلطان [illegible]، پروفیسر [illegible] بلراج [illegible] وغیرہ نے حصہ لیا ہے۔ میرے پیچھے ہی شہریار بیٹھے ہوئے ہیں۔ جدید ادب و شعر میں ان کا نمایاں مقام ہے۔ اس اجتماع میں جدیدیت کی صحیح نمائندگی وہی کر سکتے ہیں۔ وہ علیگڑھ یونیورسٹی میں اردو کے استاد ہیں۔ اس لئے بھی انہیں بولنا چاہئے۔ میں نے ان پر زور دیا کہ وہ اسٹیج پر جائیں اور بحث میں حصہ لیں، دوسرے لوگوں نے بھی کہا ہے، مگر شہریار نہ جانے کس مصلحت کی بنا پر اپنی جگہ سے ہلے تک نہیں ہیں۔ خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں۔ ظ۔ انصاری نے اپنے مقالہ میں مفاہمت کی بات کی ہے مگر پلڑا جدیدیت پسندوں ہی کی طرف جھکا ہوا ہے۔ ہلکا سا الزام بھی ترقی پسندوں پر ہے۔ میں بھی جدید رجحانات کو سراہتا ہوں، لیکن اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ جدیدیت کو منوانے اور مقبول بنانے کے لئے ترقی پسندوں کو توہین آمیز انداز میں مسلسل گھسیٹا جائے اور اردو کی نہایت تابناک نصف صدی کے شعری کارناموں کی نفی کی جائے۔ قدیم ادب کی نفی، ترقی پسند ادب کی نفی! پھر اردو شعر و ادب میں رہ کیا جاتا ہے۔ یہ نقصان کس کا ہے؟ یہ دشمنیاں اور [illegible] کے اسباب کہاں کی [illegible] بنانا کیوں؟ ترقی پسندی کی قبر پر جدیدیت کی شاندار عمارت کا تصور بڑا عجیب سا ہے۔ ظ۔ انصاری نے آخر میں اعتراضات و سوالات کے جوابات دئیے ہیں۔ ظ۔ کی جوابی تقریر ان کے مقالہ سے زیادہ پرجوش و پرتاثیر ہے۔ جملوں کی اونچ نیچ اور الفاظ کے زیر و بم [illegible] اصطلاحات کی پیشکش نے ایک سماں باندھ دیا ہے۔ پہلی نشست ختم ہو چکی ہے۔ عصمت چغتائی اپنی صدارتی تقریر میں ظ۔ انصاری کے مقالات کے متعلق کچھ کہنے کے بجائے، عمومی انداز کے چند مزاح آمیز جملے کہہ رہی ہیں "[illegible] تماشے ہیں ادیبوں کو پیش کر کے جانوروں ہی کی طرح انہیں اپنی نمائش کا موقع دیا گیا ہے" ـــ کاش عصمت اپنے منصب و مقام اور علم و فکر کے اعتبار سے کچھ سنجیدہ باتیں کرتیں۔ ترقی پسندی ہی کی [illegible] کو گنا دیتیں ـــ!

مقالات کی دوسری نشست کی صدارت سلمیٰ صدیقی نے کی ہے۔ اس میں دو [illegible] مقالے پڑھے گئے ہیں (۱) کشمیری ادیبوں کو درپیش مسائل از پروفیسر [illegible] (۲) ڈوگری ادیبوں کو درپیش مسائل۔ از پروفیسر رام ناتھ شاستری۔ ان مقالات پر بھی بحث ہوئی ہے اور پنجابی، ہندی اور اردو کا مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے۔ اس بحث نے میری دانست میں کچھ ناگوار صورت اختیار کر لی ہے۔ میں نے کھڑے ہو کر عرض کیا ہے کہ یہ سیاسی مسئلہ ہے اور علاقائی زبانوں کی تعلیم کا تعلق ریاست کے محکمۂ تعلیم سے ہے۔ جن علاقائی زبانوں کو حق تلفی کی شکایت ہے وہ محکمۂ تعلیم سے رجوع کریں۔ یہاں کے [illegible] کیا ہے کہ [illegible] اردو تعلیم برائے نام ہے۔ بہر حال یہ دوسری نشست بھی کافی پرجوش رہی۔ بیرونی ادیبوں نے علاقائی زبانوں [illegible] اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ ڈاکٹر گیان چند نے اس بحث میں بھی کوئی حصہ نہیں لیا [illegible] ویسے وہ صاحب [illegible] لسانیات ہیں۔ سلمیٰ صدیقی نے اپنی صدارتی تقریر میں کچھ [illegible]

اور سنجیدہ مزاج بھی ہیں۔ انھوں نے بحث کے سوالات کو صحیح طور پر سمجھا ہے۔

سوا دو بجے نشست ختم ہوئی ہے۔ ڈاکٹر انصاری کو لوگوں نے گھیر لیا ہے۔ انھوں نے جموں والوں کے دلوں میں جگہ بنالی ہے۔ اب دیکھ رہی ہوں، رسکنا نہیں ہے۔ مہمانوں کو جموں ہوٹل لے جایا جا رہا ہے تاکہ وہ کچھ کھا پی لیں اور گزشتہ آدھ گھنٹہ آرام کرلیں۔ اس کے بعد پھر ہنگامہ ہے۔ موسم کافی گرم ہے۔ ۴ بجے شام کو گاڑیاں آگئی ہیں جس وقت مولانا آزاد اسٹیڈیم میں صنعتی نمائش کمیٹی کی طرف سے عصرانہ ہے۔ اسٹیڈیم کے باہر استقبال کرنے والوں کی بڑی تعداد جمع ہے۔ جناب غلام رسول رینزو کے علاوہ بہت سے صنعت کار اساتذہ، صحافی بھی ہیں۔ صنعتی نمائش کی پوری کمیٹی موجود ہے۔ مولانا آزاد اسٹیڈیم اپنے طول و عرض کے اعتبار سے بہت وسیع ہے۔ چاروں طرف پختہ سیڑھیاں ہی سیڑھیاں ہیں، درمیان میں بہت بڑا میدان۔ عصرانہ میں کم و بیش ڈیڑھ سو لوگ شریک ہیں۔ مقامی ادیب و شاعر و صحافی اور اساتذہ ہیں۔ ایک طرف بہت سی کرسیاں بچھی ہوئی ہیں، سامنے کچھ فاصلے پر میزیں لگی ہیں۔ کچھ لوگ کھڑے ہوئے ہیں اور کچھ کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ الگ الگ ٹکڑیوں میں مختلف موضوعات پر گفتگو ہو رہی ہے۔ بیرونی ادیبوں اور شاعروں کی آمد نے کیسی زندگی پیدا کر دی ہے چاروں طرف! - کچھ دیر بعد میزوں کے گرد لوگ جمع ہو گئے ہیں۔ لطف صحن و دو گھنٹے ساتھ رہے۔ چائے پارٹی کافی دیر میں ختم ہوئی ہے۔ یہاں سے مہمانوں کو پھر جموں ہوٹل لے جایا جا رہا ہے، تاکہ یہ جلدی سے تیار ہو لیں۔ ۸ بجے شب کو وزیر اعلیٰ جناب سید میر قاسم صاحب کے یہاں عشائیہ (DINNER) ہے۔ مسافر تھکے ہوئے بھی ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کا؟! - کوئی لمحہ اپنا نہیں ہوتا۔ سب کچھ میزبانوں کی مرضی پر موقوف ہے۔ چاہے اعصاب ساتھ دیں یا نہ دیں۔

ٹھیک پونے آٹھ بجے گاڑیاں آگئی ہیں اور بسرعت وزیر اعلیٰ کے بنگلہ کی طرف دوڑ رہی ہیں۔ بنگلہ بقعۂ نور بنا ہوا ہے۔ مہمانوں کا اہتمام ہے۔ وزیر اعلیٰ سید میر قاسم صاحب بہ نفس نفیس ایک ایک کا استقبال کرتے ہیں ____ ادیبوں اور شاعروں سے بڑی محبت کے ساتھ مسکرا مسکرا کر مل رہے ہیں۔ لان میں رنگین شامیانوں کے نیچے صوفے اور کرسیاں لگی ہوئی ہیں۔ پہلی صف میں چاروں طرف صوفے بچھے ہوئے ہیں۔ وزیر اعلیٰ خود ایک صوفہ پر اس جگہ بیٹھے ہیں، جہاں سے داخل ہوتے ہیں، تاکہ جو لوگ بعد میں آئیں انھیں خوش آمدید کہہ سکیں۔ اپنے برابر کے صوفے پر کرشن چندر کو بٹھایا ہے۔ بیگم سلطانہ جعفری کا بطور خاص وزیر اعلیٰ سے تعارف کرایا گیا ہے۔ مجروح آج صبح ہی آئے ہیں۔ کل کے افتتاحی جلسے میں شریک نہ تھے۔ قاسم صاحب بڑے تپاک سے ملے ہیں۔ مجروح کرشن چندر کے پاس بیٹھ گئے ہیں۔ دوسرے وزراء، عمائدین، افسران اور ادباء و شعرا مختلف صوفوں پر فروکش ہیں۔ سب ہی آچکے ہیں۔ جگہیں پر ہو گئی ہیں۔ کمار پاشی ذرا دیر سے آئے ہیں۔ کرشن چندر نے انھیں بڑی محبت سے اپنے پاس بٹھایا ہے۔ کرشن چندر کی مقبولیت یہاں بھی بلا کی ہے۔ جانے ملک کا ہر علاقہ فنکاروں کی عظمتوں کا اعتراف کرنا جانتا ہے۔ کشمیر کے لوگ تو کرشن کو تنہا اپنا سمجھتے ہیں۔ پنجاب والے پنجاب کا، بہار والے بہار کا ۔ ہندی والے پریم چند کی طرح ہندی کا اور اردو والے اردو کا۔ جس جس زبان میں ان کی کہانیاں چھپی ہیں، وہ ان ہی زبانوں کے سمجھے جانے لگے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے، یہ دراصل فنکار کی آفاقیت ہے۔ کرشن چندر پر ایک دستاویزی فلم (DOCUMENTARY FILM) بن رہی ہے۔ اس کے لئے کشمیر خصوصاً پونچھ کے علاقے کو منتخب کیا گیا ہے۔ کرشن چندر پونچھ میں پیدا ہوئے تھے۔

تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہی ہیں۔ قاسم صاحب کی آنکھوں میں ایک عجیب مقناطیسی کشش [illegible] ہے [illegible] جو ہر ایک کو ان کی طرف کھینچتی ہے۔ اس وقت کے شرکا [illegible] پیش کیا گیا ہے۔ وزیر اعلیٰ نے خواہش ظاہر کی ہے کہ پہلے کچھ شعرا [illegible] ممتاز شعرا سے یہ سلسلہ شروع ہوا ہے۔ [illegible] جانثار اختر نے چند [illegible]

مخمور ترنم سے اپنی نظم سنا کر داد وصول کر رہا ہے۔ اب وہ صوفہ آگیا ہے جس پر عرش ملسیانی بیٹھے ہوئے ہیں۔ وزیر اعلیٰ قاسم صاحب نے اُن سے درخواست کی ہے اور یکایک عرش صاحب کے منہ سے جو فقرہ نکلا ہے : "کھانے کی قیمت تو ادا کرنی ہی ہوگی۔ اور سکہ دیتا ہوں" ساری محفل پر سناٹا چھا گیا ہے۔ وزیر اعلیٰ کے چہرے کی شگفتگی ایک طرح کی کرب آمیز حیرت میں بدل گئی ہے مگر فوراً ہی سنبھل کر انھوں نے عرش صاحب سے معذرت چاہی ہے اور اپنی بلند ظرفی کا ثبوت دیا ہے۔ دوسرے ادیب و شاعر ایک انفعالی کیفیت محسوس کر رہے ہیں۔ شمیم احمد شمیم (جو عرش صاحب کے پیچھے ہی بیٹھے ہیں) خاموش نہ رہ سکے۔ عرش صاحب پر چند جملے کس دئیے ہیں۔ عرش ملسیانی جہاں دیدہ ہیں اور سیکڑوں محفلیں دیکھے ہوئے۔ وہ بھی ترکی بہ ترکی جواب دے رہے ہیں۔ کبھی پنجابی زبان میں، کبھی اُردو میں۔ مہمان ہنس رہے ہیں۔ وزیر اعلیٰ خاموش ہیں۔ عرش صاحب نے آخری فقرہ پنجابی زبان میں شمیم احمد شمیم پر کسا ہے، جس میں شمیم کو "[illegible]" کہا ہے جس پر زبردست قہقہے بلند ہوئے ہیں۔ محفل کی بدمزگی کچھ دور ہوگئی ہے۔ عرش صاحب نے غزل سنائی ہے۔ پھر سردار جعفری نے نظم پڑھی ہے۔ نظم تکنیکی جدلیت سے سرشار بہت بلند معیار رکھتی ہیں۔ افسوس کہ ان کے خود نے ان کی شاعرانہ عظمت اور عالمانہ فکر و نظر کے اظہار میں معلوم نہیں بڑے بخل سے کام لیا ہے۔ اُن کی نظم بہت پسند کی گئی ہے۔ میرے پاس بیٹھے ہوئے شہریار نے بھی بہت اچھی غزل سنائی ہے۔ ان کے بعد میں نے غزل کے چند شعر پیش کئے ہیں۔ یہاں سے یہ سلسلہ مقامی شعراء تک پہنچ گیا ہے۔ دینا ناتھ نادم۔ شاہد بڈگامی۔ رحمان راہی، فاروق نازکی۔ محمد یٰسین۔ غلام نبی ناظر۔ شجاع سلطان۔ رسل پونپر۔ عابد مناوری اور طالب شوپیانی نے اپنا اپنا کلام سنایا ہے۔ اب اُدھر وزیر اعلیٰ کے پاس والے حصے میں واجدہ تبسم کی باری آگئی ہے۔ اور انھوں نے غزل کے اشعار سنا کر خوب داد لی ہے۔ پھر دوبارہ پڑھا ہے۔ آخری شاعر مجروح سلطان پوری ہیں۔ مخصوص ترنم، منفرد فکر اور لہجہ۔ کافی پسند کئے گئے ہیں۔

اس روحانی غذا کے بعد مادی غذا کے لئے، قریب ہی لگے ہوئے دوسرے شامیانوں کے نیچے سب مہمانوں کو لے جایا گیا ہے۔ کئی بڑی بڑی میزوں پر کھانے چُنے ہوئے ہیں۔ سبزی خوروں اور گوشت خوروں دونوں کیلئے الگ الگ انتظامات ہیں۔ انواع و اقسام کے کھانے ہیں۔ وزیر اعلیٰ واجدہ تبسم کو چھیڑتے ہوئے فرما رہے ہیں — "چاول خوب کھائیے گا"۔ اسی کا نام شخصی بے تکلفی ہے۔ وہ اس وقت وزیر اعلیٰ نہیں بلکہ ایک ادب دوست میزبان ہیں۔ واجدہ نے پھر چاولوں کی شان میں قصیدہ خوانی شروع کردی ہے۔ واقعی وہ اچھے چاولوں کی بڑی دلدادہ ہیں۔ یہ واجدہ کی سادگی و معصومی ہے کہ برملا بے تکلف اظہار کر دیا۔ کشمیری ضیافتوں میں گوشت بکثرت ہوتا ہے۔ گوشت کی مختلف قسمیں (VARIETIES) ہوتی ہیں۔ مرغ و ماہی کے علاوہ "گوشتابہ" (بہت بڑا کباب) وہاں کی خاص چیز ہے۔ محترم قاسم صاحب ایک ایک مہمان کے پاس جا جا کر کھاتے رہنے کے لئے اصرار فرما رہے ہیں۔ خود نہیں کھایا ہے۔ اُن کی مہمان نوازی سے سب متاثر نظر آرہے ہیں۔ رات کے گیارہ ساڑھے گیارہ بج گئے ہیں۔ سب لوگ محترم قاسم صاحب سے مل کر رخصت ہو رہے ہیں۔ وزیر اعلیٰ کو افسوس ہے کہ وہ کل سے ہم لوگوں میں نہیں رہیں گے۔ دورے پر جا رہے ہیں۔

[illegible] ہوٹل واپس آکر کچھ دیر ظ۔ انصاری کے کمرے میں اُردو ادب اور شاعروں کی دھما چوکڑی رہی ہے۔ ظ۔ انصاری بہت ہی پیارا آدمی ہے، مگر خوفناک عینک، عبا اور بظاہر ناک چڑھا۔ لیکن تہذیب و اخلاق میں ڈھلا ڈھلایا۔ کچھ دیر بعد اپنے کمرے میں آکر لیٹ گیا ہوں۔ نیند کا دُور دُور پتہ نہیں ہے۔ اتنا بڑا کمرہ، تنہائی، کل کی مصروفیات کا خیال۔ آج کے اہم واقعات ایک ایک کرکے ذہن میں ابھر رہے ہیں۔ [illegible] اہلِ علم کا جھکاؤ۔ پھر آج ہی کی [illegible] خوبصورت شاعری اور اُن کی بے پناہ مقبولیت، واجدہ تبسم کی [illegible] عرش ملسیانی کے بے محل [illegible] شمیم احمد شمیم کا موقع بے موقع طنز و مزاح۔ کمار پاشی کی [illegible] پسند [illegible] زیادہ خاموشی [illegible] جملے لائے ہیں، انھیں زیادہ قربت [illegible] سردار جعفری، جان [illegible] شخصیتیں [illegible] نقوش اُردو کے مشہور افسانہ و ناول نگار [illegible]

کا اب تک کوئی مکمل جائزہ [illegible] اپنے [illegible] کا اظہار کیا۔ "خاص طور سے کشمیر [illegible] — [illegible]
جس [illegible] کی نسل [illegible] خلوص اور احترام [illegible] [illegible]
[illegible] کر دیا ہے۔

آج موسم [illegible] ہے۔ [illegible] کی نعمت کا [illegible] ہے۔ [illegible]
[illegible] سامنے [illegible] آج [illegible]
[illegible] آگئے ہیں اور [illegible]

ڈائننگ ہال کی بہت سی کرسیاں [illegible] ہیں۔ [illegible] صاحب تشریف لائے ہیں۔ سب کو آج کا پروگرام بتایا ہے۔
[illegible] افسانہ ہے، [illegible] یونیورسٹی [illegible] پروگرام ہے۔ پانچ بجے شام کو [illegible] کی طرف سے استقبالیہ اور
[illegible] کو [illegible] مشاعرہ ہو۔

[illegible] کہ خواجہ احمد عباس [illegible] ہیں [illegible] کے کوئی [illegible] ہیں۔ عباس
صاحب [illegible] ہیں۔ [illegible] آگے [illegible]
[illegible] عباس صاحب کو آزاد ذہن (LIBERATED MIND) [illegible] کہتا ہوں۔ انھیں دیکھ کر [illegible]
[illegible] رہے ہیں۔

عباس [illegible] کہنے لگے۔ اچھا بھئی، آج کی محفلِ افسانہ کی تمہیں صدارت کرنی ہے:

عباس: "نہیں عصمت چغتائی کو صدارت کرنی چاہئے"

عصمت: "میں یہ صدارت وزارت کی جھنجھٹ چکی ہوں"

ڈائننگ ہال سے سب لوگ اپنے کمروں میں چلے گئے ہیں۔ تھوڑی دیر میں [illegible] آگئے ہیں۔
[illegible] صاحب سے کل [illegible] کی نشست میں بھی ملاقات ہوئی تھی۔ انھیں خندہ جبیں اور [illegible] پایا۔ کل شب کو [illegible] ریڈیو کے علاوہ مشاعرہ کی صدارت
[illegible] بھی [illegible] ہے۔ ان دونوں حضرات کے جاتے ہی ڈاکٹر [illegible] آگئے ہیں۔ گھبرائے گھبرائے سے [illegible] باتیں کی ہیں۔
[illegible] خواجہ احمد عباس کو [illegible] رہے ہیں انھیں ان ادیبوں [illegible] پہنچایا ہے۔ غالباً یونیورسٹی کے پروگرام کے سلسلہ
[illegible] سے ملنے آئے ہیں۔

[illegible] صاحب کے رخصت ہوتے ہی شاہد بڈگامی آگئے ہیں۔ انھیں حکومت کی طرف سے [illegible] "کالا پتھر" بتایا گیا ہے۔
[illegible] ہیں ایکسٹینشن آفیسر [illegible] کل سے ادیبوں اور شاعروں کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ ان تمام تخلیقات کو جمع کر رہے ہیں جو پڑھی گئی ہیں یا اب
پڑھی جائیں گی۔ ادیبوں اور شاعروں کے دستخط بھی لے رہے ہیں۔ شاہد بڈگامی مخلص اور خوش اخلاق نوجوان ہیں۔ ساڑھے دس بجے [illegible] جانے
کے لئے سب اپنے کمروں سے نکل رہے ہیں۔

[illegible] ہے۔ آج کل سے بھی زیادہ لوگ جمع ہیں۔ یہ محفلِ [illegible] کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ کل [illegible] صاحب نے
[illegible] پھر خواجہ احمد عباس صاحب کی صدارت کا اعلان کیا ہے۔ خواجہ صاحب بھی [illegible] پر پہنچ گئے ہیں۔ [illegible]
مشہور افسانہ نگار [illegible] بیگم کو افسانہ سنانے کی زحمت دی گئی ہے "[illegible]" کے عنوان سے [illegible]
[illegible] باقی سب لوگ [illegible] رہے ہیں۔ [illegible]
[illegible]

کہانی صاحب محظوظ ہو رہے ہیں۔ پنجابی کہانی ختم ہوئی ہے تو موہن یاور اپنی اردو کہانی "رانی کلب" سنانے آگئے ہیں۔ موہن یاور اردو کے جانے پہچانے اور کشمیر کے ممتاز افسانہ نگار ہیں جن کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ بہت اچھی کہانیاں لکھتے ہیں۔ "رانی کلب" ان کی مطبوعہ کہانی ہے اور کافی دلچسپ۔ ہماشمن موہن یاور کہانی اور اچھے انداز میں سنانے۔ شعر و ادب میں کشمیر نہ ماضی میں کسی سے پیچھے رہا ہے اور نہ اب ہے۔ بہت سی اہم ادبی شخصیتیں یہاں نے پیدا کیں۔ یہاں اردو جتنی کی اگر ذرا سی کھوٹ جاتی ہے تو اور بھی ترقیاں ہو سکتی ہیں۔ چند ہی سال میں کشمیر سے اردو کے کئی اخبارات نکلنے لگے ہیں۔ کئی لیتھو پرنٹنگ پریس لگ گئے ہیں۔ کاتب بھی پیدا ہو گئے ہیں۔ پہلے کتابت و طباعت کی سخت دشواریاں تھیں۔ بڑی دلی تمنا تھی کہ "کشمیر میں اردو شعر و ادب" کے موضوع پر ایک سیمینار ہو۔ مگر اس کا موقع ہی نہیں ہے، تمام اوقات مقرر ہو رہے ہیں۔ خود کشمیر کے ادیبوں اور شاعروں نے بھی اپنی طرف سے ادبی اجتماع کے منتظمین کے سامنے ایسی کوئی تجویز نہیں رکھی۔ کشمیر سے میرا اور میرے خاندان کا ادبی رشتہ بہت ہی دیرینہ ہے۔ والد مرحوم علامہ سیماب کے فیضان نے وہاں بڑا کام کیا اور گزشتہ تیس پینتیس سال میں میری حقیر کوششوں اور لگاؤ کے نتیجہ میں، کئی اہم نام وہاں ابھرے ہیں۔

اب بیرونی کہانی نگار اپنی کہانیاں سنائیں گے۔ دید ہیبین صاحب نے واجدہ تبسم کا نام لیا ہے۔ جس طرح اسٹیج ڈرامے میں منظر بدلتا ہے۔ بالکل اسی طرح محفلِ افسانہ کا منظر بدل رہا ہے۔ واجدہ تبسم اپنی جگہ سے اٹھی ہیں۔ اسٹیج کی لکڑی کی سیڑھیاں ناہموار اور کمزور۔ واجدہ بھاری بھرکم۔ کسی نہ کسی طرح غریب سیڑھی پر چڑھی ہیں اور پہلی ہی سیڑھی سے سامعین میں دلچسپی اور توجہ کا رنگ ابھر گیا ہے۔ دوسری سیڑھی کہانی سنانے کی باقی ہے۔ بمبئی میں تو واجدہ کا یہ حال کہ کچھ بولنے کے لئے کہو تو وہ چار اُلٹے سیدھے جملے دھیمے انداز میں کہہ کر، یہ جا وہ جا۔ مجھے بڑا اندیشہ ہے کہ وہ کہانی پڑھ بھی سکیں گی یا نہیں۔ بےہوش تو نہیں ہو جائیں گی؟۔ مائک پر جاتے ہی وہ کہہ رہی ہیں نہ "میں اپنی کہانی "اُترن" آپ کو سناؤں گی — اُترن — اُترن — اُترن!! بدنامِ زمانہ کہانی۔ متنازعہ کہانی، سامعین کے دماغوں میں کھلبلی مچ گئی ہے — واجدہ نے بلا تامل کہانی پڑھنا شروع کر دی ہے۔ چاروں طرف سناٹا چھا گیا ہے۔ واجدہ کے ہونٹوں سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملہ سامعین کے کانوں اور دلوں میں اُترتا چلا جا رہا ہے — حیدرآبادی زبان، دلچسپ فقرے، چبھتے ہوئے برجستہ مکالمے اور واجدہ کے پڑھنے کا انداز، سونے پر سہاگہ۔ کہانی میں جو مکالمہ غصہ اور نفرت لئے ہوئے آ رہا ہے نہ وہ کافی چیخ کر ادا کر رہی ہیں۔ جملوں کا اُتار چڑھاؤ بے پایاں لطف دے رہا ہے۔ سننے والے تصویرِ حیرت بنے ہوئے ہیں۔ وقفوں وقفوں سے تالیاں بج رہی ہیں۔ واجدہ کو بے انتہا پسند کیا جا رہا ہے۔ کسی کو کہانی کی موضوعہ عریانی کا احساس تک نہیں ہے۔ سب واجدہ میں کھوئے ہوئے ہیں یا کہانی کی گہری مقصدیت میں! واجدہ نے کہانی ختم کی ہے تو ایک زبردست شورِ تحسین و آفریں بلند ہوا ہے۔ اب وہ گرتی پڑتی اسی سیڑھی سے اُتر رہی ہیں جس نے انہیں کامیابی کی اس بلندی پر پہنچایا — عصمت چغتائی، سلطانہ جعفری، سلمیٰ صدیقی، بیگم ممتاز مرزا میرے قریب والے صوفہ پر بیٹھی ہوئی ہیں۔ میں نے عصمت چغتائی سے کہا ہے کہ جتوں ہوٹل واپس جا کر واجدہ کی نظر اُتار دیں۔ واجدہ سیدھی ان کے قریب آئی ہیں اور وہی عصمت چغتائی جو کل واجدہ کو ڈانٹ ڈانٹ کر رُلا رہی تھیں، اس وقت بے ساختہ، واجدہ کی پیشانی چوم رہی ہیں۔ سلمیٰ صدیقی اور سلطانہ جعفری بھی بڑی شفقت اور اتھاہ پیار کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔ واجدہ کا چہرہ دمک رہا ہے اور آنکھوں میں خوشی کے آنسو ناچ رہے ہیں۔ یہ کیسی عجیب فطرت ہے؟ خوشی میں بھی رونا اور غم میں بھی رونا!! شاید اسی کا نام گدازِ قلب ہے۔

واجدہ کے بعد دید ہیبین صاحب سلمیٰ صدیقی سے کہانی سنانے کی درخواست کر رہے ہیں۔ بڑا نازک موقع ہے۔ اِس وقت تقدیم و تاخیر سے قطع نظر کرشن چندر یا عصمت چغتائی کو بلانا چاہئے تھا۔ مشاعروں میں بھی ذہین اناؤنسر کو ایسی تبدیلی کرنا پڑتی ہے۔ سلمیٰ صدیقی اسٹیج پر آئی ہیں۔ ان کی سنجیدہ مزاجی کام آ گئی ہے۔ وہ کہہ رہی ہیں کہ میں نے یہیں یہ کہانی نما خاکہ لکھا ہے۔ لوگوں کی دلچسپی بڑھ گئی ہے۔ خاکہ کا عنوان ہے —— "ہمیں کچھ کرنا چاہئے" سلمیٰ صدیقی شگفتہ اور نکھری ستھری نثر لکھتی ہیں۔ ان کے پڑھنے کا انداز بھی بہت سنبھلا ہوا ہے۔ وہ کوئی تقریر کر رہی ہیں یا تحریر پڑھ رہی ہیں! سلمیٰ سنجیدگی کا مجسمہ بنی ہوئی ہیں۔ خاکہ نیا بھی ہے اور بمبئی کی امیر عورتوں کی غریب پرستی پر ایک گہرا طنز یہ۔ یہاں خواتین بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ خاکہ سب ہی نے پسند کیا ہے۔ سلمیٰ صدیقی کے بخیر و عافیت واپس آ جانے کے بعد سکریٹری صاحب نے عصمت چغتائی کا نام لیا ہے۔ عصمت کا قلم لکھتا

شام جمیل

مجھے بہت اچھا لگا ہے۔ تالیاں بج رہی ہیں۔ افسانہ نگاری میں عصمت کا بُت ٹوٹا ہے۔ اہلِ جموں انہیں سننے کے بعد مطمئن نہیں۔ خواجہ احمد عباس نے آگے بڑھ کر انہیں سہارا دیتے ہوئے سیڑھی سے اُوپر لیا ہے۔ عجیب ہے یہ سیڑھی بھی۔ عصمت کہہ رہی ہیں۔ عصمت ڈائس پر آ گئی ہیں۔ انہوں نے یہی نئی کہانی یہیں آ کر لکھی ہے، اس کا عنوان سوچنے میں مجھے بہت پریشانی ہوتی ہے۔ بہت سے عنوانات سامنے آئے مگر کوئی جچا نہیں۔ اسی کہانی کے لئے "چھٹ ہی نے" سے اچھا عنوان کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ (قہقہے) دو تین طالبات چونک پڑے ہیں اور تھوڑی دیر کے لئے شمیم احمد شمیم کا گہرا اچھا رنگ "سالانہ خاموشی" میں بدل گیا ہے۔ جموں میں ایک چاول ہوتا ہے، جسے اُبالنے کے بعد اس کا پانی نکال دیا جاتا ہے۔ یہ پانی کافی گاڑھا ہوتا ہے، اُردو کی عام اصطلاح میں اسے "کڑوی پیچ" کہیں گے اور کشمیری میں "پچھ شدیں"۔ میں سمجھا ہوں کہ یہی نام ہے عصمت کی شوخی بھری بے ہودہ ظرافت۔ عصمت نے کہانی پڑھنا شروع کی ہے۔ جس طرح وہ بیٹھ کر پڑھا کرتی ہیں، نہ جانے کیوں اس وقت ربط و تسلسل کے ساتھ پڑھ نہیں پا رہی ہیں۔ چند صفحات کے بعد کہانی کے درمیانی اوراق تلاش کر رہی ہیں اور سامعین عصمت کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ ادھر پیچھے صوفے پر بیٹھی ہوئی سلطانہ جعفری اور سلمیٰ صدیقی عصمت کے پرس میں گمشدہ صفحات ڈھونڈ رہی ہیں۔ گمشدہ صفحات تو نہیں ملے ہیں، مگر سامعین عصمت کو پا گئے ہیں۔ عصمت اپنی کہانی کا پلاٹ زبانی بتا رہی ہیں۔ اس تلاش، قہقہے اور زبانی گفتگو نے سارا تاثر زائل کر دیا ہے۔ عصمت معذرت کر کے نیچے اُتر آئی ہیں۔ سامعین کے لئے یہ حادثہ بالکل غیر متوقع ہے۔

اب سامعین کی نظریں کرشن چندر کی طرف ہیں۔ خواجہ احمد عباس نے جیسے ہی کرشن کا نام لیا ہے، پنڈال تالیوں سے گونج اٹھا ہے۔ کشمیر والوں کے سر فخر سے بھی اُونچے ہو گئے ہیں۔ کرشن چندر کو وہ اپنا سمجھتے ہیں نا ـــــ یوں بھی کرشن چندر نے اپنی مختلف کہانیوں میں کشمیر کی جیسی منظر نگاری اور تصویر کشی کی ہے، کسی نے نہیں کی۔ کرشن اپنا بھاری بھرکم جسم سنبھالتے ہوئے پُر وقار "ہنس مکھ" چہرے کے ساتھ ڈائس پر آ گئے ہیں۔ انہوں نے دو ماہ پہلے کی لکھی ہوئی اپنی مطبوعہ کہانی "متی" سنانا شروع کی ہے۔ لوگ متوقع تھے کہ وہ کوئی نئی کہانی سنائیں گے۔ لیکن کرشن نے اس کے بعد کوئی کہانی لکھی ہی نہیں ہے۔ تخلیق کا نیا پرانا پن کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اصل چیز تخلیق کا اچھا اثر ہوتا ہے۔ میں نے تو کہیں بھی کرشن کو نئی کہانی سناتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ان کی پرانی سے پرانی کہانی داد و تحسین کی مستحق ہوتی ہے۔ کہیں کہیں تو تمام مجمع پرانی کہانی سنانے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ "متی" بہت اچھی کہانی ہے اور اسے کافی توجہ سے سنا گیا ہے۔ کرشن چندر کے پڑھنے میں بھی ایک بہاؤ اور رکاؤ ہوتا ہے۔

آخر میں خواجہ احمد عباس صدرِ جلسہ نے اپنی ۲۲ سال پہلے کی ایک کہانی "دو بچوں کا خط بنام گاندھی جی کے نام" سنائی ہے۔ عباس صاحب کوئی کہانی اپنے ساتھ لیکر نہیں آئے ہیں۔ یوں بھی اب وہ بہت کم کہانیاں لکھتے ہیں۔ جموں میں تلاشِ بسیار کے بعد ایک مجموعہ میں انہیں اپنی یہی کہانی ملی ہے۔ کہانی پرانے ہونے کے باوجود مقصدی ہے اور اس سے سامعین کو یہ جاننے کا موقع ملا ہے کہ ۲۲ سال پہلے بھی عباس صاحب کو قومی یکجہتی کا موضوع اتنا ہی عزیز تھا جتنا آج ہے۔ اس موضوع پر وہ کئی فلمیں بنا چکے ہیں۔ صحافتی رنگ کے مضامین اور کئی دوسری کہانیاں، ڈرامے لکھ چکے ہیں۔ اسی سلسلے کی ان کی ایک اور مشہور کہانی "تین تصویریں" مطبوعہ "آجکل" ہے۔ جموں کا ادبی اجتماع بھی اپنے آغاز سے اب تک قومی یکجہتی کا دلپذیر منظر پیش کرتا رہا ہے۔ کہانی سنانے کے بعد عباس صاحب نے آج کی افسانوی نشست پر مختصر سا تبصرہ کیا ہے۔ اور آخر میں کہا ہے کہ "واجدہ تبسم نے اس نثری مشاعرہ کو لوٹ لیا"۔

لسانی یکجہتی پر مشتمل اس افسانوی نشست کے ختم ہوتے ہی مہمانوں کو امر سنگھ کلب لے جایا گیا ہے۔ یہاں جموں کے صنعت کاروں کی طرف سے عشائیہ کا انتظام ہے۔ کلب کوئی پرانا گرجا یا خانقاہ معلوم ہو رہا ہے۔ نہایت وسیع ہال ہے جس میں سامنے ایک ٹیرس نما چبوترہ ہے۔ ہال کو سجایا گیا ہے اور ہال میں دور دور میزیں ہیں۔ مہمان اور دوسرے لوگ کرسیوں پر بیٹھ گئے ہیں، تشنگی اور تھکان دور کرنے کے لئے ٹرے میں چند مشروب سے شغل کر رہے ہیں۔ کھانے میں کچھ دیر ہے۔ الگ الگ ٹکڑیوں میں بیٹھے ہوئے لوگ مختلف موضوعات پر مصروفِ گفتگو ہیں۔ کچھ [illegible] کے لئے چلے گئے ہیں۔ یہاں ٹھاکر پونچھی بھی ہیں اور ڈاکٹر گیان چند بھی۔ [illegible] صاحب یہاں سے کچھ مہمانوں کو [illegible] لے جائیں گے۔

غیر حاضر اور غیروں کی تلاش میں بہت بھیج دیں۔ کھانا شروع ہو گیا ہے۔ کھانے والوں کی تعداد کسی طرح ڈیڑھ سو سے کم نہیں ہے۔ وقت بہت ہو چکا ہے کھانے سے فارغ ہو کر تھوڑی دیر جاں نثار اختر، عرشی ملیسانی، بیگم ممتاز مرزا اور میں تجمل ہوٹل واپس آ گئے ہیں۔ یونیورسٹی نہیں گئے ہیں۔ نہیں دور کیا گیا ہے۔

اُن ادیبوں اور شاعروں کو جو یونیورسٹی نہیں گئے ہیں اور تجمل ہوٹل میں موجود ہیں، شام کو پانچ بجے "گلاب بھون" لے جایا جاتا ہے جہاں میونسپل کارپوریشن کی طرف سے استقبالیہ ہے۔ "گلاب بھون" کیا کچھ بھرا ہوا ہے۔ معلوم ہوا کہ استقبالیہ تقریب ایک گھنٹہ پہلے سے جاری ہے۔ اس میں شہری و شہزادت میئر، میونسپل کارپوریشن جموں کے استقبالیہ ایڈریس کے بعد ۴۵ منٹ تک ظ۔ انصاری نے اپنی تقریر کا جادو جگایا ہے اور اپنے مخصوص انداز میں وہاں موجود ادیبوں کا تعارف کرایا ہے۔ میں جب پہنچا ہوں تو ظ۔ انصاری تعارف کرا کے بیٹھ رہے ہیں۔ "گلاب بھون" تالیوں سے گونج رہا ہے۔ ہم بعد میں آنے والے ادیبوں اور شاعروں کے لئے بھی چند ہی سے جملے کسی نے کہہ دئے ہیں۔ کارپوریشن کی طرف سے شکریہ کی رسم ادا کی گئی ہے اور سب لوگ ہال سے باہر لان میں آئے ہیں، جہاں بہت سی میزوں پر کئی قسم کی مٹھائیاں، کیک، پیسٹری، پھل، تلی ہوئی نمکین چیزیں اور چائے کی پیالیاں چنی ہوئی ہیں۔ لوگوں کی زبردست بھیڑ ہے۔ کسی طرح ڈھائی تین سو سے کم یہاں نہیں ہیں۔ بڑا ہی شاندار استقبالیہ دیا ہے میونسپل کارپوریشن نے — کتنے خوش نظر آ رہے ہیں یہاں لوگ۔ جموں میں ادیب اور شاعر کیا آئے ہیں، بہار آ گئی ہے۔ ہونٹوں سے شگوفے پھوٹ رہے ہیں۔ آنکھوں کے چراغ جگمگا رہے ہیں۔ یہاں بعض ایسے لوگوں سے ملاقات ہوئی ہے، جن سے پہلے نہیں ہوئی تھی۔ جموں والوں نے اپنے خلوص کی انتہا کر دی ہے، اپنی محبت کی شراب لنڈھا دی ہے!

مغرب کے بعد قیام گاہ پر پہنچے ہیں۔ چند ادیب اور شاعر کہیں چلے گئے ہیں، غالباً کسی کیف و سُرور کی محفل میں۔ سب سے بڑا عوامی معرکہ کل ہند مشاعرہ سامنے ہے۔ آج تکان بھی بہت زیادہ ہے۔ شب کے کھانے کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ اپنے کمرہ میں آ کر لیٹ گیا ہوں۔ RECEPTION پر کہہ دیا ہے کہ جب گاڑیاں آئیں تو ہمیں بلا لیا جائے۔ کچھ دیر بعد برادر محترم عرشی ملیسانی آ گئے ہیں۔ ارادتاً پکڑ لیا ہے کہ وہ کون سی غزل پڑھیں گے اور پھر اُن کی بیاض میں سے ایک اچھی سی مختصر غزل بھی منتخب کر دی ہے۔ شہریار اپنے کمرہ سے میرے کمرہ ہی میں چلے آئے ہیں۔ ہمیں مشاعرہ میں لے جانے کے لئے گاڑیاں دیر سے آئی ہیں۔

مشاعرہ گاہ میں تا حد نظر آدمی ہی آدمی ہیں۔ اندر جانے کے لئے راستہ تک نہیں ہے۔ پولیس کا زبردست انتظام ہے۔ ہمارے ملک میں پولیس کے بغیر کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ پولیس ہمارا رہنما نہیں بلکہ ملجا و ماوا ہوتی ہے۔ پولیس کے ڈنڈے کھانا ہندوستانیوں کا مقدر بن گیا ہے۔ بڑی ہاؤ ہو اور دھکم دھکا ہو رہی ہے۔ پیچھے سے بعد مشکل ہمیں اسٹیج پر لے جایا گیا ہے۔ اسٹیج پر بھی جائے تنگ است والا معاملہ ہے۔ شعرا بڑی تکلیف میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان ہی میں ادیب بھی ہیں، خواتین بھی اور دوسرے خاص خاص لوگ بھی۔ معلوم ہوا کہ مشاعرہ کافی دیر سے چل رہا ہے۔ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس جناب سید مرتضیٰ فضل علی اس کے صدر ہیں اور ظ۔ انصاری معتمد مشاعرہ۔ ظ۔ صاحب کے پاس خواجہ احمد عباس بیٹھے ہوئے ہیں۔ اُن کے قریب جاں نثار اختر، ایک طرف کرشن چندر ہیں، سردار جعفری ہیں، مجروح سلطان پوری، مقامی اور غیر مقامی دوسرے شعرا ہیں۔ [illegible] اور بیگم ممتاز مرزا ہیں۔ سلمیٰ صدیقی، عصمت چغتائی، واجدہ تبسم، سلطانہ جعفری اسٹیج کے پچھلے حصہ میں بھینچی بھینچائی بیٹھی ہیں۔ عرشی ملیسانی بھی بیچ میں پھنس گئے ہیں اور کمار پاشی بھی۔ شہریار کو میں نے اپنے پاس بلا لیا ہے۔ ظ۔ انصاری بڑی خوبصورتی سے مشاعرہ کنڈکٹ کر رہے ہیں۔ اُن کے معنی خیز جملے لطف دے رہے ہیں، مگر سامعین کی پچھلی قطاروں میں بڑا انتشار ہے۔ اچھے اچھے شعر لوگوں کی نذر ہو رہے ہیں، گزرتے چلے جا رہے ہیں۔ لوگ مشاعرہ سننا چاہتے ہیں لیکن دیر سے آنے والے آگے آنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پولیس اور منتظمین اس انتشار کو دور کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ [illegible]

جا رہا ہے۔ مقامی شعراء میں قاضی علی ہندی، منظر اعظمی، عابد مناوری، فرحت گیلانی، حرمت الاکرام، شمس صبائی، عشرت کاشمیری، محمد لیس (یسین)، ساہر، جدید، انور خان، صدیقی، شجاع سلطان، حکیم منظور، اشرف ساحل نے اپنا کلام سنایا ہے۔ بیرونی شعراء میں سردار جعفری، جاں نثار اختر، مجروح سلطان پوری، خمار بارہ بنکوی، حزیں لدھیانوی، اعجاز صدیقی، شہریار، کمار پاشی، قیصر قلندر، پدما سچدیو، بیگم ممتاز مرزا اور انور مرزا پوری نے سامعین کو محظوظ کیا ہے۔ بمبئی سے پریم دھون بھی اس مشاعرہ میں بلائے گئے ہیں۔ انھوں نے اپنی مزاحیہ شاعری سے لوگوں کو کچھ ہنسایا ہے۔ ہر چند بیرونی شعرا میں سب ہی نے اپنا بہتر کلام پیش کیا ہے لیکن وہ سماں نہیں بندھ پایا ہے جو بندھنا چاہیے۔ آٹھ دس ہزار کا مجمع اور انتشار۔ پہلا دور ۱۲ بجے رات کو ختم ہو گیا ہے۔ معتمد مشاعرہ ظ۔ انصاری نے لوگوں سے درخواست کی ہے کہ جو تھک گئے ہیں، جنھوں نے کھانا نہیں کھایا ہے یا جنھیں نیند آ رہی ہے، وہ تشریف لے جا سکتے ہیں۔ جو لوگ مشاعرہ سننا چاہتے ہیں، وہ صبر و سکون سے بیٹھ جائیں تاکہ مشاعرہ کا دوسرا دور شروع کیا جائے۔ یہ حربہ بار آور نہیں ہوا۔ لوگوں پر اچھا اثر ہوا ہے۔ ہزار پانچ سو کی بھیڑ چھٹ گئی ہے۔ لوگ پُر سکون ہو گئے ہیں۔ ہر چند بعض بیرونی شعرا مشاعرہ گاہ سے باہر چلے گئے ہیں۔ جناب سید فضل علی صاحب کی جگہ ظ۔ انصاری صدارت کر رہے ہیں لیکن اس دور کے دور میں مجروح سلطان پوری، شہریار، کمار پاشی، پدما سچدیو، بیگم ممتاز مرزا وغیرہ کو بہت پسند کیا گیا ہے۔ ہر شاعر کو پوری دلچسپی اور توجہ سے سنا جا رہا ہے۔ داد کے شور سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دے رہی ہے۔ مشاعرہ کا دوسرا دور واقعی یادگار رہے گا۔ ظ۔ انصاری کو بھی اپنے تکلم و تبسم کے خزانے لٹانے کا موقع ملا ہے۔ میں نے اس دور کے لئے جو غزل منتخب کی ہے اس کے مطلع سے مقطع تک شور قیامت برپا ہے،

بات کرتے ہیں وہ ایک ایسی زباں میں اعجاز
کوئی سمجھے ہی نہیں نامہ نگاروں کے سوا

پر لوگ اور بھی قابو سے باہر ہو گئے ہیں۔ چونکہ سامعین کی پُر شور داد سے فطرتاً لہجہ بلند سے بلند تر ہوتا گیا ہے۔ اس لئے قلب پر ناگوار اثر پڑا ہے۔ کئی کئی بار ایک ایک شعر کو پڑھنا پڑا ہے۔ غزل کے ختم ہوتے ہوتے گر جانے کی نوبت آ گئی ہے۔ خواجہ احمد عباس نے سہارا دیا ہے، نفس تیز ہے۔ خواجہ صاحب نے پانی منگایا ہے۔ تکیہ کے سہارے کچھ دیر بے سُدھ رہا ہوں۔ جسم سے پسینہ بہہ رہا ہے۔ عباس صاحب کہہ رہے ہیں، آئندہ کبھی اتنے زور سے نہ پڑھئے گا۔ مشاعرہ جاری ہے۔ کمار پاشی دوبارہ پڑھنے کے لئے آئے ہیں۔ ہر شاعر کو اس کے فکر و فن کے مطابق ڈھیروں داد ملی ہے۔ اب کوئی شاعر پڑھنے کے لئے باقی نہیں ہے۔ مگر سامعین اپنی جگہ سے ہلنے کا نام نہیں لے رہے ہیں۔ یکایک ظ۔ انصاری نے اعلان کیا ہے کہ اب میں خواجہ احمد عباس صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ نثر میں شاعری فرمائیں۔ خواجہ احمد عباس دھواں دھار تقریر کر رہے ہیں۔ وہ مشاعروں کی اہمیت اور خصوصیت پر اظہار خیال کر رہے ہیں۔ ان کے ایک ایک جملہ پر تالیاں بج رہی ہیں۔ خواجہ احمد عباس کی تقریر پر شب کے ڈیڑھ بجے یہ یادگار محفل مشاعرہ ختم ہو گئی ہے۔

۲ مارچ کو صبح سب ہی کافی دیر میں بیدار ہوئے۔ ناشتہ کے لئے بھی دیر میں جمع ہو سکے۔ سب کے سروں سے ذمہ داری کا بوجھ اتر گیا ہے۔ ۹ بجے ہوٹل کا ڈائننگ ہال پھر گونجنے لگا ہے۔ منتظمین بھی ہیں، جناب غلام رسول ریزرو تشریف لے آئے ہیں۔ سب ہی کے چہرے کھلے ہوئے ہیں۔ بمبئی کے سہ روزہ ادبی پروگرام کی کامیابی پر سب مسرور ہیں۔ اس ادبی پروگرام کو کامیاب بنانے کے لئے جنھوں نے دن رات محنت کی، اپنا وقت دیا، ان میں پروفیسر رام ناتھ شاستری، شریمتی شکنتلا ڈوگرہ، شریمتی تاج بیگم، مدن چوپڑہ، سکریٹری نمائش کمیٹی، وید بھسین، محمد شفیع قریشی ایڈمنسٹریٹو آفیسر انڈسٹریز، اوم پرکاش گپتا، ٹریڈ ایجنٹ بمبئی، جتیندر ورما ڈپٹی سکریٹری کلچرل اکیڈمی، بشیر احمد، سرینڈر گپتا، آر۔ این بھان، کے ایل گپتا، شمشیر سنگھ، شوبودھی اور شاہد بڈگامی وغیرہ کے نام ذہن میں رہ گئے ہیں۔ قیصر قلندر میرے پاس ہی بیٹھے ہیں۔ ان سے دیرینہ تعلق ہے۔ یہ کشمیر کے تہہ دار شاعر ہیں۔ نظمیہ شاعری میں کافی تجربے کئے ہیں۔ فن موسیقی میں بڑی معلومات رکھتے ہیں اور اس موضوع پر اچھے مضامین لکھ چکے ہیں۔ سری نگر کے رہنے والے ہیں اور آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہیں۔ ملازمت سے ریٹائر ہو چکے ہیں۔ دیر تک باتیں ہوتی رہی ہیں۔

شاعر جمی

ناشتہ کے بعد جموں ریڈیو والے آکر چند ادیبوں کو لے گئے ہیں۔ خواجہ احمد عباس، کرشن چندر، سردار جعفری، ظ۔ انصاری، سلمیٰ صدیقی کے درمیان ایک مختصر سا ۱۵ منٹ کا مذاکرہ ہوا ہے۔ ترقی پسندی، کمٹ منٹ اور جمہوریت کے مسئلہ پر ظ۔ انصاری نے پھر اپنے پرانے مقالے کی روش اختیار کی ہے۔ نرمی اور گرمی کے ساتھ براہ راست یہ بحث جموں ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہو رہی ہے۔

اس کے فوراً بعد کرشن چندر نے، جو پہلے ہی سے بہت جذباتی ہو رہے تھے، ایک پیغام پاکستانی ادیبوں کے نام نشر کیا، اور اس میں نام بہ نام سب کو خطاب کرتے ہوئے جموں آنے والے ادیبوں اور شاعروں کا تذکرہ کیا ہے۔ پیغام نشر کرتے وقت کرشن چندر کی آواز بھرّا گئی ہے اور پنجابی بولتے بولتے وہ اُردو کی لہر میں رواں ہو گئے ہیں۔

میں نے سُنا کہ چند روز بعد اس دوستانہ ریڈیائی پیغام کا جواب غالباً لاہور ریڈیو سے بڑے اہتمام کے ساتھ دیا گیا۔ جموں کے ادبی پروگرام کے سلسلے کا یہ بھی بڑا اہم اور یادگار پہلو ہے۔

جموں ہوٹل میں دوپہر کے کھانے پر کافی ہجوم ہے۔ اس کے بعد کچھ بے تکلفانہ فوٹو گروپ ہوتے ہیں۔ سردار جعفری، خواجہ احمد عباس، ظ۔ انصاری، مجروح سلطان پوری، جاں نثار اختر، عصمت چغتائی، سلطانہ جعفری کی واپسی ابھی وقت ہے۔ ان کے لئے موٹریں تیار ہیں۔ رخصت ہوتے وقت سب ایک عجیب سا درد جدائی محسوس کر رہے ہیں۔ حالانکہ سب ایک ہی شہر سے آئے ہیں اور ایک ہی شہر کو واپس جا رہے ہیں۔ دراصل یہ نتیجہ ہے چار دن کی ہمہ وقت رفاقت کا۔

جموں ہوٹل کی بالائی منزل بھائیں بھائیں کر رہی ہے۔ چند ہی نفوس یہاں رہ گئے ہیں۔ چار بجے شام تک اُچٹی اُچٹی سی نیند آئی ہے۔ کچھ وقت کرشن چندر کے کمرہ میں گذرا ہے۔ کچھ دیر کے لئے شہریار اور عرش ملسیانی آ گئے ہیں۔ واجدہ تبسم اور بیگم ممتاز مرزا بھی تنہائی محسوس کر رہی ہیں۔ شام کی چائے کے وقت ریڈیو کے لوگ آ گئے ہیں۔ آٹھ بجے شب کو ریڈیو اسٹیشن سے کاریں آئیں گی۔ ریڈیو کے مشاعرہ کے بعد کسی دوسری جگہ کھانا ہے۔

جموں ریڈیو پر پہلے بھی دو بار مشاعرہ پڑھ چکا ہوں۔ وہی پُرانی سی عمارت۔ پھیلے ہوئے تنگ کمرے۔ مشاعرہ کے لئے وہی مخصوص ہال۔ موجودہ اسٹیشن ڈائرکٹر شری دویا بھوشن تجربہ کار، با اخلاق اور ادیب دوست ہیں۔ شری بیر کمار ڈوگرہ پروگرام ایگزیکیوٹو نے شعرا کو اپنے کمرہ ہی میں بٹھا لیا ہے۔ ٹھاکر پونچھی مشاعرہ کے انتظامات میں مشغول ہیں۔ چائے پینے کے بعد مقامی اور غیر مقامی شعرا کو ہال میں لے جایا گیا ہے۔ یہاں کرسیوں اور صوفوں پر چار پانچ سو معززینِ شہر بیٹھے ہیں۔ درمیان میں جموں و کشمیر کے گورنر شری بھگوان سہائے تشریف فرما ہیں۔ وہی اس مشاعرہ کے صدر ہیں۔ کرشن چندر، سلمیٰ صدیقی، واجدہ تبسم اور پدما سچدیو بھی ہیں۔ ایک پُر اسرار خاموشی کے بعد وقتِ مقررہ پر مشاعرہ شروع ہوتا ہے۔ اسٹیشن ڈائرکٹر صاحب نے چند افتتاحی جملے کہے ہیں۔ عرش ملسیانی نے بڑے خوبصورت پیرایۂ بیان میں مشاعرہ کی کارروائی شروع کر دی ہے۔ ہر چند اس مشاعرے میں شہریار، کمار پاشی، منظر سلیم، بیگم ممتاز مرزا اور انور مرزاپوری شریک ہیں۔ عرش صہبائی، عابد مناوری، حکیم منظور، فاروق نازکی اور چند دوسرے مقامی شعراء ہیں، لیکن مشاعرہ میں قبرستان کا سا سنّاٹا چھایا ہوا ہے۔ عرش ملسیانی بہت کوشش کر رہے ہیں، نہایت عالمانہ اور چبھتے ہوئے جملے کہہ رہے ہیں مگر مشاعرہ میں گرمی پیدا نہیں ہو رہی ہے۔ اکثر شعرا نے کم عیار و معیار کلام سنایا ہے۔ انور مرزاپوری نے اور بھی بدمزگی پیدا کی ہے کہ وہ ہر مصرع ادنیٰ چار چار بار دُہرا رہے ہیں۔

دس بجے ریڈیو کا مشاعرہ ختم ہوا ہے۔ اوم پرکاش گپتا صاحب ان چند ہمہ وقت ہم ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ رہے ہیں جو اپنا گھر ہوتے ہوئے بھی گھر نہ گئے۔ انہوں نے اپنے سرکاری فرائض کی ادائیگی کے علاوہ، اپنے بمبئی کے تعلقات کو خوب سے خوب نبھایا، اس وقت بھی ہو رہے ہیں۔ انہوں نے اور ٹھاکر پونچھی نے بتایا کہ اس وقت گاندھی نگر میں شری دیارام شاد کی طرف سے

شاعر

اننت ناگ ... کے یہاں شفٹ ہے۔ گاڑیاں پھر بھر گئی ہیں اور گاندر کا کھلا راستہ نظر آ رہا ہے۔ [illegible] واقعی دنیا کے چشمے نکلے ایڈیٹر اور ادبی کلچر کے دیوانے۔ اس وقت میں اوتار کرشن پنڈت اور ان کے اہل و عیال کی میزبانی یاد رہے گی۔ وقت میں امرت ہیوترہ دید کھیسن، بسیط بدہرا، بریش کمار جاجی، ممتاز تبریزی، اوم پرکاش گپتا اور شنکر کو بھی موجود ہیں۔ یہ سب ادب و شعر سے نسبت رکھتے ہیں۔ مقامی شاعروں میں صرف ترکشن صبائی ہیں۔ بیرونی ادیبوں اور شاعروں میں کرشن چندر، ترکشن طیبانی، سلمیٰ صدیقی کملا پاشی، بشیر بدر، واجدہ تبسم، چیپا سچدیو، بیگم ممتاز مرزا، ادا اختر مرزا پوری ہیں۔ تک بگ ۱۲ بجے یہ آخری دعوت طعام ختم ہوتی ہے۔ بعض نوجوان ناؤ دوڑ میں مصروف ہیں۔ انہیں وہیں چھوڑ کر ترکشن طیبانی، کرشن چندر، سلمیٰ صدیقی، واجدہ تبسم، چیپا سچدیو، بیگم ممتاز مرزا اور میں قیام گاہ پر واپس آ گئے ہیں۔

آج ۱۴ اپریل ہے بیگم ممتاز مرزا اور واجدہ تبسم بلین سے واپس جا رہی ہیں۔ بشیر بدر پانچ بجے کی ٹرین سے جائیں گے۔ میں، کرشن چندر، سلمیٰ صدیقی اور ترکشن طیبانی رات کی ٹرین سے۔ واجدہ روانگی کے وقت آبدیدہ ہیں۔ کتنی جلدی آنسو آ جاتے ہیں واجدہ کی آنکھوں میں۔ کرشن چندر کا بلڈ پریشر کچھ بڑھ گیا ہے۔ دن کو دس بجے ڈاکٹر نے دیکھا ہے اور تمام دن آرام کرنے کا پابند بنا دیا ہے رینزو صاحب اور دوسرے منتظمین آ گئے ہیں۔ کافی دیر تک بات چیت ہوتی رہی ہے۔ ادبی اجتماع کے تعلق سے ان کے محسوسات بھی وہی ہیں جو ہم مہمانوں کے ہیں۔ کل جب کوئی بھی نہ ہوگا تو ان سب کا دل کتنا گھبرائے گا۔ حالانکہ نمائش میں چند تفریحی ہنگامے اور بھی ہیں۔ جناب رینزو صاحب اور ان کے رفیق شام کو آنے کا وعدہ کر کے واپس ہو گئے ہیں۔ دوپہر کے کھانے کے بعد گپتا صاحب کے ساتھ محکمۂ اطلاعات کے آفس گیا ہوں۔ ترکشن طیبانی بھی ہمراہ ہیں۔ ڈپٹی ڈائرکٹر انفارمیشن شری ... ڈی سی مہرا سے ملاقات ہوئی ہے انہیں بھی "شاعر" کا قدر داں پایا۔ جموں اور سرینگر بلکہ پورے کشمیر میں "شاعر" دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے۔ افسوس کہ اس سفر میں شری ٹھاکر سدھیر سنگھ صاحب، اسٹیٹ منسٹر سے ملاقات نہ ہو سکی۔ ان سے ملنے کا بڑا اشتیاق ہے۔ وہ اب تک اپنے حلقے سے واپس نہیں ہوئے ہیں۔

سائے سمٹنے لگے ہیں، دل اُچاٹ ہے۔ وقت کاٹے نہیں کٹ رہا ہے۔ ہاں مدتوں بعد برادرم ترکشن طیبانی سے بہت سی باتیں کرنے کا موقع مل گیا ہے۔ کرشن چندر سے دن بھر میں صرف دو بار ہی ملنا ہوا ہے۔ پورا دن آرام کرنے سے وہ نارمل ہو گئے ہیں۔ شام کو ۶ بجے محترم جی۔ این رینزو صاحب تشریف لے آئے ہیں۔ گپتا صاحب، رام ناتھ شاستری صاحب، دید کھیسن عطا شاہد بڈگامی وغیرہ ساتھ ہیں۔ دو کاریں، چار مسافروں اور رخصت کرنے والے میزبانوں کو لیکر جموں اسٹیشن کی طرف رواں ہیں۔ ایئر کنڈیشنڈ کوپے میں پہلے سے ریزرویشن ہو چکا ہے۔ اسٹیشن پر رینزو صاحب اور دیگر الوداع کہنے والوں سے دیر تک گفتگو ہوتی رہی ہے۔ ٹرین کی روانگی میں اب صرف ۱۲ منٹ باقی ہیں۔ سامنے سے ڈاکٹر گیان چند گھبرائے گھبرائے بیوی بچوں کے چلے آ رہے ہیں۔ جموں میں تو ڈاکٹر صاحب پانچ منٹ بھی ملنے کی طرح نہ ملے مگر اس وقت الوداع کہنے اسٹیشن آئے ہیں۔ بہت دیر تک اپنی معذوریوں اور صحت کی خرابی کا ذکر کرتے رہے۔ مجھ سے عمر میں پانچ سال چھوٹے ہیں مگر بوڑھے نظر آتے ہیں۔

ٹرین روانہ ہونے والی ہے۔ سب بغل گیر ہو رہے ہیں اور ٹرین کی ایک ہی حرکت نے سب کچھ نگاہوں سے اوجھل کر دیا ہے۔ چند ہاتھ ہلے ہیں، اور پھر جیسے ——

"خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا"

تاثراتِ جموں

عصمت چغتائی

عجیب طلسم ہوش ربا قسم کی نمائش تھی! جموں شہر کی خلقت ٹوٹی پڑتی تھی۔ جگمگاتی روشنیاں، میری گو راؤنڈ پر کھلکھلاتے بچے، گھبرائی شرمائی لڑکیاں، دانت نکوسے اُن کے گھر والے، کپڑوں کی دکانوں پر خریداروں کے غول، کمبلوں دھسّوں اور سوئیٹروں کے اسٹال پر بھیڑ۔ زخمی سرکس کے ڈیروں پر کیو، چاٹ مسالہ، کولا ڈرنک، بڑھیا کا کاتا، چکنی چکنی جلد والے بیل، چوڑی چکلی دو دھار گائیں، سال کے بارہ مہینے انڈے دینے والی مرغیاں اور اصیل مرغ، اسا سنگو ستانہ اور سرغدکوں کے خون کو گرما دینے والے پنجابی ٹپّے۔

اور علم و ادب کی محفلیں۔ ظ انصاری کا دقیق مقالہ، کرشن چندر کی جادو بیانیاں۔ سردار جعفری کے سنساتے ہوئے اشعار۔ واجدہ تبسم کی چلبلی کہانی۔ اور داد دینے والوں کا شور! ایسا مجمع نہ دیکھا نہ سنا! مگر آنکھوں دیکھا کانوں سنا تب تھوڑا سا یقین ہوا۔

ہندوستان ہی میں نہیں شاید دنیا میں یہ پہلا موقع تھا کہ ملک کی دوسری کارآمد اشیا کی فہرست میں ادیبوں اور شاعروں کو بھی گنا گیا تھا۔ کچھ ناقدین کا خیال تھا کہ یہ علم و ادب کی تضحیک ہوئی۔ پتہ نہیں شاید یہ مویشی بھی دل میں معترض ہوں گے کہ انہیں ادیبوں اور شاعروں کی صف میں گھونس دیا گیا۔ کچھ بھی ہو ادیبوں شاعروں کو یوں چند روز مل بیٹھنے کا موقع مل جانا بجا غنیمت معلوم ہو رہا تھا۔ ناشتے اور کھانے [illegible] ہوتے ہوئے [illegible] یاد آنے گئے جو مجبوریوں کی وجہ سے نہ آسکے تھے۔ پھر وہ اپنے یاد آنے گئے جنہیں موت کے ظالم ہاتھوں نے چھین لیا ہے۔

سرحد سے اتنے قریب ہوتے ہوئے اُن ساتھیوں کی یاد ستانے لگی جنہیں موت سے بھی زیادہ بے رحم ہاتھوں نے جدا کر دیا ہے۔ جوش ملیح آبادی۔ فیض احمد فیض۔ احمد ندیم قاسمی۔ زہرہ نگاہ۔ اشفاق احمد اور نہ جانے کون کون۔ سرحد کے اُس پار کتنے قریب مگر کتنی دور۔

نہ جانے کب یہ بند دروازے کھلیں گے اور ہم پھر جمع ہونگے۔

خواجہ احمد عباس

میں شاعر نہیں ہوں، کوی نہیں ہوں، مگر مشاعرے اور کوی سمیلن سننے ضرور جاتا ہوں خصوصاً مشاعرے۔

میں سمجھتا ہوں کہ مشاعرہ ہندوستان کی ملی جلی کلچر کی سب سے روشن نشانی ہے۔ یہ ہندوستان کی عوامی تہذیب کی گہرائی کا ثبوت ہے کہ ہزاروں آدمی رات رات بھر شاعروں کا کلام سنتے ہیں۔ ایسا دنیا کے اور کسی ملک میں نہیں ہوتا۔ یہ فخر صرف ہندوستان کو حاصل ہے کہ شاعری عوام کی زندگی کا ایک اہم حصہ بن گئی ہے۔

حکومت جموں اور کشمیر کی دعوت پر اُردو کے کتنے ہی افسانہ نگاروں اور شاعروں کو جموں آنے کی دعوت دی گئی تھی [illegible] کی ایوڈی میں وہاں پہنچ گئے۔

[illegible] تھا جس میں [illegible]

ادب اور سماج کے رشتے پر بات چیت اور بحث مباحثہ ہوا۔

اگلے دن صبح کو افسانوں کا پروگرام تھا۔ اب مشاعروں کی طرح کہانیوں کے مشاعرے بھی ہونے لگے ہیں۔ اس پروگرام میں جو تین گھنٹے تک چلتا رہا، اردو، ہندی، پنجابی، ڈوگری اور کشمیری زبان کے افسانہ نگاروں نے اپنی اپنی کہانیاں سنائیں اور چار پانچ ہزار مردوں، عورتوں، لڑکوں لڑکیوں نے بڑے آرام سے بیٹھ کر اُن کو سُنا۔

رات کو مشاعرہ ہوا جس میں دس ہزار کے لگ بھگ سُننے والے موجود تھے جو سردار جعفری کی انقلابی نظموں کی داد دے رہے تھے۔ مجروح سلطانپوری کی حسین غزلوں کی بھی اور اعجاز صدیقی اور بال مکند عرش ملسیانی کے استادانہ اور فن کارانہ شعروں پر بھی سَر دھن رہے تھے۔ ساتھ میں پدما سچدیوا کی خوبصورت ڈوگری نظموں کو بھی دلچسپی بلکہ جوش کے ساتھ سن رہے تھے اور ظ انصاری کے کھاری تنقیدی جملوں کو بھی بڑی دلچسپی سے سُن رہے تھے۔

——— اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ شاعری کا جادو ہی تو ہے جو اتنے مختلف لوگوں کو، بڈھوں کو، جوانوں کو، عورتوں کو، ہندوؤں کو، مسلمانوں کو، سکھوں کو، پڑھے لکھے لوگوں کو اور اَن پڑھوں کو متاثر کرتا ہے، ان کے دلوں اور دماغوں کو جذبات کی ایک ہی لڑی میں پروتا جاتا ہے۔

یہ ہمارے ملک کا بہت بڑا تمدنی خزانہ ہے اور ہماری زبان اُردو کی ایک خوبصورت خصوصیت، جو شاید اس حد تک کسی اور زبان کو نصیب نہیں ہے۔

ظ۔ انصاری

اردو والے تو سارے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں لیکن ریاست لے دے کے ایک ہی رہ گئی ہے جہاں سرکاری سطح پر اُردو لکھنے والوں کی تھوڑی بہت آؤ بھگت ہو جاتی ہے۔ یہ تیسرا موقع تھا کہ میں جموں کشمیر کے اہلِ قلم سے مخاطب ہوا۔ سری نگر میں کشمیر یونیورسٹی کی طرف سے ایک بار (۱۹۶۹ء میں) توسیعی لکچروں کی دعوت ملی تھی۔ اس بار صنعتی نمائش کے سلسلے میں کرشن چندر بمبئی سے اہلِ قلم کی پوری ایک کھیپ بھر کر لے گئے ———

ایمان کی بات یہ ہے کہ جموں والوں کو اُمید سے بڑھ کر پایا۔ خاطر مدارات بھی خوب ہوئی۔ جی خوش ہو گیا۔ چھ اجلاس ہوئے جن میں پانچ تو صنعتی محکمے کے ڈائرکٹر رینزو صاحب کی خوش انتظامی کی بدولت خاصے کامیاب رہے۔ ایک جلسہ یونیورسٹی میں ہمارے دوست ڈاکٹر گیان چند جین نے کرایا تھا۔ نیت نیک تھی لیکن بات کچھ بنی نہیں۔ ادبی نشستوں پر جیسا کہ معمول ہے شاعروں کے فری اسٹائل سے مہر لگائی جاتی ہے، سو یہاں بھی وہی صورت قرار پائی اور اس کی خاطر معیاری شعرا کے علاوہ خوش گلو شاعر بھی طلب کئے گئے تھے۔ مشاعرہ خلافِ معمول رات گئے تک چلا ——— حاضرین کی تعداد اور با موقع داد فریاد سے اگر حجم اندازہ نکلتا ہو تو کامیاب بھی رہا۔

مجھے جلسوں یا مشاعروں میں جانے کا اکثر اتفاق ہوتا رہتا ہے۔ بمبئی میں تو خیر جموں سے کئی کئی گنا بڑے مجمعے لگتے اور سُلجھے جاتے ہیں لیکن جب ادبی تہذیبی مسائل پر زبان کھولنے کا وقت آئے تو یہ خدشہ لگا رہتا ہے کہ نرم و نازک یا باریک بات مجمع کے سروں پر سے تھالی کی طرح تیر جائے گی۔ جموں چھوٹی سی جگہ ہے پھر بھی ادبی مسائل کی جو نوک جھونک پہلے دن (۲۱ مارچ ۷۳ء) چار پانچ سو آدمی کے رُوبرو ڈھائی تین گھنٹے ہوتی رہی ایک تو اس کا معیار اچھا خاصا تھا۔ دوسرے حاضرین ذوق و شوق سے اُس میں شریک رہے۔ تیسرے یہ کہ کھل کر بات کہنے اور سننے کا لطف آیا۔ کوئی باریک نکتہ یا نازک بات برسرِ عام رسوا یا برباد نہیں ہوئی۔

افسانہ خوانی والے اجلاس، شہریوں کے استقبالیہ اور دوسرے موقعوں پر بھی غالباً سبھی مہمان یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ اہلِ جموں میں حالانکہ آج کل اُردو کا رواج نہیں رہا، تاہم صاف ستھرا، خوش مذاق ماحول زندہ ہے۔ نوجوان طلبا، اُبھرتے ہوئے ترقی پسند اور وادی کے اہلِ قلم بھی ان جلسوں میں برابر کے شریک رہے اور ان کے دم سے بحثوں اور مقالہ خوانی کا معیار بہت کچھ سنبھلا رہا۔

وزیر اعلیٰ میر قاسم صاحب نے اپنی انکساری، تواضع، مروّت، دلجوئی اور عملی شرکت سے دیانت دارانہ کوشش کی کہ وہ جنہیں بمبئی کی مصروف زندگی سے نکال کر یہاں تک بلایا گیا

ناصرہ شرما

خوش خوش گھروں کو واپس جائیں۔ سو یہی ہوا بھی۔

بس ایک کمی کھٹکی تھی کہ مقامی ذہانتوں اور صلاحیتوں کے ساتھ گھل مل کر بیٹھنے، تبادلۂ خیال کرنے اور براہِ راست اُنکی سننے کا کوئی موقع نہ ملا۔ ادیب باہر کا ہو یا اندر کا، جب تک آپس میں بحث مباحثہ، گرما گرمی اور تھوڑی بہت تو تکار نہ کرلے، آتشِ سیال ہضم نہیں کر پاتا۔ اور جب وہ دونوں کو ہضم کرنے کا جگرا پیدا کر لیتا ہے تو تر و تازہ ادب اُگلنے لگتا ہے۔ یوں ہوتا چلا آیا ہے۔ ہم اِس بار اپنے قبیلے کے مقامی جرگے سے ذرا کٹے کٹے رہے یا سینگ نہیں لڑا سکے تو بڑی وجہ یہی کہ پیار بھری نظروں سے ایک دوسرے کو تکتے رہنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ مل بیٹھنے کے جو بے تکلف اکھاڑے ہوتے ہیں وہ نہیں ملے۔ دراصل یہ اجلاس تھے ہی مل بیٹھنے کی خاطر۔

ادبی کانفرنسیں جن میں موضوعات تقسیم ہوں، سیمینار اور سیمپوزیم ہوں، ان کی ترتیب وار تنظیم کی جائے۔ خود ادبی اداروں کی طرف سے ہی کی جاتی ہیں — یہاں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ یہاں کسی موضوع پر روشنی ڈالنے کی خاطر اتنے سارے اہلِ قلم جمع نہیں کئے گئے تھے بلکہ یہ اجلاس ایک طرح سے تفریحی پروگراموں کا معیار اونچا کرنے کا ذریعہ تھے اور اسی حیثیت سے کامیاب رہے۔ جو توقع کی جا رہی تھی اسی نظر سے اِن اجلاسوں کو دیکھا جائے تو نکتہ چینی کی گنجائش نہیں رہتی بلکہ ایک دیانت دارانہ سنجیدہ کوشش تھی جس کی داد ملنی چاہیئے۔ میری طرف سے شکریہ پہنچا دیجئے۔

سلمیٰ صدیقی

جموں میں اُردو ادیبوں کی کانفرنس کی یاد بڑے خوشگوار ماحول کی یاد دلاتی ہے — ۲۰ مارچ ۱۹۷۳ء کو جموں کے ہوٹل میں بمبئی اور دہلی کے ادیبوں اور شاعروں کے قافلے نے ڈیرے ڈالے۔ — برسوں بعد اتنے بہت سارے ادیب اور شاعر یکجا نظر آ رہے تھے۔ آج بھی ذہن پہ تھوڑا سا زور ڈالتی ہوں تو ہوٹل کے سائبان میں عصمت چغتائی، سردار جعفری، جاں نثار اختر، مجروح سلطانپوری، ظ انصاری، اعجاز صدیقی، واجدہ تبسم، ممتاز مرزا، خواجہ احمد عباس اور کرشن چندر چلتے پھرتے، ہنستے بولتے اور ایک دوسرے سے گفتگو کرتے نظر آتے ہیں۔ بیچ بیچ میں شمیم اور شمیم بھی کسی نہ کسی شخص سے بحث کرتے ہوئے یا کسی نہ کسی موضوع سے الجھتے ہوئے نظر آجاتے تھے۔ پدما سچدیو کا تو جموں میکہ ہی ہے اور وہ ہم سب مہمانوں کو دیکھ بھال اسی طرح کر رہی تھیں جیسے لڑکی اپنے سسرال والوں کی خاطر مدارات اپنے میکے میں کرتی ہے۔

جموں اور کشمیر کے چیف منسٹر سید میر قاسم صاحب نے بڑے خلوص اور دریا دلی سے ادیبوں کی پذیرائی کی۔ کانفرنس میں گئے ہوئے مندوبین کو موصوف نے بڑی شاندار دعوت میں مدعو کیا اور کشمیر کی روایتی ضیافت (وازوان) کا بڑے پیمانے پر اہتمام کیا۔ سید میر قاسم صاحب نے حتی الامکان ہر مہمان پر ذاتی اور خاص توجہ صرف کی جو اتنی بڑی دعوت میں عام طور سے ممکن نہیں ہوتی ہے۔!

جموں میں ہمارے میزبان خصوصاً جناب غلام رسول ریشزدو صاحب نے جس مشہور و معروف ایشیائی مہمان نوازی کا بڑے وسیع پیمانے پہ ثبوت دیا اور اس نازک ذمہ داری کو نباہنے میں ریشزدو صاحب کی اہلیہ محترمہ نے کانفرنس کے دوران جس تندہی، خلوص اور خندہ پیشانی سے اپنے محترم شوہر کا "ہر رنج و راحت" میں ساتھ دیا، اس کے پیشِ نظر ہر مشرقی شوہر پہ یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنی "نصفِ بہتر" کے بہترین اور شریفانہ اوصاف کا کھلے عام اقرار کرے۔ جموں کے قیام کی یاد خوبصورت یادوں کی فہرست میں تازہ ترین اضافہ ہے اس لئے بہت دنوں تک اُس کی یاد آتی رہے گی۔

جاں نثار اختر

جموں میں اُردو، ڈوگری اور پنجابی ادیبوں اور شاعروں کا اجتماع نہ صرف کامیاب رہا بلکہ میں سمجھتا ہوں اِس اجتماع نے ایک راستہ بھی دکھایا ہے کہ ہندوستان کے مختلف صوبوں میں جہاں مختلف زبانیں بولنے والے عوام اور اُن زبانوں کے ادیب و شاعر رہتے بستے ہیں، اس طرح کے ملے جلے ادبی جلسوں کے ذریعے ایک دوسرے سے قریب آسکتے ہیں اور ہر قسم کے لسانی تعصب اور لسانی تنازعہ کو دُور کر سکتے ہیں۔ یہ اقدام نہ صرف اور علاقوں کی حد تک بلکہ بالواسطہ ہمارے پورے ملک میں ایک خوشگوار اور

خوش مزاج ویسٹرن مزاج سے سکتا ہے اور ہمارے قومی یک جہتی کے خواب کو بھی تکمیل میں بڑی حد تک مدد دے سکتا ہے۔

جموں کی اس کانفرنس میں اُردو ادب کی چند اہم شخصیتوں کو خصوصی طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ جن اُردو ادیبوں نے اس کانفرنس کو کامیاب بنانے میں نمایاں حصّہ لیا اُن میں سرِ فہرست ذو الفقار کا نام ہے۔ افسانے کے اجلاس میں کرشن بسلی صدیقی اور واجدہ تبسم خوب چمکے اور مشاعرے میں اعجاز صدیقی اور سجاد جعفری کو کافی سراہا گیا۔ لیکن مشاعرے کو صحیح معنوں میں لوٹ لے جانے والی ڈوگری زبان کی شاعرہ پدما سچدیو تھیں۔

اس اجتماع کی کامیابی کا سہرا ہمارے رینزد صاحب کے سر ہے اور جب سہرا شوہر کے سر باندھا جائے تو اُن کی بیگم تاج بیگم کے سر بھی یہ سہرا باندھا جانا چاہیئے۔ میں اُن کو مبارکباد دیتا ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ ان کی لیاقت و ذکاوت' ان کے اخلاق و شرافت اور اُن کی تنظیمی صلاحیت کا ہر شخص معترف نظر آتا تھا۔ اس کانفرنس اور اس خوبصورت اجتماع کی یاد بہت دن تک سبھی کے دلوں میں باقی رہے گی۔

واجدہ تبسّم

میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے ہیں۔ میں آنسو روکنا چاہتی ہوں تو سسکیاں نکل پڑتی ہیں۔

آج ۲۴ مارچ سنہ ۸۰ء ہے۔ جموں سے ہماری واپسی کا آخری دن۔ ہوائی جہاز اُڑنے میں چند ہی گھنٹے باقی ہیں۔

لیکن میرے آنسو ---؟

پدما سچدیو میری ہنسی اُڑا رہی ہے ---

"دیکھو بھئی یہ بے چاری سسرال جا رہی ہے نا۔ اسی لئے یوں پھوٹ پھوٹ کر رو رہی ہے۔ اِسے میکہ بے حد یاد آئے گا۔"

میکہ --- کتنا پیارا لفظ ہے یہ میکہ --- محبت، مٹھاس اور سُہانی یادوں سے عبارت --- وہ یادیں جو زندگی بھر ساتھ نباہے جاتی ہیں --- وہ کشش جو آگے بڑھتے ہوئے قدموں کو بھی لمحہ لمحہ پیچھے پلٹ پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کر دیتی ہیں --- ہاں یہ جموں میرا میکہ ہی تو بن گیا تھا ---!

اوپر موٹل میں کرشن بھیا کچھ بیمار سے لیٹے ہوئے ہیں۔ موٹل میں لفٹ نہیں ہے۔ ساری سیڑھیاں انہیں پیدل ہی طے کرنی ہوتی ہیں۔ آج ڈاکٹر نے اُن کا چیک اپ اس وقت کیا جب وہ سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ ظاہر ہے بلڈ پریشر کچھ ہائی ہو گیا ہو گا۔ ڈاکٹر نے انہیں آرام کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ وہ لاکھ کہہ رہے ہیں کہ نہیں بھئی میں اچھا ہوں۔ مجھے لیٹنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی ہے۔ لیکن ڈاکٹر اور سلمیٰ آپا نے اُنہیں اُٹھنے نہیں دیا ہے۔ وہ لیٹے ہوئے ہیں۔ جہاز کی اُڑان کا وقت قریب ہے۔ میں کرشن بھیا سے ملنے ان کے کمرے میں جانا چاہتی ہوں لیکن کیسے جاؤں ---؟

آنسو!

یہ پچھلے سات دن کیسے خوبصورت تھے --- خوابوں کی طرح حسین' اچانک مل جانے والی خوشیوں کی طرح ناقابلِ یقین!۔ بمبئی کے تقریباً سارے ہی نامی گرامی ادیب و شاعر سوائے عینی آپا (قرۃ العین حیدر) اور ساحر لدھیانوی کے، جموں آئے ہوئے تھے۔ آج سے کوئی بارہ سال قبل جب میں بیاہ کر بمبئی آئی تو اِن سبھوں نے مجھے وہ پیار اور محبت دی کہ میں پیچھے چھوڑ آنے والے میکے کو اک ذرا دیر کے لئے بھول سی گئی --- ہم بمبئی میں بھی آپس میں ملتے رہتے ہیں' لیکن یہاں اُردو ادیبوں کی کانفرنس میں جو سب ادیب و شاعر ایک ہی جگہ "جموں موٹل" میں جمع ہوئے تو بس کسی شادی اور برات کا سا مزہ آ گیا --- بمبئی سے چلتے وقت میں سخت افسردہ تھی۔ اپنی بارہ سالہ شادی شدہ زندگی میں میں اپنے میاں کو چھوڑ کر اتنی دُور کا تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بمبئی ہی میں کبھی بااندرہ تک بھی اکیلی نہیں گئی اور اب سوال آ پڑا تھا آٹھ سو کلو میٹر دُور جانے کا --- میرے میاں نے میری سخت مُخالفت بند ھائی "بھئی دیکھو خدا کے لئے یہ رونا دھونا بند کرو --- تم تو اپنے عزیزوں میں جا رہی ہو --- میکے کی سی بات ہے۔"



[illegible] پر ہاتھ رکھ کر پوچھا [illegible] کیا واقعی یہ یادیں
ذہن سے مٹ بھی سکتی ہیں۔ یا آج میرے میکے سے مجھے
آواز دی ہے۔ میں آ جاؤں۔ !

میرے ساتھ عصمت آپا تھیں۔ اُن کی طرح چاہنے والی
اور سہیلی کی طرح دل لگی ۔۔ پدما سچدیو ڈوگری کی مشہور شاعرہ!
جو بمبئی سے چلتے وقت صرف پلین میں میری ہمسفر بنی اور اپنی
محبت سے بہنوں کی طرح یوں مجھ سے دل مل گئی کہ پھر بعد میں
مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ وہ کوئی اور تھی۔ ایسا لگا میری پانچویں بہن
ہے بچپن کی ساتھی۔۔ پھر جو جموں پہنچے تو ایک سے بڑھ کر
ایک مہربان صورت!

صبح ہی صبح جب بیرا بیڈ ٹی لیکر ہوٹل کے کمرہ نمبر ۴۰۵
میں داخل ہوا اور میں باہر نظر ڈالوں تو دیکھوں اِدھر سے
شہنشاہِ ادب مسکراتے ہوش کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اُن کے
پیچھے اپنی متوالی چال چلتی سلمیٰ آپا چلی آ رہی ہیں۔ یہ سردار بھائی
(سردار جعفری) ہیں جو اُردو شاعری کے عظیم ستون ہیں۔۔۔
جو پلٹ کر دیکھوں تو مجروح بھائی، ظ۔ انصاری آپس میں
ہنسی مذاق کر رہے ہیں۔ میری عصمت آپا اپنی من موہنی
سہیلی سلطانہ آپا کے ساتھ خوش خوش چائے پیتی نظر آ رہی
ہیں۔ جاں نثار اختر اپنی مخصوص ادا سے سگریٹ جھٹکتے
مسکراتے نظر آ رہے ہیں۔ اعجاز صدیقی اپنی بزرگانہ شان سے
ہر ایک سے پوچھ رہے ہیں "کہیے نیند لگی یا نہیں۔ سردی
قابل برداشت ہے یا نہیں"

پدما سچدیو جموں کی بیٹی ہے۔ نو دس بجتے ہی وہ ہوٹل
چلی آتی ہے اور ہمیں بار بار جتاتی ہے کہ "دیکھو تم سب لوگ
میرے میکے میں ہو۔ یعنی میرے گھر آئے ہوئے ہو۔ کوئی تکلیف
ہو تو بتانا۔۔ !" کیونکہ بیشتر شاعر ادیب بیمار اور مضمحل تھے۔

کانفرنس سے ایک دن پہلے عباس بھائی (خواجہ احمد
عباس) بھی آ گئے۔ کانفرنس شروع ہوئی اور سرے سے
ہنگامہ پچ گیا۔ ہر محفل میں [illegible] شمیم صاحب (شمیم
احمد شمیم) [illegible] ایک محفل میں
مقابلہ [illegible] کی محفل

[illegible] میں نے اپنا افسانہ "آزرن" پڑھا۔ عصمت
آپا نے مجھے [illegible] سے اتنے زور سے گلے لگا لیا۔ کرشن بھیا،
سردار بھائی، مجروح بھائی، عباس بھائی، اعجاز بھیا، ان
لوگوں کے دلوں میں میرے لئے کتنا پیار ہے، اس کا صحیح
اندازہ مجھے اسی دن ہوا۔ باری باری سب نے مجھے
مبارکباد دی۔۔ ظ۔ انصاری، سلمیٰ آپا، سب سے بڑھ کر
عباس بھائی۔ شمیم صاحب ان سب لوگوں نے مجھے کتنا
سراہا۔ یہ میرے میکے کے پھول ہیں، خدایا انہیں سدا مہکتا
مسکراتا رکھنا۔

اور آج ۲۴ مارچ ہے۔ کل کے پلین سے عصمت آپا
سلطانہ آپا۔ سردار بھائی۔ عباس بھائی۔ مجروح بھائی۔ جاں
نثار اختر۔ ظ۔ انصاری سب جا چکے ہیں۔ پدما ۲۷ کو جائیگی۔
آج میں اور ممتاز مرزا جا رہے ہیں۔ سلمیٰ آپا، کرشن چندر
اور اعجاز صدیقی صاحب شام کی گاڑی سے روانہ ہوں گے۔

میرا سامان نیچے جا چکا ہے۔ اب مجھے بھی جانا ہے۔
مگر یہ آنسو! میں اپنے دل کو سمجھاتی ہوں "یہ سب بمبئی
ہی میں رہنے والے لوگ ہیں، تم ان سے وہاں بھی تو مل سکتی
ہو۔ نا بے وقوف واجدہ بی بی ۔۔"

میں دھیرے سے دروازہ کھول کر کرشن بھیا کے کمرے
میں داخل ہوتی ہوں۔۔ وہ مجھے روتا دیکھ کر سخت پریشان
ہو جاتے ہیں۔ سلمیٰ آپا الگ بدحواس سی کھڑی ہیں۔

اُردو ادب جتنا خوش نصیب آج ہے، آج سے
پہلے کبھی نہ تھا۔ کیسے کیسے رکھوالے اور پاسبان اسے میسر
ہیں۔ میں ان کی جدائی کے لئے نہیں روتی ہوں ۔۔ میں
یوں روتی ہوں کہ خدا میرے آنسوؤں کا نذرانہ قبول کر لے
اور ان سب کو حیات جاودانی عطا کر دے۔ یہ لوگ کتنے عظیم
کتنے قیمتی ہیں، اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ یہ وہ دانشور
ہیں جو ہزار قوم میں ہوتے ہیں۔ وہ لوگ جنہوں نے [illegible]
[illegible] میر قاسم صاحب [illegible]
[illegible] کشمیر کے [illegible]
[illegible] قابل [illegible]

دیتے ہوئے شاہ پیر کو ایک جگہ جمع کر دیا۔ کاش مجھے کسی ایسی بولی کا پتہ چل جاتا جو کبھی نہ ختم ہونے والی زندگیوں کی حنا ہوتا تو فقر عمر واسطے شوق اور اپنی ساری جھولی بھر لیتی۔

بچپن میں ہمارے گھر میں بجلی نہیں تھی۔ سر شام جب چراغ جلائے جاتے اور اس آنگن سے اُس آنگن لیجائے جاتے تو کبھی برسات کی ہواؤں سے کبھی گرمیوں کی شاموں کے تند و تیز جھونکوں سے اور کبھی جاڑوں کے ٹھٹھرتے پالا مارتے تھپیڑوں سے وہ چراغ بجھنے کو ہو جاتے ۔۔ ایسے میں ہماری اماں بی کہیں سکتی تھیں ۔۔ "بی بی چراغ کو اوٹ میں لیکر دل ہی دل میں کہو اللہ کا چراغ، اللہ ہی پر روشن ۔۔ تو وہ کبھی نہیں بجھے گا" ۔ اسے عدے بڑھتی ہوئی خدا پرستی ہی کہیے کہ واقعی اس طرح شدید ہواؤں میں بھی وہ چراغ کبھی نہ بجھتے اور اپنی منزل کو پہنچ جاتے۔

آج میرا جی چاہتا ہے اپنے آنچل کی اوٹ میں ان سارے دہکتے چمکتے چراغوں کو چھپا چھپا لوں اور دھیرے دھیرے کہوں ۔۔

"اللہ ۔۔ یہ چراغ کبھی نہ بجھیں ۔۔"

"اللہ ۔۔ یہ چراغ سدا جلتے رہیں ۔"

▲

زرِ سالانہ ختم ہونے کی اطلاع

آپ کا سالِ خریداری مئی ۔۔۔ میں ختم ہو چکا ہے۔ یہ تازہ شمارہ آپ کی مدتِ خریداری کا آخری شمارہ ہے۔ از راہِ کرم آئندہ سال کے لئے بعجلت دس روپے منی آرڈر کے ذریعہ بھیج کر ممنون فرمائیے۔ اُمید کہ آپ تجدیدِ خریداری سے سرفراز فرمائینگے ۔۔ اگر آپ منی آرڈر نہ بھیج سکیں تو دفتر کو وی پی بھیج دینے کی ہدایت کیجیے۔ اگر نئے سال کیلئے تجدیدِ خریداری منظور نہ ہو تو بھی ایک خط کے ذریعہ اطلاع دیجیے۔ اگر آپکی طرف سے جواب موصول نہ ہوا اور زرِ سالانہ بھی نہ آیا تو شاعر کی روانگی روک دی جائے گی۔ ۔۔ منیجر

اختر بستوی

دُوریاں

تفرقے مذاہب کے، ملک و قوم کے جھگڑے
کشمکش مقاصد کی، بغض و کینہ و رنجش
گاہ وجہِ آویزش مسئلہ جماعت کا!
اختلاف کا باعث گاہ فرد کی خواہش
یُوں تو ساتھ رہتے ہیں لوگ دہر میں ہر جا
اور بزعمِ خود اِن کے دل بہت کُشادہ ہیں
سچ مگر یہ ہے اختر وارثانِ آدم میں
قُربتیں بہت کم ہیں، دُوریاں زیادہ ہیں

اسیری

صدیاں میرے پیچھے تھیں صدیاں میرے آگے ہیں
میں وقت کے نرغے سے نکلوں تو بھلا کیونکر؟
زنجیر کے حلقے ہیں یہ شام و سحر گویا
ملتا نہیں چھٹکارا اِن سے کسی قیمت پر
ایّام کا اک زنداں میں نے تو اُسے جانا
جو سب کی نگاہوں میں مستقبل و ماضی ہے
پاؤں گا نہ آزادی ہرگز کبھی دنیا میں
شاید مری ہستی کا مقصد ہی اسیری ہے

شوکت پردیسی

نیا موڑ

ہر نفس اک نئے تصوّر سے!
میں اُمیدوں کے جال بُنتا ہوں
اپنے ہر روز کے تجربوں پر
غور سے دل کی بات سنتا ہوں
اور پھر گلشنِ تصوّر میں
کامیابی کے پھول چُنتا ہوں

شام ہی سے مرے تصوّر میں!
زندگی کا چراغ جلتا ہے
اک نیا موڑ ڈھونڈتا ہوں میں
اک نیا راستہ نکلتا ہے
اُس تصوّر کو آفریں جس سے
کاروبارِ حیات چلتا ہے،

ش۔ نذیر الدین

آٹھ گیلن پانی

سیٹھ ہیرالال نے بوتل میں بچی ہوئی تمام شراب ایک ہی گھونٹ میں پی کر بوتل ٹیبل پر لڑھکا دی اور سیٹھ ہیرا چند کی پیٹھ پر ایک زور دار دھپ رسید کرتے ہوئے قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ سیٹھ ہیرا چند نے بھی اپنی ہنسی سے ہیرالال کے قہقہہ کا ساتھ دیا۔ سیٹھ ہیرالعل کی توند ان کے قہقہے کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ دونوں کے ہاتھوں میں تازہ اخبار تھا۔ اچانک سیٹھ ہیرا چند نے اپنی ہنسی کو بریک لگاتے ہوئے اخبار کے پہلے صفحے کی طرف اشارہ کرکے ایک گندی سی گالی دی۔

ہیرالعل نے کہا

”کیا ہوا“

”سالی اس خبر کو پڑھو“ ہیرالعل نے کہا

”تم ہی پڑھو یار میں سنتا ہوں“ ہیرا چند نے اخبار رکھتے ہوئے کہا

”کل کسی ہوٹل میں ایک کسان نے کھانا کھایا۔ کھانا کھانے کے بعد اس نے کاؤنٹر پر پہنچ کر بل دینے کی بجائے یہ کہا کہ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ باہر میرے دو بیل بندھے ہوئے ہیں کھانے کے بل کے بجائے تم انہیں لے لو! ——— اور اس ہوٹل کے بیوقوف مالک نے اسے ایسے ہی جانے دیا۔ سالا اگر میرے ہوٹل میں کھانا کھاتا تو بتاتا“ سیٹھ ہیرالعل نے پھر ایک بھرپور قہقہہ لگاتے ہوئے کہا

”چھوڑو یار لٹے کیا کرتے ہو، ذرا اس خبر کو بھی تو پڑھو“ انہوں نے اخبار ہیرا چند کے سامنے ڈال دیا۔ بڑی سرخی میں لکھا تھا۔

”ایک راشن کارڈ پر آٹھ گیلن پانی!“

سیٹھ ہیرا چند نے پانی کی شان میں ایک گندی گالی دیتے ہوئے بیزاری سے کہا۔

”مگر ہمیں اس سے کیا فائدہ۔ اپنے مطلب کی بات کرو نا یار“ ہیرالعل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”سیٹھ ہیرالعل کبھی اپنے نقصان کی بات نہیں کرتا۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ میرے گھر میں ایک کنواں ہے اور اس کا پانی میٹھا ہے اور سنو ان کی کیا سے ان دنوں اس میں پانی بہت ہے!“

”کیا؟“ سیٹھ کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ انہوں نے صوفے پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

”تو کیا تم پانی بھی بلیک کروگے؟“ ہیرالعل ہنس پڑا۔

”اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ یہاں اناج سے لے کر سینما کی ٹکٹیں تک بلیک ہوتی ہیں۔ پھر اگر پانی بھی بلیک ہو تو کیا برا ہے؟“ دونوں ہنسنے لگے۔ سیٹھ ہیرا چند ہنستے ہوئے اٹھ گئے۔ اور ہیرالعل سے اجازت لے کر چلے گئے۔

سیٹھ ہیرالعل نے اپنے دونوں پیر راؤنڈ ٹیبل پر پھیلا دیئے اور اپنے نوکر کو آواز دی۔ آواز کے ساتھ ہی نوکر کمرے میں داخل ہوا۔ ہیرالعل نے کہا:

”کہاں مر گیا تھا بے رامو! سالے چل شراب لا“ رامو نے ریفریجریٹر سے شراب کی بوتل نکال کر ٹیبل پر رکھ دی۔

سیٹھ جی نے کہا:

[illegible]

"سیٹھ جی آتے ہی ہوں گے وہ [illegible] چلے گئے ہیں"

"کس لئے؟" سیٹھ نے رامو کی طرف گھور کر دیکھا۔

"سنا ہے کہ چوک پہ ایک کارڈ پر آٹھ گیلن پانی مل رہا ہے میں جا کر آتا ہوں۔ گھر میں پینے کو پانی نہیں ہے۔"

سیٹھ ہنس پڑے

"اچھا اچھا جا، مگر جلدی آجانا"

رامو سیٹھ کو پرنام کر کے چلا گیا۔

اُن دنوں گجرات، بہار اور راجستھان ڈسٹرکٹ میں قحط پڑا تھا کھیت بنجر پڑے تھے۔ جانور بھوک پیاس سے دم توڑ رہے تھے۔ انسانوں اور جانوروں کی حالت ایک سی تھی۔ انسانوں سے بُرا حال جانوروں کا ہے کیوں کہ قحط آیا بھی ہے تو صرف غریبوں پر۔ دُنیا میں بستی بھی بنائی ہیں وہ بوسیدہ اور شکستہ جھونپڑوں کا رُخ کرتی ہیں۔ اونچی اونچی سنگین دیواریں پھاندنے کی اُن میں طاقت نہیں ہوتی ـــــ اور رامو اس قحط زدہ علاقے کا ایک جانور ہے۔ دوسرے اس جیسے جانوروں کی طرح وہ بھی قحط کی زد میں آکر بلک رہا ہے۔ اناج اور پانی کے لئے ترس رہا ہے اور آسمان دُور دُور تک صاف اور روشن ہے!!

سورج کو سر پر اٹھائے وہ قطار میں آٹھ گیلن پانی کیلئے کھڑا تھا۔ قطار شیطان کی آنت کی طرح لمبی ہوتی جا رہی تھی۔ اُسے کھڑے ہوئے دو گھنٹے سے زیادہ ہو چکے تھے مگر ابھی تک اُس کا نمبر نہیں آیا تھا۔ جن کا نمبر آیا تھا وہ آٹھ گیلن پانی لے کر خوش خوش جا رہے تھے۔ دُور کہیں ریڈیو پر فلمی گیت بج رہا تھا۔

پانی رے پانی تیرا رنگ کیسا؟
دُنیا بنانے والے رب ـــ جیسا!

رامو نے سوچا واقعی پانی کا تو کوئی رنگ ہی نہیں ہوتا۔ کیا دنیا بنانے والا پانی جیسا ہوتا ہے۔ مگر نہیں یہ گیت غلط ہے۔ بھگوان پانی جیسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اگر بھگوان پانی جیسا ہوتا تو لوگ اُس کے لئے تڑپتے نہیں۔ بھلا بھگوان کے لئے آج تک کون ترسا ہے!۔ اچانک [illegible] سیٹھ جی کی طرف چلا گیا۔ کیوں کہ وہ اُن سے صرف دو گھنٹے کی چھٹی لے کر آیا تھا۔ اپنی نوکری کا ڈر اُسے ستانے لگا۔ ایک غریب کے ذہن میں ایک ہی مسئلہ تو نہیں ہوتا کہ اس پر سوچ کر اُس کا کوئی حل نکال سکے۔ رامو پریشان ہو گیا۔

اچانک اعلان ہوا کہ پانی ختم ہو گیا ہے۔ اب پھر کل ہی مل سکے گا۔ قطار میں کھڑے ہوئے لوگ چیونٹیوں کی طرح منتشر ہو گئے۔ رامو بھی اپنا خالی گھڑا لے کر چل پڑا۔ اب اُس کے ذہن میں پھر سے پانی کا مسئلہ اُبھر آیا تھا۔ اب کیا ہوگا؟ اگر پانی نہ ملا تو میرے بچے پیاس سے مر جائیں گے ...... اچانک اس کے ذہن میں سیٹھ جی کا کنواں اُبھر آیا۔ اس خیال کے ساتھ ہی اُس کے دل کو ایک عجیب سا سکون محسوس ہوا۔ وہ گھڑا لے کر سیدھے سیٹھ جی کے گھر پہنچا

سیٹھ جی کے گھر پہنچ کر اُسے بہت حیرت ہوئی۔ کچھ دیر تک وہ گم سم سا کھڑا رہا۔ کیوں کہ سیٹھ جی نے کنوئیں پر پہرہ لگا دیا تھا اور وہاں پانی باقاعدہ بک رہا تھا۔ پہرے داروں نے رامو کو وہاں سے دھتکار دیا۔ رامو گھڑا لے کر سیٹھ جی کے پاس پہنچا۔ سیٹھ جی اُسے دیکھتے ہی برس پڑے۔ "سالے پانی لینے گیا تھا یا کنواں کھودنے، دو گھنٹے کی چھٹی لے کر گیا تھا اب آیا ہے۔" رامو سہم گیا۔ اس نے دھیمے لہجے میں کہا

"وہاں بہت بھیڑ تھی سیٹھ جی اور وہاں پانی بھی ختم ہو گیا۔ آپ اجازت دیں تو میں آپ کے کنوئیں سے ایک گھڑا پانی لے لوں۔ گھر پہ میرے بچے پیاسے ہیں"

سیٹھ جی نے اسے جھڑکتے ہوئے کہا

"کیا تیرے باپ کا مال ہے، جانتا نہیں آج پانی کا بھاؤ کیا ہے؟ چل اپنا کام کر۔ تجھے پانی نہیں ملے گا"

رامو وہاں سے مایوس ہو کر چلا آیا۔ وہ جانتا تھا کہ سیٹھ جی جب ایک بار انکار کر دیتے ہیں تو پھر کبھی نہیں مانتے۔ ان کا آگے گڑگڑانا بیکار تھا۔ مجبوراً اُس نے اپنے ذہن سے اپنے پیاسے بچوں کا خیال نکال لیا۔ اور انہیں بھگوان کے بھروسے پر چھوڑ کر اپنے کام میں لگ گیا۔ غریب سے کچھ نہیں بن پڑتا تو وہ سب بھگوان کے بھروسے پر چھوڑ دیتا ہے۔ اس کے باوجود رہ رہ کر اس کے [illegible] معصوم شکلیں اور اُن کے [illegible]

چہرے، اُن کے منہ کے پھٹے پھٹے ہونٹ بار بار اُبھر رہے تھے۔ اور ایک سوال ہتھوڑے کی طرح اُن کے ذہن پہ ضربیں لگا رہا تھا کہ وہ کیا کرے —— اچانک اُس کے ذہن میں چوری کا خیال اُبھرا مگر کنوئیں پہ تو سخت پہرہ تھا۔ وہ چوری کے بارے میں سوچنے لگا۔

آج سیٹھ جی بہت خوش تھے۔ آج ایک ہی دن میں انہوں نے پانی سے بہت روپیہ کمایا تھا۔ اخبار میں چھپی ہوئی "آدم گلین پانی" کی خبروں نے بہت کام آئی تھی۔ وہ خوشی سے جھومتے ہوئے اپنے کمرے میں پہنچے اور اپنے کرتے کے بٹن کھول کر ٹیبل فین آن کرتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئے۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے انہیں اور خوش کر دیا۔ اور خوشی اُن کا دھیان شراب کی طرف لے آئی۔ انہوں نے صوفے سے اُٹھ کر ریفریجریٹر کھولا —— مگر وہاں تو کچھ بھی نہیں تھا۔ ولایتی شراب کی تینوں بوتلیں غائب تھیں! سیٹھ جی غصے سے گرجے۔

"رامو بے" رامو گھبرایا ہوا کمرے میں آیا۔

"یہاں کی بوتلیں کہاں گئیں ——؟" رامو کانپنے لگا۔ اُس نے ہکلاتے ہوئے کہا

"سیٹھ جی .... وہ ...... وہ تو میں لے گیا ——"

سیٹھ جی کا ہاتھ گھوم گیا۔ اور ایک زناٹے دار تھپڑ رامو کے گال پر پڑا۔

"سالے اب تو چوری بھی کرنے لگا!" رامو نے ہاتھ جوڑ دیئے سیٹھ جی نے دیوار پر سے لگا ہوا ہنٹر اُٹھا لیا۔

"بتا کہاں بیچی تو نے وہ بوتلیں ورنہ آج میں تیری چمڑی اُدھیڑ دوں گا" رامو نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

"نہیں سیٹھ جی، میں نے وہ بوتلیں بیچی نہیں"

"پھر کیا تو نے پی لیں"؟

"نہیں سیٹھ جی، میں نشہ نہیں کرتا"

"پھر ——" سیٹھ جی نے ہنٹر والا ہاتھ اوپر اٹھا لیا

"آج میرے بچے صبح سے پیاسے تھے مجھے پانی کہیں بھی نہیں ملا۔ آپ نے کبھی نہیں دیا، کئی نہ کہا کہ اُنہیں یہ شراب [illegible]

جھپٹا کر اُن کا سوکھا ہوا گلا تر کر دوں۔ شراب بھی تو پانی کی طرح پتلی ہوتی ہے نا! اسی لئے میں نے آج شراب سے اُن کی پیاس بجھا دی!!

سیٹھ جی کا اُٹھا ہوا ہاتھ نیچے گر گیا۔ جانے پھر کیسے پگھل گیا۔ انہوں نے ہنٹر ایک طرف پھینکتے ہوئے کہا:

"رامو۔ جا کر کنوئیں سے تجھے جتنا پانی چاہیئے لے جا، اور ہاں۔ منشی جی سے کہہ دینا کہ کنوئیں پر ابھی لگا دیں اور سارے لوگوں کو پانی فری سپلائی کریں" رامو نے آگے بڑھ کر سیٹھ جی کے پیر چھو لئے —— اچانک ہوا تیز ہو گئی۔ بادل گرجنے لگے بجلی کڑکی اور پورے زور و شور سے بارش ہونے لگی۔

سیٹھ جی سہم کر بڑبڑانے لگے۔

"یہ بھگوان بھی بڑا عجیب ہے۔ جب ہم لوگوں کو لوٹتے ہیں تو یہ چپ رہتا ہے اور جب کبھی ہمارے من میں اُن کے لئے دیا آتی ہے تو یہ درمیان میں کود پڑتا ہے ——!!

▲

مناظر عاشق ہرگانوی

اختر بستوی کے قطعات

قطعات کا شمار واضح شاعری (Direct poetry) کی صنف میں ہوتا ہے۔ ایک طرف تو یہ صنف سخن اختصار کی وجہ سے غزل کے قریب ہے کیونکہ شاعر کو اپنے دلی جذبات، مختلف تجربات و مشاہدات کو الگ الگ چار مصرعوں میں بیان کرنا ہوتا ہے اور دوسری طرف بیان میں ابہام اور پیچیدگی نہ ہونے کی وجہ سے اس صنف سخن کی مشابہت نظم سے قریب ہے۔ قطعات کے ذریعہ کسی نہ کسی حیات افروز پیغام کو براہ راست قاری تک پہنچانا ہوتا ہے۔ اس لئے اس میں کنایاتی اور علامتی الفاظ کے بجائے وہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں جو خیال کو واضح طور پر پیش کر سکیں۔

اختر بستوی کے قطعات کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ واردات و کیفیات قلبی اور درون انسانی میں چھپے ہنگاموں کو سلیس اور عام فہم زبان میں پیش کرنا اُن کا طرۂ امتیاز ہے۔ اُنہوں نے اپنے قطعات میں فلسفیانہ و عاشقانہ خیالات کے اظہار کے ساتھ زندگی کے معاشرتی، اخلاقی اور اصلاحی پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اُن کے قطعات میں لذت آمیز احساس سے بھرپور اور تشنگیٔ شوق کے نمائندہ (Gustatory) اور لمسی (Tactile) پیکر ملتے ہیں۔ جن سے حسیاتی آسودگی اور مسرت آمیز بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ یہ حسیاتی آسودگی اور مسرت آمیز بصیرت اختر بستوی کے تخلیقی تجربات ہیں۔ جو حرکت (Movement) کی پہچان ہیں اور ذہن اور شعور کے جوہر (Essence) کا پتہ دیتی ہیں۔ اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو ان پیکروں کا داخلی آہنگ (Inner Rhythm) بہت اہمیت رکھتا ہے اور زندگی سے انسانی رشتے کی پیچیدگی اور تہ داری کے روشن اور تابناک عکس، دائرہ در دائرہ شدت سے محسوس کراتا ہے ؎

ذہن سے دور کیا پار اُترنے کا خیال
جب کنارے بھی بلاؤں کے مقابل دیکھے
اپنی کشتی کی تباہی کا مجھے غم کیسا ہو
میں نے طوفان میں ڈھلتے ہوئے ساحل دیکھے

رات تاریک ہے بکھرا ہے اندھیرے کا فسوں
میری نظروں میں ہے بہتر ہی فطرت کی ادا
کون کہتا ہے کہ خاموش ہے شب کی ظلمت
سن رہا ہوں بڑی دیر سے آہٹ کی صدا

رات کے بعد چراغوں کی کوئی قدر نہیں!
زندگی شمع کی ہوتی ہے اندھیرے میں بسر
کون سمجھے گا اُجالے کے پرستاروں کو!
روشنی اپنی ہی ہے ظلمت کی سدا دست نگر

گرد بکھری ہے یہاں اک محل پہ افشاں بن کر
تیز کرنوں نے بنایا ہے زمیں کو زریں...
دور دیکھے سے طرفہ نظر آتا ہے چمن...
گر کبھی غور سے دیکھو تو خزاں بھی ہے حسیں

آنچ میں ادے کہ محبت تو چبھتی ہے جنوں ! ‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌ ‌‌ عشق کی آنچ جو پہنچے تو آگ میں ڈھل جاتی ہے
حسن محبوب کے معصوم تبسم کی قسم ! ‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌ ‌‌ جس کے تقدیس نگاہوں میں بدل جاتی ہے

زندگی کی چہل پہل، رنگینی اور دل آویزی دل نادان ہی کی بدولت ہے کیونکہ وہ محبت کے نور یقین سے معمور ہے اور صرف نور یقین ہی میں قلب و روح کو حقیقی سکون و مسرت کا جلوہ نظر آ سکتا ہے۔ عقل کو اپنی جدت طرازیوں اور موشگافیوں پر کتنا ہی ناز کیوں نہ ہو، لیکن حیات انسانی کو رنگین و پرکیف بنانے کے لیے اس کے پاس کوئی سامان نہیں ہے

دل ملا اور رہی ہستی کو نہ اک پل بھی سکوں ‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌ ‌‌ موت ہر لمحہ نگاہوں میں کھٹکتی ہی رہی
مشعل عقل بھی ہر گام تھی موجود مگر، ‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌ ‌‌ زندگی وقت کے صحرا میں بھٹکتی ہی رہی

عقل دیتی ہے زمانے کو سکوں کا پیغام، ‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌ ‌‌ عقل دنیا کے لیے قہر و غضب بنتی ہے
عقل سے چہرۂ ہستی پہ نکھار آتا ہے ! ‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌ ‌‌ عقل انسان کی تباہی کا سبب بنتی ہے

عقل کے اسیر لوگوں کو اختر مشورہ دیتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں ؎

عقل کے زور سے افلاک پہ اڑنے والو، ‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌ ‌‌ فرش کو عرش پہ پہنچاؤ تو کچھ بات بنے !
ماہ و مریخ پہ جانے سے بھلا کیا ہوگا ! ‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌ ‌‌ چاند تارے جو یہاں لاؤ تو کچھ بات بنے

لیکن محبت کی بنیاد کتنی ہی نفسیاتی اور طبعی ہو، اس میں سماجی حالات کو بڑا دخل ہے۔ عہد جدید میں محبتوں کے افسانوں کی کثرت کی وجوہ بہت سی ہیں۔ اس عہد میں (اختر بستوی کے عہد میں) محبت کے واقعات میں اضافہ ہو گیا ہے۔ گزشتہ محبت کے واقعات میں کمی ہو رہی ہے۔ آزادی کے بعد (اختر بستوی کا عہد آزادی کے بعد کا عہد ہے) جب ہمارے معاشرے نے کروٹ لینا شروع کیا تو بہت سی پرانی قدروں کا خاتمہ ہو گیا۔ شہر بڑے، شہر بسے، صنعتیں بڑھیں اور زندگی میں حرکت کا عمل تیز ہو گیا۔ اور لڑکیاں بھی پردوں سے نکلیں، چہار دیواری میں مقید لڑکی بازار میں آنے لگی۔ مخلوط تعلیم کا رواج شروع ہو گیا۔ محبت کی ترغیبیں بڑھ گئیں۔ مگر اس دور سے پہلے کے دور کی دوشیزہ پر حد سے زیادہ سماجی پابندیوں کی وجہ سے کسی نوجوان کے یہاں جذبے کی جو شدت ہوتی تھی اس میں کمی آ گئی۔ اس لیے کہ شدت وہاں ہوگی جہاں محبوب سے ملنا دشوار ہوگا، جہاں محبوب پردوں میں ہوگا۔ عہد نو میں محبوب سے ملنا دشوار نہیں۔ رسل و رسائل کے ذرائع بڑھ گئے ہیں۔ اپنی دھڑکنوں کی داستانیں کافی آسانی سے ترسیل کی جا سکتی ہیں۔ نئی نسل میں ایک دوشیزہ معشوق کے بعد دوسری نازنین تک پہنچنے کا ذوق نظر آتا ہے اور ایک جگہ پر رہنے کے بجائے کئی خوبرو نوجوان سامنے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ محبت کی بنیاد جذباتی کم، عقلی زیادہ ہو جاتی ہے۔ جہاں انتخاب کا سوال ہوگا یا محبت کرتے وقت بہت سے پہلوؤں پر غور کرنا ہوگا وہاں محبت کا عمل شعوری ہوگا۔ یہاں لفظ شعوری سے ابہام پیدا ہونے کا امکان ہے۔ شعوری کا لفظ کسی باقاعدہ منصوبہ بندی، کسی سوچے سمجھے پروگرام کے لیے استعمال نہیں ہو رہا ہے، بلکہ اس سے مراد محبت میں عقل و خرد کی کسی نہ کسی حد تک آمیزش سے ہے کیونکہ جنون اور معقول افراد سے محبت نہیں کی جاتی۔ محبت اگر غیر شعوری عمل ہے تو ہمیں اس کی دارفتگی اور والہانہ پن کے مناظر سطروں پر بار بار نظر آنے چاہئیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ اختر بستوی محبت کے اسی شعوری عمل کو بڑے تجرباتی انداز میں یوں بیان کرتے ہیں ؎

ظاہر آپ کی باتوں میں نہ تھا کچھ مفہوم ‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌ ‌‌ میں نے ان میں بھی مگر ڈھونڈ لیا اک پیغام
آشنائے نگہ ناز سمجھ سکتا ہے ‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌ ‌‌ وہ اشارے بھی جو کرتا ہے جنوں بے ابہام

گر پڑیں اپنی ہی بیتابی سے شبنم لیکن ‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌ ‌‌ گل کے ہونٹوں کو بھی اس شہد سے کچھ رغبت تھی
عشق بیتاب کی اظہار پہ نادم کیوں ہو ‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌ ‌‌ حسن کی شوخ نگاہوں میں بھی اک دعوت تھی

وہ گرچہ ... ہو گی | ... دل کی گھبی
... عیاں ہو گی! | ... کثرت سے غزلیں تب کی

بارہا سمجھا دیا ہے محبت کا یقین، | کر دیا کس نے مرے ایمان کو آزاد دیا
یوں وہ خوش ہو کے گزارش میری | اپنی محفل پہ شو نہ دوں تیرے کا بیرا

ایک پیغام ہے احساسِ حقیقت کا غرور | اُن کی معصوم نگاہوں میں رہے گا کب تک
قدرِ فطرت ہوتی ہیں تجربوں کی قائم، | حسن خود اپنی نگاہوں میں رہے گا کب تک

عشق کا جذبہ اور اس کے والہانہ کوائف اس زندگی کے جزر و مد اور کیف و کم سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کی اساس مادیت پر نہیں، مادیت پر ہے۔ اپنی اصل کے اعتبار سے وہ ایک جنسی جذبہ ہے مگر جنسیت کی بے راہ روی اس میں نہیں ہے۔ وہ خواہش کو پرستش قرار دینا چاہتے ہیں۔ اسلئے اختر نے کسی محبوب کو بُت نہیں بنایا۔ ہاں یہ ضرور چاہا کہ وہ جنوں کی طرح دلربا اور دل آسا ہو۔ اس کی چاہت کے اظہار میں اختر کا اپنا رنگ ہے ؎

ترنم ہو خوش ہے اس طرح جوانی کی تپش | جیسے شبنم پہ شعاعِ سحری رقص کرے
ساتھ ہی ساتھ ہے یوں ان میں کوئی تقدیس | برف جس طرح کوئی شوخ نگاہوں میں بھرے

تیرے مخمور بدن کے یہ انوکھے انداز، | جیسے کچھ خواب کسی رند کے برہم ہو جائیں
جیسے حافظ کے خیالات کا مل جائے شبیہ | جیسے خیام کے اشعار مجسم ہو جائیں،

کمسنی اُن کی نگاہوں سے چھلکتی ہے ابھی... | چشم و رخسار میں نا بندِ شب، بچپن کا نکھار
پھر بھی رہ رہ کے جھلک اٹھتا ہے یوں عکسِ شباب | جیسے پڑتی ہو کبھی جیٹھ میں ساون کی پھوار،

اختر کی عشقیہ شاعری میں ایک قسم کی معاملہ بندی ہے۔ مگر یہ معاملہ بندی جرأت اور مومن سے مختلف اور قلب اور اقرار سے قریب ہے۔ اس میں ایک ایسا رکھ رکھاؤ ملتا ہے جو عشق کو تہذیب آشنا اور زندگی کو تہذیبِ عاشقی بنا دیتا ہے ؎

خلوتِ ناز سے یوں جلوہ طرازی اُن کی | دل میں مشتاق کے طوفان اُٹھا دیتی ہے!
دُور ہی دُور سے جس طرح شفق کی سرخی | آگ دریاؤں کے سینے میں لگا دیتی ہے

میں ترے دستِ حیا سے انداز سے لوٹا لے وقت | جیسے دربارِ گلستاں سے جو پھرے بادِ صبا
جیسے شعرا کے ترنم سے ہوں موجیں واپس | جیسے اشک سے نکلے کسی زاہد کی دُعا،

عشق جو عشق تو کس کی نگاہ رہ کر بھی۔ | ساقی کے تقدس کا اظہار کرے
... خواہش | بے حجاب ... ساز کرے

دل تو شیشے کی طرح ٹوٹ بھی جاتا ہے، مگر
پیار کا رشتہ [illegible]

سوچتا ہوں کہ زندگی کوئی ٹھیک نہیں
میں تو رہا ہوں کہیں [illegible]

حسن و عشق کے فلسفے کو اختر نے یوں نظم کیا ہے ؎

عشق کہتا ہے کہ حسن کی تعریف [illegible]
حسن اور ایک شعر میں ہیں دونوں [illegible]

عشق کو حسن سے میں پایا ہے آخر کار مگر
حسن کو ہوش کے عالم میں دیکھا ہے خوب

اور فلسفۂ عقل کو یوں بیان کرتے ہیں ؎

عقل دیتی ہے زمانے کو سکوں کا پیغام
عقل دنیا کے لئے قہر و غضب بنتی ہے

عقل سے چہرۂ ہستی پہ نکھار آتا ہے
عقل انسان کی تباہی کا سبب بنتی ہے!

اور غم کی آفاقیت کی سچائی ملاحظہ کیجیے ؎

زیست کے واسطے غم زہر ہلاہل ہے مگر
غم اگر غم ہو تو ہر زخم کا مرہم بن جائے

غم کا احساس ہو انسان کو تو کم سے کم اس
غم کا عرفاں ہو تو [illegible] بن جائے

اختر بستوی کے قطعات رنگا رنگ ہیں۔ انہوں نے ہندوستان کے قدیم دانشوروں، فلسفیوں، رشیوں اور بزرگوں سے خیالات مستعار لئے ہیں۔ اور آج کی زندگی میں ان سے تاثر حاصل کیا ہے۔ جہاں ان کے بعض قطعات میں سادگی — اور احساس کی گہرائی [illegible] وہاں کچھ قطعات ایسے بھی ہیں جنہیں محض برائے بیت کہا جا سکتا ہے [illegible] ہیں۔ [illegible] ان میں حشو و زوائد بھی ہیں اور بے تاثیری اور بے رنگی ہے ؎

آپ کہتے ہیں بجا حضرت ناصح لیکن
میں بھی ایک بات کروں عرض جو مانیں نہ برا

پھر کوئی کرتے ہیں کیوں آپ وفا کی تلقین
ان سے بھی کہیے کہ وہ بھی تو کریں ترک جفا

اس قطعہ میں کون سی خوبی، خیال کی کون سی ندرت اور اظہار کی کون سی جدت ہے۔ شاعری کو اتنا سپاٹ اور بے روح نہیں ہونا چاہیے — غزل میں تو سادہ الفاظ میں بھی ایک بلیغ خیال کا اظہار ہو سکتا ہے لیکن قطعہ اور رباعی کے چار مصرعے اعلیٰ درجے کے الفاظ و تراکیب کے متقاضی ہوتے ہیں۔ الفاظ کی غرابت سے بچنا بہت ضروری ہے۔ یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ ہر بات کھلے ہوئے انداز میں کہی جائے — اگر اختر اپنے قطعات میں اشاراتی زبان اختیار کرتے تو میں سمجھتا ہوں کہ ان کے قطعات کا حسن و تاثر اور بھی بڑھ جاتا یہ الگ بات ہے کہ کہیں کہیں بیانیہ انداز ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اردو شاعری میں اختر انصاری نے قطعہ نگاری کی روایت کو بڑی خوبی سے آگے بڑھایا ہے۔ نریش کمار شاد کے یہاں بھی بڑے اچھے چبھتے ہوئے قطعات مل جاتے ہیں۔ اختر بستوی کی عمر شاعری بڑھ رہی ہے ہمیں توقع ہے کہ وہ اپنے فکر و اسلوب میں تبدیلیاں لائیں گے — ▲▲

غزلیں

اشکِ ظاہر

○

میں شب گزیدہ ہوں نقش آفتاب ہیں مجھ میں
مرے قریب نہ آؤ عذاب ہیں مجھ میں
رہے ہیں میرا ابھی مسکن درخت، غار، پہاڑ
چھپے ہوئے کئی اہلِ کتاب ہیں، مجھ میں،
اُداس اُداس ہیں لمحوں کے آئینہ خانے،
مجھ ایسے اور بھی خانہ خراب ہیں مجھ میں
کسے ملاؤ گے مجھ سے، کسے کرو گے جدا
نفس نفس غمِ عشرت مآب ہیں مجھ میں،
نگاہ دیکھ نہ پائے تو کیا ہوا ظاہر
جو دفن ہو گئے وہ سارے خواب ہیں مجھ میں۔

عابد مناروی

○

یوں دور سے نہ شیشۂ آئینہ دکھا مجھے
مجھ کو تراش کر مرا پیکر دکھا مجھے
اے شعلۂ جشق سے ابھی نا آشنا ہے تو
اک دو میرے سانچے میں ڈھل کر دکھا مجھے
ہنسنے کا حق ہے جب تجھے میری شکست پر
جو میں نہ کر سکا وہی تو کر دکھا مجھے
کتنا بدل چکا ہوں میں اتنا تو جان لوں
پھر آج میرا رُوپ تو بھر کر دکھا مجھے
عابد یہ کیا ہوا ہے کہ اپنے ہی گھر میں آج
اک اجنبی کے جیسا اپنا ہی گھر دکھا مجھے

یوسف جمال

○

پتہ چلاؤ کہ آخر انہیں ہوا کیا ہے
اُجاڑ محلوں کے رونے کا ماجرا کیا ہے

بساطِ درد پہ بکھری ہے راکھ یادوں کی
اُداس کھنڈروں کے ملبے میں ڈھونڈتا کیا ہے

اُچھال سنگِ جنوں ٹوٹ بھی گیا تو کیا
میں اس صدی کا ہوں آئینہ سوچتا کیا ہے

صدائیں بَن میں بھٹکتی پھریں گی آوارہ
جنوں کے خول سے آواز دے رہا ہے کیا

مرے نصیب میں تھیں نیند کی سیہ راتیں
نہ پوچھ دلکشیٔ خواب سے ملا کیا ہے

ذرا یہ سوچ کہ آئے گا رنگ بھرنے کون
خطوطِ لوحِ زمانے پہ کھینچتا کیا ہے

نصیب میں جو اُٹھا میں نشیب کی دیوار
تجھے فرازِ ثریا سے واسطہ کیا ہے

محمد مانکڈ
ترجمہ :- نقی امام

روٹی کی دو تہیں

آج بارہ گھنٹے جاگ رہا ہوں، بصرت کا خیال بار بار آرہا ہے۔ ایک سکول کا ایک اسٹیشن چھوٹا، گاڑی آگے بڑھتی جا رہی ہے۔ سنا ہے بصرت ترقی کی سیڑھیاں چڑھتا جا رہا ہے اور چوٹی پر پہنچ گیا ہے۔ اور ہم دونوں کی نوجوان ساتھی تھے لیکن کیا اس کسی کو کامیابی ملی؟ مگن بھائی کہتے ہیں کہ جس کی جتنی محنت اسکو ویسی ترقی۔ لیکن زندگی میں جسے کامیابی حاصل ہو جاتی ہے اسکو محنتی کہا جاتا ہے، دوسروں کو اسکے برعکس۔

گذشتہ دس سال سے ہم کسی سے ملے نہیں ہیں لیکن اُس سے جب بھی بصرت ملا" وہ کسی نہ کسی طرح اپنی پریشانیوں کو منالے کر بیٹھ جاتا کہتا تھا اس زمانے میں بصرت بلا کا بے صبرا تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اب اسکی اتنی ترقی ہو گئی ہے۔

بصرت کا گھر ترقی کا بنا ہوا تھا اور اس میں ایک کمرہ، ایک چھوٹا سا صحن اور ایک باورچی خانہ، بہت کل اثاثہ۔ اسکے علاوہ نہانے کا چھجا بنانے کے لئے بھی بصرت کے پاس پیسے نہ تھے۔ اسکے والد گوبند چاچا ہوتے تھے غریب شہر کے آدمی تھے۔ اُن کے دو گھنٹے پوجا پاٹ کے وقت بصرت کو پچھلے کمرے میں بیٹھنا پڑتا تھا۔ "کیسی زندگی ہم جی رہے ہیں! کتوں اور کوّوں سے بھی بدتر زندگی!" بصرت کہتا ——— "یہ تم کیا کہتے ہو؟ لیکن چونکہ تم بوڑھے ہو گئے ہو اسلئے تمہیں ایسا لگتا ہے۔"

میں کہتا بھی ——— "اب تو یہ دنیا اوقات ہم سب سے بدتر زندگی کیا سمجھیں؟ یہ تو ہونا ہی ہے بصرت! اسکا تو قسمت ایک جیسی نہیں ہوتی سب کو ایک جیسا شکر نصیب نہیں ہوتا۔ یہ تم کیوں بھول جاتے ہو میرے دوست!" "بس انہی باتوں پر مجھے اعتراض ہے۔ میرے خیال میں آدمی اگر محنت جیسی قیمتی چیز [illegible] کا دلیل ہے

محنت اور عزم سے انسان ٹکے کو سکوں میں تبدیل کر سکتا ہے۔ لیکن دکھی انسان کچھ اس طرح اسکا خوگر ہو جاتا ہے کہ دکھ کا احساس نہیں معلوم پڑتا۔"

"زندگی دکھوں سے بھری پڑی ہے۔" بصرت اصلیت ہی دکھوں کا علاج بھی نہیں ہوتا کیونکہ زندگی کے دکھوں کو قبول کر کے ہی جینا پڑتا ہے۔

بصرت فوراً جواب دیتا ——— "آدمی اگر جفاکش اور باہمت ہو تو وہ اپنی زندگی میں انقلاب لا سکتا ہے۔ سکے کے دو رُخ ہی جانب نظر نہیں آتے۔ ایک طرف اگر دکھ ہے تو دوسری طرف خوشیاں بھی ہیں، لیکن شرط محنت و مشقت ہے۔"

وہ پھر کہتا ——— "بابا کی نظر میں ہم لوگ بہت سکھی ہیں۔ ہمیشہ مذہب میں دو گھنٹے بھگوان کی پوجا ہوتی ہے، چونکہ میں انکا پہلا بیٹا ہوں کیا تھا کہ گھر سے گھر لیا جاتا ہے۔ اور وظائف کا پاٹھ کیا جاتا ہے۔ اور بس ——— کیا یہی سکھی ہونے کی دلیل ہے؟ جس کی جیبی کچھ بھی جس کا جیا گیان۔" میں نے اُس سے کہا [illegible] گیا۔

"اچھی دلیل ہے تمہاری!" وہ جھنجھلا اٹھتا۔ بصرت کی شادی ہونے کے بعد بھی بابا گھر سے جڑا تھا۔ اس وقت گھر میں نہانے کی جگہ بنا لی گئی تھی اور بابا کی [illegible]

"بصرت" میں نے کہا "تم نے کمال کر دیا"

"کمال تو تم کر رہے ہوتے۔ [illegible]

کہ [illegible]

کر سکے وہ ہم نے صرف ایک سال پہلے ہی ترقی کی ہے۔ لیکن یہ سب کچھ —— پھر اس کی باتوں سے معلوم ہوا کہ اس نے اپنی شادی کی اور گھر کو خوشیوں اور راحتوں سے بھر دیا ہے۔ اور اس کی خواہشات یہ ہیں وہ چاہتا ہے کہ [illegible] کو بند چاچا کی آنکھ کے موتیا بند کا آپریشن کرانے کیلئے ان کے پاس پیسے نہیں ہیں۔

اسکے بعد عبرت نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور کہا — اگر میرے پاس پیسے ہوتے تو میری زندگی کا نقشہ ہی بدل گیا ہوتا۔"

"تم ہمیشہ پیسے کو زیادہ اہمیت دیتے ہو عبرت!" میں نے اس سے جھنجھلا کر کہا۔ "دنیا میں تو تم بھی جانتے ہو کہ گھوڑا بھوسہ کھا کر کوئی بچہ زندہ نہیں رہ سکتا ہے۔ لیکن وہ [illegible] کر زندہ رہ سکتا ہے۔ پیسہ ہی اس زندگی کا مقصد ہے۔ پیسے کے عوض جنت اور جہنم کو خریدا جا سکتا ہے۔ اس معاشرتی زندگی میں پیسے سے ہی گھر کو محل بنا کر چاند کی دھرتی کو فتح کیا جا سکتا ہے۔ سب کچھ پیسہ ہے میرے دوست پیسے!" اور میں لاجواب ہو گیا۔

لیکن یہ سچ ہے کہ اب عبرت نے اپنی زندگی کو خوشگوار طور پر پُر مسرت بنا لیا ہے۔ گزشتہ دس برس میں اس نے بنگلہ، کار، نوکر چاکر اور ہر طرح کے آرام و آسائش کا سامان مہیا کر لیا ہے۔ آج اس کے [illegible] اس کی بڑی قدر و منزلت ہے اور [illegible] ایک بڑا مقبول لیڈر بھی بن گیا ہے۔

[illegible] نے [illegible] عبرت کے متعلق دریافت کیا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ عبرت بہت محنتی ہے — اس نے محنت کر کے انتہائی کامیابی حاصل کی ہے۔

لیکن پیسہ کمانے کے لئے ہم بھی تو محنت کرتے ہیں — پھر ہمیں کامیابی کیوں نصیب نہیں ہوتی؟

[illegible] — سچ پوچھو تو ہم محنتی نہیں ہیں، [illegible] ذمہ دار [illegible] نہیں۔ [illegible]

[illegible]

نے ہاتھ بڑھا کر تپاک …… یہ عبرت ہی تھا۔ آنکھوں پر رنگین چشمہ شوخ رنگین قمیص [illegible] چہرے پر مسکراہٹ لئے۔

"مجھ سے گلے ملو" اور پھر اس نے میرا سوٹ کیس اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیا۔ جب میں اس کی کار میں جا کر بیٹھا، تو مجھے بڑی حیرت کا احساس ہوا۔ آج عبرت کتنا آگے نکل گیا ہے! اور میں……؟

کار ایک شاندار بنگلے کے کمپاؤنڈ میں جا کر رک گئی۔ مکان شاندار اور خوبصورت تھا۔ اسکے چاروں طرف باغیچہ تھا۔ جو اس کی خوبصورتی میں چار چاند لگا رہا تھا۔

کار کی آواز سن کر ایک خوبصورت عورت لپک کر باہر آتی دکھائی پڑی لیکن میں اسے پہچان نہ سکا۔ اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "کیسے ہو دیور جی؟"

"ارے بھابی تم!" میں بول اٹھا۔

اس طرف تو تمہاری صحت بہت اچھی ہو گی —— بھابی مسکرا دیں۔

عبرت بول اٹھا۔ "صرف دودھ گھی کھانے سے نہیں، پیسے کی ریل پیل سے بھی آدمی کا موٹا ہو جاتا ہے۔" عبرت نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

آج مجھے اس بات کی حقیقت معلوم ہو سکی۔

بھابی نے پوچھا۔ "بھابی اور بچے تو خیریت ہیں؟

سب مزے میں ہیں بھابی! اور تمہارے بال بچے؟"

میرا بھابی کا چہرہ اتر سا گیا۔ وہ ہنستے ہنستے رک گئی۔

عبرت نے کہا۔ "ہمارے بال بچے ابھی کہاں!"

اپنے اس بے موقع سوال کا مجھے شدید احساس ہوا۔ میں نے دوسری طرف بات کا رخ پلٹ دیا۔

بہت دیر تک میں عبرت کے کمرے کو دیکھتا رہا۔ نیچے رنگین بیل بوٹے دار قالین بچھا تھا۔ وہ بڑے نقش و نگار والے پلنگ، کرسیاں، ٹیبل، گلدستے اور الماری میں رکھے مختلف کھلونے، میں چاروں طرف گھوم گھوم کر سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

[illegible] چائے پی کر میں عبرت کے ساتھ [illegible] کھانے کی آواز [illegible]

[illegible]

سمرا جھجکا کر بصرت مجھے اپنے دیوان خانے میں لے گیا۔ جو کسی
راجہ مہاراجہ کے کمرے کی مانند لگ رہا تھا۔ جس میں بچھا صوفہ سیٹ
اور پردے بھی کچھ بیش قیمت تھے جیسے میں کسی نئی دنیا میں
آگیا تھا۔ اس وقت بصرت مجھے بہت امیر کبیر نظر آیا۔ جی
چاہا اس سے گوبند چاچا سے ملنے کی بات کہوں۔ بصرت بولا "اب کھانا
کھانے کے بعد چاچا اُن سے ملیں گے۔"

میں خاموش ہو گیا۔

ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر کھانا کھانے میں مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے۔
[illegible] کئی برسوں کے بعد بھی جیسا ماں نے اپنے ہاتھ سے کھانا بنا
کر اپنائیت کی مٹھاس اس میں اور کچھ میں گھول دیا تھا۔ مجھے اس
وقت بصرت کی ماں کی آواز سنائی دی۔ لیکن میں نے کچھ بھی پوچھنا
مناسب نہیں سمجھا۔

کھانے کے بعد ہم دونوں بصرت کے کمرے میں آ گئے۔ پھر
چائے پیا اور کافی دیر تک آپس میں باتیں کرنے لگے۔ "چاچا سے نہیں ملو گے؟"
بصرت نے بہت دیر کے بعد پوچھا۔ "ہاں چلو!" میں کھڑا ہو گیا۔
بصرت مجھے لے کر دور ایک کمرے میں لے گیا۔ یہ کمرہ
مجھے ہسپتال جیسا معلوم پڑا۔ اور جگہ جگہ بوتلیں، ٹیوب لائٹ
[illegible] میں نے دیکھا۔ ایک پلنگ پر سوکھے جسم کا ایک آدمی
لیٹا ہوا ہے۔ یہ گوبند چاچا تھے۔ بصرت نے پاس جا کر زور
سے کہا۔ "چاچا جی دیکھو آیا ہے۔"

انہوں نے آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھا۔ دیکھتے رہے لیکن
بولے کچھ نہیں۔ وہ کوشش کرنے پر بھی کچھ بولنے میں کامیاب
نہ ہو پائے۔

بصرت بولا "یہ بولتے نہیں۔ ایسے ہی پڑے رہتے ہیں۔ کبھی کھانا
کھا کر بھی نہیں..... چلو اب چلیں۔"

میں سمجھ چکا تھا کہ انہیں زندگی سے [illegible] اس تنہائی میں
[illegible] کر رکھا ہے؟ لیکن خاموش رہا۔ پہلے والے دن ہوتے
تو میں ضرور بصرت سے بہت کچھ کہتا، لیکن ہمارے درمیان
دس سال میں ایک بڑا فرق آ گیا تھا۔

[illegible] وہاں سے واپس آ کر بصرت کے دیوان خانے
میں بیٹھ گیا۔ پھر کچھ باتیں کرنے کی کوشش کی لیکن جیسے ہمارے سب
بول کھو گئے تھے۔ ہونٹ پھڑپھڑا کر رہ جاتے۔ میں چپ چاپ بیٹھا کچھ سوچ
رہا تھا اور بصرت سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ مجھے اچانک ایک [illegible]
سنائی دی: "[illegible] دروازہ [illegible]" میں چونکا [illegible]
میں کھڑا ہو گیا۔ یہ کیسی آواز ہے؟....
"کچھ نہیں ___ بصرت نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ "میری ماں پاگل
ہے۔ بیمار ہے [illegible]"

میری خواہش ہوئی کہ میں یہاں سے بھاگ جاؤں ___ مگر میں نیچے
بیٹھے بیٹھے قالین کو دیکھ رہا تھا۔ [illegible] اپنے
خیالوں میں [illegible] ماں سے محبت۔ آنکھ اٹھا کر میں نے بصرت کے کمرے کا
جائزہ لیا۔ نقش و نگار، فرنیچر، گلدستے، پردے، [illegible]
اور شیشم کے کھلونے وغیرہ ...... لیکن ان سے کھیلنے
والا کوئی بھی تو نہ تھا۔

بصرت نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا [illegible] "میں
نے بہت کی دولت حاصل کی ہے۔ ایک بڑا [illegible]
لیکن اب بھی میں [illegible] ہوں۔ یہ کوئی [illegible] نہیں ہے۔ کوئی خوشی
نصیب نہیں ہوا۔ چاچا جی چپ چاپ پڑے رہتے ہیں۔ ماں پاگل ہو
گئی ہے۔ اور ہمارے کوئی بچہ بھی نہیں ہوا۔ میں نے زندگی کو پا لیا
لیکن اب میں کوئی دلکشی نہیں۔ دولت پا لینا ہی سب کچھ نہیں ہے۔"
دولت اور [illegible] کی طرح [illegible] ایک دوسرے سے
الگ ہیں۔ انہیں کسی بھی طرح الگ نہیں کیا جا سکتا [illegible]
دونوں نہیں ایک ساتھ ہمارے [illegible] آ جاتی ہیں۔
میں چپ چاپ کھڑا کمرے کی چھت کو گھور رہا تھا۔

مکتوبات

● اپریل "شب خون" کا "نشاطِ نغمہ" ابھی پڑھ کر ختم کیا ہے۔ اس مرتبہ آپ نے اداریے میں اتر پردیش اردو اکادمی کا ذکر کیا ہے۔ اور اس بہت سی کتابوں پر انعام دینے پر اعتراض کیا ہے۔ دیگر رسائل نے بھی اسی قسم کی اکادمیوں پر نکتہ چینی کی ہے ——— "کتاب نما" دہلی آپ اپریل اور مئی کی اشاعتوں میں اکادمی کی توجہ معیار کی بلندیوں کی طرف نہایت خوبصورت الفاظ میں مبذول کرائی گئی ہے۔ لیکن اس بات سے آپ بھی متفق ہوں گے کہ اتنے زیادہ انعامات اس سے قبل کبھی نہیں دیئے گئے اور اردو مصنفین کے ایک بڑے طبقے کی اس طرح حوصلہ افزائی ہوتی ہے ——— اکادمی نے کتب خانوں، مصنفین کو اپنی کتابیں شائع کرنے کے لئے اور معتدد ادیبوں اور شاعروں کو امداد دی ہے۔ لیکن سب سے بڑا سوال اتر پردیش میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا ہے۔ اگر یہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے تو دوسرے مسائل اپنے آپ حل ہو جائیں گے۔

نظموں میں جناب تاز شریف پرتا بگڑھی کی نظم بہت پسند آئی۔ خاص طور پر اُن کے یہ اشعار:

غمِ انساں، غمِ جاناں، غمِ دوراں، غمِ دل،
کوئی بھی غم ہو وہ لفظوں میں کہاں ہوتا ہے،
غم کا طوفان تو سینے میں رواں ہوتا ہے

مضمون میں جناب ڈاکٹر خلیل اللہ خاں کا مقالہ اچھا ہے لیکن اُن کے پڑھ کر تشنگی باقی رہی۔ مضمون کے ہندی دوہوں اور [illegible] بھی [illegible] بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔ یادش بخیر [illegible] نے ایک بار "عالمگیر" میگزین کے ایڈیٹر تھے "مشتری" کا ایک تفصیلی مضمون اس میگزین میں لکھا تھا۔ اگر وہ اب پھر مضمون لکھیں یا اسی قسم کا ایک مضمون لکھ دیں تو مناسب ہوگا۔ جوگندر پال کی کہانی "وہ کہاں گئے" بہت اچھی ہے۔ جنگل کی ماند اس کہانی سوسائٹی کی آئینہ دار ہے۔

محلہ سوتہ۔ بدایوں
مبشر علی صدیقی (ایم اے)

● شمارہ اپریل گذشتہ میں جناب تاز شیخ پرتاب گڑھی کی نظم "پہچان" لفظ و بیان، تخلیق اور تکنیک کا ایک کرب اور شدت احساس کو اُن کے مخصوص لب و لہجے میں پیش کرتی ہے۔ کہیں کہیں اس نظم میں "پیکرِ غزل" جو اُن کے مجموعۂ کلام "پیکر" میں شامل ہے کی بازگشت سنائی پڑتی ہے۔ چند مصرعے تھوڑی سی ردو بدل سے دہرائے گئے ہیں۔ اب ایسا بھی نہیں کہ تاز شیخ صاحب خود کو دہرانے کے عمل سے گذر رہے ہیں۔ اگلے ہی ماہ انہوں نے "بات کے پرستارو"، "زبان سے نفرت کیوں"، "عظمتوں کا المیہ" جیسی حیات آموز سیکڑوں نظموں کی توقعات ہیں۔ جس کے لئے متقل تاز شیخ "خود کو اسی طرح مٹایا ہے کہ رکھا جاتا ہے" اور "اتنی عجرت سے دنیا پر کاہ پر تھوک دیا" یہاں تک کہ "دل بہت خون ہوا معجزہ تر ہونے تک"۔ (ڈاکٹر) نذیر فتح پوری ثانی کی نظم "محک" (ترتیب میں غلطی سے ابراہیم شفیق کا نام دے دیا گیا ہے) قدروں کے زوال وانتشار کا آئینہ دار ہے اور بے یقینی کی سرد فضا کو تاثر انگیز پیرائے میں پیش کرنے میں کامیاب ہے۔ عتیق شبلی اور عبداللہ کمال کی منظومات بکھرے وجود کو بھرپور ترسیل کے وسیلے سے پیش کرنے میں کامیاب رہی ہیں۔ غزلوں میں لال چند پرارتھی چاند، کرشن کمار طور اور محبوب راہی پسند آئے۔

● تحقیقی مضمون نے جناب اختر انصاری اکبر آبادی کا مضمون بہ عنوان ایک دلچسپ اور دلکش انداز میں پیش کیا ہے ——— [illegible] کے ذریعہ فضا قائم رکھنے میں کامیاب رہے ہیں [illegible]

[illegible]

ــــــــــــــــــ

لہ آپ کو کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔ اداریہ کو دوبارہ پڑھئے کی زحمت گوارا کیجئے [illegible] بلکہ اس [illegible]

سے جوش سے جو انداز میں تحریر کردہ یہ مقالہ تحقیقی خیز واقعات کی
کڑیوں کے عدم [illegible] قاری کو [illegible] حیثیت میں رکھتا ہے۔
[illegible] اور فرقہ وارانہ [illegible] میں اہم رول ادا کرتا ہے
اُردو کا یہ ناطہ مختصر [illegible] ایک مخصوص خدمت انجام دی
ہے۔ جو فکری فضا میں چھائی ہوئی [illegible] دلچسپ ہی نہیں بلکہ
نوجوان ذہنوں کی تدریس کے لئے بھی سود مند ہے۔

۲۲۲۔ [illegible] الہ آباد — نصر قریشی

● اپریل کے شمارہ "شاعر" ملا۔ زیر نظر شمارہ میں
[illegible] نازش پرتاب گڑھی صاحب کی نظم "یہ دُھندلا دیاں"
پڑھ کر [illegible] طاری ہوئی اُس کی تائید میں
ان ہی کی نظم کا ایک مصرعہ پیش کرتا ہوں ط
"جاتے تھے پر جو گزرے ہیں وہ لفظوں میں کہاں"
[illegible] کے توسط سے نازش صاحب کو ان کی اس پُر مغز
[illegible] نظم پر ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں۔
[illegible] آبادی پر ڈاکٹر خلیل اللہ خاں صاحب کا مقالہ
[illegible] اور ادبی حیثیت کا حامل ہے۔ آزاد نظموں میں [illegible] کی
"[illegible] الصلیب" اور ڈاکٹر [illegible] زرینہ ثانی کی "شک" نے بہت متاثر
کیا۔ [illegible] ارشد صدیقی کی غزل کے مندرجہ ذیل دو شعر بھی
قابلِ تحسین ہیں۔

تھا میرے سامنے میرا قاتل کھڑا ہوا،
آئینہ دیکھ کر مجھے خود سے بھی ڈر لگا

دن بھر سمندروں کی [illegible] دیے رہے،
راتوں کو آسمان سے جا جا کے سر لگا

شری لال چند پرارتھی چاند صاحب غزل بھی نظر نواز ہوئی
مگر صرف یہ ایک شعر پسند آیا۔

اہلِ زمیں پہ تنگ ہے جب عرصۂ حیات
ایسے میں کب سُنے گا کوئی آسماں کی بات

[illegible] غالب مجھے ......

حصہ مکتوبات میں "عروضی بحث" سے متعلق پھر چند
خطوط دیکھ کر یوں لگا جیسے سانپ گزر جانے کے بعد پھر لکیر پیٹ
رہے ہوں۔"

اس ضمن میں مجھے آپ سے [illegible] شکایت ہے جبکہ آپ
پچھلے شمارے میں "عروضی بحث" کو ختم کرنے کا اعلان فرما چکے
تھے تو پھر اس سلسلے کے خطوط شریکِ اشاعت کرنے کا کیا تک؟

مرچی پورہ۔ رتلام — بسمل رتلامی

● آپ کا اداریہ "اُتر پردیش اردو اکادمی کی ادب نوازی"
قابلِ ستائش ہے اور تنگ نظر حضرات کے منہ پر ایک طمانچہ!
واقعی اُتر پردیش اردو اکاڈمی نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے
ہیں وہ قابلِ تعریف ہیں اور اراکین اکاڈمی مبارکباد کے مستحق ہیں۔
زیر نظر شمارہ میں ڈاکٹر خلیل اللہ، جمیل احمد ایم اے اور
نظام الدین ایس گوریکر صاحبان کے مقالات ٹھوس، معلوماتی
اور پُر مغز ہیں۔ نازش، زرینہ ثانی، مظفر شکیل، عبداللہ کمال
اور ظفر عزیز کی نظمیں پسند آئیں۔
جوگیندر پال اور ابراہیم شفیق کی کہانیاں متاثر کرتی ہیں
انور قمر اور نیازی کی کہانیاں بھی اچھی ہیں۔
غزلیات میں ارشد صدیقی، نصر قریشی، کرشن کمار طور
اور محبوب راہی پسند آئے۔
تازہ شمارہ صوری اور معنوی اعتبار سے خوب ہے۔

قاضی پورہ۔ کھنڈوہ — حسن رضا

● تازہ "شاعر" ملا۔ مکتوبات کے کالم میں میرے
افسانے کو کافی پسند کیا گیا ہے۔ اس کے لئے میں آپ کا اور پسند
کرنے والوں کا ممنون ہوں۔
اس بار کہانیوں کا حصہ بہت ہی خاص ہے خاص کر
جوگیندر پال کی کہانی "وہ کنواری تھی" بہت ہی خوب ہے۔
معاشرے میں پائے جانے والی آوارہ عورت تنہا ایک شریف
خاندان کی شادی شدہ عورت کی آنکھوں نے جو تصویر کھینچی
ہے، قابلِ تحسین ہے۔

[illegible] ۔ [illegible] پور — [illegible]

نقد و نظر

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

قدم قدم

ناشر ـــــــ نوازش پرتاب گڑھی

"قدم قدم" نوازش پرتاب گڑھی کی تھوڑی سی قومی نظموں کا مختصر سا مجموعہ ہے، جس میں شاعر کا ذہن اور فن ایک ایسے مقام پر اس طرح ہم آہنگ ہو گئے ہیں کہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے۔ فن کی رعنائی و پختگی سے ہم کنار ہو گیا ہے۔ اور ان کی فکر کے امتزاج سے لطافت، گیرائی اور گہرائی کا ایک معیار پیدا ہو گیا ہے۔ اگر یہ قیاس صحیح ہے تو پھر یہ کہنا چاہیے کہ نوازش پرتاب گڑھی کا ذہن روایت سے زنگ آلود نہیں ہوا۔ اُن کے تخیل کے گلستاں میں ہنوز تازگی و لطافت کار فرما ہیں، شعریت کو دماغ عروقی نہیں لگا ورنہ اتنا کہنے کے بعد شعراء عموماً اپنی ہی کہی ہوئی باتوں کو دہرانے لگتے ہیں۔ نوازش کے یہاں ابھی یہ عیب پیدا نہیں ہوا، اُن کا کلام ذہن پر بار نہیں ہوتا، بلکہ طرزِ بیان، اور ندرتِ فکر، وسعتِ مطالعہ کے باعث ہیں۔

"قدم قدم" قومی نظموں کا مجموعہ ہے، لیکن ہندوستان ہے اس کے مختلف شہروں و متبرک مقامات و شخصیات کا شاعرانہ تذکرہ ہے، بیان و موضوعات ہیں جو شعراء کے لئے آزمائی گئی ہے ۔ دورِ جدید میں ایک ہی ایسے مضمون پر نظمیں کہی گئی ہیں، شاید ہی کسی ایک تحریک یا موضوع پر نہ کہی گئی ہوں گی۔ ظاہر ہے کہ مقصد و مضمون کی سطح پر زیادہ شعر گوئی، و شعر خوانی دونوں میں ایک یکسانیت و تکرار پیدا ہو جاتی ہے۔ اس خارزار سے دامن بچا کر نکلنا اور نظم کو گلہائے رنگا رنگ سے آراستہ کرنا آسان کام نہیں ہے۔ شاعر اور صلاحیت اپنی فکر کے لئے زبان پر عبور اور بیان میں ندرت کا مطالبہ کرتی ہے، بغیر ان خوبیوں کے نظم میں تازگی اور فکر میں جولانی نہیں آ سکتی۔ یہ کلام دلکش ہوتا ہے جو شاعر کی امتیازی خصوصیت یا شخصیت کا آئینہ ہو سکے۔

نوازش کی نظموں ... دی اور غور و فکر کی صلاحیت اُن کے ... زیادہ نظر آتی ہے۔

انہوں نے تشبیہ و استعارہ اور بلاغت سے اس قدر ... کیا ہے کہ قابلِ قدر ہیں۔ اُن کی اس کامیابی کا راز ... اور نئی تشبیہ و استعارہ کا حسن ہی نہیں بلکہ مطالعات اور مشاہدے کا امتزاج ہے۔ ... ہندوستان کو یکجا ... اخبار ... کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے جو ملک کی عظمت، ... ہیں اور شعر کی ضرورت اور تازگیِ خیال کے لئے ساز گار ہیں، ایک جگہ ہندوستان کو مخاطب کر کے کہتے ہیں ؎

قطب کی لاٹ ہے یا عزمِ مستقل کا غرور
یہ لال قلعہ ہے یا تیری امنگ کا سیندور!
یہ تاج، فرقِ محبت کا تاج ہو جیسے...
کسی حسین کنواری کی لاج ہو جیسے...
یہ گنگ جمن کی ملاقات، پجاریوں کے بھجن!
کنول کی طرح یہ موجوں پہ کھیلتے ہوئے تن
یہ تیری سانولی جٹا، نگارِ مستِ خرام
کہ جیسے کرشن کی نظروں میں پریت کا پیغام
بکھر رہی نکھارتے آتی بہار میں شام
کہ جیسے زہرۂ مطلب پہ شیدا یا رنگِ حسین

تشبیہ و استعارہ کی نوک پلک اور برمحل استعمال سے تخیلات جس قدر لطیف و دلکش ہو جاتی ہے، وہ محتاجِ بیان نہیں۔ قطب کی لاٹ جتنی پائیدار و بلند ہے اس سے ہندوستان کے عزم و استقلال کی نشان دہی کرنا، لال قلعے کو ہندوستان کی امنگ کا سیندور کہنا تمنائے جگر کا نتیجہ نہیں تو اور کیا ہے۔ تاج محل کو فرقِ محبت کا تاج بتانا زیادہ توجہ کی بات نہ تھی، مگر حسین کنواری کی لاج سے تاج محل کی رعنائی تازگی اور سنجیدگی کا جو تصور قائم ہوتا ہے وہ ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ اس کا لطف وہی اٹھا سکتا ہے جو یہ جانتا ہے کہ صدیوں کے بعد بھی تاج محل نیا معلوم ہوتا ہے، جس کی صفائی و شادابی ہر صاحبِ دل کے لئے انبساط و مسرت کا سرمایہ ہے اور جو حسین کنواری کی محبت اور دلکشی و سنجیدگی و رعنائی سے کبھی لطف اندوز ہوا ہو، ... کی ... آنے والی ...

[illegible] کا [illegible] ہے۔ پھر ان کے [illegible] سب پہلا [illegible] اور شہریت کی اعلیٰ [illegible] مثال ہے۔ [illegible] کی انقلابی ترقی کا ذکر کرتے ہیں [illegible] کی [illegible] ابھرا اور بھی [illegible] [illegible] جاتا ہے۔ چند اشعار [illegible] ہیں ـــ

پھر وہ [illegible] کشش عوام [illegible] قطار اندر قطار
کس [illegible] کیسے ماضی کا سنگار
پھر ہو رہے ہیں سنوار [illegible] تعمیرِ حیات ـــ
اپنے ہاتھوں میں سنبھالے اپنی تقدیرِ حیات
پھر کمربستہ ہوئے ہیں زندگی کے حسن کار
پھر ہوئے گرمِ عمل یک دل و یک رو کردگار
[illegible] جا رہی ہے نوکِ خار
[illegible] کی صورت [illegible] ہے بیگار

[illegible] میں اور بھی نظمیں قابلِ توجہ ہیں۔ مثلاً جشنِ جمہوریت [illegible] اور ہم فرقہ پرست نہیں ہیں وغیرہ۔ ان [illegible] کی مثالیں بھی ہیں اور اپنے وطن کے سرفروشوں [illegible] ہیں [illegible] فکر و فن کا قابلِ قدر نمونہ ہے جس [illegible] احساس [illegible] نے ان نظموں میں اپنے جذبات [illegible] پر کشش بنا دیا ہے۔ اس لحاظ سے کہنا پڑتا [illegible] ہے یہ مجموعہ ایک اضافہ ہے جس [illegible] کی حالت [illegible] کشی اور ترقی کی تصویریں سامنے آجاتی ہیں۔ احساس و جذبات کی توانائی اور فکر و فن کے [illegible] کا [illegible] ہے۔

[illegible] صفحات۔ قیمت دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔
بزمِ [illegible] ادب۔ [illegible] وارڈ۔ پرتاب گڑھ (یوپی)
([illegible] لکھنؤ) ڈاکٹر سید اعجاز حسین

[illegible] کا ہر [illegible] مطبوعات میں [illegible] ہے [illegible] شامل ہے۔ [illegible] کی [illegible] ہیں سے جیسے [illegible] ہوتا ہے۔ [illegible] شدید ہے [illegible]۔ اردو [illegible] اردو دو [illegible] کا [illegible] شہر جس نے [illegible] بھی [illegible] ہے۔ [illegible] چھپے ہیں۔ ہر [illegible] سے مزاج الگ الگ [illegible] ہے۔ ہر [illegible] کی پشت پر شاعر کی تصویر [illegible] بھی [illegible]۔ [illegible] میں ہر [illegible] انتخاب اشعار [illegible] کی [illegible] عشق کا [illegible] ہے [illegible] میں اور [illegible] کا کلام پیش کیا ہے۔ "الفاظ کی برات" میں [illegible] کا کلام ہے اور [illegible] کے [illegible] سے [illegible] کا۔

اس میں اچھی اور بہت اچھی بھی اور بہت [illegible] کی شاعری کے نمونے مل جاتے ہیں۔

بے نوائی کی فصیلیں ہی [illegible] آئین [illegible]
آنکھوں کی وادی میں نیند [illegible]

ہم برق کی [illegible] کا [illegible]
بیچے ہیں زندگی کے [illegible] ہے

--- (عتیق احمد عتیق)

[illegible] کے حصے میں [illegible] نہیں آیا
[illegible] آیا ہے [illegible] نہیں آیا

[illegible] درد کا [illegible] تھا [illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible] رواں

(پانچ شاعروں کا شعری مجموعہ)
[illegible] طباعت [illegible] کی اشاعت

[illegible]

... قیمت چھ روپیہ

ملنے کا پتہ ... [illegible]

[illegible]

... رات

[illegible]

میری فکر و سوچ میں جب کچھ نہیں اس کرب کی
پھر یہ لفظوں کے بدن سے کیا نکلتا ہے کون ہے

--- (سلطان سبحانی)

کاش اپنے ظاہری حسن کی طرح یہ شعری مجموعہ معنوی و باطنی حسن سے بھی آراستہ ہوتا تو اور زیادہ قابل قدر بن جاتا۔ بہرحال یہ نوجوان شاعر [illegible] کی جدت پسندی کا ایک تجربہ ہے۔ خدا کرے اردو شاعری میں ایسے تجربے [illegible]۔ جدید شاعری کا بھی ایک معیار اور وزن و

محفلِ اپنی

مئی، جون کا مشترکہ شمارہ

[illegible] ۔ ۲ سال سے شائع ہو رہا [illegible] کی وجہ سے بے حد [illegible] اس میں کام بند تھا۔ اس [illegible] نہیں ہو سکتا۔ ہم نے کوشش کی کہ کسی دوسرے [illegible] طباعت ہو جائے لیکن اپنی طباعت کا کہیں [illegible] ہو سکا۔ مجبوراً طویل تاخیر، اُس سے پیدا شدہ [illegible] اور "شاعر" کی ذہنیت انتظار کو گوارا کرنا پڑا۔ [illegible] طور پر ہم اس کے لئے معذرت خواہ ہیں۔ [illegible] اس نقصان کا مداوا نہیں۔ اس شمارہ کا حجم بڑھا [illegible] کر دیا گیا ہے تاکہ جولائی گزشتہ کا شمارہ وقت [illegible]۔ آئندہ شمارہ مریم شاہ "شاعر" کے ایک اہم ترین خاص نمبر [illegible] اور شاعر کے مستقل ابواب کے لئے اس مشترکہ شمارہ کی [illegible] نقد و جستجو والا باب کافی طویل [illegible] وجہ سے حصۂ نظم و نثر میں بعض وہ مختصر [illegible] شامل ہو سکیں، جو اس شمارہ کے لئے منتخب [illegible] نقد و نظر اور مکتوبات کے مستقل ابواب پہلے بھی زیادہ [illegible] شمارہ ۲۰۰ صفحات کے بجائے ۹۸ صفحات کا ہے۔ لیکن نقد و جستجو کا باب بجائے خود بہت اہم اور دلچسپ ہے۔ اس میں کرشن چندر کا خطبۂ صدارت (چھ جنوری کے ادبی اجتماع کے منتظمین نے ہمارے مسلسل تقاضوں کے باوجود نہ بھیجا) اور بعض دوسرے ادیبوں اور شاعروں کا تأثر شامل نہیں ہے۔ اگر ان سب سے تقاضے بہت کئے گئے مگر اُن وعدوں کا کیا ہوگا جو پورے نہ ہوں۔ !!

آئندہ شمارے کا بڑا حصہ ہم نے علامہ اقبال کی نذر کیا ہے۔ شاعرِ مشرق پر جو مضامین آئندہ شمارہ میں شائع [illegible] وہ بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان سے اُردو دنیا یقیناً مسرور و مستفید ہوگی اور ہمارے اس اقدام کو قارئینِ شاعر ضرور سراہیں گے۔

آئندہ شمارے میں

جولائی ۱۹۷۲


اگلا بچہ ہونے سے پہلے
ذرا سوچئے
کیا آپ اس بچے
کی صحیح دیکھ بھال
نہیں کرنا چاہیں گے؟
نرودھ ہر جگہ ملتا ہے۔ سرکاری رعایتی دام، 15 پیسے میں 3
جب تک نہ چاہیں تب تک نہ پائیں سنتان
نرودھ

The 'SHA[illegible]' Bombay 8.
THE MOST POPULAR OLDEST LI[illegible]ARY & CULTURAL URDU JOU[illegible]
(44 Years of Publication) (Telephone No. [illegible]
Publishing [illegible]s, 15-16
Registered with the Reg[illegible] Newspapers at R. N. No. 14482/5[illegible]

علامہ سیمابؔ اکبر آبادی

کی چند حیات افروز تصانیف

کلیم عجم	(غزلیات)	چار روپیہ آٹھ آنے
سدرۃ المنتہیٰ	(غزلیات)	چار روپیہ
کار امروز	(نظمیں)	چار روپیہ آٹھ آنے
شعر انقلاب	(نظمیں)	تین روپیہ
عالم آشوب	(رباعیات)	تین روپیہ
نقش غم (مراثی نظمیں اور سلام)		ایک روپیہ

جلدوں پر خوبصورت اور رنگین گردپوش

(مکمل سیٹ کی خریداری پر نصف محصول ڈاک معاف)

منیجر اشاعت، مکتبۂ قصرالادب پوسٹ بکس ۲۵۲۶ بمبئی ۸

Cover Printed at JAYA ART PRINTERS, Bombay-8.



اردو کا ممتاز ادبی و تہذیبی ماہنامہ

شاعر

بمبئی

جولائی ۱۹۷۳ء

جلد ــــــ ۴۴
شمارہ ــــــ ۷

مدیر اعلیٰ
اعجاز صدیقی

معاونین
مہندر ناتھ
ڈاکٹر محمد حسن

مہتمم
ناظر نعمان صدیقی

اس شمارے میں

فون ــــــ ۳۵۹۹۰۴

زرِ سالانہ ــــــ ۱۰ ــــــ روپے
معاونین سے ــــــ ۲۰ ــــــ روپے
دائمی خریداری ــــــ ۱۲۵ ــــــ روپے
ممالک غیر ــــــ ۲۵ ــــــ شلنگ

فی پرچہ
ایک روپیہ

ترسیلِ زر کا پتہ
ماہنامہ شاعر، بمبئی ۴۰۰۰۰۸
ــــــ خط و کتابت کا پتہ ــــــ
ماہنامہ شاعر، مکتبہ قصر الادب، پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶
بمبئی ۴۰۰۰۰۸


انکم ٹیکس دہندگان!
محکمہ انکم ٹیکس کی طرف سے

ترتیب

جولائی ۱۹۷۳ء

شاعر بمبئی

محض زبان دانی ــــ یا ذریعۂ تعلیم بھی ؟!

بموقعِ معاصر "سب ساتھ" دہلی، آندھرا پردیش کے گورنر جناب [illegible] نے حکام کو [illegible] کے ذریعہ حکم دیا کہ ریاست میں اُردو ٹیچروں کی تقرریاں بلا تاخیر کی جائیں۔ یہ بات گورنر صاحب نے ریاستی انجمن ترقی اُردو کی کانفرنس میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہی۔ اسی کانفرنس میں [illegible] صاحب نے کہا کہ شکایت کی جاتی ہے کہ ایسے ٹیچر جو خود اُردو جانتے ہی نہیں انہیں اُردو داں ٹیچر قرار دے کر ان کا تقرر کیا جا رہا ہے۔

آندھرا پردیش میں اعلان کردہ چار ہزار اُردو ٹیچروں کی تقرری کا مسئلہ کافی الجھا ہوا ہے۔ اس سلسلے میں حکومت کی طرف سے کس حد تک سنجیدگی سے کام لیا جا رہا ہے اس کا اندازہ اخبارات کی بعض خبروں سے بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے۔ مرکزی حکومت کے احکامات اور گجرال کمیٹی کی سفارشات پر ٹھیک سے عمل درآمد نہیں ہو رہا ہے۔ جس طرح کے ٹھوس اقدامات کی ضرورت تھی وہ نہیں کیے گئے۔ جو کچھ اب تک ہوا ہے وہ توقع سے زیادہ نہیں۔

یہ تو اچھی بات ہے کہ ریاستی انجمن ترقی اُردو نے اپنی کانفرنس میں اُردو دوستوں سے حرکت و عمل کو تیز کرنے پر زور دیا۔ اس کانفرنس میں [illegible] نمائندوں نے شرکت کی۔ بعض نمائندوں نے بتایا کہ اُن کے اضلاع میں اُردو تعلیم کے سلسلے میں قصبہ قصبہ شاخیں اور کمیٹیاں بنائی جا چکی ہیں۔ ہم نے "شاہراہ" کے پچھلے شمارے میں "اُردو تعلیمی نگراں کمیٹیوں" کے قیام پر زور دیا تھا۔

مگر ایک بات صاف اور واضح نہیں ہوئی۔ اس کی صراحت نہ حکومتِ آندھرا پردیش کی طرف سے کی گئی ہے اور نہ ریاستی انجمن کی طرف سے کہ ریاست میں اُردو کا نیا تعلیمی نظام کس نوعیت کا ہوگا۔ یہ جو چار ہزار اُردو ٹیچروں کے تقرر کی اطلاعات کئی مہینے سے گشت کر رہی ہیں، ان ٹیچروں کو اُردو زبان پڑھانے کے لیے رکھا جا رہا ہے یا یہ دیگر مضامین بھی اُردو میں پڑھائیں گے؟ اگر صرف زبان پڑھانے کے لیے ٹیچروں کا تقرر کیا جا رہا ہے تو یہ ایک سطحی بات ہے۔ محض اُردو زبان پڑھا دینا اُردو تعلیم کے مسئلہ کا حل نہیں ہے۔ بنیادی بات اُردو ذریعۂ تعلیم کی ہے۔ یعنی پرائمری سے ہائر سیکنڈری تک کے تمام مضامین کی تعلیم اُردو میں ہو۔ اس کے ساتھ ہندی اور انگریزی زبانوں کی تعلیم بحیثیت زبان اس انداز سے دی جائے کہ طلبہ ان میں بھی پختہ اور معقول ہوں۔ اس طرح کا تعلیمی انتظام بعض دوسری ریاستوں میں موجود ہے۔ اس سلسلے میں ہم مہاراشٹر، اترپردیش اور میسور کا نام بطور مثال پیش کر سکتے ہیں۔ صرف بمبئی میں اُردو میڈیم کے تقریباً تین سو پرائمری اسکول اور تیس سے زائد ہائی اسکول ہیں جن میں ہزاروں کی تعداد میں طلبہ اور طالبات تمام مضامین کی تعلیم اُردو میں حاصل کرتے ہیں۔ اور امتحانات کے پرچے بھی اُردو ہی میں حل کرتے ہیں۔ یہ [illegible] اور ہندی اور انگریزی بھی۔ انہیں کالجوں میں داخلے ملتے ہیں اور یہ انگریزی میڈیم میں کالج کی تعلیم حاصل کر کے بی اے اور ایم اے کی ڈگریاں لیتے ہیں۔

جب مادری زبان میں تعلیم کے اصول کو مانا جا چکا ہے اور اسے [illegible] حیثیت حاصل ہے تو پھر آندھرا پردیش میں بڑی تعداد میں اُردو میڈیم اسکول کیوں نہیں [illegible] یا ہندی میڈیم کے اسکولوں میں [illegible] اُردو مادری زبان والے بچوں کو [illegible] تمام مضامین اُردو میں پڑھنے کی سہولت کیوں نہیں دی جا رہی۔ اُردو ٹریننگ کالج بھی ہونے چاہئیں تاکہ اُردو میں تمام مضامین کی تعلیم کے لیے ٹرینڈ ٹیچر مل سکیں۔ [illegible] ان ٹیچروں کا [illegible] چاہئیں جو [illegible] کی تعلیم حاصل کر چکے ہوں [illegible] پڑھانے کا [illegible] تجربہ ہو، جو اُردو اصطلاحات سے واقف ہوں۔

آندھرا پردیش ریاستی انجمن ترقی اُردو کو چاہئے کہ قطعی طور پر معلوم کرے کہ چار ہزار نئے ٹیچروں کا تقرر کس نوعیت کا ہے۔ [illegible] اس سلسلے میں واضح اعلان کا مطالبہ کرنا چاہیے۔

نذرِ اقبال

ڈی۔پی۔دھر

گلِ زخیابانِ جنتِ کشمیر

تنم گلِ ز خیابانِ جنتِ کشمیر
دل از حریمِ حجاز و نوا ز شیراز است

جناب درگا پرشاد دھر، جو ڈی۔پی۔ دھر کے نام سے مشہور ہیں، حکومتِ ہند میں منصوبہ بندی کے وزیر ہیں۔ اس سے پہلے آپ سوویت یونین میں ہندوستان کے سفیر تھے۔ پیشِ نظر مضمون سوویت یونین کے لئے لکھا گیا تھا اور روسی زبان میں شائع ہو چکا ہے۔ اردو میں پہلی بار شاعر میں شائع ہو رہا ہے۔ اس کے لئے ہم ڈی۔پی۔ صاحب کے ممنون ہیں۔ (ادارہ)

علامہ اقبال کی زندگی، تعلیم، فکر اور فن کا پھیلاؤ مشرق سے مغرب تک ہے اور وہ کلاسیکی جرمن فلسفے کا طالب علم ہونے کے علاوہ اپنے زمانے کی بہترین فکری، سیاسی اور تہذیبی تحریکوں کا ایک روشن آئینہ اور [illegible] کا بہترین ترجمان ہے۔

جب وہ کہتا ہے کہ:

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی ‎ ‎ برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

تو یہی حقیقت برہمن زادہ کی دستِ قلم اور صنعتِ بیان اس قوتِ فکر پر حیرت ہوتی ہے جو ہندوستان کے سب سے [illegible] اپنی [illegible] کے ساتھ عربی اور فارسی کی شستہ زبان و ادب جاننے والی تمام دنیا پر چھا گیا۔ سوویت یونین کے علمی و ادبی حلقوں سے بھی اقبال کا ایک گہرا رشتہ ہے۔

(۲)

سوویت یونین میں سوشلزم کی عظیم الشان فتوحات کے ساتھ مشرق و مغرب کے علوم اور ادبیات کی تشنگی بھی عام ہو گئی ہے۔ ادبیات کے جواہر پارے ان گلیوں، محلوں اور کھیتوں تک پہنچ رہے ہیں جہاں پہلے کبھی نہیں پہنچے تھے۔ خاص طور سے ہندوستان کے علوم اور ادبیات سے جو محبت کی جاتی ہے، انہیں جس دلچسپی اور احترام کے ہاتھوں سے جس طرح لیا جاتا ہے اس کی مثال باقی دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ ۱۹۶۲ء میں رابندر ناتھ ٹیگور کی تمام تصانیف کا مکمل سیٹ روسی زبان میں شائع کیا گیا اور پورے ملک کے ادبی حلقوں میں اس عظیم ہندوستانی شاعر کا جشن منایا گیا۔ ۱۹۶۹ء میں مرزا غالب کی جس طرح قدر دانی ہوئی، ان کا جشن منایا گیا، [illegible] اسی سال گورو نانک کی پانچ سو سالہ یادگار منائی گئی۔ علمی مضامین شائع ہوئے اور نسلِ حاضر کو ان کی تعلیم سے روشناس کیا گیا۔ اب ۱۹۷۲ء میں، عظیم ہندی شاعر امیر خسرو دہلوی کی تصانیف کا مکمل سیٹ اور ان پر علمی مضامین کے مجموعے شائع کرنے کی زبردست تیاریاں ہو رہی ہیں [illegible] تہذیب کا [illegible] سامنے ایک نمونہ [illegible] حقیقت [illegible] سوویت عوام مشرق کے ادب سے گہری محبت کرتے ہیں اور انسانیت کے بہترین ورثے کو عوام تک پہنچانے کے لئے سوویت یونین کے ادیب و اہلِ قلم کسی کوشش میں کمی نہیں کرتے۔

میں اپنے ملک کے نمائندے کی حیثیت سے ان باوقار کوششوں کا احترام کرتا ہوں [illegible]

[illegible]

ہے کہ گئے زمانے میں حضرت کشمیر کی کو خمیر پر تو تمام عجب شناسوں کا حق ہے لیکن میرے سامنے یہ کلام ہے کہ اقبال اپنا کشمیری برہمن خاندان ہونا کبھی نہیں بھولتے۔ وہ خود کو رنگ و نسل سے بلند سمجھنے والا اپنی شخصیت سے کیا کہتے ہیں!

[illegible]   [illegible]
[illegible]   [illegible]

لیکن شخصیت کی یہی تمام وسعت کے باوجود جہاں کشمیر اور ہندوستان کا ذکر آتا ہے وہاں ان کی شدید دردمندی اور فکر کی اپنی کیفیت ابھر آتی ہے۔

چہ بے پروا گذشتند از نوائے صبحگاہِ من   کہ برد آں شور و مستی از سیہ چشمانِ کشمیری!

آہ! یہ قومِ نجیب و چرب دست و تر دماغ   ہے کہاں روزِ مکافات اے خدائے دیر گیر!

چھپے رہیں گے زمانے کی آنکھ سے کب تک   گہر ہیں آبِ وُلر کے تمام یکدانہ

میں اصل کا خاص سومناتی   آبا مرے لاتی و مناتی
....   میرا کفِ خاک برہمن زاد

(۳)

کشمیر اور ہندوستان کے مختلف علاقوں میں آج بھی ایسے کئی خاندان موجود ہیں جن سے اقبال کی رشتہ داری تھی۔ جواہر لال نہرو کی طرح علامہ اقبال بھی اپنی تمام ذہنی وسعتوں کے باوجود اور عالمگیر انسانی برادری کے عقیدے کے باوجود آبِ وُلر کے گوہرِ یک دانہ تھے اور خود انہیں اس کا احساس بھی تھا۔ "ارمغانِ حجاز" ان کی زندگی کے آخری مرحلے کا کارنامہ ہے اور اس کی کئی نظمیں کشمیری عوام کے درد سے بھری ہیں۔ کشمیر سے جو تعلق اقبال کا تھا وہ یہاں بھی رنگ لایا کہ ان کا کلام کشمیر کی تحریکِ آزادی کے مختلف مرحلوں پر کام آتا رہا۔ مجھے ۱۹۴۶ء کا وہ دن یاد ہے جب ہندوستان کے مستقبل کے فیصلے پر برطانوی کابینہ مشن (cabinet-mission) سے گفتگو چل رہی تھی اور کشمیر کے لیڈروں کا اصرار تھا کہ ریاست کی عوام کی نمائندگی نواب اور مہاراجہ دکن ہی نہیں بلکہ وہ عوامی رہنماؤں کے ذریعے ہونی چاہیے۔ اس پر اختلاف رہا اور یہ مطالبہ منظور نہ ہو سکا۔ ۱۸۴۶ء میں کشمیر کی ریاست کا علاقہ مہاراجہ گلاب سنگھ نے انگریزوں سے ۷۵ لاکھ روپے کے عوض خریدا تھا اور ایک قوم کی پوری خرید و فروخت کا یہ واقعہ تاریخ میں معاہدۂ امرتسر کے نام سے مشہور ہے۔

یہ معاہدہ جسے ہم بیعنامہ سمجھتے تھے اقبال کے لفظوں میں پوری ایک قوم کا سودا تھا۔

بادِ صبا اگر بہ جنیوا گذر کنی   حرفے ز ما بہ مجلسِ اقوام باز گو
دہقان و کشت و جوی و خیاباں فروختند   قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند

آزادی حاصل کرنے کے لئے انسان کی جدوجہد کی تاریخ میں شاید یہ کوئی اکیلی مثال ہے جہاں کسی شاعر کے خیالات نے ایک مضبوط تحریک کو جنم دیا ہو اور اس کے اشعار ہر مرد و زن کے دل میں موجزن رہے ہوں اور انہیں بڑی سے بڑی قربانی دینے پر آمادہ کیا ہو۔ لیکن اقبال کے ان اشعار نے ایک پوری قوم کو سامراج اور جاگیردارانہ نظام کے خلاف صف آرا کیا اور بالآخر انہیں فتح حاصل ہوئی۔

۱۹۳۱ء [illegible] کشمیر [illegible] عوامی حقوق کی [illegible] کے خلاف آواز تھی جو ۱۹۴۷ء میں بالآخر [illegible]

[illegible] فرصت سے [illegible] کے آثار ہندوستان کا [illegible] ہو گیا۔ ۱۹۲۳ء میں [illegible] وہ [illegible] دو [illegible] (colonialist forces) [illegible] پر کشمیر [illegible] کے [illegible] اسباب [illegible] [illegible] معاملات کی [illegible] ختم ہو گیا جو [illegible] ہو چکا تھا اور جسے اب [illegible] جا سکتا۔

(۴)

اقبال کی ذہنی بیداری اور شعری سرگرمی ہندوستان کی قومی آزادی کی تحریک کے ایک خاص مرحلے پر شروع ہوتی ہے۔ [illegible] کلام [illegible] ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا لیکن ۲۰ ویں صدی کے شروع ہوتے ہی ان کی حب الوطنی کی نظمیں مشہور ہونے لگی تھیں۔ [illegible] سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا [illegible] ملک کے طول و عرض میں پھیل گیا اس کے بعد [illegible] [illegible] حال [illegible] ہے۔

[illegible] ہندوستاں [illegible] کوئی [illegible] ... [illegible] انساں [illegible]

[illegible] قدم رکھ رہے تھے جب انہوں نے "ہندوستانی بچوں کا قومی گیت" کے عنوان سے خود اپنے حب الوطنی کا اعلان کیا۔

چشتی نے جس زمیں میں پیغامِ حق سنایا ... نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا ... جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

حب الوطنی کے ساتھ ہندوستان جیسے ایک نوآبادیاتی ملک (Colonial country) میں قوم پرستی یا National[illegible] کی تحریک آگے بڑھ رہی تھی اور [illegible] اقبال بھی اس کے نغمہ خوانوں میں شریک تھے یہاں تک کہ ۱۹۰۵ء میں وہ فلسفے کی اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان روانہ ہوئے۔ ڈاکٹریٹ حاصل کرنے کے لئے یورپ اور ہائیڈل برگ پہنچے۔ انہوں نے یورپ میں نیشنلزم کا دوسرا [illegible] دیکھا جرمنی فرانس برطانیہ [illegible] [illegible] نیشنلزم کے جھنڈے تلے جب [illegible] کے گیت گا کر دنیا کی کمزور قوموں کے حصے بخرے اور بانٹ ہونے طاقتوں پر [illegible] کے لئے خوفناک جنگ کی تیاریاں کر رہے تھے۔ عالمگیر انسانی برادری کا تصور محض کتابوں اور [illegible] میں رہ گیا تھا اور مغرب [illegible] دنیا کے کسی حصے میں کوئی ایسی طاقت موجود نہ تھی جو اس تصور کی عملی شکل پیش کر سکتی۔ یہاں سے اقبال کی ذہنی تلاش پر ایک کاری ضرب لگی اور انہوں نے جنگِ زرگری کی تیاریاں کرنے والی سامراجی تہذیب کی [illegible] آنکھیں ڈال کر صاف کہا:

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی ... جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

وطن یا وطنیت کا یہ جارحانہ (aggressive) تصور جو کمزور [illegible] غارت کرنے کو [illegible] نیشنلزم کا کارنامہ سمجھتا ہے۔ وطن کے سیاسی تصور کے بارے میں انہوں نے دیکھا کہ:

اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے ... تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے ... کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

خدا کی مخلوق [illegible] میں [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] فلسفہ اور [illegible] ادب کے ایک [illegible] اقبال کو [illegible] [illegible]

[illegible] Imperialism [illegible] ایک طرف [illegible] آزادی [illegible] ہیں [illegible]
Nietzsche کے super man [illegible] کی طرف [illegible] ہے۔ یہاں سے [illegible] فرد و ملت [illegible] مردِ مومن کے [illegible] سب سے نمایاں [illegible] کلام [illegible] مثنوی اسرار و رموز کے [illegible] خودی [illegible] بے خودی [illegible] بیان کو اہمیت دیتے ہیں۔

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں ۔۔۔ موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اس ملک میں جو انہوں نے پہلے [illegible] ہندوستانی [illegible] مسلم اور غیر مسلم کی کچھ تمیز نہیں [illegible] چاہیے کہ [illegible] تباہ حالت ہے اور اس پر قناعت سے [illegible] خودی کے اسرار بیان کرتے ہوئے وہ اس مثنوی میں برہمن سے کہتے ہیں:

من نگویم از بتان بیزار شو ۔۔۔ کافری شائستۂ زنار شو
اے امانت دارِ تہذیبِ کہن ۔۔۔ پشتِ پا بر مسلکِ آبا مزن
گر ز جمعیت حیاتِ ملت است ۔۔۔ کفر ہم سرمایۂ جمعیت است

دو عالمگیر جنگوں کے درمیان کا زمانہ یورپ اور ایشیا کے اکثر ملکوں میں [illegible] انقلاب آفریں [illegible] زمانہ ہے۔ انقلاب اکتوبر ۱۹۱۷ء ان تمام واقعات (Events) کے سلسلے میں سب سے بڑا تاریخ ساز (Epock making) واقعہ تھا جس نے نہ صرف امپریلسٹ طاقتوں کے [illegible] بلکہ قوموں کی غلامی اور آزادی کے مسئلے کو نیا رخ دیا اور دنیا کے محکوموں کو نئی امیدوں سے روشناس کر دیا۔

اقبال کے پیامِ فکر اور شاعری میں اس واقعے کی زبردست گونج سنائی دیتی ہے۔ وہ براہِ راست انقلاب کا نعرہ بلند کرتے ہیں اور ملوکیت Emperialism کے خلاف نعرۂ جنگ بلند کرتے ہیں۔ پیامِ مشرق جو جرمن مفکر اور شاعر گوئٹے کے West ost Diwan کے جواب میں نظموں کا ایک مجموعہ ہے ۱۹۲۳ء کے قریب تیار ہو چکا تھا۔ اس میں اقبال کی آواز میں افسردگی کے بجائے مردانگی حاوی ہے۔

از غلامی دل بمیرد در بدن ۔۔۔ از غلامی روح گردد بارِ تن
از غلامی بزمِ ملت فرد فرد ۔۔۔ این و آن با این و آن اندر نبرد

ہندوستان میں آزادی کی لہر جو ۱۹۱۸ء میں جنگ ختم ہوتے ہوتے بڑے زور و شور سے اٹھی تھی جس نے ملک کی آبادی کے مختلف طبقوں اور گروہوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا ۱۹۲۲ء کے بعد سے افتراق اور اختلاف کی سازشوں کا شکار ہونے لگتی ہے۔ اقبال کے دل سے [illegible] ہے اور ملک کی سب سے زیادہ [illegible] کی نظموں کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ وہی اقبال جو یورپ سے واپسی کے کوئی ایک سال بعد ہندوستان کے افسردہ احوال سے اس درجہ بیزار تھے کہ "میری خواہش تو یہ ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو اس ملک کو چھوڑ جاؤں"... (اقبال نامہ جلد دوم صفحہ ۱۱۸) وہ اب ملک چھوڑ جانے کی بجائے اس افتراق اور انتشار کو [illegible] نیت سے انقلاب کا بلند بانگ نغمہ سناتے ہیں۔

اے ہمالہ اے اٹک اے رودِ گنگ ۔۔۔ زیستن تا کے چنان بے آب و رنگ
شرق و غرب آزاد و ما نخچیرِ غیر ۔۔۔ خشتِ ما سرمایۂ تعمیرِ غیر
ہندیان با یکدگر آویختند ۔۔۔ فتنہ ہای کہنہ باز انگیختند

[illegible]

کافر شکی قوت او از غضب زمیں — عالمے آورد بزور ربگر و محال
کس نداند جلوۂ آب از سراب
انقلاب اے انقلاب اے انقلاب

تیرگی افکار ایشیا پر ہے اور ہندوستان میں انقلاب برپا ہو چکا ہے ۔ محکوم ملکوں میں آزادی کی جدوجہد تیز ہے یہاں انقلاب تھا اقبال کا فلسفۂ خودی اور جمعیتِ ملت کی تعمیر اور تکمیل کا نقطۂ آغاز ہے اور وہ جوانوں کو پیغام دیتے ہیں

اے جواں دامانِ او محکم بگیر — در غلامی زادۂ آزاد میر

تم غلامی میں آنکھ کھولی لیکن زندگی ایسی گزارو کہ جب آنکھ بند ہو تو تم آزاد ہو ۔ نیشنلزم اور وطنیت کے سیاسی تصور سے انکار کرنے والے اقبال کا یہ پیغام دراصل قومی اور وطنی تحریکوں کی شکل میں سامنے آ رہا تھا اور اقبال ان آثار سے خوش تھے ۔ یہ فکر کا تضاد نہیں بلکہ فکر کا ارتقا اور شاعر کا فنی بلوغ ہے ۔

(۵)

اقبال نے کم و بیش ۴۰ سال شاعری کی ۔ شاعری کے علاوہ اُن کے خطبات اور خطوط بھی شائع ہوتے رہے ۔ وہ اپنے مختلف خیالات اور نظریات کے بارے کافی سیاسی ، سماجی اور علمی حلقوں میں نکتہ چینی کا نشانہ بھی بنے ۔ انہوں نے کئی بار اپنی پوزیشن بھی واضح کی اور خیالات اور بیانات میں بھی ترمیم کی لیکن اُن کی زندگی اور فکر و فن پر کوئی ایسا وقت نہیں گزرا جب ہندوستان کی قومی آزادی کی تحریک سے منکر ہوئے ہوں ۔ جب انہوں نے ہندوستان کی تہذیب سے اُس کے علمی کارناموں سے اس کی روایات اور ملکوں سے اس کے تاریخی رہنماؤں سے اور ہندوستان کے لئے پیار دل کے درد سے انکار کیا ہو ۔

اُن کی اُردو نظموں کا بہترین مجموعہ "بالِ جبریل" کو شمار کیا جاتا ہے اور اس مجموعے کی ابتدا ہوتی ہے سنسکرت کے شاعر بھرتری ہری کے کلام سے ۔ رام ، کرشن ، گوتم بدھ ، وشوامتر ، سوامی رام تیرتھ ، گرو نانک ، اکبر اور سلطان ٹیپو اُن کے محبوب ہیرو ہیں اور اپنی نظموں میں وہ خراجِ عقیدت پیش کیا ہے جو کوئی بڑے سے بڑا محبِ وطن ہندوستانی دے سکتا تھا ۔

"جاوید نامہ" ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا ۔ جب اقبال کی فکر اور شاعری دونوں معراجِ کمال کو پہنچ چکے تھے ۔ آسمان کی رفعتوں پر رشی وشوامتر کے بعد جنوبی ہند خصوصاً میسور کی آزادی کا ہیرو سلطان ٹیپو ملتا ہے جو آج یہ جاننے کو بے چین ہے کہ ملک انگریزوں سے آزاد ہونے کے لئے کیا کوشش کر رہا ہے ۔ بنگال اور میسور کے دو کردار جو خفیہ طور پر انگریزی ایجنٹوں سے مل گئے تھے "میر جعفر اور میر صادق" انہیں دوزخ بھی اپنی آگ میں جلانے کے لئے تیار نہیں اور قومی آزادی کی تحریک سے غداری کرنے والے ان دو تاریخی کرداروں کے متعلق اقبال کا یہ شعر ضرب المثل ہو چکا ہے

جعفر از بنگال و صادق از دکن — ننگِ ملت ننگِ دیں ننگِ وطن

یہاں ملت ، دین اور وطن سب یکجا ہو گئے ہیں ۔ سب سے دردناک تصویر "روحِ مادرِ ہند" کی ہے جو نورِ لایزال کی حسین پیکر ہونے کے باوجود طوق و بند میں گرفتار ہے ۔

آسماں شق گشت و حوری پاک زاد — پردہ را از چہرۂ خود برگشاد
گفت تو کہ روحِ ہندست این نگر — [illegible] سوز او اندر جگر

یہ روحِ پاک زاد ہندوستانیوں سے شکوہ کرتی ہے :

[illegible] ... اندر [illegible]
[illegible]

اقبال کی شاعری میں اول سے آخر تک فرسودہ روایات اور رسوم کہنہ کے خلاف جذبہ ملتا ہے لیکن جب انہوں نے اپنی مشہور نظم نیا شوالہ لکھی تو

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے　　تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے

اپنی رسوم کہنہ "اور عزیزیت کے پردوں کے خلاف" وہ اپنی بعد کی نظموں میں فریاد کر رہے ہیں۔ پچاس برس کی عمر ہو چکی تھی اور ان کے ذہنی ارتقا کا ہر جا اور ہو چکا تھا جب انہوں نے "شعاع امید" تصنیف کی ہے۔ یہ ایک نہایت خوبصورت نظم ہے جس میں سورج اپنی شعاعوں کو زمین سے واپس طلب کر لیتا ہے لیکن

اک شوخ کرن، شوخ مثال نگہ حور　　آرام سے فارغ، صفت جوہر سیماب
بولی کہ مجھے رخصت تنویر عطا ہو　　جب تک نہ ہو مشرق کا ہر اک ذرہ جہاں تاب
چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو　　جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردان گراں خواب
خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز　　اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب

کونسی خاک ہے یہ؟ سر زمین ہندوستان کو اس سے بڑھ کر خراج عقیدت اور کیا ہو سکتا ہے کہ،

اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غواص معانی　　جن کے لئے ہر بحر پر آشوب ہے پایاب

نظم میں پیغام یہ تمام ہوتا ہے کہ مشرق و مغرب میں جہاں جہاں تاریکی ہے "رسوم کہنہ" کے بندھن ہیں وہاں آفتاب کی شعاعوں کا پھیلنا قانون فطرت ہے۔۔۔

فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

"بال جبریل" میں بھی بیٹے کو یہی نصیحت کرتے ہیں،

اٹھا نہ شیشہ گران فرنگ کے احساں　　سفال ہند سے مینا و جام پیدا کر

ہندوستان کی قومی آزادی کی عظیم الشان تحریک جس نے گاندھی جی کی رہنمائی میں اقتصادی سطح پر سودیشی تحریک کو جنم دیا اس کے سوا اور کیا طلب کر رہی تھی؟ "وطنیت" کے سیاسی تصور سے انکار کرنے کے باوجود اقبال کے ہاں ہندوستان کی قومی تحریک اور وطنی آزادی کے تمام عناصر بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ ان کا مثالی ہیرو "مرد مومن" بھی کسی ایک مذہب یا فرقے کا آدمی نہیں بلکہ وہ صدیوں کے خواب سے جاگا ہوا تازہ دم، خود آگاہ اور بالکل نوجوان ہے جو "رسوم کہنہ" "عزیزیت" "تن بے عملی" اور "افسردگی" کے تمام بندھنوں کو توڑ کر نئی دنیا آباد کرنا چاہتا ہے۔ اسی پہلو سے انہیں روس کے انقلاب سے آئندہ کی امیدیں بندھتی ہیں،

پرانی سیاست گری خوار ہے　　زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے
گیا دور سرمایہ داری گیا　　تماشا دکھا کر مداری گیا

(ساقی نامہ۔ بال جبریل)

یہ آواز بدلتے ہوئے حالات اور اختلافات کے باوجود عمر کے آخری دنوں تک بلند رہی ہے۔ یہ اس زمانے میں بھی بلند رہی جب وہ مسلم لیگ کے آل انڈیا اجلاس (الہ آباد) کی صدارت (۱۹۳۰) کر چکے تھے اور پاکستان کے نظریہ کو ان کی فکر سے منسوب کیا جا رہا تھا۔
ہندوستان کا نقشہ اس کی جغرافیائی حیثیت، اس کی گہری اور وسیع تہذیب کے پس منظر سے نہ صرف واقفیت ضروری ہے بلکہ عالمگیر پیمانے پر آنے والی تبدیلیوں میں ہندوستان کی سیاسی پوزیشن کا بھی گہرا علم ہونا چاہیے تب جا کر یہ پیغمبرانہ پیشین گوئی زبان سے نکلتی ہے،

[illegible] زناری اوست　　کشاد ہر گرہ از تار اوست
پس است ... ہندوستان را　　غلام آزاد از بیداری اوست

(بقیہ صفحہ ۲۴ پر ملاحظہ کیجئے)

سردار جعفری

اقبال

اقبال کی شخصیت کی تعمیر میں کشمیری برہمن کا دماغ، اسلام کا عشق، [illegible] الٰہیات، مغربی علوم، ہندی فلسفہ، جلال الدین رومی اور غالب کی شاعری، مارکس اور لینن کے انقلابی تصورات سب شامل ہیں ؎

خرد افزود مرا درس حکیمان فرنگ،
سینہ افروخت مرا صحبت صاحب نظراں

یورپ و فرنگ کی تحریک، شعرا، فلسفی اور سائنس داں سب کا مطالعہ کیا ہے۔ اقبال نے صرف اپنی شاعری میں جن کا ذکر کیا ہے اُن میں [illegible] ٹالسٹائی، شیکسپیئر، ہیگل، نطشے، گوئٹے، برگساں، [illegible] براؤننگ، ورڈز ورتھ، آئن سٹائن، مارکس، لینن [illegible] وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں اور مشرقی صاحب کمالات میں اسلامی ہستیوں کے علاوہ رام، گوتم بدھ، شیو، بھرتری ہری، شنکر اچاریہ، گرو نانک وغیرہ۔ اپنی ایک طرح کی [illegible] نے [illegible] سب کی عظمت کا اعتراف کیا ہے بلکہ [illegible] پہلی بار ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی، گایتری کا ترجمہ ہے۔ اور بال جبریل جس کی اشاعت کا سنہ ۱۹۳۴ء ہے، بھرتری ہری کے اس شعر سے شروع ہوتی ہے ؎

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

ایک اور شعر میں اقبال نے اپنے حسب و نسب [illegible] کا پتہ اس طرح دیا ہے ؎

تنم گلے ز خیابان جنت کشمیر
دل از حریم حجاز و نوا ز شیراز است

یہاں غالب کی طرح ایرانی شاعرانہ مزاج 'ذہن ہند' سے ہم آہنگ ہے۔ واقعی ایک عظیم شاعر اسلام میں اقبال نے ذہن ہندی کو [illegible] کی طرح عظیم اور حسین سمجھا ہے اور اقبال کو اپنی فلسفہ دانی پر بڑا ناز تھا اور یہ کہ وہ اپنے برہمن آبا و اجداد کی دین اور ذہن ہندی کی خصوصیت سمجھتے تھے۔ مشرق [illegible] ہند فلسفے اور جدید مغربی فلسفے کی حد تک ہی نہیں بلکہ مولانا جلال الدین رومی کے فلسفیانہ مزاج کو سمجھنے کے لئے بھی اقبال نے اپنی برہمن زادگی کو خصوصیت قرار دیا ہے ؎

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی
برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

ظاہر ہے کہ اس مزاج کے شاعر کو تنگ نظری [illegible] مسلم عصبیت اور دونوں نے مل کر ایک عظیم آفاقی شاعر کو [illegible] کیا بنا دیا۔ اقبال کی شاعری کو [illegible] کے پیمانے سے تولنا اس کی قدر و قیمت متعین کرنا [illegible] ہے۔ نیشنلزم جب اپنی حد سے [illegible] کر لیتا ہے جس کے خلاف جواہر لال نے آگاہ کیا ہے تو وہ فرقہ پرستی کی طرح تنگ نظر ہو جاتی ہے۔ اقبال کی طرح کے شاعر صرف جغرافیائی اعتبار سے کسی ایک ملک یا کسی ایک مذہب کے شاعر کہے جا سکتے ہیں اور ان کا ذہن [illegible] آفاقی اور عالمگیر ہوتا ہے۔ تنگ نظری اور عصبیت کے بطن سے بڑا شاعر کبھی پیدا نہیں ہو سکتا ؎

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں

"It would be get on with him. He was in reminiscent mood and he wandered from one subject to another, and I listened to him, talking little myself. I admired him and his poetry and it pleased me greatly to feel that he liked me and had a good opinion of me. A little before I left him he said to me: 'What is there in common between JINAH and you? He is a politician, you are a patriot."

DISCOVERY OF INDIA
JAWAHARLAL NEHRU

THE SIGNET PRESS CALCUTTA. P. 365

[illegible]

[illegible]

تحفے ہیں جن میں سے کئی ہندوستان کو کشمیر نے عطا کیے ہیں۔ جواہر لال اور اقبال دونوں کشمیری النسل تھے۔ (اقبال کا خاندان کئی پشت پہلے مسلمان ہو گیا تھا) اور اس مشترکہ خصوصیت کے ساتھ دونوں ہندوستان کی نجات کے لیے سوشلزم کو ضروری سمجھتے تھے۔ پنڈت نہرو نے اقبال سے اپنی ملاقات کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے :-

"During his last years IQBAL turned more and more towards socialism. The great progress that Soviet Russia had made attracted him. Even his poetry took a different turn. A few months before his death, as he lay on his sick bed, he sent for me and I gladly obeyed the summons. As I talked to him about many things I felt that, in spite of differences, how much we had in common and how easy

خطاب کرتا ہے ؎

بندۂ ما این ذوق آزادی کہ داد
صید را سودای صیادی کہ داد
آن برہمن زادگان زندہ دلے
لالۂ احمر ز روی شان خجل
تیز بین و پختہ کار و سخت کوش
از نگاہ شان فرنگ اندر خروش
اصل شان از خاک دامنگیر ماست
مطلع این اختران کشمیر ماست
خاک ما را بے شرر دانی اگر
بر درون خود یکے بکشا نظر
این ہمہ سوزے کہ داری از کجاست
این دم باد بہاری از کجاست
ایں ہماں باد است کز تاثیر او
کوہسار ما بگیرد رنگ و بو

جن برہمن زادگانِ زندہ دل کے ساتھ اقبال نے اپنا شمار کیا ہے ان سے بظاہر لال نہرو کے خاندان کو خارج نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ اس خاندان کے سوا کسی دوسرے خاندان کی طرف نگاہ جا ہی نہیں سکتی۔ اس نظم کی تخلیق کی تاریخ اور مکمل آزادی کی لاہور والی تجویز کی تاریخ دور دور نہیں ہے۔ اور ۱۹۳۰ء میں جواہر لال کی شہرت اور مقبولیت اور آزادی کا ہنگامہ دونوں اپنے شباب پر تھے۔ از نگاہ شان فرنگ اندر خروش۔

اس کے علاوہ پنڈت نہرو کے بیان کی تصدیق ۱۹۲۲ء میں میاں افتخار الدین اور ۴۴-۱۹۴۳ء میں [illegible] سے [illegible] کر چکے تھے۔ نہرو اور اقبال کی ملاقات کے وقت یہ دونوں حضرات وہاں موجود تھے۔ جب میں [illegible] تو انہوں نے مجھے دو باتیں [illegible] ایک یہ کہ علامہ اقبال اور گرو دیو ٹیگور دونوں [illegible] اور دوسرے [illegible] ایسا ہوا کہ [illegible] ملاقات نہ ہو سکی۔

اور دوسری بات یہ کہ اقبال [illegible] نہیں تھی۔

یہاں میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ جس طرح جواہر لال، گاندھی اور ٹیگور ہندو تھے اسی طرح اقبال مسلمان تھے۔ لیکن ان بزرگوں کے دل میں ساری مخلوقِ خدا کا احترام تھا جیسا کہ اقبال نے جاوید نامہ میں کہا ہے ؎

حرف بد را بر لب آوردن خطاست
کافر و مومن ہمہ خلق خداست
آدمیت احترام آدمی
با خبر شو از مقام آدمی
آدمی را ربط و ضبط تن بہ تن
بر طریق دوستی گامے بزن
بندۂ عشق از خدا گیرد طریق
می شود بر کافر و مومن شفیق
کفر و دین را گیر در پہنائے دل
دل اگر بگریزد از دل وائے دل
گرچہ دل زندانی آب و گل است
این ہمہ آفاق آفاق دل است

اقبال نے کافر و مومن کے الفاظ لغوی معنوں میں بھی استعمال کئے ہیں لیکن فکر کی اعلیٰ سطح پر ہندو اور مسلمان کے معنوں میں استعمال نہیں کئے ہیں۔ ان کے نظام فکر میں خدا کی تخلیق کی ہوئی یہ دنیا نامکمل ہے۔ اور تخلیق کا عمل جاری ہے۔ اس میں انسان [illegible] پر ایک [illegible] ہے۔ یہ تخلیق آدم کو بندۂ مومن بناتی ہے۔ جس نے اپنی قوت تخلیق کو پا لیا اس نے [illegible] کر لی۔ چنانچہ جاوید نامہ میں اقبال نے کافر کی یہ تعریف کی ہے جو جمال الدین افغانی کی زبان سے بیان ہوئی ہے ؎

بندۂ آزاد را آید گران
زیستن اندر جہان دیگران
ہر کہ او را قوت تخلیق نیست
پیش ما جز کافر و زندیق نیست
از جمال ما نصیب خود نبرد

از نگاہش روزگاراں [illegible] تو بر تو

مردِ حق برندہ چوں شمشیر باش
خود جہانِ خویش را تقدیر باش

ایک دوسری جگہ کافر اور مومن کے اختلاف کو بغیر اقبال نے نمایاں کیا ہے

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

جس نے اپنی خودی کو حاصل نہیں کیا وہ خدا کو تلاش نہیں کر سکتا ہے

خودی میں گم ہے خدائی تلاش کر غافل
یہی ہے تیرے لیے اب صلاحِ کار کی راہ

از ہمہ کس کنارہ گیر صحبت آشنا طلب
ہم ز خدا خودی طلب ہم ز خودی خدا طلب

مسلمان اور کافر میں یہی فرق ہے کہ ایک خودی کا رازداں ہے اور دوسرا نہیں

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

ایسا مومن وہ عارفِ ہندی بھی ہے جس کو اقبال نے جاوید نامہ میں "جہاں دوست" کہا ہے جو وشوامتر کا لفظی ترجمہ ہے۔ لیکن جس کے بیان میں اقبال نے شیو کی بعض خصوصیات شامل کر دی ہیں۔ اس عارفِ ہندی سے جو اقبال کو خبر دیتا ہے کہ ہنگامِ طلوع شفا و راست' سوال و جواب کے بعد یہ شعر آتا ہے

از کلامم لذتِ جانش فزود
نکتہ ہائے دلنشیں بر من کشود

اور ان نکتہ ہائے دلنشیں میں یہ بھی دو نکتے ہیں

کافری مرگ است اے روشن نہاد
کے سزد با مردہ کافر را جہاد

مردِ مومن زندہ و با خود بجنگ
بر خود افتد ہمچو بر آہو پلنگ

کافرِ بیدار دل پیشِ صنم
بہ ز دیندارے کہ خفت اندر حرم

اس مقام سے گزر کر شاعر [illegible] تک پہنچ گیا ہے۔

غالب کا ایک خوبصورت شعر ہے

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

اقبال نے اس وفاداری کو خودی کی شرط قرار دیا ہے چنانچہ اپنی طویل مثنوی اسرارِ خودی میں جہاں شاعر نے اپنے فلسفے کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے' ایک مکالمہ شیخ و برہمن کے درمیان ہوتا ہے جس میں بنارس کے برہمن سے شیخ کہتا ہے

من نہ گویم از بتاں بیزار شو
کافری؟ شائستۂ زنار شو
اے امانت دارِ تہذیبِ کہن
پشت پا بر مسلکِ آبا مزن
گر ز جمعیت حیاتِ ملت است
کفر ہم سرمایۂ جمعیت است
تو کہ ہم در کافری کامل نہ
در خورِ طوفِ حریمِ دل نہ
ماندہ ایم از جادۂ تسلیم دور
تو ز آزر، من ز ابراہیم دور
قیسِ ما سودائیِ محمل نہ شد
در جنونِ عاشقی کامل نہ شد
مرد چوں شمعِ خودی اندر وجود
از خیالِ آسماں پیما چہ سود

اقبال کے فلسفے میں سارا نظامِ عالم اور تسلسلِ حیات خودی کے استحکام پر منحصر ہے۔ وہ یہی ہستی کو آثارِ خودی اور اسرارِ خودی کہتا ہے جس سے عالم پیدا [illegible] اثبات اور نفی جدلیاتی قوتیں ہیں جن کے ٹکراؤ اور کشمکش کر خودی ترقی کرتی ہے اور اپنی قوت سے آشنا ہوتی ہے۔ [illegible] پر کہتا ہے کہ [illegible] اور [illegible]

کو اقبال [illegible] کے فلسفے میں مضمر ہے۔ یہ نکتہ
اسلامی حکما اور صوفیا کے سلسلوں میں بھی کیا گیا ہے۔
مگر اقبال [illegible] جو انسان کی خودی کا تشکیل
پاتا ہے [illegible] خودی میں شامل ہیں۔ قوت تخلیق اور قوت
عمل خودی کے مظاہر ہیں۔ انہیں سے مقاصد کی تولید اور
تخلیق ہوتی ہے۔ مقاصد اور حسن کا نام خودی ہے۔ عشق و
جستجو سے پائندہ اور تابندہ تر ہوتی ہے۔ مگر خودی سوال
سے کمزور ہوتی ہے۔ یہاں ترک دنیا اور اصل ترک ہوس کا نام
ہے [illegible] کائنات خودی کی طاقت سے مسخر کی جاتی ہے
[illegible] تخلیق کو انسان کی قوت عمل و قوت تخلیق تکمیل اور
[illegible] کی طرف لے جاتی ہے ؎

اے [illegible] راہ بجائے دربند
انجم کدہ بہ کیمیا جہان می بافت
گفت یزداں کہ چنین است و دگر ہیچ مگو
گفت آدم کہ چنین است و چنان می بایست

(زبور عجم)

اقبال نے جرمن شاعر گوئٹے کے دیوان مغربی
(West ostlicher Diwan) کے جواب
میں جو فارسی کتاب پیام مشرق لکھی تھی اس میں ایک نظم
ہے "مکالمہ مابین خدا و انسان" جس میں انسان کی تخلیقی
برتری کو اس طرح پیش کیا گیا ہے ؎

خدا

جہاں را ز یک آب و گل آفریدم
تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی
من از خاک پولاد ناب آفریدم
تو شمشیر و تیر و تفنگ آفریدی
تبر آفریدی نہال چمن را
قفس ساختی طائر نغمہ زن را

انسان

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدم
خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

انسان کی تخلیقی قوت [illegible]
اقبال کے یہاں [illegible]
[illegible] کی شاعری کا [illegible] آدم کا پہلا گناہ [illegible]
[illegible] نظم سرگزشت آدم [illegible]
اس پیام کو [illegible] کے بعد جب انسان جنت سے اس عالم خاک
[illegible] آتا ہے تو اس پر اس کی عظمت کے دروازے کھل
گئے ہیں۔ فرشتے اس کو رخصت کرتے وقت اس کی تعریف
میں گیت گاتے ہیں اور روح ارضی ان الفاظ میں اس کا
استقبال کرتی ہے ؎

کھول آنکھ زمیں دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ
ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ گنبد افلاک یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ یہ صحرا یہ سمندر یہ ہوائیں
تھیں پیش نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

خورشید جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ہے ترے خون جگر میں
اے پیکر گل کوشش پیہم کی جزا دیکھ

انسان کے پیکر گل میں [illegible]
اس کو [illegible] تقدیر جہاں [illegible]
اشرف المخلوقات [illegible]
بلکہ ہے کیونکہ فرشتوں کی [illegible]
[illegible] میں مصروف [illegible]
[illegible]

ڈاکٹر تارا چند رستوگی

اقبال پر زرتشتیت کا اثر

اقبال کے جامِ شیرو مے کو زرتشتیت نے بھی فروغ جلوہ عطا کیا ہے۔ میں نے ایک مقالے میں جس کا عنوان "اقبال اور آئنسٹین" ہے۔ جاوید نامہ کے ایک کردار زروان کا ذکر کرتے ہوئے زرتشتیت سے اثرپذیری کی طرف اشارہ کیا ہے۔ غالباً محولہ مضمون کی متذکرہ عبارت کو یہاں پیش کرنا نا درست نہ ہوگا۔

"...... زمان و مکان کا تصور اقبال کو اتنا دلچسپ معلوم ہوا کہ اُس نے اپنی تصنیف جاوید نامہ میں ایک کردار کو آئنسٹین کے نظریۂ زمان و مکان پر تشکیل کر کے پیش کر دیا اور نام رکھا زروان۔ لیکن لفظ زروان کہاں سے لیا گیا ہے۔ ابھی تک کسی نقاد نے اس پر توجہ نہیں دی ہے...... زروان کو اقبال نے اوستا سے لیا ہے۔ اوستا میں دو اصطلاحیں ملتی ہیں۔ زروان (ZARWAN) یا زُروان (ZURWAN) اور دریگھو خودھاتا (DAREGHO - KHVADHTA) پہلی اصطلاح کے معنی ہیں۔ زمان لامحدود یعنی ابد اور دوسری سے مراد ہے وقت یعنی ابد سے لیا ہوا ایک حصہ۔ اقبال کا زروان یہیں سے لیا ہوا ہے بس فرق اتنا ہے کہ اُس نے اپنے زروان کو زمان و مکان کی علامت بنا کر پیش کیا ہے (اقبال اور آئنسٹین" اردو ادب شمارہ ۳ ۱۹۷۵ء)

بات لفظ زروان ہی پر ختم نہیں ہو جاتی۔ اقبال نے اِس کے علاوہ بھی بہت کچھ زرتشتیت سے لیا ہے۔ فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لئے اقبال کے تحقیقی مقالہ کا موضوع تھا۔ THE DEVELOPMENT OF METAPHYSICS IN PERSIA (ایران میں مابعد الطبیعات کا ارتقا)۔ ظاہر ہے کہ اقبال نے زرتشتیت کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہوگا۔

عہدِ قدیم میں ہند ایرانی اقوام کے مذہبی خیالات میں بنیادی طور پر خاصی یکسانیت پائی جاتی تھی۔ زرتشتیت کے مذہبی صحیفہ "اوستا" کی بیشتر گاتھائیں (آیات) ویدک شلوکوں سے مطابقت رکھتی ہیں اور بہت سے تصورات میں بھرپور ہم آہنگی نظر آتی ہے۔ رگ وید میں جو مفہوم لفظ ریتا (RITA) سے ابھرتا ہے وہی اوستا میں لفظ آشا (ASHA) سے نکلتا ہے۔ دونوں ہی پاکیزگی یا نکوکاری و تقویٰ پر دلالت کرتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ رگ وید اور اوستا کے یہ الفاظ صداقتِ ازلی (ETERNAL TRUTH) کا مفہوم بھی پیش کرتے ہیں اور اسی صداقتِ ازلی کو تمام مظاہر اور نشو و نما (MANIFESTATIONS AND EVOLUTIONS) کی واحد صداقت تصور کرتے ہیں۔ مزید براں ان الفاظ کے حیطۂ مفہوم میں خدا کی وہ تنظیم بھی شامل ہے جس کے تحت کائنات کو معرض وجود میں لایا گیا ہے۔

آشا میں وہ مفہوم بھی مضمر ہے جو کرم کی تھیوری (THEORY OF KARMA) جس کے تحت عمل اور ردِ عمل دونوں ہوتے ہیں [illegible]

سے دیکھا جائے تو اقبال کے یہاں یہی مفہوم وجدان سے اُبھرتا ہے۔ زرتشت کے نزدیک تمام جاندار خدا کے بنائے ہوئے راستے پر گامزن ہیں مگر سب کو اپنی قوتوں کو بروئے کار لاکر اپنی نجات خود تلاش کرنا ہے۔ آزادیٔ خیال اور ندرتِ عمل پر زرتشت بھی زور دیتا ہے اور اقبال بھی ؂

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش ۔ براہِ دیگراں رفتن عذاب است
گر از دستِ تو کارِ نادر آید ۔۔۔۔۔ گناہے ہم اگر باشد ثواب است!

ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ذوقِ انقلاب ۔ ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ملت کا شباب
ندرتِ فکر و عمل سے معجزاتِ زندگی ... ندرتِ فکر و عمل سے سنگِ خارا لعلِ ناب

کہا جاتا ہے کہ زرتشت کے یہاں ثنویت (DUALISM) پائی جاتی ہے لیکن یہ خیال قطعاً غلط ہے۔ اہرمن اور اُرمزد (AHRIMAN AND ORMUZD) باصل دو الگ الگ وجود نہیں ہیں۔ بات صرف یہ ہے کہ ان کو تمثیلی (ALLEGORICAL) انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ دراصل اُرمزد اُصولِ خیر (PRINCIPAL OF GOOD) ہے اور اہرمن اصولِ شر (PRINCIPAL OF EVIL) ہے۔ یہ دونوں اصول مل کر ایک وحدتِ ضد و نقیض (Unity of antithesis) میں ڈھل جاتے ہیں اور ان کا تصادم بالآخر اہورہ مزد (AHURA MOZ A) میں فنا ہو جاتا ہے۔ یہاں یہ بھی بتانا ضروری ہے کہ یہ دونوں اُصول اسی اہورہ مزد سے اُبھرتے ہیں جو تمام زندگی کا حاکم و خالق ہے۔ جیکسن [illegible] Jackson نے اپنی معروف تصنیف (ZOROASTER THE PROPHET OF ANCIENT IRAN) یعنی زرتشت ایران قدیم کا پیغمبر، میں اسی نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے۔ لکھتا ہے کہ "یہ دونوں وجود ایک دوسرے سے آزاد حیثیت نہیں رکھتے بلکہ ایک وجود دُوسرے کا اضافی ہے۔ اہورمزد کی وحدتِ اعلیٰ (HIGHER UNITY) میں ان کا اتصال ہوتا ہے۔ ان کا وجود دُنیا شروع ہونے سے پہلے ہوتا ہے لیکن ان کے درمیان مخالفت کی تعبیر (EXPRESSION) اسی دُنیا میں ہوتی ہے۔ جو ہمارے پیش نظر ہے"

یسنہ (YASNA) نمبر 9 ؛ 19 میں اہورمزد نے ان دونوں کو لایزال (ETERNAL) سے دو ثانی وجود (DOUBLE EMANATION) بتایا ہے۔ تقابلی فلسفے کا مطالعہ کرنے والے اس پہلو کو بھی سامنے لائے ہیں کہ یہ دونوں وجود وہی حیثیت و مقام رکھتے ہیں جو یوگ درشن میں پرش (Purusha) اور پرکرتی (Prakriti) یعنی رُوح اور مادہ کو دیئے گئے ہیں۔ ان دونوں وجودوں کے مابین عمل اور ردِ عمل کو کتنی وضاحت و تشریح سے مندرجۂ ذیل یسنہ نمبر ۳۰ [illegible] میں بیان کیا گیا ہے۔

"اور اب جب یہ دونوں وُجود ساتھ ساتھ آتے ہیں۔ ان پہلے شروع میں زندگی (Life) اور غیر زندگی (Not Life) کی تخلیق کی"

اور بھی متعدد مقامات پر گاتھاؤں میں زندگی اور غیر زندگی کا مذکور ہے۔ دراصل زندگی کے ابدی سرچشمے کے [illegible] ہیں۔ جب مطلق (Absolute) نے ظہور میں آنے کا ارادہ کیا تو وحدت سے ثنویت میں آ گیا۔ زرتشت کے نزدیک خیر کے

ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ تہیں پہنچ سے شر ایک ممتاز کردار کا حامل ہوتا ہے۔ اسی سے ملتی جلتی بات فاؤسٹ (Faust) میں گوئٹے (Goethe) نے (Mephistopheles) سے کہلوائی ہے اور اس کو ایک ایسی قوت بتایا ہے جو شر کے لیے سازش میں مبتلا ہو کر خیر کی تخلیق کرتا ہے۔ یہی خیال اقبال نے نظم کیا ہے ؎

مزی اندر جہانِ کور ذوقے   کہ یزداں دارد و شیطاں ندارد

یزداں اور شیطان دونوں مزدوری ہیں اور گاتھا کے یسنہ نمبر ۱ میں ان دونوں وجودوں کے متعلق دیکھیے یہ کہا گیا ہے۔

یہ توام خالق ..... جو مل کر تخلیق کرتے ہیں۔

گوناگوں کائنات ہمارے ہر طرف .....

لہٰذا زرتشت کے یہاں شر صرف اضافی ہے اور اس کا انحصار صرف اسی پر ہے کہ کوئی فرد آشا کے راستے پر چلتے ہوئے خالق سے کتنے فاصلے پر ہے۔ آشا کے شاہراہ پر گامزن رہنا ہی زرتشت کا کلیدی پیام ہے۔ اور اقبال کے یہاں بھی "عمل پیہم یقینِ محکم" کا آہنگ بڑے تواتر کے ساتھ سنائی دیتا ہے ؎

میارا بزم بر ساحل کہ آں جا   نوائے زندگانی نرم خیز است
بہ دریا غلط و با موجش درآویز   حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

ساحل سے موجِ خیر و شر کا تماشائی ہی ہونا سعیٔ لاحاصل سے زیادہ کچھ نہیں۔ قابلِ توقیر و ستائش تو وہ ہے جو طوفان کے طمانچے کھاتا ہے۔ اقبال اور زرتشت دونوں کا یہی خیال ہے ؎

گفتمش کہ سود خویش ز جیب برآر
گل از شگافِ سینہ زرناب آفرید

دہقاں ز درد ساز اگر خستہ تن شوی
خوگر بہ خار شو کہ سراپا چمن شوی

اقبال کی شعری شخصیت بے پناہ اثر پذیری کی صلاحیت کی حامل تھی۔ مغرب و مشرق کے بے شمار مفکرین اور شعراء اقبال کے مطالعے میں آئے تھے اور بیرونِ ملک کے بہت سے بڑے بڑے دانشور وغیرہ سے اکتساب فیض کے مواقع اقبال کو ملے تھے۔ لہٰذا اسلامی ماخذ کے علاوہ بھی شعرِ اقبال کو محرکات ملے۔ اثر کی نشاندہی کو مربوط اور نظم و ضبط کی سطح پر لانے کے لیے ٹھنڈے دل سے غور کر کے کلیہ وضع کرنے کی ضرورت ہے۔ ابھی تک صرف یہی ہوتا رہا ہے کہ کسی طرزِ فکر سے قدرے مماثلت اور کسی انداز نظر سے تھوڑی سی یگانگت دکھا کر اقبال کے نظریات سے موازنہ و تقابل کیا جاتا ہے۔ بعد ازاں بات کو نظریوں میں اختلاف تک کھینچ لاتے ہیں اور نہایت آسانی سے کہہ دیا جاتا ہے کہ اقبال نے فلاں شاعر یا مفکر سے کوئی اثر قبول نہیں کیا۔ میری رائے میں یہ منفی انداز تنقید ہے۔ ایک بڑی شخصیت پر اثر پڑنے کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ کسی نے دوسرے کی بات کو کاملاً اور کلی طور پر لے لیا۔ بالفاظِ دیگر نظریات میں کلی یگانگت پیدا ہو جانا کوئی لازم و ملزوم امر نہیں ہوتا۔ اثر متعدد صورتوں میں منکشف ہو سکتا ہے۔ کلی یگانگت کی شکل میں بھی ظاہر ہو سکتا ہے اور جزوی یگانگت کی صورت میں بھی [illegible] ہو سکتا ہے۔ علاوہ بریں مماثلانہ طرز بھی اختیار کر سکتا ہے تو [illegible] کو بھی جنم دے سکتا ہے۔ یعنی ایک بات کو کچھ حد تک ہی تسلیم کر سکتے ہیں اور ایسا کر کے تھوڑی دور ہی [illegible] کر سکتے ہیں۔ اگر کسی کی بات ہمیں کسی سمت متحرک یا مرغوب کرتی ہے تو یہ بھی اثر کی کارفرمائی ہے۔

پر کسی بات کا ردِ عمل ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ہم کسی برعکس خیال کی طرف رجوع کریں تو اس کو بھی اثر ہی کی کارگزاری سمجھنا چاہیئے۔ درحقیقت اثر ایک جاری و ساری سلسلۂ عمل ہے جو احساسیت سے ربط و واسطہ رکھتا ہے۔ اقبال نے بڑی حساس طبیعت پائی تھی۔ جس نے شعر و فکرِ اقبال کو مجموعہ البحرین بنا دیا تھا۔ ادھر ادھر سے لئے ہوئے محرکات و خیالات بھی لطف تو یہ ہے خاص اقبالی احساس کے بن جاتے ہیں۔ حسنِ اسلوب تو دیکھئے کہ جو کچھ زرتشت سے لیا گیا وہ سب اقبال کا اپنا ہی شعری سرمایہ معلوم ہوتا ہے۔

بقیہ "گلِ زجنتِ کشمیر" صفحہ ۱۳

یہ "ارمغانِ حجاز" کے آخری قطعوں میں سے ہے۔ اور اقبال کے بالکل آخری دنوں کا کلام (۱۹۳۸ء)۔ واقعی ہندوستان کے اس باوقت نے اس محبِ وطن مفکر اور شاعر نے جو پیام دیا تھا ابھی اس کی دوسری اشاعت کی نوبت نہ آئی تھی کہ ہندوستان نہ صرف خود غیر ملکی سے آزاد ہوا بلکہ اس کی آزادی افریقہ اور ایشیا کے بہت سے محکوم ملکوں کی آزادی کے سلسلے میں "کی پہلی کڑی بن گئی۔ اور چراغ سے چراغ روشن ہوتا چلا گیا۔

سوویت یونین کے آزاد اور خوش حال ملک کو اس کی آزاد قومیتوں کو اقبال کا یہ جشن مبارک ہو!

بقیہ "اقبال" صفحہ ۱۸

درد و داغ، آرزو اور جستجو نے تسخیرِ کائنات کا بلند منصب عطا کیا ہے۔ اسی وجہ سے اقبال اپنی بندگی کو خدائی سے تبدیل کرنے کو تیار نہیں ؎

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزومندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

مولانا شبلی نعمانی کے الفاظ میں تصوف میں دو مقام ایک دوسرے کے مقابل ہیں۔ ایک مقام فنا ہے، جہاں قطرہ دریا میں مل کر دریا بن جاتا ہے اور دوسرا مقام بقا ہے جہاں قطرہ دریا کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ پہلا مقام عجز و انکسار کا ہے اور دوسرا مقام پندارِ خودی کا، جہاں عاجزی کی جگہ سربلندی ہے۔ اقبال مقامِ بقا کا شاعر ہے ؎

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

اس شعر کا انسپریشن براہِ راست رومی کے یہاں سے آیا ہے ؎

بزیرِ کنگرۂ کبریاش مردانند
فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر

لیکن یہ اقبال کے فلسفۂ خودی کا بڑا اہم نکتہ۔ ۔ ۔

(یہ سردار جعفری کے ایک طویل مقالے کے چند اقتباسات ہیں۔ یہ مقالہ انجمن ترقی اردو بمبئی کتابی شکل میں شائع کر رہی ہے)

شاہ حسین

عشقِ اقبال کی نظر میں

اقبال کی شخصیت بڑی پہلودار ہے۔ اُن کی شاعری میں فکر و فن کا پُرشکوہ امتزاج ملتا ہے۔ اقبال شاعر بھی ہیں اور فلسفی بھی ـــــ شعر ایک ایسے رنگ کا نام ہے جس میں شعوری کیفیت غالب ہو اور اس کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ مختصر پیرایۂ بیان میں قلوب و اذہانِ انسانی کو متاثر و مسحور کیا جائے۔ یہ اثر آفرینی اور سحر آفرینی گویا حکمت ہے، اور حکمت ہی وہ نکتہ ہے جس کی حدیں فلسفے سے قریب آ جاتی ہیں۔ لیکن ایک شاعر اپنے میلاناتِ ذہنی (Mood) اور اخذِ نتائج میں ہمیشہ کسی فلسفی کی طرح نہیں ہوا کرتا۔ محرکیں وہ موجودات میں نمو پذیر واقعات کا پابند ہوتا ہے اور کبھی اُن کے عوامل و عواقب کا۔ شاعری میں ذہنی اور نفسی کیفیات کا تجزیہ اور احساسات، تصورات و جذبات کی ترجمانی کی جاتی ہے، اس لئے فلسفے کا جزو ہونے کے اعتبار سے اس کو اس رشتے سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور فلسفہ اسی کا نام ہے کہ زندگی کے پوشیدہ حقائق اور صداقتوں کو ظاہر کرنے، انہیں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی جائے ـــــ علت و معلول اور قانون سے بظاہر تعلق نہ ہونے کے باوجود ذہنِ انسانی کی تشکیل و تعمیر اور تربیت و تہذیب کی بناء پر شاعری کو فنونِ لطیفہ میں بیحد اہمیت حاصل ہے ـــــ شاعر اپنے ادراک و تخئیل سے خارجی اثرات اور انسانی کیفیات کا عکس لیفے احساس میں نہ صرف اُتارتا ہے بلکہ مختلف مظاہر کی مشترک خصوصیات کی، جو نوعِ انسانی کے اندرونی احساس کی بناء پر تجرباتی مادے کو قابو میں لانے کی ایک کوشش ہے، تلاش کرتا ہے، اور اسی انداز کے ماتحت انفس و آفاق کی گوناگوں کیفیات اور اعمال میں ربط و تعلق اور تربیت و تہذیب بھی پیدا کرتا ہے۔ یہ کیفیات و اعمال ارتقائی مقصد رکھتے ہیں۔ شاعر عمل ارتقاء کے وقدان اندرونی اور بیرونی ہیجات کی بناء پر اعمالِ نفس کو مختلف انواع میں تقسیم کرتا ہے؛ لیکن ہر صورت میں مجموعی وحدت کا رشتہ ٹوٹنے نہیں پاتا۔ شاعر بھی ایک قائد کہا جا سکتا ہے جو زندگی کی تفسیر عام مفروضوں کی صورت میں نہیں بلکہ خود انسان اور کائنات کو سمجھ کر کرتا ہے۔ اس کی یہ انفرادیت جب اس کے خارج سے گھل مل جاتی ہے تو اس نظر میں گیرائی اور فکر میں گہرائی پیدا ہوتی ہے:

اے اہلِ نظر! ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا!

اندرونی ہیجات اور خارجی محرکات کا یہ باہمی ربط و انسلاک شاعر میں ایک پیغمبرانہ بصیرت پیدا کرتا اور اُسے فروغ دیتا ہے۔ اس طرح وہ حقیقی معنی میں "دیدۂ بینائے قوم" کہلانے کا مستحق بنتا ہے ـــــ یہاں اس امر کا مستحضر رہنا ضروری ہے کہ شاعری استدلال اور منطق کی موشگافیوں میں اسیر ہو کر نہیں رہ جاتی۔ شاعر کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ کسی نظامِ فلسفہ کو استدلالی طور پر پیش کرے۔ اسی لئے ہم کسی شاعر کے کلام میں کوئی مربوط اور مسلسل فلسفہ نہیں پا سکتے۔ اقبال کی شاعری کے بارے میں بھی

یہ بات صحیح ہے۔

اقبال کے ذہن رسا نے اپنے افکار و تاثرات سے وہ رنگا رنگ چمن آرائیاں کی ہیں جن کے پھولوں کی شمیم نے چہار دہ شام جہاں کو معطر کئے دیتی ہے۔ خیالات میں وسعت اور پھیلاؤ کے باوجود یہ تمام کے تمام ایک مرکزی وحدت میں سمٹتے ہوئے نظر آتے ہیں اور یہ مرکز لا اِلٰہ اِلَّا اللہ محمد رسول اللہ ہے جس کے گرد اقبال کی شاعری ہالہ بنائے ہوئے ہے۔ اسی کلمۂ طیبہ کی روشنی سے شاعر نے اپنے ذہن اساس فکر کی قندیلیں روشن کی ہیں :

خرد دیکھے اگر دل کی نگہ سے
جہاں روشن ہے نورِ لا اِلٰہ سے

اسی کی تشریح و توضیح میں اقبال نے بعض مخصوص اصطلاحیں استعمال کی ہیں جو اپنے قدیم معانی سے بہت کم علاقہ رکھتی ہیں۔ ان اصطلاحوں میں اولین اہمیت "عشق" کو حاصل ہے۔ اس کے علاوہ اقبال نے لفظ "خودی" کو ایک نئی معنوی وسعت دی۔ بحیثیت مجموعی بنیادی طور پر اقبال کے افکار میں دونوں تصورات کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ "عشق" اور "خودی" کے علاوہ اقبال نے دیگر فلسفیانہ خیالات اور نظریات کے بارے میں اپنے حاکمانہ مستدلات اور نظریات پیش کئے ہیں۔ "عشق" اور "خودی" کی توضیح نیز دیگر فلسفیانہ خیالات کے سلسلے میں اقبال نے مغربی فلاسفہ و مفکرین کے افکار و نظریات کو جانچا، پرکھا اور جنہیں مناسب و صحیح سمجھا انہیں اپنی فنکارانہ فن کاری اور بے پناہ بصیرت کی خراد پر چڑھا کر نئے آب و رنگ کے ساتھ پیش کیا۔ اقبال بھی فلسفے سے کوئی بیگانہ نہیں تھا، وہ اس بحر کا بھی شناور ہے۔ لیکن یہاں بھی وہ اپنی پیکر معانی کی ضو فشانی سے ان خیالات کو تابناک اور درخشاں بنا کر پیش کرتا ہے۔ وہ متعصب اور تنگ نظر نہیں۔ اس کے دل و دماغ کی جولانگاہ دنیائے آب و گل کی ہر بہتر شے سے استفادہ کے کسی پہلو کو کبھی نظر انداز نہیں کرتی۔ وہ کسی خانقاہ کا گوشہ نشین مست و بے خود زاہد، صوفی یا ملا کبھی نہیں رہا ہے۔ زیرِ خورشید جہاں تاب جہاں بھی کوئی ذرہ تاباں نظر آتا ہے، اقبال کی جستجو اسے وہاں تک رواں دواں لے جاتی ہے۔ اس کی تابانی میں اگر اس صاحب حکمت شاعر کو حقیقی اور لازوال وصف کی ہلکی سی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے تو اسے وہ اپنے شعر کے مضمون کے لئے منتخب کر لیتا ہے تاکہ اس درخشانی اور تابناکی سے وہ ان کی نظریں بھی روشن کرے جن تک اس کی شعاعیں نہیں پہنچ سکیں یا اگر پہنچیں بھی تو بہت مدھم :

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اور یہی دیدہ ور ہے جو انسان کے دردِ حقیقی معنی میں آشنا ہے، جو انتہائی "حساس" اور "دل گداز" [illegible] ہوتا ہے۔ ہیئتِ اجتماعی میں اس کی حیثیت وہی ہے جو جسمِ انسانی میں آنکھ کی ہے :

مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ!
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

"عشق" کو اقبال نے جن عمیق معانی و مفاہیم کا حامل بنایا ہے، اُن سے قدیم اردو شاعری بالکلیہ بیگانہ نہ ہو تب بھی اقبال کے تصورِ عشق تک اس کی رسائی مشکل تو ہے۔ اقبال نے عشق کے مفہوم میں جو گہرائی، ہمہ گیری اور وسعت پیدا کی وہ پہلے ناپید تھی۔ ہماری سادی اصطلاحیں "عشقِ مجازی" اور "عشقِ حقیقی" استعمال ہوتی تھیں۔ عشقِ مجازی کا مفہوم ظاہر پر گوشت پوست کی کسی ہستی سے وابستگی اور الفت لیا جاتا تھا۔ بعض اوقات اسے عشقِ حقیقی تک پہنچنے کا ایک زینہ بھی

سمجھا گیا۔ عشقِ حقیقی سے کبھی تو اپنے ہم جنسوں سے ایسی محبت مراد لی گئی جس میں ہوا و ہوس کا شائبہ نہ ہو اور کبھی کبھی اسے عشقِ الٰہی کا مماثل اور مترادف سمجھ لیا گیا۔ عشق اقبالؔ کے نزدیک لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی عملی تفسیر ہے۔ یہ ایک بے پناہ اور والہانہ "خدا نما" جذبہ ہے۔ وہ عشق نور ہے جسے بقائے دوام حاصل ہے:

مَئے عشق کی گفتگو جب قضا نے ۔۔۔ ہنسی اُس کے لب پر ہوئی آشکارا

گری اس تبسم کی بجلی اجل پر ۔۔۔ اندھیرے کا ہو نور میں کیا گزارا

بقا کو جو دیکھا فنا ہو گئی وہ ۔۔۔ قضا تھی شکارِ قضا ہو گئی وہ!

عشق زماں و مکاں کی بندشوں اور قیود سے آزاد عرشِ ربِّ جلیل کے قریں اوجِ حیات آفریں پر فائز و متمکّن ہے۔ اقبالؔ اکثر عشق کو عقل کا حریف اور مدِّ مقابل بنا کر پیش کرتے ہیں۔ عشق مصلحت اندیشی کی وجہ سے خام رہ جاتا ہے۔ جبکہ عقل پختہ ہوتی ہے تو اسی سے:

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل ۔۔۔ عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی

اور یہی نامصلحت اندیشی عشق میں بیباکی اور بےخوفی پیدا کرتی ہے:

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق ۔۔۔ عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

اقبالؔ عشق کو حقیقی جذبات و خیالات کا منبع اور سرچشمہ سمجھتے ہیں۔ علم (جس کا منبع عقل ہے) کی بنیاد اندازہ اور گمان پر ہے، اس تک نورِ حقیقی کی ضیاء بار کرنیں نہیں پہنچ سکتیں۔ اور عشق، اس کے برخلاف حسنِ ازل سے راست استفاضۂ نور کرتا ہے۔ اقبالؔ نے عقل کو چراغِ راہ سے تشبیہ دی جو راہِ منزلِ مقصود میں ہلکا سا اُجالا تو کرتی ہے لیکن فی نفسہٖ منزل نہیں بن سکتی:

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور ۔۔۔ چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے

نظم "علم اور عشق" میں اس خیال کو بڑی ہی جامعیت کے ساتھ دو تراکیب سے ظاہر کیا گیا ہے:

علم : اِبنُ الکتاب

عشق : اُمُّ الکتاب

علم و عقل مظاہرِ تخلیقی یعنی موجودات کی تعبیر و تشریح میں گم ہیں جب کہ عشق ذاتِ خالق کے روبرو موجود ہے۔ علم تشکیک و اشتباہ کے دروازے کھولتا ہے، اس کے برعکس عشق سکون و طمانیت کا ضامن ہے ــــ ربِّ حقیقی خود صاحبِ عشق کو اپنا قرب عطا کرتے ہوئے، اپنے لیے واحد متکلم کا صیغہ استعمال کرتے ہوئے، یوں گویا ہوتا ہے:

يَآ اَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِىْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝

فَادْخُلِىْ فِىْ عِبٰدِىْ ۝ وَادْخُلِىْ جَنَّتِىْ ۝ (سورۃ الفجر)

(اے نفسِ مطمئن، چل اپنے رب کی طرف اس حال میں کہ تو اُس سے خوش اور وہ تجھ سے خوش۔۔۔ پھر شامل ہو جا میرے (خاص) بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنت میں ــ)

پھر اس نفسِ مطمئن (وہ انسان جسے شرحِ صدر حاصل ہے) کے پائے ثبات کو فانی دنیا کی کوئی شورش، کسی قسم کا ہنگامہ، کیسی ہی تلاطم خیزی، غرض کوئی شے متزلزل نہیں کر سکتی کیونکہ اس کے عشق کی بنیاد تخمین و ظن پر نہیں ہوتی۔ علم سے ہزاروں سوالات پیدا ہوتے ہیں اور عشق تمام سوالات کا ایک جواب ہے۔ اس ہستی کے سامنے جسے ربِّ کائنات کے سوا کسی دوسرے سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ جاہ و حشمت اور دولت و ثروت سب بے حقیقت ہوتے ہیں۔ صاحبِ عشق کو دنیاوی

[illegible]

حال و ماضی اور مستقبل [illegible] کر سکتے ہیں لیکن اسے اُن کی پروا نہیں ہوتی۔ اگرچہ سب کچھ نہ ہے تو بھی [illegible] اصل پر یقین ہی نفسِ مطمئن کو حقیقی کامیابی سے ہمکنار کرتا ہے۔ عشق کی تڑپ [illegible] ہوتی ہے اور یہ جستجو معشوق کی جنبشِ ابرو کا نتیجہ ہوا کرتی ہے، کیونکہ حقیقی اور کامل عشق وہی ہے کہ عاشق کی نشست و برخاست، گفت و شنید، مسرّت و الم، دوستی اور دشمنی غرض اس کا اوڑھنا بچھونا معشوق کی مرضی ہے۔ [illegible] جس میں اوراق، اعمال و افعال کی ہلکی سی بھی جنبش نہ ہونے پائے۔ معشوق کی رضا اپنے نفس کی [illegible] ہر لحظہ ذکرِ محبوب کی لذّت سے سرشار ہو۔ وہ يَذْكُرُونَ اللّٰهَ قِيَامًا [illegible] کا اصل نمونہ بن جائے۔ سرِ نیاز ہمیشہ دہلیزِ ناز پر سجدہ ریز ہے گویا "جل گئی مزرعِ ہستی تو اُگا دانۂ دل" ——— اور یہی مضغۂ گوشت تو ہے جو فکر و جذبہ کا مخزن ہے اور جس میں عشق کی بے پناہ جولانیاں سموئی ہوئی ہوتی ہیں۔ محبت کی شدید ترین خواہش یہی ہوتی ہے کہ وہ جلوۂ محبوب سے اپنی نگاہ اور اپنے دل کی تسکین کا سامان کرے، تاکہ اسے اپنی طاقتِ دیدار کی بے بضاعتی اور خود اپنی بے بساطی کا احساس ہے لیکن "عشق" نالے طالب دیدار ہی دیتا ہے:

مانا کہ تیری دید کے قابل نہیں ہوں میں　　　تو میرا شوق دیکھ، مرا انتظار دیکھ

شیفتہ نے کہا تھا:

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ!　　　اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

اقبال اس تپشِ درونِ سینہ سے کچھ کام بھی لینا چاہتے ہیں:

عشق نے کر دیا تجھے ذوقِ تپش سے آشنا　　　بزم کو مثلِ شمع بزم حاصلِ سوز و ساز دے

لیکن یہ عشق اِن کے نزدیک بے دست و پائی نہیں، وہ اپنی خودی کا اثبات بھی چاہتا ہے:

عشق بلند بال ہے رسم و رہِ نیاز سے　　　حسن ہے مستِ ناز اگر تو بھی جواب ناز دے

یہی احساسِ عشق سازِ حیات کے تاروں کا مضراب بن جاتا ہے۔ زندگی کے سارے ہنگامے اسی عشق کی بدولت ہیں۔ انسان ایک پیکرِ خاکی ہے، مٹی کا پتلا ہے لیکن اِس میں سوز و گداز اسی عشق کی بدولت پیدا ہوتا ہے۔ جب اِس پیکرِ آب و گِل میں حقیقتِ آدم میں عشق سما جاتا ہے تو وہ حقیقی معنی میں انسان کہلائے جانے کا مستحق بنتا ہے، ایسا انسان جس کی حیات سوز و گداز اور شوق و بیتابی سے لبریز ہوتی ہے:

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم　　　عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوزِ دمبدم

جب قلبِ انسان ان کیفیاتِ عشق کی آماجگاہ بن جاتا ہے اور اس کے ریشے ریشے میں عشق اِس طرح سما جاتا ہے جس طرح شاخِ گل میں بادِ سحرگاہی کا نم تو اس انسان سے مخاطب ہو کر شاعر بجا طور پر یہ کہتا ہے:

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے　　　جہاں ہے تیرے لئے، تو نہیں جہاں کے لئے

سارا جہاں اِس صاحبِ عشق یا مردِ مومن، یعنی انسانِ کامل کی میراث بن جاتا ہے کہ خود معشوقِ حقیقی نے بھی یہی ارشاد فرمایا ہے، لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ

جہاں تمام ہے میراث مردِ مومن کی　　　مرے کلام پہ حجت ہے نکتۂ لولاک

اُس کی باتیں بظاہر "زلفِ پریشاں" ہوتے ہوئے بھی وہ "محرمِ رازِ درونِ میخانہ" ہوتا ہے:

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ   کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ

کوئی 'محرمِ رازِ درونِ میخانہ' ہو جب ہی خود آگاہی کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ یہ عرفان ہی کا ثمرہ ہے کہ غلاموں پر بھی اسرارِ شہنشاہی منکشف ہوتے ہیں۔

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی   کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

عشق ابنِ آدم کے جسمِ خاکی میں جذبہ و عمل کی وہ رُوح پھونکتا ہے کہ اس کے 'دنوں کی تپش' اور 'شبوں کا گداز' دونوں صفحۂ ہستی پر لازوال اور انمٹ نقوش کے ارتسام کا باعث بن جاتے ہیں ـــــ اقبال نے اپنی شاہکار نظم 'مسجدِ قرطبہ' میں اپنے اس تصورِ عشق کی بڑی جامع تعریف و توضیح کی ہے۔ کسی جگہ اقبال نے کہا ہے: "ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں" اور یہاں بھی وہ اپنے اسی مشاہدے کے نتائج پیش کرتے ہوئے اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ کارِ جہاں بے ثبات ہے اور اس دنیا میں صورت پذیر تمام معجزہ ہائے ہنر آنی و فانی ہیں لیکن نقوشِ ہنر و کمال میں ثبات و دوام کی رنگ آمیزی کرنے والا جذبہ عشق ہے اور اس عشق کا نشیمن 'مردِ خدا کا دل' ہے۔ عشق حیاتِ ابدی کا دوسرا نام ہے۔ وہ زمان و مکاں کی قیود سے آزاد ہے۔ مردِ خدا زمانے کا پابند نہیں، زمانہ اس کی گردِ کفِ پا ہے۔ عشق ہی سے تمام مظاہرِ کائنات کا وجود ہے۔ وہ ایک جذبۂ نمو ہے۔ عشق مقلد نہیں قائد ہے۔ وہ زمانے کا ساتھ نہیں دیتا، زمانہ اس کے جلو میں چلتا ہے ـــــ یہی عشق مردِ مومن میں الٰہی صفات پیدا کرتا ہے اور وہ تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہ کی عملی تفسیر بن کر دنیائے چند روزہ کے عاجلانہ فوائد کے بدلے ایک بلند اور اعلیٰ مقصد کے حصول کی جدوجہد میں ہمہ تن مشغول ہو جاتا ہے۔ عشق ہی انسان میں وہ صفات پیدا کرتا ہے جو نہ صرف قربِ الٰہی کا ذریعہ بنتی ہیں۔ بلکہ اس جہانِ فانی میں بھی اُسے ایک ممتاز اور منفرد مقام عطا کرتی ہیں۔ اسی لئے اقبال کی نصیحت ہے:

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر   نیا زمانہ، نئے صبح و شام پیدا کر

مجملاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ عشق ایک والہانہ "خدا نما" جذبہ ہے۔ حسنِ ازل تک رسائی صرف اسی کی بدولت ہو سکتی ہے۔ عشق کا یہ جذبہ اس قدر شدید ہونا چاہیئے کہ انسان کا ہر عمل اسی میں ڈوبا ہوا ہو۔ جذبۂ عشق ایک بنیادی اور کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ عقل اس کے مقابلے میں فروتر مقام کی حامل ہے کیونکہ عقل تشکیک کے دروازے کھولتی ہے اور عشق یقین کا راستہ دکھاتا ہے۔ یہی یقین طمانیت و سکون کی وہ دولت عطا کرتا ہے جس کے مقابلے میں دنیا کی تمام نعمتیں ہیچ ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ عشق مصلحت اندیش نہیں ہوتا۔ عشق خود آگاہی سکھاتا ہے۔ عشق ہی کی بدولت انسان کو اس امر کا احساس ہوتا ہے کہ یہ کائنات اُس کے، اور صرف اُسی کے لئے تخلیق کی گئی ہے۔ عشق ایک آفاقی جذبہ ہے جس کی وسعتیں زمان و مکاں کی پابند نہیں۔ اسی احساس کا تصرف ہے کہ صاحبِ عشق یعنی مردِ خدا یا مردِ مومن میں جہد و عمل کی وہ رُوح پیدا ہوتی ہے کہ اس کے ہاتھوں کلبۂ آب و گل کا رُوپ نکھر اُٹھتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے فکر و فن کے نمونوں میں ثبات و دوام کی رنگ آمیزی کر پاتا ہے۔ بندۂ مومن عشق ہی کی بدولت صفاتِ الٰہی کا پرتو خود میں دیکھتا ہے اور یوں وہ انفس و آفاق کی رہنمائی کے منصب اور نیابتِ الٰہی کا اہل قرار پاتا ہے ـــــ عشق کا یہ تصور اقبال کے ہاں کچھ اس شدت سے اُبھرا کہ بقول خلیفہ عبدالحکیم انہیں عشق ہی سے عشق ہو گیا۔

(بقیہ صفحہ ۳۲ پر دیکھیے)

حشم الرمضان

اپنی نظم مرزا غالب میں اقبال کی ترمیمات

شعر گوئی ایک مشکل فن ہے۔ اس کیلئے طبعاً موزوں کا ہونا لازمی ہے لیکن محض موزونیٔ طبع ہی شعر گوئی کا معیار نہیں۔ مثلاً شاعر وہی ہے جو زندہ احساس اور لطیف جذبات کا حامل ہو، مشاہدات و تجربات کی بازآفرینی کر سکتا ہو، معائب و محاسنِ کلام کا مکمل عرفان رکھتا ہو۔ اور واردات و کیفیات کے اظہار پر پوری طرح قادر ہو۔ گویا نکاتِ زبان و بیان کے علم اور نثر و نظم پر کامل دسترس کے بغیر شعر گوئی ممکن نہیں۔

کسی کلام میں زبان کی خامی تو بہ آسانی گرفت میں آ سکتی ہے لیکن بیان کی خامی کی گرفت ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ بیان کی غلطی باریک سے باریک تر ہوتی ہے اور اس باریکی تک اُسی کی رسائی ممکن ہے جو ذہنِ رسا، نگاہِ دوربین اور طبعِ سلیم رکھتا ہو اور جس کی بحد حوطبع کلام کی پرکاری کے انداز سے واقف ہو۔

نقصِ بیان ـــ جب ایک شاعر تخلیقی عمل سے گزرتا ہے تو اس کی قوتِ متخیلہ کبھی کبھی اسے بلندی کی انتہائی منزل پر پہونچا دیتی ہے جہاں اس کا نطق اظہار و بیان میں عاجز ہوتا ہے۔ نتیجے کے طور پر مفاہیم کی صحیح ترسیل نہیں ہو پاتی۔ ایسے مقامات تقریباً ہر شاعر کی زندگی آتے رہے ہیں اور ہر شاعر عجزِ بیان کا شکار ہوتا رہا ہے لیکن یہ صورتِ حال قطعی وقتی غیر ارادی و غیر اختیاری ہوتی ہے، اس کیلئے شاعر کا عجزِ بیان ہرگز قابلِ گرفت نہیں کیونکہ شاعر عجزِ بیان کا شکار اپنی کم علمی یا کم فہمی کے سبب نہیں بلکہ زبان کی تنگ دامانی اور الفاظ کی بے بسی کے سبب ہوتا ہے۔ ہاں، اگر شاعر کا عجزِ بیان ناپختگی کی وجہ سے ہے تو اس پر انگلی اُٹھ سکتی ہے۔

نقصِ زبان ـــ جملوں اور لفظوں کی بعض غلطیاں ایسی بھی ہیں جنہیں صرف اتفاقی طور پر غلط یا صحیح کہا جا سکتا ہے۔ ہاں اگر زبان کے ان مسلّمہ اصولوں سے انحراف کیا گیا ہو جو تقریباً ہر جگہ مشترک ہیں۔ تو شاعر اس انحراف کے لئے جوابدہ ہے۔ ویسے اگر اس انحراف سے بیان مجروح نہیں ہوتا اور زبان کی توسیع کے امکانات پیدا ہوتے ہیں تو شاعر کو حق ہے کہ وہ ایسے نئے نئے تجربے کرے۔ شاعر کو ان باتوں کے لئے مطعون نہیں کیا جا سکتا۔

زبان و بیان کے اسقام سے پاک کلام ہی کا کوئی ادبی معیار متعین کیا جا سکتا ہے اور قدر و قیمت کے تناسب سے اس کے معیار کی درجہ بندی بلند سے بلند اور پست سے پست کے معیار میں کی جا سکتی ہے لیکن اس پر یکسر ناقص یا مہمل ہونے کا حکم لگانے سے پہلے اس پر اچھی طرح غور کر لینا چاہیے اور شاعر کی شخصیت، اُس کے مقام اور اس کے علم و فکر کو ملحوظِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

علامہ اقبال پنجاب کے رہنے والے تھے اور چونکہ پنجاب کی اُردو اور دیگر علاقوں مثلاً دہلی، لکھنؤ یا حیدرآباد کی اُردو میں نمایاں فرق ہے، اس لئے ان کے کلام میں پنجابی زبان کے اثرات کا پایا جانا غیر فطری نہیں لیکن چونکہ اُردو کی اَدبی [illegible] و بیشتر ہر جگہ [illegible] اس لئے کلام میں دہلویت، لکھنویت، حیدرآبادیت یا پنجابیت کی گنجائش [illegible]

پر تحرّف نہ آتا ہو۔

اقبال کے کلام پر ابتداء ہی سے مختلف مکتبۂ فکر کے دانشوروں کی جانب سے مختلف قسم کے اعتراضات ہوتے رہے ہیں جن میں یہ اعتراض خاص طور نمایاں رہا ہے کہ اُن کے کلام میں لفظی غلطیاں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کو ہمیشہ اپنے کلام میں حکّ و اصلاح سے کام لیتے رہے ہیں۔

جب ہم کسی شاعر کے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس مطالعے سے ہمیں اُس کے کلام کا تجزیہ مقصود ہوتا ہے تو ہم اس کے کلام کو مختلف ادوار میں تقسیم کر دیتے ہیں تاکہ شاعر کے ذہنی ارتقاء کا پتہ چل سکے۔ گویا ہر شاعر ارتقا کی مختلف منزلوں سے گزرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب ایک پختہ کار شاعر اپنے ابتدائی کلام پر نظر ثانی کرتا ہے تو اسے اس میں خیال و زبان و بیان کی بہت سی کمزوریاں نظر آتی ہیں۔ بانگ درا کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال نے اپنے بہت سارے کلام میں ترمیمات کی ہیں۔ لیکن فی الوقت ہم محض اُن ترمیمات کی وضاحت پر اکتفا کریں گے جو اقبال کی ایک مشہور نظم "مرزا غالب" میں رُونما ہوئی ہیں۔ یہ نظم مرزا غالب کا وہ پُر تاثیر مرثیہ ہے جس کا جواب شاید اُردو ادب میں نہ مل سکے۔ یہ نظم اولاً رسالہ "مخزن" (ماہ ستمبر ۱۹۰۱ء) میں شائع ہوئی تھی۔ اور شاید دوسری بار نظر ثانی کے بعد "بانگ درا" میں شائع ہوئی۔ اقبال نے اس میں کافی ترمیم و تنسیخ کی ہے۔ آیئے ہم دیکھیں کہ اقبال نے اپنی اس نظم میں کیا کیا ترمیمیں کی ہیں۔ نظم کا پہلا بند "مخزن" میں یوں شائع ہوا ہے ؎

فکرِ انساں کو تری ہستی سے یہ روشن ہوا　　ہے پرِ مرغِ تصوّر کی رسائی تا کجا

رُوح تھا تو اور تھی بزمِ سخن پیکر ترا　　زیبِ محفل بھی رہا محفل سے پنہاں بھی رہا

دید تیری آنکھ کو اُس حُسن کی منظور ہے

صورتِ رُوحِ رواں ہر شئے میں جو مستور ہے!

لیکن "بانگ درا" میں پہلے مصرع میں "کو" کی جگہ "پر" دوسرے مصرع میں "تصوّر" کی جگہ "تخیّل" تیسرے مصرع میں "رُوح تھا تو اور تھی" کی جگہ "تھا سراپا رُوح تو" اور چھٹے مصرع میں "صورتِ روحِ رواں" کی جگہ "بن کے سوزِ زندگی" ہے۔ ظاہر ہے یہ ترمیمیں اقبال نے کچھ سوچ کر ہی کی ہوں گی۔ "روشن ہونا" محاورہ ہے اور اس کے معنی ہیں "ظاہر ہونا" اور یہ "پر" کے ساتھ مستعمل ہے "کو" کے ساتھ نہیں۔ چنانچہ کوئی بھی بات کسی کو روشن نہیں ہوتی بلکہ کسی پر روشن ہوتی ہے۔ اسلئے پہلے مصرع میں "کو" کی جگہ "پر" نہایت مناسب ترمیم ہے۔

دوسرے مصرع میں "تصوّر" کی جگہ "تخیّل" کی ترمیم ذرا وضاحت طلب ہے۔ تصوّر اور تخیّل میں جو باریک فرق ہے، شاید اسے ایک عام ذہن محسوس نہ کر سکے، لیکن خواص ضرور محسوس کریں گے۔ تصوّر جو اس خمسہ کے حصار میں رہ کر قائم کیا جا سکتا ہے، جبکہ تخیّل اس کا پابند نہیں، وہ اس حصار کو توڑ کر آگے بھی نکل سکتا ہے۔ یوں تو حِسّی مہیجات کی کارفرمائی کے بغیر کسی چیز کا تصوّر ممکن نہیں، لیکن گزشتہ تجربات کی اساس پر کسی نئی چیز کی تعمیر جو فکری سطح پر واقع ہوئی ہو در اصل تخیّل ہی کی پیداوار کہی جائے گی اور وہ قطعی غیر متشکّل ہوگی۔ تصوّر کی تصویر ممکن ہے، تخیّل کی تصویر ممکن نہیں۔ فلسفہ کی زبان میں ہم تخیّل کو the yaless thought [?] کہہ سکتے ہیں۔ تخیّل کے اس بانکپن نے اقبال کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا اور انہوں نے اپنی شاعری میں اس کا استعمال اتنی کثرت سے کیا کہ اسے علامت کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ اس وضاحت کے بعد دوسرے مصرع میں "تصوّر" کا "تخیّل" سے تبدیل کر دینا اقبال کی باریک بینی کا ثبوت ہے۔

تیسرے مصرع میں "تھا" و "تو" "تھی" سے کے یکجا استعمال سے نہ صرف یہ کہ تنافر کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، بلکہ مصرع کی فصاحت بھی مجروح ہوتی ہے۔ اقبال نے ممکن ہے اسی خامی کے پیش نظر "زرد تھا تو اور تھی" کو "تھا سراپا رُوح تو" سے تبدیل کر دیا ہو۔ لیکن اس تبدیلی کے باوجود یہ مصرع فصیح نہ ہو سکا کیونکہ اس میں "سراپا" کا استعمال بھرتی کا ہو گیا ہے اور اس مصرع کا دوسرا ٹکڑا "بزم سخن پیکر ترا" کچھ نامکمل سا رہ گیا ہے۔ زبان کی فصاحت اور تکمیل مفہوم کے لیے اس ٹکڑے میں بھی ایک فعل کی ضرورت تھی۔ فعل کی اسی دشواری نے اقبال سے پہلا مصرع کہلوایا ہوگا جس میں انہوں نے فعلوں کی دشواری پر تو قابو پا لیا لیکن "تھا تو اور تھی" کا بھدا پن سامعہ اور ناطقہ دونوں پر گراں گزرنے لگا۔ چنانچہ انہوں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ شعر کے بھدے پن سے چھٹکارہ پا لیا جائے چاہے اس سے نقصِ فعل ہی کیوں نہ پیدا ہوتا ہو۔

بند کے آخری مصرع میں "صورت رمح رواں" کی تبدیلی معنوی اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اسی کا نام بلندیِ فکر و تخیل ہے۔ "بہا کے سوز زندگی" یقیناً حکیمانہ اصلاح ہے۔ اس تبدیلی سے مصرع میں بلا کی بلاغت آگئی ہے۔ لفظ "سوز" کو بھی اقبال کے کلام میں علامت کی حیثیت حاصل ہے، جو اربابِ فکر و نظر سے پوشیدہ نہیں۔ یہ لفظ بھی اقبال کے کلام میں بکثرت آیا ہے۔

نظم کا دوسرا بند "مخزن" میں یوں شائع ہوا ہے ؎

معجز کلکِ تصوّر ہے دیا دیواں ہے یہ … یا کوئی تفسیر رمز فطرت انساں ہے یہ
نازشِ موسیٰ کلامی ہائے ہندوستاں ہے یہ … نورِ معنی سے دل افروزِ سخنداناں ہے یہ

نقش فریادی ہے تیری شوخی تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

جو لوگ نظم کی تکنیک سے واقف ہیں وہ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ مندرجہ بالا بند کی وجہ سے اس نظم کا تسلسل برقرار نہیں رہتا، کیونکہ اس نظم کے اگلے پچھلے بندوں میں شاعر براہِ راست غالب سے مخاطب ہے جبکہ اس بند میں وہ غالب کے دیوان کے اوصاف بیان کرنے لگتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس بند کے پہلے دونوں اشعار آورد کا شکار ہیں۔ پہلے شعر میں "معجز کلک تصوّر ہے" "دیا دیواں ہے یہ" دونوں ہی ٹکڑے بے محل ہیں۔ معجز کے معنی "عاجز کرنے والا" کے ہیں۔ اور "کلک تصوّر" کے معنی تصوّر کی کلک کھلی نظم کے۔ دوسرا مصرع بے عیب اور اچھا ہے۔ پھر تیسرا مصرع مہملیت کا شکار ہو گیا ہے۔ "بارشِ موسیٰ کلامی ہائے ہندوستاں" ـــــ یعنی چہ؟ اپا چوتھے مصرع میں "دل افروزِ سخنداناں" بھی اچھی ترکیب نہیں ہے۔

تیسرا شعر تو خیر غالب کے دیوان کا مطلع ہی ہے مگر معمولی تصرّف کے ساتھ ــــ لیکن یہ مطلع بھی اس بند میں پیوند ہی معلوم ہوتا ہے، جس سے کوئی خاص بات پیدا نہیں ہوتی۔ غالباً انہیں گوناگوں نقصانات کے پیش نظر اقبال نے اس بند کا سراپا ہی بدل کر رکھ دیا ہے۔ اب وہی بند "بانگ درا" میں ملاحظہ ہو ؎

محفلِ ہستی تری بربط سے ہے سرمایہ دار … جس طرح ندی کے نغموں سے سکوتِ کوہسار
تیرے فردوسِ تخیل سے ہے قدرت کی بہار … تیری کشتِ فکر سے اُگتے ہیں عالم سبزہ زار

زندگی مضمر ہے تیری شوخیِ تحریر میں
تابِ گویائی سے جنبش ہے لبِ تصویر میں!

"مخزن" میں چھپے بند کے دوسرے اور پہلے شعر کے مفاہیم کو بالترتیب پہلے اور دوسرے شعر میں کس خوبی اور شعریت کے ساتھ نظم کیا ہے، اہلِ ذوق خود اندازہ کریں۔ اور تیسرے شعر میں غالب کے مطلع کی کیا حسین تشریح کی ہے! سبحان اللہ ! ہا!

شاعرو ہنگ

ایمان سے کہ مطلع کی اِس جاندار تشریح سے غالب کی رُوح پھڑک اٹھی ہوگی۔ مختلف شارحینِ کرام نے غالب کے اس مطلع کی مختلف شرحیں لکھی ہیں لیکن سب کی سب اگر یکسر بے جان نہیں تو نیم جان ضرور ہیں ؎

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا.....

شاعر بہ اندازِ تغافل پوچھتا ہے کہ یہ نقش یا پیکرِ تصویر کس کی شوخیٔ تحریر کا فریادی ہے۔ محرر کے جاندار قلم نے ایسا نقش یا تصویری پیکر تراشا ہے جو منہ سے بولتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس کے لب اب ہلے کہ تب ہلے۔ گویا تحریری نقش یا پیکر شاعر سے شاکی ہے کہ اُس نے اُسے کاغذی کیوں بنایا یعنی تحریر کے ذریعہ کاغذ پر اُس کا سراپا کیوں کھینچا۔ اُس نے اُسے گوشت پوست کا قالب کیوں عطا نہ کیا۔ دراصل اِس شعر میں شاعر خدا کا مدِمقابل ہے۔ وہ اپنی قدرت کا موازنہ خدا کی قدرت سے بڑے ہی غیر محسوس پیرائے میں کرتا ہے۔ خدا کی مخلوق اور شاعر کی مخلوق میں فرق صرف یہ ہے کہ خدا کی مخلوق گوشت پوست کی ہے اور بولتی ہے جبکہ شاعر کی مخلوق کاغذی ہے اور بولتی تو ہے مگر بے آواز۔ اقبال کا تشریحی شعر دوبارہ پڑھیے اور پھر دیکھیے کہ یہ تشریح دل لگتی ہے کہ نہیں۔

اپنے اِس نئے بند میں اقبال نے پہلے شعر میں غالب کو شاعرِ عالم، دوسرے میں شاعرِ فطرت اور تیسرے میں مصوّر شاعر کہہ کر نہ صرف فکرِ غالب کا صحیح محاکمہ پیش کیا ہے؛ بلکہ نظم کا تسلسل بھی برقرار رکھا ہے۔

"مخزن" میں نظم کے چوتھے بند کا پہلا شعر یوں شائع ہوا ہے ؎

لطفِ گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں
ہو تصوّر کا نہ جب تک فکرِ کامل ہم نشیں!

جبکہ "بانگِ درا" میں چھپی نظم میں اِس شعر کے دوسرے مصرع میں "تصوّر" کی جگہ "تخیّل" ہے۔ اور اس تبدیلی کے سلسلے میں بھی اقبال کا وہی ذہن کام کر رہا ہے۔ جو "مرغِ تصوّر" کے سلسلے میں پیش کیا جا چکا ہے۔

اِسی بند کا آخری شعر "مخزن" میں یوں چھپا ہے ؎

گیسوئے اُردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے
شمع یہ جوئندۂ دل سوزیٔ پروانہ ہے!

جبکہ "بانگِ درا" میں اِس شعر کے دوسرے مصرع میں "جوئندہ" کی جگہ "سودائی" ہے۔ اور یہ اصلاح شمع اور پروانہ کی مناسبت سے واقعی معقول ہے۔ فارسی لفظ "جوئندہ" نہ صرف یہ کہ ثقیل ہے اور شعر کے مزاج سے میل نہیں کھاتا، بلکہ اِس سے شعر کا مفہوم بھی کمزور ہو جاتا ہے۔ شمع کی جستجو سے پروانوں کی دل سوزی مشکوک ہو جاتی ہے جبکہ شاعر کا منشاء ہرگز یہ نہیں ہے۔ حق بہ حقدار رسید کے مصداق "سودائی" واقعی موزوں ترین لفظ تھا۔ اِس لفظ نے پورے شعر میں جان ڈال دی ہے۔ اس سے شعر میں بڑی دلربائی اور بلا کی تاثیر پیدا ہو گئی ہے۔

نظم کا آخری بند "مخزن" میں یوں ہے ؎

اے جہان آباد! اے گہوارۂ علم و ہنر
ہیں سراپا نالۂ خاموش تیرے بام و در!
تیرے ہر ذرّے میں خوابیدہ ہیں سو شمس و قمر
یوں تو پوشیدہ ہیں تیری خاک میں لاکھوں گہر
دفن تجھ میں کوئی فخرِ روزگار ایسا بھی ہے!
تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے!

[illegible] میں موشمس و قمر کا پایا جانا بہت مبالغہ آمیز تھا۔ فنِ شاعری میں بے شک مبالغہ کی اہمیت ہے لیکن اس میں کسی توازن کا [illegible] ہے۔ مبالغہ کے اس تجاوز ہی نے اقبال کو اس مصرع کی اصلاح پر مجبور کیا ہوگا۔ چنانچہ "بانگِ درا" میں یہ مصرع یوں مرقوم ہے ؎

ذرّے ذرّے میں ترے خوابیدہ ہیں شمس و قمر

اور یہ مبالغہ ذائقی متوازن بھی ہے اور پُر تاثیر بھی۔

جس موضوع پر یہ چند سطور لکھی گئی ہیں، وہ بہت ہی دلچسپ اور کارآمد ہے۔ عموماً ہر بڑے شاعر کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ بار بار اپنے کلام پر نظرثانی کرتا رہتا ہے۔ جب تک فکر و خیال اور الفاظ میں صحیح ربط و حُسن اور گہرائی پیدا نہیں کر لیتا وہ مطمئن نہیں ہوتا ہے۔ جن شعرا کی زندگی میں اُن کے کلام کی تدوین ہوئی ہے، اُس میں نظرثانی کی بہترین مثالیں ہمیں مل سکتی ہیں۔ نہ صرف مجموعۂ کلام کے پہلے ایڈیشن میں ان تبدیلیوں کے واضح نشانات ملتے ہیں، بلکہ بعض شعراء نے اپنے مجموعوں کے دوسرے اور تیسرے ایڈیشنوں میں بھی کافی تبدیلیاں کی ہیں۔

بقیہ "عشق اقبال کی نظر میں" صفحہ ۲

یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیئے کہ اس عشق کا ایک کلی پہلو بھی ہے اور صاحبِ عشق کا اس پہلو سے اعراض عشق کے اس تصور کو محض جینی بنا دیتا ہے۔ اسی لیے "یَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" کے پیشِ نظر اقبال کائنات کے تمام مظاہر سے اپنا گہرا تعلق قائم کرنے پر زور دیتے ہیں۔ قدرتی مناظر سے اقبال کی دلچسپی اسی وجہ سے ہے ۔۔۔۔ اس وسیع و عریض کائنات میں ہر جگہ پھیلے ہوئے انسانوں میں اُن افراد سے بہرحال فطری طور پر زیادہ تعلق خاطر محسوس ہوتا ہے جو ہمیشہ اپنے گرد و پیش موجود رہیں اور جن سے روزانہ سابقہ پیش آتا رہتا ہے۔ اسلام میں پڑوسی تو پڑوسی مسافر اور سفر کے ساتھی تک کے ساتھ حسنِ سلوک اور محبت کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس طرح اپنے ملک اور وطن کے افراد سے یگانگت اور محبت عین فطری ہے۔ اس میں مذہب اور رنگ و نسل کی کوئی قید نہیں بلکہ آدم کی اولاد ہونے کے ناتے تمام انسان بھائی بھائی ہیں۔ ان سے محبت لازمی اور ان میں تفریق [illegible] ہے۔ اقبال کی شاعری میں محبت کے اسی جذبے کی فراوانی ہے۔

قطب سرشار

سورج کی ندا آتی ہے

سنو رفیقو ــــــ!
جو جسم پہ گذری ہے بھول جائیں
سیاہ راتیں گھٹی گھٹی ہیں
سیاہیوں نے تمام سڑکوں کی وسعتوں کو چھپا لیا ہے
نہ کوئی چہرہ نہ کوئی منظر جو زندگی کا یقیں دلائے
دلوں کے جنگل خزاں رسیدہ
زمین پیاسی ہے اور سوکھی
دلوں میں خنجر عداوتوں اور نفرتوں کے
چھپائے پھرتے ہیں اہلِ دانش
برہنہ اشجار پر پرندے پروں کو اپنے جھٹک رہے ہیں
ہوائیں چیخوں کا شورِ پیہم
فضا میں بارود جل رہا ہے
زمیں آتش کدہ بنی ہے۔
سنو رفیقو ــــ!
جو جسم پہ گذری ہے بھول جائیں
یہ رات کالی سیاہیوں کی ہے گہری کھائی
ہزاروں برسوں سے جس میں ہم سب بھٹک رہے ہیں،
سنو کہ سورج بھی کہساروں کی سخت باہوں میں پھنس گیا ہے
وہ کتنی صدیوں سے چیختا ہے
مجھے بچاؤ ــ! مجھے بچاؤ ــ!
چلو رفیقو اُسے بچائیں
حیاتِ نورِ سحر کو کب سے ترس رہی ہے ــــ!!!

رشید عبدالسمیع جلیل

بیسویں صدی کا المیہ

نہ ذکر زیرِ آسماں
پسِ رباب نہ کوئی
بکھیرتا ہے وقت کی اداس سرسراہٹیں
نہ انبساطِ نغمہ ہے نہ اعتبارِ روز و شب
خیال و خواب منتشر
نفس نفس فسردگی سے نیم جاں
خلش بقدرِ احتیاج
بجا کہ اضطرابِ جاں بھی عارضی نہیں مگر،
شعور و آگہی کی بات باعثِ فروغِ درد
خرامِ وقت بے صدا
حدودِ کائنات میں
کسے خبر کہ انقلاب کتنے ہمرکاب ہیں
سمندروں کے پانیوں میں جانے کیسی آگ ہے۔
جھلس رہی ہے یہ زمیں
خلا میں حبسِ دم کا احتمال ہے،
حیات اک عذاب ہے،
مجھے یہ اعتراف ہے کہ لاشعوری طور پر
تمام سرسراہٹوں کو جذب کر چکا ہوں میں
قدم قدم روش روش
ہجومِ دلبری نہیں
جنوں کی ساری منزلیں بھی تشنہ کام رہ گئیں
سنبھل سنبھل کے چل رہا ہوں رہگذارِ زیست پر
غبارِ کارواں نہیں،
سمجھ چکا ہوں غالباً
کہ بیسویں صدی ہے یہ۔

علی عباس اُمید

اِحساس کی سطح

دشت ویران کے مانند ہیں میری آنکھیں
نہ کہیں سایۂ گل ہے، نہ تمنّا کی بہار
نہ تو جذبات کے غنچے، نہ اُمیدوں کی پھوار
ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا نشانِ کہسار
ایک ذرّہ بھی نہیں یاں کا مسرّت بہ کنار
حرف تا فرش فقط سوچ کی حسرت کا غبار
نہ کہیں نیند کا کاجل، نہ کہیں شب کا خمار
اور بینائی بھی ٹھہری ہے متاعِ بیکار!

بیکراں دشت کے ویرانے میں سطحِ احساس
ایسی اک جگہ ہے جس کے ہیں امیں ہوش و حواس
اور اس سطح پہ شفاف و بلوریں پیکر
شام کے ساتھ یہ اندازِ سحر
اپنی رعنائی سے رنگوں کے جلو میں ہر روز
چاند کی طرح سے ہوتا ہے طلوع۔
اُس کی رعنائی سے رنگوں کی رُوپہلی کرنیں
دشت ویراں میں بکھر جاتی ہیں
اور... کچھ اور نکھر جاتی ہیں!!

چاند ویراں ہے مگر چاندنی کا رُوپ انوپ
اپنی باہوں سے سمیٹے ہوئے ماحول کی دھوپ
بیکراں دشت میں
جس سمت چلا جاتا ہے۔
اس کی ویرانی کو
شاداب
بنا آتا ہے۔!!!

ممتاز شکیب

فکر

دھوپ سے تپتے ہوئے بن میں
اونچے سے اک پیڑ کا سایہ
شاخوں پر سورج کو تھامے
کچھ دن سے یہ سوچ رہا ہے
لمحوں کی شدّت کا موسم
بدلے تو سبزہ لہرائے!

سیّدہ زہرہ دیولالوی

پتّھر

کس نے چھینا مرا اندازِ تکلّم مجھ سے
مرے اطراف وہی موت کا سنّاٹا ہے
دیکھتے دیکھتے پتھرا گئیں آنکھیں میری
جسم ساکت ہے کسی سنگِ شوالہ کی طرح
جم گیا خون رگوں میں کوئی تحریک، نہیں
میں بھی پتّھر ہوں کوئی تیشہ بکف آ جائے،

شاعر جمو.

ظفرالاسلام ظفر

امرجوت

میں ہوں اک خاک محل جس کے کسی گوشے میں
اک دیا میں نے محبت کا جلایا تھا کبھی
اب بھی پر نور ہے وہ اب بھی ضیا پاش ہے وہ
روز و شب آتے رہے آتے رہیں گے یوں ہی
ماہ و سال آتے رہے آتے رہیں گے یوں ہی
تند رو وقت کے پیمانوں کی یہ آمد و شد
نہ رکی ہے نہ تو رک پائے گی روکے سے کبھی
لیکن اس خاک محل میں جو دیا جلتا ہے
یوں ہی پر نور ضیا پاش رہے گا لوگو!
اور اس وقت بھی جب
ملک الموت کی اک ضرب کے ساتھ
یہ محل خاک میں مل جائے گا
یہ دیا اپنی امر جوت کے ساتھ
یوں ہی پر نور ضیا پاش رہے گا لوگو!

ایک لمحے کی تلاش

وقت کی صدیوں سے کچھ لمحے چرا کر اک دن
چھاؤں میں سوچ کی میں بیٹھ گیا.
اور یادوں کی کھنڈر میں جا کر
ایسے لمحات کے ٹکڑوں کو سمیٹا میں نے
جن کے ہونٹوں پہ تبسم کے کنول جلتے تھے
پھر خیال آیا کہ لمحات کے ان ریزوں سے
ایسے اک لمحے کی تخلیق کروں
جو کہ چھوٹا ہو مگر سالم ہو
آہ! لمحات کے ان ٹکڑوں سے
ایک لمحہ بھی نہیں بن پایا۔

لمبے راستوں کا سفر

تین سال گزر گئے۔ لیکن یوسف نے دوسری شادی نہیں کی۔ اس لئے نہیں کہ اب وہ شادی کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے یا اُن کی طبیعت اس کے لئے راغب نہیں تھی، بلکہ ان کے سامنے اپنے دو کم سن بچوں کا مستقبل تھا۔ جب ماں نے داغِ مفارقت دیا، تو ندیم پانچ سال کا تھا اور شنو کی عمر دو سال تھی ——— اب شنو پانچ سال کی تھی اور ندیم آٹھ سال کا ہو چکا تھا اور دونوں ہی اسکول جاتے تھے۔ یوسف صاحب کے سامنے دوسری شادی اور سوتیلی ماں کی متعدد رنج فرسا مثالیں موجود تھیں۔ اس لئے اُن کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ اپنے پھول جیسے نازک اور ننھے منے بچوں کی ملکوتی مسکراہٹوں پر غم کا سایہ ڈال دیں۔ حالانکہ مرنے والی نے گھر بسانے کی وصیت بھی کی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ عورت اور مرد زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہوتے ہیں، اگر ایک پہیہ ٹوٹ جائے تو گاڑی کو کھینچنے کے لئے اس کی جگہ نیا پہیہ لگانا ہی پڑتا ہے لیکن یوسف صاحب سمجھتے تھے کہ مرنے والی نے اس وصیت سے محض اپنی عالی ظرفی اور وسعت منشی کا ثبوت دیا تھا۔ ورنہ بھلا کوئی عورت اپنے جگر کے ٹکڑوں کو سوتیلی گود میں ڈالنا گوارا کر سکتی ہے۔

یہاں یوسف صاحب سے ایک چوک ہو رہی تھی۔ مرنے والی در اصل ممتا اور شرافت کی تصویر تھی، اور سمجھتی تھی کہ عورت عام طور سے شرافت اور ممتا کی تصویر ہی ہوا کرتی ہے اس لئے اُس نے سمجھا تھا کہ جو عورت یوسف صاحب کے گھر کی بہار بن کر آئے گی وہ ان کے بچوں کے لئے ماں کا نعم البدل بھی ہوگی۔ لیکن یوسف صاحب کا دل نہیں مانتا تھا۔ دوسری شادی کے تصور ہی سے انہیں وحشت ہونے لگتی تھی۔

اسی کشمکش میں تین سال گزر گئے۔ دوستوں اور رشتے داروں کے سمجھانے بجھانے کا بھی ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ گھر میں صرف بوڑھی ماں تھی۔ بہنیں شادی شدہ تھیں۔ ایک نٹ کھٹ اور سرکش نوکرانی تھی، یوسف صاحب کی بے بسی نے اس کو انتہائی گستاخ اور بدمزاج بنا دیا تھا۔ وہ کسی کو کل سیدھی سمجھتی ہی نہ تھی۔
بچوں کی دیکھ بھال اور گھر کے کام کاج میں یوسف صاحب کی ماں کو بڑی پریشانی ہوتی تھی۔ نوکرانی بات بات پر چونچلے کرتی اور چھوڑ دینے کی دھمکی دیتی رہتی۔ بچے ایک تو یوں ہی اللہ آمین کے پالے ہوئے تھے، ماں کے مر جانے سے ان کا لاڈ پیار اور بھی بڑھ گیا۔ دادی کی پلکیں اُن کے قدموں تلے بچھی رہتیں اور باپ کی گود ہر گھڑی ان کے لئے بے قرار رہتی۔

یوسف صاحب دفتر سے آنے کے بعد ایک لمحہ کے لئے بھی دونوں بچوں کو نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیتے۔ بھلا ایسی حالت میں وہ بچوں پر سوتیلی ماں کا سایہ کیسے پڑنے دیتے۔

ایک بار ایسا ہوا کہ یوسف صاحب کی ماں سخت بیمار ہو گئیں اور اُن کی دونوں بہنیں ماں کی تیمارداری کے لئے سسرال سے میکے آ گئیں۔

بہنوں نے بھی یوسف صاحب پر گھر بسانے کے لئے زور ڈالا۔ کیوں کہ کچھ دنوں رہ کر ان دونوں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ اُن کے بھائی کی ایک پہیہ والی گاڑی دوسرے پہیے کے

...سے بیوہ ہوئی تھی وہ ہیں آ کی پڑی ہے۔ اور دوسرا بیٹے کے بغیر گھر گرہستی کے چلنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ ماں نے بھی داماد اور بیٹیوں کی ہاں میں ہاں ملائی۔ لیکن یوسف صاحب اُدھر ادھوری باتوں میں ٹال گئے۔

ماں کے صحت یاب ہونے پر دونوں بہنوں نے واپسی کا قصد کیا۔ اور ننھی بہن اپنی بچی شنّو کو ساتھ لے جانے اور اپنے پاس رکھنے پر بضد ہوگئی۔ یوسف صاحب نے بادلِ ناخواستہ اجازت دے دی۔ لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد یوسف صاحب کا دل اپنی بچی کی جدائی میں تڑپنے لگا۔ ندیم بھی اکیلا اکیلا سا رہ کر اُداس ہو جایا کرتا۔ پھر نہ جانے کیوں یوسف صاحب کو بیٹے کے مقابلے میں بیٹی سے زیادہ پیار اور اُنس تھا۔ اس کی وہ بھولی بھالی حرکتیں اور میٹھی میٹھی باتیں، بات بات پر رُوٹھ جانا، گردن سے لٹک جانا اور سینے پر لیٹ جانا، گود میں سما کر سو جانا، سوتے میں ہونٹوں اور آنکھوں کو ننھی منّی انگلیوں سے کریدتا اور ذرا سی گدگدی پر کھلکھلا کر ہنس پڑنا۔ یہی تو وہ معصوم راحتیں اور روح کی مسکراہٹیں تھیں جن کے سہارے یوسف صاحب اپنی گرانبار اور اُداس زندگی کو کاٹ رہے تھے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ شنّو سر سے پاؤں تک اپنی ماں سے اس قدر مشابہ تھی، جیسے سانچے میں ڈھال دی گئی ہو۔ اپنی رفیقۂ حیات کی اس زندہ نشانی سے اُن کے دل کو بڑی تسکین ہوتی تھی۔

اور ایک دن شنّو کی یاد نے اُن کو پاگل کر دیا۔ دفتر سے چھٹی لی اور بہن کے ہاں پہونچ گئے۔ اور بہن کا دل توڑ کر شنّو کو گھر لے آئے۔ پھوپی نے شنّو پر اپنا پیار کچھ اس طرح نچھاور کیا تھا کہ بچی باپ کو بھول کر پھوپی ہی کی ہو کر رہ گئی تھی۔ جب اُسے معلوم ہوا کہ اُس کو پھوپی سے الگ کیا جا رہا ہے تو وہ رونے لگی۔ اس بات نے یوسف صاحب کو اور بھی بیقرار کر دیا۔ وہ سوچنے لگے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کچھ عرصے بعد وہ اپنی بچی کے لئے اجنبی بن جائیں۔ اس لئے انہوں نے بہن کے جذبات کی اور بھی پروا نہ کی۔

لیکن یوسف صاحب کی زندگی [illegible] سے زیادہ

دلدل تک نہ پہنچ سکی۔ وہ تھکے تھکے سے نظر آنے لگے۔ بعض اوقات انہیں اپنی زندگی ادھوری ادھوری سی محسوس ہوا کرتی۔ دن اور رات کی بعض ساعتیں ایسی بھی ہوتیں جب اُن کا جی اداس، اور خیال کھویا کھویا سا رہتا۔ کبھی سرد اور کالی راتوں کی پُر سکون تنہائیاں ۔ گونگی اور طویل تنہائیاں روح کو بے قرار اور آوارہ کر دیا کرتیں۔ کبھی خنک اور شفاف چاندنی راتیں بے چین کروٹوں اور ادھورے ادھورے سپنوں میں کٹ جاتیں۔ اکھڑی اکھڑی نیند اور تھکے تھکے خیالات۔ صبح کو بستر چھوڑتے تو ذہن تھکا تھکا اور جسم نڈھال ہوتا۔ رات کو جب بچے سو جاتے تو یوسف صاحب کی پیاسی زندگی کے وہ تقاضے جاگ اٹھتے جنہیں وہ فرض اور محبت کی لوریوں اور تھپکیوں سے سلا دینا چاہتے تھے۔ زندگی کے جن سوتوں کو وہ خشک کرنا چاہتے تھے اُن کی دھاریں اپنے پھوٹنے کا راستہ نہ پا کر اندر ہی اندر مچلتی رہتیں۔

انسان دن بھر کے شور اور ہنگامے میں گھرا رہنے کے بعد تھک کر چُور ہو جاتا ہے اور پھر اپنی کھوئی ہوئی توانائی اور چستی حاصل کرنے کے لئے رات کی پُر سکون تنہائی اور گہری خاموشی میں ڈوب جاتا ہے۔ یہ تنہائی فکر و عمل سے دُور جسم اور جذبات کا حصہ ہوتی ہے۔ ایسے میں جسم اور جذبات کو کوئی ہمنوا اور محرمِ راز نہیں ملتا تو اس کی خلوت کانٹوں کی سیج بن جاتی ہے، اُس کا بستر اس کی نازک تمناؤں کا تابوت بن جاتا ہے اور اس کے احساسات کٹی ہوئی پتنگ کی طرح خلا میں ڈانوا ڈول ہوتے رہتے ہیں۔ اس پتنگ کا نہ کوئی سہارا ہوتا ہے اور نہ اس کی کوئی منزل ہوتی ہے۔ اس ٹھوس اور عظیم حقیقت کی چبھن نے یوسف صاحب کو بھی بیکل رکھنا شروع کر دیا تھا۔ اور ابھی یوسف صاحب کی عمر ہی کیا تھی؛ ———— سینتیس سال! اس عمر کا جوان اور تندرست مرد جو روٹی کپڑے سے خوشحال ہو اور جو ازدواجی زندگی کی راحت و لذت سے آشنا ہو وہ بھلا تجرد کی زندگی کب تک جھیل سکتا ہے۔ وہ زندگی اور بشریت کے تیز و تند دھاروں پر کاغذ کی ناؤ کب تک چلاتے رہتے۔

آخر ایک وقت آیا جب اُن کی اُداسیوں اور بے کیفیوں کو ماں کی بوڑھی آنکھوں نے بھی بھانپ لیا۔ ماں جانتی تھی کہ آدھی آدھی رات تک کتابیں پڑھتے رہنے، کھانا کم کھانے اور پہننے اوڑھنے کی

شاہ جی

طرف سے بے نیاز ہو جانے کا کیا مطلب تھا۔ وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ
بار بار طور پر خاموش رہنے اور صرف ادھر ادھر کی بات کا ٹال دینے کا سبب
کیا تھا۔ اس بار ماں نے بیٹے کی کوئی ضد نہیں سُنی اور لڑکی کی تلاش
شروع کر دی۔ یوسف صاحب شادی کے لئے نیم رضامند تو ہو ہی
چکے تھے مگر ان کے دل میں ایک بات کھٹکتی رہتی تھی جو وہ ماں سے کہہ
نہیں پاتے تھے۔ وہ بات اس لڑکی یا عورت سے متعلق تھی جس
کی تلاش جاری تھی۔

دراصل یوسف صاحب بہت حساس اور محتاط طبیعت
کے مالک تھے۔ وہ کوئی کام کیا کرتے تو اس کے تمام نشیب و فراز پر
بار بار غور کر لیتے۔ پھر شادی اور وہ بھی دوسری، تو بہت بڑی
بات تھی۔ اس پر تو وہ جس قدر بھی غور و فکر کرتے کم تھا۔ اور یہ اسی
غور و فکر کا نتیجہ تھا کہ وہ کسی کم سن اور کنواری لڑکی کو بیاہ کر لانا
نہیں چاہتے تھے۔ کسی نوجوان لڑکی کے ساتھ ان کا کوئی میل نہیں تھا۔
کیوں کہ وہ اپنی نوجوانی کے دور کو دس پندرہ سال پیچھے چھوڑ چکے
تھے۔ جو کچھ وہ دس پندرہ سال پہلے تھے اُس میں اور آج میں
فرق پیدا ہو چکا تھا۔ اس درمیانی عرصہ میں دنیا کے سرد و گرم اور
زندگی کے نشیب و فراز کا تجربہ حاصل تھا۔ طبیعت میں وہ شوخی اور
گرمی باقی نہیں تھی۔ اُمنگوں اور ولولوں میں وہ جوش و خروش
نہیں تھا۔ قدم قدم پر رکنے، رک کر سوچنے اور سوچ کر چلنے کی
عادت پڑ چکی تھی۔ اٹھارہ بیس سال کی جوان لڑکی شریک حیات
بن کر آتی تو اُس کے خوابوں کی تعبیر پر وہ پورے نہیں اتر سکیں
گے۔ اس کی رفتار ______ اُس کے قدموں کی رفتار اور
اس کی سانسوں کی رفتار ______ اُن کے مقابلے میں تیز ہوگی
وہ بے چاری ان کے تجربات اور تفکرات کا ساتھ دینے میں کتنی
بدمزگی محسوس کرے گی۔ یوسف صاحب نے اس بات پر یوں
غور کیا کہ جب وہ پچیس سال کے کنوارے نوجوان تھے، اُس
وقت اگر پینتیس ۳۵ سال کی دو بچوں والی بیوہ اُن کی شریک زندگی
بنائی جاتی تو اُن کے احساسات اور جذبات کا کیا عالم ہوتا۔ اس
لئے وہ کسی ایسی عورت سے شادی کرنا چاہتے تھے جو [illegible]
سے کچھ کم ہو۔

یوسف صاحب نے رشتے کی [illegible]
کو ماں کے سامنے پیش کیا۔ لیکن ان کا فلسفہ ماں کی سمجھ میں نہ آسکا
وہ سوچتی تھیں کہ ان کا بیٹا کتنا سیدھا اور بے وقوف ہے! چاہے تو
ماں نے یوسف صاحب کی اس بات پر کوئی دھیان نہیں دیا لیکن
جب دیکھا کہ بیٹا اپنے خیال پر اٹل ہے تو مجبور ہو کر اس کی پسند کی
بیوہ کی بات چلائی۔ اور آخر ماں نے دکھ ہی سے ساجدہ [illegible] ایک
کو پسند کر ہی لیا جو شادی کے کچھ دن بعد ہی بائیس سال کی عمر میں
بیوہ ہو گئی تھی۔ اور اب اُس کو بیوہ ہوئے تین سال گزر چکے تھے
وہ کون سی خوبی تھی جو ساجدہ میں نہیں تھی۔ اس کی سب سے بڑی خوبی
تو یہی تھی کہ وہ یوسف صاحب کی شرط اور پسند پر پوری اُترتی
تھی۔ پھر بھی یوسف صاحب کچھ جھجکے اور جب انہوں نے اپنی
فیصلہ کن رضامندی کا اظہار کیا تو کئی روز تک ان کا [illegible]
رہا۔ وہ بالکل خاموش اور گوشہ گیر سے رہنے لگے جیسے وہ
کوئی بہت بڑی غلطی کر رہے ہوں۔ انہیں رہ رہ کر اپنی پہلی بیوی
کا خیال آتا اور کبھی کسی وقت وہ ندیم اور شگفتہ کو دیر تک نہارتے
رہتے۔ گویا وہ اپنی زندگی کی ساری پونجی کو پہلی اور آخری بار
ایک ہی داؤ پر لگا دینے کا فیصلہ کر رہے ہوں۔

ساجدہ یوسف صاحب کی شریک حیات بن کر آگئی۔ در و دیوار
جگمگا اٹھے۔ گھر کے کونے کونے میں رونق آگئی۔ نیا ماحول پیدا ہو
گیا اور زندگی کا نیا سفر شروع ہوا۔ ساجدہ کے قدم رکھتے ہی
یوسف صاحب نے محسوس کیا جیسے گھر کا نقشہ بدل گیا ہو۔

یوسف صاحب اور ساجدہ کی پہلی ملاقات کا آغاز جس
جملے سے ہوا ______ "ہمیشہ سے یہ رسم چلی آئی ہے کہ شوہر پہلی
ملاقات میں یادگار کے طور پر بیوی کو کوئی تحفہ دیتا ہے۔ میں نے
بھی تمہارے لئے دو تحفے بلکہ جوڑے ہیں۔ ایک پھول ہے
اور ایک کلی۔ اس پھول اور کلی کی خوشبو اور شادابی کو قائم
رکھنا اب تمہارا فرض ہے۔ تم نے پورا [illegible]
نہیں کی، پھر بھی یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ [illegible] اس
کلی کا حق اور تمہارا اس پر ہو گیا ہے"

جب کہ یوسف صاحب کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئے، پھر بولے ——— "میں نے سُنا ہے کہ تم بہت ذہین اور سنجیدہ ہو، ضرور ہو گی۔ اور مجھے یقین ہے کہ تم جلد ہی یہ بات سمجھ لو گی کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ یہ گھر تمہارے پاس میری ایک بہن کی امانت ہے۔ تم پہلے ان بچوں کی ماں ہو اور بعد میں میری شریکِ حیات۔ مجھے معلوم ہے کہ تم خود بھی بچپن ہی میں ماں کے سائے سے محروم ہو گئی تھیں اور تم نے سوتیلی ماں کے بہت ظلم ستم سہے ہیں۔ اسی لئے تمہاری ذات پر مجھے پورا پورا بھروسہ ہے اور میرا دل کہتا ہے کہ تم میرے بچوں کی سگی ماں بن کر اپنی سوتیلی ماں کے ناگوار نقش کو مٹا کر رہو گی۔"

ساجدہ نے اس لیکچر کے جواب میں اپنا سر یوسف صاحب کے سینے سے لگا دیا۔ البتہ... یوسف صاحب اس کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کو نہ دیکھ سکے۔ یہی آنسو کسی دن شبنم بن کر پھول اور کلی کا منہ دُھلانے والے تھے۔

یوسف صاحب کی زندگی کا گلستاں ایک بار پھر ہرا بھرا ہو اُٹھا۔ ساجدہ کی رگوں میں زیادہ گرم خون تھا اور اس کی سانسیں زیادہ گرم اور تیز تھیں۔ پھر بھی اس نے اپنے بہت ہی نیک اور محبت کرنے والے خاوند کی زندگی سے اپنی زندگی کو ہم آہنگ کر لیا۔ یوسف صاحب کا سارا دھیان دو ہی باتوں کی طرف لگا رہتا۔ ایک یہ کہ ساجدہ کو بچوں کا کتنا خیال رہتا ہے اور دوسرے یہ کہ شیشے میں کوئی بال تو نہیں آیا۔ وہ اپنی بیوی کو کچھ ضرورت سے زیادہ کم سن اور ناتجربہ کار سمجھتے تھے۔ حالانکہ بات ایسی نہیں تھی۔ ان کو یہ وہم سا ہو گیا تھا کہ... ساجدہ کی نئی جوانی کہیں سنجیدہ اور بردبار زندگی سے اکتا نہ جائے۔ وہ اس کی سادگی اور سنجیدگی کو مصنوعی سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ شوخی و طرّاری اور لاابالی پن ساجدہ کی [illegible] جو اپنا جواب نہ پاکر کسی وقت بھی [illegible] احساس کمتری کا اثر تھا کہ یوسف صاحب کی نظر ہر وقت ساجدہ کے شیشے پر [illegible] لیکن

ساجدہ ان کے اس وسوسے اور احساس کمتری کے سبب سے بے خبر تھی۔ وہ اپنی زندگی اور مسرتوں میں کسی کمی کو نہ پاتی تھی۔ اس کے ذہن کو سکون اور دل کو قرار تھا جس سے یوسف صاحب محروم تھے۔ ان کا ذہن ہر لمحہ کسی دکھ میں لگا رہتا۔ [illegible] وہ خود بھی پریشان ہو جایا کرتے۔

شادی کے کچھ ہی دنوں بعد ندیم اور شنّو کو ساجدہ نے اس قدر مانوس کر لیا کہ یوسف صاحب حیران رہ گئے۔ پھر بھی وہم اور شک کا کیا علاج ہو سکتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ شروع شروع میں ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ نیا نیا تعلق ہے اس لئے یہ دل کشی اور لگاوٹ ہے۔ اصل رنگ تو آگے چل کر کھلے گا۔ اور آگے چل کر ایسا ہوا کہ بچوں نے یوسف صاحب سے ملنا جلنا کم کر دیا اور اپنی نئی ماں کے ہو کر رہ گئے۔ جب تک ماں سامنے نہ بیٹھتی وہ کھانا نہ کھاتے۔ ساجدہ اپنی اس جیت پر فخر اور خوشی سے پھولی نہ سماتی۔ چند مہینوں ہی میں بچوں کے ذہن سے سگی ماں کا نقش مٹتا چلا گیا۔ پڑوسیوں میں اس کی شرافت اور ممتا کے چرچے ہونے لگے۔ [illegible] کہا جاتا ہے۔ جو عورت خود سوتیلی ماں کے پالے پڑ چکی ہو، وہ جب خود سوتیلی ماں بنتی ہے تو محبت اور رحمت کا دریا بن جاتی ہے۔

یوسف صاحب بھی دوستوں کے سامنے ساجدہ کی تعریف ہی کیا کرتے لیکن ان کا دل پوری طور پر مطمئن نہیں تھا۔ اس لئے وہ گاہے گاہے ساجدہ کے طور طریقوں کے بارے میں بچوں سے بھی پوچھ لیا کرتے۔

ایک بار ایسا ہوا کہ یوسف صاحب نے اکیلے میں ننھی شنّو سے پوچھ لیا: "تمہیں امی کیسی لگتی ہیں؟"

شنّو نے کہا: "بہت اچھی۔"

یوسف صاحب نے پھر پوچھا، "خوب پیار کرتی ہیں؟"

شنّو نے دونوں بازوؤں کو پھیلاتے ہوئے زور دے کر کہا،

"بہت ——— اتنا پیار کرتی ہیں۔"

"اور کھانے کو خوب ڈھیر سارا دیتی ہیں؟"

"ہاں، اچھے اچھے کھانے بنا کر دیتی ہیں۔"

"ندیم کو کیا؟"

"نہیں تو کیا، میں اکیلی ہی سب کہہ سکتی ہوں۔"

اور جب یوسف صاحب دفتر چلے گئے تو شفو نے تمام باتیں ان کے سامنے دہرا دیں۔ شام کو جب وہ دفتر سے واپس آئے تو انہوں نے پہلی بار ساجدہ کے چہرے پر اداسی کی پرچھائیں دیکھیں۔ وہ کچھ چپ چپ سی تھی۔ آج ساجدہ کی مسکراہٹوں میں ہلکی سی تلخی رچی ہوئی تھی۔ بچوں کو سلا کر جب وہ سونے کے کمرے میں گئی تو یوسف صاحب نے کچھ پوچھنا چاہا لیکن وہ ٹال گئی۔ یہ اداسی کئی روز تک طاری رہی اور یوسف صاحب محسوس کرنے لگے جیسے ان کا کچھ کھو گیا ہے۔

آخر ایک بار جب یوسف صاحب نے بہت اصرار کیا تو ساجدہ نے آبدیدہ ہو کر کہا، "آپ میرے بارے میں بچوں سے پوچھتے ہیں، کیا آپ خود نہیں سمجھ پاتے کہ میں کیسی ہوں۔ اگر اتنا کچھ کرنے پر بھی آپ کو مجھ پر شک ہے تو سوچتی ہوں کہ آنے والے دن کیسے کٹیں گے۔"

یوسف صاحب نے ہنستے ہوئے کہا، "تم کتنی وہمی اور نازک مزاج ہو۔ میں نے تو یوں ہی ذرا شفو سے پوچھ لیا تھا ورنہ میری کیا آنکھیں پھوٹ گئی ہیں۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اگر تم نے ان بچوں کو اپنی کوکھ سے بھی جنم دیا ہوتا تو ان سے زیادہ کیا کر سکتی تھیں۔"

ساجدہ کا دل خوشی اور فخر کے احساس سے دوہرا ہو اٹھا اور شکایت کے آنسو مسرت کے آنسوؤں میں تبدیل ہو گئے ——— لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ یوسف صاحب کا ذہن صاف نہیں تھا۔ اور وہ کچھ نہ کچھ سوچتے ہی رہتے تھے۔

شادی کے ایک سال بعد ساس اور بہو کا وہ ناٹک شروع ہو گیا جو کم و بیش ہر گھر میں ازل سے ہوتا آیا ہے۔ ماں یہ سمجھتی ہے کہ بیٹا سو فی صد اس کی ملکیت ہے اور بیوی کا یہ دعویٰ کہ شوہر پر اس کے سوا اور کسی کا حق نہیں۔ کیونکہ اس کی خاطر وہ اپنے والدین اور عزیز و اقارب کو ساری زندگی کے لئے تیاگ کر صرف اسی کی ہو کر رہ جاتی ہے۔ ساس اور بہو کے استحقاق کی اس کشمکش میں بیچارے مرد کی زندگی عذاب بن جاتی ہے۔ اور یہی یوسف صاحب کے ساتھ بھی ہوا۔ اور پھر کچھ دنوں کی متواتر بدمزگی کے بعد معصوم بچے بھی اس لڑائی کی زد میں آگئے۔ اگر ساجدہ ضبط سے کام نہ لیا کرتی تو سارا گھر جہنم کا نمونہ بن جاتا۔ ساس نے بچوں کو اس سے الگ رکھنے کی کوشش شروع کر دی اور ساجدہ یہ کہتی کہ بچے اس کے ہیں۔ ماں اور بچوں کے درمیان کسی کو حائل ہونے کا حق نہیں۔ بچے بھی بہت ساجدہ ہی کے پاس گھسے رہتے جس سے بڑی بی کو جلن اور کڑھن ہوتی رہتی اور اکثر خفا ہو کر بچوں کو ڈانٹتی رہتیں۔

ماں نے یوسف صاحب کے ذہن میں زہر بھرنا شروع کر دیا۔ ایک دن ان کے سامنے ہی ندیم کے سر پر ہاتھ پھیر کر اور بلائیں لے کر کہنے لگیں۔ "کیسا مرجھا گیا ہے میرا چاند! آخر کیوں نہ ہو، کھانا پینا ٹھیک ٹھیک ملتا ہو تو بچے پھول کی طرح کھلے رہتے ہیں۔ جس کا باپ چھ سات سو روپیہ ماہوار پاتا ہو اس کا یہ حال۔ کوئی دیکھے تو کیا کہے۔ کپڑے بھی قاعدے قرینے کے نہیں۔ اب میرے ہاتھ میں کیا دھرا ہے کہ ناز نخروں کے پالوں کو دیکھوں۔ جس کے ہاتھ میں ڈوری اس کے ہاتھ میں سب کچھ۔ سچ ہے جو کوکھ سے جنم دیتی ہے اس کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔"

یوسف صاحب کے دبے دبے شک کو سہارا مل گیا اور جب انہوں نے اپنے بچے کے چہرے کو غور سے دیکھا تو واقعی انہیں بھی وہ مرجھایا ہوا نظر آیا۔ ساجدہ بھی کسی ضرورت سے آگئی تھی۔ ماں بیٹے اچانک پراسرار طور پر خاموش ہو گئے۔ اور وہ بھانپ گئی کہ اس کے خلاف کوئی سازش کی جا رہی ہے۔ اس نے وہاں رکنا مناسب نہیں سمجھا اور ندیم کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے باہر نکل گئی۔ "چلو کپڑے بدل کر اسکول جاؤ وقت ہو گیا ہے۔"

ساس کی سازشوں اور شوہر کی دبی [illegible] بدگمانیوں کے باوجود ساجدہ کے دل میں بچوں کی طرف سے کبھی میل پیدا [illegible] پیار دیتا اتنا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کی ذمہ داریوں میں اضافہ [illegible] ہے اور کچھ دنوں کے بعد شفو اور ندیم دو سے تین ہو جائیں گے۔ اس کی ماں کی آزمائش کی سب سے کٹھن گھڑی آگئی تھی۔ ساس کو ایک نیا نسخہ مل گیا۔ اٹھتے بیٹھتے یہی کہا جاتا کہ اب تو اپنی کوکھ کھلنے والی ہے۔ کچھ دنوں میں گود بھر جائے گی، پھر پرائے بچوں کا دھیان کون کرے گا۔ ماں نے اس بات کو اچھی طرح یوسف صاحب کے ذہن نشین کرا دیا۔ اور ان کے دل میں ہمیشہ سے جو شک کا کانٹا چھپا ہوا تھا اب ان کی آنکھوں میں کانٹا بن کر چبھتا رہتا۔ ساجدہ بیوقوف نہیں تھی۔ وہ معاملے کو بھانپ گئی۔ مگر اس نے بالکل ہی چپ سادھ لی تھی۔ کیونکہ بات بڑھنے

سے تھی پیدا ہونے کا ڈر تھا۔

ساجدہ کے دن جوں جوں چڑھتے گئے وہ سستی اور تھکاوٹ محسوس کرتی رہی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گھر گرہستی میں اُس کی مستعدی کم ہوتی گئی۔ اس بات کو ساس نندوں کی بے توجہی اور بے دلی سے منسوب کر دیا۔ یوسف صاحب کے شک کا رنگ گہرا ہوتا گیا۔ اور آخرکار ایک دن اُنہوں نے ہمت کر کے ساجدہ کو ٹوک ہی دیا: "ساجدہ، اگر مالی اپنی پھلواری میں کوئی نیا پودا لگاتا ہے تو پرانے پودوں کی حفاظت اور سینچائی بند نہیں کر دیتا۔"

یہ بات ساجدہ کے دل میں تیر کی طرح لگی اور وہ کئی روز تک غم کے بوجھ سے پاگل بنی رہی۔ اس کی کھوئی کھوئی کیفیت اور دل کی اُداسی کو یوسف صاحب نے اچھی نظر سے نہیں دیکھا۔ بلکہ اُنہوں نے سمجھا کہ اب ساجدہ گھل رہی ہے۔ ایک تو جسم کی گرانی اور تھکاوٹ اُس پر دل زخمی اور دماغ نڈھال ——— ساجدہ اکثر اُلوانتی کھٹوانتی لئے پڑی رہتی۔ ظاہر ہے کہ اس کا اثر بچوں پر بھی پڑا۔ مگر یوسف صاحب اس بات پر حیران رہتے کہ ماں کی اُداسی نے بچوں کو بھی اداس کر دیا تھا اور دونوں اکثر ماں کے پاس ہی سوگواری صورت لئے بیٹھے رہتے۔ یہ راز یوسف صاحب کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ لیکن اُن کی ماں نے اِس راز پر سے بھی پردہ اٹھا کر اُن کا ذہن صاف کر دیا۔ اس نے کہا: "سوتیلی آخر سوتیلی ہی ہوتی ہے۔ بے چاری کب تک اپنے دل کو اور دنیا کو دھوکے میں رکھتی۔ اس کی جان کو یہ روگ لگ گیا ہے کہ ممتا کا ناٹک تو ختم ہو رہا ہے، اب وہ دنیا کو کیا منہ دکھائے گی۔ اس سوگ میں گھل رہی ہے۔ تم اپنے بچوں کا کوئی انتظام کر لو، پھر تم بھی چین سے رہ سکو گے اور اس بے چاری کے دل کا بوجھ بھی ہلکا ہو جائے گا۔ اور یہ بچے تو آخر بچے ہی ہیں۔ مارا نہیں سفید اور سیاہ کی کیا تمیز۔ گھر میں تو وہی ایک ہے، چاہے سوتیلی ہو یا سگی، اُس کو چھوڑ کر کس کے پاس جائیں گے۔ اسی لئے دونوں بھائی بہن اُس کے پاس گھسے رہتے ہیں۔"

ماں کی میٹھی زبان کا قاتل زہر یوسف صاحب کے دل میں سرایت کر گیا اور اُنہوں نے فیصلہ کر لیا کہ شنّو کو اُس کی پھوپھی کے گھر بھیج دیں گے اور ندیم کو کسی بورڈنگ ہاؤس میں داخل کرا دیں گے۔ مگر اُن کی طبیعت میں چونکہ ٹھنڈک اور سنجیدگی تھی اس لئے وہ اس کام کو بدمزگی پیدا کر کے نہیں کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ایک روز اُنہوں نے بیمار ساجدہ کے سرہانے بیٹھ کر اُس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا: "بُرا نہ مانو تو ایک بات کہوں" اور انہوں نے ساجدہ کے جواب کا انتظار کئے بغیر کہنا شروع کیا۔ "دیکھتا ہوں کہ تم روز بروز کمزور اور مضمحل ہوتی جاتی ہو۔ میرا خیال ہے کہ جب تک تمہیں اس جنجال سے فراغت نہ ہو جائے تم میکے جا کر رہو۔ یہاں گھر گرہستی کے بوجھ سے تم کو تکلیف ہوتی ہوگی ——"

ساجدہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

یوسف صاحب بولے: "تم ندیم اور شنّو کی فکر نہ کرو۔ شنّو کو اُس کی پھوپھی کے پاس بھیج دوں گا اور ندیم کو بورڈنگ ہاؤس میں داخل کرا دوں گا۔"

ساجدہ کے کلیجے میں یہ دوسرا تیر پیوست کیا گیا۔ ممتا کی اس سے بڑی ذلت اور کیا ہو سکتی تھی! وہ بالکل گم صم پڑی رہی۔ یوسف صاحب کے اصرار پر وہ صرف اس قدر بولی: "مجھے اپنے آپ پر قابو ہو سکتا ہے لیکن دوسروں کے دل پر میرا کیا اختیار ہے۔ جو کچھ آپ کا دل کہتا ہے آپ کے لئے وہی ٹھیک ہے۔ میں آپ کی مرضی میں دخل دینا نہیں چاہتی، میں کتنی بدنصیب ہوں کہ ان بچوں کی ماں بن کر آپ کو خوش نہ کر سکی۔"

ساجدہ کی آواز بھر آگئی اور آنکھیں بھیگ گئیں لیکن یہ آنسو یوسف صاحب کا ارادہ نہ بدل سکے اور وہ چپ چاپ اٹھ کر چلے گئے۔ وہ سوچنے لگی: "کتنی بڑی بدنامی اور رسوائی ہے کہ میری وجہ سے گھر کے بچے کہیں اور جا کر رہیں۔ میکے جا کر کیا کروں گی وہاں میری ماں طعنوں اور اُلاہنوں کے تیروں سے کلیجہ چھلنی کر دے گی۔ اب تو اسی در سے جنازہ نکلے تو سب کا کلیجہ ٹھنڈا ہو جائے۔ اگر میرے بغیر دونوں بچوں کا جی باہر لگ جائے تو واقعی میری ممتا میں کھوٹ ہوگا۔"

یوسف صاحب نے دونوں بچوں کو بھیج دیا۔ اور اب اُن کی ماں نے کہنا شروع کیا ——— ہائے ہائے، بھرا پُرا گھر کیسا سُونا سُونا سا ہو کر رہ گیا ہے۔ بچوں سے گھر کی رونق تھی اور اب تو گھر کھنڈر بیابان سا لگتا ہے۔ خدا کسی کو یہ دن نہ دکھائے۔"

ساجدہ کا دل ٹوٹ چکا تھا۔ اُس کی رُوح زخمی پرندے کی طرح پنجرے میں پھڑپھڑاتی رہتی۔ یوسف صاحب نے بھی دلچسپی کم

(بقیہ صفحہ ۴۴ پر دیکھئے)

اکرام جاوید

میں وہی ہوں

زندگی کے تجربات نے مجھے سنگدل بنا دیا ہے!

میں جو کل تھا آج نہیں ہوں۔ میں جو کل تھا بہت معصوم اور بے خبر تھا۔ بے حد جذباتی اور حساس تھا۔ پیار بھرا اُمنگ بھرا میرا دل، سوز و گداز اور گداخت کی دولت سے مالا مال تھا۔ میں حسن کا پرستار بھی تھا اور طلب گار بھی۔ حسن جو زندگی میں تھا۔ زندگی کے اصولوں اور اقدار میں تھا۔ دل [illegible] تھا۔ دل یقین سے [illegible] کی دنیا روشن تھی۔ مجھے انسان سے محبت تھی، کائنات کے ذرّے ذرّے سے عشق تھا۔ دکھ درد، بھوک، بیماری اور موت کے مقابلے میں انسان کی مجبوری اور بے بسی کا احساس مجھے بھی اکثر اداس کر دیتا تھا۔ آج زندگی کے تجربات نے مجھے بے حس بنا دیا ہے۔

سینے میں دل ہے ٹوٹا ہوا — درد کی، احساس کی دولت سے محروم — یاس کی سیاہی میں ڈوبا ہوا — بے یقینی کے کانٹوں میں اُلجھا ہوا۔ بے مروت، بے رحم اور خود غرض۔ زندگی کے حسن کا، عروج آدم خاکی کا، اصولوں اور اقدار کی عظمت کا مجھے اب کوئی پاس نہیں۔ احساس نہیں —!

دل کی بربادی کا افسانہ بے حد طویل اور دردناک ہے!

میں نے ایک متمول زمیندار گھرانے میں جنم لیا۔ بچپن لاڈ پیار میں گزرا۔ جوانی آئی تو شفیق باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ رشتے ناطوں کی پیار، محبت اور شرافت کا موسم بدل گیا۔ حقیقت سامنے آئی۔ خلوص اور وفا کا بھرم کھل گیا۔ عشق مصلوب ہوا۔ دل کا خون ہوا۔ حسن رسوا سربازار ہوا۔ خوابوں کے چمن جل گئے۔ تمنا کا شہر ویران ہو گیا۔ آسمان سے آگ برسی، پہاڑ شعلے اُگلنے لگا۔ پھول جل گئے۔ تارے بجھ گئے۔ سورج کا قتل ہوا۔ وحشت تنہائی میں آگ کے بگولوں نے، میرے احساس نارسائی نے مجھے جلا کر راکھ بنا دیا۔ پھر آندھی اور طوفانوں میں میری راکھ اُڑ گئی — اس طرح قصۂ دل تمام ہوا۔ اب کچھ بھی نہیں ہوں۔ ایک سایہ ہوں۔ پرچھائیں ہوں۔ اندھیروں میں کھوئی ہوئی ایک روشنی ہوں —!

زندگی کے تجربات نے مجھے سنگدل بنا دیا ہے —!

آج میں نے حالات سے، گردش زمانہ سے سمجھوتہ کر لیا ہے اور مشینوں کے شہر میں ایک مشین کی طرح رہتا ہوں۔ اور مشین کا کوئی دل نہیں ہوتا۔ کوئی دماغ نہیں ہوتا۔ مشین خواب نہیں دیکھتی، نور و ظلمت میں فرق نہیں کر سکتی۔ مشین کے کوئی [illegible] نہیں ہوتے۔ کبھی میں دولت سے بے پروا اور بے نیاز رہتا تھا۔ موروثی جائیداد کو ایک مصیبت سمجھتا تھا۔ میں غریبوں کا دوست تھا، محنت کش مظلوموں کا طرفدار۔ ایک نئی دنیا، ایک نئے آدم کے خواب دیکھنے والا۔ میں بہت معصوم اور بے وقوف تھا۔ اور آج گاؤں میں میری سینکڑوں ایکڑ زمین ہے جس پر [illegible] کی طرح غریب کسان میرے لیے سونا چاندی اگلتے ہیں۔ شہر میں [illegible] ہیں، دکانیں ہیں، جن میں سینکڑوں افراد میرے لیے کام کرتے ہیں۔ [illegible] بات [illegible] پڑتی ہے کہ صد ہزار داستانوں کا خون ہو جانے [illegible] طرح ہو گئی ہے۔ میری بے اندازہ دولت [illegible] کے لیے کتنے لوگ بے [illegible] کا شمار کیا کروں۔ کہیں [illegible]

جب مجھے سوچا تھا۔ تباہ حال تھا۔ اور اب بالکل نہیں کیونکہ
پرشتے گرام کے ہوں۔ کامیاب زندگی بسر کرنے کا سلیقہ مجھے
آگیا ہے ــــ!

میں زندگی سے رشتہ کبھی کا توڑ چکا۔ لیکن زندگی میرا
پیچھا نہیں چھوڑتی۔ بار بار مجھے آئینہ دکھاتی ہے ــ!

اب کی بار بارش نہیں ہوئی، تو ہر طرف ہاہاکار مچ گئی
ہے۔ جنگل سوکھ گئے ہیں، کھیتوں میں خاک اڑ رہی ہے ــ
بستیوں میں آگ لگ گئی ہے۔ انسانوں کے لئے اناج، اور
جانوروں کے لئے چارہ نہیں ہے۔ پانی آبِ حیات ہو گیا ہے،
اور داتا گرام کو ہر شب چرانا۔ کھانے کے لئے اناج نہیں ہے،
پینے کے لئے پانی نہیں ہے۔ کرنے کے لئے کام نہیں ہے۔ چارے
اور پانی کے لئے ترس ترس کر علاقے بھر کے مویشی مر گئے۔
اونے پونے داموں بک گئے۔ بھوک، پیاس، اور بیکاری
سے بدحواس ہو کر گاؤں والوں نے شہروں کا رخ کیا ہے۔ گاؤں
اجڑ گئے ہیں۔ بستیاں ویران ہو رہی ہیں۔ اور شہروں کا بھی
حال وہی ہے۔ جہاں بھی پانی آبِ حیات ہے۔ اناج ہیرے
موتیوں کے دام بک رہا ہے۔ ہر شئے گراں ہو گئی ہے۔ جنگل کی
آگ کی طرح گرانی پھیلتی جا رہی ہے۔ آدمیوں کی کثرت ہے،
باقی ہر شئے کی قلت ہے۔ پٹرول کی، مٹی کے تیل اور بجلی کی قلت
نے تو ہوش اڑا دیئے ہیں۔ ملوں اور کارخانوں کا کام متاثر
ہو گیا ہے۔ برسرِ روزگار لوگ بیکار ہوتے جا رہے ہیں۔ گاؤں
سے بھاگ کر آنے والوں کو بڑی سخت سزا مل رہی ہے ــ
رکشہ رانی سے حمالی تک ہر جگہ سخت کشمکش ہے، مقابلہ ہے،
کوئی کام نہیں مل رہا ہے۔ گاؤں سے بھاگ کر آنے والے بھوکے
پیاسے تباہ حال مردوں، عورتوں اور بچوں کی ٹولیاں زندہ
لاشوں کی طرح گلی کوچوں اور بازاروں میں بھٹکتی پھرتی ہیں
کوئی سہارا نہیں ملتا، کوئی ٹھکانہ نہیں ملتا۔ کوئی کام
نہیں ملتا۔ بھیک تک نہیں ملتی۔ زندگی ایک ناختم ہونے
والا عذاب بن گئی ہے ــ!

گنگا رام اور راج محمد بڑے غیرت دار کسان ہیں۔
بھیک مانگنا انہیں نہیں آتا۔ کوئی کام دھندا کرنا چاہیں تو
سرمایہ نہیں ہے۔ امداد کے لئے میرے پاس آئے ہیں ــ

"بیس پچاس سو روپے ادھار دو سرکار" دونوں بیک آواز
کہتے ہیں۔

"فصل پر ہم آپ کی پائی پائی چکا دیں گے!"

"میں کوئی ساہوکار نہیں ہوں۔ ہاں کوئی چیز بیچنے کے لئے ہو
تو دکھاؤ۔ کام کی ہوئی تو خرید لوں گا ــ!" میرا لہجہ سخت ہو جاتا ہے۔

"ہماری زمین تو آپ خرید چکے ہیں۔ ہمارے گھر بک گئے،
بیلوں کی جوڑیاں، گائے اور بکریاں، عورتوں کے زیور، کپڑے، گھر
کے برتن باسن تک بک گئے۔ اب بیچنے کے لئے ہمارے پاس
کچھ نہیں ہے سرکار۔ ہماری مدد کرو ــ!"

وہ منت سے، خوشامد سے، رو کر گڑگڑا کر میرے منجمد
دل کو بیدار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مجھ پر ان باتوں کا کوئی اثر
نہیں ہوتا ہے۔ پتھر کی ایک چٹان سے سر ٹکرا کر لہولہان اور نڈھال
سے وہ چلے گئے ہیں۔ میں ٹس سے مس نہیں ہوا ہوں۔

زندگی کے تجربات نے مجھے سنگدل بنا دیا ہے ــ!

آج مگر ایک حادثہ ہو گیا ہے۔

دبلا پتلا، دراز قد، زرد رنگ بوڑھا گنگا رام آج پھر میرے
پاس آیا ہے۔ اس کے ساتھ گورے رنگ اور ادھیڑ عمر کی سوکھی
مرجھائی سی ایک عورت ہے۔ دس بارہ سال کا معصوم صورت
ایک بچہ ہے۔ میلے کچیلے بوسیدہ سے لباس میں ملبوس گنگا رام،
اس کی بیوی اور اس کا بچہ خشک سالی کی تصویر بن گئے ہیں۔

"میں رادی ہوں سرکار" خستہ حال عورت بھرائی ہوئی
آواز میں کہتی ہے۔

"میں آپ کی آیا رادی ہوں۔ آپ جب بچے تھے، میں آپ کو گود
میں اٹھائے پھرتی تھی۔ آپ کی خدمت کرتی تھی۔ آپکو یاد ہوگا۔"

"رادی ــــ!" ایک بجلی سی میرے تن بدن میں دوڑ جاتی ہے
رگوں میں خون کی روانی تیز ہو جاتی ہے۔ مدتوں بعد مجھے اپنا
بچپن یاد آتا ہے۔ معصومیت اور محبت کا زمانہ یاد آتا ہے، پیسے
بھرے امنگ بھرے دل کا خیال آتا ہے جو شیشے کی طرح صاف

اور موم کی طرح نرم تھا۔

"یہ راجو ہے سرکار۔ ہمارا بیٹا ——!"

[illegible] پا آتا ہے۔ شادی کے پندرہ سال بعد بڑی منتوں اور مرادوں کے بعد راجو پیدا ہوا تھا۔ راجو اُن کا اکلوتا بیٹا ہے، اُن کی زندگی کی آخری شمع سب سے قیمتی پونجی —— اُن دونوں کے بڑھاپے کا واحد سہارا۔ میری نگاہیں راجو کے معصوم چہرے پر ٹکی ہوئی ہیں۔ پھٹی ہوئی شیلا دھاری دار قمیص اور میلی بوسیدہ سی نیکر میں ملبوس، ننگے سر، ننگے پاؤں، گھبرایا ہوا، سہما ہوا، بھوک اور فاقوں کی آگ میں جلا ہوا معصوم بچہ میرے لئے ایک علامت بن گیا ہے۔ میرے احساس کے بال و پر کھول رہا ہے مجھے ایک تر و دس بگم گشتہ کی یاد دلا رہا ہے ——!

"یہ ٹھیک ہے سرکار —— ہمارا بیٹا ہے" اُن کی آواز لرز رہی ہے۔

"تم اسے بیچنے لائے ہو"

"آج دو دن سے ہم نے کچھ نہیں کھایا" رانی کہتی ہے "اب برداشت نہیں ہوتا ——"

"پانچ سو دے دیں! ہم چار سو ہی دے دو" گنگا رام التجا کرتا ہے وانی سسک رہی ہے۔ آسمان کانپ رہا ہے۔ زمین لرز رہی ہے۔ میرا جذباتی وجود طوفانوں کی زد میں ہے۔ دل میں دھماکے ہو رہے ہیں۔ سینے میں کوئی شیشہ ٹوٹ رہا ہے۔ کوئی شئے جل رہی ہے۔ منظر دھواں دھار ہو گیا ہے!

"راجو کو خرید لو سرکار۔ ہمیں پیسے کی سخت ضرورت ہے!" وانی روتے ہوئے کہتی ہے "راجو کو خرید لو ——!"

گنگا رام کچھ کہنا چاہتا ہے کہ میں تڑپ کر چیخ پڑتا ہوں "راجو آدمی کا بچہ ہے۔ اسے خریدا اور بیچا نہیں جا سکتا ——!"

"پھر ہم کیا کریں؟ کیا مر جائیں ہم"

"مرنے کی بات مت کرو!" میرے دل کی گہرائیوں سے آواز بلند ہوتی ہے۔ میری آواز بو جھل ہے لیکن ابھی ہے "میں ابھی زندہ ہوں۔ سنو —— ہمارے پاس سیکڑوں ایکڑ زمین ہے۔ درجنوں ملیں اور کارخانے ہیں۔ لاکھوں کروڑوں کا سرمایہ ہے۔ گوداموں میں اناج کے ذخیرے بھرے ہوئے ہیں زیرِ زمین پانی کا خزانہ ہے۔ پھر گھبراتے کیوں ہو —— بھائی یہیں کیوں ہوتے ہو —— ہ لوگوں کو میرے پاس لے آؤ ہم مل کر حالات کا مقابلہ کریں گے ——!

وہ تینوں حیران و ششدر رہ گئے ہیں۔

"سنو وانی۔ دیکھو گنگا رام —— راجو میرا ماضی بھی ہے اور مستقبل بھی! اسے نیلام پر نہ چڑھاؤ!"

میں نے آج اپنے آپ کو پا لیا ہے۔

میں جو کل تھا آج پھر وہی ہوں ——!

(بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد)

بقیہ:- افسانہ "لمبے راستوں کا سفر" صفحہ ۳۲

کر دی تھی۔ وہ زیادہ سے زیادہ وقت باہر گزارنے کی کوشش کرتے۔

اور ایک دن اچانک ندیم بورڈنگ ہاؤس سے بھاگ کر —— پچھتر میل کا تنہا سفر کر کے گھر آ گیا۔ دادی صحن میں بیٹھی تھی، باپ برآمدے میں کھڑے تھے، لیکن اُس نے اُن دونوں کی طرف نگاہ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا اور سیدھا کمرے میں گھس گیا جہاں ساجدہ بیمار پڑی تھی۔ اُس کی چھاتی سے لگ کر ندیم بہت دیر تک سسکیاں بھرتا رہا۔ ممتا کے سمندر میں طوفان جاگ اُٹھا۔ یوسف صاحب اپنی ماں کے ساتھ چند قدم پیچھے سے یہ نظارہ دیکھتے رہے۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔ سات ہی تو اُن کی بہن کا بھی خط آیا تھا جس میں اُس نے لکھا تھا کہ شنو بھابی کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ یوسف صاحب کا جی چاہا کہ وہ اُس ممتا کی دیوی کے قدم چوم لیں۔

اپنی جیت پر ساجدہ کے مضمحل چہرے پر سُرخی دوڑ گئی۔ اور آنکھوں میں غرور ناچ اُٹھا۔

جمیل الرحمٰن

عکس

وہ بے تحاشہ دوڑ رہا تھا۔ جیسے کوئی اُس کا پیچھا کر رہا ہو۔ یا پھر وہ کسی کا پیچھا کر رہا ہو۔ کہیں وہ چور تو نہیں ——؟ لیکن وہ کوئی چور نہیں تھا۔ جب وہ اچانک مجھ سے ٹکراتے ہوئے آگے نکل گیا تو میں نے اُسے ایک ہی نظر میں پہچان لیا۔ وہ ایک نوجوان تھا جو پڑھا لکھا ضرور ہوگا۔ ورنہ اُس کی وہ میلی قمیض اس کی شکن آلود پتلون کے اندر نہ ہوتی گو کہ اس کی وحشت ناک حالت نے اس کی تقریباً آدھی قمیض کو پتلون کے باہر کر دیا تھا۔ قمیض کے بٹن بھی ٹوٹے ہوئے تھے۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ لیکن اس نے اپنے بالوں کو صبح ضرور جمایا ہوگا۔ شاید پانی کی مدد سے کیونکہ اب وہ خشک ہو چکے تھے۔ ایک ہی لمحہ میں اُس کی یہ تصویر میری نظروں میں سما گئی۔ اور اس نقشہ کے تیار ہوتے ہی میں نے اس تصویر کا نام "بے روزگار نوجوان" رکھ دیا۔ میں اس کے اِس طرح دوڑنے کی وجہ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک اُس نوجوان کی تصویر نے کہا "کیا سوچ رہے ہو بیٹھے ——؟ یہی کہ تم اِس طرح کیوں دوڑ رہے ہو ——! اُس نے ایک عجیب مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا "ساری دنیا ہی دوڑ رہی ہے۔ آپ کو مجھے دوڑتا ہوا دیکھ کر تعجب کیوں ہو رہا ہے۔ شاید آپ کی دوڑ میں شکست ہو گئی ہے۔ اس لئے آپ کو دوسرے دوڑتے ہوئے معلوم ہو رہے ہیں"۔ میں اُس کے اس جواب سے سٹپٹا گیا۔ اور غیر ارادی طور پر میرے قدم تیزی سے اُٹھنے لگے۔ لیکن —— لیکن میں دنیا سے کسی طرح پیچھے تو نہیں تھا۔ اُس کا مجھ پر یہ الزام غلط ہے۔ میں نے گذشتہ چند سالوں میں جو ترقی کی ہے اُسے دوڑنا نہیں بلکہ اُڑنا کہا جا سکتا ہے۔ ایک دن میں بھی تو اسی کی طرح بے روزگار تھا۔ آج میرے پاس کیا کچھ نہیں ——؟ پاگل ہے وہ لڑکا —— !! اچانک اُس کے ہونٹوں نے خطرناک قہقہہ لگایا —— "ہاں —— ہاں شاید میں پاگل ہی ہوں —— اِسلئے تو دوڑ رہا ہوں وقت کو پکڑنے —— آہاہا —— !! ابھی دیکھ لینا میں ایک ہی جست میں وقت کا دامن پکڑ کر گھسیٹ لوں گا۔ کیونکہ —— کیونکہ اگر میں وقت کو نہ پکڑ سکا تو وہ میری ماں کی رُوح کو لے اُڑے گا۔ وہ اس وقت گھر میں پڑی سسک رہی ہے۔ اُسے انجکشن کی سخت ضرورت ہے۔ میں اس کے لئے انجکشن ہی تو لانے دوڑ رہا ہوں" اُس کے لہجے میں ایک تڑپ تھی اور پاگلوں جیسا غصہ بھی۔ جیسے وہ کسی قیمت پر وقت کو پکڑ کر رہے گا۔ وہ کسی دُشمن کی طرح وقت پر جھپٹ رہا تھا۔ میں اُس کے جذبات کو اچھی طرح سمجھ گیا تھا —— لیکن کیا وہ وقت کو پکڑ سکے گا —— ؟ کیا وہ اپنی ماں کی جان بچا سکے گا —— ؟ پاگل کہیں کا —— !! انجکشن کیلئے تو پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور مجھے معلوم ہے —— اُس کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے کیونکہ —— کیونکہ وہ ایک ایماندار اور بزدل بے روزگار ہے —— اچانک میری جیب میں پڑے نوٹوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ "ہمیں آزاد کرو —— ہمیں آزاد کرو —— لیکن میں نے اُن کا گلا وہیں دبا دیا۔ کہیں وہ گھبرا کر باہر نہ نکل پڑیں —— میں اِن نوٹوں سے محبت کرنے لگا ہوں۔ میں اکثر اُنہیں اسی صورت میں خرچ کرتا ہوں کہ وہ دوسرے نوٹوں کو لے کر واپس میری تجوری میں آجائیں۔ یا اُن کا پورا پورا معاوضہ مجھے مل جائے۔ مجھے اس نوجوان سے ہمدردی ضرور ہے۔ لیکن میں اُسے دوا کیلئے روپے کیسے دے دوں —— اُس سے مجھے کوئی فائدہ تو نہیں ہونے والا ہے۔ دان تو میں کرتا ہی رہتا ہوں۔ ہزاروں روپے اناتھ آشرم اور ہسپتالوں کو دیتا ہوں جس سے میری عزت و شہرت میں اضافہ ہوتا ہے۔ [illegible]

تصویریں کھینچتی ہیں۔ بے رونق نوجوان غریب نادار انسان روپیوں کو کیسے
اپنے قبضے میں کیا جاتا ہے۔ اُسے اس بے وقوفی کی سزا ملنی ہی چاہیئے
جو لالچ میں آ کر آگے بڑھ سکا۔ لیکن اُس نوجوان کا ہیولہ برابر میرا پیچھا
کر رہا تھا۔ جیسے وہ میرے ذہن سے چپک سا گیا تھا — میں اُسکے
خیال کو جھٹک دینا چاہتا تھا کیونکہ کلب کی رنگینیاں میرا انتظار کر رہی
تھیں۔ میں جلد از جلد اُن رنگینیوں میں کھو جانا چاہتا تھا۔ لیکن کلب
تک کا مختصر سا فاصلہ مجھے بہت طویل معلوم ہونے لگا۔ کئی دنوں کے
بعد آج میں اپنے پیروں سے چل رہا تھا۔ میرے پاؤں چلنے کو ترس
گئے تھے۔ جیسے میں اپاہج سا ہو گیا تھا۔ یا میرے پاؤں مجھ سے جُدا
ہو گئے تھے۔ کار، ہوائی جہاز اور لفٹ نے جیسے میرے پاؤں مجھ سے
چھین لئے تھے۔ آج پیدل چلنے کی خواہش میں اپنے ڈرائیور کو میں نے
چھٹی دے دی تھی۔ اور ٹہلتے ٹہلتے کلب کی طرف چل دیا تھا — لیکن
— لیکن اس نوجوان نے مجھ سے ٹکرا کر مجھے عجیب اُلجھن میں ڈال دیا
میں سوچنے لگا، میں اُس کے بارے میں اتنا کیوں سوچ رہا ہوں۔ میرا
اُس سے رشتہ ہی کیا ہے — ؟ لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ میرا ذہن
اُس نوجوان کے ہیولے کے گرد لپٹ گیا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا
تھا جیسے اُسکا میرا بہت پُرانا رشتہ ہے — میں اُسے بھی وہی
راستہ دکھانا چاہتا تھا جس سے وہ وقت کو پکڑ سکے، اپنی ماں کی زندگی
بچا سکے۔ اُسے اس وقت میری رہبری کی ضرورت تھی۔ جسطرح سیٹھ
چمنی لال نے ایسے ہی وقت میں میری رہبری کی تھی۔ روپیوں کو اپنے
قبضے میں کرنے کے گُر سکھائے تھے۔ لاکھوں کے ہیر پھیر کی ترکیبیں بھی
بتائیں۔ اسمگلنگ اور ملاوٹ کے آرٹ سے واقف کرایا۔

آخر کار میں کلب پہنچ ہی گیا۔ وہاں حسبِ معمول رنگینیاں
بکھری ہوئی تھیں — وہاں میری نظر مسز دانیال پر پڑتے ہی میری
ساری تھکاوٹ دور ہو گئی۔ اُس نے بھی مجھے دیکھا تو فوراً میری میز
پر آ بیٹھی۔ پھر بہت دیر تک سرگوشی اور مے نوشی ہوتی رہی۔ آج
میں کچھ زیادہ ہی پی گیا تھا۔ لیکن نشے نے میری بصارت کو اور بھی
تیز کر دیا۔ اور میرے ذہن نے اُس نوجوان کی تصویر پھر اُبھار دی۔
مجھے اب صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ نوجوان اب بھی دوا کی دکان پر کھڑا
دوکاندار سے اپنی ماں کی زندگی مانگ رہا ہے۔ جیسے میں کوئی ٹیلی ویژن
دیکھ رہا ہوں۔ میں نے چاہا کہ ٹیلی ویژن بند کر دوں۔ لیکن اُس کا
بٹن میرے بس میں نہیں تھا۔ میں نے جھنجھلا کر جام اس کے اسکرین پر
دے مارا اچانک جیسے ٹھہرے ہوئے پانی میں ہلچل مچی اور تصویر گڈ مڈ
ہو کر رہ گئی۔ لیکن پھر لہریں پُرسکون ہوتی گئیں اور تصویر حرکت
کرنے لگی۔ نوجوان اب مایوس ہو کر اپنے آپ کو دوکان کی سیڑھیوں پر
ڈال چکا تھا، بالکل تھکے ہوئے اور مضمحل جسم کے ساتھ وہ سیڑھیوں
پر بیٹھ گیا۔ اور اپنے سر کو گھٹنوں میں چھپائے شاید رونے لگا —
میری اُس سے ہمدردی بڑھتی گئی۔ اُس کی شرافت و معصومیت پر
ترس آنے لگا۔ اُسکی مایوسی اور ناامیدی پہ افسوس ہوا۔ اور اس کی
بزدلی پر غصہ بھی آنے لگا — بڑا چلا تھا وقت کا دامن پکڑنے،
اب کیا ہو گیا وہ جوش وہ ولولہ — یا میں نے اپنی چھٹی حس کے ذریعہ
اُس سے رابطہ قائم کر لیا۔ اُسکے ذہن میں تیزی کے ساتھ اُترتا چلا
گیا۔ اور اُس کے غم و غصے میں شدت پیدا کرتا گیا۔ دل کی دھڑکنوں
کو بڑھاتا گیا۔ خون کی روانی کو تیز کرتا ہوا میں اس کے دماغ تک پہنچ
گیا۔ اور اس کو اکساتا رہا بغاوت پر۔ میں نے غیرت دلائی۔ اور
بغاوت کی ترغیب دی۔ نادان — ! کوئی آج کی دنیا میں اسطرح
جی سکتا ہے۔ نیکی اور ایمانداری اِس دنیا میں اب کہاں — یہ تو
نام ہے بزدلی اور بے وقوفی کا۔ اُٹھ اور بہادری سے جینے کے
اُصولوں کو اپنا لے۔ پچھلے گزرے ہوئے لوگ جسے بُرائی سمجھتے تھے، اب
وہ بُرائی، بُرائی نہیں رہی۔ یوں سمجھ لے کہ جینے کا ڈگر ہے۔ جسے بھی
اِس دنیا میں جینا ہو اُسے اسی ڈگر پر آنا پڑتا ہے۔ میں نے اُسکے کان
بھرے اور دل کے دروازوں کو بند کر دیا، جہاں سے ضمیر باہر نہ
نکل سکے اور دماغ کی کھڑکیاں کھول دیں۔ میں نے اپنے اس نئے
شاگرد کو شفقت کیساتھ سب کچھ سمجھا کر پہلا کام یہ سونپا کہ اُٹھ اور
اپنی ماں کی زندگی کو بچا لے۔ اس میڈیکل ہال کی سیڑھیوں سے اُٹھ۔
کیونکہ اب ساری دکانیں بند ہو چکی ہیں، بازار میں سناٹا چھا گیا
ہے۔ دوکان کے پچھلے راستے سے روشن دان کو توڑ کر اندر داخل ہو جا
— اندر سے اس کی زندگی مل جائیگی — پھر ایسے ہی کئی کام وہ
میری رہنمائی میں کر کے رہیگا تو زندگی کا عیش اُس کے قدم چومیگا
— اور پھر میں بہت خوش ہوا کیونکہ اُس پہ میری باتوں کا اثر ہو

چپ رہا تھا اور وہ آپ سے آپ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ میں نے اُسی خوشی میں اُس کے نام کا ایک اور جام چڑھا لیا۔ میں اتنی پی گیا تھا کہ میرا وزن بڑھ کر ایک پہاڑ بن گیا تھا۔ میری ٹانگیں اُس پہاڑ کو اُٹھانے کے قابل نہ رہی تھیں۔ اُسی طرح جیسے وہ نوجوان غموں کے بوجھ سے دَب گیا تھا اور ایک قدم بھی چلنے کے قابل نہ رہا تھا۔ اگر میں نے اُسے اُٹھنے کی ترغیب نہ دی ہوتی تو وہ شاید وہیں پڑا روتے روتے مر جاتا ——— میں اب سوچ رہا تھا کہ میں گھر کیسے پہونچوں گا۔ مجھے پھر مشین کا سہارا لینا پڑیگا۔ اور کسی ٹیکسی کو روکنا ہوگا۔ لیکن کلب کے دروازے تک پہنچنا بھی میرے لئے دُشوار تھا۔ تقریباً سارے لوگ جا چکے تھے۔ اچانک ایک خوشبو کے جھونکے نے مجھے سہارا دیا۔ مسز دانیال نے میری باہیں تھام کر کہا "چلئے میں آپ کو لفٹ دیتی ہوں۔" او ——— تھینک یو ——— ویری کائنڈ آف یو ——— یہ لفٹ بھی کیا پیارا لفظ ہے۔ جیسے اس لفظ نے زندگی میں سکون بھر دیا ہے۔ مجھے مسز دانیال نے کئی بار لفٹ دی تھی۔ مجھے اس وقت مسز دانیال کے لفٹ کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ مسز دانیال کی خوبصورت باہوں کے سہارے اُس کی خوبصورت کار میں بیٹھتے ہی میں نے ڈاکٹر دانیال کے بارے میں دریافت کیا۔ اُس نے کہا "او ——— ڈارلنگ وہ کب گھر پہ ہوتے ہیں؟" اُنہیں اپنے پیشنٹس سے ہی فرصت کب ملتی ہے۔ بس وہ ہیں اور اُن کے پیشنٹس ہیں یا پھر اُن کی لیبارٹری ——— کار کی گداز سیٹوں سے مسز دانیال کے گداز بستر تک پہنچتے پہنچتے میں جیسے اُس نوجوان کو بھول ہی گیا تھا۔ بیڈ روم سے مسز دانیال نے ڈاکٹر دانیال کی لیباریٹری کا فون ملایا اور دریافت کیا کہ ڈارلنگ تم کتنگ دیر ہو ———؟ تو اُدھر سے ڈاکٹر نے معذرت چاہتے ہوئے کہا "مائی سویٹ، میں ابھی حاضر ہو جاتا۔ لیکن ایک پیشنٹ کے پاس جا کر آنے میں یہاں کا کام پورا نہ ہو سکا ——— بے چارہ نوجوان ——— اُسکی ماں کیلئے میں نے جو دوا تجویز کی تھی وہ صرف سوڈا کمیر تھی۔ لیکن تعجب ہے اُس دوا نے بھی اثر نہ کیا۔ میں نے ابھی ابھی اُس دوا کا تجزیہ کیا ہے (Analysis) اور وہ دوا نقلی ہے۔ اُس میں ملاوٹ ہے ——— او وہ ڈارلنگ یہ کیا کر سکتا ہے۔ اصلی نقلی دوائیں۔

پیشنٹس یا لیبارٹری، میرے کان میں گونج رہے تھے ——— ایک بڑھیا کے منہ سے کراہتی سی کمی ہو گئی اس دنیا میں ——— اتنا سنتے ہی میں چونک پڑا ہوں۔

"کیا کہا ——— ؟ وہ مر گئی ——— ہائے! مجھے یوں لگا جیسے اُس نوجوان نے مجھے گریبان سے پکڑ کر اُٹھا لیا ہے ——— وہ بے انتہا بپھرا ہوا ہے، جیسے وہ مجھے مار ڈالے گا ——— !!

انور حسین حسرت

برگد کا پیڑ

کبھی ختم نہ ہونے والے راستوں پر چلنے سے پہلے اُس نے اپنے دادا کا لکھا سفرنامہ پڑھا تھا۔ باب در باب برگد کے پیڑ کی تعریف لکھی تھی۔ دوسرے درختوں کا ذکر سرسری تھا۔ اُس نے اپنے باپ سے بات کی۔ وہ بھی دادا کے لکھے سے متفق تھا۔ بڑی اُلجھن ہوئی۔ لوگ دوسرے درختوں کی طرف کیوں توجہ نہیں دیتے۔ راستے میں جا بجا اُگے درختوں کا حقارت سے نظرانداز کیا جانا اُس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ کیا مسافت کے مارے مسافروں کو ان سے کوئی فائدہ نہیں۔ وہ جھنجھلا کر باسی دماغوں کو کوسنے لگا۔ بھلے سایوں کی تلاش میں نئے پیڑوں سے شناسائی کرنی ہو۔ برگد کے پیڑ کا ہی گن گان کیوں، کیوں چھاؤں تو چھاؤں ہے، کسی بھی پیڑ کی کیوں نہ ہو۔

چلتے چلتے سورج سر پر آ گیا۔ آسمان سے برستی آگ دماغ کو پگھلانے لگی۔ جلتی زمین پہ قدم رکھنا مشکل ہو گیا۔ ایسے لگا کسی ہون کنڈ میں کھڑا ہو۔ پیاس کی شدت سے بے حال ہو کر خشک زبان سوکھے ہونٹوں پر پھیری۔ حلق میں چبھتے کانٹے کو نگلنے کی بے سود کوشش نے نڈھال کر دیا۔ سر چکرانے لگا۔ قدم لڑکھڑانے لگے۔ گرتا پڑتا تھوڑی دوری پر کھڑے درخت کے نیچے جا پہنچا۔ ٹنڈ منڈ درخت پر پتے گنتی کے تھے۔ تنے اور شاخیں لکیروں کی شکل میں زمین پر بکھری ہوئی تھیں۔ بھٹک بھٹک کر وہ دھبوں اور لکیروں میں پناہ ڈھونڈنے لگا۔ مگر ان میں ٹھنڈک تھی نہ راحت۔ —— ٹہنیاں جھلس کر جل رہی تھیں۔ وہ اُسے کیا پناہ دیتا۔ وہاں سے بمشکل وہ دھول سے اَٹے راستے پر نکلا۔ سائے میں چلنے سے بہتر ہے تپتی دھول میں جل کر کباب ہو جاؤں۔ دیر سوچنے پر اُسے برگد کے پیڑ کی یاد آئی۔ بچی کھچی طاقت سمیٹ کر چلتے ہوئے راستے پر آگے بڑھنے لگا۔ ہانپتا کانپتا دل اُمیدوں کو جنم دیتا پھر ساتھ دینے لگا۔

برگد کے پیڑ نظر آتے ہی جان میں جان آ گئی۔ موت کا احساس مٹنے لگا۔ مٹتا ہوا یقین لوٹنے لگا۔ سکون بخش چھاؤں میں پہنچا تو بچپن یاد آ گیا۔ گلی محلے گھومتے کھیلتے تھک ہار کر گھر لوٹتا تو ماں کے آنچل کے سائے میں ایسی ہی راحت ملتی تھی۔ پاس کے کوئیں سے پانی پیا۔ حواس بحال ہونے لگے۔ نئی زندگی پانے کی مسرت کو محسوس کرتا ہوا آرام کرنے کے لئے پیڑ کی جڑ پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ نگاہیں برگد کے پھیلاؤ پر پڑیں۔ پیڑ مسکرا رہا تھا۔ اپنائیت سے بھرپور مسکراہٹ اُس کے وجود پر آکاش بن کر چھانے لگی۔ پیڑ کی چوٹی کی طرف دیکھا تو بیلیں نظر آئیں۔ برگد کے جسم میں دانت اور پنجے گاڑے اس کا خون چوس رہی تھیں۔ قہقہوں کی آوازیں سن کر غور سے دیکھا۔ بیلیں باتیں کر رہی تھیں۔ اُس نے کان اُن کی طرف لگا دیے۔ وہ برگد کی عمر جاننے کے لئے بیقرار تھیں۔ کئی بار اس کے رگ و ریشے کی جانچ کروا چکی تھیں۔ مگر پیڑ کی پیدائش کی تاریخ کا پتہ نہیں چل سکا تھا۔ اُسے بوڑھا کہا جا سکتا تھا نہ جوان۔ پیدائش کے وقت کا پتہ نہ ہو تو موت کا دن کیسے مقرر ہو۔ جھلا کر کچھ بیلیں برگد کی داڑھی نوچتے ہوئے چلانے لگیں —— تم اپنی موت کا دن خود کیوں نہیں بتا دیتے۔ تمہاری لمبی عمر سے ہر کوئی تنگ آ چکا ہے۔ اتنا جینا بھی کس کام کا۔ تمہارے ہوتے ہوئے ہماری زندگیاں یوں ہی چھوٹی رہیں گی۔ کب مرو گے؟ بتاؤ تم کب مرو گے؟؟ یہ دیکھ کر وہ پریشان ہو اٹھا۔ بیلیں جس کے خون پر پل رہی تھیں، اُسی کی موت کے لئے پاگل تھیں۔ اُس کے جی میں آئی چیخ کر پوچھے۔ اپنے جنم داتا کی موت مانگتے

تمہیں شرم نہیں آتی ؟ بے مروّتی کی کوئی حد بھی ہے۔ یہ جنم داتا ہی تو ہمارا قاتل ہے۔ اس کی کوکھ سے جنم لینا موت سے بدتر ہے۔ یہ ہمیں ہماری زندگی کا احساس نہیں ہونے دیتا۔ اس کے ہوتے ہوئے ہمیں کوئی نہیں پوچھ سکتا۔ سب کے دل و دماغ پر یہی مسلّط ہے۔

سب نے ایک ساتھ چلا کر کہا تو وہ سہم گیا۔ ان کو میرے دل میں اُٹھنے والے خیال کا پتہ کیسے چل گیا۔ اب وہ کچھ نہیں سوچے گا۔ پھر بھی بیلوں کی کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ دل پہ ہاتھ رکھ کر اُسے زور سے دبا دیا۔ مگر اُس نے سُنا بیلیں اُسے کوس رہی تھیں۔ دادا کے لکھے سفرنامے کی تعریف کی پاداش میں گالیاں دے رہی تھیں۔ ایک بیل نے انگارے برساتی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اُس کا منہ چڑانے کے لئے خون آلودہ دانت نکالے تو وہ گھبرا گیا۔ بیل کے دانتوں پر سرسراتا لہو کہیں مجھ پر نہ ٹپک پڑے۔ جلدی سے اُٹھا اور جھنجھلاہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ میرے دادا نے غلط نہیں لکھا۔ اس نے الفاظ کو ہونٹوں سے باہر آنے سے روکنے کی پوری کوشش کی۔ پھر بھی بیلوں نے حقارت آمیز قہقہہ لگایا۔ تو وہ بیتاب ہو کر کہنے لگا۔ میرا باپ بھی میرے دادا کے لکھے کی تصدیق کرتا ہے۔ میں نے دوسرے درختوں کے جھلس دینے والے سایوں میں کھڑا ہو کر دیکھا ہے۔ برگد کے پیڑ کی چھاؤں ایک سچائی ہے۔ حقیقت سے کوئی منہ نہیں موڑ سکتا۔ اس کو سنتے ساتھ ساتھ بیلوں کی برہمی بڑھنے لگی۔ تمہاری برگد کے تئیں وفاداری تمہاری موت کا اعلان ہے۔ اس کو چھوڑے بغیر تم دیگر درختوں کی قدر نہیں کر سکتے۔ باپ دادا کے لکھے سفرنامے جلائے بنا تم کسی سفر کا لطف نہیں لے سکتے۔ تمہیں بھی تو سفرنامہ لکھنا ہے۔ وہ تمہارے دادا کے لکھے سفرنامہ جیسا ہوا تو !

یہ سُن کر اُس نے پھر برگد کی اونچائیوں پر نظر دوڑائی۔ کچھ بیلیں اس کی چوٹی تک پہنچی دکھائی دیں۔ ایک تو اس کے کندھوں پر کھڑی تھی۔ مگر اس کا چہرہ زرد پڑ رہا تھا۔ دھڑ اور ٹانگیں سوکھ رہی تھیں۔ اُسے اپنا آپ سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ موت کی آغوش میں سرک جانے کے خوف سے کانپ رہی تھی۔ یہ دیکھ کر وہ ذہنی انتشار کا شکار ہونے لگا۔ اس کے دماغ میں متضاد خیالات ٹکرانے لگے ہر عزم اس کی گرفت سے نکلنے لگا۔ برگد کا پیڑ راکشش نظر آنے لگا۔ اُسکا بے قابو ہوتا ہوا وجود کہنے لگا میں کب تک دادا کے لکھے سفرنامہ کو پڑھ کر فخر کرتا رہوں گا اپنے باپ کی نقل کرتا رہوں گا۔ یہ بے برگ و بار بیلیں ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ برگد کے پیڑ کی زندگی میں ان کو کوئی اہمیت نہیں مل سکتی۔ ان کے وجود کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ بے بسی اور بے حسی کے بھنور میں آنے کے ساتھ ہی کچھ کر گزرنے کی خواہش ایک عزم بن کر اُس کے وجود کو جھنجھوڑنے لگی۔ دہشت اور گھبراہٹ کے عالم میں اس نے کوٹھی کے پاس پڑا کلہاڑا اٹھا کر برگد کی اُسی جڑ پر پوری طاقت سے وار کر دیا جس پر سر رکھے وہ آرام سے لیٹا ہوا تھا۔ مگر یہ دیکھ کر وہ سُن رہ گیا کہ کلہاڑا جڑ کو کاٹنے کی بجائے دو ٹکڑے ہو کر اُس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر دُور جا گرا تھا۔ ▲▲

بقیہ: ڈرامہ بیچ کی دیوار صفحہ ۴۲

تسنیم :- ارے ابّا ابھی تک نہیں آئے۔ پتہ نہیں کیا کرنے لگے۔

ثریا :- یہ کیا ؟

تسنیم :- کیا ہوا آپی ؟

ثریا :- وہ بیچ کی دیوار میں سے اینٹیں نکال رہے ہیں۔

تسنیم :- (خوش ہوتے ہوئے) سچ آپی۔

ثریا :- تو خود دیکھ لے

تسنیم :- چلئے اچھا ہوا، اب یہ درمیان سے نفرت کی دیوار گر جائے گی۔ (فیڈ آؤٹ)

شاعری

غزلیں

حرمت الاکرام

وہ رہ کے ہاں آ سکے ہیں یادوں کے گاؤں سے
کیا نکلے کوئی درد کی خلوت سراؤں سے

شاداب وادیوں کی ہیں گودیں کھلی ہوئی
اک بنتِ ماہ جھانک رہی ہے خلاؤں سے

وہ دھن سفر کی ہے کہ نہیں تن بدن کا ہوش
رُک کر نکالتے نہیں کانٹے بھی پاؤں سے

اک بار اُٹھائی آنکھ اور آگے نکل گئے
ٹھنڈک پکارتی رہی نخلوں کی چھاؤں سے

آنکھیں کہاں سے لاؤ گے اتنی کہ جی سکو
کیا جانے تیر آئیں گے کن کن دِشاؤں سے

رات اِس قدر ہے سرد کہ بجھنے لگے بدن
تھوڑی سی آگ مانگ کے لا دو چتاؤں سے

صحرائے شب سے لوٹے ہیں کچھ لوگ اِس طرح
آئے ہوں جیسے چھوٹ کے لمبی سزاؤں سے

اِن قمقموں کی بھیڑ میں گُم وہ بھی ہو گئی
اک روشنی جو لائے تھے اندھی گپھاؤں سے

ہنس ہنس کے رات کاٹنے والے کو کیا ہوا
روتا ہے مل کے صبح کی ٹھنڈی ہواؤں سے

پھولوں کی طرح چنتا ہوں لمحوں کی آہٹیں
حرمت بکھر گیا ہوں میں اپنی صداؤں سے

ظہیر غازی پوری

لفظ و معنیٰ کے رسولوں کی امانت ہوں میں
فن کی زینت، نئی اقدار کی اُمت ہوں میں

زندگی ہے کہ بکھرتا ہوا سایہ کوئی
یہ بھی کیا کم ہے کہ ایسے میں سلامت ہوں میں

میرے چہرے پہ ہے کچھ رنگِ صباحت اب تک
ورنہ جلتے ہوئے سورج کی تمازت ہوں میں

سنگِ آوارہ سرِ راہ سمجھنا نہ مجھے
دانشِ وقت تری خاص ضرورت ہوں میں

نئی موجوں کے تھپیڑوں سے مجھے بچنا ہے،
ساحلِ حرف و مطالب کی کفالت ہوں میں

یوں تو رک جاتے ہیں احساس کی منزل پہ یہاں
اَن گنت حدودِ گذرگاہوں کی وسعت ہوں میں

کھلیں ذہنوں کے دریچے تو مجھے سمجھو گے
پیکرِ لفظ ہوں، الجھن کی ریاضت ہوں میں

گن کے رفتار مری نبض کی کیا پاؤ گے
سانس لیتی ہوئی موہوم سی ساعت ہوں میں

ٹوٹتے لمحوں سے ناپو نہ مری شخصیت
کسی پھیلے ہوئے صحرا کی طوالت ہوں میں

کانپنے لگتی ہے پاس آ کے مرے تیز ہوا
جسم کے خول میں شعلوں کی حرارت ہوں میں

عمر بھر ساتھ رہا پھر بھی نہ پہچان سکا
کس نے لکھا ہے مجھے کس کی کتابت ہوں میں

عہدِ ناقدریٔ افکار و قلم میں بھی ظہیر
شرحِ الفاظ ہوں اظہار کی جدت ہوں میں

حسن کمال

تو اس تلاش کا انجام بھی وہی نکلا
میں دیوتا جسے سمجھا تھا آدمی نکلا

میں رفتہ رفتہ ہوا قتل جس کے ہاتھوں سے
وہ بد قماش، وہ قاتل میں آپ ہی نکلا

خدا قریب تھا، سر تو جھکا تھا میرا مگر
مرا حریف مرا شوقِ بندگی نکلا

مجھے تو شکل پہ اس کی گماں تھا میں خود ہوں
وہ کل قریب سے نکلا تو اجنبی نکلا

میں زندگی کو کوئی نام دینے والا تھا
بہت تلاش پہ نکلا تو تشنگی نکلا

خزاں کا خوف تو جاتا رہا دلوں سے حسن
خدا کا شکر کہ ہر پھول کاغذی نکلا

مظفر حنفی

پتنگا بھٹکتا رہا ہر طرف
اندھیرا گھٹا ٹوپ تھا ہر طرف

سوا میرے بستی میں کوئی نہیں
مقابل ہے اک آئینہ ہر طرف

کوئی راستہ ہو تو آواز دے،
وہی نقشِ پا نقشِ پا ہر طرف!

چمکنے، گرجنے سے کیا فائدہ
گزر جا برستا ہوا ہر طرف

جدھر جائیے یا اخی! یا اخی!
بلاتا ہے کوہِ ندا ہر طرف

چراغوں کے پر کاٹ کر آئی ہے
سویرے کی ٹھنڈی ہوا ہر طرف

پسینہ بہانے کی عادت نہ تھی
نتیجے میں خوں بہہ گیا ہر طرف

غزلیں

اویس احمد دَوراں (مرحوم)

گونجیں گے دُور دُور کے سُنسان راستے
آباد ہو کے جُھومیں گے ویران راستے
پہچان لیں گے جب ہمیں نادان راستے
بن جائیں گے ہمارے نگہبان راستے
ہر سانس اک ہمالہ کے جا رہی ہے سر
ہر لمحہ ہوتے جاتے ہیں آسان راستے
جن کو سمجھ رہے تھے پُراسرار و پُرخطر
آؤ پُکارتے ہیں وہ انجان راستے
خود منزلِ نجات کی ڈھونڈی ہے اِس نے راہ
پھر خود ہی بھول بیٹھا ہے انسان راستے
انساں کی طرح سوزِ دروں سے ہیں بیقرار
یہ بیسویں صدی کے پریشان راستے
کچھ روز تُند و گرم بگولوں سے بھی مہیب
دوراں یوں ہی اُٹھائیں گے طوفان راستے

نثار پرویز (گیا)

شعور و آگہی بن کر ملے ہیں،
بہت سے غم خوشی بن کر ملے ہیں
اندھیروں سے شکایت کیا کریں ہم
اُجالے تیرگی بن کر ملے ہیں
بدن جھُولے ہوئے دار و رسن پر
شرربا زندگی بن کر ملے ہیں
چھُپے ہیں بستیوں میں کتنے جنگل
درندے آدمی بن کر ملے ہیں
کُشادہ دل سمندر کے کنارے
غمِ تشنہ لبی بن کر ملے ہیں
وفا کا یہ بھی اک اندازِ نو تھا
ہم اُن سے اجنبی بن کر ملے ہیں
فریبِ دوست بھی پرویزؔ اکثر
کمالِ سادگی بن کر ملے ہیں

صلاح الدین نیّر (حیدرآباد)

○

کیا ضروری ہے کہ شعلوں کو ہوا دی جائے
ہے بجا رسم تو یہ رسم اُٹھا دی جائے[1]

کون قاتل ہے یہاں اپنے رفیقوں کے سوا
سب بھلے لوگ ہیں کس کس کو سزا دی جائے

جن چراغوں کی ضمانت ہے غریبوں کا لہو
اُن چراغوں کی حیات اور بڑھا دی جائے

اُتنا ہی پاؤں سے زنجیر کا رشتہ ہوگا!
جسقدر قید کی میعاد بڑھا دی جائے

کوئی الزام نہیں زخمِ تمنّا کے سوا
اپنا قاتل ہوں میں خود مجھکو سزا دی جائے

ہم کو جینا ہے مگر دستِ نگر بن کے نہیں
اپنی تاریخ یہی ہے تو جلا دی جائے

جبکہ ہاتھوں کی لکیروں کا بھروسہ ہی نہیں
کیسے ماتھے کی یہ تحریر مٹا دی جائے

مصلحت کوشش زمانے کا اثر عام سہی
سچ کی ممکن نہیں آواز دبا دی جائے

اپنے ہی لوگوں سے ڈرتا ہوں ہمیشہ نیّر
ربطِ شائستہ پہ تہمت نہ لگا دی جائے

راہی قریشی (مجگری)

○

چشمِ بے خواب کو اِک کام تو سونپا جائے
دشتِ بیداری میں سپنا کوئی دیکھا جائے

دشتِ غربت کی سُلگتی ہوئی تنہائی میں
کہیں غمخواری کا سایہ ہو تو ٹھہرا جائے

عہد و پیماں کے دیئے بجھتے چلے جاتے ہیں
صرف پلکوں کا ستارہ ہے جو چمکا جائے

دل میں اب کوئی تمنّا ہے، نہ ارماں نہ اُمید
یہ چمن دیکھتے ہی دیکھتے سُوکھا جائے

عُمر تو تھک کے کہیں بیٹھ گئی ہے جیسے
اور زمانہ ہے کہ ہر لمحہ گذرتا جائے

دامنِ صحنِ چمن چھوٹ گیا ہے، تو چلو
ایک خوشبو کی طرح چار سُو بکھرا جائے

سب کو پہچان لیا، دیکھ لیا، جان لیا!
ایک دن خود کو بھی آئینے میں دیکھا جائے

شہر میں چارہ گری عام ہوئی تو راہی
اپنے زخموں سے لہو اور بھی رِستا جائے

[1] یہ مصرع جاں نثار اختر کا ہے ۔
(ادارہ)

شہاب للت (مہاراشٹر)

○

آنے والے کل کی خوشیوں کے لئے
آج کے شکوے ملتوی ہم نے کئے
دکھ تو ہے زندہ حقیقت آج کی
سکھ بھی دیکھیں گے اگر کل تک جئے
سب کی اُڑتی ہے ہنسی وقتِ زوال
ڈوبتے سورج پہ ہنستے ہیں دیئے
روشنی جو تجھ میں ہے وہ ہم میں ہے
تو ہے سورج ہم ہیں مٹی کے دیئے
زندگی تھی لمحہ لمحہ اک عذاب
جینے والے مجبوراً پھر بھی جیئے
آنکھ جب بھی آئینے سے مل گئی،
میرے خدوخال مجھ پر ہنس دیئے
اپنے زخموں سے زیادہ بے نیاز
دوسروں کے زخم جس نے بھی سیئے
خواہشوں کی ہیں صلیبیں منتظر
جابجا مجبور انساں کے لئے
کل شہاب اُن کو پریشاں دیکھ کر
ہم بھی اُن پر اتفاقاً ہنس دیئے

رونق تھیادی

○

کس طرف جائیں جلتے ہوئے شہر میں
ڈر لگے اب نکلتے ہوئے شہر میں.
چپکے چپکے مرا گاؤں داخل ہوا
روپ اپنا بدلتے ہوئے شہر میں
تنہا تنہا سا لگتا ہے ہر آدمی
بھیڑ کے ساتھ چلتے ہوئے شہر میں
خودکشی، رہزنی، بے بسی، مفلسی،
ہے سبھی کچھ بدلتے ہوئے شہر میں
خوب چمکی ہے جسموں کی سوداگری
کھوٹے سکوں پہ پلتے ہوئے شہر میں
لے رہی ہیں جنم نت نئی سازشیں
خواہشوں کو کچلتے ہوئے شہر میں
رونق اپنی بھی پہچان مشکل ہوئی
لمحہ لمحہ بدلتے ہوئے شہر میں

ڈاکٹر احسن رضوی

○

رات اک گیت جو ہونٹوں پہ مرے مچلا ہے
میرے خوابوں کی طرح دور تلک بکھرا ہے
زندگی تیری جھلک کیسے دکھائی دے ہمیں
سامنے اپنے تو افکار کا اک کہرا ہے
زلف کی چھاؤں ملی ہے تو ذرا رک جائیں
کیا پتہ آگے کوئی دشت ہے یا صحرا ہے
ذہن کا آئینہ رکھتا ہے بہت سے پہلو
ایک چہرہ کئی رنگوں میں ابھر سکتا ہے
تشنگی آنکھوں کی ہونٹوں پہ اتر آئی ہے
آج نزدیک سے میں نے جو اسے دیکھا ہے

یوسف اعظمی

○

مجھے تلاش ہے اک جسم کی صبا کی طرح
گزر رہا ہوں ہر اک موڑ سے ندا کی طرح
دلوں کا آج دعاؤں سے واسطہ ہی نہیں
ہر ایک آدمی لیے رابطہ ہے خلا کی طرح
نظر کے سامنے مجرم ہے آگہی کا وجود
ہر ایک دل ہے کسی کاسۂ گدا کی طرح
کثیف لمحوں سے دامن بچا کے گزرا ہوں
لہو چمکتا ہے تیرے نقوشِ پا کی طرح
بہت عجیب ہے تنہائی کا یہ سناٹا
ہر ایک لمحہ جلے ہے کسی چتا کی طرح

مہدی پرتاپگڑھی

○

لبِ سکوت کے بوسے کی طرح زندہ ہوں
ہے پیاس جس کا مقدر میں ایسا دریا ہوں
میں بوئے گل کی طرح قیدِ غم سے نکلا ہوں
مہک اٹھی ہے فضا جس طرف سے گزرا ہوں
سراپا خارِ رفاقت اٹھائے ہے ہر سمت
ہر ایک گام پہ میں چونک چونک اٹھتا ہوں
ہے آفتابِ عمل میرے دستِ قدرت میں
شبِ گراں کو بتا دو میں اک سویرا ہوں
ہر ایک راہگزر پوچھتی ہے تیرا پتہ
چمن سے جب بھی اکیلا کبھی گزرتا ہوں
مرے وجود کو خود سے نہ تم الگ سمجھو
تمہارے ساتھ میں سائے کی طرح رہتا ہوں
اتار دیتا میں زخموں کی یہ قبا مہدی
اگر زمانہ نہ کہتا کہ میں مسیحا ہوں

شفق تنویر

خود کو بکھرا ہوا یہ دیکھ رہا ہو جیسے
زرد شیشے کی طرح ٹوٹ گیا ہو جیسے
بے حسی ایسی کہ سُنتا نہیں نغمہ بھی کوئی
چیخ میری کسی صحرا کی صدا ہو جیسے
گود میں ماں کی ہمکتا ہوا ننھا بچہ
شکلِ معصوم میں لگتا ہے خدا ہو جیسے
میرے ہی ہاتھوں کے خنجر پہ نشاں لگتے ہیں
قتل میرا مرے ہاتھوں سے ہُوا ہو جیسے
خود پہ یوں پڑتی ہیں مشکوک نگاہیں میری
میرا چہرہ کئی چہروں میں چھُپا ہو جیسے
اِس طرح بھیڑ میں دیکھا اُسے میں نے تنویرؔ
کائی میں کوئی کنول آن گِرا ہو جیسے

عزیز اندوری

پھر سے کہئے کہ میں اک بہتا سمندر تو نہیں
آدمی وقت کی رفتار سے بڑھ کر تو نہیں
رگ مخالف ہیں نکلتے نہیں گھر سے اپنے
وقت کے ہاتھوں میں پھر ظلم کا خنجر تو نہیں؟
حسن و فکاہ سے آگے بھی جہاں بستے ہیں
قد و گیسو میں اُلجھنا ہی مقدّر تو نہیں
ہم ہیں مظلوم دفا ہم سے لکھاؤ تاریخ
ہم سے پوشیدہ ستم کا کوئی منظر تو نہیں
اپنے ہی حق میں کوئی فیصلہ کرلیں ہم بھی
صرف اُن کا ہی کرم اپنا مقدّر تو نہیں
ہم بھی شیشوں کے مکانوں میں مقیّد ہیں عزیزؔ
اپنے زخموں کا مداوا کہیں پتھر — تو نہیں۔؟

لکشمی نرائن فارغ

غیروں سے مروّت ہے اپنوں سے نہ ہمدردی
انسان کی قیمت خود انسان نے کم کردی
ہے صبحِ مسرّت کی تابندہ جبیں بیشک
خورشید کے چہرے پر لیکن ہے ابھی زردی
ہر راہ میں کیں پیدا دشواریاں خود ہم نے
جس سمت قدم اُٹھے دیوار کھڑی کردی
انسان کی فطرت بھی اک طرفہ تماشہ ہے
یہ آبلہ پائی اور یہ جوششِ جہاں گردی
ہے کتنا جنوں پرور یہ دورِ زمانہ بھی
تجدیدِ مقاصد کی ہر سر میں ہوا بھر دی
آئینِ اذیت میں تبدیلیاں کیں پیدا
دی میں نے زمانے کو خود دعوتِ بے دردی
کچھ مشقِ تصوّر نے سانچے میں اُنھیں ڈھالا
کچھ ذوقِ تماشا نے تائیدِ نظر کردی
باقی ہے ابھی فارغؔ اِس دَور کے اِنساں میں
اک ہمّتِ مردانہ، اک جذبۂ پامردی

ڈرامہ

بیچ کی دیوار

کردار

تسنیم ——— کالج کی [redacted] طرار۔ لڑکی

ثریا ——— تسنیم کی ماں

غیاث ——— [redacted] محبوب۔

کمال ——— [redacted]

ممتاز ——— [redacted] محبوبہ

تسنیم۔ (آف مائک) "امی ذرا ادھر تو آیئے۔"

ثریا۔ (فیڈنگ اِن) تجھے تو کچھ کام ہی نہیں۔ تمام دن کھڑکی سے لگی باہر دیکھتی رہتی ہے۔ کیا ہے؟

تسنیم۔ (آن مائک) وہ دیکھیے پڑوس والے مکان میں کرائے دار آگئے ہیں۔

ثریا۔ تو کیا کیا جائے۔ کیا جشن منایا جائے۔ ہمیں پڑوسیوں سے کون سا رُکو ملتا رہنا ہے۔ جو اُن کے آنے سے خوشی ہوگی۔

تسنیم۔ مگر امی یہ لوگ شائستہ نظر آتے ہیں۔

ثریا۔ آنکھ اکثر دھوکا کھا جاتی ہے بیٹی۔ کیا پہلے والے کرایہ دار دیکھنے میں غیر مہذب تھے

تسنیم۔ اُن کی بات چھوڑیئے۔

ثریا۔ بیٹی ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ ایک دن تو خود ہی اپنا خیال بدل دیگی

تسنیم۔ امی پتہ نہیں انہوں نے صبح سے کچھ کھایا بھی ہے یا نہیں۔ کیوں نہ ہم اُن کے لئے کچھ بھیج دیں۔

ثریا۔ تجھے خدا محفوظ رکھے۔ میں کہتی ہوں ہمیں پڑوسیوں کو منہ لگانا نہیں ہے۔

تسنیم۔ ہوسکتا ہے مکان خالی کرنے کی مصروفیت میں انہوں نے پکایا نہ ہو۔

ثریا۔ ٹھیک ہے، نہیں پکایا ہوگا۔ نہیں پکایا۔ ہم بھی تو کرائے کے مکانوں میں رہتے آئے ہیں۔ کبھی کسی پڑوسی نے ہم پر ایسی عنایت کی

تسنیم۔ دوسروں کا مقابلہ ہم اپنے آپ سے کیوں کریں۔

ثریا۔ ابھی تو نا سمجھ ہے دنیا کے طور طریقوں سے واقف نہیں۔

تسنیم۔ میں نا سمجھ سہی مگر ہم انہیں کچھ نہ کچھ ضرور بھجوائیں گے۔ میں پراٹھے تیار کرتی ہوں اور آپ ترکاری بنایئے۔

ثریا۔ ہرگز نہیں۔ اگر تیرے ابا کو یہ معلوم ہوجائے کہ ہم نے کھانا پکا کر پڑوسیوں کو بھیجا ہے تو وہ گھر سر پر اٹھالیں گے۔

تسنیم۔ ابا کی طرف سے آپ پریشان نہ ہوں انہیں سمجھانے کا ذمہ میرا۔

ثریا۔ میں کچھ نہیں جانتی۔

تسنیم۔ امی۔ اب عورتیں آئی ہیں۔

ثریا۔ دیکھوں۔ کون کون ہیں؟

تسنیم۔ وہ جو موٹر سے اتر رہی ہیں نا...... وہ...... میں سمجھتی ہوں اس مکان میں رہیں گی۔

ثریا۔ (ہنستی ہے) خوب۔

تسنیم۔ کیا بات ہے امی آپ ہنس رہی ہیں؟

ثریا۔ کم سے کم عمر کا لحاظ کیا ہوتا۔ کتنا غازہ تھوپ رکھا ہے۔ یہ لڑکی کون ہوسکتی ہے، شاید بیٹی ہو۔ توبہ توبہ کس قسم کے کپڑے پہن رکھے ہیں۔

تسنیم۔ اور یہ...... ممکن ہے بیٹا ہو۔

ثریا۔ (ہنستی ہے) ذرا اس کی وضع تو دیکھو۔

تسنیم۔ اُسے کیا ہوا؟

ثریا۔ کمبخت نے چوڑی دار پائجامے میں قمیض ٹھونس رکھی ہے اور بال کیسی بے ترتیبی سے بڑھائے ہیں۔

تسنیم۔ آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ آپ گھر سے باہر قدم نہیں نکالتیں اسی لئے آپ کو وہ لوگ عجیب سے لگ رہے ہیں۔

ثریا۔ آج کل کے فیشن کو آگ لگے۔ لوگ تماشے بنے گھومتے ہیں ہم بھی تو فیشن پرست رہے ہیں اُس زمانے کی بات ہی الگ تھی

تسنیم۔ بس امّی بس۔ اِس دقیانوسی تذکرے ہی سے مجھے وحشت ہوتی ہے (فیڈنگ آف) اچھا امّی میں باورچی خانے میں چلی، ذرا آپ ترکاری دیکھ لیجئے۔

ثریا۔ تو بھی بڑی ضدی ہے۔ لاکھ سمجھاؤ مگر سمجھے گی نہیں۔

(موسیقی)

کمال کا مکان

ممتاز۔ کمال ــــ یہ الماریاں یہاں کس نے رکھوا دیں۔

کمال۔ میں نے امی۔

ممتاز۔ ایسا کرو، ان الماریوں کو اُدھر کے کمرے میں رکھوا دو۔ اِس کمرے کو ہم ڈائننگ ہال بنائیں گے۔

کمال۔ بہت بہتر امّی

ممتاز۔ (لائٹ کے سوئچ کی آواز) یہ کیا؟ بجلی یہاں نہیں ہے؟

کمال۔ بجلی کا بل داخل کر کے کنکشن لینا ہے۔ کل تک کنکشن آجائیگا

ممتاز۔ مجھے بغیر لائٹ کے نیند نہیں آتی۔

کمال۔ ایسا کریں گے پڑوس والے مکان سے ہم ایک رات کے لئے لائٹ لے لیں گے۔ کل سے تو خود ہمارے یہاں لائٹ آجائے گی۔

ممتاز۔ ہرگز نہیں۔ میں تو یہ چاہتی ہوں کہ ان سے بات چیت تک نہ کی جائے۔ تو نے دیکھا نہیں ہمیں اچھا مکان محض اُن بیہودہ پڑوسیوں کی وجہ سے چھوڑنا پڑا۔

کمال۔ ہو سکتا ہے یہ پڑوسی ویسے نہ ہوں۔

ممتاز۔ کیا ہو سکتا ہے اور کیا نہیں یہ تو مجھ پر چھوڑ دے

کمال۔ پھر بھی امّی۔ کیوں نہ ہم اُن کے بارے میں اچھے خیالات رکھیں

ممتاز۔ تو ابھی کم عمر ہے۔ رفتہ رفتہ تجھے سمجھ آئے گی۔ پڑوسیوں کی وجہ سے ہمیں ہزاروں کا نقصان برداشت کرنا پڑا۔ کتنی اچھی اچھی مرغیاں اُس کے کتّے نے ہضم کر لیں۔

کمال۔ قصور تو کتّے کا تھا۔

ممتاز۔ کتّا تھا کس کا؟

کمال۔ مجھے مرغیوں سے زیادہ افسوس تو باغ کا ہے۔ نظر تو کتے ہی بکری گھس آئی تھی۔ کہاں کہاں سے میں نے پودے اکٹھا کئے تھے، سب کے سب تباہ ہو گئے۔

ممتاز۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ اُنہیں اُلٹی ہم ہی سے شکایتیں تھیں

کمال۔ ہم سے نہیں امّی۔ ہماری مرغیوں سے۔ ہماری مرغیاں بھی اکثر اوقات ان کا باورچی خانہ گندہ کر دیتی تھیں۔

ممتاز۔ بیٹا۔ اِس میز کو ایسے رکھ دو۔ تھوڑا سا اس طرف کو ہٹا کے ..... (کمال میز ہٹاتا ہے) ہاں اور ــ ذرا سا اور ..... بس بس ٹھیک ہے۔

کمال۔ نہ جانے یہ پڑوسی کیسے ہوں؟

ممتاز۔ سامنے ہی تو ہیں۔ میں کب سے اُنہیں کو دیکھ رہی ہوں۔ کھڑکی میں کھڑے ہماری طرف دیکھ دیکھ کر یوں ہنسے جا رہے ہیں جیسے ہم ریگ کے باشندے ہوں۔

کمال۔ آپ کو یہ خیال کیسے آیا کہ وہ ہمیں دیکھ کر ہنس رہے ہیں۔

ممتاز۔ میں دودھ پیتی بچی نہیں کہ اتنا بھی نہ سمجھ سکوں۔

کمال۔ ٹھیک ہے۔ ابھی مجھے لائٹ کا بندوبست کرنا ہے۔

ممتاز۔ خبردار جو تو نے اُن سے لائٹ مانگی۔

کمال۔ پھر کہاں سے لی جائے۔؟

ممتاز۔ ہم چراغ جلا لیں گے۔

کمال۔ چراغ کی روشنی میں مجھ سے پڑھا نہیں جاتا۔

ممتاز۔ آج رات اگر پڑھے گا نہیں تو کون سا غضب ہو جائیگا۔

کمال۔ کل میرا امتحان ہے۔ آج کا سارا دن تو اٹھا پٹک میں گزر گیا (کراس فیڈ لیجئے۔ سامان کی لاری آگئی ہے....

(لاری کی آواز ــ موسیقی)

تسنیم کا مکان

غیاث:۔ (مکان میں داخل ہوتے ہوئے) ارے بھئی سنتی ہو

ثریا:۔ کیا ہے ؟

غیاث:۔ راستے میں مجھے تسنیم کی سہیلی کملا ملی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی آج
رات تسنیم کی اُس کے گھر دعوت ہے۔

ثریا:۔ اچھا۔ وہ خود کیوں نہیں آئی۔

غیاث:۔ مصروفیت ہوگی۔ تسنیم کہاں ہے ؟

ثریا:۔ (پریشان ہوتے ہوئے) یہیں کہیں ہوگی۔ شاید نیچے ہو

غیاث:۔ وہ نیچے نہیں ہے۔

ثریا:۔ باورچی خانے میں ہوگی۔

غیاث:۔ میں دیکھتا ہوں (وہ جاتا ہے) وقفہ

ثریا:۔ (خود سے) میں کہتی رہی دیکھو باپ کے آنے کا وقت ہے،
مگر سنتا کون۔

غیاث:۔ (آف مائک) تسنیم ...... تسنیم بیٹی (فیڈنگ آن)
باورچی خانے میں بھی نہیں ہے۔ تم کیسی ماں ہو جی، تمہیں یہ
تک معلوم نہیں کہ تمہاری بیٹی کہاں ہے ..... میں ایکبار
اور نیچے دیکھتا ہوں۔

ثریا:۔ ٹھہریئے۔

غیاث:۔ کیا ہے ؟

ثریا:۔ وہ پڑوس والے مکان میں گئی ہوگی۔

غیاث:۔ پڑوس والے مکان میں! تمہارا مطلب ہے اُس خالی مکان میں

ثریا:۔ اُس میں کرائے دار آگئے ہیں۔

غیاث:۔ وہ وہاں کیا کرنے گئی ہے۔

ثریا:۔ اِس کا خیال تھا کہ اُن لوگوں نے مصروفیت کی وجہ سے کھانا
نہیں پکایا ہوگا اس لئے وہ کھانے کی چیزیں انہیں دینے گئی ہے

غیاث:۔ میں تم سے پوچھتا ہوں تم نے اجازت کیوں دی ؟

ثریا:۔ میں روکتی رہی، مگر اُس کی ضد کے آگے کس کی چلتی ہے۔

غیاث:۔ تمہارے بے جا لاڈ کی وجہ سے وہ بگڑتی جا رہی ہے۔

ثریا:۔ میں کیا کرتی۔ کہہ رہی تھی پڑوسیوں کی اہمیت ہر مذہب میں
بتائی گئی ہے۔ پڑوسیوں سے ہمیں دوستانہ تعلقات رکھنے چاہیئے

غیاث:۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا۔ تم نے دیکھا نہیں پچھلے کرائے
داروں نے ہمیں کتنا تنگ کیا تھا۔

ثریا:۔ اُن کمبختوں کا تذکرہ نہ کیجیے۔ ہاتھ نہ لگاؤ جھگڑا شروع ہی
کر دیا ہوں۔

غیاث:۔ تمہاری بیٹی کی ٹانگ توڑ ڈالی۔ کئی دنوں تک مجھے اُسے دواخانہ
لے جانا پڑا۔ جانور تک کا انہیں لحاظ نہیں تھا۔

ثریا:۔ ٹانگ توڑنے کے بعد انہوں نے جھگڑا بھی تو کیا تھا۔

غیاث:۔ دو کوڑی کی مرغی کی بھی کیا حیثیت تھی۔ اسے جانور تھا
اُٹھا لایا۔

ثریا:۔ اور کیا۔ ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔

غیاث:۔ اُن کے کوؤں نے ہمیں کتنا تنگ نہیں کیا تھا۔ کبھی ہم نے
اُن سے کوئی شکایت کی۔

ثریا:۔ (ہنستی ہے) آپ تو حد کرتے ہیں۔ اُن کے کوّے .....
کوؤں کو بھی کسی نے پالا ہے۔

غیاث:۔ اگر وہ کوّے اُن کے نہیں تھے تو اب کیوں نہیں آ رہے
ہیں۔ اُن کے جانے کے بعد سے ہمیں کوئی کوّا دکھائی نہیں دیا

ثریا:۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ کوّے اُن کے مکان خالی کرنے کے
بعد سے نہیں آ رہے ہیں یہ محض اتفاق ہو سکتا ہے۔

غیاث:۔ ایسا بھی کیا اتفاق۔ میں تسنیم کو آواز دیتا ہوں۔

ثریا:۔ آواز دینے کی ضرورت نہیں وہ آتی ہوگی۔

غیاث:۔ تم دیکھ لینا، تم نے جو برتن بھجوائے ہیں، وہ ٹھیک حالت
میں واپس نہیں آئیں گے۔ برتنوں میں کھڈّے
پڑ جائیں گے۔

ثریا:۔ کھڈّے تو نہیں پڑیں گے، اس لئے کہ میں نے کانچ
کے برتن بھیجے ہیں۔

غیاث:۔ تو ٹکڑے اور کرچیاں وصول کرنا

ثریا:۔ اب آپ سے کون اُلجھے، لیجیے تسنیم آ رہی ہے (وقفہ)

غیاث:۔ (غصّے سے) کہاں تھیں ؟

تسنیم:۔ میں ...... ذرا ...... اُدھر گئی تھی۔

ثریا:۔ برتن کہاں ہیں ؟

تسنیم:۔ اُن کے یہاں برتن اُوپر نہیں بچے، انہوں نے کہا کہ وہ کچھ

دیر بعد برتن لوٹا دیں گے۔
غیاث :۔ میں پوچھتا ہوں تم گئیں کیوں ؟
تسنیم :۔ ابا وہ ہمارے پڑوسی ہیں ! ہمیں اُن کا خیال رکھنا چاہئیے
غیاث :۔ آئندہ سے تم اُدھر کا رُخ نہیں کرو گی۔
تسنیم :۔ وہ بہت اچھے لوگ ہیں ابا۔
ثریا :۔ کون کون ہیں وہ ؟
تسنیم :۔ کمال اور کوثر بھائی بہن ہیں، اُن کی ماں ہیں اور اُن کے ابا ہیں جو اکثر دورے پر رہتے ہیں۔ تیس پینتیس مرغیاں بھی ہیں
غیاث :۔ اب باورچی خانے کی خیر نہیں۔
ثریا :۔ تم سے کیا بات چیت رہی۔
تسنیم :۔ اُنہوں نے ہمارے بارے میں تفصیل سے پوچھا۔ کہہ رہے تھے آج تک کسی نے اُن کا اِس طرح سے خیال نہیں کیا۔
ثریا :۔ اور کیا کہا ؟
تسنیم :۔ کوثر کی ماں نے کہا کہ میں آپ کو اور ابا کو اُن کا سلام پہنچا دوں۔ وہ لوگ ملنے آئیں گے۔
غیاث :۔ اُن کے آنے سے پہلے، مجھے یقین ہے کہ اُن کی مُرغیاں آئیں گی، بکریاں قدم رنجہ فرمائیں گی اور.......
ثریا :۔ اور کُتے تشریف لائیں گے۔
تسنیم :۔ کُتے ؟!
ثریا :۔ ہاں کُتے۔ تم سُنو گی تو خوب ہنسو گی۔ تمہارے ابا کہہ رہے تھے۔
غیاث :۔ (جملہ پورا کرنے سے پہلے) تم تو مجھے بات نہیں کرنے دو گی
ہاں تسنیم کان کھول کر سُن لو۔ تم اُدھر نہیں جاؤ گی۔ سمجھیں ؟
تسنیم :۔ آپ کہتے ہیں تو ٹھیک ہے، مگر یہ کچھ اچھا نہیں لگتا کہ ہم اپنے پڑوسیوں سے اِس طرح کا رویہ رکھیں۔
(موسیقی)

کمال کا گھر

کمال :۔ امی، کتنا اچھا کھانا ہے۔
ممتاز :۔ تو تو کہے گا ہی
کمال :۔ بڑا مزے تو لاجواب ہیں۔ اتنے ملائم کبھی ہمارے یہاں نہیں بنتے۔
ممتاز :۔ پراٹھوں سے زیادہ مجھے حیرت پسندآئی
کمال :۔ اب آپ بھی اُن لوگوں کی دعوت کر دیجئے۔ اتوار کے دن مجھے فرصت ہوگی میں انتظام کر دوں گا۔
ممتاز :۔ مجھے اِس عنایت کے پیچھے کچھ اور نظر آرہا ہے۔
کمال :۔ میں بھی تو سُنوں کیا نظر آرہا ہے۔
ممتاز :۔ کوئی یونہی تو مہربان نہیں ہوتا۔ مجھے تو کچھ عجیب سا لگ رہا ہے
کمال :۔ عجیب لگنے کی کیا بات ہے امی۔ ہو سکتا ہے اُنہوں نے سوچا ہو کاموں کی زیادتی کی وجہ سے ہمیں پکانے کی فرصت نہ ملی ہو اور انہوں نے کھانا پکا کر بھیج دیا۔ ایک پڑوسی کا جو فرض ہوتا ہے وہ ادا کر دیا۔
ممتاز :۔ میں پوچھتی ہوں آج تک کسی نے ایسا کیا ؟
کمال :۔ یہ لوگ شائستہ اور مہذب لگتے ہیں خصوصاً وہ لڑکی اسنے کیا نام بتایا تھا امی۔
ممتاز :۔ تسنیم۔
کمال :۔ جی ہاں تسنیم۔
ممتاز :۔ تجھے کیسی لگی وہ لڑکی۔
کمال :۔ بہت اچھی۔ وہ خوبصورت ہے، خوب سیرت ہے
ممتاز :۔ خوب۔ تو نے خوب سیرت ہونے کا اندازہ کیسے لگایا۔
کمال :۔ جسے پڑوسیوں کا اتنا خیال ہو، اس کی خوب سیرتی میں شک کی گنجائش ہو سکتی ہے۔
ممتاز :۔ ویسے بات بھی تو لڑکی کی ہے۔
کمال :۔ بات چاہے کسی کی ہو...... مجھے کہنا صرف اتنا ہے کہ وہ....
ممتاز :۔ بس بس۔ میں سمجھ گئی۔ تجھے وہ لڑکی پسند آگئی ہے۔
کمال :۔ میں نے تو نہیں کہا کہ وہ مجھے پسند ہے !
ممتاز :۔ کہنا ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ بعض باتیں صرف سمجھی جاتی ہیں
کمال :۔ فی الوقت پسند بھی ہے تو کیا فرق پڑ جائے گا۔
ممتاز :۔ بہت کچھ
کمال :۔ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔
ممتاز :۔ تو سمجھتا ہے مگر بنتا بہت ہے۔

کمال :- میں آپ ہی کا بیٹا ہوں امّی
ممتاز :- مجھے کب اس سے انکار ہے۔ لوگ اچھے ہیں تو میں بات آگے بڑھاؤں گی۔
کمال :- کیا مجھے شکریہ ادا کرنا ہوگا۔
ممتاز :- نہیں۔ بلکہ یہ برتن واپس کرنے ہوں گے۔
کمال :- میں ابھی واپس کئے دیتا ہوں۔
ممتاز :- انہیں شیشے میں رکھ لو۔ ذرا احتیاط سے
کمال :- امّی۔ کیا میں بچہ ہوں جو گرا دوں گا۔
ممتاز :- پھر بھی پرائی چیزیں ہیں۔
کمال :- کیا آپ دروازہ کھولیں گی (برتن اٹھا لیتا ہے)
ممتاز :- ضرور

(موسیقی)

تسنیم کا مکان

کانچ کے برتن گرنے کی آواز

غیاث :- ارے یہ کیا ؟ ..... دیکھیں یہ آواز کدھر سے آئی۔
(وقفہ) ذرا ادھر تو آنا۔
ثریا :- (آتے ہوئے) کیا ہے ؟
غیاث :- تسنیم تم بھی ادھر آؤ۔ دیکھو میں کیا کہتا تھا۔
تسنیم :- ارے اس نے تو سارے برتن گرا دیئے۔
ثریا :- شاید اپنے ٹائیگر نے ہی کیا ہوگا۔
غیاث :- ٹائیگر بے چارے کا نام تو مفت میں بدنام ہے۔ تمہیں کہیں ٹائیگر دکھائی دیتا ہے۔
تسنیم :- وہ خاموش کھڑا کیا کر رہا ہے۔
غیاث :- کسی اور شرارت کے بارے میں سوچ رہا ہوگا۔
ثریا :- ہو سکتا ہے غلطی سے گر گئے ہوں گے۔
غیاث :- کیوں نہیں۔ بے شک۔
ثریا :- آپ تو ہر بات پر طنز کرتے ہیں۔
غیاث :- تم ہی کہو کیا کروں۔ کیا برخوردار کو اس عظیم کارنامے پر شاباشی دوں یا اپنا سر پیٹ لوں۔
ثریا :- آپ نے تو ابتدا ہی میں اپنے شک کا اظہار کیا تھا۔

غیاث :- اب تو آنکھ کھل گئی مجھے۔ میرا ایک ایک لفظ درست نکلا۔ اب گھر سے اور کرچیاں وصول کرنا۔ لو وہ واپس جا رہا ہے
(موسیقی)

کمال کا مکان

کمال :- امّی۔ دروازہ کھولئے
ممتاز :- (دروازہ کھولتے ہوئے) تم آ گئے
کمال :- امّی ہوا یوں ....
ممتاز :- ہاں ہاں کہو کیا ہوا۔
کمال :- وہ برتن تھے نا ....
ممتاز :- کیا ہوا اُن برتنوں کو ؟
کمال :- میں لے جا رہا تھا کہ مجھے ٹھوکر لگی اور سارے برتن ٹوٹ گئے
ممتاز :- یہ کیا کیا تم نے ؟
کمال :- میں ابھی بازار سے دوسرے لائے دیتا ہوں۔
ممتاز :- شروع ہی میں میں نے تمہیں تاکید کی تھی۔
کمال :- اتفاق کی بات ہے۔ میں نے جان بوجھ کر تو ایسا نہیں کیا
ممتاز :- ٹھیک ہے مگر ہم اُن سے کیا کہیں گے۔ مجھے تو شرم آ رہی ہے۔
کمال :- میرا بھی یہی حال ہے۔ کیوں نہ ہم دوسرے برتن بھجوا دیں یا قیمت ادا کریں۔
ممتاز :- یہ اچھا نہیں لگتا۔ اس کا وہ بُرا بھی مان سکتے ہیں۔
کمال :- پھر کیا کیا جائے ؟
ممتاز :- تو جا اور اُن سے صاف صاف کہدے۔
کمال :- مجھ میں وہاں جانے کی ہمت نہیں ہے
ممتاز :- چل میں بھی چلتی ہوں۔
کمال :- چلئے

(موسیقی)

تسنیم کا مکان

غیاث :- ارے بھئی شام ہو گئی کیا رات کا کھانا ہمارے پڑوسیوں کے یہاں نہیں جائے گا۔
ثریا :- آپ کو تو موقع چاہیئے طنز کرنے کے لئے کیا ہوا اگر برتن

ٹوٹ گئے۔ یہ تو گئی

غیاث:۔ باقی قسمت کی دو چار اور باتیں اُتر گئیں تو اچھا ہے

ثریاؔ:۔ تم تو کہہ دو کون سا ایسا بیچ رہا ہے

غیاث:۔ ظاہر ہے اُسے دودھ چھوٹے تو کچھ ہی دن ہوئے ہیں۔

تسنیم:۔ اب بس بھی کیجئے آپا۔ غلطی میری تھی۔ مجھے افسوس ہے

(دروازے پر دستک ہوتی ہے)

غیاث:۔ کون ہے؟

ممتاز:۔ (آف مائک) دروازہ کھولئے۔ ہم آپکے پڑوسی ہیں۔

غیاث:۔ پتہ نہیں اب اور کیا آفت آنے والی ہے

ثریاؔ:۔ تسنیم۔ ذرا کرسیاں سلیقے سے رکھ دو۔

تسنیم:۔ جی امی (وہ کرسیاں رکھتی ہے۔ غیاث دروازہ کھولتا ہے)

ممتاز:۔ آداب عرض کرتی ہوں۔

غیاث:۔ آداب عرض ہے، تشریف لائیے۔ یہ میری بیوی ہیں۔

ممتاز:۔ بہن۔ تمہارا احسان میں زندگی بھر نہیں بھول سکتی۔ تم نے کھانا بھیجنے کی تکلیف کی۔ ہمیں تو ایسا لگ رہا ہے جیسے ہم اپنے رشتہ داروں میں آگئے ہوں۔

غیاث:۔ (طنز سے) کیوں نہیں۔ ہم بھی یہی سمجھتے ہیں کہ پڑوس میں ہمارے رشتہ دار آگئے ہیں۔

ممتاز:۔ یہ آپ کی عنایت ہے بھائی صاحب۔ اچھے پڑوسی قسمت والوں ہی کو ملتے ہیں۔

ثریاؔ:۔ بیٹھو نا بہن۔

غیاث:۔ تسنیم۔ کیا چائے نہیں بناؤ گی۔

ممتاز:۔ تکلیف کی ضرورت نہیں بھائی صاحب

غیاث:۔ اِس میں تکلیف کی کون سی بات ہے۔

ممتاز:۔ آپ کے خلوص نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے۔ اس گھر کا بچہ بچہ خلوص کا پیکر نظر آتا ہے۔

ثریاؔ:۔ اب اگر دُنیا سے خلوص بھی اُٹھ جائے تو پھر رہ ہی کیا جائیگا

ممتاز:۔ یہ بات تو ہے۔ آپ کون سے دفتر میں کام کرتے ہیں؟

غیاث:۔ میں بنک میں کام کرتا ہوں۔

ممتاز:۔ بہن ایسا کیجئے آپ، بھائی صاحب اور بچی رات کا کھانا ہمارے یہاں کھائیں۔

ثریاؔ:۔ کیوں بہن تم ہی رات کے کھانے کے لئے یہاں رُک جاؤ

ممتاز:۔ ارے نہیں

غیاث:۔ اِس میں حرج ہی کیا ہے۔

ممتاز:۔ دُوسری بات یہ ہے کہ تمہارے برتن کمالی کے ہاتھوں ٹوٹ گئے۔

ثریاؔ:۔ کوئی بات نہیں۔ میرے پاس اور سیٹ ہیں۔

تسنیم:۔ (بھاگتی ہوئی آتی ہے) آپا دیکھئے اپنا ٹائیگر کیا لے آیا ہے

غیاث:۔ ارے کمبخت مرغی اٹھا لایا ہے۔ کس کی مرغی ہے؟

ممتاز:۔ یہ تو میری مرغی ہے

غیاث:۔ اِسے تو مرغیاں پکڑنے کی بُری عادت پڑ گئی ہے۔ ناحق آپ کا نقصان ہوگیا۔

ممتاز:۔ کوئی بات نہیں۔ جانور ہی تو ہے۔

غیاث:۔ پھر بھی

ممتاز:۔ آپ ناحق افسوس کرتے ہیں۔ ویسے غلطی میری ہی ہے میں نے مرغیاں کھُلی چھوڑ دی تھیں۔

غیاث:۔ نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ میں ٹائیگر کو باندھ کے رکھوں گا۔

ممتاز:۔ اب آپ اس بارے میں مت سوچئے۔ کیا بہن رات کا کھانا ہمارے ساتھ نہیں کھاؤ گی

ثریاؔ:۔ جب تم مُصر ہو تو ضرور

ممتاز:۔ بھائی صاحب، آپ آئیں گے نا۔ آپکے قابل اہتمام تو نہیں ہو سکے پھر بھی ——

غیاث:۔ کیا کہتی ہیں آپ، ناحق شرمندہ کر رہی ہیں۔

ممتاز:۔ تو میں چلوں۔ ہمارے اور آپ کے گھروں کے بیچ شاید دروازہ تھا جو دیوار اُٹھا کر بند کر دیا گیا ہے۔ بہت گھوم کے اِدھر آنا پڑتا ہے

ثریاؔ:۔ ہاں۔ سابقہ پڑوسی بہت جھگڑالو تھے۔ روز روز کے جھگڑوں سے تنگ آ کر ہمیں دیوار اُٹھانی پڑی۔

غیاث:۔ چلئے۔ میں آپ کو گیٹ تک چھوڑ آؤں۔ (موسیقی)

(بقیہ صفحہ ۴۹ پر دیکھئے)

مکتوبات

● مئی۔ جون کا "شاعر" موصول ہوا اور میں نے دلچسپی کے ساتھ اس کا مطالعہ کیا۔ جموں کی صنعتی نمائش میں منعقدہ ادبی محفل کا رپورتاژ پڑھ کر بے انتہا خوشی ہوئی۔ رپورتاژ پڑھتے ہوئے مجھے ایسا محسوس کیا گیا میں آپ بھی اس ادبی اجتماع کی نشستوں میں بیٹھا

میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے میری اُن کوششوں کو سراہا جو میں نے اس ادبی اجتماع کی کامیابی کے لیے کیں۔

۱۲۹۔ مہاتما گاندھی روڈ۔ بمبئی ۱ — اوم پرکاش گپتا
(ٹریڈ ایجنٹ، جموں و کشمیر)

● زبان و حال میں آپ کا رپورتاژ پڑھ کر بیحد محظوظ ہوا۔ بچا تُلا ہوا اندازِ تحریر اور طرزِ بیان گویا قاری کو ہم سفر کر لیا ہو —— جیسے جیسے رپورتاژ پڑھتے جاؤ، لگتا ہے ایک ایک واقعہ آنکھوں کے سامنے وقوع پذیر ہے، ایک ایک منظر نظروں میں سما رہا ہے۔ یہ کچھا بھلک بس کی بات ہے جو طرزِ بیان پر قدرت رکھتا ہو۔

مہر مسکن، ملتانی پورہ، بیگم بازار، حیدرآباد ۱۲ — سید مجو قمر

● نئے شمارے میں آپ کا رپورتاژ بہت خوب ہے ایسا لگا جیسے ہم خود اس پروگرام میں شریک ہوں۔ ایک ایک منظر بہت حسین ہے۔ اتنا حسین اور طویل رپورتاژ لکھنے پر مبارک باد قبول فرمائیے واجدہ تبسم کے تاثرات بہت خوبصورت ہیں۔

معرفت زید احمد صدیقی، دکان نمبر ۱۱، بستی نظام الدین دہلی۔ — سلمان درخشندہ

● مئی۔ جون ۷۰ء کے مشترک شمارے میں آپ نے "بدعات" کے زیرِ عنوان اُتر پردیش میں اُردو تعلیم کے احکامات کے متعلق لکھا ہے۔ اِسی قسم کی تحریریں قومی آواز لکھنؤ، سیاستِ جدید کانپور اور الجمعیۃ دہلی میں شائع ہوئی ہیں۔ ابھی تک اُتر پردیش کے میونسپل پرائمری اسکولوں میں نئے اُردو ٹیچروں کا تقرر نہیں ہوا ہے۔ حالانکہ ۱۲ جولائی سے یہ اسکول کھل گئے ہیں۔ اِس سلسلے میں ۸ جولائی ۷۰ء کا "ہماری زبان" کا اداریہ ملاحظہ فرمائیے۔ اُس کے فاضل ایڈیٹر پروفیسر آلِ احمد سرور صاحب اس پر لکھتے ہیں — "اُردو کے استادوں کے تقرر کے سلسلے میں حکومت کو اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ کوئی بدعنوانی نہ ہو۔ اور اُردو کے وہ استاد زیادہ سے زیادہ تعداد میں مقرر ہوں جو اُردو واقعی جانتے ہیں۔ اب اُتر پردیش میں صدر کا راج ہے۔ اِس لئے اُردو دوستوں کی یہ توقع بے جا نہیں ہے کہ اُردو کے سلسلہ میں حکومت کی پالیسی پر نیک نیتی اور خلوص سے عمل ہوگا"

اِس شمارہ میں ڈاکٹر محمد علی زیدی کا مقالہ "داغ کا تصورِ عشق" کافی محنت سے لکھا گیا ہے علاوہ پُر مغز ہے۔ داغ کی شاعری کا پہلو ابھی تک معیاری چیزیں بہت کم لکھی گئی ہیں۔ اُردو ادب کی تاریخ ان کو چھوڑ کر اِس وقت میرے سامنے نوری کی کتاب "داغ" رسالہ "نگار" کا داغ نمبر۔ احسن مارہروی مرحوم کی منتخبِ داغ اور متعدد یوپی کے داغ کی شاعری پر تنقیدی مضامین ہیں۔ ڈاکٹر محمد علی زیدی کا "داغ کا تصورِ عشق" اُن میں ایک خوشگوار اضافہ ہے۔

آپ کا جموں کا سفرنامہ بھی دلچسپ ہے۔ بیشتر نظمیں اور غزلیں جان دار ہیں۔ اگلے شمارہ میں علامہ اقبال پر مضامین دیکھنے کا منتظر ہوں۔ شاید کوئی نئی چیز سامنے آجائے۔

محلہ سوتھا۔ بدایوں (یوپی) — بشیر علی صدیقی ایم اے

● مئی اور جون ۷۰ء کا مشترکہ "شاعر" کا شمارہ ملا۔ شکریہ۔ آپ کا لکھا ہوا رپورتاژ "بمبئی سے جموں تک" بڑا آبدار اور جامع المضمون ہے اوّل سے آخر تک پڑھنے کے بعد دل باغ باغ ہو گیا۔

اِس کے بعد "تاثراتِ جموں" میں عصمت چغتائی صاحبہ، خواجہ احمد عباس صاحب، ظ انصاری صاحب، سلمیٰ صدیقی صاحبہ، جاں نثار اختر صاحب اور واجدہ تبسم صاحبہ کے تاثرات نہایت پُرکشش اور دل کو موہ لینے والے ہیں۔ خاص کر کے واجدہ تبسم صاحبہ کے مضمون نے دل کو بہت متاثر کیا۔

ڈاکٹر محمد علی زیدی کا مقالہ "داغ کا تصورِ عشق" بہت خوب اور معیاری ہے۔ اختر بستوی کے قطعات والا مقالہ بھی بہت پسند آیا۔ "کتابوں کی صلیب پر" پچھلے [illegible] پیاری کہانیاں ہیں۔ حضرت نثار اٹاوی، [illegible]

ادارۂ شعر کو ... کامیاب اور معیاری [illegible]

کٹیہار ... شاہد ... کمال منصوری

● تازہ شمارہ "شاعر" کا ممبئی شمارہ [illegible] کے صفحات پر نگاہ پڑی۔ [illegible] جناب [illegible] نظم [illegible] پر مجبور کر دیا۔ آپ کا اداریہ "ممبئی سے ممبئی تک" بڑا ہی دلچسپ اور اہم ہے۔ ایک ہی نشست میں ذوق و شوق سے پڑھ ڈالا۔ آپ نے جس جادو بیانی کے ساتھ آنکھوں دیکھا حال بیان کیا ہے اُسے پڑھ کر بے ساختہ منہ سے واہ نکل گئی۔ سچ پوچھئے تو ابتدا تا انجام دیکھئے آپ کی جادو بیانی نے مجھے موہ لیا ہے۔ "ممبئی سے ممبئی تک" پڑھنے کے بعد قلب و ذہن کو جو سرور حاصل ہوا ہے وہ ناقابلِ بیان ہے۔ ایک لمحے کے لئے ایسا محسوس ہوا (مجھے ہی نہیں بلکہ تمام قارئینِ "شاعر" نے یہ محسوس کیا ہوگا) جیسے میں بھی اس ادبی پروگرام میں شریک تھا۔

ظ. انصاری صاحب کے تاثر کا اپنا ایک الگ ہی رنگ ہے مختصر سے تاثر کے ذریعہ وہ "بہت کچھ" بیان کر گئے ہیں ـــــــ عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس، سلمیٰ صدیقی، جاں نثار اختر اور واجدہ تبسم، ان سب کے تاثرات بھی بے حد پسند آئے.... واجدہ تبسم نے اپنے تاثر کو افسانوی انداز میں پیش کیا ہے اور وہ اس میں کافی کامیاب رہی ہیں۔

زیرِ نظر شمارہ ترتیب و تزئین اور معیاری تخلیقات کے لحاظ سے لائقِ تحسین ہے۔ اختر بستوی کی نظمیں "اسیری" اور "دُوریاں" اور خالد شفائی کی "دیت نام کی دھرتی" بہت عمدہ ہیں۔ سعید عارفی، آمر صدیقی، زکی حصاری، اور عابد مناوری کی غزلوں نے کافی متاثر کیا۔ عظیم اجمیری اور شمس۔ نذیر الدین کی کہانیاں پسند آئیں۔

اسلام آباد۔ کھتولی ضلع مظفر نگر — مظفر حیات [illegible]

● "شاعر" کا ممبئی [illegible] ملا۔ شکریہ۔ حسبِ معمول اس بار بھی آپ نے جو صفحات [illegible] ہر وقت [illegible] ہے۔ [illegible]

... کی ایک مثال ہے۔ آپ نے جس خبر کا حوالہ دیا ہے اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یو پی کی صوبائی حکومت کے [illegible] عہدے داران اُردو کے متعلق صدق دلی کے ساتھ منصفانہ رویہ اپنانے سے گریز کر رہے ہیں لیکن اس صوبے میں [illegible] اُردو کے ساتھ ہونے والی بے انصافی [illegible] بلکہ [illegible] تعلیم کے بیشتر افسران [illegible] اُردو دشمن واقع ہوئے ہیں اور حکومت کی طرف سے اگر خدا نخواستہ کچھ اُردو کو کچھ مراعات بھی ملتی ہیں تو انہیں بھی یہ لوگ عملاً کالعدم کرنے کی مختلف طریقے ترکیبیں نکالا کرتے ہیں۔ میں اس سلسلے میں اپنے ضلع بستی کی ایک تازہ ترین مثال پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میونسپل حدود میں واقع تمام پرائمری اسکولوں کے متعلق حکومت کی طرف سے یہ حکم جاری ہوا تھا کہ ہر اسکول میں اس کا خیال کئے بغیر ایک اُردو ٹیچر مقرر کر دیا جائے کہ وہاں کوئی طالب علم اُردو پڑھنے والا ہے یا نہیں۔ لیکن بستی کے اربابِ اقتدار نے اس حکم میں اپنی طرف سے ایک گوشہ نکال لیا اور میونسپل حدود میں جتنے بھی پرائمری اسکول ہیں سب میں ایک گشتی مراسلہ بھجوا دیا کہ جن جن پرائمری ٹیچروں نے آزادی سے قبل سکنڈ فارم کی حیثیت سے اُردو پڑھی ہو وہ اپنے ناموں سے دفتر کو مطلع کریں۔ چنانچہ جتنے ٹیچر وہاں کے نام اس ضمن میں موصول ہوئے ان کے بارے میں یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ وہ اُردو پڑھانے کی بھی اہلیت رکھتے ہیں لہٰذا ان کی موجودگی میں نئے اُردو ٹیچر کی بھرتی کی ضرورت نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُردو [illegible] کی الگ حیثیت سے گھٹ کر صرف [illegible] رہ گئی [illegible] یہاں [illegible] اُردو ٹیچروں کی بھرتی کے انتظامات کئے جا سکتے ہیں لیکن جیسا کہ آپ نے تحریر فرمایا ہے [illegible] نہیں سکتا۔ بلکہ [illegible] اور عزم [illegible] ذاتی طور پر مندرجہ بالا امر کی طرف [illegible] کی توجہ مبذول کرائی ہے اور اب "شاعر" [illegible]

[illegible] زیادہ سے زیادہ اصحاب کو [illegible] اس قسم کی [illegible]

[illegible]

کیپ کا رپورتاژ "بمبئی سے کوئٹہ تک" لاجواب ہے۔ اسے پڑھتے وقت شروع سے آخر تک بالکل ایسی [illegible] ساتھ [illegible]

مدثر علی۔ [illegible] بستی (یوپی) اختر بستوی [illegible]

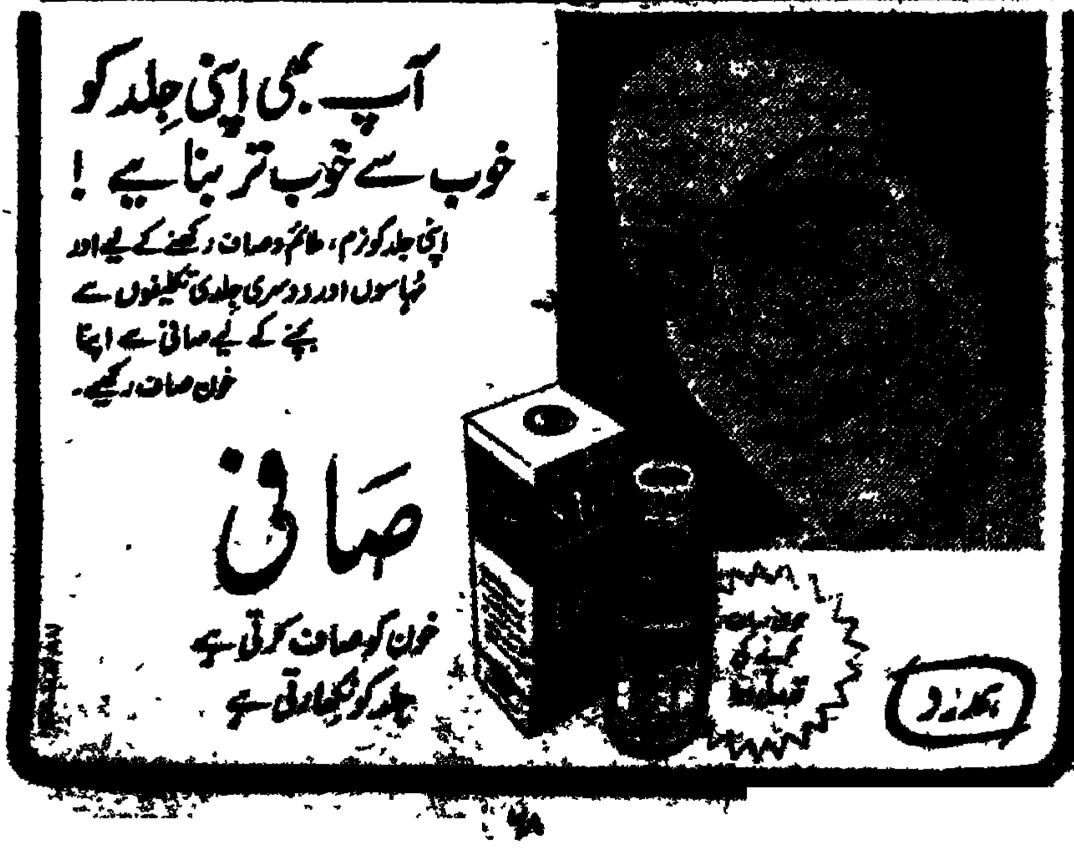
۔۔۔ شمارہ شاندار نکلا۔ بہت خوب ہے۔ آپ کی روداد سفر جو اس شمارے میں [illegible] آخر تک پڑھی بہت دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔ یہ صرف ایک سفر کی روداد نہیں ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے اور شہروں کی چلتی پھرتی تصویریں نظر آتی ہیں اور آپ نے اپنے قلبی احساسات و واردات کو اس میں جس طرح سمویا ہے وہ بڑی معنی خیز اور عبرت آموز ہے۔ کوئی اگر دیکھنا چاہے تو ان سطور کے آئینہ میں ملک کی موجودہ تشویش انگیز صورت حال کا چہرہ دیکھ سکتا ہے۔

شہید احمد اکبر آبادی ایم اے (مدیر برہان)

انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹری آف میڈیسن
اینڈ میڈیکل ریسرچ۔ نئی دہلی ۶۲

• [illegible] شاعر [illegible] جوش [illegible] کانفرنس کی تفصیلات اور [illegible] سے [illegible] ہے۔ [illegible] مشکل [illegible] تاریخی مقالہ [illegible] ہے۔ [illegible] صاحب کا تاثر [illegible] عشرت [illegible] جمال کی [illegible] غزل [illegible] غلط چھپا ہے۔ [illegible] گیت [illegible] بہت پیاری ہے۔ [illegible] رپورتاژ بھی کافی دلچسپ ہے۔

اشوک [illegible] ناگپور (مہاراشٹر) [illegible]



نقد و نظر

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

کلیاتِ ممنون

مرتبہ ——— محمد اکبر الدین صدیقی

میر نظام الدین ممنون دہلوی اُس عہد کے شاعر ہیں جب دلّی میں شاہ نصیر، احسان اور ذوق کا [illegible] حاصل تھا۔ اپنی فطری شاعرانہ صلاحیتوں اور خاندانی وراثت کے بدولت ممنون نے اپنے معاصرین میں ایک بلند مقام حاصل کیا۔ انہیں شاہ عالم کے دربار سے "فخر الشعرا" کا خطاب ملا۔ وہ میر قمر الدین منت کے [illegible] لڑکے تھے۔ منت خود اپنے وقت کے مشہور شاعر تھے۔ انہوں نے نواب آصف الدولہ اور کئی دیگر رؤسا کی مدح میں قصائد لکھے۔ دربار دہلی میں باریاب ہوئے۔ وہ بنگال بھی گئے اور [illegible] کی مدح سرائی کی۔ لارڈ وارن ہیسٹنگز کی شان میں قصیدہ لکھنے کے صلے میں "ملک الشعرا" کا خطاب پایا۔ شاہ ولی اللہ منت کے رشتہ داروں میں تھے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے درس تفسیر و حدیث لیا تھا۔ ممنون کو ایسے ہی لائق و فائق باپ کی تربیت نصیب ہوئی۔ اور انہوں نے بھی شاعری میں نام پیدا کیا۔ "شاعر شیریں زبان ہند" ممنون کی تاریخ وفات ہے۔ تذکرۂ اہل دہلی میں لکھا گیا ہے۔

"ذوق کے قصیدے کے سامنے قصائد ممنون کا رتبہ ہے اور ذوق کی غزلیات کے آگے متاخرین کا مرتبہ"

اور بھی تذکرہ نگاروں نے ممنون کی بہت تعریف کی ہے، لیکن یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان آرا میں غلو بھی شامل ہے۔ یہاں ممنون کی شاعری پر کوئی تحقیقی اظہار خیال مقصود نہیں اور نہ اُن کے کلام سے اُن کے معاصرین کے کلام کے موازنہ کا یہ موقع ہے۔ خود کلیاتِ ممنون کے مرتب محمد اکبر الدین صدیقی صاحب نے بھی [illegible] سرسری توجہ دی ہے اور وہ ممنون کی شاعری کا [illegible] ہیں۔ انہوں نے تقابل [illegible]

[illegible]

[illegible] شاعری کا اظہار [illegible] کیفیت بھی آگئی ہے اور [illegible] انداز [illegible]۔ ان کے شعر میں [illegible] اور [illegible] کسک [illegible]۔ وہ اپنے [illegible] کر کے چونکا دیتے ہیں اور کہیں [illegible] انداز اختیار کر کے [illegible] تصویر بھی پیش کر دیتے ہیں۔

مرتب نے ممنون کی غزلیہ شاعری کی چند مثالیں اپنے مقدمہ میں دی ہیں اور حیاتِ ممنون پر بھی اچھی سی نظر ڈالی ہے۔ ممنون کے قصائد [illegible] پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔

یہ کلیاتِ ممنون کی پہلی جلد ہے اور اس میں مرتب نے ممنون کے صرف قصیدے شامل کئے ہیں۔ ان قصائد کی تعداد ۳۲ ہے۔ ممنون کے کلیات کے تین نسخوں کو سامنے رکھ کر یہ قصائد ترتیب دیئے گئے ہیں۔ اور اختلافِ نسخ و متن کا خیال رکھا گیا ہے۔ کتب خانۂ آصفیہ کا [illegible] نسخہ۔ مولانا آزاد لائبریری بھوپال کے کم قصائد اور غزلوں والے نسخے اور انڈیا آفس لندن کے [illegible] نسخہ کلام ممنون کو مرتب نے سامنے رکھا ہے۔ قصائد کے ساتھ حسب ضرورت مختصر [illegible] ہیں۔ [illegible]

[illegible] ممنون کے قصیدہ [illegible] قصائد [illegible] کے سلسلے میں [illegible] بحث [illegible] تنقید [illegible] اوسط درجہ کی ہے۔ [illegible] کتاب مرتب سے [illegible] کے پتہ سے منگائی جا سکتی ہے۔

(ادارہ)

دیوانِ حافظ (مترجم)

[illegible] ——— مولانا قاضی سجاد حسین

[illegible] مدرسہ عالیہ [illegible]

[illegible] فارسی و عربی کی مشکلات [illegible]

[illegible] قاضی صاحب [illegible]

[illegible]

ایسی کتابیں انتخاب فرمائیں جن کا اردو ترجمہ اور حواشی ضروری ہوں تاکہ
سمجھنا مشکل نہ ہو۔ چنانچہ اس وقت تک ان کے قلم سے چھپ گئی ہیں
[illegible] تنبیہ مُغلقات کی عربی شرح "الترشیحات"
دوم [illegible] حافظ کی کتاب "اتحاف [illegible]"، سوم گلستانِ سعدی، چہارم
بوستان، پنجم دیوانِ حافظ کے حاشیے اور ترجمے۔ اس وقت میرا مقصد
[illegible] دیوانِ حافظ مترجم (تیسرا ایڈیشن) پیش نظر ہے جو کہ
منقح اصلاحات اور ترجمہ صاف و سادہ، زوائد سے پاک، زبان بامحاورہ
اور مطلب خیز، گو کہیں کہیں دو جگہ اختلاف کی گنجائش ہے۔ اتفاق کی
بات ہے کہ اوّل الذکر دو کتابیں میری نظر سے نہیں گذریں۔ نہ صرف
یہ بلکہ ان کا علم بھی حضرت کوثر چاند پوری کے مقدمہ سے ہوا۔ حضرت مولانا
سجاد کے گلستان، بوستان اور دیوانِ حافظ کے حواشی اور ترجمے تو
حال ہی میں چھپے ہیں۔ ان تینوں کتابوں کے حواشی یا محاورہ یا لفظی یا منظوم
ترجمے ہماری زبان میں خاصی تعداد میں پہلے بھی ہو چکے ہیں۔ جو قدیم [illegible]
یا دارالاسلام کے عربی کتب خانوں یا قدیم کتابوں کے تاجروں کے ہاں
نظر آجاتے ہیں۔ حضرت مولانا قاضی سجاد حسین کا ترجمہ "دیوانِ حافظ"
اردو کا اور خود اپنے ہی پہلے ایڈیشن پر حسنِ کتابت و طباعت وغیرہ
کے لحاظ سے سبقت لے گیا ہے۔ جو یقیناً حافظیات سے شغف
رکھنے والوں کیلئے ایک نادر تحفہ ہے۔ کاغذ، طباعت، کتابت سب
اچھا ہے اور متن کی کتابت بھی قیمتی ہے۔ مگر ترجمہ اور حواشی کی
کتابت نہایت باریک ہے۔ اگرچہ میرے جیسے کمزور بصارت والے کی شکایت
کیسے [illegible] سمجھنا چاہیئے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ مطالعۂ کتاب کے
اکثر شائقین حضرات کو بھی یہی شکوہ ہوگا۔

مولانا قاضی سجاد صاحب کی شائع کردہ گلستان اور
بوستان کے مقدمے محترم پروفیسر سید [illegible] نے لکھے تھے۔ دیوانِ
حافظ مترجم کے موجودہ ایڈیشن کا مقدمہ ملک کے مشہور طبیب اور
ادیب سے زیادہ [illegible] حضرت کوثر چاند پوری نے لکھا ہے اور انہوں نے
پر کتاب کی [illegible] بھی پیش فرمایا ہے۔ [illegible] حضرت مولانا
سجاد حسین کا [illegible]
حضرت موصوف نے اس کتاب کے [illegible] دیوانِ
حافظ اور حیاتِ حافظ کے بارے میں [illegible]

ہے۔ خوشی کا باعث یہ ہے کہ الحمد للہ انگریزی ہندوستان میں
اب تک فارسی درس [illegible] مساجد اور [illegible] میں [illegible] پایا جاتا ہے۔ [illegible]
دیوانِ حافظ کے بعض شعروں کی صحت و عدم صحت پر اکثر
بحث رہی ہے۔ چنانچہ ایک غزل کی صحت پر [illegible]
نے بھی [illegible] آخر میں [illegible] کیا تھا۔ چونکہ [illegible] تحریر اس
وقت پیش نظر نہیں ہے، اس لئے اس کے متعلق کچھ کہنے سے معذور
ہوں۔ پیش نظر نسخۂ دیوان میں پانچ قصیدے بھی ہیں۔ پانچویں قصیدہ
کے مطلع کے پہلے لفظ "مقتدر" پر گفتگو کرتے ہوئے حاشیے میں
مترجم محترم فرماتے ہیں:۔

"یہ قصیدہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی منقبت میں
ہے۔ مقتدر سے مراد خلیفہ ہے۔ یہ قصیدہ لفظی اور
معنوی نقائص کی وجہ سے الحاقی معلوم ہوتا ہے۔"
(حاشیہ صفحہ ۴۶۶)

میں قاضی سجاد صاحب سے متفق ہوں۔ سارا دیوانِ حافظ
بغور پڑھا جائے اور اس کے بعد اس قصیدے کو مطالعہ کیجئے اور
خود اندازہ کیجئے کہ دونوں میں کیا نسبت ہے؟

جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا۔ ادیبِ شہیر، طبیبِ لبیب حضرت
کوثر چاند پوری کا مقدمہ بھی بڑے مطالعہ کے بعد لکھا گیا ہے۔ مگر
مقدمہ کے مطالعہ سے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فاضل مقدمہ نگار
کسی اندرونی کشمکش کی حالت میں بعض مسائل پر اظہارِ خیال فرما
رہے ہیں۔ مثلاً حافظ کے اشعار میں جس شراب کے گن گائے گئے
ہیں، وہ شرابِ انگوری تھی یا شرابِ معرفت کی کشید کردہ [illegible] شراب۔
یا حافظ کی دربار داریاں یا تیمور و حافظ میں تبادلۂ خیالات یا
حافظ کے کلام میں ایہام وغیرہ [illegible] وغیرہ۔ مشکل یہ ہے کہ
تاریخ و تذکرہ کے عنوان سے ہمیں [illegible] کا جو سرمایہ ملتا ہے اس میں
تحقیق و تنقید سے کام لینے کی بجائے [illegible] یا عقیدت و نفرت یا
مختلف جذبات کے زیرِ اثر [illegible]
کام لیا گیا ہے۔ جیسا [illegible] روایت سے [illegible]
[illegible]

[illegible]

حقیقت لسانی [illegible] کی وجہ سے ناممکن تھا کہ اس سے قالب [illegible] کی طرف توجہ نہ کی جاتی۔ خوشی کی بات ہے کہ اس جلد کا حصہ ۱۹۹ غزلوں، ساحب صاحب نے ۳۰ نظموں اور کلام حمد و نعت اور قال کے عنوان سے کتاب کی داد دی ہے۔ قال نکالنے کے عام طریقے کے علاوہ نو جدولیں ترتیب دے کر فال کی چیستاں کو حل کرنے کا قاسم اقبال اصحاب کے لئے ایک دلچسپ دفالی نامہ کشا " مشغلہ ہم پہنچا رہا ہے۔"

۴۴۴ صفحات۔ قسم اول۔ ڈائی سے چھپا ہوا مطلا و رنگین پلاسٹک جلد والا۔ قسم دوم جلد پر چھپا ہوا سرورق مطلا و رنگین انعمولی سرورق نہایت خوبصورت چار رنگ کا۔ ابتدائی صفحات دو رنگ کے حاشیہ کے ساتھ۔ ہر صفحہ پر سیاہ خوبصورت حاشیہ کتاب پر قیمت کہیں درج نہیں ہے۔

ناشر: سب رنگ کتاب گھر دہلی ۶

(محمد طاں شہاب مالیر کوٹلوی بمبئی)

ریگِ رواں

از: ——— رشی پٹیالوی

چند سال پہلے رشی پٹیالوی کی قومی وطنی اور ہنگامہ خیز سیاسی نظموں کا ایک مجموعہ شائع ہوا تھا۔ نہ صرف شاعر کے تیمار فکر نے انہیں ان نظموں کی داد دی تھی، بلکہ عام طور پر اُن کی نظموں کو جذبے اور تعمیری رجحان کی وجہ سے سراہا گیا تھا۔

رشی کی شاعرانہ حیثیت سے اردو حلقے واقف ہیں۔ اُن کا کلام رسائل میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ اردو کے خوش فکر شعراء میں اُن کا شمار ہوتا ہے۔ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ لیکن اُن کی غزلوں کا کوئی بھرپور مجموعہ اب تک شائع نہیں ہوا تھا۔ اب "ریگِ رواں" کی اشاعت نے رشی پٹیالوی کی غزلیہ شاعری کے سرمایہ سے پوری طرح واقف ہونے کا موقع دیا ہے۔ ان غزلوں کو پڑھنے کے بعد قاری کو گوشن کے رنگ و سخن کا اندازہ ہوتا ہے [illegible] شامل ہے جو

[illegible] کے کلام [illegible] شاعری کے [illegible] سے مزاج انسانی ہم آہنگ ہے۔

[illegible] صاحب کے کلام کا بیشتر حصہ غزلوں یعنی عشقیہ شاعری پر مشتمل ہے۔ ان کی غزلوں میں اُن تمام عناصر کی پرچھائیاں ملتی ہیں جن کی نشو و نما سے وہ "رس جس" پیدا ہوتا ہے جس کے بغیر عشقیہ شاعری کا وجود میں آنا ممکن نہیں۔"

(انور بہار صاحب)

"واردات حسن و عشق و محبت غزل کی زبان میں جذبہ کی آنچ پا کر جس کیف و سرخوشی یا قدم قدم میں ڈھل جاتے ہیں اس کے کئی اچھے نمونے مجھے رشی پٹیالوی کے یہاں نظر آئے۔

رشی کے تغزل میں ایک طرح کی سادگی اور معصومیت کے علاوہ سنجیدگی ہے۔ جذبہ اور اظہار کا ان کا اپنا ڈھنگ ہے۔" (اعجاز صدیقی)

ہجر کی راتیں ہیں یا محشر کی گھڑیاں ہیں
سویا بھی نہیں جاتا جاگا بھی نہیں جاتا
گھٹ گھٹ کر بھی تو مرنے کے انداز نہیں آتے
رونے کی طرح ہم سے رویا بھی نہیں جاتا

نزدیک ہوں تو اور بھی بڑھتی ہیں دوریاں
قربت بھی فاصلہ ہے محبت کی راہ میں

لفظ لفظ رنگینی، ذکر ذکر دلچسپی
پھر بھی حجابات اُن کی ختم ہی نہیں ہوتی

چاند کو بھی دکھانے لگی آئینہ تیرا
اُن کے آنگن میں بکھری ہوئی چاندنی

یہ شعر [illegible]
[illegible]

شمی صاحب کے یہاں اس قدر جاذبیت اور گہرائی و گیرائی کی کمی مزید ... شاعری کے کلام میں فکر و تدبر کے ... سے پیدا ہوتی ہے تبصرہ نگار کو ان خیالات سے اتفاق نہیں ہے۔ یہ کمی ضرور ہے لیکن ایک سوال میں ... کرنے سے کچھ ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں جو ... کی ... مثلاً

خود پرستی بری نہیں، لیکن
کوئی آدمی شناس رہے

ستم زدوں کو سہارے تو مل ہی جاتے ہیں
ہر ایک شاخ مگر آشیاں نہیں ہوتی

ذوقِ پرواز بھی تو ہے لازم
بات بنتی نہیں بال و پر سے

رشمی تیاری کے اس نوع کے اشعار میں سادگی فکر کے ساتھ ایک طرح کی پرکاری ہے۔ یہ اگر بہت گہرے نہیں ہیں تو انہیں سطحی بھی نہیں کہا جا سکتا۔ رشمی جدت اور قدامت کی درمیانی کڑی ہیں۔ ان کے یہاں توازن ہے، جذبہ ہے اور فن کا احترام بھی۔

۱۸۴ صفحات، کتابت، طباعت، کاغذ اور سرورق معیاری۔ قیمت چھ روپے

ملنے کا پتہ:۔ رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج۔ دہلی ۶

(ادارہ)

آئندہ شمارے میں

اگست ۱۹۶۹ء

مقالات

ادب میں ابہام اور اس کے مسائل — ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید
آزاد غزل — ایک تجزیہ — ظہیر غازی پوری
مظفر آبادی کے ابتدائی ... — سید منظور الحسن برکاتی

کہانیاں

سوال نمبر ۵ کا جواب (آسامی کہانی) — سید عبد المالک
ترجمہ: محمد احمد علی شاہ
دیگ کا زنگ — انور قمر
شیشے کے پردے (ہندی کہانی) — راجندر اوستھی
ترجمہ: مسکین ... ایم اے
قطرہ قطرہ — غلام محمد زیدی

خاکہ

محبوب حسین جگر — ...

ملاقات

آسام کے مقبول ادیب سید عبد المالک سے ایک ملاقات — محمد احمد علی شاہ

نظمیں اور گیت

نازش پرتاب گڑھی — عما قاضی — رفعت نعیم — یوسف جمال
سطوت رسول — سحر کبیر پوری —

غزلیں

جاں نثار اختر — لال چند پرارتھی چاند — عروج زیدی
نصر قریشی — چندر پرکاش شاد — رشمی پیلی بھیتی —
کرشن کمار طور — اقبال ماہر — جمنا پرشاد راہی — حکیم منظور
ذکاء الدین شایاں — قاسم رضا — آذر بارہ بنکوی —
عقیل شاداب — گلشن ...

مکتبہ ... — ... — ...

... محفوظ کرا لیجیے

رفتار

(علمی ادبی اور تعلیمی خبریں)

▲ ڈاکٹر [illegible] حسن صدر شعبۂ [illegible] یونیورسٹی [illegible] کو [illegible] فیلوشپ کا اعزاز ملا ہے۔ ڈاکٹر [illegible] حسن دو سال تک دہلی میں رہ کر [illegible] صدی کے ادب اور سماج پر تحقیقی کام کریں گے۔ یہ اسکالر شپ [illegible] لوگوں کو بھی ملا ہے۔

▲ حکومت پنجاب، اُردو کی ترویج و ترقی کے لیے ۵ لاکھ روپے خرچ کرے گی۔ یہ بات وزیر مالیات مسٹر [illegible] نے فروغ اُردو کمیٹی کی بات چیت [illegible]۔ کمیٹی نے اس بات کی سفارش کی کہ پنجاب یونیورسٹی کے لنگویج ڈپارٹمنٹ میں اُردو کے لیے الگ سے جگہ نکالی جائے۔ ریاست میں اُردو اسکولوں کے قیام کے سلسلے میں انتظامات کے لیے ایک کمیٹی بھی بنا دی گئی ہے۔

▲ حکومت یو پی نے دارالمصنفین اعظم گڑھ اور جگر میموریل [illegible] سمیت پانچ تعلیمی اور ثقافتی اداروں کو ایک ایک لاکھ روپے کی امداد کا اعلان کیا ہے۔

▲ نئی دہلی۔ مرکزی وزارت تعلیم و سماجی بہبود نے اُردو کی ترویج و ترقی کے لیے ایک علیحدہ بیورو قائم کیا ہے۔ یہ نیا بیورو ترقی اُردو بورڈ کے سیکریٹریٹ کے طور پر کام کرے گا۔ اس بیورو کی طرف سے [illegible] کا ادب، جدید ترین معلومات فراہم کرنے والی سائنسی کتابیں، بچوں کی کتب، حوالہ جاتی کتب، انسائیکلوپیڈیا، نصاب کی بنیادی کتابیں شائع کی جائیں گی۔

▲ نئی دہلی۔ اُردو کے مفاد کو فروغ دینے کے لیے [illegible] کی ایک تشکیل دی گئی ہے۔ اس پارلیمانی اُردو کمیٹی کے [illegible] ممبر بن چکے ہیں۔ اور مزید کوششیں جاری ہیں۔ پارلیمانی اُردو کمیٹی [illegible] صدر پنڈت آنند نرائن ملا اور [illegible] مسٹر [illegible] اور [illegible] ہیں۔ [illegible] جناب ست پال [illegible] اور جناب محمد عثمان عارف بنائے گئے ہیں۔

▲ [illegible] ۱۲ [illegible]

[illegible]

[illegible] سے [illegible] میں [illegible] کی شرکت کی [illegible] یونیورسٹی [illegible] سے [illegible] اوقاف [illegible] ۱۲ [illegible] فرمایا۔ [illegible] اپنے اساتذہ کے صدر [illegible]

▲ حکومت آندھرا پردیش نے حیدرآباد کے جواں سال شاعر صلاح الدین نیر کمالی کے تیسرے مجموعۂ کلام "صنم تراش" کی اشاعت کے لیے ایک ہزار پانچسو روپے کی گرانٹ منظور کی ہے۔ "صنم تراش" میں منتخب غزلوں کے علاوہ موضوعاتی اور رومانی نظمیں بھی شامل ہیں۔ صلاح الدین نیر کا دوسرا مجموعۂ کلام "زعفران کے گلاب" بھی حکومت آندھرا پردیش کے تعاون سے شائع ہوا تھا۔ "نیر گیتا" کے نام سے [illegible] کا منظوم ترجمہ تلگو میں شائع ہو چکا ہے۔

▲ [illegible] اور مقبول شاعر حمید ناگپوری کا ۷۲ سال کی عمر میں ۱۷ جولائی گذشتہ کو انتقال ہو گیا۔ اُن کے جنازے میں ہندو اور مسلمان کثیر تعداد میں شریک تھے۔ حمید ناگپوری مرحوم کو ہندی اور مراٹھی حلقوں میں بھی مقبولیت حاصل تھی۔ وہ گذشتہ [illegible] سال سے [illegible] میں مبتلا تھے۔ انہیں چھ سو روپے سالانہ وظیفہ ملتا تھا۔

▲ ۱۵ اپریل ۷۳ء کو غالب اکاڈمی [illegible] میں مولانا علیم اختر مرحوم کی پہلی برسی منائی گئی اور انہیں ادیبوں اور شاعروں نے اپنا خراج عقیدت و محبت پیش کیا۔ "شام اختر" کے اس پروگرام کی صدارت جناب کوثر چاند پوری نے فرمائی اور افتتاح سپریم کورٹ آف انڈیا کے آنریبل جسٹس اے [illegible] نے فرمایا۔ انہوں نے کہا کہ اختر مرحوم نہ صرف ایک بلند پایہ صاحب طرز شاعر تھے بلکہ انسانیت کی اعلیٰ و ارفع قدروں کے حامل تھے۔ اُن کا کردار بڑا متاثر کن تھا۔ اُن کی خلوص بھری یادوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ جناب خوشتر گرامی ایڈیٹر بیسویں صدی نے بھی مولانا علیم اختر کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ [illegible] فرشتہ صفت [illegible] وہ [illegible] اور نیک طینت انسان تھے۔

[illegible]



ملک پرنٹر و پبلشر اعجاز صدیقی نے یونیورسل فائن لیتھو پریس ... شائع کیا۔

Publishing Dates. 15-16
Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No. 14402/57

علامہ سیماب اکبرآبادی

کی چند حیات افروز تصانیف

کلیم عجم	(غزلیات)	چار روپیہ آٹھ آنے
سدرۃ المنتہیٰ	(غزلیات)	چار روپیہ
کارِ امروز	(نظمیں)	چار روپیہ آٹھ آنے
شعرِ انقلاب	(نظمیں)	تین روپیہ
عالم آشوب	(رباعیات)	تین روپیہ
نفیرِ غم	(مراثی نظمیں اور سلام)	ایک روپیہ

جلدوں پر خوبصورت اور رنگین گردپوش

(مکمل سیٹ کی خریداری پر نصف محصول ڈاک معاف)

منیجر باشاعت، مکتبۂ قصرالادب پوسٹ بکس ۲۰۳۹ بمبئی ۸

Printed at SAYA ART PRINTERS

جنوری سنہ ۱۹۳۰

بانی علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

اردو کا چوالیس سالہ علمی ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

شاعر بمبئی

ستمبر-اکتوبر ۷۳ء

جلد نمبر-۴۴
شمارہ نمبر-۹-۱۰

مدیر
اعجاز صدیقی

معاونین
مہندر ناتھ
ڈاکٹر محمد حسن

مہتمم:-
ناظر نعمان صدیقی

اس شمارے میں

فون:- ۳۵۹۹۰۴

زرِ سالانہ ——— ۱۲ ——— روپے
معاونین ——— ۲۵ ——— روپے
تاعمر خریداری ——— ۱۲۵ ——— روپے
ممالک غیر سے ——— ۲۵ ——— شلنگ

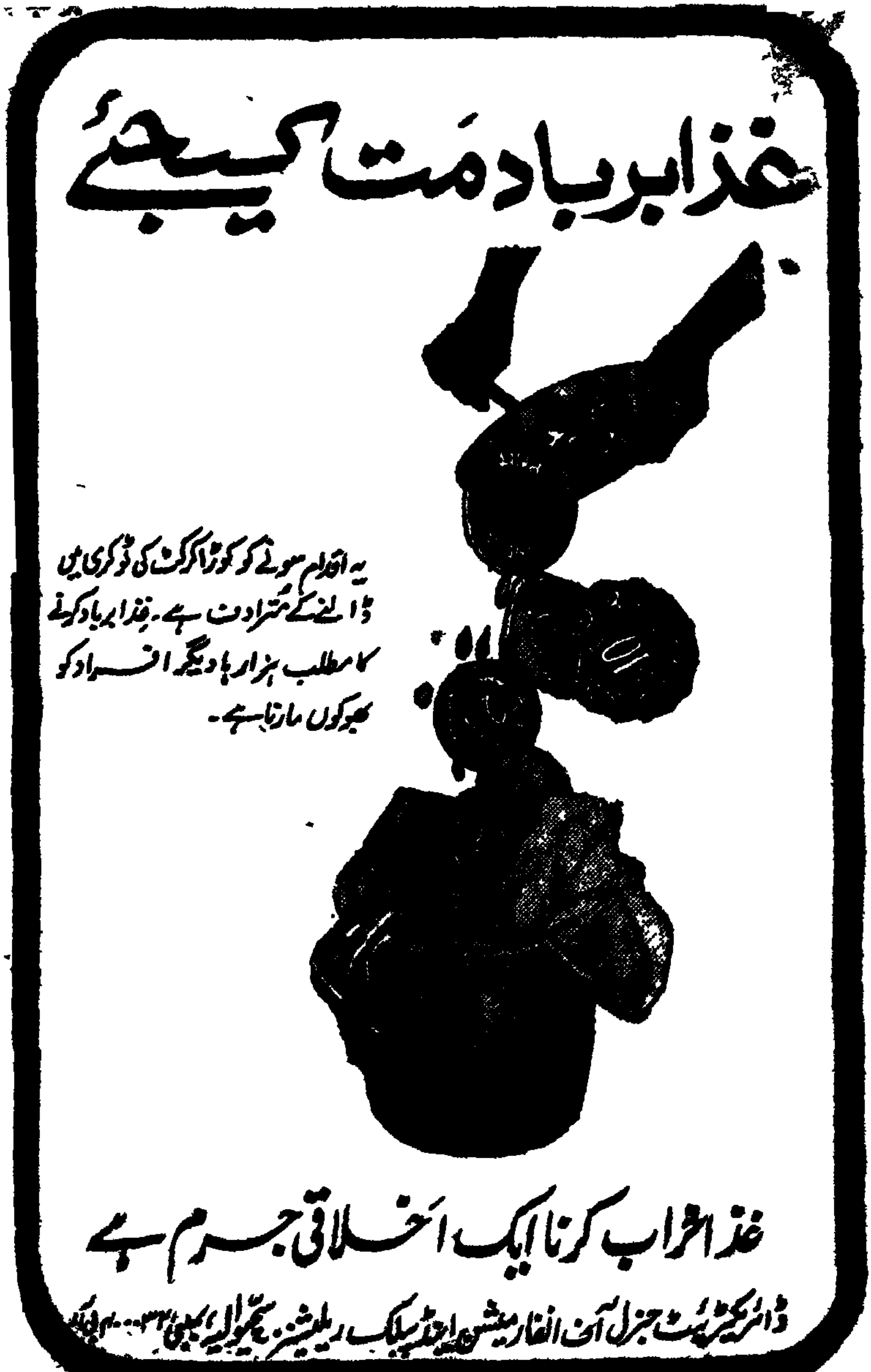
قیمت:- ایک روپیہ پچاس پیسے

——— ترسیلِ زر کا پتہ ———

ماہنامہ شاعر، قصر الادب، بمبئی ۴۰۰۰۰۸

خط و کتابت کا پتہ:-

ماہنامہ شاعر، مکتبہ قصر الادب، پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶


غذا برباد مت کیجئے
یہ اقدام ہونے کو کوڑا کرکٹ کی ٹوکری میں
ڈالنے کے مترادف ہے۔ غذا برباد کرنے
کا مطلب ہزارہا دیگر افراد کو
بھوکوں مارنا ہے۔
غذا خراب کرنا ایک اخلاقی جرم ہے
ڈائرکٹریٹ جنرل آف انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز سچیوالیہ بمبئی ۴۰۰۰۳۲

ترتیب

شاعر بمبئی
ستمبر اکتوبر ۱۹۷۳ء

غیر مسلم اُردو ادیبوں کی کانفرنس کا مطالبہ

لکھنؤ ـــ ۱۷ر نومبر ۱۹۸۶ء کو آل انڈیا غیر مسلم اُردو ادیبوں کی کانفرنس میں مندوبین کے اجلاس میں مطالبہ کیا گیا کہ مُلک کی اُن تمام ریاستوں میں اردو کو دوسری زبان کا درجہ دیا جائے جہاں سرکاری زبان ہندی ہے۔

اِس اجلاس میں مرکزی حکومت سے یہ بھی کہا گیا کہ وہ ہندی بولنے والی ریاستوں میں ثانوی اسکولوں کی کلاسوں تک اردو کو لازمی زبان قرار دینے کا اعلان کرے۔

اس سلسلہ میں ایک قرارداد ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے پیش کی جس کی تائید مسٹر بلراج کومل نے کی۔ جس میں مرکزی حکومت سے کہا گیا کہ وہ اُن تمام ریاستوں کے نام ظاہر کرے جہاں اُردو سرکاری زبان نہیں ہے۔ لیکن وہاں اُردو بولنے والے افراد کی کافی تعداد موجود ہے۔ اور جن علاقوں میں بھی اچھی تعداد میں طلباء ہوں وہاں حکومت کو اُردو زبان میں تعلیم کے انتظامات کرنے چاہئیں۔

غیر مسلم اُردو ادیبوں کی اس کانفرنس میں ایک اور قرارداد منظور کی گئی جس میں مرکزی حکومت اور ریاستی حکومتوں پر زور دیا گیا ہے کہ وہ ہندی بولنے والی ریاستوں میں سرکاری افسروں یا سرکاری ملازمین کی حیثیت سے صرف ایسے افراد کا تقرر کریں جنہوں نے میٹرک یا ہائر سیکنڈری تک اردو کا مطالعہ کیا ہو۔

مرکزی حکومت سے اجلاس میں یہ بھی مطالبہ کیا گیا کہ مرکزی انتظام کے علاقہ چنڈی گڑھ کے تمام اسکولوں اور کالجوں میں اُردو کی تعلیم لازمی قرار دے۔ وہاں کی حکومت نے اردو کو علاقائی زبان کا درجہ پہلے سے دے رکھا ہے۔

ایک دوسری قرارداد میں کہا گیا ہے کہ اُردو صرف اقلیتی فرقہ کی یا کسی ایک خطہ کے رہنے والے افراد کی زبان نہیں ہے۔ قرارداد میں تمام سیاسی جماعتوں سے اپیل کی گئی ہے کہ اُردو کو کسی خاص فرقے سے منسوب و منسلک نہ کریں اور معاشرے میں اُس کے جائز کردار میں مدد بہم پہونچائیں۔

غیر مسلم ادیبوں کی اس کانفرنس میں ایک اور قرارداد میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ آل انڈیا ریڈیو اور ٹیلی ویژن اپنے اُردو پروگراموں میں اضافہ کریں۔

مندوبین سے خطاب کرتے ہوئے مسٹر آنند نرائن مُلّا نے کہا کہ اُردو کے لئے جدوجہد کی خاطر اردو کے تمام غیر مسلم ادیبوں اور شاعروں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کا ان کا خواب پورا ہوا ہے انہوں نے کہا کہ صرف ہماری جدوجہد سے ہی اُردو کو اُس کا جائز مقام مل سکتا ہے۔ مسٹر مُلّا نے کہا کہ اُردو کی ترقی کیلئے فضا اب بہتر ہو گئی ہے۔ اب یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم حکومت کو راضی کریں کہ وہ اردو کے لئے ہمارے مطالبات کو قبول کرے۔ انہوں نے کہا کہ سرکاری عہدوں کے لئے امیدواروں کا انتخاب کرتے وقت اردو کی صلاحیت لازمی قرار دی جائے۔

کم و بیش دو سو سال کی تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ اُردو کسی ایک قوم یا فرقے کی زبان نہیں ہے۔ زبانوں کے ساتھ فرقوں اور قوموں کی بات فرقہ پرست ہی کرتے ہیں۔ بہرحال غیر مسلم اُردو ادیبوں کی حالیہ کانفرنس نے فرقہ پرستوں کے دماغ میں پھر ایک کیل ٹھونک دی اور بڑی تعداد میں جمع ہو کر اُردو کے حقوق کی بازیافت کے لئے ایک بھرپور نعرہ بلند کیا۔ مطالبات پیش کئے اور کئی ایسی اہم قراردادیں منظور کیں جو اساسی حیثیت رکھتی ہیں اور اب سے پہلے بھی کئی بار انہیں منظور کیا اور دہرایا جا چکا ہے۔ لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔

اردو کے مسلم ادیب ہوں یا غیر مسلم، اُردو کے سلسلے میں سب کا موقف ایک ہی ہے۔ لکھنؤ کانفرنس میں بھی مسلم اور غیر مسلم دونوں فرقوں کے ادیب اور دانشور جمع ہوئے تھے۔ فرق اتنا تھا کہ کارگذار صرف غیر مسلم ادیب تھے۔ اگر اس موقع پر ان کی طرف سے کسی سخت احتجاجی رویئے کا اظہار ہو جاتا، ایک ACTION COMMITEE بن جاتی تو بہت اچھا ہوتا۔ مرکزی و ریاستی سرکاروں کو الٹی میٹم دے دیا جاتا کہ اتنی مدت میں اگر ہمارے مطالبات پورے نہ ہوئے تو سخت اقدامات کئے جائیں گے۔ کم از کم اتنا ہی اعلان کر دیا جاتا کہ جن ریاستوں سے مطالبات کا تعلق ہے، اگر اُن کی طرف سے مطالبات پورے نہ کئے گئے تو ان ریاستوں کے اردو داں آئندہ انتخاب میں حکمراں جماعت کے نمائندوں کو ووٹ نہیں دیں گے۔ لیکن افسوس کہ ایسی کوئی قرارداد منظور نہیں کی گئی۔

سجاد ظہیر (مرحوم)

کرشن چندر

بنے بھائی صرف دوستوں کے دوست ہی نہیں تھے۔ وہ اپنے دشمنوں کے بھی دوست تھے۔ ان کے آدرش سے فلسفۂ زندگی سے بہت سوں کو انکار ہوگا۔ اُن کی ذاتی شرافت نیک نفسی وضعداری اور خوش مذاقی سے اُن کے بدترین دشمن بھی انکار نہیں کرسکتے۔ خوش قسمتی سے ان کے دشمن بہت کم تھے۔ اُن کے آئیڈیل سے اختلاف رکھنے کے باوجود اُن کے چاہنے والے ہر طبقے میں پائے جاتے تھے۔ ثبوت میں صرف ایک مثال کافی ہے۔ جن دنوں بنے بھائی پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری تھے اور اُن پر سازش کا الزام لگا کر انہیں گرفتار کرنے کی کوشش کی گئی تھی وہ روپوش ہوگئے تھے۔ پولیس انہیں چاروں طرف ڈھونڈ رہی تھی اور وہ خود ایک ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل آف پولیس کے ہاں پناہ لیے ہوئے تھے۔ پولیس ڈھونڈے اور خود پولیس ہی انہیں پناہ دے ایسا قصہ تو میں نے زندگی میں کبھی نہیں سنا۔

بنے بھائی کے چہرے پر ہر وقت ایک من موہنی مسکراہٹ چھائی رہتی تھی۔ میں نے انہیں کبھی خفا ہوتے نہیں دیکھا۔ کبھی کسی پر برہم ہوتے نہیں دیکھا۔ میری اور اُن کی دوستی ۲۵ برس پرانی تھی۔ اس عرصے میں بیس بار دوستیاں ٹوٹتی ہیں اور ٹوٹ کر پھر سنور جاتی ہیں مگر ان ۲۵ برسوں میں ایک بار بھی تو میں نے بنے بھائی کو خفا ہوتے نہیں دیکھا۔ ایسا تو نہیں ہے کہ خفا ہونے کے مقام ان کی یا میری زندگی میں نہیں آئے۔ زندگی میں اتنی بے انصافی ہے اتنی نابرابری ہے اتنا ظلم ہے اتنی غریبی ہے اتنی کمینگی ہے کہ کبھی کبھی دل شعلے کی طرح بھڑک کر جل جانے کو چاہتا ہے۔ اس غلاظت اور تنگ نظری کے درمیان بھی وہ کس طرح اپنا تبسم استوار کرسکتے تھے۔ یہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ انہیں اپنے آدرش کی سچائی پر کس قدر یقین تھا۔ خفا تو صرف وہ لوگ ہوتے ہیں جن کا کوئی یقین نہیں ہوتا اور جنہیں اپنے ایمان میں سوشگاف نظر آتے ہیں۔

ہم سوچتے تھے کہ اُن کا متبسم چہرہ ہمیشہ ہمارے درمیان پھول کی طرح کھلتا رہے گا۔ کسے معلوم تھا کہ یہ شریف النفس معصوم انسان خوبصورتی، حسن اور خوش سلیقگی سے عشق کرنے والا ادیب، ترقی پسندوں کا امام ایک دن ہمیں یوں اکیلا چھوڑ جائے گا۔ بڑے لوگ تو ہر برس پیدا ہوتے رہتے ہیں لیکن سجاد ظہیر جیسا غیر معمولی انسان صدیوں میں بھی بڑی مشکل سے پیدا ہوتا ہے۔

سردار جعفری

فیض نے بہت صحیح بات کہی ہے کہ وہ لوگ بدقسمت ہیں جو سجاد ظہیر کے دوست تھے کیونکہ وہ اتنے اچھے دوست سے محروم ہوگئے اور وہ لوگ بھی بدقسمت ہیں جو سجاد ظہیر کے دوست نہیں تھے کیونکہ وہ ایک نہایت خوبصورت انسان کی محبت سے محروم رہے۔

سجاد ظہیر کی شخصیت میں جتنی دلنوازی تھی اتنی ہی پیچیدگی اور تہہ داری تھی۔ پہلی نظر میں یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ اس شخصیت میں لطافت اور صلابت کا عجیب و غریب امتزاج ہے۔ لکھنؤ کے ایک نہایت مہذب اور امیر گھرانے میں پیدا ہونے اور انگلستان میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد سجاد ظہیر نے اپنے لیے مفلسی کی زندگی کا انتخاب کیا اور اپنی ساری صلاحیتیں مظلوموں کی حمایت کے لیے وقف کردیں۔ خاندان کی روایت اور لکھنؤ اور انگلستان کی تہذیب نے اُن کو نرمی دی تھی اور عوام کی خدمت گذاری کے جذبے نے ایک ایسی قوت جس کا مقابلہ استبداد کی بدترین طاقتیں نہیں کرسکتی تھیں۔ پاکستان کی جیلوں میں انہوں نے جس طرح پانچ سال گذارے وہ حیران کن ہیں۔ سرکاری وکیل نے پانچ بار موت کی سزا کا مطالبہ کیا۔ لیکن سجاد ظہیر پر ذرا سا بھی خوف طاری نہیں ہوا۔ بلکہ موت کے سائے میں بیٹھ کر وہ اپنی یاد

میں نے دستِ صبا [illegible] پر کتابیں لکھتے تھے ۔ اس سارے دور کو فیض نے ایک شعر میں سمیٹ لیا ہے ؎

تمھارے عشق کو دار و رسن پہنچ نہ سکے ۔۔۔ تو لوٹ آئے ترے سربلند کیا کرتے

سجاد ظہیر میں جرأت انکار بھی تھی اور جرأت گفتار بھی ۔ اس پر اُن کی طالب علمی کے زمانے کے دو واقعات شاہد ہیں ۔ ایک بار آکسفورڈ میں مشہور برطانوی ڈرامانویس برنارڈ شا نے تقریر کی ۔ برنارڈ شا کے رعب کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے لوگ بات کرتے ہوئے گھبراتے تھے لیکن سجاد ظہیر نے کسی جھجک کے بغیر کہا " مسٹر شا آپ کی فلاں بات تو بالکل غلط تھی " اور سننے والے حیران رہ گئے کہ یہ کون برنارڈ شا کو ٹوکنے کی ہمت کر رہا ہے ۔ ایسا ہی ایک واقعہ لندن میں پیش آیا جہاں سجاد ظہیر نے ٹیگور سے یہ سوال کیا کہ اس وقت جب مہاتما گاندھی آزادی کے لئے ستیہ گرہ کر رہے ہیں تو آپ کو ہندوستان میں گاندھی جی کے ساتھ ہونا چاہیے تھا ۔ آپ انگلستان میں کیا کر رہے ہیں ۔

میں نے ۳۰ سال کی رفاقت اور دوستی میں سجاد ظہیر کی طبیعت کی مختلف کیفیتیں دیکھی ہیں ۔ ذاتی معاملات میں بڑا صبر و تحمل تھا لیکن جہاں اصول کی بات آجاتی تھی وہاں کوئی سمجھوتہ ان کے لئے قابلِ قبول نہیں تھا ۔ یہ بات خود بخود میرے دو شعروں میں نظم ہوگئی جو میں نے اُن کے جنازے کے دن ریڈیو سے پڑھے تھے ؎

اے صبا، اک گل مری جانب سے اُس دل کیلئے ۔۔۔ جس کی دھڑکن میں چھپا تھا نغمۂ عالم کا دل
دشمنوں کے واسطے جو آہن و فولاد تھا ۔۔۔ دوستوں کے واسطے تھا قطرۂ شبنم کا دل

مختلف قسم کی کیفیتیں دیکھنے کے بعد بھی جو تاثر باقی رہ گیا ہے وہ ایک نرم اور لطیف شخصیت کا تصور ہے ۔ اُن کی نرم آواز، دھیما لہجہ اور رک رک کر بات کرنے کا انداز ہمیشہ یاد رہے گا ۔

اعجاز صدیقی

بات بہت پرانی ہے غالباً ۱۹۴۱ء کی ۔ آگرہ کالج میں انگریزی کے ایک نوجوان پروفیسر تھے ۔ لانبا قد، چھریرا بدن، کھلتا ہوا رنگ، بڑے شائستہ اور مہذب ۔ بظاہر پُرسکون لیکن یہ باطن سمندر کی اندرونی سطح کی سی ہلچل ۔ یہ تھے احمد علی ۔ گاہ بہ گاہ ملاقات بھی ہو جاتی تھی ۔ اردو ادب سے لگاؤ تھا لکھتے بھی تھے ۔۔۔ کچھ دن بعد معلوم ہوا کہ اُن کی مرتبہ افسانوں کی ایک کتاب " انگارے " ضبط کرلی گئی ہے ۔ اُس میں باغیانہ خیالات کے افسانے تھے ۔ " انگارے " کی ضبطی سے جہاں احمد علی کا نام ابھر کر آیا وہیں ایک نام سجاد ظہیر کا بھی تھا ۔ اس میں شامل ان کے افسانے سب سے زیادہ گرم اور باغیانہ تھے ۔

ہندوستان ایک زبردست سیاسی بحران سے دوچار تھا ۔ آزادی کی تحریک شدت اختیار کرچکی تھی ۔ دوسری جنگِ عظیم کا نقارہ بج چکا تھا ۔ انگریزوں کی سیاسی بازیگری کا بازار گرم تھا ۔ مارکس اور لینن کے نظریات و خیالات اور کمیونزم کی تحریک کا پھیلاؤ ہو رہا تھا ۔ سجاد ظہیر سر وزیر حسن (چیف جسٹس اودھ) کے لڑکے تھے ۔ ایک نہایت خوشحال، با اقتدار اور ممتاز خاندان کے چشم و چراغ ۔ انگلستان میں بیرسٹری کی تعلیم حاصل کی ۔ جج یا کوئی بڑے افسر بن سکتے تھے مگر ان باتوں سے قطع نظر والدین کے منشا کے خلاف اور اپنی افتادِ طبع کے مطابق وہ عملی سیاست میں کود پڑے ۔ کمیونزم سے ان کا لگاؤ گہرا ہوتا گیا اور یہ اُن کے سیاسی نظریہ کی سب سے بڑی فتح تھی کہ انکی موت بھی اُسی ملک کی حدود میں واقع ہوئی جہاں سے ان کے سیاسی افکار و خیالات کو روشنی ملی تھی ۔

سجاد ظہیر مرحوم کی پوری زندگی ایک مجاہد کی زندگی تھی ۔ اُن کا سوانح نگار اُن کی زندگی کے کسی ایک لمحے کو بھی رائیگاں قرار نہ دے سکے گا ۔ وہ آدرش وادی تھے ۔ مقصد کے لئے جئے اور مقصد ہی کے لئے مرے ۔ اُنہوں نے بار بار قید و بند کی صعوبتیں سہیں اور پاکستان میں گرفتاری کے بعد تو تختۂ دار تک پہنچ جانے کی نوبت آگئی ۔ اُن کے اندر ایک اچھا ادیب چھپا ہوا تھا ۔ اگر وہ خود کو عملی سیاست

[illegible] اور صحافت کے لئے وقف نہ کر دیتے تو یا تو کسی منسٹری میں ہوتے یا پھر اُردو کے بہت بڑے ادیب۔ [illegible] علاوہ انہوں نے اپنی تحریروں سے ادبی حلقوں کو متاثر کیا۔ وہ افسانہ نویس، ڈراما نگار اور ایک حد تک نقاد بھی تھے۔ انہوں نے نثر میں شاعری کی۔ مجموعی حیثیت سے وہ ایک باشعور ادیب تھے۔ کئی زبانوں پر انہیں عبور حاصل تھا۔ نثر بڑی شگفتہ لکھتے تھے۔ بہت اچھے مترجم تھے۔ لندن کی ایک رات۔ روشنائی۔ اور ذکر حافظ سے اُن کی ادیبانہ صلاحیت اور انفرادیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ "اخبار حیات" کے اداریے اور مضامین بھی اُن کی ادبی و سیاسی شخصیت سے روشناس کرانے کے لئے کافی ہیں۔ اُن کی شخصیت میں ادب اور سیاست کا ایک متوازن امتزاج تھا۔ دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنا ممکن نہیں۔ مرحوم کیمونسٹ پارٹی کے رہنماؤں میں سے تو ایک تھے ہی لیکن وہ ادب میں ترقی پسند تحریک کے بانی اور رہنما بھی تھے۔ انہوں نے ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کا ایک بڑا گروہ بنایا۔ اُن کی قیادت میں اس تحریک نے زبردست مقبولیت حاصل کی۔ اُردو شعر و ادب کا مزاج بدلا۔ نئے لکھنے والوں کا سیاسی اور سماجی شعور بیدار ہوا۔ ادب میں حقیقت پسندی اور دھرتی حیثیت آئی۔ ادب برائے زندگی کا نظریہ عام ہوا۔ نئے اسالیب پیدا ہوئے۔ صحت مند قدروں کو اپنانے کا رجحان بڑھا۔ ترقی پسند تحریک نے کئی قد آور شخصیتیں پیدا کیں اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ یہ تحریک ایک جگہ آکر رک گئی۔ مگر سجاد ظہیر مرحوم کے قدم نہ رکے۔ انہوں نے ملک کی دوسری زبانوں کے لکھنے والوں میں بھی اس تحریک کو پھیلایا اور سب زبانوں کے ترقی پسند مصنفین کو ایک پلیٹ فارم پر لا کر جمع کر دیا۔ اُن کی ایک تنہا ذات تھی جو ہمیشہ اس تحریک کے لئے مشعل راہ بنی رہی۔ افرو ایشیائی ادیبوں کی تنظیم سے بھی انہیں بڑی دلچسپی تھی۔ وہ قزاقستان کے صدر مقام الما آتا میں افرو ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس میں شرکت کے لئے ہی گئے تھے اور وہیں ۶۸ سال کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

آگرہ سے جب "شاعر" نکلتا تھا تو کبھی کبھی سجاد ظہیر سے خط و کتابت ہو جاتی تھی۔ لیکن اب سے ۲۴ سال پہلے جب میں بمبئی ہجرت کر کے آیا اور یہاں کے ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں سے تعلقات اور گہرے ہوئے تو انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسوں میں شرکت ہونے لگی۔ مہندر ناتھ سکریٹری تھے۔ سردار جعفری کی پہلی قیام گاہ پر ہر مہینے نشست ہوتی تھی۔ سال میں ایک آدھ بار سجاد ظہیر بھی آتے تھے۔ نجی گفتگو ہو یا بحث میں حصہ لیں، معلوم ہوتا تھا کہ ایک نہایت شریف، با اخلاق، ملنسار اور صبر و تحمل والا انسان بول رہا ہے۔ نہ کوئی گھن گرج، نہ غصہ۔ بس ایک دلنوازی تہذیبی رچاؤ اور منکسر المزاجی۔

عصمت چغتائی کے مکان پہ ترقی پسند مصنفین کا جلسہ تھا۔ کسی قرارداد یا منشور کا انگریزی سے اُردو میں ترجمہ ہونا تھا۔ مجھے اور باقر مہدی کو اپنے ساتھ کمرے میں لے گئے۔ باہمی مشورے سے اُس کا ترجمہ ہوا۔ ایک انگریزی لفظ کا اچھا متبادل نہیں مل رہا تھا۔ میں نے کچھ دیر کے تامل کے بعد اُردو لفظ بتایا تو بہت خوش ہوئے۔ بمبئی اور بمبئی سے باہر کے جلسوں اور کانفرنسوں میں اُن سے اکثر ملاقات ہو جاتی تھی۔ سرسری طور پہ نہیں بلکہ تفصیل کے ساتھ سب کچھ پوچھتے تھے۔ محبت اور خلوص کا اظہار کرتے تھے۔ گذشتہ چند سال میں چند اختلافی باتوں کی وجہ سے مجھ میں اور اُن میں کچھ بُعد سا پیدا ہو گیا تھا۔ نہ وہ مجھے "حیات" بھیجتے تھے اور نہ میں انہیں "شاعر"۔ مگر ملاقاتوں میں کبھی کسی تلخی کا اظہار نہ میری طرف سے ہوا اور نہ ان کی طرف سے۔

جہاں سجاد ظہیر میں بے اندازہ خوبیاں تھیں، بے پناہ عمل جذبہ تھا وہیں میرے دل میں اُن کی قدر و منزلت اس لئے اور بھی زیادہ تھی کہ وہ اُردو کے ساتھ کی جانے والی حق تلفیوں کے خلاف آواز بلند کرتے رہتے تھے۔ اُردو رسم الخط کے سلسلے میں اُن کے اور رضیہ سجاد ظہیر کے خیالات میں کافی اختلاف تھا۔ وہ اُردو کے رسم الخط کو قائم رکھنے پر بار بار اصرار کرتے رہے اور مخالفین کو مدلل جوابات دیتے رہے۔ مرکزی انجمن ترقی اُردو کے رکن تھے اور اُردو کے سچے پرستار و رہنما۔

اب کہاں لوگ اس طبیعت کے۔!

[illegible]

پاسے اُردو زبان کی بدقسمتی ہی سمجھئے کہ اِس زبان کے بڑے بڑے سُتون جلدی جلدی نظروں سے اوجھل ہوتے جا رہے ہیں۔ ابھی تک مخدوم اور سید احتشام حسین کی جدائی کے زخم مندمل نہیں ہوئے تھے اچانک یہ روح فرسا خبر ملی کہ سجاد ظہیر چل بسے۔

صرف سجاد ظہیر ہی ہم سے جدا نہیں ہوئے بلکہ ترقی پسند تحریک کا ایک زرّیں دَور کا اختتام ہوا۔ وہ صبح تو نہ آئی جس کا ہمیں انتظار تھا مگر وہ تاریک رات ضرور آ گئی جس کا ہمیں انتظار نہیں تھا۔

وہ راہنما رُک گیا جس کی ٹھنڈی چھاؤں تلے بڑے سے بڑا ادیب بیٹھتا تھا اور سجاد ظہیر کی شیریں اور نرم آواز سے لطف اندوز ہوتا تھا۔

سجاد ظہیر کی شخصیت بڑی دلکش اور دلنشین تھی۔ فراخ پیشانی، معصوم اور پیارا چہرہ چھوٹی چھوٹی سی ذہین آنکھیں، گورا رنگ، موٹے موٹے سے ہونٹ، اونچا اور بھاری جسم۔

اپنی شیریں گفتگو سے دشمنوں کو بھی اپنا بنا لیتے۔ دوست یار چھوٹے بڑے پیار سے اُنھیں بنّے بھائی کہہ کر پکارتے تھے۔ شیریں اور دھیمی آواز میں گفتگو کرنا، ہمیشہ مُسکراتے رہنا۔ یہ اُن کے مزاج کی خصوصیت تھی۔ میں نے اُنھیں کبھی خفا ہوتے نہیں دیکھا خواہ افسانہ ہو، چاہے شامِ غزل ہو۔ یا کوئی ادبی جلسہ ہو، اُنھوں نے ادب اور احترام کے دامن کو کبھی نہ چھوڑا، ہمیشہ بچھڑوں کو ملاتے دیکھا، جو روتے تھے اُنھیں ہنساتے دیکھا اور ادب کے محاذ پر مردِ مجاہد کی طرح لڑتے ہوئے دیکھا۔

سجاد ظہیر ترقی پسند تحریک کے رُوحِ رَواں تھے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ وہی اِس تحریک کے جنم داتا تھے، وہی اِسے پروان چڑھانے والے تھے تو یہ غلط بیانی نہ ہوگی۔ اُردو زبان میں ترقی پسند قدروں کو لانا اور ترقی پسند ادیبوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا سجاد ظہیر کا کارنامہ تھا ——— اُنھوں نے صرف اُردو زبان کے ترقی پسند ادیبوں کو یکجا نہیں کیا بلکہ ہندوستان کی دیگر زبانوں کے ترقی پسند ادیبوں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کیا اور اِس تحریک کا رشتہ ناطہ بین الاقوامی ادب اور ادیبوں سے جوڑا۔ اور اِس بات کا احساس دِلایا کہ ادب ایک قوم کا سرمایہ نہیں ہوتا بلکہ اچھا ادب ساری دنیا کے عوام کی ملکیت ہوتا ہے۔

یہ سجاد ظہیر کی شخصیت، اُن کی محنت، اُن کی فراست اور اُن کے ذوقِ جمال کا اثر تھا کہ اُردو اور دیگر زبانوں کے تمام ترقی پسند ادیب ایک ہی لڑی میں پروئے گئے۔ کشمیر سے لیکر راس کماری تک ترقی پسند تحریک کے چرچے ہونے لگے۔ سجاد ظہیر کے اِس کارنامے کو کوئی فراموش نہیں کر سکتا۔

سجاد ظہیر صرف بڑے آدمیوں کی عزت نہیں کرتے تھے بلکہ نئے اور اُبھرتے ہوئے شاعروں اور افسانہ نگاروں سے بڑے پیار اور احترام سے پیش آتے۔ اُنھوں نے ترقی پسند ادب کو ایک خانے میں بند نہیں کیا بلکہ اسے آسمان کی سی وسعت عطا کی اور سمندر کی طرح وسیع اور گہرا کیا۔ اگر سجاد ظہیر کرشن چندر کے افسانوں کو پڑھ کر جھوم جاتے تھے، تو اُنھیں بیدی بھی اُتنے ہی عزیز تھے، اگر وہ علی سردار جعفری، کیفی، مخدوم، ساحر، نیاز حیدر، جاں نثار اختر کی شاعری کے گرویدہ تھے، تو فراق اور جگر کے پرستاروں میں سے تھے۔ اِسی سے اُن کے ذوقِ جمال اور وسیع القلبی کا پتہ چلتا ہے۔ اِسی لئے بڑا سے بڑا ادیب اور شاعر اور چھوٹے سے چھوٹا ادیب اور شاعر اُن سے پیار کرتا تھا۔

سجاد ظہیر نے جو کچھ کہا ترقی پسند ادیبوں نے اُسے حرفِ آخر کہا، زندگی میں اتنی عزت کس کو ملتی ہے۔ اور سجاد ظہیر واقعی اِس عزت اور احترام کے مستحق تھے۔

سجاد ظہیر ادب اور سیاست کے سنگم پر کھڑے تھے، وہ کمیونسٹ پارٹی کے اہم رکن تھے اور کمیونسٹ پارٹی کے حکم پر پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی کو آرگنائز کرنے گئے، پھر وہیں گرفتار ہوئے، یہ اُن کی خوش قسمتی سمجھئے، کہ تختۂ دار پر لٹکنے سے بچ گئے۔ وطن ۔

وہیں شہید ہو جاتے۔

اس سرزمین کے علاوہ جہاں تک اُن کی ادبی کاوشوں کا تعلق ہے وہ اپنی جگہ پر سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ کتاب "انگارے" اُردو ادب پر ایٹم بم جیسا گری، پرانی روایات کو تہس نہس کر کے ایک نئے افسانوی ادب کا آغاز کیا۔ "لندن کی ایک رات" ایک ناقابلِ فراموش تخلیق ہے۔ یہ چھوٹا سا ناول بڑے بڑے ناولوں پر بھاری ہے۔ اسی طرح "روشنائی" تنقیدی ادب میں ایک نمایاں اضافہ ہے۔ "پگھلا نیلم" جو اُن کی آزاد نظموں کا مجموعہ ہے اور جس سے اُن کے ذہنی احساسات، خیالات، جذبات، نظریات اور تصورات کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے علاوہ اُن کے خطوط، تقریریں، مقالے اس بات کا ثبوت ہیں کہ اگر وہ ترقی پسند تحریک کے سب سے بڑے راہنما تھے تو ادب کے میدان میں اُن کا قد چھوٹا نہ تھا، بلکہ بہتوں سے بڑا تھا۔

ایک اور اہم بات جس کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ زیادہ تر لوگ چاہے وہ ادیب ہوں یا سیاست داں، وہ صرف اپنی ذات کے لئے جیتے ہیں اور اپنی ذات کے لئے سب کچھ کرتے ہیں، اپنی ذات کو نمایاں کرنے کے لئے۔ اپنے اردگرد چراغ روشن کرتے ہیں۔ اور دوسرے چراغوں کو بجھانے کی کوشش میں اپنی زندگیاں صرف کرتے ہیں۔ لیکن سجاد ظہیر ایسے کیوں نہیں کبھی کھڑے نہیں ہوئے۔ وہ چاہتے تو دوسرے کے لئے، اگر وہ چاہتے، تو کمیونسٹ پارٹی کو چھوڑ کر کانگریس میں شریک ہو سکتے تھے۔ جواہر لال جی، اور کانگریس کے دیگر رہنماؤں سے اُن کے اچھے خاصے مراسم تھے اور خود بھی ایک با اثر باوقار خاندان کے چشم و چراغ تھے، وہ بڑی آسانی سے کانگریس کے جھنڈے تلے وزیر بن سکتے تھے۔ مگر سجاد ظہیر نے ایسا نہیں کیا۔ جس مقصد یا نصب العین کو سینے سے لگایا اُسی کیلئے جیتا اور مرے بھی۔ عوام کی بہتری کے لئے مرنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔

سجاد ظہیر چاہتے تو اپنے لئے پدم شری، ہزو ایوارڈ یا لینن پرائز بڑی آسانی سے لے سکتے تھے۔ اُنہوں نے ہمیشہ دوسروں کو یہ ایوارڈ دلائے، اپنی ذات کیلئے کچھ نہ مانگا۔ کہاں ہیں اس قسم کے بے غرض ادیب اور رہنما؟ چراغ لے کر ڈھونڈھیے، ایک بھی نہیں ملے گا۔

جب کبھی بمبئی آتے، مجھ سے ضرور ملتے، اور پوچھتے، "ترقی پسند انجمن کی میٹنگ ہوتی ہے؟ کون آتا ہے؟ کون کیا لکھ رہا ہے؟ بھئی اگر بڑے ادیب نہیں آتے ہیں تو نہ آئیں، چھوٹوں کو بلاؤ۔ یہی چھوٹے ایک دن بڑے بنیں گے۔ جہندر۔ مجھے کار نہیں چاہئے، بس میں چلیں گے، بس نہیں ملے گی تو پیدل چلیں گے۔ تم میٹنگ تو بلاؤ۔ میں اپنے ساتھیوں سے ملنا چاہتا ہوں، بڑوں سے چھوٹوں سے۔ میرے لئے سب ایک ہیں" ادب اور ادیبوں سے شاید ہی کوئی اتنی محبت کر سکے۔

سجاد ظہیر اپنے خلوص اور پیار سے سب کو اپنا بنا لیتے۔ جب کبھی کسی شب افسانہ یا شامِ غزل میں شرکت کی جب شاعروں اور افسانہ نگاروں کو داد ملتی، تو اُن کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگتیں، یوں لگتا، یہ داد اُنہی کو مل رہی ہے۔ یہ قافلہ اُن کا ہے اور وہ اِس قافلے کے سپہ سالار ہیں۔

سجاد ظہیر کی موت نے صرف ہندوستان کے سیاسی اور ادبی فضا میں ایک خلا ہی پیدا نہیں کیا بلکہ بین الاقوامی ترقی پسند تحریک کے ایک بہت بڑے راہ نما کو ہم سے چھین لیا۔ وہ راہنما، بیک وقت، ایک ساتھی، ایک دوست، ایک دانشور، ایک ادیب، ایک مفکر اور ایک شریف انسان تھا جس نے زندگی کی آخری سانس تک اُردو ادب کی آبیاری کی۔ سجاد ظہیر اُردو ادب کے بہت بڑے عاشق اور خالق تھے۔

میں اپنی طرف سے اور ادارۂ شاعر کی طرف سے سجاد ظہیر کے متعلقین اور خاص کر اُن کی رفیقۂ حیات رضیہ سجاد ظہیر سے اظہارِ افسوس کرتا ہوں۔ ہم سب اُن کے غم میں شریک ہیں۔ اور ہم امید کرتے ہیں کہ اس دنیا میں اس قسم کے مفکر، بیدار اور جری شریف اور نیک ادیب پیدا ہوتے رہیں گے۔ جو عوام کی بہتری اور بہبودی کے لئے اچھے اور بھرپور ادب کے لئے اپنی زندگیاں نچھاور کرتے رہیں گے۔

تبرکاتِ شاد عظیم آبادی

دو غیر مطبوعہ غزلیں

سنہ ۱۸۷۵ء

زمانہ جن پہ گراں ہُوا انہیں اِس علیل کی کیا خبر
وہ جو مبتلائے جفا نہیں انھیں مجھ غریب کی کیا خبر

شبِ تار و دامنِ دشت میں کوئی بدنصیب ہے نالہ کش
جو گھروں میں سوئے ہیں چین سے اُنھیں اُس غریب کی کیا خبر

ہے بلند اس لئے تیرا گھر، کہ نہ آہ کا ہو وہاں گذر
ستم آشنا ہے جو نالہ کش، تجھے اُس غریب کی کیا خبر

نہیں پایلوں میں نوائے خوش، یہ تو بیڑیوں کی پکار ہے
تمہیں اہلِ بزمِ طرب بھلا کسی بدنصیب کی کیا خبر

یہ تو اتفاق کی بات ہے، تجھے شاد گر کوئی مان لے
نہیں جن کو قوم سے واسطہ - انہیں تجھ نقیب کی کیا خبر

سنہ ۱۸۸۰ء

ہزار حیف چھٹا ساتھ ہمنشینوں کا
مکاں تو ہیں پہ ٹھکانہ نہیں مکینوں کا

کھلا جو باغ میں غنچہ، ستارہ وار کھلا
گلوں نے نقش اُتارا ہے مہ جبینوں کا

ہے اپنی اپنی طبیعت پہ حُسنِ شے موقوف
میں کیوں ہوں بندۂ بے دام ان حسینوں کا

نظر کا کیا ہے بھروسہ، نظر پہ ہیں پردے
خیال عرش پہ جاتا ہے دُوربینوں کا

زمینِ شور ہو یا ہو زمینِ شعر اے دل
نہیں ہے کوئی خریدار ان زمینوں کا

ذرا نکل کے تو دنیا سے دیکھ لے انساں
پتہ نہ دن کا نہ اندازہ ہے مہینوں کا

بہشت دہر ہے اپنا وطن خدا کی قسم
جُدا جُدا ہے ترانہ سبھی مہینوں کا

کسی کو مان لیا دل نے جب تو مان لیا
نہ دخل دو یہی مسلک ہے خوش یقینوں کا

سکھا دیا ہے مجھے بچ بچ کے راستہ چلنا
خدا بھلا کرے اے شاد نکتہ چینوں کا

مقالہ

ڈاکٹر شارب ردولوی

اردو تنقید کے دس سال — ایک جائزہ

اردو تنقید کی تاریخ میں پچھلے دس سال ایک اہم سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ اس دہائی میں اردو تنقید میں جتنا کام ہوا اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ جدید اردو تنقید کو نظریات کے تحت مختلف خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یہ خانے مغربی تنقید میں جتنے واضح اور صاف ہیں اردو میں نہیں ہیں۔ یہاں یہ خانے کہیں ایک دوسرے میں الجھے ہوئے نظر آتے ہیں اور کہیں تلے اوپر، کہیں دھندلے اور کہیں نامکمل۔ لیکن پچھلے دس برسوں میں ان میں نمایاں تبدیلی ہوئی ہے اور اردو میں بھی بعض نظریات نے ایک واضح دبستان کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس عرصے میں بعض نئے رجحانات بھی سامنے آئے ہیں اور ان کا بھی ایک حلقہ بن گیا ہے گو کہ خانوں کی اس تقسیم میں ان کی بہت واضح شکل ابھی نہیں بن سکی ہے۔

اردو تنقید کے جائزے کے لئے اگر ہم تھوڑے سے پچھلے اوراق پلٹ کر دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ تنقید نے اپنا سفر کافی تیزی سے کیا ہے۔ وہ روایتی تنقید سے سائنٹیفک تنقید کی منزل تک کافی تیز رفتاری سے آئی ہے۔ صحتِ زبان، اسلوب اور ہیئت، محاورے، تشبیہ، استعارہ، کنایہ اور دوسری صنعتوں کا التزام، مضمون آفرینی، مرصع سازی، تخیل کی جدت، فصاحت و بلاغت، جذبات نگاری، بیان کی نزاکت، احساس، حسن اور مسرت کی تلاش روایتی تنقید کے اجزائے ترکیبی تھے جسے تھوڑی سی وسعت دے کر جدید مغربی اصطلاح نے جمالیاتی تنقید کا نام دیا۔ اسی روایتی یا جمالیاتی تنقید کا ایک حصہ تاثراتی تنقید ہے جس نے مغربی رجحانات خصوصیت کے ساتھ کروچے کے نظریۂ اظہاریت کا بہت زیادہ اثر قبول کیا ہے۔ انہیں روایتوں کے تحت بعض وہ چھوٹے چھوٹے خانے آ جاتے ہیں جو ایک ہی میں الجھے ہوئے ہیں جنہیں مختلف نام دے گئے ہیں لیکن جو اردو میں کسی دبستان یا خاص گروہ کی حیثیت نہیں رکھتے۔ یہ ہیں، تعریفی تنقید، توضیحی تنقید و تشریحی تنقید، تقابلی تنقید اور تجزیاتی تنقید وغیرہ۔

دوسرا اہم رجحان سماجی تنقید کا ہے جس کی ابتدا حالی کے افادیت کے نظریے سے ہوئی لیکن جس کی پرورش مارکس اور اینجلز کے فلسفیانہ نظریات میں ہوئی۔ جس میں انسان، ادیب اور ادب کے سماجی رشتے، زندگی کے عصری تقاضے، طبقاتی کشمکش، تاریخی جدلیت اور جدلیاتی مادیت کے تحت فن اور فنکار کی خوبیوں کو پرکھا گیا ہے اور ادب کے اقدار کے تعین کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ ایک اہم رجحان تھا جو بہت تیزی سے پھیلا۔ کچھ ملکی و بین الاقوامی تاریخی و سیاسی حالات اس کے پھیلنے میں معاون ہوئے اور تھوڑے ہی عرصے میں اس نے ایک دبستان کی شکل اختیار کر لی۔ جسے کسی نے مارکسی یا ترقی پسند تنقید، کسی نے سماجی یا عمرانی تنقید کا نام دیا۔

آج جب ہم اردو تنقید کے پچھلے دس سال کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں سب سے زیادہ نمایاں یہی دو رجحان یا دبستان نظر

رہتے ہیں۔ ارتقا اور شکست و ریخت کے عمل میں ان میں بھی ذیلی دبستان بن گئے ہیں۔ کسی نظریے کی ابتدا کے موقع پر اس میں جو سختی، انتہا پسندی اور کٹّر پن ہوتا ہے وہ وقت کی تبدیلی، نئے علوم سے واقفیت اور نئے اور ذاتی تجربات کی بنا پر اعتدال کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور زیادہ صحت مند اور قابل قبول بن جاتا ہے۔ اکثر تبدیلیوں کی وجہ سے اس کی نئی شکل ابھر آتی ہے اور وہ اپنی اصل سے منسلک رہنے کے باوجود ایک آزاد نظریہ یا رجحان بن جاتا ہے۔ قدرت کے نظام ارتقا کا یہی اصول ہے۔ یہ اصول مذہب اور تہذیب سے لیکر ادب اور تنقید تک ایک ہی طرح عمل پیرا ہے۔

اسی طرح روایتی یا کلاسیکی تنقید جمالیاتی، رومانی، تاثراتی اور نفسیاتی تنقید میں منقسم ہو گئی۔ ان دس برسوں میں لکھی جانے والی تنقیدوں میں جمالیاتی، تاثراتی اور نفسیاتی تینوں رجحانات کی نمائندگی کرنے والے ناقدین، مضامین اور کتابیں مل جائیں گی، خالص جمالیاتی تنقید کم ملے گی۔ اس کے مقابلے میں تاثراتی اور نفسیاتی دبستان کا اثر زیادہ نظر آئے گا۔

جمالیاتی و تاثراتی تنقید حسن، مسرت، حظ انگیزی اور اظہار پر منحصر ہے۔ اس کا مقصد ادبی فن پاروں میں مسرت و حسن کی تلاش کرنا ہے چونکہ جمالیات عموماً فنون لطیفہ کے بارے میں اظہار خیال کرتی ہے اسی لئے اس کو فلسفۂ فن کہا گیا ہے۔ فلسفہ اور جمالیات کے دبستان سے تعلق رکھنے والے حکما نے اس لفظ کو بھی ادبی تخلیق کی تعریف اور اس کے محاسن تلاش کرنے کے سلسلے میں استعمال کیا ہے۔ ادبی تنقید کے سلسلے میں اس رجحان کے ماننے والے ناقدین پر کروچے کے نظریات کا بہت گہرا اثر پڑا ہے۔ کروچے کا خیال ہے کہ حسن در حقیقت اظہار کا نام ہے۔ عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ حسن ایک صفت ہے۔ اس کی نگاہ میں یہ غلط ہے۔ وہ کہتا ہے کہ حسن انسان کے تجربات ذہنی کی ایک صفت ہے۔ جو چیزوں میں خوبصورتی دیکھتا ہے۔ یہ صفت بنیادی طور پر اظہار کی ذہنی فعالیت ہے۔ اس نے لکھا ہے

"حسن حظ انگیز ہے کیونکہ یہ ذات کا کامیاب اظہار ہے۔۔۔ حسن کے مدارج نہیں ہوتے۔ مکمل اظہار ذاتی ہی فقط حسین ہوتا ہے۔" تاریخ جمالیات۔ نصیر احمد ناصر ص ۴۲۔ جلد دوم۔

کروچے نے ایک طرف جدید جمالیاتی تصورات کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ دوسری طرف ادب و تنقید میں تاثراتی و تخلیقی تنقید کو ایک مستقل دبستان بنانے میں مدد کی۔ ادب میں اظہاریت کے بارے میں کروچے کے نقطۂ نظر کو کلینتھ بروکس (Cleaneth Brooks) نے ایک فارمولے کی شکل میں اس طرح پیش کیا کہ:

وجدان + اظہار + تخیل + خیال آرائی + حسن = فن

اور یہی اصول ہمیں تاثراتی اور تخلیقی تنقید میں نظر آتے ہیں۔ کہیں کہیں لوگوں نے تاثرات اور اظہار کو الگ کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ یعنی کہا گیا ہے کہ ادب تاثرات کی ایک فنی شکل ہے خارجی عوامل سے جو اثرات ادب پر پڑتے ہیں وہ انہیں کو پیش کرتا ہے اس طرح تخلیق سے ذہنوں پر مرتب ہونے والے اثرات تنقید کی صف میں آ جاتے ہیں اور خود تنقید تخلیق کا درجہ اختیار کر لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ کے مشہور تاثراتی نقاد اسپنگارن نے اپنی تنقید کو تخلیقی تنقید یا نئی تنقید کا نام دیا ہے۔

جمالیاتی، تاثراتی یا تخلیقی ناقدین کے ادبی پرکھ کے اصولوں کو اگر مختصراً بیان کیا جائے تو ان کی نگاہ میں شاعری یا ادب کا مقصد تلاش حسن، مسرت، حظ اور اس کیفیت کی باز آفرینی ہے جس کے تحت فنکار نے کسی فن پارے کی تخلیق کی تھی۔ یہ ناقد ادب کی مقصدیت کے منکر ہیں اور ادیب کی سماجی ذمے داری کے قائل نہیں ہیں۔ ان کا کام محض ان داخلی اور شخصی تاثرات کو پیش کر دینا ہے جو جستجوئے کیف یا جستجوئے حسن کے سلسلے میں پیش آتے ہیں۔

اردو تنقید میں یہ دبستان کافی قدیم ہے۔ پرانے لوگوں میں حالی کو چھوڑ کر آزاد، شبلی اور مہدی افادی سے لیکر نیاز

تفسیری اور تاثر انگیزی تک بھی رنگ نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ پچھلے دس سال میں جن تنقیدی کتب اور نقادوں نے اس دبستان کو آبرو بخشی ہے ان میں عملی تنقید کلیم الدین احمد، ندائے فراق گورکھپوری، غالب، شخصیت اور فکر و فن رشید احمد صدیقی، غالب خورشید الاسلام، ذوق و جستجو، خواجہ احمد فاروقی فانی کی شاعری، ظہیر احمد صدیقی آزاد نظم اردو شاعری میں، کنول کرشن پالی، یاس یگانہ چنگیزی، راہی معصوم رضا سرفہرست ہیں۔ یہاں پر جمالیات، تاثرات کے مدارج اور مفہوم کی مختلف تہوں کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے جو فراق گورکھپوری سے لیکر خورشید الاسلام اور رشید احمد صدیقی کے یہاں پھیلی ہوئی ہیں اس مختصر مقالے میں ان کا تفصیلی ذکر ممکن نہیں ہے۔

جس طرح فلسفے کی ایک شاخ جمالیات نے ادب و تنقید کو متاثر کیا اسی طرح نفسیات نے بھی تخلیق و تنقید پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ جدید ماہرین نفسیات فرائڈ، ایڈلر اور یونگ کے نظریات تحلیل نفسی، احساس کمتری، اجتماعی لاشعور اور Archetypes نے مغربی ادبیات کے ساتھ اردو ادب و تنقید کو بھی بہت متاثر کیا ہے۔ اردو میں مغربی تنقید کی طرح مختلف نفسیاتی اسکول یا مس ماڈ باڈکن، آئی اے رچرڈز، ڈیوڈ ڈیشیز، ایف ایل اف ین، لیونل ٹریلنگ، ولیم فلپس اور ایڈورڈ ڈبلیو بیلاوڈ وغیرہ کی طرح خاص نفسیاتی نظریات کے پیش نظر ادبی تخلیقات کا مطالعہ کرنے والے اور ان خاص حالات کے تحت ان کے اقدار کا تعین کرنے والے تو نہیں ہیں لیکن ان نظریات سے متاثر ہو کر فن پارے کے معائب و محاسن کا اندازہ کرنے والے بہت سے نقاد ہیں جنہوں نے مختلف نفسیاتی نظریات سے استفادہ کرتے ہوئے ادب اور ادیب کا مطالعہ کیا ہے اور ادیب کے نہاں خانوں تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ اردو میں مغرب کی طرح نفسیاتی اسکول کے مختلف گروہ نہ ہوتے ہوئے بھی نفسیاتی رجحانات کے تحت ادبی اقدار کو پرکھنے کی کوشش کرنے والوں کا ایک ایسا گروہ ہے جسے نفسیاتی دبستانِ تنقید کا نام دیا جا سکتا ہے۔

اس طرز تنقید کو عام کرنے میں جدید نفسیاتی تجربات اور انکشافات کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے دوسرے یہ بھی ہوا ہے کہ پچھلے دس سال میں کتابوں کی ایک کثیر تعداد نفسیاتی مسائل اور مختلف نفسیاتی نظریات پر اردو میں لکھی گئیں یا ترجمہ ہوئیں جن میں فرائڈ کی civilization and its discontents جس کا ترجمہ احمد سعید نے تہذیب اور اس کے ہیجانات کے نام سے، قاسم محمود نے کنتھ واکر کی کتاب Psychology of sex کو جنس کا نفسیاتی پہلو کے نام سے اردو میں منتقل کیا۔ عبدالوہاب ظہوری کا شعور و لاشعور، شیر محمد اختر کی سگمنڈ فرائڈ اور احساس برتری، پروفیسر ایم اے قریشی کی فرائڈ اور لاشعور، حزب اللہ کی تحلیل نفسی، دیویندر اسر کی ادب اور نفسیات، ارمان سرحدی کی جدید نفسیات بہت اہم ہیں۔ ان کتابوں سے نفسیات کے بنیادی مسائل سامنے آئے اور لوگوں نے ادیب اور اس کی تخلیقات کے نفسیاتی پہلوؤں پر غور کرنا شروع کیا۔ نفسیاتی رجحان اردو میں نیا نہیں ہے لیکن باقاعدہ نفسیاتی تنقید یقیناً نیا ہے اس لئے کہ اس سے قبل ادبی تخلیقات کو تحلیل نفسی یا اجتماعی لاشعور کی بنیادوں پر نہیں پرکھا گیا تھا۔

نفسیاتی تنقید کے بنیادی اصولوں میں تھوڑا سا اختلاف ہے۔ فرائڈ کے ماننے والے تحلیلِ نفسی کے ذریعے ادیب یا شاعر کے نہاں خانوں میں پوشیدہ تشنہ خواہشات، نیوراسس، اڈ کی نشاط جوئی، لیبیڈو کی کارفرمائی، خواب اور خواب بیداری کی سمت آفرینی اور جنسی تشنگی کی تلاش کرتے ہیں۔ اس کے بعد اس بات کا پتہ لگانے کی کوشش کرتے ہیں کہ فن کار نے جو کچھ لکھا ہے اور اس کے اظہار کے لئے جو ہیئت، جس طرح کے الفاظ اور جن تشبیہوں اور استعاروں سے کام لیا ہے وہ اس کے لاشعور میں پوشیدہ کس جذبے یا خیال سے متعلق ہے۔ فرائڈ کے دبستان کا ایک نفسیاتی نقاد فنی تخلیق میں الفاظ، تشبیہ و استعارے اور خاص علامات اور اشارات کی اپنے انداز میں تشریح کر کے اس فن پارے کی خوبی یا خامی پر اظہار خیال کرتا ہے۔ ایڈلر سے متاثر نقاد فنی تخلیق میں Compen- sation Method تلاش کرتا ہے اس لئے کہ ایڈلر کا خیال ہے کہ فن کار احساسِ کمتری کا شکار ہوتے ہیں۔ یہ احساس کمتری

بچپن سے بلوغت تک کسی اعصابی کمی، ناک نقشہ، صورت، رنگ، قد وغیرہ کی وجہ سے یا پرورش کی کسی کوتاہی یا ماحول کے اثر سے پیدا ہوتا ہے اپنی اس کمی کو چھپانے کے لئے انسان ایسے بڑے بڑے کام کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ لوگوں کی نگاہ اس کی کمی پر نہ پڑے۔ ایک فنکار اس کو زیادہ اچھی طرح چھپا لیتا ہے۔ اس کو ایڈلر نے Compensation Method کا نام دیا ہے۔ یہاں نقاد ادیب کی تخلیقات میں اس کی اس کمزوری کو تلاش کرتا ہے اور یہ دیکھتا ہے کہ کسی خاص بات کا ذکر فنکار نے کیوں کیا ہے۔ ایڈلر کا یہ نظریہ Individul Psychology کے نام سے بھی مشہور ہے۔ یونگ کے نظریے کے مطابق اجتماعی لاشعور فنی تخلیقات کا سرچشمہ ہے۔ یہ اجتماعی لاشعور کسی مخصوص انسان کا لاشعور نہیں ہوتا بلکہ وہ تمام بنی نوع انسان کا مشترکہ لاشعور ہوتا ہے۔ لاشعور کی اصلیت بہیمی اور قدیمی ہے خصوصاً نسلی لاشعور کا سلسلہ دھندلے ماضی تک چلا جاتا ہے، اس لئے جو اشارات اور علامات لاشعور اپنے اظہار کے لئے استعمال کرتا ہے وہ بھی بہیمی اور قدیمی ہوتے ہیں جنہیں، وہ ابتدائی اشارات Achetypes کہتا ہے۔ یونگ کا خیال ہے کہ دیومالا انسانی فطرت کا ابتدائی اور بنیادی اظہار ہے۔ لاشعور فرائڈ اور یونگ دونوں کے یہاں ہے لیکن فرق یہ ہے کہ فرائڈ کا لاشعور ایک اسٹور ہاؤس ہے جہاں تمام مخرب اخلاق اور خراب باتیں جمع ہیں جس پر تحت الشعور کا پہرہ رہتا ہے اور یونگ کے یہاں لاشعور انسان کی تخلیقی اور تحریکی روح کا سرچشمہ ہے۔ یونگ کے نظریات نے ادب اور تنقید میں زیادہ فلسفیانہ سنجیدگی اور وزن پیدا کیا اور اس پر زور دیا کہ ادب مسرت بخش کیوں ہوتا ہے۔ ادب کی ہیئت اور ہمارے سمبل اور علامات میں کتنی ہم آہنگی ہے۔ فرائڈ کے نظریات جنسی تشنگی فنکار کی کچلی ہوئی خواہشات، اس کی نفسیاتی الجھنوں اور لاشعور کی ستم رانیوں کو غیر معمولی اہمیت دیتے ہیں۔ تحلیل نفسی یا عام نفسیاتی اصولوں پر ادبی تنقید کی ذمے داری نہیں رکھی جاسکتی اس لئے کہ فنی تخلیق کے اقدار کے تعین کے سلسلے میں یہ نظریات معتبر نہیں ہیں۔ فنکار کی انفرادیت یا ادب کی رمزیت وایمائیت کے مطالعے کے سلسلے میں ان سے ضرور مدد لی جاسکتی ہے۔

تنقید کے سلسلے میں نفسیاتی نقطہ نگاہ کی ان کوتاہیوں کے باوجود پچھلے دس برسوں میں اس دبستان میں بہت زیادہ کام ہوا ہے اور اس سلسلے کے بہت سے اہم مضامین اور کتابیں سامنے آئی ہیں۔ یہ کتابیں اردو تنقید کی Potentiality اور تنوع Diversity کی نشان دہی کرتی ہیں۔ جن ناقدین نے تنقید کے اس نظریے کے پیش نظر مضامین اور کتابیں لکھی ہیں ان میں تنقیدی مسائل اور تنقید کا نفسیاتی دبستان۔ ریاض احمد۔ تنقید و تحلیل شمیم احمد۔ نظم جدید کی کروٹیں، اردو شاعری کا مزاج اور تنقید اور احتساب ڈاکٹر وزیر آغا۔ نئی نظم اور پورا آدمی سلیم احمد۔ ستارہ یا بادبان محمد حسن عسکری۔ نگاہ اور نقطے سلیم اختر۔ اردو تنقید میں نفسیاتی عناصر ڈاکٹر محمود الحسن رضوی۔ ادبی قدریں اور نفسیات، باتیں بیماریاں اور غالب کا جمالیاتی شعور ڈاکٹر شکیل الرحمٰن۔ رسوا کے تنقیدی مراسلات مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن۔ تحقیق و تنقید جدید ڈاکٹر اختر اورینوی زیادہ اہم ہیں۔

(۲)

شروع میں شاید اس کا ذکر آچکا ہے کہ جدید اردو تنقید کو ہم تین بڑے خانوں میں تقسیم کرسکتے ہیں پہلا جس میں روایتی تنقید کلاسیکی، جمالیاتی، تاثراتی، تخلیقی نفسیاتی تنقید اور تنقید کی دوسری روایات آجاتی ہیں۔ دوسرے تنقید کا وہ اسکول ہے جس میں ترقی پسند تنقید مارکسی سماجی، عمرانی تاریخی اور سائنٹیفک تنقید شامل ہے۔ تقریباً پچھلے تیس سال سے اردو تنقید کے کارواں کی رہبری اسی دبستان کے ہاتھ میں ہے۔ ان ناقدین کا خیال ہے کہ کسی فن پارے کو تخلیق دینے والا ایک فرد تو ضرور ہوتا ہے لیکن اس فرد کے اندر اپنے عہد کی روح، اپنی قوم اور تہذیب، مذہب، اعتقاد اور اخلاقی خیالات کا عکس سیاسی کشمکش کی پرچھائیاں اور معاشی رد و بدل کا احساس اس کے کارناموں کو ایک تہذیبی اور تاریخی قدر میں تبدیل کردیتا ہے اس لئے فنی تخلیق

کی پہچان کے لیے اس عہد کی روح عصر کا مطالعہ ضروری ہے۔ روح عصر کسی عہد کے تقاضوں کے بنیادی ذہنی تاثرات وتصورات، معاشی حالات اور طبقاتی کشمکش کے اثرات کا نام ہے اس کو دوسرے الفاظ میں تاریخیت یا Historicity بھی کہہ سکتے ہیں ایک فنکار اپنے عہد کی تہذیبی، سماجی اور سیاسی کشاکش سے خود کو الگ نہیں رکھ سکتا۔ لاکھ کوشش کے باوجود اس کے ذہن پر عصریت اپنا عکس ڈالتی رہتی ہے۔ ادب کے تاریخی وسماجی تصور کی ابتدا تو بہت پہلے ہوئی لیکن جدید دور میں تاریخی نظریے کی اہمیت پر سب سے زیادہ زور تین Taine نے دیا جس نے ادبی تنقید کے اصولوں کو سائنٹیفک انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ Taine کے تاریخی نظریے کے ساتھ ہی مارکس اور اینجلز سے مارکسی معاشی اور سماجی نظریے کی ابتدا ہوئی اور یہ نظریات اس قدر مقبول ہوئے کہ غیر مارکسی نقاد بھی سماجی اور طبقاتی اثرات کو ادب کے مطالعہ کے لئے اہمیت دینے لگے۔ مارکس کے نظریات کی بنیاد ادب اور سماج کے تعلق پر منحصر ہے۔ اس نے سماجی شعور کے ڈھانچے کو ذرائع پیداوار کے رشتوں سے منسلک کرکے ادب کا اس سے ایک تعلق ظاہر کیا ہے۔ مارکس نے کہا ہے کہ ثقافت کے دوسرے شعبوں کی طرح ادب بھی جدلیاتی عمل اور تفاعل Inter Action کے ذرائع پیداوار کے رشتوں کو منسلک کرتا ہے اور ان کی اصلاح کرتا ہے۔ مارکس کی تعلیمات کے تحت ادب کو اپنے زمانے کے سماجی سیاسی اور مادی پس منظر میں دیکھنے پر زور سب سے پہلے ترقی پسند ادیبوں اور ناقدوں نے دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ جس طرح ایک عام آدمی خارجی حالات واسباب سے متاثر ہوتا ہے اسی طرح ایک فنکار بھی اثر قبول کرتا ہے اس لئے ادب کو زندگی کا آئینہ کہا گیا ہے۔ ادب کے بارے میں لینن نے کہا ہے کہ اس کو عام لوگوں کی زندگی سے متعلق حقیقت کا آئینہ دار اور ترقی پسند رجحانات کا ترجمان ہونا چاہیے اس لئے کہ وہ سماجی ارتقا کے مطالعہ کا ایک ذریعہ اور معاشرے کی جدوجہد کا کامیاب ہتھیار ہے۔ لینن کی نگاہ میں ادب کو اسی وقت سمجھا جا سکتا ہے جبکہ ہم فنکار کو سماجی ہستی تسلیم کریں اور یہ بات مانیں کہ ادب پر حالات کا اثر پڑتا ہے اور ادیب اپنے دور کے خیالات اور معاشرے کی عکاسی کرتا ہے۔ مارکسی تنقید کا ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ بنیادی طور پر اس نے یہ تسلیم کیا کہ فنکار اپنے طبقے اور زمانے کا عکاس ہوتا ہے۔

مارکسی، سماجی یا عمرانی تنقید اپنی ابتدا میں انتہاپسندی کا شکار رہی۔ ادیبوں نے طبقاتی کشمکش کو پروپیگنڈہ، جنس کو حقیقت نگاری اور مزدور کو فیشن کے طور پر استعمال کیا اور نقادوں نے انہیں بندھے ٹکے اصولوں پر ان کی عظمت کا حکم دیا۔ لیکن رفتہ رفتہ اس میں اعتدال آتا گیا اور وہ سائنٹفک تنقید کی طرف بڑھتی گئی۔ ادب پارے کا اندرونی تجزیہ، تفہیم اور باز آفرینی، جمالیاتی قدروں کا احساس، ماضی کی صحت مند روایات کا احترام، زندگی اور عہد کی تصویرکشی، مادی تاریخی اور جدلیاتی حقیقتوں اور فنی قدروں کے شعور نے اسے سائنٹفک تنقید کا درجہ دیا۔

اگر پچھلے دس سال کی سماجی Sociological مارکسی یا ترقی پسند تنقید کا جائزہ لیں تو وہ نہ صرف اس سے پہلے کی سماجی تنقید سے مختلف نظر آئے گی بلکہ اس میں فکر ونظر اور رجحانات ونظریات کی کئی تہیں ملیں گی۔ پہلی تہہ میں روایتی تنقید نمایاں نظر آتی ہے اس میں عموماً وہ ناقدین ملیں گے جو نظریات کے اعتبار سے مارکسی نہیں تھے بلکہ مارکس کے نظریات سے متاثر تھے اور سماجی شعور کے احساس نے انہیں ترقی پسند نقادوں کی صف میں شامل کر دیا ہے۔ ایسے ناقدین کی تعداد بہت زیادہ ہے ان کے یہاں روایتی اصول ترقی پسند تنقید کے اصولوں کے ساتھ ملے ہوئے ہیں ان میں میرامن سے عبدالحق تک اور نقد میر، سید محمد عبداللہ۔ ادب و آگہی مجتبیٰ حسین اردو ادب آزادی کے بعد، ادب اور ادیب، اردو شاعری کا سماجی پس منظر، ڈاکٹر اعجاز حسین، اردو مرثیے کا ارتقا، مسیح الزماں، تنقید اور انداز نظر، سیدہ جعفر، مجاز حیات اور شاعری، منظر سلیم۔ معیار ادب شوکت سبزواری۔ رجب علی سرور، ڈاکٹر نیر مسعود، ادبی مطالعے اطہر پرویز، جدید نظم پر یورپی اثرات، ڈاکٹر حامدی کشمیری اہم ہیں۔

اس کے علاوہ اسی سماجی تنقید کا ایک نمایاں رخ جو گذشتہ برسوں میں سامنے آیا ہے ایک وسیع انسانیت کی روایت

Broader Humanistic Tradition ہے جس کا سب سے زیادہ اثر علی سردار جعفری کی تنقید میں نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں میر اور کبیر پر ان کا دیباچہ قابل ذکر ہے۔ اس کے ساتھ class contradiction پر زور کم ہوا ہے۔ احتشام حسین کے تنقیدی لہجے میں یہ تبدیلی نمایاں طور پر دیکھی جا سکتی ہے لیکن انہوں نے تنقید کے اس کارواں کو سائنٹفک انداز نظر اور فلسفیانہ لب و لہجے کی طرف موڑ دیا ہے۔ اگر ترقی پسند تنقید کو یہ صحت مند موڑ نہ ملا ہوتا تو جس طرح اس کی مخالفت اور رد عمل شروع ہوا تھا اس میں اسے یہ مقام حاصل کرنا مشکل ہوتا۔ اس زمانے کی تنقید کا سب سے اہم حصہ یہی ہے جس میں ایک Thought Pattern نمایاں ہوا ہے اور ایک طرح کی فلسفیانہ اور سائنٹفک تنقید کا وجود ہوا ہے۔ اس سلسلے میں ان کے ذوق ادب و شعور کے دوسرے ایڈیشن کے مضامین خصوصیت کے ساتھ ادب اور تہذیب' اردو ناول اور سماجی شعور' نظیر اکبرآبادی' علیگڑھ تحریک کے اساسی پہلو، اس کے علاوہ افکار و مسائل، عکس اور آئینے' اور اعتبار نظر کے بیشتر مضامین سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

احتشام حسین کے بعد اس فلسفیانہ اور سائنٹفک تنقید کو ترقی دینے والے ممتاز حسین، ڈاکٹر محمد حسن اور اسلوب احمد انصاری ہیں جنہوں نے اپنے مضامین اور کتابوں کے ذریعے تنقید کے اس رجحان کو صرف مقبولیت ہی نہیں دی ہے بلکہ اعتبار بھی بخشا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد حسن کی کتاب "دہلی میں اردو شاعری کا فکری و تہذیبی پس منظر" مطالعہ سودا' شعر نو' اسلوب احمد انصاری کی کتاب ادب اور تنقید' نقش غالب اور ممتاز حسین کی کتاب ادب و شعور (دوسرا ایڈیشن) بہت اہم ہیں۔

تنقید کے اس رجحان نے خیال کو بنیادی اہمیت دی اور خیال، سماج اور عصری زندگی کے رشتے اور ادبی شہ پارے کو جنم دینے والے عہد' تہذیبی، جذباتی اور فکری محرکات اور عوامل کو سمجھنے پر زور دیا۔ علم و دانش اور ادب کے زندگی سے رشتے اور اس کے عرفان کو اہمیت دی۔ اس دبستان نقد میں متذکرہ ناموں کے علاوہ بھی بہت سے نام ملیں گے جنہوں نے پچھلے دس برسوں میں اہم مضامین اور کتابیں لکھی ہیں جن میں حالی اور نیا تنقیدی شعور پروفیسر اختر انصاری، آگہی و بیباکی باقر مہدی، تلاش و توازن ڈاکٹر قمر رئیس' تنقید کا تاریخی شعور اور انفرادیت (مضمون) ڈاکٹر سید محمد عقیل اور تنقیدی نظریات جلد دوم مرتبہ پروفیسر احتشام حسین اہم ہیں۔

اس کے علاوہ اس عرصے میں پہلی بار تنقید میں تحقیق کی اہمیت پر زور دیا گیا اور اس کی کوشش کی گئی کہ سائنٹفک تنقید کے اصولوں کو مرتب کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ کیا تنقید کے اصول ہو بھی سکتے ہیں؟ اس سلسلے میں اسلوب احمد انصاری کا مضمون سائنٹفک تنقید پروفیسر احتشام حسین کا مضمون ادبی تنقید قدر و معیار کا مسئلہ اور شارب ردولوی کی کتاب جدید اردو تنقید اصول و نظریات اپنی نوعیت کی پہلی کوشش ہے۔ تنقید کا یہی انداز نظر جسے سائنٹفک تنقید کا نام دیا گیا ہے اس عہد کا مقبول ترین رجحان ہے۔

اس کے علاوہ ادھر چند برسوں میں جدیدیت کے نام پر ایک خاص طرح کے تنقیدی رجحان کا جنم ہوا ہے۔ یہ رجحان کچھ رومانویت' کچھ نفسیات اور کچھ جھنجھلاہٹ سے مرکب ہے۔ ویسے تو اس کی تاریخ دس سال سے زیادہ پرانی ہے کیونکہ اس روایت کا سرفہرست محمد حسن عسکری کا نام ہے جن کی پہلی کتاب انسان اور آدمی ۱۹۵۳ء میں شائع ہوئی تھی لیکن اس کو ایک محدود حلقے میں رواج پچھلے دس برسوں میں ملا ہے۔ یہ دراصل تنقید کم رائے زنی اور جملے بازی زیادہ ہے۔ پہلے نقاد کا خیال تھا کہ وہ اپنی تنقید سے پڑھنے والوں کے ذوق کی تربیت کرتا ہے لیکن یہ نقاد اس طرح کی ذمے داری نہیں لیتے۔ جب ان کے یہاں لکھنے کا کوئی مقصد نہیں ترسیل اور ابلاغ کی کوئی اہمیت نہیں۔ شاعری ناشاعری ہے، کہانی اکہانی Anty story ہے تو ظاہر ہے کہ تنقید کیا ہوگی

اس تجریدی ادب پر ابھی کوئی تنقیدی تصنیف نہیں آئی لیکن اس حلقے کے ادیب و ناقدین نے ترقی پسند ادب کے بارے میں اکثر لکھا ہے جو چھوٹا دانے زنی اور کیلیقی پر مشتمل ہے۔ تنقید کے یہ نمونے مضامین کی شکل میں کم ملتے ہیں۔ عام طور پر یہ تنقید مراسلوں اور تبصروں تک محدود ہے۔ اس کے پیشوا محمد حسن عسکری ہیں جن کے مضامین رسائل اور ان کے مجموعے ستارہ یا بادبان میں شائع ہو چکے ہیں جنہیں خود نہیں معلوم کہ یہ تنقیدی مضامین ہیں یا پھر اُن جو فرانسیسی ابہام پسند شاعر میلارمے کی طرح خود نہیں جانتے کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ کیا ہے۔

حسن عسکری کے ساتھ اس دبستان میں (اگر آپ اسے دبستان ماننے پر تیار ہوں) سب سے اہم نام آل احمد سرور کا ہے۔ انہوں نے اسی دہائی میں اپنے خیالات و نظریات کو تبدیل کیا ہے اور جدیدیت کے راستے کو اپنایا ہے۔ اُن کی اس دہائی سے پہلے کی کئی اہم کتابیں ہیں جن کا اردو تنقید میں اہم مقام ہے لیکن اس زمانے میں ان کے صرف چند مضامین شائع ہوئے ہیں جن میں جدیدیت سے متعلق انہوں نے اپنے نظریات کا اظہار کیا ہے جو کہ اُن کے خیالات کو سمجھنے کے لئے کافی اہم ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ "سائنس اور ٹیکنالوجی انسانیت کو تباہی کی طرف لیجا سکتی ہے، صرف ادب ۔۔۔ ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں اس لئے ادب ہی نہیں، انسانیت کا مستقبل بھی جدید ادب کے عرفان پر منحصر ہے۔ وہی فاقہ زدہ جذبات کی سیرابی کا سامان کر کے لفظ کے ملاحتی استعمال سے اس کا جادو جگا کر دو تہذیبوں کی خلیج کو پُر کر سکتا ہے اور انسانیت کے لئے نشہ و نجات دونوں کا سامان بہم پہنچا سکتا ہے"۔ (شب خون۔ جون ۱۹۶۸ء صفحہ) چونکہ آل احمد سرور کا یہ مضمون اس نئے تنقیدی اور ادبی رجحان کو سمجھنے کے لئے بہت اہم ہے اس لئے چند جملے اور نقل کرنا ضروری معلوم ہوتے ہیں۔

"جب اُس نے کائنات کو سمجھنے یا سمجھانے کی کوشش چھوڑ کر اپنی ذات کے عرفان کی کوشش کی اور اپنے تجربے کا تجزیہ بھی اُسے عزیز ٹھہرا تو اُسے ایسی زبان کی ضرورت نہ رہی جو اپنی ذات سے باہر دیکھنے والے شعرا کے واضح اظہار کے لئے کافی تھی مگر اس کے محشرِ جذبات کی ترجمانی سے قاصر تھی۔"

"وہ اپنے آپ سے اپنا رشتہ قائم نہیں کر پاتا۔ تنہائی سے گھبرا کر وہ اور زیادہ تنہائی کی منزلیں طے کرتا ہے۔ وہ تعلیم سے گھبراتا ہے، نظریات اُسے خوفزدہ کرتے ہیں۔ افادی، اخلاقی، سیاسی شاعری اُسے زہر لگتی ہے۔"

"مارکسزم نے ہمیں اتنا بڑا ادب نہیں دیا، ہاں وجودیت EXISTENTIALISM کے علمبرداروں میں سارتر اور کامیو کی عظمت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔"

"جدیدیت کا نمایاں روپ آج کی آئیڈیالوجی سے بےزاری، فرد پر توجہ، اُس کی نفسیات کی تحقیق، ذات کے عرفان، اُس کی تنہائی اور اُس کی موت کے تصور سے خاص دلچسپی ہے۔"

آل احمد سرور اس گروہ کے سب سے سنجیدہ نقاد ہیں اسی لئے اتنی مثالیں دی گئیں کہ اس اندازِ فکر اور رجحان کے اصولوں کی صحیح شکل سامنے آسکے۔

حسن عسکری اور آلِ احمد سرور کے بعد اہم نقاد سلیم احمد ہیں۔ ان کا مجموعۂ مضامین "نئی نظم اور پورا آدمی" تنقید کے اس دبستان کی مقبول کتاب ہے جس کے دو جملے ملاحظہ ہوں۔

"تب ترقی پسندی کا مفہوم اتنا تنگ نہیں تھا جتنا محترمہ (راشن کے گھونسلے کی شکل والے) علی سردار جعفری کے دورِ عروج میں ہوا۔"

راشد کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

(بقیہ صفحہ ۲۸ پر دیکھئے)

شاعر بیتی

تاج کا ہیرا

حرمت الاکرام

اُسے دیکھا بھی
اُس سے بات بھی کی
ہوائے سرخوشی جزعو بہ جزعو دل میں اُتری
غبارِ درد کی چادر سرکنے سی لگی جیسے کوئی رکھتا ہو برسوں کی پرانی چوٹ پر پھاہا،
میں کیوں ناشادماں تھا؟ یہ خیال آیا
تو اپنی ہی کسی تقصیر نے خنجر دکھایا،
بس اک جھونکا چلا اور آگ بھڑکی
جُھلستا ہی رہا احساس مجھکو
یہ اپنے تجربوں کا رس مرے پیالے میں اکثر گھول دیتا ہے۔
کہیں جاؤں، کہیں بھی چھپ کے میں بیٹھوں ---- دریچہ اک نہ اک آتش کدہ کا کھول دیتا ہے۔
یہ ایسا نخل ہے کھلتے ہیں آنسو جس کی شاخوں میں۔
یہ موتی ہے مگر اس کے کنول کی جھلملاہٹ صورتِ پیکاں اُتر جاتی ہے سینوں میں
میں کوئی خواب دیکھوں کوئی افسانہ لکھوں قرطاسِ جاں پر
اُبھاروں کوئی ست رنگی دھنک تنہائیوں کے آسماں پر۔
گوارا ہے کب اس کو
گوارا ہے کب اس کو
مری دو چار لمحوں کی خوشی بھی
مگر اس دشمنِ جاں سے بچھڑنا خود کہاں مجھکو گوارا ہے۔
یہ غم کی رات کا تنہا ستارہ ہے
وجود اس کا صفر کی طرح ہے دل کی اکائی پر
صفر جتنے بڑھیں گے اتنی قیمت بڑھتی جائے گی۔
گھٹا دوں اپنی قیمت ۔ اس صفر کو میں کھرچ دوں
گنا دوں سا کھ اپنی چند لمحوں کی مسرت کے عوض لیکن پھر آخر کیا کروں گا؟
میں اپنی شخصیت کا قرض (جو ٹکس لئے بیٹھا ہے پشتِ ناتواں پر) بھروں گا بھی تو کس صورت بھروں گا؟
اُدھ پہلے ہوں سنہرے ہوں مگر سکے ہوں پچھلے دور کے تو وہ دکانوں میں نہیں چلتے۔
الگ ہوتا ہے کاروبار ان کا
مجھے بازار سے نسبت نہ کاروبار سے کوئی علاقہ ہے۔
اسی خاطر یہ دشمن مجھکو پیارا ہے۔
مرا دشمن ـــ مرا احساس ـ دل کے تاج کا ہیرا!!

جوگندر پال

غرقاب

تمام رات خواب میں مَیں اُلٹوٹ وہناک سے اپنی نئی کہانی رقم کرتا رہا۔ رات گہری اور گھنی ہوتی چلی گئی، تاروں نے ٹمٹما ٹمٹما کر دوسرے سارے تاروں کو بھی باہر بلا لیا اور میری کہانی اتنی فراواں ہو گئی کہ میں بے اختیار اس کی سچائی پر ایمان لے آیا ——— لیکن ابھی وہ ادھوری ہی تھی کہ میری آنکھ کھل گئی :

میری بے حساب تخلیق کا حرف حرف نا معلوم کہاں اڑ گیا اور میں پریشانی سے اپنا سر کھجانے لگا اور سورج کی گول مول درخشندگی حیرت زدہ ہو ہو کر آسمان کی بے کراں، خالی نیلاہٹ میں نظر دوڑانے لگی کہ گم شدہ ٹمٹماہٹیں کہیں ایک بار تو نظر آجائیں۔

خدا کی آنکھ کھل گئی ہے اور ہم سب اُس کے آس پاس اُجالے میں ڈوب گئے ہیں اور خدا پریشان ہے کہ اس کی ساری کی ساری مخلوق کہاں غائب ہو گئی ہے،

نا معلوم ہم کہاں ہیں۔ خدا نے اپنے خواب میں ابھی ہمیں پورا آدھا بھی تخلیق نہ کیا تھا کہ اُس کی آنکھ کھل گئی ——— وہ بھول گیا ہے کہ اُس نے ہمیں کہاں تک پیدا کیا تھا، کیونکر شروع کیا تھا؟ ——— ہم کیا ہیں، کون ہیں؟ ——— ہماری ادھوری شکلوں سے ہماری شناخت کیونکر ممکن ہو گی؟

اور خدا کی بڑھتی ہوئی بے چین مایوسی سے کائنات تابندہ تر ہو رہی ہے۔ اور اس اندھی تابندگی میں ڈوبے ہوئے کھنڈروں پر اُنہی شکلوں کا گمان ہوتا ہے جو دیکھنے والوں کے ذہن میں ہوں؛

اور ان بے نشان کھنڈروں کا خاموش کرب خدا کی حمد الاپ رہا ہے جس کی گونج خدا کے سوا سب کو سنائی دے رہی ہے۔

کہانی

شروڈ اینڈرسن

مترجمہ: ڈاکٹر عصمت جاوید

بھائی کی موت

افسانے کا بنیادی خیال یہ ہے کہ موت کی کئی قسمیں ہوتی ہیں لیکن سچ پوچھا جائے تو یہ خیال بھی اب نیا نہیں ہے۔ لیکن افسانہ نگار نے اسی خیال کو جس انداز سے پیش کیا ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔ گھر اور زندگی کے زیریں سطحی مناقشے جن سے ہم عموماً سرسری طور پر گزر جاتے ہیں بچوں کی نفسیات، ان کی معصومیت، سرپرست خاندان کی انانیت، موروثی اثرات، ان سب باتوں کا تجزیہ افسانہ نگار نے ایک ذہین کردار میری کے توسط سے کیا ہے۔ یہ افسانہ ۱۹۳۶ء سے قبل شائع ہوا ہے (اینڈرسن کا انتقال ۱۹۴۱ء میں ہوا تھا) اس لئے ممکن ہے اگر یہ افسانہ بعد میں لکھا جاتا تو شاید اس میں وضاحتی نوٹ شامل نہ ہوتے جنہیں افسانہ نگار نے بار بار دہرایا ہے اور افسانہ وہیں ختم کر دیا جاتا جہاں تھامس کی موت کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن موجودہ صورت میں بھی یہ افسانہ ایک عام قاری کو متاثر کر سکتا ہے

سیب کے درخت کے وہ آر پار کٹے ہوئے دو تنے تھے، ایک اوسط القامت آدمی کے گھٹنے تک اونچے۔ دو بچے انہیں بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے ان دونوں درختوں کو کٹتے ہوئے دیکھا تھا لیکن انہیں گرتا دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے سوچا بھی نہ تھا کہ ان درختوں کے کٹے ہوئے تنے بچ رہیں گے۔ انہوں نے اس وقت انہیں دیکھا بھی نہ تھا اور بعد میں انہیں دیکھتے ہوئے ٹیڈ نے اپنی بہن میری سے کہا۔

"ان سے خون ضرور نکلا ہوگا۔ آدمی کا پاؤں جب تلوار کاٹ دیتا ہے تو خون نکلتا ہے نا اسی طرح"

وہ جنگ کی کہانیاں سنتا آیا تھا۔ اس نے جنگِ عظیم میں شریک ہونے والے ایک سپاہی کو دیکھا تھا جس کا ایک ہاتھ کٹا ہوا تھا اس نے اسے دھان کی کوٹھی کے پاس کسی سے باتیں کرتے دیکھا تھا جب ٹیڈ نے اس کا ذکر کیا تو میری کو شک آنے لگا کہ اس نے کبھی اس ٹنڈے آدمی کو دھان کی کوٹھی کے پاس باتیں کرتے نہیں دیکھا تھا۔

اس نے کہا

"آدمی کیوں؟ ایک عورت یا لڑکی کے پاؤں کی طرح کیوں نہیں؟"

لیکن ٹیڈ نے اس خیال کو بکواس قرار دیتے ہوئے جواب دیا

"عورتوں اور لڑکیوں کے ہاتھ پاؤں تھوڑی کٹے ہیں!"

"کیوں نہیں۔ بتاؤ تو کیوں نہیں"۔ میری بار بار کہتی رہی

اگر اس دن جب درخت کٹ رہے تھے وہ وہیں کھڑے رہتے تو کتنا اچھا ہوتا! "ہم وہاں جا کر ان کو چھو سکتے تھے"۔ ٹیڈ نے کہا اس کی مراد ان کٹے ہوئے تنوں سے تھی۔ "کیا وہ گرم گرم رہے ہوں گے؟ کیا ان سے خون نکلا ہوگا؟" بعد میں انہوں نے قریب جا کر ان حصوں کو چھوا تو تھا لیکن اس دن سردی ہونے کی وجہ سے وہ کٹے ہوئے تنے انہیں ٹھنڈے محسوس ہوئے۔ ٹیڈ اپنی اس بات پر اڑا رہا کہ صرف مردوں ہی کے ہاتھ پاؤں کٹ سکتے ہیں لیکن میری کے ذہن میں صرف لڑائی نہیں بلکہ موٹر کے حادثات بھی تھے۔

"کیا عورتوں اور بچوں کے ساتھ موٹر کے ایکسیڈنٹ نہیں ہوتے؟"

اس نے کہا لیکن ٹیڈ اسنے والا کب تھا۔

دونوں بچے تھے لیکن ایک اعتبار سے وہ بڑے آدمیوں کی طرح سنجیدہ بھی تھے۔ میری چودہ سال کی تھی اور ٹیڈ گیارہ سال کا۔ وہ ورجینیا کے ایک کسان کے بچے تھے جن کا نام جان گرے تھا اور جنوب مغربی

دھنیا میں رہتا تھا۔ اس مقام پر زیچ ویلی تھی ایک وسیع وادی تھی جس کے ایک طرف سے ریل اور ایک چھوٹی سی ندی گزرتی تھی اور شمال سے جنوب تک دور تک پہاڑ پھیلے ہوئے تھے۔ ٹیڈ کو دل کی بیماری تھی۔ جب وہ ۱۲ سال کا لڑکا تھا تو اسے ریومیٹک فیور کا حملہ ہوا تھا اور اس کے دل پر ایک خاص قسم کا زخم آگیا تھا وہ دبلا پتلا تھا اور تعجب کی بات ہے کہ اب تک زندہ تھا کیونکہ ڈاکٹر نے کہہ دیا تھا کہ وہ کسی وقت بھی مر سکتا ہے۔ چلتے پھرتے کسی وقت بھی وہ دھم سے مردہ حالت میں گر سکتا ہے۔ اس چیز نے ٹیڈ کو اپنی بہن میری کے بالکل قریب کر دیا تھا اور میری کے دل میں ایک بھرپور ہمدردانہ جذبہ جاگ اٹھا تھا۔

ان دونوں کے درمیان جو ایک بے نام سا کچھ۔ کچھ رشتہ قائم ہوا تھا اس سے ان کا پورا خاندان بلکہ وادی کے قریب کھیتوں کے ہمسائے اور اس اسکول کے بچے بھی واقف ہو گئے تھے جہاں وہ پڑھنے جاتے تھے۔ لوگ کہا کرتے "دیکھو وہ کس طرح ساتھ ساتھ جا رہے ہیں۔ انہیں ایک دوسرے کے ساتھ ہی مزہ تو آتا ہوگا لیکن وہ کتنے سنجیدہ لگتے ہیں۔ ان کی عمر کے لوگوں میں ایسی سنجیدگی دیکھو" لیکن جب صورت یہ ہو تو ان کا سنجیدہ ہونا ہی فطری معلوم ہوتا ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ٹیڈ کے انجام کے بارے میں ہر کوئی نہ کسی جانتا تھا لیکن اس حقیقت نے میری پر عجیب و غریب اثر ڈالا تھا۔ چودہ سال کی عمر میں وہ ایک لڑکی بھی تھی اور ایک عورت بھی۔ اس کی عورت پن غیر متوقع موقعوں پر اس میں سے باہر جھانکنے لگتا تھا۔

اس نے اپنے بھائی ٹیڈ کے بارے میں، اگر کوئی بات آتی جسے جاننے لگا تھا کیونکہ اس طرح کا ملا ہوا ٹیڈ کے سینے میں تھا وہ کسی وقت بھی اپنی دھڑکن روک کر اسے مردہ حالت میں گرا سکتا تھا ایک تر و تازہ کٹے ہوئے درخت کی طرح۔ گرے خاندان کے دوسرے افراد، بڑی بوڑھی جیسے ماں اور باپ اور بڑا بھائی ڈان جو اس وقت اٹھارہ سال کا تھا محسوس کر رہے تھے کہ ان دونوں بچوں کے درمیان کچھ تو ہے جسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا، جسے سمجھا نہیں جا سکتا اور پھر گھر والوں کا یہ احساس کچھ جسم [illegible] ایک ہی خاندان کے کچھ افراد کبھی کبھی عجیب و غریب [illegible] محسوس کرتے ہیں جو نا گوار نا طور پر [illegible] ان پر منحصر [illegible] حقیقت [illegible] اور میری نے

کم عمری ہی میں پالیا تھا۔

ڈان اپنے باپ پر پڑا تھا اور اٹھارہ سال کی عمر میں وہ بھرپور آدمی لگتا تھا۔ وہ ان آدمیوں میں سے تھا جن کے بارے میں لوگ کہتے ہیں "بڑا نیک آدمی ہے۔ آگے چل کر ضرور اپنے پیروں پر کھڑا ہوگا۔" خود اس کا باپ جوانی میں نہ تو شراب پیتا تھا، نہ لڑکیوں کے پیچھے دوڑتا تھا اور نہ کبھی آپے سے باہر ہوتا تھا۔ جب وہ لڑکا تھا تو زیچ ویلی میں کتنے ہی بگڑے دل جوان تھے ان میں سے اکثر کو ورثے میں کھیت ملے تھے جنہیں وہ جوئے، شراب، گھوڑ دوڑ اور لڑکیوں کے تعاقب میں ہاتھ سے کھو بیٹھے تھے۔ یہ دھنیا کی روایت سی بن گئی تھی لیکن جان گرے صاحبِ اراضی تھا۔ گرے خاندان کے سبھی لوگ ہمیشہ سے ایسے ہی تھے۔ لوگ بگ کہا کرتے "جان گرے ایک سیدھا سادہ مویشی پالنے والا آدمی ہے"۔ اسے مویشیوں کی بڑی اچھی پرکھ تھی۔ وہ جانتا تھا کہ انہیں کیا غذا کھلانے سے وہ فربہ ہو سکتے ہیں۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے کھیتوں کے لیے کون کون سے مویشی کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں اور وہ کہاں کہاں ملتے ہیں۔ گرے کے کھیتوں کا مجموعی رقبہ بارہ سو ایکڑ تھا جس میں ایک خاص قسم کی گھاس اگتی تھی۔

باپ نہ صرف صاحبِ اراضی تھا، بلکہ جوع الارض کا شکار بھی۔ اسے خود اپنے باپ سے صرف ایک چھوٹا سا کھیت ورثے میں ملا تھا۔ یہی کوئی دو سو ایکڑ کا۔ لیکن وہ برابر اس میں اضافہ کرتا رہا۔ ابتدا میں اس کا کھیت اس خاندان کے کھیتوں سے ملحق تھا جس کا نام "اسپیلوال" تھا۔ اس خاندان کے لوگ خود کو "نواب" سمجھتے تھے اور فخریہ کہا کرتے تھے کہ جہاں نوازی اسپ پروری وغیرہ ان کے خاندان کی پشتوں سے چلی آنے والی ایک روایت ہے۔ وہ گھوڑوں پر شرطیں بھی بدتے تھے۔ جان گرے نے پہلے بیس ایکڑ، پھر تیس ایکڑ، پھر پچاس ایکڑ "اس طرح آہستہ آہستہ ان کی زمین خریدنی شروع کر دی یہاں تک کہ وہ ان کے آبائی مکان پر قابض ہو گیا اور اسی خاندان کی ایک لڑکی سے شادی بھی کر لی۔ لڑکی عمر زیادہ تھی۔ وہ خاندان کی دوسری عورتوں کی طرح قبول صورت بھی نہیں تھی۔ اسپیلوال کی اراضی گھٹتے گھٹتے سو ایکڑ سے بھی کم رہ گئی تھی اور وہ ہر سال ایک ایک پائی جوڑ کر برابر اپنی اراضی میں اضافہ کرتا رہا جو اب گرے اراضی کہلانے لگی تھی۔ وہ مکان جو پہلے کبھی اسپیلوال کا تھا کبھی

پکّی اینٹوں کا بنا تھا۔ جس کے کمرے بہت کشادہ تھے اور بڑے آرام دہ تھے۔

لوگ تعجب کرتے تھے کہ ویسپسیانو نے جان گرے سے شادی کیوں کی۔ یہ گرا ہوا رشتہ تھا اور یہ تعجب کرتے کہ رشتہ منظور کیا ہی کیوں گیا تھا۔ ویسپسیانو خاندان کے تمام لڑکیاں تعلیم یافتہ تھیں اور گاؤں سے دور رہ کر کالج میں تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ لیکن روشی اتنی خوبصورت نہیں تھی شادی کے بعد البتہ وہ ایسی نکلنے لگی بلکہ ایکا ایکی ایسی نکھری کہ سمجھو کہ حسین ہی ہو گئی۔ ہر کوئی جانتا تھا کہ ویسپسیانو خاندان کے افراد حساس اور اونچے طبقے کے لوگ تھے لیکن ان کے آدمی گرے خاندان والوں کی طرح اپنی اراضی سنبھال نہیں سکے۔ ورجینیا کے اس حصے کے لوگ جان گرے کی تعریف کرتے تھے اور مویشیوں کے بارے میں اس کی سوجھ بوجھ بصیرت اور پرکھ کے دل سے قائل تھے۔

ڈان گرے خاندان کا سب سے بڑا لڑکا تھا اور وہ صحیح معنوں میں گرے بننے کے لئے پیدا ہوا تھا۔ اپنے باپ کی طرح، دوسرا گرے۔ لیکن میری کا معاملہ کچھ عجیب و غریب بلکہ غیر معمولی تھا جو لڑکی ہوتے ہوئے بھی بڑوں کی طرح حساس اور باشعور تھی۔ جیسے بیک وقت چھوٹی بھی ہو اور بڑی بھی۔ اسی خاندان میں جہاں ڈان تھا۔ بڑا بھائی۔ بڑا، گٹھیلے بدن والا اپنے باپ کی طرح تو میں ٹیڈ بھی تھا، نحیف و نزار دھان پان، عام حالات میں ایک لڑکی ہونے کی حیثیت سے اس کا ڈان سے متاثر ہونا اور اسے ایک چھوٹی بچی کی تعریف و توصیف کا مرکز بنانا فطری اور مناسب امر ہی ہوتا ہے لیکن کوئی نہ کوئی بات تھی کہ ڈان اس کے لئے بس ایک ہستی تھی اس سے زیادہ کچھ نہیں وہ۔ جیسے اس کے وجود سے باہر تھا اندر نہیں۔ جبکہ خاندان کا بظاہر سب سے کمزور فرد ــــ ٹیڈ اس کے لئے سب کچھ تھا

بہرحال ڈان ایک قوی الجثہ اور خاموش طبیعت والا انسان تھا اور بظاہر اس میں خود اعتمادی بھی تھی۔ اگر باپ نے دو سو ایکڑ زمین سے ابتدا کر کے اسے بارہ سو ایکڑ بنا دیا تھا تو وہ بھی کچھ کرنا چاہتا تھا۔ اگرچہ وہ اپنے منہ سے کچھ کہتا نہیں تھا۔ لیکن وہ بھی اپنا کام شروع کرنا چاہتا تھا۔ وہ خود انتظام سنبھالنا چاہتا تھا اور مالک بننے کی تمنا رکھتا تھا، اس کے باپ نے اسے ایک کالج ـــــ زراعتی کالج میں بھیجنا بھی چاہا تھا لیکن اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ زمینوں میں رہ کر بہت کچھ سیکھ سکتا ہوں۔

باپ اور بیٹے کے درمیان مقابلہ شروع ہو چکا تھا لیکن ایسے سلجھے پن سے ہی رکھا گیا تھا۔ یہ مقابلہ کام کرنے کے ڈھنگ اور فیصلے صادر کرنے سے متعلق تھا۔ اب تک بیٹے ہی کو جھکنا پڑ رہا تھا۔

ہر خاندان کی طرح گرے خاندان میں بھی۔ بڑے بڑے گروہ کے اندر چھوٹی چھوٹی، الگ تھلگ ٹکڑیاں قائم تھیں۔ جہاں حد بندی ہوئی تفریقیں اور خفیہ طور پر چلنے والی خاموش لڑائیاں تھیں۔ کہیں میری اور ٹیڈ تھے۔ کہیں ڈان اور اس کا باپ تھا۔ اور کہیں ماں اور اس کے دو چھوٹے بچے چھ سالہ گلڈز اور دو سالہ ہیری تھی۔ گلڈز اپنے بڑے بھائی ڈان کا خاموش مداح تھا۔

جہاں تک میری اور ٹیڈی کا تعلق ہے وہ اپنی ہی بنائی ہوئی دنیا کے اندر مگن تھے اور یہ دنیا انہوں نے جدوجہد کے بغیر نہیں بنائی تھی۔ بات یہ تھی کہ ٹیڈ کے بیمار دل کی وجہ سے۔ جس کی حرکت کسی وقت بھی بند ہو سکتی تھی۔ لوگ اسے اللہ آمین سے پالنا چاہتے تھے اور ہمیشہ اس کے ساتھ لاڈ پیار سے پیش آتے تھے۔ صرف میری ہی اس راز کو جانتی تھی کہ اس سے ٹیڈ کو کتنا غصہ آتا تھا اور تکلیف پہنچتی تھی۔

"نہیں ٹیڈ۔ مجھ سے غلطی ہوئی معاف کرنا۔"

"ٹیڈ۔ ذرا سنبھل کے!"

کبھی کبھی ٹیڈ مارے غصے کے سفید پڑ جاتا تھا اور کانپنے لگتا تھا۔ ڈان، ابا، امی، سبھی اس کے ساتھ اسی طرح پیش آتے تھے کوئی بھی سمجھتا ہی نہیں تھا کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے کس طرح وہ اپنے باپ کی دوبین سے ایک موٹر چلانا سیکھنا چاہتا ہے۔ وہ پیڑ پر چڑھ کر پرندوں کے گھونسلے ڈھونڈنا چاہتا ہے اور میری کیسا بڑا بنا کر دوڑنا چاہتا ہے ظاہر ہے کہ وہ کھیتوں میں رہتا تھا اس لئے اس کا یہ چاہنا کہ ٹٹو کو کھونٹے سے کھول کر اس پر زین دھرے اور اس پر سوار ہو ایک فطری امر تھا۔ نہیں ٹیڈ۔ نہیں۔ یوں نہ کرو۔ ایسا کرنا تمہارے لئے منع ہے۔

کھیت کے مزدوروں اور اسکول کے بچوں میں رہ کر اس نے گالی بھی سیکھ لی تھی! "ایسی کی تیسی" وہ میری سے کہا کرتا۔ صرف میری ہی اس کے دل کی کیفیت سے واقف تھی۔ اگرچہ اس نے اس احساس کو واضح الفاظ میں کبھی نہیں ڈھالا تھا۔ خود سے بھی نہیں کہا تھا۔ یہی وہ خصوصیت تھی جس نے اسے چھوٹی عمر ہی میں بڑا بنا دیا تھا اور اسے سارے خاندان سے

متاثر کر رہا تھا اور اُس میں ایک عجیب و غریب قسم کا عزم جگا دیا تھا۔

"لڑکیوں کو ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔"

ایک بار تو اُس کے ذہن میں یہی احساس انہی الفاظ میں ڈھلا تھا اور اس نے اپنے آپ سے یہی الفاظ کہتے ہوئے سُنے "لڑکیوں کو ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔

اگر اس کے حصے میں زندگی کے صرف چند سال آئے ہیں تو انہیں چاہیئے کہ اُسے جو کچھ ملنے والا ہے اُسے برباد نہ کریں۔"

وہ اسے لمحہ لمحہ بار بار، ہر روز کیوں مارنا چاہتے ہیں؟ یہ خیالات اس کے ذہن میں اُس حد تک واضح شکل اختیار نہیں کر پائے تھے لیکن دوسروں کے اس رویے کے خلاف اس کے دل میں غم و غصہ پیدا ہوتا تھا وہ ایک سپاہی کی طرح تھی جو وزمیں ٹیڈ کی حفاظت کرتا تھا۔

دو واقعے تھے اپنی ہی بنائی ہوئی دنیا میں دور بہت دور نکل آئے تھے اور ایک بار صرف ایک بار وہ بات سطح پر اُبھر آئی جسے میری اب تک مبہم طور پر محسوس کرتی آئی تھی۔ اور یہ واقعہ ماں کے ساتھ پیش آیا۔

یہ ابتدائی گرما کا ایک دن تھا اور بارش میں ٹیڈ اور میری مکان کے پورچ کے ارد گرد کنارے کھیل رہے تھے جہاں پرنالے سے پانی زور و شور سے نیچے گر رہا تھا اور پورچ کے کنارے سے ایک نالے کی شکل میں بہہ نکلا تھا۔ پہلے ٹیڈ اور اس کے بعد میری اس نالے میں قدم رکھ کر گزرے اور پھر پورچ کے اندر جا پہنچے۔ اُن کے کپڑے پانی سے شرابور ہو گئے تھے اُن کے تر بالوں سے پانی کی دھاریں بہہ رہی تھیں بڑا مزہ آ رہا تھا اور اس کے اندر کی طرف، برف پر ٹھنڈے ٹھنڈے پانی کا لمس، وہ قہقہے پہ قہقہے لگا رہے تھے کہ ماں دروازے پر آ گئی اس کی نظر ٹیڈ پر پڑی اور اس نے خوف اور تشویش سے بھری آواز میں کہا "ٹیڈ کم از کم تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے!" کو یہ الفاظ صرف اتنا ہی کہا تھا مگر اس کی تہہ میں وہ بہت کچھ کہہ گئی۔ اس نے میری سے ایک لفظ بھی نہیں کہا "ٹیڈ کم از کم تمہیں تو ایسا نہیں کرنا چاہیئے" کا مطلب تھا "ٹیڈ تمہارا دل کمزور ہے تمہیں تیز دوڑنا، سیڑھیوں پر چڑھنا اور بارش میں باہر نکلنا بھی ترک کرنا چاہیئے۔ ذرا سا ایک جھٹکا تمہارا کام تمام کر سکتا ہے۔ تم مر جاؤ گے۔" یہ دیکھو بڑا راگ تھا اور ٹیڈ فوراً بات کی تہہ تک پہنچ گیا۔

اُس کا رنگ سفید پڑ گیا اور وہ کانپنے لگا۔ لڑکے کیوں نہیں سمجھتے کہ یہ بات اس کے لیے شرمندگی کی بات ہے؟ اس روز ٹیڈ ماں کو کوئی جواب دیئے بغیر پورچ سے نکل کر پانی میں بھیگتا ہوا دھان کی کوٹھی کی طرف دوڑنے لگا۔ وہ خود کو ہر ایک سے چھپانا چاہتا تھا۔ میری سمجھ رہی تھی کہ اس کے دل پر کیا بیت رہی ہے۔

وہ اچانک بڑی ہو کر آپے سے باہر ہو گئی۔ ماں بیٹی ایک دوسرے کے مدمقابل کھڑی تھیں۔ ایک طرف ایک عورت جو پچاس کے پیٹے میں تھی تو دوسری طرف ایک بچی جو دس سال کی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے خاندان میں ایک کی جگہ دوسرے نے لے لی تھی۔ میری نے ماں کی غلطی محسوس کر لی اور یہ بھی محسوس کیا کہ اسے کچھ کرنا چاہیئے۔ "ماں، تمہیں زیادہ سمجھداری سے کام لینا چاہیئے تھا۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔ غصے سے اس کا رنگ بھی سفید پڑ گیا تھا۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے "تمہیں ایسا کبھی نہیں کرنا چاہیئے۔ نہیں کرو گی نا؟"

"کیا نہیں کرنا چاہیئے، بیٹی!" ماں کی آواز میں حیرت اور نیم غصے کی کیفیت تھی۔

"اُسے ہمیشہ یاد دلاتے رہنا" میری بولی۔ وہ رونا چاہتی تھی لیکن روئی نہیں۔

ماں سمجھ گئی۔ کشیدگی کا موقعہ آنے سے پہلے ہی میری بھی بارش میں بھیگتی ہوئی دھان کی کوٹھی کی طرف دوڑتی چلی گئی۔ مطلع ابھی تک صاف نہیں ہوا تھا۔ ماں بھی پھر برسنا چاہتی تھی، شاید جھنجھوڑنا بھی کہ وہ اتنی گستاخ کیسے ہو گئی! ایک لڑکی اس طرح بڑوں کو سبق پڑھانے، ماں کو ٹوکے! میری کی بات سے کتنے پہلو نکلتے تھے جیسے یہ بھی کہ ٹیڈ کو موت۔ اچانک موت کی بار بار یاد دلائے بغیر اسے اچانک مرنے کے لیے چھوڑ دیا جائے! حالانکہ ایک بچے کے ان الفاظ میں "زندگی آخر ہے کیا؟ کیا موت سب سے زیادہ ڈراؤنی چیز ہے؟ زندگی کی کتنی قدروں کا مفہوم پوشیدہ ہے۔ ماں تری بلا رضا مرضی سے گھر میں چلی گئی۔ میری دھان کی کوٹھی میں پہنچی تو وہاں ٹیڈ موجود تھا۔ وہ خالی اصطبل میں کھڑا، دیوار کی طرف پیٹھ کیے خلا میں گھور رہا تھا۔ دونوں میں کوئی سوال جواب نہیں ہوئے۔ ٹیڈ نے صرف "چوں" کہا اور میری بولی "چلو ٹیڈ" شاید وہ دونوں بارش میں کھیلنے جا رہے تھے جو خطرناک کھیل کھیلنے کے موڈ میں تھے۔ بارش

ختم ہونے لگا تو میری نے کہا "آؤ، ہم جوتے اتار ڈالیں۔" ننگے پاؤں چلنا ٹیڈ کے لیے سخت مشکل تھا۔ دونوں نے اپنے جوتے اتار ڈالے اور انہیں کوٹھی میں چھوڑ کر پانی کی طرف چل پڑے۔ نالی میں ایک کھاڑی تھی جو ندی میں جاکر ملتی تھی۔ اس میں پانی آئی ہوئی تھی۔ دونوں اس کھاڑی کے پاس گئے۔ میری کا اس میں پاؤں پھسل گیا اور ٹیڈ کو اسے کھینچ کر پانی سے باہر نکالنا پڑا۔ تب اس نے کہا: "میں نے ماں سے کہہ دیا ہے" اور وہ سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔

"کیا؟" ٹیڈ نے کہا "دیکھو میں نے تم کو ڈوبنے سے بچایا کہ نہیں؟"

"ہاں، ہاں بچایا" میری بولی۔ "میں نے ماں سے کہہ دیا ہے کہ وہ ہمیں کچھ نہ بولے" وہ یکایک پھر گئی "انہیں میری بات سننی پڑے گی۔ انہیں ایسا کرنا ہی پڑے گا۔"

دونوں بچوں میں ایک غیر شعوری معاہدہ تھا اور ٹیڈ ایک فریق کی حیثیت سے اپنے حصے کا فرض ادا کر رہا تھا۔ اس کا تخیل تیز تھا اور کئی خطرناک اور مہم کے کام اس کے دماغ میں آتے۔ شاید ماں نے باپ سے اور بڑے بھائی ڈان سے بھی کہہ دیا تھا۔ کیونکہ اب خاندان میں ان دونوں کو اپنے حال پر چھوڑ دینے کا ایک نیا رجحان دکھائی دے رہا تھا، جس کی وجہ سے ان دونوں کو زیادہ کھل کر کھیلنے کا موقع ملا۔ جیسے کوئی پابندی اٹھا دی گئی ہو۔ وہ اپنی ایک چھوٹی سی اندرونی دنیا بنا ہی چکے تھے جو سر دست از سر نو تعمیر ہوتی رہتی اور اس میں ایک طرح کی حفاظت کا احساس پایا جاتا۔ دونوں بچے محسوس کرتے تھے اگرچہ ان کا یہ احساس الفاظ میں ڈھل کر غیر مبہم نہیں ہو پایا تھا کہ وہ اپنی ہی بنائی دنیا میں رہتے ہوئے اور وہاں خود کو محفوظ سمجھتے ہوئے دفعتہً باہر کی دنیا میں بھی جھانک سکتے تھے اور ایک نئے زاویے سے یہ دیکھ سکتے تھے کہ اس دنیا میں جو ان کے علاوہ دوسروں کی بھی ہے کیا کچھ ہو رہا ہے۔

یہ وہ خارجی دنیا تھی جس کے بارے میں سوچا جا سکتا، دیکھا جا سکتا تھا۔ کشمکش اور تصادم کی دنیا، انسانی رشتوں میں ہونے والی کشمکش کی دنیا۔ ان کی ذاتی دنیا سے باہر، گھر میں، گلیوں میں، کھیت پر جہاں بچھڑے موٹے ہونے کے لیے آتے اور تگڑے بیل منڈی میں بکنے کے لیے لے جائے جاتے، جہاں گھوڑوں پر سواری کی جاتی اور جہاں میمنے پیدا ہوتے۔ رنگا رنگ بشری پہلو ایک بچے کے لیے عسیر الفہم بلکہ اکثر ناقابل فہم ہوا کرتا ہے لیکن اس دن سے جب بارش ہو رہی تھی اور گھر کے پورچ کے پاس ماں سے دو دو باتیں ہوئی تھیں، میری کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے

ٹیڈ کے ساتھ مل کر ایک نیا گھر بسا لیا ہو۔ اب گھر، کھیت اور ماں کی کوششیں سب چیزیں زیادہ پیاری پیاری دکھائی دینے لگی تھیں۔ ان میں ایک نئی طرح کی آزادی کا احساس پیدا ہوا تھا۔ دونوں بچے گاؤں کے راستے پر ساتھ ساتھ چلتے اور شام میں اسکول سے لوٹ کر کھیت میں چلے جاتے۔ راستے میں دوسرے بچے بھی ہوتے لیکن وہ دونوں یا تو آگے نکل جاتے یا پیچھے رہ جاتے۔ دونوں میں مشورے ہوتے، منصوبے بنتے۔ "میں بڑی ہو کر نرس بنوں گی" میری کہتی۔ شاید اس کے ذہن میں اس نرس کا تصور رہا ہو جو گھر میں اس وقت ٹھہری تھی جب ٹیڈ بیمار تھا۔ ٹیڈ کہا کرتا "ہم تو گھر سے بھاگ جائیں گے کاؤبوائے بنیں گے نہیں تو ریلوے انجینیئر بنیں گے" یعنی وہ اس ریل کی پٹریوں پر کام کرنا چاہتا تھا جو ریچ ویلی میں کھیتوں کے کنارے کنارے گزرتی تھیں۔

جہاں تک ان کے چھوٹے تنوں کا تعلق ہے جو گھر کے پاس تھے وہ سیب کے دو پیڑوں کا باقی ماندہ حصہ تھے۔ بچے سیب کے ان پیڑوں کو بھی جانتے تھے جنہیں ایک دن پت جھڑ کے ابتدائی زمانے میں کاٹ ڈالا گیا۔ گرے ہاؤس کا پچھلا پورچ بھی تھا۔ پورچ کی سیڑھیوں سے ایک راستہ اس پتھریلے مکان کی طرف جاتا تھا جو ٹھنڈک کے لیے تھا، کیونکہ اس میں گوشت اور دوسرا سامان بھرا رہتا۔ چشمے کے کنارے بنا ہوا تھا اور یہ چشمہ کھیت کے نیچے کنارے کنارے بہتا ہوا ماں کی دو بڑی بڑی کوٹھیوں سے گزر کر اور سبزہ زار سے ہوتا ہوا اس کھاڑی میں جا ملتا تھا جسے ورجینیا میں "برانچ" (شاخ) کہتے ہیں اور یہ دونوں درخت چشمے کے پاس والی پتھریلی کوٹھی کے محاذی اور جنگلے سے لگے ہوئے ایک دوسرے کے قریب کھڑے تھے۔

یہ درخت ہرے بھرے تھے جن کی جڑیں زرخیز اور دائم مرطوب رہنے والی زمین میں پیوست تھیں۔ ان میں سے ایک پیڑ کی ایک موٹی ٹہنی جھک کر زمین سے لگی تھی جس پر کبھی کبھی میری اور ٹیڈ چڑھتے تھے اور وہاں سے چھلانگ لگا کر دوسرے پیڑ کی ٹہنی تک پہنچ جاتے اور جب پت جھڑ کا موسم آیا، مکان کے سامنے اور پہلو کے دوسرے درختوں سے پتے جھڑنے لگے لیکن سیب کے ان دونوں درختوں سے لہو کی طرح سرخ پتے برابر چمٹے ہوئے تھے۔ خاکستری مائل دنوں میں یہ پتے سوکھے ہوئے لہو کی طرح نظر آتے لیکن سورج نکلتا تو ایسا لگتا جیسے [illegible]

کے حساب سے نیچے زیادہ پیڑ کی طرح دھک رہا تھا۔ جب ہوا چلتی تو یہ چھوٹے ہوئے
پتے آپس میں سرگوشیاں کرنے لگتے اور ایسا محسوس ہوتا جیسے یہ دونوں
پیڑ آپس میں مصروف گفتگو ہوں۔

ایک دن جان گرے کو یہ بتایا گیا کہ ان درختوں کو کاٹ ڈالا جائے
ایسا ہونے کی کوئی خاص وجہ نہیں تھی البتہ اس نے اعلان کر دیا "میں سوچتا
ہوں کہ انہیں کاٹ ڈالا جائے"۔

"لیکن کیوں؟" اس کی بیوی نے پوچھا۔ "یہ درخت اس کے لئے
بہت کچھ تھے۔ ان درختوں کو ٹھیک اسی جگہ پر اس کے دادا نے لگایا تھا
وہ بولی "خزاں کے موسم میں جب ہم کھڑکی پر بیٹھے ہوتے ہیں کھڑے ہوں تو پہاڑوں
کے علاوہ وہ دیکھنے میں کتنے خوبصورت لگتے ہیں"۔ اس نے یہ بھی بتایا
کہ ان بڑے بڑے درختوں کو کس طرح دور کے جنگل سے لایا گیا تھا اور
یہ کہ گرے کے دادا جان کو ان درختوں سے کتنا لگاؤ تھا۔ جان گرے نے
جواب دیا "یہ روگ اسمتھ نال خاندان والے ہی پال سکتے ہیں۔
دیکھو ہمارے گھر کے آس پاس کافی درخت ہیں پھر گھر پر یا آنگن میں ان کا
سایہ بھی آ رہتا پڑتا۔ ایک سمتھ نال ہی درختوں کیلئے اتنی تکلیف
اٹھا سکتا ہے اور انہیں ایسی جگہ لگا سکتا ہے جہاں گھاس اگانا چاہئے"۔
یہ کہتے کہتے اس نے یکایک فیصلہ کر لیا اور یہ فیصلہ حتمی تھا۔ ارادہ سخت ہونے
کے علاوہ اسمتھ نال والوں کے طور طریقوں کے بارے میں کافی علم رکھتا تھا
درختوں کے بارے میں یہ گفتگو کھانے کی میز پر ہوئی تھی اور ٹیڈ اور بیری
یہ دونوں یہ گفتگو سن رہے تھے۔

بات میز سے شروع ہوئی، لیکن گھر کے باہر اسے عملی جامہ پہنایا جانے
والا تھا، بیوی گھر کے پچھواڑے سیڑھیوں کے نیچے بیٹھ گئی۔ جان گرے
ہمیشہ کی طرح اچانک طور پر خاموشی سے میز کے پاس سے اٹھا اور تیزی سے
لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اور دروازہ دھڑام سے بند کرکے باہر نکل گیا تھا
بیوی نے پیچھے سے چلا کر لپکتے ہوکر اور اپنے شوہر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا
"نہیں جان ایسا نہ کرو"۔

اس دن سردی تھی لیکن سورج نکلا ہوا تھا اور کھیتوں اور دوسرے
درختوں کے اس طرف یہ درخت دھند میں جھکے ہوئے دکھائی دے رہے تھے
نوجوان ٹیڈ جو شکل و صورت میں بالکل اپنے باپ کے مشابہ تھا اور بیری
سے بظاہر اس سے ملتا جلتا تھا اپنی ماں کے ساتھ گھر سے باہر نکلا اور

ٹیڈ اور بیری بھی ان کے پیچھے پیچھے آ گئے۔ شروع میں تو دونوں نے کچھ
نہیں کہا لیکن جب باپ نے ان کے احتجاج کا جواب نہیں دیا اور
درختوں کو کاٹنے کی طرف اسی طرح بڑھتا رہا تو وہ بھی بول پڑا۔ اس نے
جو کچھ کہا اس میں عزم جھانک رہا تھا لیکن جس نے باپ کے ارادے کو
اور بھی پختہ کر دیا تھا۔

یہ دونوں بچے ایک کنارے کھڑے ہو کر یہ تماشہ دیکھنے
لگے۔ کچھ نہ کچھ بات ضرور تھی۔ لیکن وہ تو اپنی اس طفلانہ دنیا میں گم تھے
جس کا اصول ہے "نہ ہم کو نہ چھیڑو ہم تمہیں نہ چھیڑیں گے"۔ وہ جو کچھ دیکھ
رہے تھے اس کی تہہ میں ایک مبہم سا احساس تھا۔ اس دوپہر میں جو باتیں
ہوئیں بیری گرے کو ایک عرصے بعد واضح شکل میں یاد آئیں، جب وہ
لڑکی سے عورت بن چکی تھی۔ اس وقت اس نے جھگڑا دیکھ کر اس کے دل
میں تنہائی کا احساس یکایک شدید ہو گیا تھا جیسے ٹیڈ اور وہ ایک طرف
ہوں اور دوسرے تمام لوگ ایک طرف اور ان کے درمیان ایک دیوار
کھڑی ہو۔ اس وقت باپ شائد نئے روپ میں نظر آ رہا تھا اور وہ
اور اس کی ماں ایک اور نئے روپ میں۔

زندگی میں لوگوں کے باہمی رشتوں میں کوئی نہ کوئی بات ہوتی ہے جسے
ہم بھرپور تخریبی قوت کہہ سکتے ہیں۔ اس دن بیری کو اس تخریبی قوت کا
مبہم سا، دھندلا سا احساس ہوا تھا جیسے اس نے ایک طویل عرصے بعد
ٹیڈ کے مرنے کے بہت دنوں بعد واضح طور پر محسوس کیا تھا سامنے وہ
کیفیت تھا جسے اس کے باپ نے ثابت قدمی سے ہوشیاری اور چالاکی
سے اسمتھ نال والوں سے چھپا لیا تھا۔ گھر میں وقتاً فوقتاً جو کھل کر یا
اشاروں کنایوں میں باتیں ہوتی ہیں، اختلافات ہوتے ہیں ان کا اثر دیر
دیر تک قائم رہتا ہے۔ باپ ـــ جان گرے ایک کامیاب انسان
تھا اس نے زمین حاصل کی تھی۔ وہ مالک تھا۔ حاکم تھا، ایسا حاکم جو ارادے
کو عمل میں لانے کی پوری قوت رکھتا تھا اور یہ قوت اپنی حدوں سے باہر
نکل کر صرف انسانی زندگیوں پر نہیں بلکہ ان کے ارادوں، مرادوں اور
خواہشوں کو بھی لپیٹ میں لے رہی تھی۔ کیا اسی لئے میری گرے نے یہ
تمام باتیں سوچی تھیں؟ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی اس وقت تو وہ ایک مخصوص
صورت حال سے دوچار تھی جس میں اس کے بھائی ٹیڈ سے جو جلد مرنے
والا تھا ایک مخصوص رشتہ قائم ہو چکا تھا۔ ملکیت کا احساس بھی عجیب

احساس ایسے عجیب و غریب اختیارات تفویض کرتا ہے، قطعاً عطا کرتا ہے یا پھر کہ اپنے بچوں پر، آدمیوں اور عورتوں کا، اراضی پر، کھیتوں پر، گھروں پر، شہروں میں فیکٹریوں پر!

"میں اس باڑی کے درخت کو کٹوا کر رہوں گا۔ ان میں سیب لگتے تو ہیں لیکن صحیح قسم کے نہیں۔ اب ایسے سیبوں سے کوئی مالی فائدہ نہیں!"

"لیکن، ابا حضور ذرا دیکھئے، سنئے"

"بکواس، نری جذباتیت!"

انتشار ———

میری گرے کے باپ کے بارے میں یہ سوچنا حماقت ہے کہ احساس سے عاری آدمی تھا۔ وہ ساری عمر جد و جہد کرتا رہا تھا اور شاید ایک نوجوان آدمی کی حیثیت سے کئی محرومیوں اور تنگیوں کا شکار رہا ہوگا اس دنیا کے لئے کچھ نہ کچھ اکٹھا کرنا ہی پڑتا ہے۔ ملکیت کا مطلب ہے طاقت، یہ کہہ سکنے کا اختیار کہ "وہ" نہ کرو۔ اگر کوئی کسی چیز کے حصول کے لئے سخت اور مسلسل جد و جہد کرے تو یہ چیز اس کے لئے مسرت کا سامان تو بن ہی جائے گی۔

کیا گرے خاندان کے باپ اور بیٹے کے درمیان کوئی نفرت تھی؟ "تم میں بھی وہی بات ہے جو مجھ میں ہے۔ میری ہی طرح اقتدار کا جنون۔ ابھی تم جوان ہو اور میں بوڑھا ہو رہا ہوں" تعریف میں ملا جلا خوف

نوجوان لڑکا اپنے باپ سے کتنا ملتا جلتا تھا! اس کے چہرے میں ویسی ہی لکیریں تھیں۔ ویسی ہی آنکھیں۔ دونوں بھاری بھر کم تھے۔ نوجوان بڈ کی چال اپنے باپ کی طرح تھی وہ باپ ہی کی طرح دروازہ دھڑام سے بند کرتا۔ دونوں خیال کی نفاست اور لطافت سے محروم تھے۔ دونوں میں ایک بھاری پن تھا جو من مانی کروا سکتا تھا۔ جب جان گرے نے لوئیس اسمتھ سے شادی کی تھی تو وہ ایک پختہ آدمی بن چکا تھا اور اس کی کامرانی کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ ایسے آدمی جوانی میں بلا سوچے سمجھے شادی نہیں کیا کرتے! وہ ساٹھ سال کا ہو چلا تھا اور اب اس کے لڑکا بھی تھا۔ اس سے کتنا ملتا جلتا، جس میں وہی قوت تھی جو اس میں تھی۔ دونوں اراضی کے بڑھانے والے، ملکیت سے پیار کرنے والے۔

"یہ میرا کھیت ہے، میرا گھر ہے۔ میرے گھوڑے، میری بھیڑیں۔ میرے سارے مویشی۔ اب جلدی۔ آئندہ دس برسوں میں، زیادہ سے زیادہ پندرہ برس میں میرا باپ مرنے کے قریب ہوگا۔

تیرا ہاتھ ابھی سے پھسلنے لگا ہے۔ سب کچھ تیری گرفت سے نکل جائے گا۔ اس لئے ——— جان گرے نے اتنی بڑی جائداد آسانی سے حاصل نہیں کی ہے۔ اسے کتنے صبر و ضبط سے کام لینا پڑا ہوگا۔ کتنی ثابت قدمی سے۔ یہ بات تو وہی خود سمجھ سکتا تھا۔ پانچ۔ دس۔ اور پندرہ سال کا کام ——— بچت۔ اپنی نوال خاندان کے کھیت کا قطعہ بقطعہ لینا۔ "بے وقوف کہیں کے" سمجھتے تھے ہم نواب ہیں۔ اور معاملہ یہ تھا کہ اپنی زمین ٹھکانے لگا رہے ہیں۔ اپنی بیس ایکڑ۔ ابھی تیس ایکڑ اور ابھی کہاں گھوڑے پال رہے تھے گھوڑے جو ایک ایکڑ زمین میں بھی ہل چلا نہیں سکتے۔

اور اب وہ زمین سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ اسے زرخیز بنانے کے لئے انہوں نے کچھ بھی تو نہیں کیا تھا۔ سوچتے تھے "ہم ایسے نوال جو اشراف ابن شریف، ہیں ہل چلا کر اپنے ہاتھ آلودہ کرنا نہیں چاہتا۔"

بے وقوف، جو جانتے نہ تھے کہ زمین کی ملکیت کا کیا مفہوم ہے، دولت، ذمہ داری۔ دوسرے درجے کے لوگ تو دراصل یہی ہیں۔ اس نے ایک اپنی نوال خاندان کی لڑکی سے شادی کی جو آگے چل کر سب سے امیر سب سے زیادہ ہوشیار ثابت ہوئی اور جوان سیبوں سے زیادہ لمبی رت بھی نکلی۔

اور اب اس کا لڑکا تھا جو اس نے اپنی ماں کے ساتھ کھڑا تھا۔ دونوں پورچ سے باہر آ گئے تھے یہ فطری امر تھا اور مناسب بھی کہ وہ۔ جیسا کہ وہ کچھ تھا اور جیسا کہ وہ کچھ بننا چاہتا تھا ——— اپنا وقت آنے پر مالک بھی بنے اور حکمرانی بھی کرے۔

البتہ دوسرے بچوں کے بھی تو حقوق تھے۔ اگر تم میں دم خم ہے۔ جیسا کہ جان گرے کے خیال کے مطابق اس کے لڑکے (ڈان میں تھا) تو معاملہ طے پا سکتا تھا۔ تم انہیں خرید سکتے ہو۔ ان کا کوئی نہ کوئی انتظام کر سکتے ہو۔ ایک ٹیڈ تھا۔ جو زندہ رہنے والا نہیں تھا اور میری اور دوسرے دونوں بچے تھے۔ بہتر ہے کہ تم ابھی سے جد و جہد کرو۔

یہ تمام خیالات۔ باپ اور بیٹے کے درمیان ہونے والی اچانک کشمکش کے تمام مضمرات جو اس سے پیدا ہوئے تھے۔ میری کے ذہن میں آہستہ آہستہ مبہم صورت میں ابھرنے لگے تھے جو ابھی ایک بچے

سے کچھ بھی پوچھتی تھی کیا ڈر لالی وقت پیدا ہوتا ہے جب بیج زمین میں
بویا جائے؟ یا بعد میں جب زمین سے پودا سر نکالتا ہے؟ اور اس میں
کلیاں نکلتی ... اور پھر جب اس میں پھل پکتے ہیں؟
گریسے خاندان وا... تھے ۔ پھونک پھونک کر قدم رکھنے والے تھے،
بہت کم خرچ کرنے والے، بڑھاپے کے رحم و کرم پہ ، صابر ۔ انہوں نے کیوں اس جیسی لالچی خاندان
کو پیدا نہیں کر دیا تھا! اسی لالچ جس کا خون لالچی کے دونوں بچوں، بیوی اور
خود اُس کی رگوں میں بھی تھا!

موسم خزاں کے اُس دن، ایک طرف بیٹا اور اپنی ماں کے ساتھ اور
دوسری طرف دونوں بچے بیوی اور بیٹا الگ تھلگ کھڑے تھے ۔
ایسا نہ کرو جان! ابھی گریسے نے پھر کہا ۔ باپ جو دھان کی کوٹھی
کی طرف بڑھ رہا تھا، رک گیا

"کیوں نہیں؟"
"نہیں ۔ ایسا نہ کرو!" نوجوان اُن پر پیٹ پڑا ۔ اس کی آنکھوں
میں عجیب وغریب گڑگڑانے والی نظر تھی ۔ اس میں ایک جاندار چمک پیدا
ہوگئی جیسے باپ سے کہہ رہی ہو: "میں مالک ہوں ۔ میں مالک بننے والا
ہوں"

باپ مڑا ۔ بیٹے کو تیز نظروں سے دیکھا اور پھر اُسے نظرانداز کر دیا ۔
ماں التجا کر رہی ہے ۔ لیکن کیوں؟ آخر کیوں؟"
"یہ پیڑ کمزور ہیں ۔ ان کے سائے میں گھاس نہیں اُگتی ۔"
"لیکن ہمارے پاس بہت گھاس ہے ۔ گائیوں کے لئے کئی ایکڑ
زمین ہے"

جان گریسے اب اپنی بیوی کو جواب دینے ہی والا تھا لیکن اُس کی
نظر اپنے لڑکے پہ تھی ۔ اُن دونوں کے درمیان خاموش لفظوں میں گفتگو ہو رہی
تھی ۔

"میں مالک ہوں، میرا حکم چلتا ہے ۔ تمہیں منع کرنے کا کیا مطلب ہے؟"
"اچھا! آپ مالک ہیں ۔ خیر لیکن جلد ہی میں مالک بننے والا ہوں"
"جہنم میں جاؤ"
"بے وقوف ابھی نہیں ۔ ابھی نہیں ۔"
آخر میں مذکورہ بالا الفاظ ادا نہیں کئے گئے اور آگے چل کر بیوی
کو بھی یاد نہ رہا تھا کہ ان دونوں نے کون کون سے الفاظ استعمال کئے تھے ۔

دونوں کے اندر ایک عزم بجلی کی طرح جاگ اُٹھا تھا ۔ شاید اپنی ماں کو حمایت
کرنے کا ایک عزم ۔ شاید کسی اجابت کا عزم ۔ اس کی رگوں میں بہنے
والے اسی لالچی خون کا جذبہ ۔ ایک لمحے کے لئے درخت کی محبت
گایوں کی محبت پہ حاوی ہو رہی تھی، گھاس جیسے کاکریل بگڑے ہوئے
ہیں ۔

"تم ایسا نہیں کر سکتے"
"کیا نہیں کر سکتا"
"وہ درخت کاٹ نہیں سکتے"
باپ نے اس کا جواب نہیں دیا ۔ وہ دھان کی کوٹھی کی طرف
بڑھنے لگا ۔ سورج اب بھی چمک رہا تھا ۔ بدن میں چبھنے والی سردی پھیل
رہی تھی ۔ دونوں درخت دور کی پہاڑیوں کے محاذی دھدھک رہے
تھے جیسے کہیں آگ جلائی ہو ۔

دوپہر کا وقت تھا ۔ وہاں دو آدمی تھے، دونوں جوان کھیت کے
ملازم جو دھان کی کوٹھیوں کے اس پار کرایہ کے مکان میں رہتے تھے ۔
ان میں سے ایک ۔ جس کا ادھیڑ عمر کا بیٹا تھا ۔ شادی شدہ تھا
اور دوسرا جو خاموش طبیعت کا ایک خوبصورت جوان تھا اُس کے گھر
میں کھانا کھاتا تھا ۔ وہ ابھی ابھی دوپہر کا کھانا کھا کر نکلے تھے اور دھان
کی ایک کوٹھی کی طرف جا رہے تھے ۔ خریف کی فصل کاٹنے کا زمانہ
شروع ہو چکا تھا اور وہ دونوں دھان کاٹنے دور کے ایک کھیت میں
جانے والے تھے ۔

باپ دھان کی کوٹھی سے ان دونوں آدمیوں کو ساتھ لیا آیا ۔ وہ
اپنے ساتھ کلہاڑے اور آرے لائے تھے ۔
"ان درختوں کو کاٹنا ہے" جان گریسے کے انداز سے ایک
اندھا بگڑا احمقانہ عزم ظاہر ہو رہا تھا اور وہ اس لمحے اس کی بیوی، اس کے
بچوں کی ماں ......
بچوں کو کیا معلوم تھا اور معلوم بھی کیسے ہوتا کہ اُن کی ماں اس طرح کے
کتنے لمحوں سے گزر چکی تھی جب اس نے جان گریسے سے شادی کی تھی ۔ وہ
اس کا آدمی تھا ۔

ابا جان ۔ اگر آپ ایسا کریں گے ... لڑکا گریسے نے سرد
لہجے میں کہا ۔

"تمہیں جو کہتا ہوں وہ کرو۔ دونوں درختوں کو کاٹ ڈالو۔" لیڈی
شکمو دونوں مزدوروں کی طرف تھا۔ اُن میں سے ایک جس کا اُوپری
ہونٹ کٹا ہوا تھا ہنسنے لگا۔ اس کی ہنسی گدھے کے رینکنے سے ملتی
جلتی تھی۔

"نہیں ایسا نہ کرو۔" لوئیس گریسے نے کہا۔ لیکن اب کی بار وہ اپنے
شوہر سے مخاطب نہیں تھی وہ اپنے بیٹے کے قریب گئی اور اس کا بازو
پکڑ کر کہا۔

"ایسا نہ کرو۔"

"ماں سے مت لڑو۔ میرے آدمی سے مت لڑو۔" کیا میری
گریسے بھی یہ بات سمجھ سکتی تھی! وہ باتیں جو زندگی میں پیش آتی ہیں
انہیں سمجھنے کے لئے وقت درکار ہوتا ہے۔ زندگی ذہن میں آہستہ آہستہ
منکشف ہوتی ہے۔ میری بیٹے کے ساتھ کھڑی تھی جس کا طفلانہ چہرہ سفید
اور سُتا ہوا تھا۔ موت اُس کے آس پاس منڈلا رہی تھی کسی بھی لمحے کسی
بھی لمحے وہ ......

"میں سیکڑوں بار اس مرحلے سے گزر چکی ہوں۔ یہ آدمی جس
سے میں نے شادی کی ہے اسی طرح اپنی بات منواتا آیا ہے۔ کوئی چیز
اُسے باز نہیں رکھ سکتی۔ میں نے اس سے شادی کی ہے۔ اس کے
بچے پیدا کئے ہیں۔"

"ہم عورتیں جھکنے ہی میں عافیت سمجھتی ہیں۔"

"یہ تم سے زیادہ میرا معاملہ ہے۔ ڈان۔ میرے بچے۔
ایک عورت جو اپنی ہی چیزوں کی دست نگر ہوتی ہے۔ اپنے گھر کی
بھی، جو اُس کے اِرد گِرد تخلیق کیا جاتا ہے۔"

بیٹا معاملات کو ماں کی آنکھوں سے نہیں دیکھ رہا تھا۔ اُس
نے ایکاں کا ہاتھ جو اُس کے بازو پر تھا جھٹک دیا۔ لوئیس گریسے اپنے میاں
سے عمر میں چھوٹی تھی۔ اگر وہ ساٹھ کے پیٹے میں تھا تو وہ بھی پچاس کے لگ
بھگ رہی ہوگی۔ اُس لمحے وہ بہت ہی نازک اور کمزور نظر آ رہی تھی،
اُس لمحے اُس کی چالیس سال میں کوئی خاص بات تھی۔ کوئی خاص بات جو
خون میں ہوتی ہے۔ ایسی لاتعلق خون میں؟

اُسی لمحے میری شاید مبہم طریقے سے سب کچھ سمجھ رہی تھی۔
عورتیں اور اُن کے آدمی! لیکن اس وقت اُس کے لئے صرف ایک ہی

وحشی ڈکوبر سے... ایک ہی فرد تھا۔ بچہ ٹیڈ۔ ایک وقت کے
بعد اسے یاد آیا کہ بیٹا اُس وقت کس طرح نظر آ رہا تھا۔ اس کے لڑکے
چہرے پر منچلانہ سنجیدگی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے چہرے سے
اُس نے یہ بعد میں سوچا تھا۔ باپ اور بھائی دونوں کے لئے ایک قسم
کی نفرت کا عنصر دکھائی دے رہا تھا جیسے وہ لڑکا آپ سے کہہ رہا
ہو۔۔ حالانکہ درحقیقت وہ اپنے آپ سے ایسی باتیں نہیں کہہ سکتا تھا۔
وہ بہت چھوٹا تھا۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ یہ احمق لوگ۔ میرا باپ
اور بھائی۔ میں زیادہ دن چپ نہ رہوں گا تو نہیں، لیکن اگر میں زندہ رہا تو
دیکھ لینا۔ میں کیا کرتا ہوں۔"

بھائی ڈان ایک دو قدم بڑھا کر باپ کے اور قریب پہنچ گیا

"اگر آپ ایسا کریں گے ابا جان ......"

"تو کیا کرو گے؟"

"میں یہ کھیت چھوڑ دوں گا اور پھر کبھی نہیں آؤں گا۔"

"اچھی بات ہے تو چلے جاؤ۔"

اب باپ اُن دو آدمیوں کو ہدایت دینے میں مصروف تھا
جو درخت کاٹنا شروع کر چکے تھے۔ وہ آدمی جس کا اوپری ہونٹ کٹا
تھا جھنجھلا رہا تھا ایسی ہنسی جو گدھے کے رینکنے سے ملتی جلتی تھی۔ "تیز
کرو۔" باپ نے تیزی سے کہا اور ہنسی کی آواز یکایک رُک گئی۔

بیٹا ڈان چل دیا۔ وہ بلا مقصد دھان کی کوٹھی کی طرف بڑھ
رہا تھا۔ وہ ایک کوٹھی کے پاس پہنچ کر رک گیا۔ ماں جو سفید پڑ چکی تھی
تقریباً بھاگتے ہوئے گھر میں داخل ہو گئی۔

بیٹا گھر کی طرف پلٹا وہ دونوں بچوں کے پاس سے گزرا، مگر
اُن کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا اور نہ گھر میں داخل ہوا۔ باپ نے
اُس کی طرف نہیں دیکھا۔ وہ گھر کے سامنے والی پگڈنڈی سے ہوتے ہوئے
گزر کر پھاٹک میں داخل ہوا وہاں سے راستے پر آ گیا۔ راستہ وادی
میں سے کئی میلوں تک چلا گیا تھا اور پھر گھوم کر پہاڑ پر سے ہوتے
ہوئے شہر کی طرف جاتا تھا۔

جب ڈان لوٹ کر کھیت میں آیا تو سب سے پہلے میری نے اسے
دیکھا تھا۔ تقریباً چار تشویشناک دن گزر چکے تھے۔ شاید اُس [illegible]
ماں اور بیٹے میں مخفی طور پر رابطہ قائم تھا۔ گھر میں ٹیلیفون تھا۔

دن بھر کھیتوں میں ہوتا تھا اور جب وہ گھر میں ہوتا تھا تو مکمل خاموشی چھائی رہتی تھی۔

جس دن بلانی لوٹ کر کھیت میں آیا اور باپ بیٹے ملے تو میری وہیں دھان کی ایک کوٹھی کے پاس تھی۔ یہ عجیب بے تکی ملاقات تھی۔

بیٹا آیا۔ میری نے ایک مدت کے بعد اس کا تقریباً جھکتے جھکتے کیا تھا۔ باپ اصطبل سے نکلا۔ وہ گھوڑوں کو چارا ڈال رہا تھا۔ باپ بیٹے میں سے کسی نے میری کو نہیں دیکھا تھا۔ کیونکہ کوٹھی کے پاس ایک کار کھڑی تھی اور وہ دبے پاؤں چھپ کر اس کار میں ڈرائیور کی نشست پر جا بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ اسٹیرنگ وہیل پر تھے اور وہ اس طرح بیٹھی تھی جیسے گاڑی چلا رہی ہو۔

"ہیلو!" باپ نے کہا۔ اگر وہ اس وقت خود کو فاتح محسوس کر رہا تھا تو بھی اس نے اس احساس کا ذکر نہیں کیا۔

"میں واپس آگیا ہوں۔" بیٹے نے کہا

"جانتا ہوں۔" باپ نے جواب دیا۔ "دھان کاٹنا جلد ہی ہے۔" وہ کوٹھی کے دروازے کے پاس گیا اور پھر رک کر مڑا۔

"یہ سب کچھ تمہارا ہی ہے۔ تم اس کے مالک ہو گے۔"

اس نے اور کچھ نہیں کہا اور وہ دونوں چلے گئے۔ باپ دور دراز کھیتوں کی طرف اور بیٹا گھر کی طرف۔ میری کو پورا یقین تھا کہ باپ بیٹے میں اس سے زیادہ اور کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔

باپ کے کہنے کا مطلب تھا۔

"جب یہ تمہارا ہو گا اسی وقت تم آقا بن سکتے ہو۔" بچہ اس سے زیادہ اور کیا سمجھ سکتا تھا۔ "علم دھیرے دھیرے آتا ہے" اس کا مطلب تھا۔

"طاقت تمہارے ہاتھ میں ہو گی اور جب ہو گی اسی وقت تمہیں اپنی بات منوانے کے لئے پورا زور لگانا ہو گا۔

"ہم جو ہیں وہ معلوم ہے۔ ہم کمزور لوگوں کے ساتھ وقت برباد نہیں کر سکتے۔ کچھ آدمی حکم دینے کے لئے پیدا ہوتے ہیں اور کچھ حکم ماننے کے لئے۔ جب تمہاری باری آئے گی تو تم انہیں تابعداری پر مجبور کرنا۔

موت کی ایک قسم ہوتی ہے۔"

"اس سے پہلے کہ تم مالک بنو اور حکم چلاؤ تمہارے اندر کسی چیز کو مر جانا چاہئے۔"

موت کی ظاہر ہے کہ ایک سے زیادہ قسمیں ہیں۔ ڈان کے لئے ایک قسم کی موت اور چھوٹے بھائی ٹیڈ کے لئے دوسری قسم کی موت جو جلد آنے والی تھی۔

میری اس دن بھاگ کر لی ہوئی۔ وہ جلد سے جلد روشنی میں آنا چاہتی تھی۔ اور بعد میں ایک عرصے تک اس نے یہ ٹھیک ٹھیک سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی کہ اس دن کیا کچھ ہوا تھا۔ البتہ بعد میں وہ اور ٹیڈ دونوں ان درختوں کے بارے میں اکثر بات چیت کرتے رہتے تھے۔ ایک دن جب سردی تھی وہ دونوں وہاں گئے تھے اور کٹے ہوئے تنوں کو اپنی انگلیوں سے چھوا تھا۔ لیکن یہ کٹے ہوئے تنے کتنے ٹھنڈے تھے!

ٹیڈ اس پر اصرار کرتا رہا کہ صرف مردوں کے ہاتھ پیر کاٹے جاتے ہیں۔ جس سے میری انکار کرتی رہی۔ دونوں وہ سب کام برابر کرتے رہتے جن سے ٹیڈ کو منع کیا گیا تھا۔ لیکن کوئی مزاحمت نہیں کرتا تھا اور ایک یا دو سال بعد ٹیڈ مر گیا۔ اسے اس وقت موت آئی جب رات میں وہ بستر پر سو رہا تھا۔

لیکن جب تک وہ زندہ رہا میری نے ایک عرصے بعد یہ محسوس کیا۔ وہ آزادی کے ایک عجیب و غریب احساس سے بہرہ مند تھا۔ ایسی چیز جس پر صرف اس کا قبضہ تھا جو صرف اس کی ملکیت تھی اور جس کی بدولت وہ ایک لازوال مسرت سے مالا مال تھا۔ اس احساس آزادی کی توجیہہ میری نے آگے چل کر اس طرح کی تھی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اسے جس قسم کی موت مرنا تھا، اس میں وہ نفی ذات نہیں تھی جس سے اس کے بڑے بھائی کو، ملکیت حاصل کرنے کامیاب زندگی گزارنے اور اپنا وقت آنے پر حکم چلانے کا موقع یقین کے ساتھ حاصل کرنے کے لئے گزرنا پڑا تھا اور اس طرح اسے ایسی گہری، تہہ دار اور خوفناک موت کا سامنا نہیں کرنا پڑا جس سے اس کا بڑا بھائی دو چار ہوا تھا۔

متین سروش

غزل

فاقہ کش رندِ قدح خوار وہی ہے کہ جو تھا
خواجۂ شہر سیہ کار وہی ہے کہ جو تھا

دھوم ہے بادۂ عشرت کی طرب گاہوں میں
گریۂ مفلس و نادار وہی ہے کہ جو تھا

جسمِ بے رُوح کے ناسور کا مرہم ہے کہاں
خنجرِ کافر و دیندار وہی ہے کہ جو تھا

حق و انصاف کا ہر چند زمانہ ہے مگر
احتشامِ رسن و دار وہی ہے کہ جو تھا

خواب تعبیر سے بیگانہ ہیں کاشانوں میں
کاسۂ دیدۂ بیدار وہی ہے کہ جو تھا

جشن کاری ہے فقط عیشِ تخیّل کی نمود
حاصلِ دانش و افکار وہی ہے کہ جو تھا

دَورِ نَو شعبدۂ وہم و گماں ہے کہ نہیں
رہروِ وادیِ پُرخار وہی ہے کہ جو تھا

قتل گاہوں میں چراغاں کا سماں آج بھی ہے
فتنۂ عقلِ فسوں کار وہی ہے کہ جو تھا

ہم نے پھاڑے ہیں فقط جیب و گریباں اپنے
گُل فشاں دامنِ اغیار وہی ہے کہ جو تھا

چندِ لمحاتِ گریزاں کو نہ زنجیر کہو
نعرۂ عظمتِ کردار وہی ہے کہ جو تھا

رُوئے تہذیب پہ یہ غازۂ خونِ انساں
حسنِ تخلیق کا شہکار وہی ہے کہ جو تھا

جبرِ حالات پہ آتی ہے ہنسی ہم کو سروش
امتحانِ دلِ بیدار وہی ہے کہ جو تھا


خاندانی تحفظ۔۔
اپنے بچوں کا
مستقبل محفوظ بنائیے
سمجھدار والدین جانتے ہیں کہ
دینا بینک
مائنرس سیونگس سکیم کے
تحت اپنے بچوں کے نام کھاتہ کھولنے
سے اُن کا مستقبل بہتر اور محفوظ
ہوجاتا ہے۔ اس طرح جمع رقم اُن کی
بڑھتی ہوئی ضروریات کی تکمیل
کے کام آتی ہے۔ آپ بھی اپنے بچے
کے نام سے آج ہی مائنرس سیونگ
اکاؤنٹ کھولئے۔ اس پر ۹ فیصدی
سود ملتا ہے۔
دینا بینک
(اے گورنمنٹ آف انڈیا انڈرٹیکنگ)
ہیڈ آفس: دینا بینک بلڈنگس،
ہارنیمن سرکل، بمبئی - ۱

ڈاکٹر یوسف سرمست

ناول کی تنقید

ناول ادب کی بہت ہی اہم صنف ہے۔ اور اس صنف سے دلچسپی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ ناول اس زمانے میں جس قدر لکھے جا رہے ہیں اور اُن کے پڑھنے والے اس قدر زیادہ ہو گئے ہیں کہ بعضوں کا خیال ہے کہ یہ ناول کا دور ہے۔ ہر قسم کے بے شمار ناول بازار میں ملتے ہیں لیکن ناولوں کی اس بہتات کے باوجود ناول کی تنقید کی طرف جیسی چاہیئے توجہ نہیں کی جا رہی ہے۔ ناول سے متعلق اچھی تنقیدی کتابیں تو دور کی بات ہے مختلف رسائل میں بھی ناول پر شاذ و نادر ہی کوئی مضمون ملتا ہے۔ حالانکہ آج کل جس قدر ناول لکھے جا رہے ہیں اُس کا لازمی تقاضا تو یہ ہونا چاہیئے تھا کہ اُردو کے نقاد ناول پر پوری توجہ دیں اور عام پڑھنے والوں کے ذوق کی تربیت میں اپنا حصہ ادا کریں۔ لیکن چونکہ ناول حد درجہ لچک دار اور وسیع صنف ادب ہے اس میں ہر بات بیان کی جا سکتی ہے۔ ہر موضوع کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ زندگی کے ہر رخ کو بے نقاب کیا جا سکتا ہے اس لئے ناول کی اچھائی اور برائی کا تعین بھی بے حد مشکل ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہماری تنقیدی بیگانہ روی کا یہ بھی باعث ۔ اس کے علاوہ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جس طرح سائنس کے میدان میں یا ٹکنالوجی کے میدان میں ہم مغرب سے ہمیشہ کئی سال پیچھے رہا کرتے ہیں اسی طرح تنقید میں بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو ادب میں POPULAR NOVELS اور SERIOUS NOVELS میں عام طور پر کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ نہ ہی ہمارے ادب میں یہ اصطلاحیں ملتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بعض وقت بعض نقاد غیر شعوری طور پر ان دونوں میں فرق کر لیتے ہیں لیکن شعوری طور پر اس فرق کی وضاحت نہیں کر پاتے اصل میں خود ادب اور غیر ادب میں جو فرق کرنا چاہیئے وہ ہم نہیں کیا کرتے ہیں کیونکہ ادب کے نام پر اکثر بے ادبی ہوتی ہے۔ اس سے بھی عام طور پر اغماض برتا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں تنقید میں سکوت سخن شناسی کی بے صلاحیت ہے۔ اسی وجہ سے جانسن نے کہا تھا۔ کسی بھی مصنف کے بارے میں ہمارا بدترین سلوک یہی ہو سکتا ہے کہ ہم اُن کی تصنیف کے بارے میں خاموش رہیں۔ The worst thing that we can do to an author is to be silent as to his work.

لیکن یہ بات اونچی سطح پر تو اہمیت رکھتی ہے لیکن یہ اسی صورت میں اہمیت رکھتی ہے۔ جب اس خاموشی کی معنویت کو کوئی سمجھ جائے۔ اگر اس کے برخلاف کوئی چیز ادب کے نام پر پیش کی جاتی ہے اور ادبی نقاد اس وقت بھی خاموش رہتا ہے تو پھر اس خاموشی کو نیم رضامندی سمجھ لینے کا حق بھی دوسروں کو حاصل ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے پروفیسر ڈیوڈ ڈیچیس نے اس سلسلے میں بڑی اہم بات کہی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک تبصرہ نگار ایک ٹیلی فون ڈائرکٹری کی تعریف اس کی اچھائی کی بنا پر کر سکتا ہے اور ایک ادبی نقاد کو اس بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اس کے برعکس اگر اس ڈائرکٹری کا مصنف یا پبلشر اسے ادب کہہ کر پیش کرتا ہے تو پھر ادبی نقاد کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اس کا جائزہ لے اور ثابت کرے کہ یہ ادب نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ بالکلیہ غیر ادبی کتابوں کے تعلق سے یہ بات واضح ہوتی ہے۔ لیکن بعض جگہ یہ فرق بہت مبہم ہوتا ہے۔ کوئی کتاب ادبی مقصد کو پورا نہیں کرتی لیکن ادبی کہہ کر پیش کی جاتی ہے اس سلسلے میں بھی پروفیسر ڈیچیس نے ایک دلچسپ مثال پیش کی ہے۔

اس کا کہنا ہے کہ ایسا ناول جو چین کے متعلق بڑی اچھی معلومات فراہم کرتا ہے اس پر ایک تبصرہ نگار کا طور پر اس لحاظ سے اس کی تعریف کر سکتا ہے کہ ناول کے ذریعے ہمیں چین سے متعلق اچھی معلومات فراہم کی گئیں۔ لیکن ادبی نقاد اس کے بڑا ادبی محاسن کو نظر انداز کر کے اس کے غیر ادبی مقصد کی بنا پر اسے رد کرتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ ایک ایسی کتاب ہو سکتی ہے جو بالکلیہ غیر ادبی مقصد کے لیے لکھی گئی ہو لیکن اگر وہ ادبی قدر و قیمت رکھتی ہے تو ادب کے نقاد کا فرض ہے کہ اس کے ادبی محاسن کو سراہے اور اس کی وضاحت کرے مثال کے طور پر ایک ناول حلو مائی بھی ہو سکتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ کسی خاص انسانی تجربہ اور جذبہ کو روشنی میں لاتا ہے اور بڑے سلیقے اور انتہائی سلیقہ سے واقعات کو بیان کرتا ہے۔ اور تجربہ کا اعتبار سے انسانی زندگی کے اعتبار سے فکر انگیز ہے اور ذہن پر گہرا نقش بھی چھوڑتا ہے تو ظاہر ہے کہ ایسا ناول ادبی اہمیت بھی رکھتا ہے اور اس بات کی وضاحت ادبی نقاد کا فرض بن جاتا ہے۔

اس زمانے میں ادبی نقاد کے فرائض بہت زیادہ بڑھ گئے ہیں کیونکہ تجارت اور عام مقبولیت کو مطمح نظر بنا کر لکھنے والوں کی اتنی بہتات ہو گئی ہے کہ آج سنجیدہ اور مقبول لکھنے والوں میں امتیاز پیدا ہو گیا ہے اور ان میں فرق کرنا اتنا ضروری بن گیا ہے کہ آج سب سے پہلے یہ سوال کرنا پڑتا ہے کہ آیا لکھنے والا سنجیدہ ادیب ہے یا مقبول یا تاجر ادیب ہے؟ تجارت کی گرم بازاری ادب میں بھی بری طرح در آئی ہے۔

Commercial writer یا تاجر ادیب کے پیش نظر چونکہ بازاری مانگ ہوا کرتی ہے اس لئے وہ اپنے قاری سے کسی بات کا مطالبہ نہیں کرتا اس کو تو صرف اسی تجارت سے غرض ہوتی ہے۔ وہ تو صرف بازار کے رخ کو دیکھتا ہے اور اسی کے مطابق کام کرتا ہے۔ اس کے برخلاف سنجیدہ ناول نگار بازار کو نہیں اپنی اور اپنے اطراف کی زندگی کو بڑے غور سے اور بڑی فکر سے دیکھتا ہے اسی کے پیش نظر اپنے اندر کی اور اپنے باہر کی دنیا ہوتی ہے اسی وجہ سے سنجیدہ ادیب مقبول ادیب کے برخلاف قاری کے مطالبات کو پورا نہیں کرتا بلکہ خود قاری سے بعض مطالبات کرتا ہے جس کو پورا کرنا قاری کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ سنجیدہ ادیب قاری کی ذہنی سطح تک نہیں جاتا بلکہ مطالبہ کرتا ہے کہ قاری اس کی ذہنی سطح تک پہنچنے کی کوشش کرے اور اس کے زاویۂ نگاہ سے زندگی کو دیکھنے کے بعد اپنے طور پر اس پر غور کرے اور اس کے متعلق سوچے۔ اسی لئے مقبول ادب کو پسند کرنے والے سنجیدہ ادب کو پسند نہیں کیا کرتے بالکل اسی طرح جس طرح فلمی شاعری سے حظ حاصل کرنے والے غالب، اقبال یا میر کی شاعری سے لطف اندوز نہیں ہوا کرتے۔ اسی لئے تو مقبول ناولوں کے شائقین کے لئے سنجیدہ ناول پڑھنا مصیبت ہوا کرتی ہے۔ اور وہ ان سے اس وقت تک محظوظ نہیں ہو سکتے جب تک کہ ان کے ذوق کی تربیت نہ کی جائے۔ اس بات کی وضاحت یوں بھی ہو سکتی ہے کہ قرۃ العین حیدر کا ناول "چاندنی بیگم" اگرچہ ہلکا پھلکا ناول ہے لیکن چونکہ ایک سنجیدہ ناول ہے اس لئے وہ لوگ جو مقبول ناول پڑھتے ہیں۔ اس ناول کا مطالعہ بھی ان پر بار گزرتا ہے کیونکہ ناول میں تکنیک کی جدت کی وجہ سے قاری کو سوچنا پڑتا ہے جب تک مختلف واقعات کے سرے قاری کے ذہن میں نہیں رہتے وہ ناول کی رفتار اور کرداروں کے ارتقاء کو نہیں سمجھ سکتا۔ اس لئے قاری کو ذہن چوکنا رکھنا پڑتا ہے۔ ناول پر غور کرنا پڑتا ہے اور چونکہ عام قاری اس کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ زندگی سے فرار چاہتے ہیں۔ زندگی کے مطالبات اور اس کے مسائل سے روگردانی کرنا چاہتے ہیں۔ اسی لئے ایسے ناول جو انہیں ذرا بھی سوچنے پر مجبور کرتے ہیں وہ انہیں پسند نہیں کرتے حالانکہ اچھے ادب اور اچھے ناول کا کام ہی یہی ہے کہ وہ زندگی سے آگہی پیدا کرے۔ وہ ہمیں جگاتا ہے۔ زندگی کے مختلف مسائل اور انسانی زندگی کی گہرائیوں سے واقف کر کے ان پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے جیسا کہ ایک نقاد نے کہا ہے کہ ناول ایک صنف ادب: انسانی بڑھتی ہوئی آگہی کی تشفی کے لئے وجود میں آئی ہے اسی لئے جی ایس فریزر ناول نگار سے خاص طور پر مطالبہ کرتا ہے کہ اس کے پاس حقیقت کا احترام ہونا چاہیے بلکہ یہ بھی کہنا ہے کہ یہ حقیقت اور سچائی خود ناول نگار دریافت کرتا ہے اور اسی طرح زندگی کے تعلق سے اپنے نقطۂ نظر کو پیش کرتا ہے۔ مقبول ناول نگار زندگی کی سچائیوں اور حقیقتوں کو اپنے طور پر دریافت کرنے کی سکت نہیں رکھتا وہ چھپے ہوئے نوالوں کو چباتا ہے۔ زندگی کے تعلق سے وہ پامال اور بندھے ٹکے انداز سے سوچتا ہے۔ وہ زندگی کے تعلق سے کوئی بصیرت افروز بات نہیں بتاتا کیونکہ اسے خود یہ بصیرت

حاصل نہیں ہوتی ۔ حالانکہ حقیقت اور سچائی کا یہ شوق سنجیدہ ناولوں کا امتیازی وصف ہے ۔ مقبول ناول نگار کبھی زندگی کا محدود نقطۂ نہیں دیکھتے ہیں وہ زندگی کو اُبھرا ہوا اور ابھی نکھرا ہوا دکھاتے ہیں ۔ وہ زندگی کی اچھائی اور برائی کے عکاس ہوتے ہیں وہ زندگی کے بحرِ ناپیدا کنار میں حقیقت کے موتی ڈھونڈتے رہتے ہیں ۔ وہ زندگی کے سمندر کے کنارے مقبول ناول نگاروں کی طرح صرف ریتوں سے نہیں کھیلا کرتے مقبول ناولوں کو پڑھنے کے بعد انسانی زندگی کے تعلق سے کوئی بصارت ملتی ہے نہ ہی بصیرت ۔ کیونکہ وہ زندگی کی اصل صداقتوں کی باتیں نہیں کرتے ہیں ۔ حالانکہ اصل ٹریلنگ کے کہنے کے مطابق ناول نام ہے مستقل طور پر سچائی اور صداقت کی تلاش اور کھوج کا ۔ ناول نگار کے لئے یہ کھوج کا میدان سماجی زندگی ہوتی ہے ۔ اور اس تلاش کا موضوع اور مواد انسانی زندگی اور اس کے طور طریقے ہوتے ہیں ۔ اسی سے انسان کی روح ظاہر ہوتی ہے ۔ اس لئے ایک سنجیدہ ناول وہی ہوگا جو سماج کی عکاسی کرے اور انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے پر ہمیں مجبور کرے ۔ کیونکہ سنجیدہ ناول نگار زندگی کی عکاسی اس طرح کرتا ہے کہ وہ ہمارے لئے ایک فکر بن جاتی ہے ۔ ہم سماجی خرابیوں کو اُن کی اصل شکل میں دیکھنے لگتے ہیں اور اسکے ہاں اچھائی یا برائی کا بندھا ٹکا تصور نہیں ملتا ۔ اسی لئے ٹریلنگ کا کہنا ہے ناول کی بڑائی اور افادیت اس بات میں مضمر ہے کہ وہ قاری کو اخلاقی زندگی پر غور کرنے پر مجبور کرتا ہے ۔ اور بتاتا ہے کہ حقیقت صرف وہی نہیں جسکو اُس کی روایتی اور رسمی تعلیم نے پیش کیا ہے بلکہ حقیقت کے اور بھی روپ ہیں ۔ ٹریلنگ کا یہ بھی کہنا ہے کہ ناول ہی وہ صنف ہے جس میں انسانوں کے فرق اور ان کے فرق کی قدر و قیمت کو نمایاں کیا جاتا ہے ۔ اس لئے ایسا ناول جو ان تمام باتوں کا حامل ہوگا وہ اہمیت رکھیگا ۔ سنجیدہ ناولوں کی اہمیت اصل میں اس بات میں پوشیدہ ہے کہ وہ حقائق کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ قاری ان کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے ۔ مثال کے طور پر قتل کے واقعہ پر دوستوفسکی کا مشہور ناول "جرم و سزا" بھی لکھا گیا ہے ۔ اور دوسرے ہزاروں لاکھوں جاسوسی ناول بھی جو قتل و خون کو بنیاد بنا کر لکھے جاتے ہیں ۔ لیکن "جرم و سزا" کو پڑھنے کے بعد جس طرح اس ناول کے واقعات اور اس کے کردار انسان پر گہرا اور ناقابلِ فراموش تاثر چھوڑتے ہیں دوسرے مقبول ناول ناممکن ہے کہ ایسا تاثر چھوڑیں ۔ یہ ناول ہمیں سوچنے پر مجبور کرتا ہے ۔ وہ ہمیں پوری طرح چونکاتا ہے ۔ اور زندگی پر غور کرنے پر مجبور کرتا ہے ۔ اس لئے ہمیں یاد رہ جاتا ہے ہم سیکڑوں ناول پڑھتے ہیں لیکن وہ کبھی بھی ایسا نقش اور تاثر نہیں چھوڑتے جس کی وجہ سے ہم ان کو یاد رکھنے پہ مجبور ہو جائیں ۔ اسی وجہ سے ڈیوڈ ڈیچس کا کہنا ہے کہ اگر کوئی ناول یاد رکھنے کے قابل نہیں ہے اور ہمارے ذہن پر کوئی نقش نہیں چھوڑتا ہے تو پھر ایسے ناول کی کوئی قدر ہے نہ اہمیت ۔ ـــــ اسی لئے ای ۔ ایم فورسٹر کا کہنا ہے کہ کسی بھی ناول کی بڑائی اس بات پر منحصر ہے کہ وہ ہمیں کس حد تک چونکا سکتا ہے ۔

اچھا ادیب یا ناول نگار چونکہ زندگی کے پیش پا افتادہ حقائق کو نہیں بلکہ اہم اور گمبھیر حقائق و مسائل کو پیش کرتا ہے ۔ اس لئے مواد کی یہ اہمیت ناول نگار کو مجبور کرتی ہے کہ وہ مخصوص تکنیک کو اپنائے ۔ اسی لئے سنجیدہ ناول نگاروں کے یہاں ناول میں تکنیک کا تنوع ملتا ہے ۔ اس کے برخلاف مقبول ناول نگار چونکہ مواد میں کوئی جدت نہیں رکھتے ۔ اس لئے اُن کے ناولوں کی تکنیک میں بھی کوئی ندرت نہیں پیدا ہوتی ہے ۔ ہر مقبول ناول ایک ہی انداز کا ہوا کرتا ہے نہ صرف یہ کہ ایک مقبول ناول نگار اپنے ایک ناول کو دوسرے ناول سے الگ انداز پہ نہیں لکھ سکتا بلکہ مقبول ناول نگار خود ایک دوسرے سے زیادہ مختلف نہیں ہوا کرتے ۔ اسی وجہ سے ڈی ایچ لارنس نے کہا ہے ناول کی تعمیر اور بناوٹ کے اصول انہیں ناولوں کے لئے اہمیت رکھ سکتے ہیں جو دوسرے ناولوں کی نقل ہوتے ہیں اور جو ناول دوسرے ناولوں کی نقل نہیں ہوتا اس کی اپنی بناوٹ اور تعمیر کے علیحدہ اصول ہوتے ہیں ۔ اسی لئے ایک نقاد نے کہا ہے کہ ہر ناول نگار کو چاہئے کہ وہ اپنے ناولوں میں علیحدہ تکنیک سے کام لے کیونکہ ہر قابلِ ذکر ناول ایک علیحدہ حیثیت کا حامل ہوتا ہے جسکے اپنے الگ اصول و ضوابط ہوتے ہیں اسی وجہ سے سنجیدہ ناول ہر لحاظ سے مقبول ناولوں سے مختلف ہوتے ہیں اور اسی بنا پر سنجیدہ ناولوں کو پڑھنا بھی کسی قدر مشکل ہوتا ہے ۔ کیونکہ ان میں ایک بالکل نئے اور جدید تر ادبیت سے حقائق کا اظہار ہوتا ہے جن کے ہم عادی نہیں ہوتے اسی لئے ناول کی اچھائی کیلئے دلچسپی کو کسوٹی بنانا بھی غلط ہے ۔ حالانکہ ناول کے بعض نقاد اس کو بہت اہمیت دیتے

ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ کامیاب ناول وہی ہے جس کا پہلا جملہ قصّہ شروع کرنے، آدمی کو کھینچ لے، دل کو لگا لے، دلچسپی شروع کر دے۔

اگر دلچسپی یا مقبولیت کو معیار بنایا جائے تو پھر اس دور کے تمام عظیم ناول نگار بالکل ناکام ثابت ہوں گے اور اسی طرح دنیا کے بہت سے عظیم ناول اس کسوٹی پر پورے نہیں اتریں گے۔ کیونکہ ان میں سے اکثر ناول نہ تو پہلے جملے سے قصّہ شروع کر دیتے ہیں نہ ہی پہلا جملہ قاری کی توجہ اپنی جانب کھینچ لیتا ہے۔ نہ ہی ان ناولوں میں عام قاری کے لئے دلچسپی کا سامان ہوتا ہے اس لئے گرچہ مانا کہ کسی نے کہا ہے سنجیدہ ناول پہلی مرتبہ مشکل معلوم ہوتے ہیں اور انہیں کوشش کے ساتھ ہی پڑھا جا سکتا ہے اس کے علاوہ خود دلچسپی بھی ایک اضافی چیز ہے اس لئے اس کو معیار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ٹالسٹائی اور بالزاک دنیا کے متفقہ طور پر عظیم ناول نگار رہے لیکن وہ اتنی دلچسپی سے نہیں پڑھے جاتے جتنے معمولی درجے کے ناول یعنی مقبول ناول۔ جیسا کہ مڈی پریس نے کہا ہے، ایسے لوگ جن کی تعداد ناول پڑھنے میں سب سے زیادہ ہے وہ مقبول ناولوں کے رسیا ہیں۔ وہ سطحی اور مقبول ناولوں کو دنیا کے عظیم ناولوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ اسی سلسلے میں ان کا یہ بھی کہنا صحیح ہے کہ عام قاری زندگی، محبت، شادی، جنس، موت وغیرہ کے متعلق بندھے ٹکے انداز میں سوچنے کے عادی ہوتے ہیں۔ وہ سنجیدہ ناولوں کی سب سے اہم خصوصیت یعنی چونکا دینے یا فکر انگیزی کی طاقت کو برداشت نہیں کر سکتے حالانکہ یہ خصوصیت یعنی ناولوں کا ایسا ہی مجموعی تاثر ناول کو عظمت بخش سکتا ہے۔

بقیہ اُردو تنقید کے دس سال صفحہ ۲۰

"اسے معلوم ہے کہ محبت گل بہیاں کرنے کا نام نہیں ہے۔ نہ دامن میں پھول چاند ستارے لیکر محبوبہ کو پیش کرنے کا۔ وہ جانتا ہے کہ محبت کا سارا معاملہ دامن کے نیچے جاتا ہے"

ایک اور نقاد شاعری کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "شاعری زندگی کی تنقید کرتی ہے نہ عکاسی ـــــ یہ وہ میدان ہے جہاں زندگی کی بیداریاں پہنچ ہی نہیں پاتیں' شاعری کو زندگی کے حقائق سے زیادہ سروکار نہیں۔ شاعر تعقل اور فہم کی صلاحیتوں پر غنودگی طاری کر کے ذات اور لاشعور کے راستے سے زندگی کی تشنگی اور نارسائی منعقد کرنا چاہتی ہے"۔

یہ جدیدیت کی تنقید کا اصل مزاج اور رخ ہے۔ ابھی اس تنقید کی ابتدا ہے۔ آل احمد سرور، محمد حسن عسکری اور سلیم احمد کے علاوہ شمس الرحمٰن فاروقی کے مضامین کا مجموعہ لفظ و معانی اور فاروقی کے تبصرے، خلیل الرحمٰن اعظمی کا مجموعہ زاویۂ نگاہ، بلراج کومل کا مضمون خطِ مستقیم اور خطِ منحنی کی شاعری، شمیم زیدی کا مضمون کچھ کوزہ گری اور جوں کے بارے میں اور وارث علوی، محمود ہاشمی وغیرہ کے مضامین کافی اہمیت رکھتے ہیں۔

اس کے علاوہ اس عرصے کی ایک اہم بات یہ ہے کہ تمام ادبی رسائل میں تنقید کا حصہ نمایاں رہا ہے۔ خطوط کے حصے میں بھی تنقید جاری رہی ہے۔ وہ رسائل جنہوں نے اس عہد میں تنقید کو اہمیت دی وہ کتاب، شاعر، اسکیل، اوراق، نقوش، سوغات، تحریک، سویرا، نیا دور، شب خون، آہنگ، مورچہ، سہیل، شاخسار، عصری ادب، شب رنگ، گفتگو، سطور، شعر و حکمت، اردو ادب، فکر و نظر اور شیرازہ وغیرہ ہیں۔

ان دس برسوں میں ادبی تنقید پر جتنا کام ہوا ہے اور جتنے مضامین کے مجموعے اور کتابیں شائع ہوئی ہیں انہیں دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ عہد تنقید کا عہد ہے کیونکہ اس عرصے میں تنقید کے ہر پہلو، نظریات، اصول اور عملی تنقید پر نمایاں کام ہوا ہے۔

نوٹ: اس مضمون میں سنہ سے سنہ تک کی مطبوعات اور تنقید کی رفتار کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں بعض کتابوں اور ناموں کی کمی محسوس ہو سکتی ہے لیکن ایسا صرف اس لئے کرنا پڑا کہ مضمون صرف فہرست ہو کر نہ رہ جائے ـــــ قارب ادارہ

آخری رات

شہریار

سُنو ! آخری رات اُترے گی آج آسماں سے
سُنو ! ان زمینوں پہ فصلیں اُگانے کی سب کوششیں رائیگاں ہوگئی ہیں۔
پہاڑوں کو اپنی جگہ سے سرکتے ہوئے دیکھتے ہو۔
گھنے اور گہرے اندھیروں میں پرچھائیاں دفن کرکے۔
الاؤ جلانے کی تیاریوں میں کہاں منہمک ہو۔
درختوں سے گرتے ہوئے خشک پتّوں کی آواز۔
بھوکے درندوں کو جنگل کی جانب بُلانے لگی ہے۔
بدن کی سُرنگوں میں بارود بھرلو۔
بدی کے دنوں کی ہراک بات پھر یاد آنے لگی ہے۔

مژدۂ انقلاب

شہریار

دُھواں بن کے جو قید ہیں بوتلوں کے بدن میں
وہ سب دیو ہیں
خوف اور نفرتوں کے
وہ سب دیو اک روز آزاد ہوں گے۔
وہ سب دیو جس روز آزاد ہوں گے۔
تو اِس شہر کا ایک اک فرد خود سے پشیماں ہوگا۔
طلسمِ ہوس ٹوٹ جانے پہ حیراں ہوگا۔
نگاہیں کبھی آسمانوں کی جانب اُٹھیں گی۔
کبھی ہاتھ کوئی اشارہ کریں گے۔
کبھی ہونٹ کچھ بولنے کا ارادہ کریں گے۔
مگر کچھ نہ ہوگا۔
فقط جنگ ہوگی۔
ہراک سمت سے بارشِ سنگ ہوگی۔

منوہر ساغر پالمپوری

نئے دھان

کارتک مہینے کی صبح تھی۔ سورج ابھی کشنا بھدری مندر والی پہاڑی کی اوٹ سے جھانک ہی رہا تھا۔ گھاٹیوں میں گھاس کٹ چکی تھی اور گھاس کے ڈھیروں پر کارتک کی ٹھٹھری ہوئی گنگنی سی دھوپ پھیل رہی تھی۔ کھیتوں میں کسان دھان اور مکی کی فصلیں کاٹ کر سمیٹ سنبھال چکے تھے۔ کھلیانوں میں دھان گاہے جا چکے تھے۔ گیہوں بوئے جا رہے تھے۔ سڑکوں پر راہوں کی منڈیروں پر۔ بڑی بڑی چٹانوں پر غرضیکہ بڑے بڑے درختوں کے تنوں پر بھی جلی حروف میں لکھا تھا۔ "ہمیشہ بالیں۔ ۲۰۰ گیہوں بوئیں!" محکمہ زراعت سے شہر کے پینٹروں نے جابجا یہ الفاظ لکھنے کے ہزاروں روپے اجرت کی صورت میں وصول کئے تھے۔ محکمہ زراعت کے زیر اہتمام بھارت اور مغربی جرمنی کے اشتراک سے کھیتی باڑی کا بہت بڑا پراجیکٹ حال ہی میں کھلا تھا۔ اس منصوبے کی افتتاحیہ تقاریب پر صوبائی سرکار نے لگ بھگ پندرہ ہزار روپے خرچ کئے تھے اور اس منصوبے کا افتتاح بڑے تزک و احتشام کے ساتھ خود صوبہ کے وزیر اعلیٰ اور مغربی جرمنی کے سفیر نے کیا تھا۔

کرتو نے اپنے سکیتی بیلوں کی جوڑی (ہماچل کی سابقہ ریاست سکیت کے بیل مشہور ہیں ہر سال موسم بہار میں مویشیوں کی بہت بڑی منڈی یہاں لگتی ہے) گوال کے دروازے سے باہر نکالی اور انھیں اُساری کے بڑے پیڑ کی چھاؤں میں گرتے کونٹوں کے ساتھ باندھ دیا۔ آج وہ شہر جا رہا تھا۔

کرتو نے بھارت جرمن زرعی منصوبے کے افسران کی ہدایات پر عمل پیرا ہو کر اپنے کھیتوں میں چینی دھان کی نئی قسم بوئی تھی۔ سرکاری ڈپو سے اُدھار لے کر کئی بورے کیمیاوی کھاد بھی اس نے اس نئی فصل کو دی تھی۔ کھاد نے اپنا خاطر خواہ اثر دکھایا تھا اور بڑی زبردست فصل اُگی تھی۔ دھان کی اس نئی فصل کو دیکھنے گاہے بگاہے محکمہ زراعت کے کئی افسر وغیرہ اپنے ملنے کے کرتو کے کھیتوں کو دیکھنے آ چکے تھے۔ کرتو خود تو ایک غریب کسان تھا ایسے مواقع پر اُسے پاس پڑوس کے لوگوں سے کرسیاں، میزیں مانگ کر دینی پڑتیں اور خود گڑ کی چائے پینے والا کرتو افسران کی چائے کے لئے بازار سے چینی ادھار لے آتا تھا۔ جب فصل تیار ہو گئی تھی تو خود مغربی جرمنی کے سفیر مقامی سب ڈویژنل مجسٹریٹ کے ساتھ فصل کا معائنہ کرنے آئے تھے۔ اس موقع پر سارا گاؤں تماشہ دیکھنے کرتو کے کھیتوں کے گرد جمع ہو گیا تھا۔ پھر لہلہاتی فصل میں کھڑے ہو کر ان اعلیٰ افسران کے ساتھ کرتو کی فوٹو کھینچی گئی تھی۔ پھر دھان کی یہ نئی فصل محکمہ زراعت کے ایک افسر کی موجودگی میں کاٹی گئی تھی۔ کرتو کو ہدایت دی گئی تھی کہ وہ اس فصل کو افسر مذکور کی موجودگی میں کاٹے گا اور گہائی کی مشین اُسے پراجیکٹ کی طرف سے دی جائے گی۔

کرتو آج پراجیکٹ کے دفتر میں انفارمیشن افسر کے پاس دھان گاہنے کی تاریخ مقرر کرانے جا رہا تھا۔ کیونکہ دھان کی فصل کو گاہنے میں دیر ہو رہی تھی کرتو کی فکرمندی بڑھ رہی تھی۔

نوٹ: ۱۔ اُساری: برگد کے قد کا درخت جس کے پتوں کا چارہ مویشی بڑی رغبت سے کھاتے ہیں۔

ایک تو تحصیل کے دفتر سے آئے ڈیپو سے تقاوی پر اُدھار لی گئی کیمیاوی کھاد کے روپے سرکاری خزانے میں جمع کرانے کا نوٹس بھی مل چکا تھا اور دوسرے اُس کی فصل ابھی کھیتوں ہی میں کھڑی تھی۔ بہرحال کرپو نے سرکاری پچڑے سے بچنے کے لئے تقاوی کے روپے کسی سے ادھار لے کر جمع کروانے کی بات سوچی تھی۔ لیکن جب وہ تحصیل کے دفتر میں روپے جمع کروانے گیا تو اُسے سخت مایوسی اور کوفت کا سامنا کرنا پڑا۔ تحصیل کے تقاوی کلرک نے آدھے دن تو اُس سے بات تک نہ کی اور جب شام ہونے لگی تو اُسے بتایا کہ اُس کے روپے جمع نہیں ہو سکتے۔ روپے جمع نہ ہونے کی وجہ یہ بتائی گئی کہ بی ڈی او کے دفتر سے کرپو کی تقاوی کی وصولی کی جو مثل تحصیل میں بھیجی گئی تھی اُس پر کھتونی نمبر نہیں لگایا گیا تھا۔ نتیجہ کے طور پر کرپو کو ایک پورا دن بی۔ڈی۔او کے دفتر میں فارم وغیرہ بھروانے کھتونی نمبر لگانے اور بابوؤں کے سامنے لِلیانے میں لگا تھا اور تقاوی کے روپے دیر سے جمع کروانے کا جرمانہ بھی اُلٹا اُسے ہی بھرنا پڑا تھا۔ وہ اِس معاملے کی شکایت متعلقہ ایس ڈی ایم سے ہزار کوشش کے باوجود نہ کر پایا تھا کیونکہ ایس۔ڈی۔ایم سرکاری میٹنگوں کے سلسلے میں عموماً ضلع کے صدر مقام پر جاتے رہتے تھے۔

کرپو کے گاؤں کے دوسرے کسان اپنے دھان کو شکر گوگا دیوتا کے مندر میں اندرا چڑھا کر نیا اناج بھی کھانے لگے تھے لیکن اُس کے دھان ابھی کھیت میں ہی کھڑے تھے۔ کیونکہ یہ دھان افسران کی موجودگی میں ہی مشین سے گاہے جانے تھے اس لئے کرپو اِن کو باندھ کر کھوا بھی نہ لگا سکا تھا۔ جو چار پانچ یوم اس نے پراجیکٹ کے تحت تر بیگر لگانے میں صرف کئے تھے اُسی دوران اُس کے گاؤں کے کسان گندم بھی بیج چکے تھے۔

کرپو آج گھر سے یہی سوچ کر نکلا تھا کہ آج وہ افسران سے دھان گاہنے کی تاریخ پکی کروا کر ہی لوٹے گا۔ کھیتی کے دفتر کے سوچنا ادھیکاری نے کرپو کے دل میں سلگتی ہوئی ناراضگی کی چنگاری کو بھانپ لیا تھا۔ اُس نے کرپو کو بڑے تپاک سے کرسی پر بٹھایا۔ اُسے چائے پلوائی۔ اس نے معافی بھی مانگتے ہوئے کہا کہ دیگر سرکاری مصروفیات کی وجہ سے اُس کے دھان گاہنے کی تاریخ مقرر نہ کی جا سکی۔ اب منگلوار کو متعلقہ افسران کو فرصت ہوگی اور اُس دن کا پروگرام وہ پکا سمجھے۔ تب تک شہر کے ایم۔ایل۔اے صاحب جو بڑے زمیندار ہیں کے یہاں سے دھان گاہنے کی مشین بھی فارغ ہو جائے گی۔ سوچنا ادھیکاری نے کرپو کے سامنے جرمن نیوز ویکلی کا تازہ شمارہ رکھا۔ سرورق پر مقامی ایس ڈی ایم اور جرمن سفیر و دیگر زراعتی افسران کے ساتھ دھان کے لہلہاتے کھیتوں میں کرپو کی تصویر چھپی تھی۔ پس منظر میں اُس کا رہائشی چھپر اور گھراٹ نظر آ رہے تھے۔ گھراٹ کے مشرق کی طرف السا ہن کے درخت کے نیچے اُس کے دونوں شکتی بیل بھی بندھے دکھائی دے رہے تھے۔ تصویر دیکھ کر کرپو کی باچھیں کھل گئیں۔ الغرض مختصر آمیز نے اخباروں کا ایک بنڈل کرپو کو دیتے ہوئے مشورہ دیا کہ وہ یہ اخبار اپنے پاس پڑوس کے کسانوں میں بانٹے تاکہ اس کی مقبولیت بھی ہو اور دوسرے کسان بھی کھیتی کے نئے طریقے اپنا کر اس زرعی انقلاب سے فیضیاب ہوں اور ترقی پسند کسان کہلانے کا شرف حاصل کریں۔

سوچنا ادھیکاری کی باتوں سے کافی مطمئن ہو کر کرپو اپنے گھر لوٹ چلا۔ اب تو صرف ایک دن کا ہی وقفہ تھا۔ منگل کے دن دھان گاہے جائیں گے۔ اخباروں کا بنڈل بغل میں دبائے وہ دل میں یہ سوچتا جا رہا تھا کہ اگر نوکرشاہی کا لال فیتہ نہ ہوتا تو شاید اس کا دیش ترقی کی کتنی منزلیں آج تک طے کر چکا ہوتا۔

سگاؤ[3] کی ہٹی پہنچ کر وہ برٹو جیسور کی دوکان پر بیٹھ گیا۔ اُس کے دو چار پڑوسی کسان اسے وہاں مل گئے۔ کرپو نے

---

[1] مینجمنٹ۔ [2] کھلواڑا

[3] لب سڑک ایک گاؤں۔

بڑے فخر سے انھیں اخبار کی کاپیاں بانٹیں۔ اخبار کے سرورق پر بڑے افسران کے ساتھ کرپو کی تصویر دیکھ کر لوگ اُس کی تعریف کے پل باندھنے لگے۔ اپنی تعریف سُن کر کرپو نے چاول کی بنی تازہ چھول[1] کی پانچ چھ بوتلیں اُن دیہاتیوں کے ساتھ بیٹھ کر پی ڈالیں۔ اُس کے ساتھی کسانوں کو اُس کی قسمت پر رشک ہو رہا تھا۔ وہ اس بات کے قائل ہو چکے تھے کہ بھارت کی ترقی اُس کی ذہنی ترقی میں ہے۔

چھول کے نشے نے اُن سب کی زبانوں کے گھوڑوں کی پیٹھوں پر چابک کا کام کیا۔ باتوں کا سلسلہ گھوڑ دوڑ کی طرح چل پڑا۔ بڑے افسران کی تعریف کرتے ہوئے کرپو بولا
"سات سمندر پار سے یہ جرمن لوگ دیوتا بن کر ہمارا بھلا کرنے آئے ہیں۔ دیکھا تم نے۔ کتنی محنت کرتے ہیں یہ لوگ؟"
گھسیٹو ترکھان اخبار میں کرپو کی تصویر دیکھ کر حیرت سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے بولا۔

"واہ بھئی کرپو! بڑے اونچے بھاگ ہیں تیرے۔ ان بڑے صاحبان کے ساتھ کتنی خوبصورت تصویر اُتری ہے تیری؟ ابے! یہ صاحب تمہیں کہاں مل گیا؟ (گھسیٹو کا اشارہ مقامی ایس۔ ڈی۔ ایم کی طرف تھا) اِس صاحب کو تو دنیا بھر کے کام رہتے ہیں۔ میرا بھی دعوے چل رہا ہے اِس کی عدالت میں۔ تین سال ہونے آئے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اُس دعوے کا فیصلہ یا تو اس صاحب کے تبدیل ہونے پر ہوگا یا میرے مرجانے پر۔" گھسیٹو کے مُنہ سے ایک کربناک آہ سی نکل گئی۔

کرپو نے گھسیٹو کی بات اَن سُنی کرتے ہوئے کہا: "کچھ بھی ہو یہ جرمن لوگ کمال کے آدمی ہیں۔ ہماچل کو ایک زرخیز گلزار بنانے کے لئے کتنے جتن کر رہے ہیں یہ لوگ؟"

"لیکن یار کرپو! تیرے دھان ابھی کھیتوں میں ہی بکھرے پڑے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہیں یہ ابر پھٹ پڑے، اور تم اپنی فصل بھی نہ سنبھال پاؤ!"

بلندو نے اُسے چیتاونی سی دیتے ہوئے کہا۔

بات چیت کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ یہ خیال کرپو کے ذہن میں بجلی کی طرح کوند گیا کہ شام ڈھلنے جا رہی ہے۔ وہ اخباروں کو سنبھال کر اٹھنے لگا تو "کڑ! کڑ! کڑاک!!" کی آواز سے بادل گرج اٹھے۔ دُکان سے باہر نکل کر کرپو نے دیکھا نیوگل ندی کے پار دھولا دھار کی چوٹیوں[2] پر گھنگھور بادل گرج رہے تھے حالانکہ کرپو کے گاؤں والی سمت آسمان بالکل صاف تھا۔

ایک انجانے خدشے نے کرپو کو سر سے پاؤں تک لرزا دیا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے ایک کومیٹر پر واقع اپنے گھر کی طرف لپکا۔ چھول کا نشہ کافور ہو چکا تھا۔

گھر پہنچ کر کرپو نے دیکھا کہ اُس کے ایک ہزاری سکینی بیل کھونٹے پر بندھے بندھے گھاس کی ایک پوری گڈی چر گئے تھے اور سورج دیوتا کا رتھ گگل والی رڈھی پار کر کے پچھمی افق پر جا پہنچا تھا۔

"آج کا دن بھی بیکار گیا! لوگ گیہوں کی بجائی بھی ختم کر بیٹھے!" کرپو دبی آواز میں بول اٹھا۔

سامنے سے اُس کی گھر والی بھاگو جل بھُنی آئی اور بیلوں کو کھول کر گوال میں باندھنے لے چلی۔ اُس کے تیور دیکھ کر کرپو کو کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ آنگن میں پڑی کھاٹ پر دم سے بیٹھ گیا۔ آخر اُس نے ہمت بٹور کر کہا۔

"پرسوں دھان کاٹے جائیں گے۔ شکر کے دن! ادھر تو آ! یہ دیکھ میری تصویر اخبار میں چھپی ہے!"

کرپو نے سوچا اُس کی تصویر اخبار میں دیکھ کر بھاگو کا پارہ اُتر جائے گا۔ لیکن بادلوں کی زوردار گرج نے اُس کے الفاظ بھاگو کے کانوں تک پہنچنے ہی نہ دئے۔ بادل اب سارے آسمان پر پھیلتے جا رہے تھے۔ انھیں دیکھ کر بھاگو بھی ساون کی گھٹا سی برس پڑی۔

"آ گیا نکھٹو"! آج کا دن بھی برباد ہوا۔ ان بادلوں کو تو دیکھو! جیسے آسمان ہی پھٹ پڑے گا۔ لیکن میں موئی کون ہوتی ہوں تمہیں سمجھانے والی ہنسے دھان کیا لگانے آئے جانے والوں کی چائے

(بقیہ صفحہ ۵۸ پر دیکھئے)

---

[1] چاول سے بنی شراب۔ [2] چوٹی

غزلیں

ضیا فتح آبادی

دل جل رہا ہے جیسے کسی قبر کا دِیا !
آندھی نے حادثات کی آکر بجھا دیا

زحمت نہ دی زباں کو، مگر داد لے جنوں
چُپ رہ کے میں نے حالِ دِل اُن کو سُنا دیا

موجود اور بھی تھے تری بزمِ ناز میں
لیکن مجھی کو تو نے غمِ بے دوا دیا

اِس باغ میں تو پھُولنا پھَلنا محال ہے
جس شاخ پہ پھل آیا اُسی کو جھُکا دیا

کیوں چھین لی نہ تابِ نظر بھی نگاہ سے
دِل کو تو بے نیازِ تمنّا بنا دیا

دستک درِ حیات پہ دی کس نے صبح دم
تھا محوِ خوابِ ناز، مجھے کیوں جگا دیا،

دستورِ زندگی ہے ازل سے یہی ضیا
مُرجھا گیا تو ٹہنی سے پتّہ گرا دیا

رونق دکنی سیمابی

خوشی کب راس آئی ہے، جسے چاہو خوشی دے دو
مجھے خندہ لبی کے بدلے آشفتہ دلی دے دو

میں بے بیخودی سہی، لیکن تقاضائے خِرد یہ ہے
بقدرِ ہوش پہلے اختیاراتِ خودی دے دو

اگر اِنسانیت کا اِس طرح عرفان ہوتا ہے
خدارا آدمی کو احترامِ آدمی دے دو

بنا کر شیشۂ دل توڑنا ہم کو نہیں آتا !
فنِ آہن گری لے لو، ہمیں شیشہ گری دے دو

بساطِ عالمِ امکاں پہ میں خود پھیل جاؤں گا،
بقدرِ اکتسابِ غم شعورِ آگہی دے دو

خِرد کی وادیوں میں جہل کی تاریکیاں کیسی،
یہ اچھا ہے جنوں کے ہاتھ میں مشعل کوئی دے دو

جسے جینے کی حسرت بھی ہو مرنے کی تمنّا بھی
ملے جو شخص ایسا اُس کو اذنِ خودکشی دے دو

شکایت[؎] مِٹنے والی صورتوں سے ہے عبث رونقؔ
کہا یہ کس نے تھا اِن کو حجابِ بے بسی دے دو

[؎] چھُپنے والی صُورتوں کو دو نہ الزامِ حجاب
خاک میں کر دی گئیں، پنہاں کہ پنہاں ہو گئیں؟
سیمابؔ

مقالہ

ڈاکٹر ظ۔ انصاری

فطرت کی ہمنوا ـــــ شاعرہ

سو بسال سے ایک بار لاہور کے انگریز پروفیسر لوکس نے پوچھا:

کیا واقعی تم سمجھتے ہو کہ خدا نے محمدؐ سے اسی زبان میں، انہی الفاظ میں کلام کیا تھا، یا یہ کہ جو کچھ الہام ہوا، وہ انھوں نے اپنی زبان عربی میں ادا کیا تھا؟

اقبال ذرا دیر کو سوچ میں پڑ گئے اور پھر بولے:

ٹھیک اسی زبان اور انہی الفاظ میں کلام کیا ہوگا۔ خود میرا تجربہ ہے کہ جب شاعرانہ کیفیت طاری ہوتی ہے تو الفاظ مجھے سوچنے نہیں پڑتے۔ خیال اپنے لفظوں سمیت مجھ پر اُترتا ہے اور میں لکھتا چلا جاتا ہوں۔

پیاسا سچدیو کی گیت نما نظمیں سنتے اور پڑھتے وقت مجھے یوں محسوس ہوتا ہے، گویا نہ لفظ سوچے گئے، نہ لفظ جوڑے گئے، نہ لفظ کھوجے یا ڈھونڈے تراشے گئے، بلکہ وہ کسی جانی، پہچانی، دُھند میں لپٹی ہوئی فضا سے شاعرہ کے دل پر اُترتے چلے گئے؛ دنیا سے براہِ راست اپنے منظر، موسیقی، رنگ اور کسک کے ساتھ ہماری تصوّر کی فضا کو گھیرے لیتے ہیں؛ بادلوں کی طرح تیرتے اور چاند کی طرح نرم نرم اُجالا پھیلاتے۔ نہ انھیں روشنائی کی ضرورت، نہ انگشتائی کی، نہ کاغذ کی، نہ ادائیگی کی۔

پہلی بار میں نے ان کی ایک مختصر نظم بمبئی کی کسی محفل میں سنی تھی، اب اس محفل کی یاد محض اسی نظم سے وابستہ ہوگئی ہے۔ نظم کا عنوان تھا "طلب":–

طلب

طلب جذباتی ہے،
طلب مَتھ ڈالتی ہے،
طلب ذاتی ہے
تمہیں میرے نزدیک
مجھے تمہارے نزدیک،
جب ایک راہ میں دو کے گزرنے کی سمائی نہیں ہوتی۔
ہر روز شام چھا جانے سے ذرا پہلے
میری ڈیوڑھی کی دہلیز پر
جب اُجالا بکھرتا ہے

شاعر بیچا

ڈھلتے سورج کی شعاعیں گھوم گھوم کر
میرے پیروں میں آکر یوں سمٹ جاتی ہیں
جیسے یہاں پر رات آگ گئی ہو۔
کیا روشنی تو ہے،
گو معذ آتی ہے،
میرے پاؤں چھوتی ہے
اور بار بار مجھ سے پوچھتی ہے:
تم کیوں کھڑی ہو؟
کس کے لئے کھڑی ہو؟
کوئی آیا ہے کیا؟

تیرے پاس کیا ہے؟
میرے پاس کیا ہے؟
لکھا ہوا ورق
رنگا ہوا ورق
بٹا ہوا ورق
تیرے لہو کے ساتھ
میرے لہو کے ساتھ

ہاں واقعی میرے اور تیرے پاس اِس ایک ورق کے سوا اور ہے بھی کیا؟ ورق بھی کیسا؟ تیرے اور میرے لہو سے رنگا ہوا، لکھا ہوا، بٹا ہوا ورق۔

غالب کہتا ہے:

فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے
نالہ پابندِ نَے نہیں ہے

بانسری کے رسیلے یا درد بھرے سُروں کے بغیر بھی فریاد ہو سکتی ہے، مگر دل تک تبھی پہنچتی ہے، جب دل سے نکلی ہو اور عالمِ فطرت کے سُروں سے ہم آہنگ ہو گئی ہو۔

شعر، شاعر اور عالمِ فطرت کا، یوں دل کی خلوت میں یکجان ہو جانا قدرت کی ایسی بیش بہا نعمت تھی جو صنعتی دور INDISTRIAL AGE نے آدمی سے چھین لی۔ آدمی تہذیب کے بچپن تک اِن کھلونوں سے کھیلتا اور خوش ہوتا رہا، مشین کے تیز رفتار پہئیے کی گڑگڑاہٹ نے کھلونے کچل ڈالے۔ کہیں کچھ بچ رہے ہیں تو تہذیب کو اُس کا لڑکپن یاد دلاتے ہیں اور اپنا یہ سنہرا دور کسے پیارا نہیں ہوتا!

پیا سچدیو کی شاعری اسی معنی میں ایک نعمت ہے، قدرت کی نعمت، جس میں فطرت، خیال، الفاظ، تصویر، نغمہ اور مٹی کی سوندھی مہک گھل مل کر ایک ہو گئے ہیں اور ہمیں اُن گمشدہ وادیوں میں لے جاتے ہیں جہاں کبھی قدرتی حسن اور انسانی جذبۂ اُلفت، ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے رہتے تھے۔

یہ بکی آنچ، یہ بکسوئی، تازگی اور میٹھی کسک آئی کہاں سے؟ جموں کی اُن پہاڑیوں سے، جہاں ۵، ۷ برس کی ایک شریر لڑکی کودتی پھرتی تھی اور تھک تھکا کر کسی پتھر کا تکیہ بنا کر سو جایا کرتی تھی؟ کیا یہ دنیا سے ڈوگری کی اُن نرم پوروں نے بخشی جس کے کناروں پر وہ ننگے پاؤں دوڑ

شاعرہ نیلہ

وہ کیا رنگ تھا کہ جس کے عمر بھر پچھتی پھرتی تھی؟ ۱۹۴۷ میں وہ ابھی سات برس کی تھی کہ چھینے باپ فرقہ وارانہ فساد میں گولی کا نشانہ بن گئے۔ باپ کی آغوشِ شفقت، جس میں کبھی ہندی کے دوہے اور سنسکرت کے اشلوک گنگنانے کو ملتے تھے؟ اس سے محرومی کا احساس جس نے دوسروں کی محرومی دیکھنے اور سمجھنے کے لئے ایک خوبصورت بچی کو بڑوں کی نگاہ بخشی؟ ۱۰، ۹ برس کی عمر میں وہ اسکول میں جب انجانے گیت گنگنایا کرتی تو اُسے کیا خبر ہوتی کہ لفظوں کے ڈھیلے ڈھالے رنگین لباس میں خیالوں اور کیفیتوں کی نرم زرد نہر اُس کے معصوم جذبوں کو ہلکورے دے رہی ہے۔ چاندنی کی ہر اُس کے نغمے سے سینے میں مدوجزر اُبھار رہا ہے، ۱۲، ۱۳ برس کی عمر کو پہنچ کر، جب گڑیاں کھیلنے کے دن رخصت ہو رہے تھے، وہ اسکول کے بھرے جلسوں میں اپنی ہلکی پھلکی نظمیں سناتے وقت کیا جانتی ہوگی کہ فن پارے اُس کی شوخ، چنچل، البیلی اور بے تکلف طبیعت کی گود میں کھیل رہے ہیں! — یہ فن پارے کہاں سے آئے؟ ارد گرد کی بے تکلف، مفلس، فضاؤں بھری، دھیمی سُروں میں گاتی ہوئی زندگی سے؟ غم کے احساس سے؟ لہو کی گردش سے؟ نوجوانی کے بے سمت جوش سے؟ یا اُس فیض سے جو شاعروں اور پیغمبروں میں برابر تقسیم کیا جا چکا ہے؟

میرے روحانی مرشد مرزا کہتے ہیں:

بدانشِ غم آموزگارِ من است
خزانِ عزیزاں بہارِ من است

غم کے احساس نے مجھے شعور بخشا، وہ حالت جو اوروں پر خزاں طاری کر دیتی ہے، میرے لئے بہار بن گئی۔
کیا یہ روئی پائی کا غم ہے جو شعور عطا کرتا ہے؟ یا اپنے وجود کے غم کو پوری کائنات کے دکھوں میں گھول دینے سے یہ توانائی حاصل ہوتی ہے، جس نے ہمیشہ کلا کی کلیاں کھلائی ہیں؟

"میں چھوٹی سی تھی۔ دوپہر کے وقت کھیل کود کر گھر آ رہی تھی۔ دروازے پر ایک بے کس، اُجڑی ہوئی عورت کو دیکھا، وہ کبھی ہمسایوں کی حویلیوں پر نظر ڈالتی، کبھی مجھ پر۔ میں نے پوچھا، کیا چاہتی ہو؟ کہنے لگی: ایک گلاس پانی۔ میں دوڑ کر اندر گئی، لوٹے میں پانی لائی، اُس نے غٹاغٹ پیا — پھر سر اٹھایا اور پوچھا: —

اپنے راجے دی منڈیاں تُسدیاں نہ ؟
(یہ راجہ کے محل کیا تمہارے ہیں۔؟)

راجہ کے محل

یہ راجہ کے محل کیا آپ کے ہیں؟
میں گھر سے بے گھر ہو چکی ہوں
میری آنکھوں کی روشنی بجھ چکی ہے
میرے نینوں کا نور
کیلاس کے لوٹے
جو کھسوٹ کر لے گئے؛

ابھی تو میرے پودوں میں کونپل بھی نہ پھوٹی تھی،
میرا ساجن اتنی قدر بھی نہ کر سکا تھا!
وہ جنہوں نے کا ننھی ٹہنیاں اکھاڑ لیں
وہ بھنیا، در انتیاں کیا آپ کی ہیں؟

یہ راجہ کے محل کیا آپ کے ہیں؟

———

یہ اونچی اونچی دیواریں
آکاش چھوتی ہوئی
یہ مال خزانے سے بھر پور — قدآور محل، دو محلے،
پکی لال اینٹوں کے یہ من بھاون نظارے
جن سے ہمارے لہو کی باس آتی ہے۔
ہمارے گاڑھے پسینے نے مٹی سے گارہ یہیں بنایا تھا
ہمارے کاندھوں نے شہتیر یہیں اُتارے تھے،
دھوپ کی تپش سہار کر
جنہوں نے یہ دیواریں چنیں

کیا یہ تم کے محل آپ کے ہیں ؟
یہ راجہ کے محل . . . . . .

وہ جگمگاتی دیوالیاں کیا آپ کی ہیں ؟
یہ راجہ کے محل . . . . .

تو پہ داغی گئی، میرے کانوں نے بھی سُنی
آج پھر وہی بار و پھاڑے گئے،
میرے چاند کے چڑھنے کا سمے ہو گیا،
مگر گلی میں کوئی آہٹ نہ ہوئی
نہ میرے پاؤں اُٹھے، نہ آنکھیں لینے گئے،
ساجن کی پکار سُنی نہ گئی،
وہ جو انھیں آدھے راستے سے گھیر کر لے گئیں
وہ لوہے کی زنجیریں کیا آپ کی ہیں ؟؟
یہ راجہ کے محل . . . . . .

جنھیں کھود کھود کر ہم نے کیاریاں ڈالی
جن کی مٹی کے گھروندوں کا گارا جل پیا،
جنھیں تپتی دوپہروں میں پسینہ پانی دے کر سینچا،
اور پریتم سو کھا ستا چہرہ دیکھ کر ناراض بھی ہوئے،
اور انکوا پھوٹنے پر ہمارا مَن کھِل اُٹھا،
جب ان پودوں میں بور پڑا اور کھیتوں پر جوبنوں نور برسا
کسی کو گھورتے دیکھ کر ہماری آنکھیں پوچھنے لگیں :
یہ سندر کیاریاں کیا آپ کی ہیں ؟
یہ راجہ کے محل . . . . . .

جنھوں نے ہمارے لہو کے چراغ جلائے
اور اندھیری راتوں کے گلے میں چاندنی کی مالا ڈال دی،
چاندنی چاند سے دامن بندھوائے مسکرا رہی ہے،
اور ہمیں دیکھ دیکھ کر دُور سے مذاق اُڑا رہی ہے
ہمارے من کے تارے ٹوٹ رہے ہیں،
جیسے آکاش پر آتشبازی کے انار چھوٹ رہے ہوں۔
جنھیں ہمارے بجھے ہوئے بچے
آسمان پر ٹکٹکی باندھے تک رہے ہیں

جس پر کسی کا حق ہو چکا ہے،
چھٹ پن سے ہی جسے کوئی لے گیا ہے،
جسے دیکھ کر آنکھیں خوشی سے دمک اٹھتی ہیں،
من آپسے آپ بدل گئے ہیں،
جس کی یاد میں دن رات کا فرق مٹ چکا ہے،
جس کا نام لے کر سکھیاں چھیڑ جاتی ہیں،
جو قول و قرار کئے بیٹھی ہیں،
وہ رُوحیں کیا آپ کی ہیں ؟
یہ راجہ کے محل کیا آپ کے ہیں ؟

وہ تو چل دی — میں دیکھتی اور سوچتی رہ گئی ۔ آخر اُس تھکی ہوئی پیاسی عورت کو راج محلوں کا خیال کیوں کھٹک رہا ہے ؟ اُس بے سر و سامان عورت نے محلوں کی ملکیت کیوں پوچھی ؟ وہ تو چلی گئی — مجھے یہ نظم دے گئی ۔

کیا یہ راجہ کے محل آپ کے ہیں ؟

پدما چڈیو نے جموں سے ہائی اسکول پاس کیا۔ کالج کی سائنس کلاس میں داخلہ لیا: " میں سائنس داں بنوں گی۔ " آرٹ اور سائنس کے معرکے میں اُبھرتی ہوئی شاعرہ ہار گئی۔ غمِ عشق نے اُس کی ساڑی کا پلّو تھام لیا۔ ایک ہجومِ آشفتہ سراں اور اُس میں ایک بلبلِ ہزار داستاں پیدا ۔

انھی دنوں وہ آنتوں کی دق میں مبتلا ہو گئی اور عزیزوں نے اُسے کچھ دن کا مہمان جان کر سری نگر میں NEST DESEASES ہسپتال کے حوالے کر دیا۔ پھر مڑ کر نہ دیکھا۔

ہسپتال کے تین سال اُس نے یوں گزارے جیسے پکنک میں گزار رہی تھی۔ افسردگی، بیماری، گلہ اور کڑوی یادوں کے اس ماحول میں اُس نے ایڑیاں نہیں رگڑیں، کسی کو بددعا نہیں دی۔ زمانے کی شکایت نہیں کی؛ بیماروں کا جی بہلایا، انہیں نظمیں سنائیں، گیت گائے، زندگی آمیز دلی، چھیڑ چھاڑ، لطیفے اور مسکراہٹیں بکھیرنے والی یہ بے کس لڑکی سینے کی بیماریوں کے احاطے میں دل کی دھڑکنوں کو تیز کرتی، بے چین تمناؤں کو سکون بخشتی، بے بسی پر اختیار کی صدا بلند کرتی رہی — جینے اور محض جینے کی خاطر اُس نے موت سے ایسی زبردست کشتی کی کہ ہر ایک کو اُس پر پیار آنے لگا۔ ہسپتال کے انچارج مرحوم ڈاکٹر حفیظ اللہ نے اُسے بیٹی بنا لیا اور بیٹیوں کی طرح اُس کے ناز اٹھائے۔ آج بھی اُن کی یاد سے پدما کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگتے ہیں۔

وہ زندگی کی ناز برداریاں کر رہی تھی اور زندگی سے تھکے ہوئے لوگ اُس کی ناز برداری میں لگے تھے۔ آصف اعظم علی فیضی اُن دنوں کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے، اُن کی بیوی سلطانہ فیضی نے بھی سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرا۔ سری نگر کے کئی گھرانوں میں اُس کا نام جانا پہچانا ہو گیا۔ نئے لوگ، نیا ماحول، دوسرے رسم و رواج، ڈوگری میں گیت اور نظم لکھنے والی بیمار لڑکی فر فر کشمیری بولتی، اُردو کے کلاسیکی خزانے کو کھنگالتی، چھوٹوں بڑوں میں پیار اور مسکراہٹ کی دولت لٹاتی، آخر ایک دن قدم قدم چل کر ہسپتال سے چلی آئی۔ تندرستی کی خوشی اور چاہنے والے چھوٹے بڑوں سے جدائی کا غم لئے، آنسو اور تبسم کی دھنک بکھیرتی جب سری نگر سے جموں کی طرف رخصت ہوئی تب تو نشاط اور شالیمار کے چشمے وداعی گیت گا رہے تھے:

بابل میرا نیہر چھوٹو ہی جائے

جموں میں اُس نے آل انڈیا ریڈیو پر اناؤنسر کی ملازمت کر لی۔ ملازمت عورت کے حق میں آزادی کا پروانہ بھی ہے اور جی کا جنجال بھی۔ پدما نے اُسے دونوں حیثیتوں سے قبول کیا اور باقی وقت شاعری کی دیوی کے چرنوں میں بھینٹ کر دیا۔

۱۹۶۲-۶۳ کے آس پاس وہ اپنی ریاست کی ایک ہونہار، دلیر، بے باک، جاندار اور نمائندہ شاعرہ مانی جانے لگی۔ جابجا جلسوں اور مشاعروں کے بلاوے آتے، ہر راہ لوگ اُسے دیکھ کر ٹھٹک جاتے، وزیرِ اعظم بخشی غلام محمد کہا کرتے تھے کہ چار سو برس بعد ہمارے یہاں حبّہ خاتون نئے روپ میں آئی ہے۔

پچھلے دنوں جب ہم جموں کے کئی یادگار جلسوں میں شریک ہوئے تو میں نے دیکھا کہ سارا شہر اُسے جانتا ہے، مانتا ہے اور جی جان سے چاہتا بھی ہے۔ مگر وہ جو عرب کے شاعر نے کہا ہے ؎

اذا کانت النفوس کبارًا
تعبت فی مرادها الاجسام!

شخصیت جتنی بڑی ہو، اُس کے آدرش بھی اُتنے ہی اونچے ہوتے ہیں اور جسم وہاں تک پہنچتے پہنچتے سخت مصیبتوں سے گزرتے ہیں۔ ایک بڑی مصیبت اُس کی گھات میں لگی تھی۔ یک عشق و ہزار بدگمانی۔ ہمدردوں کی بدگمانی نے جموں شہر سے رشتہ توڑ دیا۔ اور اپنی سرزمین، کوہستانی سلسلے، ریڈیو کی نوکری، اور شعر کی چبھن سے رشتہ اور مضبوط کر دیا۔ شاعرانہ شہرت کے ساتھ ساتھ تہمتوں کے خارزار میں وہ ملیکہ دیوی کا بن کر رہ گئی۔

زہر کی لے اور اونچی ہو گئی۔

یہیں جموں میں اُس کی ملاقات ایک منچلے سکھ شریف زادے سے ہوئی جسے قدرت نے ادب کا شوق، مطالعہ کا ذوق، گلے کا رس، سنگیت کی لگن، کیریکٹر کی مضبوطی اور محبت کا درد بخشا تھا۔ دو سال گزرے ہوں گے کہ دونوں عہد و پیمان میں بندھ گئے۔ وہاں پہنچ کر سردار سریندر سنگھ نے پدما کو اپنا گھر بار سپرد کر دیا۔ وہ باورچی خانے میں آٹا اُسی شوق سے گوندھنے لگی جس شوق سے گھر کی چیزیں اور اپنی نظموں کی چو پشانی

گنگنایا کرتی تھی۔

بھلا زندگی نے اُسے بے گھر کر کے ایک گھر دیا، بے کس کر کے نئے نئے رشتے، موت کے دہانے پر کھڑا کر کے زندگی دی، غموں کی تیز آنچ سے گزار کر کندن کی گہرائی اور شادمانی دی، خوف میں ڈال کر اطمینان دیا، دکھ دے کر طبیعت میں صفائی پیدا کی، اور تضادوں کی بھٹی میں جھونک کر، جی بھر کر، جھولیاں بھر بھر کر محبت کے موتی لٹانے کا اعلیٰ ظرف دیا۔ اور محبت کی بھول بھلیوں میں بھٹکا کر وہ شاعرانہ صلاحیت عطا کی جو زندگی کے پیچ و خم میں اپنی راہ تلاش کرنا اور اپنے قدموں پر کھڑا ہونا سکھاتی ہے۔

۱۹۶۸ میں جب وہ بمبئی کے ریڈیو اسٹیشن پر ہندی کی اناؤنسر ہو کر آئی تو ہر طرف اُس کے قدرداں پھیلے ہوئے تھے۔ ہندی اُردو کے ادب شناسوں تک اُس کا نام پہنچ چکا تھا۔ ادبی محفلیں اُس کے گیتوں کی امیدوار تھیں، اخباروں، رسالوں کے ایڈیٹر اُس کا کلام چھاپنے کے مشتاق تھے۔ اور وہ جموں کی ہمدرد، ڈوگری کی نامور شاعرہ، پدما، سیندور بھری مانگ پر ساری کا آنچل ڈالے نظریں جھکائے، نپا تلا کر ہر ایک سے یوں ملتی، مل کر یوں خوش ہوتی جیسے پنچال کی پہاڑیوں میں کبھی انجانے پھولوں سے، دریا کنارے سنگیوں سے مل کر خوش ہوا کرتی تھی۔

صنعتی تہذیب کے اس گھنے جنگل میں وہ اپنے شاعرانہ بہار کی بھینی بھینی مہک سنبھالے ہوئے ہے۔

"کیا، پدما تم ہی ہو؟"

رام دھاری سنگھ دنکر نے ایک دن اُسے اپنے گھر (دہلی) میں دیکھ کر پوچھا۔ اور چند روز بعد جب اُس کے کلام کا پہلا مجموعہ چھپنے جا رہا تھا تو اُس کے دیباچے میں لکھا:

تر: "پدما جی نے ڈوگری کے لوک گیتوں کے سوا کچھ اپنی کویتائیں بھی مجھے سنائیں۔ اور انہیں سن کر مجھے لگا، میں اپنی قلم پھینک دوں۔ وہی اچھا ہے کیونکہ جو بات پدما کہتی ہے وہی اصلی کویتا ہے۔ ہم میں سے ہر کوئی، اس کویتا سے بہت دور ہو گیا ہے۔"

کون ہے جو قطب مینار کو اپنے آگے گردن جھکاتے دیکھ کر بدحواس نہ ہو جائے؟ پدما پھلوں سے لدی ہوئی ٹہنی کی طرح اور جھک گئی۔ اُس کا مجموعہ چھپا اور ساہتیہ اکادمی کا وہ انعام جیت لایا جس کی آرزو کرتے کرتے بعض مشہور اور مقبول اہلِ قلم دنیا سے گزر جاتے ہیں۔ ملک میں اُس کے نام اور کلام کی بڑی دھوم ہوئی اور وہ خود ایک نئی نویلی گرہستن کی طرح شرم سے اور گھونگھٹ نکالتی رہی۔

ایک نظم "پریم پریت" میں اُس کے لکھے ہوئے دو گیت گھر گھر پھیل گئے۔ ساہتیہ اکادمی نے اُس کا کلام کا ہندی ترجمہ کتابی شکل میں چھاپنے کا بیڑہ اُٹھا لیا، ہندی اور اُردو کے لیکھکوں میں وہ ڈوگری، جواب طلبی اور کھینچا تانی کا ایک اور کارن بن گئی۔

اُردو کے ہزاروں شعر اُسے زبانی یاد ہیں۔ اُردو لکھ پڑھ سکتی ہے، شعر ڈوگری میں کہتی ہے مگر جس سادگی اور بے تکلفی سے وہ اُن کا اُردو ترجمہ فی البدیہہ سناتی ہے، اُردو کے پروفیسر منہ کھولے سکتہ رہ جاتے ہیں۔ گھر میں پنجابی بولی ہے، محفلوں میں ہندوستانی۔ نگاہ برابر وسیع ہوتی جاتی ہے اور دل اُس سے وسیع تر ——

چند روز پہلے جب پدما سچدیو کی ساس، جنہیں اُس نے ماں کی طرح چاہا، بسترِ مرگ پر پڑی تھیں تو کبھی کبھی شاعرانہ لمحے اور تیمارداری کے تقاضے میں بل پڑ جاتا تھا۔ پہلی بار اُس نے شاعری سے منہ موڑا اور جب اُس جیتی ماتا کی پیاری ساس نے دنیا سے منہ موڑا تو وہ اُسے نظم کی صورت میں ایک ایسا تحفہ دے گئی جو اپنی اپیل میں ہمہ گیر بھی ہے، شاعرہ کا ذاتی تجربہ بھی، اور ذاتی و کائناتی کیفیت کی ہم آہنگی نے اس نظم کو ایک عجب تاثر بخش دیا ہے۔

فطرت، حسن، انسان، غم، مسرت اور ذاتی تجربے کی یہی ہم آہنگی اور لہجے کی مٹھاس ہے جس نے پدما سچدیو کی نرم، پُر بہار، دلآویز شخصیت کو شعر کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔

چاندی کے ورق
(اصل ڈوگری سے ترجمہ)

(میں نے اپنی ساس کے انتقال کے دو دن بعد
خواب میں دیکھا کہ وہ آئی ہیں اور مجھے چاندی کے
ورق لگے دو پان دے رہی ہیں)

پ۔ س

ان دنوں میں ـــــ آ آ کر
انتظار کر کر کے
زنجیرِ در بجا بجا کر
ننھی ننھی بچیاں تھک چکی ہیں۔

میں نے اُن کے قدموں کی دھیمی آہٹ سُنی
سنتی رہی
پر دروازہ نہ کھولا
آنسو اپنی آنکھوں میں تول لئے،
آنچل کے پیچھے میں ڈھلکنے نہ دئیے؛
آنسو میرے اندر میں گھل مل گئے

ہمارے آنگن کا چھتنار برگد مجھے بچپنے گر گیا ہے
میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا:
پتے پتے پر پیلاہٹ پھیلتے
اور ٹہنیوں کی کالائی سے کنگن گرتے۔
چھتنار برگد پر
گرنے سے پہلے کچھ ساتے آئے،
جیسے روئی کے پھاہے،
دیکھتے دیکھتے یہ روئی کے پھاہے چڑیاں بنے، بن کر اڑ گئے
درخت خالی ہاتھ رہ گیا
اور ڈالی چرچرا کے گر گئی

اور پھر اُسی رات
میرے خواب میں آ کر
یہ پیڑ مجھے دو بڑے پان دے گیا
چاندی کے ورق میں
لپٹا اک احسان دے گیا

تبھی تو ننھی بچیاں آ آ کر
انتظار کر کر کے
واپس چلی گئی ہیں
اس اندھیرے کے سیلاب میں
میری کتنی نظمیں بہہ گئی ہیں۔

یہ لمحاتی نظمیں، لمحوں اور زمانوں کی حدیں توڑ کر جئیں گی اور ڈوگری زبان ہی نہیں ـــــ ہمارے ملک کی کئی زبانیں اُس کی مہک پر، اُس کے رس پر، اُس کی روحانی قوت پر اور دلکشی پر فخر کرتی رہیں گی۔

قطب سرشار

سانس لیتی ہوئی کتاب

(نوٹ :- اس نظم میں "مدرس" خود کو مخاطب کر رہا ہے- میں نے یوم اساتذہ ۵ ستمبر کے لئے یہ نظم کہی تھی)

ماں کی ممتا ہوں ، شفقتِ پدری
قوم کی رُوح، قوم کا معمار
نونہالوں کے پیاسے جنگل میں
میں ہوں شفقت کی ایک ندی کی طرح
عقل و دانش کی چاندنی کی طرح
آئینہ ہوں معاشرہ کا میں
میرا دامن ——— اور ——— میرا لہجہ
گنبدِ قوم کی خلاؤں میں
ایک اک فرد بن کے گونجے ہے -
ذہنِ طفلک کی لوحِ سادہ پر
میں ہوں آدرشِ خامۂ افکار
نُورِ دانش ہوں ، آفتاب ہوں میں
سانس لیتی ہوئی کتاب ہوں میں

یعقوب راہی

جب آنکھیں کھول دیتا ہوں

سُلگتی رات آتے ہی -
اندھیرے پھیل جاتے ہیں -
کسی کی یاد کے جگنو
چمک کر بجھنے لگتے ہیں -
کسی کی راہ میں بکھری ہوئی میری اِن آنکھوں کو
کچھ ایسی نیند آتی ہے -
مری آنکھوں کو جیسے نیند کی آغوش سب کچھ ہو -!
مگر جب بھی -
کسی آزاد رَو لمحے کی دستک سے
میں آنکھیں کھول دیتا ہوں
چمکتے چاند سی دو اجنبی آنکھیں
میری آنکھوں کی گہری کھائیوں میں،
اُترتی اِس طرح محسوس ہوتی ہیں
وہ جیسے میری آنکھوں کی سیاہی پینے والی ہوں -!!

کہانی

قیوم خالد

امانت

میں نے یہ کہانی محترمہ رضیہ سجاد ظہیر صاحبہ کے ایک مضمون "کلی جو مرجھا گئی" سے متاثر ہو کر لکھی ہے۔ یہ مضمون روزنامہ سیاست حیدرآباد مورخہ ۱۰ جون ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں ایک ...سالہ ویتنامی لڑکی مانگ لی کا ذکر ہے جو بمباری سے ہلاک ہو جاتی ہے۔ مانگ لی شاعرہ بھی تھی۔ جو نظم میری کہانی میں ہے، وہ مانگ لی ہی کی نظم ہے۔ جس کا ترجمہ رضیہ سجاد ظہیر صاحبہ نے کیا ہے۔ میں اس مضمون سے اتنا متاثر ہوا کہ مجھے کرداروں کے نام بدلنے کی بھی را... نہ ہوا۔

قیوم خالد

موسم خزاں کی ایک ویران صبح ہے۔ پھر بھی آسمان ابر آلود ہے۔ سورج اب تک کتنا سفر طے کر چکا ہے نہیں معلوم۔ پتہ نہیں وہ چل بھی رہا ہے یا نہیں۔ کمرے کی ساری فضا بوجھل ہے۔ تمہاری دی ہوئی کلیاں بھی مرجھا گئی ہیں۔ لیکن ان کی سرخی اور بڑھ گئی ہے۔

مجھے اب بھی وہ شام یاد ہے جب ہم اپنے ماسٹر صاحب کو الوداع کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ محاذِ جنگ پر دسویں کلاس کے چند لڑکے بھی جا رہے تھے۔ مانگ بھی ان میں شامل تھا۔ تھیل تھیں ہم چینی، دسویں جماعت کا ذہین طالب علم۔ تم نے الوداعی پارٹی میں جو نظم پڑھی تھی وہ اب بھی مجھے لفظ بہ لفظ یاد ہے۔ تمہاری نظم سن کر ماسٹر صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ ماسٹر صاحب کی فرمائش پر تم نے وہ نظم کاغذ پر لکھ کر دے دی تھی۔ ماسٹر صاحب نے وہ نظم یہ کہہ کر رکھ لی تھی کہ وہ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھیں گے۔ پھر لڑکیوں نے محاذ پر جانے والے لڑکوں کو اپنے ہاتھ سے کاڑھے ہوئے رومال دیئے۔ سارے رومال سفید تھے لیکن جو رومال تم نے مانگ کو دیا وہ رنگین تھا۔ میں نے مانگ کو چھیڑا: "تم بہت خوش قسمت ہو۔" وہ جھینپ گیا۔ جب میں نے تم سے اس معاملہ کے بارے میں دریافت کیا تو تم نے یہ کہہ کر بات اڑا دی کہ تمہارا اس ... تم نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ میں بہت شریر ہو گئی ہوں اور لڑکوں کا مذاق اڑانے لگی ہوں۔ پھر اس دن کے بعد سے تم تھیل تھیں زیادہ کھلنے لگی تھیں۔۔

مجھے وہ شام بھی اچھی طرح یاد ہے جب میں ہوم ورک کا کام کرنے کے لئے تمہاری نوٹ بک گھر لے گئی تھی۔ اسی میں مانگ کے نام لکھا ہوا ایک خط تھا۔ تم نے لکھا تھا:

پیارے مانگ!

تم جب سے گئے ہو میرا دل یہاں نہیں لگ رہا ہے۔ حالانکہ جینے اور ساتھ مرنے کی تو ہم نے قسم کھائی تھی۔ کاش! ایسے ہی نباہ سکتی۔ لیکن تم ہی نے مجھے ساتھ چلنے سے منع کر دیا تھا اور کہا تھا کہ پڑھائی بھی ایک قسم کا محاذ ہے۔ مجھے یہ سوچ کر فخر محسوس ہوتا ہے کہ ساری قوم کی جدوجہد میں تمہارا بھی ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ موسم خزاں کی خنک رات ہے۔ کھلے آسمان پر چاند اپنی پوری آب و تاب سے روشنی بکھیر رہا ہے۔ یہی چاند تمہارا راستہ بھی روشن کر رہا ہوگا۔ تم اپنے آپ کو اکیلا نہ سمجھنا۔ یہ چاند تمہارا ساتھی ہے اور یہی چاند میرا بھی ساتھی ہے۔ اس طرح ہم تینوں ساتھ ہیں۔ آج سے چند دن بعد خزاں کا میلہ ہوگا۔ لیکن اب کے خزاں کے میلے میں کچھ بھی مزا نہیں آئے گا۔ تم جو نہیں ہو گے۔ سوچ رہی ہوں آگے کیا لکھوں ...

کو لیبیت کچھ ہے۔ لیکن تمہیں پڑھنے کی فرصت کہاں۔ اسی لئے خط ختم کر رہی ہوں۔

فقط تمہاری

وانگ یی یا

میں تمہاری رازدار سہیلی تھی۔ لاک کو تم نے خط لکھا مگر مجھے اس سے بالکل لاعلم رکھا۔ اسی لئے دوسرے دن صبح میں تم سے روٹھی روٹھی گھومتی رہی۔ تم نے مجھ سے روٹھنے کی وجہ پوچھی۔ میں نے کہا "ہوگی کوئی بات۔ ہر بات بتائی نہیں جاتی ہے۔" حالانکہ میں روٹھنے کی وجہ بتانے کے لئے بیتاب تھی۔ تم نے کہا "سہیلیوں سے بات چھپانا اچھی بات نہیں۔ اور اگر میں بھی تم سے روٹھ گئی تو پھر منوں گی ہی نہیں۔"

"اور تم نے خود جو بات مجھ سے چھپائی ہے۔" میں نے کہا۔

"کون سی۔" تم نے پوچھا۔

"یہی کہ تم لاک سے محبت کرتی ہو۔ تم نے تو مجھ سے کہا تھا کہ میں سسٹر ہو گئی ہوں۔ لڑکوں کا مذاق اڑانے لگی ہوں۔ تو پھر یہ کیا ہے؟" میں نے خط آگے بڑھا دیا۔ تم سٹپٹا گئیں۔ بہت دیر تک تم مٹھی کو انگوٹھے سے مٹی کریدتی رہیں۔ مٹی کریدتے ہوئے تم نے مجھ سے پوچھا۔ کیا محبت کرنا گناہ ہے۔ محبت تو زندگی ہے اور مجھے زندگی سے پیار ہے۔ پھر تم نے مجھے اپنی نظم سنائی۔

زندگی مجھے تجھ سے پیار ہے
تو صرف آسمان و زمین نہیں
تو مستقبل کا یقین ہے
وہ مستقبل جو میرا دل ہے
میری زندگی ہے۔

(وانگ یی یا)

بہت دیر تک ہم خاموش بیٹھے رہے پھر تم نے سکوت توڑا اور پوچھا۔ کیا تم نے کسی سے محبت نہیں کی۔ میرا بھی جی چاہا کہ تمہیں کریدنے لگوں۔ لیکن زخموں کو کریدنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ جو انسان جنگ کی گود میں پیدا ہوا ہو۔ جو اس کی آغوش کا پروردہ ہو۔ وہ محبت کس سے کرے۔ جب زندگی کا آنے والا ہر لمحہ موت کا پیغام ہو تو کوئی کیسے محبت کرے؟ میں نے جواب دیا

تم نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے تمہیں اس بات کا یقین نہ آیا ہو۔ میں تمہاری نظروں کا مطلب سمجھ گئی اور مجھے یہ کہنا پڑا کہ میں نے بھی کسی سے محبت کی تھی لیکن اس سے پہلے کہ میں اظہار کرتی وہ محاذ پر چلا گیا اور پھر کبھی لوٹ کر نہ آیا۔

اس کے بعد بہت دیر تک ہم مستقبل کے خواب بنتے رہے۔ ایسے مستقبل کے جس کا کوئی یقین نہیں تھا۔ پھر بھی جیسے تم اپنا دل اپنی زندگی سمجھتی تھیں۔ تم نے کہا تھا کہ تم دسویں جماعت پاس کر کے نرسنگ کی ٹریننگ حاصل کرو گی تاکہ قوم کی جدوجہد کا حصہ بن سکو۔

لیکن چار دن بعد جو تم نے بتایا کہ تم پڑھائی کے ساتھ ساتھ ٹریننگ بھی حاصل کرنے لگی ہو۔ تاکہ پڑھائی ختم ہوتے ہی تم محاذ پہ پہنچ سکو۔ تم ٹریننگ کیلئے اسپتال جانے لگیں۔ تم لوگوں کو زندگی بخشنے ہسپتال گئی تھیں، لیکن موت نے تمہیں آ دبوچا۔ ایک رات جب تم ہسپتال میں تھیں ہسپتال پر بم گر پڑا۔ اور تم رات بھر زندگی اور موت سے لڑتی رہیں۔ صبح جب میں تمہیں دیکھنے آئی تو تم آخری سانس لینے کی کوشش کر رہی تھیں۔ تم نے مجھے سفید کلیاں جن پر خون کے چھینٹے پڑے ہوئے تھے دیتے ہوئے بمشکل کہا کہ جب لاک واپس آئے تو اسے یہ کلیاں دے دینا۔ پھر تم نے مجھ سے زندگی والی نظم سنانے کی فرمائش کی۔ میں نے نظم سنانا شروع کی، جیسے ہی میں نے نظم ختم کی۔ تمہاری گردن ڈھلک گئی۔ اس طرح آٹھ بج کر ۳۲ منٹ پر تمہاری زندگی کی جدوجہد ختم ہو گئی۔ جب میں وہاں سے لوٹی تو بہت اداس تھی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے منگل کا دن منحوس لگا۔

اور آج تمہیں مرے ہوئے پانچ دن ہو چکے ہیں۔ کل سے [illegible] کا میلہ شروع ہونے والا ہے لیکن تم نہیں ہو۔ تمہاری دی ہوئی کلیاں مرجھا گئی ہیں۔ لیکن ان کی سرخی اور بڑھ گئی ہے۔ تم بھی تو ایک کلی تھیں، جو وقت سے پہلے مرجھا گئی ہے۔ لیکن اب میں تمہاری دی ہوئی امانت کیسے سونپوں۔ آج صبح اسٹرالانٹ کی بھیجی ہوئی گھڑی موصول ہوئی؛ جس کے ساتھ ایک خط بھی ہے۔ لکھا ہے۔

لاک کو شاید یہ گھڑی تم نے دی تھی۔ وہ اسے ہمیشہ دل کے قریب لگائے رکھتا تھا۔ اس کی جیب میں ایک وصیت ملی کہ اگر وہ

(بقیہ صفحہ ۹۲ پر دیکھئے)

غزلیں

علقمہ شبلی

چوٹ پھولوں کی چھڑی سے بھی دِکیوں دل پہ لگے
شہر میں ہر آدمی جب درد کا پیکر لگے

کارگاہِ زندگی گویا ہے دشتِ کربلا،
راستے میں جس طرف بھی جائیے ٹھوکر لگے

اِس دیارِ روشنی نے یوں کیا ہے خیرہ چشم
زندگی جیسے یہاں شب سے بھی تیرہ تر لگے

راستے ویران، چہرے فق، لبوں پر خامشی
دوستو! یہ شہر بھی اب مجھ کو اپنا گھر لگے

وقت کا بے رحم سورج کیوں نہ ہو زہرہ گداز
صبح کی ٹھنڈی ہوا بھی جب مجھے خنجر لگے

منزلیں ایسی بھی آئی ہیں سفر میں ذات کے
پھول بھی زیرِ قدم آئے تو وہ پتھر لگے

زخمِ تنہائی کا شبلیؔ تھا نہ کچھ کم جاں گداز
اور اُس پر یہ ہوا کہ پے بہ پے نشتر لگے

شاہد ماہلی

نہ جانے کون سی خواہش عذاب ہے یارو
نفس نفس میں عجب اضطراب ہے یارو

نہیں ہے کچھ بھی خلاؤں کی وسعتوں کے سوا
زمیں سے تا بہ فلک اک سراب ہے یارو

بکھرتا رہتا ہے اوراقِ منتشر کی طرح
خیال ہے کہ پرانی کتاب ہے یارو

عجیب موڑ پہ آکر ٹھہر گئی ہے حیات!
کوئی خیال نہ خواہش نہ خواب ہے یارو

حقیقتوں کو سرِ راہ کر دیا عریاں
عروسِ وقت بڑی بے حجاب ہے یارو

گُھرے ہیں کتنے سوالوں کے راہ میں اشجار
بس اک سکوت ہی سب کا جواب ہے یارو

جہاں پہ آکے ملی گردشِ فلک سے اماں
یہی وہ اک دلِ خانہ خراب ہے یارو

مقالہ

نقی احمد ارشاد

حکیم میر انشاء اللہ خاں انشاءؔ

(۱) اسلاف کے ـ تذکروں کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ امام جعفر صادقؑ چھٹے امام اثنا عشری کی اولادوں میں تھے۔ چنانچہ شیخ احمد علی تذکرۂ فرائد الغرائب میں تحریر کرتے ہیں ـ "سید انشاء اللہ خاں، انشاء تخلص، عینی خلف محمد اولاد اللہ [illegible] امیر انشاء اللہ جعفری النسب۔ نجفی الوطن است ۔ جدش شاہ نور اللہ نجفی در ہندوستان متوارث شد، میر ماشاء اللہ بخلاف پدر بزرگوار سعیہا در تلاش دنیا کرد۔ در بنگالہ ملازمت نوابان اندر نظر رسیدہ و اکثر در کار زار پیش از دیگران داد شجاعت دادہ، تمام بدلش جرات گاہ بود۔ در عالم تنزل کہ عہد نواب قاسم علی خان بود پیشی نواب وزیر الممالک، نواب شجاع الدولہ آمدہ"

میر ماشاء اللہ کے زمانے میں بیشتر لڑائیاں ہوئیں ۔ اور وہ اتر (سمتھال پرگنہ) سے عظیم آباد تک بکسر، مگر سید التاخرین یا تاریخ مظفری میں میر ماشاء اللہ خاں کا نام نہیں ملتا۔ بہرکیف یہ خاندان نجف اشرف سے وارد ہندوستان ہوا اور مرشد آباد عظیم آباد (مونگیر) میں اس زمانے میں اتنی دولت جمع کی کہ آں روز بادر عرصۂ بربادیٔ اسباب، از دہ فیل ہمراہ داشت۔ سخاوت بدرجہ بود کہ در جنب او نام حاتم ذکر کردن باعث خجالت است ۔ بذات خود مرغ پلاؤ و نان جو را مساوی می دانست۔ ہمیشہ بر زمین می خوابید و شب زندہ دار بود۔ آخر با چون زمانہ را بکام کسانے دید، کہ رہا کردہ و در فرخ آباد متوطن شد، از نواب مظفر جنگ بقدر ضرورت قناعت می کرد۔

الغرض میر ماشاء اللہ مرحوم نے فرخ آباد میں رحلت کی اور وہیں اُن کا مزار ہے ـ مصحفی لکھتے ہیں ـ "اصل بزرگانش از نجف اشرف و ولادت گاہ او شہر مرشد آباد است۔"

مرشد آباد میں ولادت ہونے کی وجہ سے میر انشاء اللہ خاں بنگلہ زبان کے بھی ماہر تھے چنانچہ مولوی عبد القادر جیب رام پوری اپنے روزنامچہ میں تحریر کرتے ہیں ـ "بزبان اردو فارسی و عربی و بنگلہ و پوربی و مرہٹی و کشمیری و ترکی و افغانی بلہجۂ آں قوم سخن گفتی۔"

زمانہ نہایت پر آشوب تھا ـ ۱۷۵۰ء میں حملۂ نادر شاہ کے بعد مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھرنا شروع ہو گیا تھا۔ تمام مغربی ہندوستان میں سلطنت کا نظم و نسق بگڑ گیا تھا۔ مشرقی حصے میں قدرے امان تھا مگر جنگ پلاسی ۱۷۵۷ء اور جنگ بکسر ۱۷۶۴ء کے بعد مشرقی ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تھا۔ مغربی و مشرقی ہندوستان کے درمیان حکومتِ اودھ صوبہ میں جزیرہ کی سی کیفیت رکھتی تھی اس لئے تمام اہلِ حرفہ و فنون لطیفہ مغرب و مشرق دونوں حصوں سے بھاگ بھاگ کے فیض آباد و لکھنؤ پہنچ رہے تھے۔ چنانچہ میر ماشاء اللہ بھی اور میرزا محمد دہلی سے وارد فیض آباد ہوئے، بشیخ احمد علی لکھتے ہیں۔

حالاتِ انشاءؔ: "چوں بسن شانزدہ سالہ رسید، بحضور نواب وزیر الممالک شجاع الدولہ داخل حلقہ شد ـ در آں وقت در ایام شباب بطور خود بطرز نوی بے استاد و ردیف در انشاء پرداز اہمادہ [illegible] فارسی و عربی ہم بر سلیقۂ ثبت داشت، چالاکی و صحبت مطبوع و تقریر دلچسپ یافتہ شد، در تمام دربار ادبی کمیشن کلکم ادبی و سیر و عنایت بندگان عالی محسود اہل دربار شد بعد چندے کہ نواب موصوف قضا کرد، در دربار آصف الدولہ

مجلس انشاء اللہ خاں ذکر رہنہ سے بیکر نواب ضعفاء المقام والدولہ میرزا نجف خاں مرحوم ۔ اس کی مطابقت تاریخوں سے بھی ہوتی ہے آصف الدولہ نہایت تھے اعمال میں مبتلا تھے ۔ چنانچہ نجم الغنی خاں رام پوری تاریخ اودھ جلد دوم صفحہ میں تحریر کرتے ہیں :

"اس بیان سے سیر المتاخرین کی یہ شہادت معلوم ہوتی ہے کہ آصف الدولہ کے بدوضع ہم نشین خلاف وضع فطری کام بہت کرتے تھے مگر ایسا ہو تا تھا کہ تھوڑی دام اور فریب دیا کر سزا کیں دو دیبانی پاس سے نکال دینا کافی تھا ۔ شجاع الدولہ کو اتنی غیرت آتا صاف دلالت اس مطلب پر کرتا ہے کہ اگر صاحب بغاوت ، نو خلاف وضع فطری کام کا ارتکاب کرتے ہوتے تو مشغول لڑکوں کو ایسی سخت سزائیں نہ دی جاتیں :

چونکہ بہو بیگم نہ تو اصلاحات ستو ستری کے کلاک صاحبزادے تھے ستانوئم اور زنان خانے میں پلے کسی جنگ میں کبھی شریک نہیں ہوئے ۔ لہٰذا عیب بہ فطرت اور قوت رجولیت کی کمی کے باعث ہوس پرستی کے شہوانی عیوب میں مبتلا تھے ۔

لہٰذا میر انشاء کا عاشق بھی ذہن سے مشہور ہے ایسے ازمال پرست دربار میں کیونکر ٹک سکتے تھے ۔ لہٰذا میرزا نجف خاں کی دہلی میں جاتا پڑا میر نجف خاں سے تعلقات ظاہر ہے دونگر ہا عظیم آباد کے ہوں گے کیونکہ میرزا محسن صوبہ دار الٰہ آباد دوم شجاع الدولہ کے انتقال کے بسبب میرزا نجف خاں میرزا محسن کا نجف خاں کے بھانجے کو شجاع الدولہ نے مروا ڈالا ۔ الٰہ آباد پہ بھی قبضہ کر لیا تو ناچار میرزا نجف خاں نے بسبب آئندہ کیا ملا جا میر قاسم کے لشکر میں شریک ہو گئے ۔ بعد شکست اودھ ناکام میرزا نجف خاں نے دہلی کا رخ کیا ۔ (دیکھو سیر المتاخرین ۔)

الغرض میر انشاء دہلی پہنچے ۔ نجف خاں کی حکومت عارضی ثابت ہوئی کثرت سے نوشی کے سبب جلد ہی مر گئے ۔ لہٰذا انشاء اللہ خاں نے ایسے میں لکھنؤ کا رخ کیا ۔

"وقتیکہ در اندیں گذ بعد چندے ہم پلے پدر بہ دہلی رفتہ با محمد بیگ خاں ہمدانی معزز می بود و چند با مغرورا بر دستے آمدہ تفنگ و تیر دگیر زد ۔ لیکن چوں حیات اسنار باقی بود بہ سلامت برگشت ۔"

غرض میر انشاء صرف صاحب محفل تھے بلکہ میدان کے سپاہی بھی تھے ۔ جس پر بہت کم اہل قلم نے لکھا ہے ۔ جنگ کے بعد اسمٰعیل بیگ ہمدانی برادر زادہ محمد بیگ سے نا اتفاقی کے باعث دوبارہ لکھنؤ واپس آ گئے ۔

(۳) **تلاش معاش** یہ زمانہ وہ تھا کہ دہلی کے اکثر شاہزادے لکھنؤ میں شکوہ سے پذیر ہو گئے تھے ۔ ان میں میرزا سلیمان شکوہ بھی تھے ۔ میر انشاء کوئی ہے چلے سے وابستہ رہے مگر یہ سلسلہ کی اور بہو بیگم کے خواجہ سرا الماس علی خاں کے دامن دولت سے وابستہ ہو گئے یہ شخص ایک کروڑ روپے کا گماشتہ اور بچا ۔ فوج بھی رکھتا تھا اور بہو بیگم کی سرپرستی کے سبب کسی شخص سے نہیں دبتا تھا ۔ اس کے علاوہ نواب سالار جنگ بہادر بہو بیگم کو بھی اس کی سرپرستی حاصل تھی ۔

آصف الدولہ کے بعد جب سعادت علی خاں مسند نشین ہوئے تو بہو بیگم کے اقبال کا ستارہ غروب ہو گیا ۔ میر انشاء اللہ سعادت علی خاں کے مصاحب خاص ہو گئے ۔ چونکہ بہو بیگم اور سالار جنگ سے یہ عداوت دل رکھتے تھے لہٰذا میر انشاء کو ابھار کر سالار جنگ کے خلف اکبر میرزا قاسم علی خاں کو ایک دن ذلیل کرایا جیسا کہ شیخ احمد علی تحریر کرتے ہیں ۔ "نواب میرزا قاسم علی خاں ابن نواب سالار جنگ را بہ میر ہجو بر برد تمے چنانچہ حال ذلیلی کرد ۔"

یہاں یہ بات تحریر کرنے کے لائق ہے کہ جس طرح نوابوں کے یہاں اہل فنون لطیفہ ، مصوروں موسیقاروں کی پرورش ہوتی تھی ۔ یہاں تک کہ ان کی کئی پشت ایک ہی فن کے کمال میں گزر جاتی تھی اسی طرح میر ضاحک ، میر حسن ، میر خلیق ، میر انیس ، میر مونس کی پرورش نسل در نسل نواب سالار جنگ (آصف الدولہ کے ماموں) ، نواب میرزا قاسم علی و نواب میرزا علی پسران سالار جنگ سے لے کر نواب میرزا … تک پشت با پشت جاری ہوئی ۔ ان کی تنخواہیں مقرر تھیں ۔ "مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی نسل در نسل ان کا پیشہ تھا ۔ یہاں تک کہ … بہو بیگم جب … کی جاگیر غازی الدین حیدر کو منتقل ہو گئی تو جو تنخواہ بہو بیگم کے وقت سے چلی آتی تھی ۔ وہ نواب واجد علی شاہ کی معزولی … تک … جاری رہی ۔"

شاہ ٹیکی

اس طرح میر انشاء اللہ خان کی اولاد کی پرورش واجد علی شاہ کے عہد تک ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ ننھی بیگم، میر انشاء اللہ خان کی نواسی اور واجد علی شاہ کے محل میں آ گئیں :

شیخ احمد علی کا تذکرہ خود میر انشاء اللہ خان کی زندگی میں لکھا گیا تھا۔ آب حیات کی تحریر بالکل بے بنیاد ہے کہ انشاء اللہ خان نے عالم غربت میں انتقال کیا۔ ان کا آخری مرض جنون ہو گیا تھا اور اسی مرض میں ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۸ء میں انتقال فرمایا۔

اگر ان کے حالات زندگی اور حکایات جمع کئے جائیں تو ایک چند اجزا کی کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ یہاں صرف ایک واقعہ پر اکتفا کرتا ہوں۔

بعد محمد شاہ جب خاندان امراء الامراء خان دوراں خان و خواجہ عاصم بلاد ہند میں تہس نہس ہو گیا تو خواجہ عاصم کے بھتیجے خواجہ باسط خلف خواجہ مظفر (دیکھو سیر المتاخرین) ... آ بسے جہاں ان کے نام کا ٹیلہ مشہور ہے۔ یہاں خاندان کی دختری اولاد عظیم آباد چلی آئی جن میں مشہور شاعر شاد عظیم آبادی تھے۔

خواجہ باسط کے نواسے امیر علی لکھنؤ کے مشہور سوز خواں تھے اور فن موسیقی میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ خواجہ باسط کے احفاد میں سے میر ضمیر مرحوم مشہور مرثیہ گو تھے۔ میر انشاء اللہ خان اور اس خاندان سے گہرے مراسم تھے چنانچہ نجم الغنی خان رامپوری تاریخ اودھ جلد چہارم صفحہ ۲۱ میں تحریر کرتے ہیں

"خواجہ باسط کے نواسے میر امیر علی ایک سوز خواں تھے کہ علم موسیقی میں انہوں نے پایۂ کمال حاصل کیا تھا مگر اپنے گھر ہی میں مجلس کر کے پڑھتے تھے۔ نواب سعادت علی خان نے ان کے شہرۂ کمال سے مشتاق ہو کر طلب کیا۔ انہوں نے انکار کیا اور کہلا بھیجا کہ سلام کے بعد یہ بھی کہا کہ آپ حاکم وقت ہیں تو میں سیادت کے اعتبار سے مخدوم ہوں۔ آپ ہی میرے یہاں آنے سے عار کیجئے تو اچھے۔ کہا کہ سید میرے یہاں ہزاروں سے زیادہ ہیں، میر صاحب نے اگر فخر سید کیا تو انہیں کیا ... اب ڈوم (الف ندارد) ہی ہو گئے۔ خیر انہیں اختیار ہے۔

امیر علی صاحب نے یہ سن کر خیالات چند در چند سے دکن کا ارادہ کیا۔ سید انشاء اللہ خان کے بھتیجے بھانجے بھی ان کے شاگرد تھے۔ یہ لوگ بھی ساتھ کی رفاقت میں عمر کے بعد وطن پر آمادہ ہوئے۔ انشاء اللہ خان نے امیر علی صاحب کے جانے کا سبب پوچھا تو معاملہ معلوم ہوا۔ سید صاحب نواب کے نہایت مقرب تھے، اس وقت دربار میں پہنچے۔ نواب سعادت علی خان نے دیر سے آنے کا سبب دریافت کیا۔ انہوں نے ایک غزل پڑھی جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

سعادت بنی ہے اور سعادت علی بنا ÷ یارب سدا یہ بنی ہمیشہ بنی رہے

پھر کہا کہ حضور غلام جو اس وقت رخصت ہو کر جا تو دل سے کہا کہ اپنے دولہا کے دولہن (یعنی سلطنت) کو دعا دیکر ... حضور واقف کر باللہ امیر علی سوار ستار سے گئی ہیں بھی ... سر پر بوجھ ہے، وہ کون؟ مولوی دلدار علی صاحب (مجتہد عصر) کا ذکر میں ... وہ کون؟ دونوں صاحبزادے گئے ہیں ... وہ کون؟ قتیل حسن خان صاحب۔ غرض اسی طرح چند نامور لوگوں کا نام لے کر کہا کہ حضور غور کریں تو یہ لکھنؤ میں نمونہ ہیں۔ دل دھک سے ہو گیا کہ اللہ سبحانہ کو قائم رکھے یہ کیا؟ نواب نے پوچھا۔ کہا حضور یہ امیر علی صاحب۔ اور ان کی کیفیت مفصل بیان کی۔ سن کر نواب ہنس کر کہا کہ ان کی قدر اندیشیاں بے جا ہیں۔ میں ایسے صاحب کمال کو فخر لکھنؤ سمجھتا ہوں۔ غرض ان کی تسلی کے لئے سو روپے دے اور خانہ نشینی مقرر کر کے پانچ سو روپے کا خلعت امیر علی صاحب کے واسطے انشاء اللہ خان کے ہاتھ بھیجا"

اولاد واجد علی شاہ کے عہد تک ان کی اولاد لکھنؤ میں شکوہ رہا چنانچہ ان کی نواسی ننھی بیگم خود واجد علی شاہ کے عقد میں آئیں مگر اس خاندان پر بھی زوال آیا اور خود مرزا انشاء کے علاوہ میر انشاء اللہ شاد عظیم آباد ہوئے۔ انہوں نے جو بحر باقی نظم کی ہے اس کے اشعار حیات فریاد ملاحظہ شاد عظیم آبادی سے نقل کئے جاتے ہیں ؎

جو سر کے اٹھا سورما گورا خواجہ تاباں کی کریچ لے کر ... سے اپنا ہاتھی ہولا، بچھیر کے دوڑے ہو کے زَرِ زَر

ہیں یہ بادل گرج رہے ہیں فرنگی طنبور بج رہے ہیں ... گولا دستار سج رہے ہیں اتار رکھے سروں سے افسر

انشاء کی طباعی، عربی فارسی سے بیزاری

... زمانہ تھا کہ اردو زبان ہندی کہی جاتی تھی اور ... سے پتہ چلتا ہے کہ انشاء اس زبان کی گرد ...

اور ملک کا بھوا آر بیکا چاہتے تھے۔ عبدالرحیم خان خاناں، رسکھ خان، ملک محمد جائسی وغیرہ نے تو براہ راست مقامی اور اودھی بندی کو اختیار کیا۔ مگر ابتدا سے ترقی دربار ہندی (اردو) کو فارسی عربی کے تسلط سے آزاد کرانا چاہا۔ چنانچہ عروض و بلاغت و بیان کی اصطلاحیں جب موجود زبان کے مناسب حال نہ پائیں تو درباری رنگ اور انجمن خانہ کے گھنگرو کے مزاج کے مطابق خود اصطلاحیں وضع کیں۔ مثال

(وزن)	(اصطلاح اشعار)
۱ مفاعیلن، مفاعیلن، مفاعیلن	پری خانم، پری خانم، پری خانم
۲ فاعلن، فاعلن، فاعلن، فاعلن	چت لگن، چت لگن، چت لگن، چت لگن
	(پریمی دل محبت، چت بمعنی دل)
۳ مفعول مفاعیلن، مفعول مفاعیلن	بی جان پری خانم، بی جان پری خانم
۴ فعول فعلان، فعول فعلان	گڑ گڑ بی جان، گڑ گڑ بی جان

۵ صنعت عکس۔ — بیاند ہیں دے گی بلا کر نئی گالی

(بیاند نام کی مشہور طوائف جو صاحب علی خاں کی کچھ دنوں منظور نظر تھی)

۶ صنعت توشیخ۔ — بیاند کو آج کہا کمہار نے بندی کے گھر ناحق، ناحق الو کے سامنے مارا۔ گھر میں سندی تھی سو وہ دوشالے کی گاتی باندھے جوڑی بجا رہی تھی خوب جب غل ہوا تو اٹھ گئی اور کٹھے پر جا کر لیٹ رہی اور جو لونڈیاں تھیں ہنسے ہنسے کرنے لگیں۔ سنہ زاندو آرزو دی۔

۷ صنعت مُعرّب۔ — اے تیری پلی کے تیچھے میں پیچ، ابل — ۸ زلف۔ — کا نام ستار

۹ رکن سالم — کا نام صاحب طائفہ — ۱۰ فرع — کا نام ذریہ صاحب طائفہ

وجہ یہ تھی کہ پنگل • عروض سنسکرت سے واقف نہ تھے اور واقف بھی ہوتے تو بوجہ اختلاف مذاق عربی کی عروضی اصطلاحیں سنسکرت میں کیوں چلتیں۔

اسی طرح جب ہمارے زمانے میں کوئی اردو کی نظمیں انگریزی بحروں میں نظم کرے تو پنٹا میٹر (Penta metere) ہیکسا میٹر (Hexa Metre) وغیرہ اصطلاحات کا کیا ترجمہ ہوگا۔ سوائے اس کے کہ موسیقی کے اوزان پر جو لفظی کے بول بنا لیے گئے ہیں ان کا اصطلاحی کوئی نام نہ ہو۔

---

۱ سنگار۔ لفظ سنسکرت ہے۔ اس کا لطف وہی اٹھا سکتے ہیں جو قدیم موسیقی کے شرنگار رس سے واقف ہیں جس کی حالت شہروں کے تال اور ملہار میں نرمان کی سی ہے۔ آج سے تقریباً ۲۰ سال پہلے صرف چند موسیقی داں عظیم آباد میں اس سے واقف تھے شاید اگر ہو یا کی ایسا میں کوئی جاننے والا ہو تو ہو۔

بقیہ افسانہ "نئے دھان" صفحہ ۴۲

روبیوں نے ہیں کنگال کر دیا۔ لوگ اپنے دھان گاہ کر گیہوں بھی بیچ بیٹھے لیکن انہیں دھان گاہنے کی تاریخ نہیں ملی دل تو چاہتا ہے کہ ان مارواڑی بنیئے مہاجنوں سے پوچھوں کہ بال بچوں کو ان کے کلیجے کھلائیں؟ لوگ نیا بجات کرا رہے ہیں اور یہاں صرف وقت پشاوریوں کی دکان سے کلو کلو چاول ادھار لئے جا رہے ہیں۔ آگ لگے ایسی نئی کھیتی کو!" بھاگو متاثر ہوتی جا رہی تھی۔ اسے جو خوشی اتنی بڑی فصل اُگنے پر ہوئی تھی وہ اب مایوسی میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی

کر کچھ مجرم کی طرح صحن میں گم سم کھڑا تھا۔ بادل اور گھر سے ہو چلے تھے۔ ان کی گرج کے ساتھ ساتھ اس کا دل بھی دھڑک رہا تھا۔

معاً دکھن کی طرف زور سے بجلی کڑکی۔ صبح ہوتے تک اولے بھری وہ بارش ہوئی کہ کھیتوں میں پانی کی ندیاں بہہ نکلیں۔ انھیں ندیوں میں کر پڑ کے نئے دھان اولوں کی مار سے ٹوٹ کر آدھے کھیتوں میں اور باقی پرال سمیت ڈھلانوں پر بہہ نکلے۔

خ۔ اد شفائی

بُوڑھا برگد

کبھی کبھی مَیں یہ سوچتا ہوں —
کہ اے وشال اور بُوڑھے برگد !
بدرجہا تم ہو مجھ سے بہتر
عظیم ہے فرق مجھ میں تم میں
میں باوجود "اشرف المخلوق"
غرض کا پُتلا، غرض کا پیکر
نہ مجھ سے ہے فائدہ کسی کو
نہ مجھ سے ہے فیضیاب کوئی
میں اپنی "حرص و ہوس" کا بندہ
مگر ہو تم مہربان و مشفق
تمہاری چھتنار ڈالیوں کی
خنک سُہانی سی چھاؤں میں
جانے کتنے درماندہ راہ رو
یوں ہی چند گھڑیوں کے واسطے
آ کے بیٹھ جاتے ہیں
پھر سے ہونے کو
تازہ دم
اور
چاق و چوبند،

آنند موہن اعجاز

کلکتہ
شاعر کی نظر سے

فلک سے آنکھ ملاتے ہوئے یہ قصرِ عظیم
سڑک پہ رقص کناں موٹروں کی آوازیں
کھلی کھلی سی یہ سڑکیں، یہ شام چہ رنگی،
جہاں ہے گرمِ سفر آدمی بہ تیز قدم
کہ جیسے ہگلی کی بہتی ہوئی جواں لہریں،
وہ چھپلے نور میں ڈوبے ہوئے یہ رنگ محل
ہو کے پیاسے جہاں تشنگیٔ دل کے لئے
پلائی سکتے "ایاغوں" میں گھول دیتے ہیں
جنوں نواز یہ سگریٹ کے دھوئیں کی لکیر
عجیب کیف فضا میں بکھیر دیتی ہے
حسیں لباس میں مدفون دق زدہ چہرے
غموں میں ڈوبی ہوئی ہے تمام ہی خلقت
جہاں سے جیسے سروکار ہی نہیں اسکو
نہیں ہے فکر کسی دوسرے کی اپنے سوا
خودی میں کھویا ہوا جیسے ایک عالم ہو
وہ جسکو نام دیا ہے جہاں نے شاعر کا
وہ جس کو چاہئیں رنگینیاں مناظر کی
وہ جس کو چاہیئے صحبت حسین پھولوں کی
وہ دیکھ سکتا نہیں ہے جمود انساں کا
یہ اونچے اونچے محل جو رفیقِ گردوں ہیں
سکونِ دل کسی شاعر کو دے نہیں سکتے

اظہار الاسلام

شاعروں کی شکست

میں، حاتم اور شاہجہاں ایک مثلث کی حیثیت رکھتے ہوئے بھی آپس میں گہری دشمنی کا شکار تھے۔ میں جان بوجھ کر دوستی کا لفظ استعمال کرنے سے گریز کر رہا ہوں کیونکہ ہم لوگ روز مل کر بھی مل نہ پاتے تھے۔ دوستی کی خلیج حائل رہا کرتی تھی۔ خود بھی ایسا گزر رہا تھا کہ آدمی خود سے بھی مل نہ پاتا تھا۔ پھر ہم کیسے مل پاتے۔ حاتم ایم۔ایس۔سی میں گولڈ میڈلسٹ تھا۔ یہ اُس کی خوش قسمتی تھی کہ اسے ایک پوسٹ آفس میں "ٹھپّا" لگانے کا کام مل گیا تھا۔ شاہجہاں ایک مفلوک الحال مصور جو زمانے کی ستم ظریفی سے صرف پینٹر بن کر رہ گیا تھا۔ شاہکار تصویروں کی خالق انگلیاں اب صرف سائن بورڈ رنگنے کے لئے اونے پونے میں بکنے لگیں۔

میں شاعر ہوں۔ مجھے کسی اُستاد کا شرفِ تلمذ حاصل کرنے کا فخر حاصل نہیں ہوا۔ میں نے ہمیشہ اپنے ذوقِ طبع پر بھروسہ کرنے ہی میں عافیت محسوس کی۔ یہی وجہ ہے کہ اساتذہ حضرات کی ٹیڑھی نظر سے واسطہ پڑتا رہا۔ اِن میں کچھ لوگ تو ایسے بھی ملے جو میری پیشانی پر اپنا لیبل لگانا چاہتے تھے۔ مشاعرے میں مجھے پوچھتا کون ___؟ ڈائس پر بیٹھنے کا میرے پاس کوئی پاسپورٹ بھی تو نہ تھا۔ شعرا حضرات ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ہر ٹکڑا مجھے مخالف ٹکڑے کا سمجھتا۔ اس لئے میں نے کسی ٹکڑے میں پناہ لینے کی کوشش ہی نہیں کی۔ مُدیران حضرات کا بھی کم و بیش یہی حال تھا۔ ہر مدیر کا اپنا ایک گروپ تھا۔ مجھے کوئی لفٹ دیتا بھی تو کیوں ___؟ اگر تخلیق پسند بھی آ جاتی تو اشاعت کی منزل سے گذرنے پاتی۔ اکثر لوگ میرے بارے میں تشکیک میں مبتلا تھے۔ میرا کس ازم سے تعلق ہے۔ لیفٹسٹ ہوں، یا رائٹسٹ، ترقی پسند ہوں یا رجعت پسند۔ جدید ترقی پسند ہوں یا شب خونی جدیدیا۔ میں متوسط طبقہ کا ایک بیروزگار فرد تھا۔ مجھے سرکاری عہدے کی اعلیٰ کرسی بھی تو نصیب نہ تھی، ورنہ ملک کے نامور نقّاد میری تعریف میں صفحے کے صفحے سیاہ کرتے۔ مجھے ایک ایڈیٹر نے مشورہ دیا: "میاں چھوٹے ہو، ابھی سیکھو۔ اسی میں تمہارا بھی بھلا ہے اور قوم کا بھی اور پھر کتابیں اس کے لئے ایکسٹرا کاغذ وغیرہ نہیں خریدنا ہوگا، تمہاری تخلیقات ہی کافی ہوں گی۔" دوسرے نے بغیر آنکھ دبا کر کہا کہ میں تمہارا کلام ضرور چھاپ دیتا اگر تم "شاعرہ" ہوتے۔

شام کے جھٹپٹوں میں اپنا سورج جب مغرب کی جانب ڈھلکنے لگتا تو ہم لوگ "تاڑی بگان" میں جمع ہو جاتے۔ سفید آسمانی رس بھی بیٹھے کام کی چیز ہوا کرتا۔ دن بھر کے تلخ تجربات کی گرد دھل کر رہ جاتی۔ کبھی کبھی بار میں جانے کی خواہش ہوتی لیکن وہاں کا ماحول ہماری جیب کے لئے بڑا بار تھا۔

چنانچہ اُس دن جب شام کی سانولی سلونی رنگت سیاہی میں تبدیل ہو رہی تھی، ہم لوگ "چکا چک" چڑھا رہے تھے۔ لیکن حاتم بڑا اداس تھا۔ اُس کی بیوی ہر سال عید کے موقع پر کانجی ورم کی ساڑی کی فرمائش کرتی مگر سات سوال حل کرنے والا حاتم آج ایک معمولی سوال کے سامنے گھٹنا ٹیکنے پر مجبور تھا۔

شاعر

دوسری طرف مست الست نے اپنے آخری لمحات میں شاہجہاں سے ایک ایسے آرٹ کے نمونے کی فرمائش کی جو ممتاز محل کی یاد کو لافانی بنا دے۔ مگر شاہجہاں کے پاس رنگوں کے پیسے نہیں تھے۔ اُس کی انگلیاں تخلیق کے کرب سے بے چین تھیں۔

اُدھر میری تخلیقات دھڑا دھڑ واپس چلی آ رہی تھیں۔ کوئی بھی ایسا اشاعتی ادارہ نہیں تھا جو میری تخلیقات کی ضخامت کا متحمل ہو سکے۔ لیکن ہم تینوں کی آنکھوں میں نہ جانے کیوں یقین کی پرچھائیاں لہرا رہی تھیں۔ جیسے کوئی آنے والا کل ہمارے خوابوں کے جسم میں حقیقت کی روح ڈال دے گا۔

ملک بھر میں صد سالہ برسی کی دھوم تھی۔ جگہ جگہ جلسے، سیمینار، مشاعرے، مذاکرے ہو رہے تھے۔ یہ ادبیات سے کہ اس کی آڑ میں سیاسی توے پر روٹیاں پک رہی تھیں۔ رسالے دھڑا دھڑ نمبر نکال کر پیسے بٹور رہے تھے۔ حکومت نے بھی خصوصی ڈاک ٹکٹ کا اجرا کر کے "بڑا کام" انجام دیا۔

میں پروانہ وار ایک جلسے میں پہنچا۔ ایک لیڈر آفاقی شاعر کی مظلوم زبان کے حق میں دھواں دھار تقریر فرما رہے تھے۔ حالانکہ اُن کے ہاتھوں سے اسی زبان کے خون کی بو آ رہی تھی۔ جناب صدر کی پشت پر شاعر کی بڑی سی تصویر آویزاں تھی۔

اپنی تعریف کے کلمات و اشعار سن کر میرے خون نے جوش مارا اور میں چیختا ہوا ڈائس کی طرف بھاگا کہ آپ جس کی یاد میں یہ دکھوں رہے ہیں اور قیمتی الفاظ پانی کی طرح بہا رہے ہیں وہ نامراد و ناکام شاعر یہاں آپ کے سامنے کھڑا ہے مگر آوازوں کی بھیڑ میں میری آواز گم ہو کر رہ گئی اور ایک والنٹیر نے میری گردن پکڑ کر مجھے ہال سے باہر نکال دیا۔

میں غصے میں بھرا شاہجہاں کے پاس پہنچا۔ وہ اپنے کباڑ خانے میں لہولہان تھا۔ میں کچھ کہنے ہی جا رہا تھا کہ وہ چیخ پڑا۔

"غالب! سنا تم نے حاتم صبح سے جیل میں ہے اور کوئی ضمانت دینے کو تیار نہیں۔"

مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا۔ پھر دھیرے دھیرے ساری بات سمجھ میں آ گئی۔ بس کا کنڈکٹر حاتم کی ساڑھی کے ایک سوال نے اُسے جیل کی ہوا کھلا دی۔ کیش بکس سے روپے لینے کے الزام میں نوکری بھی ہاتھ سے جاتی رہی۔

میں بُت بنا سب کچھ احساس کی آنکھوں سے دیکھتا رہا کہ ایک ہلکی سی چیخ پر چونک پڑا۔ دیکھا تو شاہجہاں درد سے کراہ رہا تھا۔ اس کے جسم کے کئی حصوں سے خون رِس رہا تھا۔

پھر جب اُس نے اپنے جسم سے چادر ہٹائی تو میں چیخ پڑا۔ اس کی دونوں رانیں کٹ کر جھول رہی تھیں۔ پھر اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

سامنے ہی ایک ایزل پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ میں نے اُسے سرکایا تو میرا ذہن سنسنا اٹھا۔ پتھر کے تاج محل کی جگہ ایک خون میں ڈوبا ہوا تاج مسکرا رہا تھا۔ جس سے آنکھ ملاتے ہوئے مجھے اپنے وجود سے گھن آ رہی تھی۔ میرے سارے بدن میں نفرت کی جوالا بھڑک اٹھی۔ ایک چنگھاڑتا ہوا سیلاب میرے سر سے گزر گیا اور میں اپنی ہی آگ میں جھلس کر رہ گیا۔ ▲

بقیہ افسانہ امانت صفحہ ۵۳

مر گیا تو یہ گھڑی تم کو واپس کرنا جانے۔ یہ گھڑی بھیج رہا ہوں، بچی! کو دے دینا۔ تم شاید سمجھ گئی ہو گی کہ کیا سمجھ ہو گیا ہے۔ ہاں وہ شگل کی صبح کو یہ دنیا چھوڑ چکا ہے۔

فقط تمہارا ماسٹر
کانت

یہ خبر میرے لئے پریشان کن نہیں ہے۔ میں اس کے لئے پہلے ہی سے تیار تھی لیکن وہ گھڑی ماسٹر کانت نے دی ہے۔ اُس میں ایک سوراخ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس گھڑی کو جیرت ہوئی اُس کے دل میں لگی۔ گولی کی جو فی الحال اُس میں آ گئی ہے کہ دو منٹ ہو رہے ہیں ایسا طرح تم دونوں کی ساتھ جینے اور ساتھ مرنے کا قسم بکرا لیکن پتا ہے کہ ساتھ مرنے اور ساتھ جینے کی قسم پوری ہو چکی ہے۔ خزاں کی صبح ہونے کے باوجود آسمان ابر آلود ہے۔ بھگوان اب تک کتنا سفر طے کر چکا ہے نہیں معلوم۔ ہو سکتا ہے وہ چل بھی رہا ہے یا نہیں۔ لیکن میں تم ہی سے پوچھ رہی ہوں کہ تم دونوں کو اگر دولہا بنا تو تم لوگوں نے کیوں نہ مجھے بھی ساتھ لے لیا۔ اب میں یہ امانتیں کس کو دوں؟

غزلیں

سلیم صدیقی

جس شخص کو سفر میں خیالِ سفر رہا
منزل کے پاس آکے بھی وہ دُور تر رہا

ہم نے روایتوں سے کنارا تو کر لیا
صدیوں ایک بوجھ مگر ذہن پر رہا

تم نے قدم قدم پہ مرا ساتھ تو دیا
لیکن تمہارا ساتھ بہت مختصر رہا

جو آنسوؤں سے تم رہے دامن نہیں تھے وہ
دامن تھا وہ جو خونِ تمنا سے تر رہا

کیا اضطرابِ ذہن پہ ہم کر سکیں گے ناز
دِل اور دماغ میں نہ توازن اگر رہا

ہاں ہم ہی تھے سلیم شکستوں کے زیرِ پا
ہاں فتح کا ہمارے ہی قدموں پہ سر رہا

یوسف جمال

وہ دیکھ کر سنہرا خواب اِس طرح لہک اُٹھا
خوشی سے جیسے بچہ ماں کی گود میں ہمک اُٹھا

نشیب کی اُڑان سے فراز کی اٹھان تک
فسانہ سخت منزلوں کا سُن کے دل بلک اُٹھا

بھبھوت تجربوں کی خواہشات کی عروس نے
مَلی ہے اِس قدر کہ زرد رنگ بھی دمک اُٹھا

ہوس کی سرد راکھ کی تہوں میں (بیج کی طرح)
حرارتوں کا شعلہ جو چھپا تھا پھر بھڑک اُٹھا

تمہاری ایک بھول سے سبھی کو ہو گئی خبر
تمہارے خط کو کھولتے ہی گھر مرا مہک اُٹھا

نہ جانے کون سی خطا کی پا رہا تھا دل سزا
ہر ایک لمحہ ایک عجیب خوف سے چمک اُٹھا

ڈاکٹر پرشوتم دوبے
مترجمہ: تحقیت اعظمی

فردوسی نامہ

ڈاکٹر پرشوتم دوبے ہوشنگ آباد ایم پی میں پیدا ہوئے۔ ہندی ادب میں ایم اے پی ایچ ڈی ہیں۔ ۱۹۶۲ء سے بمبئی میں سکونت اختیار کی۔ جے ہند کالج بمبئی اور بمبئی یونیورسٹی میں بحیثیت پروفیسر رہے۔ ۱۹۶۶ء سے ایس۔ ایس۔ ڈی پی۔ ایس آرٹس اینڈ کامرس کالج دھولیہ میں بحیثیت صدر شعبۂ ہندی اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

اب تک بیس افسانے، ۶۰ طنزیے اور کچھ نظمیں ہندی رسائل میں شائع ہو چکی ہیں۔ ارنسٹ ہیمنگوے کے "FARE-WELL . TO ARMS" کا ہندی ترجمہ "شاستر و داعی" کے نام سے کیا جو PEARL PUBLICATIONS INDIA BOOK HOUSE سے شائع ہوا۔ علاوہ ازیں تحقیقی مقالہ "व्यक्ति चेतना और स्वातंत्र्योत्तर हिन्दी उपन्यास" (ویکتی چیتنا اور سوتنتروتر ہندی اپنیاس) انڈیا پرکاشن بمبئی سے شائع ہوا۔ اسے مجھے آپ سے سہاجیوت ہے۔ طنزیہ مجموعہ "پتنگ ستان" کا زیر ترتیب طباعت سے گزر رہا ہے۔

اس سے پہلے آپ پڑھ چکے ہیں ۔۔

غزنی کے بادشاہ محمود غزنوی کے دربار میں فردوسی نام کا ایک شاعر تھا۔ اسکے شاندار تخیل، شہرت اور رطبیت سے متاثر ہوکر محمود غزنوی نے اسے اپنی زندگی پر ایک شاہنامہ لکھنے کا حکم دیا۔ بادشاہ نے فردوسی کو زبان دی کہ وہ اسے ہر شعر پر ایک سونے کا سکہ دے گا۔ برسوں کی سخت محنت کے بعد فردوسی نے شاہنامہ لکھ کر غزنوی کے دربار میں پیش کیا۔ شاہنامہ کے شعر سن کر بادشاہ اور درباری فردوسی کی قابلیت پر متعجب ہو کر جھوم گئے۔ لیکن محمود غزنوی نے اپنا وعدہ ایفا نہ کیا۔ فردوسی کو سونے کے بدلے چاندی کے سکے دیے گئے۔ فردوسی کا دل ٹوٹ گیا۔ اس اہانت کو برداشت نہ کر سکنے کی وجہ سے کچھ ہی دنوں میں اس کی موت ہو گئی۔ بادشاہ محمود غزنوی بھی کچھ سال بعد قبر میں سو گیا۔

اب آگے پڑھیے ۔۔

قیامت کا دن آنے میں ابھی صدیاں باقی تھیں۔ مگر فردوسی کی روح انتقام کے لیے بے حد مضطرب تھی۔ اس کے انتقام کی آگ نے محمود غزنوی کی روح کو چین نہ لینے دیا۔ آخر میں تنگ آکر اماوس کی سنسان رات میں محمود کی روح نے فردوسی کی قبر پر آواز دی: "فردوسی"

قبر نے کوئی جواب نہ دیا۔

محمود کی روح نے دوبارہ پکارا، "ہاں بھئی فردوسی میاں سو گئے کیا"

اس مرتبہ فردوسی کی قبر سے بڑی کمزور سی آواز سنائی دی "کون ہے"

جواب ملا۔ "ارے شاعر صاحب، میں ہوں ..... محمود۔"

"کون محمود؟"

"بھئی وہی غزنی کے مرحوم بادشاہ، محمود غزنوی کو بھول گئے کیا؟"

محمود غزنوی کا نام سنتے ہی فردوسی کی روح آگ بگولہ ہو گئی۔ سرخ سرخ چنگاریاں اڑاتے ہوئے اس نے محمود کی روح کو ڈانٹا "اب آپ یہاں کیا لینے آئے ہیں؟ کیا مجھے یہاں بھی چین سے سونے نہ دیں گے۔ ایک شاہنامہ لکھوا کر آپ نے میری جان لے لی۔ اب دوسرا شاہنامہ لکھوا کر کیا آپ میری روح کو بھی مار ڈالنا

چلے جاتے ہیں۔ اب تو آپ بھی مر چکے ہیں۔ آپ کی بادشاہت ختم ہو چکی ہے۔ ملک گیری کی ہوس کرنے پر بھی میں آپ کے لئے دوسرا "شاہ نامہ" نہیں لکھوں گا۔"

غزنوی کی روح اس انکار کے لئے تیار نہ تھی۔ گھبرا کر اس نے کہا: "شاعر اعظم فردوسی! اپنی بادشاہت اور دولت کے نشے میں چور ہو کر جیتے جی میں نے تمہارے ساتھ جو سلوک کیا اس پر مجھے سخت افسوس ہے۔ میں واقعی تمہارا قصور وار ہوں۔ تم سے دوسرا شاہ نامہ لکھوانے نہیں، معافی مانگنے آیا ہوں۔"

"اب معافی مانگنے سے کیا فائدہ؟" فردوسی کی روح نے ہنستے ہوئے کہا: "آپ کی بخیلی نے میری شاعری کو مٹی میں ملا دیا، آپ کی تنگدلی نے میری زندگی کے شاداب باغ کو اجاڑ کر رکھ دیا اور اب...... جبکہ میں اور آپ دونوں مر چکے ہیں۔ جب مجھ میں اور آپ میں کوئی فرق نہ رہا...... آپ مجھ سے معافی مانگنے کا ڈھونگ کر رہے ہیں۔"

"یہ ڈھونگ نہیں ہے فردوسی! مجھے اپنی ناانصافی پر واقعی بڑا افسوس ہے۔ میں اس کی تلافی کرنا چاہتا ہوں۔"

"لکیر پیٹنے سے سانپ نہیں مارا جاتا۔ بادشاہ حضور!...... گزرا ہوا وقت اور بیتی ہوئی زندگی پھر کبھی لوٹ کر نہیں آتے۔" فردوسی کی روح نے بے رخی سے جواب دیا۔

پل بھر کے لئے قبرگاہ میں سناٹا چھا گیا۔ اس کے بعد محمود کی روح بولی: "یہ سچ ہے کہ گزرا ہوا وقت لوٹ کر نہیں آتا۔ لیکن گزری ہوئی زندگی پھر سے واپس لائی جا سکتی ہے اور...... زندگی ہے تو تلافی بھی ہو سکتی ہے۔"

"لیکن دوسری زندگی ہمیں ملے گی کہاں؟ ہمیں تو قیامت تک یہیں سوتے رہنا ہے۔"

"اس کے لئے ہمیں ہندوستان جانا پڑے گا فردوسی، اس ملک سے ہمیں بڑا پیار ہے۔ ہم نے اس پر اٹھارہ بار چڑھائی کی تھی، اٹھارہ بار لوٹا تھا۔ ہم وہاں انیسویں بار جائیں گے۔ لیکن اس مرتبہ چڑھائی کرنے یا لوٹنے کے ارادے سے نہیں...... نئی زندگی پانے اور تلافی کرنے کی نیت سے، مجھے یقین ہے کہ اب تمہیں ہماری نیک نیتی پر کوئی شبہ نہیں ہوگا۔"

فردوسی کی روح چکر میں پڑ گئی: "پہیلیاں مت بجھائیے۔ صاف صاف بتلائیے کہ آپ کا مطلب کیا ہے۔ میں نہیں سمجھا۔"

"سنو!" محمود کی روح بولی: "ہندوستان حیات بعد الموت میں یقین کرتا ہے۔ اس لئے وہاں نئی زندگی پا سکتے ہیں۔ رہی تلافی اور خمیازے کی بات سو ہم اپنی گدیاں بدل لیں گے۔ تم بادشاہ کے روپ میں پیدا ہوگے اور میں شاعر بن کر۔"

"لیکن بادشاہت کے دن تو کبھی کے ختم ہو چکے ہیں اور شاعروں کو آج کل کوئی نہیں پوچھتا۔" فردوسی کی روح نے منطق لگائی۔

"تم بھولتے ہو فردوسی،" محمود کی روح نے سمجھایا۔ "بادشاہت اور شاعری کے دن کبھی ختم نہیں ہوتے، ہاں زمانے کے ساتھ ان کی شکلیں بدل جاتی ہیں۔ میری امارت اور بخیلی تمہارے پاس ہوگی اور تمہاری شاعرانہ جبلت میرے پاس۔ یہی میرا پرائشچت ہوگا۔"

فردوسی کی روح نے تجویز منظور کر لی۔ سویرا ہونے میں کچھ ہی گھنٹے باقی تھے۔ اس لئے دونوں اپنی اپنی قبر میں لیٹ گئے۔

-: تیسری قسط :-

اس سے پہلے آپ پڑھ چکے ہیں۔

اوپر پڑھ لیجئے یا تاریخ کی کتاب کا محلول تیار کر کے پی جائیے۔ نہیں پڑھنا چاہیں تو نہ پڑھیں۔ یہاں آپ کو کوئی سزا ملنے والی نہیں ہے۔ اب آگے پڑھئے۔

صدیوں آرام کرنے کے بعد، فردوسی اور غزنوی کی روحیں ہندوستان پہنچیں۔ فردوسی کی روح گنگا کے شمال میں موجود ایک بڑے شہر کے بڑے بازار کی بڑی حویلی کے مالک سیٹھ نند لال گپتا کے یہاں اوتار ہوئی۔ خاندانی منصوبہ بندی کے سخت مخالف ہونے کے باوجود بھی سیٹھ نند لال گپتا اپنی جوانی بڑھاپے کی اولادی چلاتے جا رہے تھے لیکن خدا کی قدرت کون جان سکتا ہے۔ سیٹھ جی کو جب تک امید تھی۔ اس وقت تک تو اولاد کا سایہ بھی پاس نہ پھٹکا۔ اور جب ان کا ڈھلتا ہوا بڑھاپا، بیراگی بن کر گنگا نہانے کا سوچنے لگا تو بیٹے کی پیدائش نے ان کے پیر گھر میں باندھ دیئے۔ قسمت کی یہ ادھار اور ... دولت — سیٹھ نے بیٹے کا جشن ولادت ایسی دھوم دھام سے منایا جیسے ہندوستان کا [illegible]

گنڈلی کا دن نے بتایا جیوتشی کی کہ سیٹھ جی کا پوت دولت ہاتھوں سے
دھن اور بیاس طرف سے عزت حاصل کرے گا۔ بیٹے کا نام رکھا گیا
گلزاری لال، جسے ماں باپ کے پیار نے گلّو بنا دیا۔

قدرت کی بنیادی روح نے گنگا کے جنوب میں موجود ایک چھوٹے
سے گاؤں کے رام بھجن نام کے غریب مزدور کے گھر میں جنم لیا۔ رام بھجن
کی غریبی اور ماں کا … دونوں میں دن دونی رات چوگنی بڑھ آرہی
تھی۔ بیوہ ماں کی دعویں ادا تھی۔ اس نے بیٹے کی ولادت پر خوشی کی
زیادتی کے سبب اس دن بھر کھانا بھی نہیں کھایا۔ بغیر کسی دھوم
دھام اور جیوتشیوں اور پنڈتوں سے پوچھ تاچھ کے لئے بغیر بچے کا نام
ہر بھجن رکھ دیا گیا۔ نہ لاڈ نہ پیار، نہ بھر پیٹ کھانا، نہ نیند اور اسے
ہریا کے نام سے پکارا جانے لگا۔ گھر کے دوسرے بچوں کی طرح وہ بھی
دھول میں لوٹ لوٹ کر بڑا ہو گیا۔ جگہ جگہ سے ٹوٹی جھونپڑی میں سردی
گرمی، برسات گزارتے گزارتے ہر بھجن ایسے بڑھنے لگا جیسے بنجر میں
گھاس۔

لکشمی کی لاثانی اولاد ہونے کی وجہ سے گلزاری لال گپتا یعنی
گلّو کو کسی بات کی کمی نہ تھی۔ وہ جیسے جیسے بڑا ہوتا گیا اسی طرح اس کا جسم
موٹا ہوتا گیا۔ اور جیسے جیسے موٹاپا اس کے جسم کا حصار کرتا گیا۔ ویسے
ویسے عقل بھی اس کے تناسب سے موٹی ہوتی گئی۔ لیکن گلّو کے پتا کو اپنے
بیٹے کی عقل کے بارے میں کوئی فکر نہ تھی۔ ان کا سالہاسال کا تجربہ یہ
ثابت کر چکا تھا کہ آج کے دور میں عقل بھی مختلف چیزوں کی طرح پیسوں
سے خریدی جا سکتی ہے۔ اس لئے انہوں نے بے فکر ہو کر اسے کانونٹ
میں بھرتی کرا دیا۔ لاڈلا گلزاری لال بڑا ما بدولت بچہ تھا۔ وہ نہ کتابوں سے
جھگڑا الجھا رہتا تھا اور نہ اسکول کی سیڑھیوں اور دروازوں سے۔ اس کا
نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ ایک سال مدرسوں اور ہم جماعتوں سے دوستی قائم کرنے
میں لگاتا۔ دوسرے سال کا مراسلہ استادوں کی انہی سے متعارف ہونے
کے لئے کرتا اور جب اسے پیسے کی طاقت اور مدرسوں کی فراخدلی، ہم
جماعتوں کے تعاون اور کتابوں کے بیکار ہونے پر یقین ہو جاتا تو وہ تیسرے
سال امتحان میں بسم اللہ وغیرہ جیسے فائدہ مند ذرائع کا سہارا لے کر اگلی
جماعت کا لائین کلیر پالیتا۔ اس نے اپنی طالب علمانہ زندگی میں کسی بھی
امتحانی پرچے کی سیڑھی کبھی پوری نہ کی لیکن زیر و برگی وہ کبھی آؤٹ
نہیں ہوا۔ اس طرح میٹرک تک پہنچتے ہی گلّو کو کسی خاص مشکل کا سامنا
نہیں کرنا پڑا۔ گر میٹرک پڑھتے پڑھاتے خاندان، استادوں، ممتحنوں
کا اتنا زبردست اکھاڑا سا کہ گلزاری لال کی پہلوانی عقل کتنی باد بھی
کھا کر زمین سے نکلتے سر نکلتے حیران ہو گئی۔ آخر میں ایک محسن استاد
نے اس کے پتا کو ایک نسخہ بتایا۔ سیٹھ نند لال گپتا نے انعامی جنگی
کشتی کا اشتہار دیا۔ اس میں ہزاروں روپیوں کا پہلا انعام رکھا گیا اور
گلزاری لال کے نام پر ایک مشہور پہلوان کو میٹرک کے اکھاڑے
میں اتار دیا۔ پہلوان غریب ہوتے ہوئے بھی ایماندار تھا۔ اس نے
انعام جیت کر گلزاری لال کو دے دیا۔ اور دوسری کشتی لڑنے نکل پڑا۔
اس طرح گلّو کو میٹرک کا خطاب مل گیا۔

میٹرک کی سیڑھی پر سے اچھال مارتے ہی گلّو کو اس کے پتا
نے دھندے بیوپار کے گر سمجھاتے ہوئے کہا۔ "بیٹا سنسار کا مول
منتر ہے سکہ۔ سکھ کی جڑ ہے پیسہ اور پیسہ کمانے کا اچھا راستہ
ہے بیوپار۔ "بیوپار سے بستے لکشمی" (بیوپار میں لکشمی بسیرا کرتی ہے)
اتنا ہی پرانا اصول ہے جتنی پرانی لکشمی جی ہیں۔ بیوپار کا اصول ہے
کہ کم سے کم دو اور زیادہ سے زیادہ لو۔ ویسے قول میں تو سب کچھ برا
ہی دکھائی دیتا ہے لیکن اصل میں اصلی اور نقلی کا کچھ ایسا میل جول
ہوتا ہے کہ اسے بڑے سے بڑے چشمہ دھاری کی … سے تیز آنکھ
بھی پکڑ نہیں پاتی۔ آج کے بیوپار کی سیاست ہے سب کی مساوی
خدمت کرنا۔ کیونکہ سیوا ہی میں میوا ہے۔ پیارے بیٹے! زیادہ
پڑھنے میں عقل ناکارہ ہو جاتی ہے کیونکہ جس دماغ میں کتابی کیڑا
گھس جاتا ہے۔ وہ بالکل بےکار ہو جاتا ہے۔ سنسار کا اصول ہے کہ
محنت سکو … لیکن تعلیم کے لئے
سے میٹرک کا مطلب صرف امتحان پاس کرنا ہوتا ہے۔ لیکن تاجر کے
بچے کہاتے ہیں اس کا جمع خرچ کسی اور طرح سے ہوتا ہے میٹرک یعنی
"میں + ٹرک"۔ مطلب یہ کہ جب کسی کو یقین ہو جائے کہ "میں ٹرک
کرنا سیکھ گیا ہوں" تو اسے میٹرک کہا جانے لگا۔ تو میٹرک ہو گیا ہے۔
اب بات بیوپار میں طبیعت لگا۔

گلّو اپنے پتا کے حکم کو امر سمجھ کر … سر تسلیم خم
کرتے ہوئے بیوپار میں لگ گیا۔ اپنے لاڈلے بیٹے کی تاجرانہ عقل کی کامیابی

پر سیٹھ گزاری لال کا خوش قسمتی ہوتے ہوئے کہ ایک دن انگریز خوش ہو کر انہیں
جیتے جی سیدھے سورگ پہنچ گئے۔ گزاری لال اپنے والد کی بے تحاشا
دولت کا وارث بن کر موج اڑانے لگا۔

ہر بھجن اور ہریا کے حالات گزاری لال سے بالکل متضاد تھے۔ اس
کے پتا رام بھجن کی آمدنی سے جب کنبے کا پیٹ ہی نہ بھرا جا سکتا تھا تو
ہر بھجن کی تعلیم کا انتظام بغیر ٹکٹ سفر کرنے کی مانند مشکل تھا۔ پھر بھی
ایک دن ہر بھجن نے اسکول کے زینوں پر پیر رکھ ہی دیا۔ سرسوتی کے
بھنڈار میں اُن دنوں عقل کا اسٹاک بہت بڑا تھا۔ اس لئے ہر بھجن کو
پہلے زینے ہی پر ضرورت سے زیادہ عقل مل گئی۔ نتیجۃً اس کے
دماغ میں کتابوں کے صفحات ہمالیہ پر جمی برف کی مانند جمنے لگے۔ کئی
بار ہر سال کو دانگتے لگاتے وہ اپنی عمر سے آگے نکل گیا۔ اس کے
گرام پنچایت کے گرو جی نے اس کی عقل کو کانٹے پر تول کر پیشن گوئی کی کہ باپ
کی کمائی نہ ہوتے ہوئے بھی لڑکا کسی نہ کسی دن ترشنی سنگم پر بنے پُل کی
طرح اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے گا۔ گرو جی کی بات جھوٹ کیسے ہو سکتی تھی؟
سرکاری وظیفہ پر پڑھتے پڑھتے ایک دن ہر بھجن نے میٹرک میں ممتاز آکر
راجیہ بھر کے طلباء کو "ہری بھجن" کرنے پر مجبور کر دیا۔ اپنی اولاد
کی ہوشیاری دیکھ کر رام بھجن نے کئی دن تک یادوں کا بھوگ چڑھا پڑا
اللہ بھرتے ہوئے بولا "ہریا! تو اب بہت بڑا ہو گیا ہے۔ تو نے باپ
دادوں کا نام اُچھال دیا۔ اب کہیں نوکری چاکری کر لے۔ تو مجھے
تھوڑا آرام ملے۔" لیکن ہر بھجن نے جب اسے یہ بتلایا کہ اسے آگے پڑھنے
کے لئے بھی سرکاری وظیفہ ملے گا تو اس نے اسے حکم نامہ دینے کے ساتھ
کئی اور حکم نامے بھی تھما دیئے۔

ہریا نے کاشی کی راہ پکڑی اور بابا وشوناتھ کے دوارے پہ بیٹھ
بن اپنا نام لکھوایا۔ ریس کے گھوڑے کی طرح وظیفہ اور ٹیوشن جیسے
چابک کے سہارے امتحان کی گھوڑ دوڑ میں وہ ہمیشہ پہلا آ نکلا۔ اور فرسٹ
ایم اے پاس کر کے ہر بھجن کے بدلے شری ایچ بی سنگھ ایم اے کے
نام سے مشہور ہو گیا۔

لیکن سرسوتی نے جس طرح منتری اور لکشمی کو دھکا دیا۔ اسی طرح
ہر بھجن کو بھی جھیل لیا۔ ہر امتحان میں اول آنے پر بھی ہر بھجن کا آمدنی مزدور
کا تھا۔ اس لئے کوئی بیٹا یا ملکیت اس کا اوڑھنا بچھونا بننے کو تیار نہیں تھا۔

نوکری ابھی کسے لئے "پیں لاگے" اپنی قدر کا ڈھنڈورا پیٹنے لئے
گھوڑے کے پیر کے مانند لمبی اور کستے انگریز کی طرح پیچ سے باہر نکل
گئی۔ وہ جہاں جاتا وہیں اُس سے کوئی یہ نہ پوچھتا کہ کتنا پڑھے ہو؟
کہاں تک پڑھے ہو؟ جو پوچھتا وہ یہی پوچھتا کہ تم کس کے آدمی ہو؟
فلاں کو جانتے ہو؟ تمہارے پتا ماہر زراعت ہیں یا نہیں؟ تم
گائے کا دودھ پیتے ہو یا بھینس کا؟ جنت کسان اور سرکاری کسان میں
کیا فرق ہے؟ ایم پی کا اصل مطلب ممبر پارلیمنٹ ہے یا اور کچھ۔؟
ہر بھجن شرمندہ ہوکر اور بغلیں جھانکتا۔ اور سادی چائے کی پیالی پی کر گھر
لوٹ جاتا۔

نوکری سے آنکھ مچولی کھیلتے کھیلتے ایک دن ہر بھجن سیٹھ
گزاری لال جیسے سے ٹکرا گیا۔ گزاری لال نے اپنے مرے باپ کی یاد
میں کالج کھول دیا تھا۔ وہی اس کے سب کچھ تھے۔ ہر بھجن کو نوکری
چاہیئے تھی اور گزاری لال کو نوکر۔ سو انہوں نے بیوپاری تختی دیتے
ہوئے ہر بھجن کو اس شرط پر نوکر رکھ لیا کہ اسے جو کچھ تنخواہ ملے گی
اس میں سے آدھی لے۔ "سنت لال گپتا کوشش" میں دینی پڑے گی۔ شرط
منظور کرتے ہی ہر بھجن کا تقرر ہو گیا۔

ایک دن ہر بھجن کے پتا کو نہ جانے کیا سوجھا کہ اس نے اپنے
آپ کی موت کا اعلان کر دیا۔ پتا کے حلقے کے ممبروں کی پیٹ پوجا
کا سارا بوجھ ہر بھجن پر آ پڑا۔ گرہستی کی گاڑی ڈھکیلتے ڈھکیلتے شری
ایچ بی سنگھ ایم اے کا فرسٹ کلاس ایسے گم ہو گیا۔ جیسے گیہوں
میں دھتورے کے بیج۔

تھوڑے تعلیمی پرانے اخبار کی طرح گھر کے کونے میں دبا کر
رکھ دیئے گئے۔ نوکری کے دوران وقت بے وقت سیٹھ گزاری
لال کی حاضری بجاتے بجاتے ہر بھجن اُن کے کافی نزدیک آ گیا۔ ایک
دن سیٹھ جی نے اُسے بڑے پیار سے اپنے پاس بٹھاتے ہوئے پوچھا۔
"بھائی ہر بھجن! تم تو فرسٹ کلاس آتے رہے ہو۔ پڑھائی لکھائی
میں تم نے سارے راجیہ میں نام کمایا ہے۔ سنا ہے تمہیں کچھ لکھنے
لکھانے کا بھی شوق ہے۔"

اپنی تعریف سن کر ہر بھجن پھول کر ہیرا شٹ بن گیا۔ شرمیلی
ہیروئن جیسے نخرے کرتے ہوئے وہ بڑی ملائمت سے بولا: "جی!"

جیز میں صاحب، میں گھس بلاتی ہوں۔ آپ کی چاکری کر کے کسی طرح ایک درجن آدمیوں کا پیٹ بھر رہا ہوں۔ رہی ادب کی خدمت کی بات سو روزی روٹی کی فکر میں وہ دال میں نمک کے برابر ہی ہو پاتی ہے۔

سیٹھ گلزاری لال تاڑ گئے کہ حزن کی تشخیص صحیح ہوئی۔ بلاؤ کا ٹکڑا منہ میں رکھ کر چباتے ہوئے انہوں نے کہا پروفیسر صاحب علم کا طلب علمیت اور قابلیت کا مطلب دولت اور شہرت۔ صدیوں پہلے ہمارے آباء واجداد نے "ودیاپلش سے ارتھ کرنے" (علم کی ثروت سے دولت کا حصول) کر کر اس پر اپنی مہر ثبت کر دی۔ آپ کو اپنی عقل اور شخصیت کا استعمال کرنا چاہیئے۔

ہربنس بونگ جیٹ دیکھنے والے کسی آدمی کی طرح سیٹھ کا منہ دیکھنے لگا۔ گلزاری لال کاروباری کرتب کا پانسہ پھینکتے ہوئے بولے "ہربنس تمہارے پاس شہرت ہے اور میرے پاس دولت۔ اگر تم چاہو تو ہم انہیں ایک دوسرے سے بدل سکتے ہیں۔ تم مجھے ایم اے کرا دو اور میں تمہیں نزہی ہاؤ کے منصوبے میں مدد دے سکتا ہوں۔ بولو منظور ہے؟"

ہربنس کو گلزاری لال کی بات ماننے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ تعلیم کی گاڑی اپالو کی رفتار سے دوڑنے لگی۔ ہربنس کا علم گلزاری لال کے کھاتے میں جمع ہونے لگا۔ لوگوں میں سرگوشی ہونے لگی کہ گلزاری لال کا امتحانی نمبر کسی دور دراز امتحانی مرکز سے بھرا جاتا ہے اور امتحانات کے دنوں میں ہربنس ایک ماہ کی چھٹی پر چلے جاتے ہیں۔ پھر بھی فی الوقت وہ ایم اے بن گئے۔

دولت اور ڈگریوں سے پُر استعمال نے سیٹھ گلزاری لال کو ایک ساتھ ادب و سیاست دونوں کے اسٹیج پر لا کھڑا کیا۔ ادبی ووٹ کھینچتے کھینچتے کچھ ہی دنوں میں وہ "دو رُخا سیجانی" اور ہربنس کو یقین کا نشہ پلاتے پلاتے انہوں نے ادب کے مشہور شعراء میں اپنا نام لکھا لیا۔

ایک دن کچھ شعر سے باز ادیبوں نے سیٹھ گلزاری لال کی وائی پلیٹ میں باتوں کا سر کر گنڈ چلتے ہوئے احساس دلایا تھا کہ آپ جیسے لکشمی اور سرسوتی کے لاڈلے بیٹے دلیش میں خوب بلاٹ لے کر ڈھونڈنے پر بھی نہیں ملیں گے۔ افسوس اسی بات کا ہے کہ آپ کی

میدان کا ایک بڑا میدان ہے اسے دوسرا قدم اٹھانا۔

سیٹھ گلزاری لال کی طلبی مسکراہٹ نے سوال کیا۔ "وہ کیسے"؟

جواب میں ایک سہمی مردہ مانندش اور قابل جیز ادیب نے کہا۔ "لکشمی تو آپ کے یہاں ٹیکس ڈیپارٹمنٹ دولت بنا کر بیٹھ گئی ہے۔ لیکن سرسوتی نے ابھی اپنا سبز گز کا کہ تا بھی پیش کروا۔ زمانہ ہے انکا وہ مساوات کا ابن لئے لکشمی اور سرسوتی میں یک جہتی پیدا کرنے کے لئے آپ کو پی ایچ ڈی ضرور کر لینا چاہیے۔ جیسے ہندی میں آج کل دو چھند بھی مخصوص ہیں۔ نئے ادب کا رجحان اور پی ایچ ڈی کا رجحان۔ آپ کے لئے دونوں سہل ہیں۔ کیونکہ ان دونوں کا انتہائی حصول دولت آپ کے پاس کافی ہے۔

بونم ٹھیکتی گنشرم تک کے بوڈیں لینے ہی خواہوں کو الوداع کہہ کر سیٹھ گلزاری لال نے اپنے ڈرائیور کے ہاتھ ہربنس کو بلیس اور ایس بھجوایا۔ ہربنس کے حاضر ہوتے ہی انہوں نے پوچھا، ماسٹر ہم پی ایچ ڈی کرنا چاہتے ہیں۔ تم ہمیں کوئی آسان راستہ بتاؤ۔ ہربنس نے ہندوستان کے نقشے کی طرح پی۔ ایچ۔ ڈی کا عکس خاکہ کھینچ کر رکھ دیا۔ سیٹھ گلزاری لال نے اس بار اسے سو تیشن کا ٹکڑا باہر کر دے دیا۔ ہربنس ہاتھی کی سونڈ کی مانند گردن لٹکائے لوٹ آیا۔

سیٹھ گلزاری لال کی کوٹھی کے لوٹ کتابیں بن کر بند تجوریاں کے بجائے الماریوں کی رونق بڑھانے لگے۔ کالج کی لائبریری میں بھی نت نئے گزٹوں کا ذخیرہ ہونے لگا۔ ہربنس بیٹی قسمن بیوی مند لگائے ڈھیلے پینٹ پر بیلٹ کسے۔ گلزاری لال کے مرتضیٰ مرتب حصار میں بلا ضرورت مشق عمل کرنے لگا۔ محنت مشقت اور غیر مستقیم فاقہ سے تعاون پا کر ہربنس فریج میں رکھے ہوئے پانی کی مانند بے تصویر بن گیا۔ کچھ ہی دنوں گزرتے گزرتے وہ بیگران شکر کا باماق نظر آنے لگا۔ اسی طرح دل چاہی کی ضروری شرطیں پوری کر کے اس نے بستر پر ہی اپنا مستقل مسکن بنا لیا۔

ہربنس کی بیماری سرکاری ہسپتال کا مناسب استقبال کر رہی تھی کہ ایک دن اس نے بہت میں سیٹھ گلزاری لال کے پی ایچ ڈی پا جانے کی خبر سنی۔ ایسے محسوس ہوا گویا وہ پی ایچ ڈی سیٹھ کو نہیں خود اسی کو ملی ہے۔ جسم کی بچی کچھی طاقت کو کسی طرح پیروں میں جمع کر کے

وہ نوجوان کو کتنی شرمندگی اٹھانی پڑی تھی۔ مبارک سنگھ بابا کے درمیان الفاظ کے بعد مرزا ہرنگی نے سیٹھ گلزاری لال سے استفسار کیا کہ "پرنسپل صاحب! بہت مصیبت میں ہوں۔ آپ نے مجھے تشفی دی تھی۔"

آنکھوں میں چمک، چہرے پر دمک اور آواز میں نفرت گھولکر گلزاری لال نے جواب دیا: "تشفی کی اب روح کی دنیا میں کوئی قیمت نہیں ہے ہرنگی! وہ تو صرف سیاست ہے ہر بات کا صرف فائدہ ہوتی ہے۔ تشفی کی بات تھی، اب ختم ہوگئی۔ تمہیں یاد ہے شادی کے عشق نے ایک بلا دی دی لیکن مسلوک عشق نے ایک گرام بھی نہ دی۔ ارے تم لمبی بیماری میں مبتلا ہونے کے بعد بھی کالج سے نکالے نہیں گئے۔ یہی کیا کم تشفی ہے۔"

ہرنگی کا سر نیٹ لائٹ کی طرح گھوم گیا۔ گھر لوٹ کر وہ بستر پر اپنی ساری ڈگریاں بچھا کر سو گیا۔ دو دن بعد کالج کی طرف سے اُسے ایک خط ملا۔ لکھا تھا:

"پروفیسر صاحب کے خلاف کچھ طالبات کی شکایتوں کی جانچ کرنے کے بعد کالج کی مجلسِ منتظمہ اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ اُن کے غیر اخلاقی برتاؤ سے کالج کی عزت خطرے میں پڑ گئی ہے۔ اُن کی مسلسل بیماری کے سبب کالج کی پڑھائی کا بھی نقصان ہو رہا ہے۔ اس لئے مجلسِ منتظمہ اُنہیں اپنے عہدے سے فوراً سبکدوش کرتی ہے۔"

خط پڑھ کر مرزا ہرنگی نے ایک بار جو آنکھیں بند کیں تو پھر اُنہیں دوبارہ کھولنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ سیٹھ گلزاری لال نے فراخ دلی کا ثبوت دیا، اُن کی بقایا تنخواہ کفن دفن کے لئے اسی وقت بھجوا دی۔

اختتامِ قسط

ابھی تک آپ پڑھ چکے ہیں۔

پہلی تین قسطیں حاصل کرنے کے لئے قارئین مرکزی دفتر سے ربط قائم کریں۔ دلچسپ بدلی کی خبر تمام ان سے معلوم کر لیں۔

اب آگے پڑھئے۔

موت کے بعد ہرنگی کی روح پھر محمود غزنوی کی روح میں تبدیل ہو کر اپنی قبر میں لوٹ گئی۔ ابھی وہ آرام ہی کر رہی تھی کہ فردوسی کی قبر سے آواز آئی۔

"بادشاہ محمود غزنوی کی روح لوٹ آئی کیا؟"

"کون فردوسی؟ محمود کی روح بول رہی ہے!"

"اے عالم پناہ! جواب ملا۔

"لیکن تم پہلے کیسے؟ ہمیں تو سیٹھ گلزاری لال کے روپ میں تم نے ہی چھڑا لیا تھا!"

"جہاں پناہ! شاہنامہ کے بدلے میں نے تمہاری خسیس فطرت اپنی غلطی کا ازالہ کر لیا۔ اب تو تمہیں کوئی ملال نہیں ہونا چاہئے؟"

"ملال نہیں حضور! افسوس ہے سخت افسوس، کیونکہ میں سیٹھ گلزاری لال بن ہی نہیں پایا!"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو فردوسی؟" محمود کی روح اُلجھن میں پڑ گئی۔

"آپ یقین مانئے حضور! میں سیٹھ نند لال کی بیوی کی زچگی کے وقت گلزاری لال کے روپ میں جنم لینے ہی والا تھا لیکن دائی کی لاپرواہی کے سبب میں اس کے ہاتھ سے پھسل کر زمین پر گر پڑا۔ بچے کی جان ہی کتنی ہوتی ہے شہنشاہ! گرتے ہی میری روح فنا ہوگئی۔ میں خود اپنی قبر میں لوٹ آیا۔ اُدھر دائی نے گھبرا کر ایک غریب عورت کے بچے کو میرے مردہ جسم سے بدل کر دیا۔ وہی بچہ پھر سیٹھ نند لال گپتا کا بیٹا کہلایا اور گلزاری لال بن کر آپ سے ہر حرکت کروا رہا۔"

"پھر پتہ چلا ہے کہ گلزاری لال کے جسم میں کسی سیاسی لیڈر کی روح ہے۔ وہ کچھ سال اور زندہ رہ کر بہت سے ہر مجنوں کی تجارت کرتی رہے گی۔" فردوسی کی روح نے ہنستے ہوئے کہا۔

اور محمود غزنوی کی روح یہ سوچ کر اُداس ہو گئی کہ اخیر میں بیسویں صدی کے ہندوستان کے ایک معمولی نیتا کی روح نے اُسے ہمیشہ کے لئے ہرا دیا۔

(ہندی سے)

بلونت بھول

نیا گیت

مایا آنی جانی رے بھیا، مایا آنی جانی رے بھیا
قدم قدم پر مے خانے
قدم قدم بازار
نشہ زوری اور سینہ زوری
ٹوٹ کے سب آثار
کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں پر بکھری ایک کہانی رے بھیا
مایا آنی جانی رے بھیا
قدم قدم پر کالے دھندے
اندھیارے کا راج
قدم قدم پر آنکھیں خیرہ
دولت سر کا تاج
فٹ پاتھوں پر گزرے جیون بچپن اور جوانی رے بھیا
مایا آنی جانی رے بھیا
قدم قدم پر ساری شوبھا
چہرے سب بے نور
دُبلے پتلے ہڈی ڈھانچے
برسوں کے رنجور
قدم قدم پر نرک دکھائے اپنی ایک نشانی رے بھیا
مایا آنی جانی رے بھیا
قدم قدم پر گندے بچے
بیٹھے ہیں جگ کے تانے
قدم قدم پر سلگے جیسے
چلتے پھرتے لاشے
قدم قدم پر سب کی صورت لگتی جانی پہچانی رے بھیا
مایا آنی جانی رے بھیا، مایا آنی جانی رے بھیا

ثمر ایسنپوری

گیت

دھرتی چیخ رہی ہے کیوں؟ نیلے امبر سے پوچھو
بہری ہو گئی پریم کی بستی
نگر پیار کا گونگا
ہری بھری دھرتی کے مکھ پر
خون کا گہرا دھبہ
سوچ کے تن میں چبھتے زہریلے نشتر سے پوچھو
دھرتی چیخ رہی ہے کیوں نیلے امبر سے پوچھو
چاروں طرف دکھوں کے جنگل
چنتاؤں کی کھائی
اُس کے ماتھے کی ریکھا
نکلی کتنی ہرجائی
سکھ کی راہ میں پڑے ہوئے دکھ کے پتھر سے پوچھو
دھرتی چیخ رہی ہے کیوں؟ نیلے امبر سے پوچھو
جیون کی ارتھی کے پیچھے
ٹوٹے پھوٹے چہرے
چین اور آرام کے تن پر
گھاؤ ہیں کتنے گہرے
چھپ گئیں آشاؤں کی کرنیں کس کے ڈر سے پوچھو
دھرتی چیخ رہی ہے کیوں؟ نیلے امبر سے پوچھو

مقالہ

رحمٰن حمیدی

جدید عربی شاعری کا امام ـــــ بارودی

محمود سامی البارودی نے جب ہوش سنبھالا تو فرانسیسیوں کے جبر و استبداد کی شدّت سے سرزمینِ مصر چیخ رہی تھی۔ اہالیانِ مصر کے دلوں میں پنولین کے ظالمانہ رویّہ کے خلاف نفرت کے شدید جذبات موجزن تھے اور باشندگانِ مصر خوابِ راحت سے چونک کر بیدار ہو چکے تھے۔ پنولین نے اپنے تین سالہ قیام کے دوران مصریوں پر جو کاری ضرب لگائی تھی اُس کی دلخراش اور جگر سوز چوٹ سے پورا مصر سسک رہا تھا اور وطنِ عزیز کی تعمیر کا نیا جذبہ مصریوں کے ذہن میں کروٹیں لے رہا تھا اور انہی انقلاب انگیز حالات کے درمیان ۱۸۰۵ء میں محمد علی کے برسرِ اقتدار آتے ہی مصر کے طرزِ معاشرت، تہذیب و تمدّن اور سماجی رسم و رواج میں ایک زبردست تبدیلی رُونما ہوئی۔ جدید اندازِ فکر پر مشتمل تعلیم و تربیت اور شعر و ادب کا ماحول پیدا ہوا۔ ایک نئی تحریک وجود میں آئی اور عربی شاعری "الشعر دیوان العرب" سے نکل کر منطق و فلسفہ اور زندگی کے پیچیدہ مسائل سے ہم آہنگ ہونے لگی۔ عربی شاعری کا دامن اس نوع کی شاعری سے خالی تھا۔ انہیں تغیر پذیر حالات میں محمود سامی البارودی نے ضلع البحیرۃ کے ایک گاؤں ایتائی البارود میں ۱۸۳۸ء میں آنکھ کھولی۔ سات سال کی عمر میں اپنے والدِ محترم کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو گئے۔ ابتدائی تعلیم کی تکمیل کے بعد ملٹری کالج میں داخل ہوئے ۱۸۵۴ء میں تعلیم سے فارغ ہو کر محکمۂ افواج کی ملازمت کے لئے حکومت کے ایوان پر دستک دی۔ لیکن پیہم سعی و کاوش کے باوجود محکمۂ افواج کی ملازمت نہ مل سکی اور شکستہ خاطر ہو کر عربی ادب کے مطالعہ کی جانب مائل ہوئے۔ انہوں نے المثل السائر، الأغانی، تاریخ ابن خلدون و مقدمہ، العقد الفرید، فقہ اللغۃ، وفیات الأعیان، احیاء العلوم، تفسیر الرازی، شرح القسطلانی، حیات الحیوان، نفح الطیب، قانون ابن سینا اور تذکرۂ داؤد کے علاوہ عربی ادب کے مایۂ ناز شعراء کے دواوین کا مطالعہ کیا۔ ترکی اور فارسی ادب سے بھی بہرہ مند ہوئے اور انگریزی زبان بھی سیکھی۔ شوقِ مطالعہ نے ان کی تخلیقی قوتوں کو بیدار کر دیا اور پھر شعر گوئی کی طرف مائل ہو گئے۔ تخلیقی قوت کی جولانی، ذہن کی جودت، فطری جھکاؤ اور شاعرانہ مزاج کے باعث انہیں عربی ادب کے قواعد و اسالیب، اشعار کی بندش و ترکیب اور شعریت پر بہت جلد عبور حاصل ہو گیا۔ حافظہ اتنا تیز تھا کہ مشہور و معروف شعراء کا کلام انہوں نے زبانی یاد کر لیا اور اسی فطری رجحان کی وساطت سے اپنے محبوب ترین اشعار کا ایک مجموعہ مرتب کیا جس سے ان کی باریک بینی، ادبی ذوق کی بلندی، فکر و خیال کی ندرت، مزاج کی رعنائی اور نظریات کی جدّت کا بیّن ثبوت ہے۔

یہ بڑا عجیب اور قابلِ غور امر ہے کہ صدیوں کی مردہ عربی شاعری میں نئی رُوح پھونکنے والے عظیم شاعر کی تعلیم و تربیت سپاہیانہ ماحول میں ہوئی۔ لیکن جنگ و جدال اور طریقۂ پیکار کا پروردہ ذہن کسی وقت شعر و شاعری سے منحرف نہیں ہوا۔ شاعرانہ مزاج ہر قدم پر زندہ رہا۔ بارودی نے عربی زبان کی انقلابی شاعری کا مطالعہ کیا۔ فوجی تعلیم و تربیت نے اس جذبے اور جوش کو اور بھی پختہ کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ بارودی نے ہمیشہ جبر و ظلم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ بارودی کی سیاسی شاعری میں اُن کی بے باک شخصیت کا پرتو پورے طور پر نمایاں ہے۔ بارودی کے سیاسی اشعار میں جبر و استبداد کے خلاف زبردست احتجاج ہے۔ موجودہ نظامِ حکومت پر انہوں نے نہایت

بے باکی اور جرأت سے نغمہ چھیڑتی ہے اور اپنی کاوشوں سے عوام میں آزادی، سیاسی بیداری اور جمہوریت کی ایک نئی تحریک پیدا کر دی۔ باروری کی سیاسی اور جمہوری بیداری کو کچلنے کے لئے توفیق پاشا نے باروری کو جلاوطن کر دیا تھا۔ اس انقلاب پسند شاعر کو سترہ برس جلاوطنی کی زندگی لنکا میں گزارنی پڑی۔ جلاوطنی کے دوران بے پناہ مصائب و آلام سے گزرنا پڑا۔ بیوی اور ایک لڑکی نے غربت و افلاس سے دم توڑ دیا اور باروری کی آنکھوں سے لہو ٹپک پڑا۔ لیکن ان کے پائے استقلال میں ذرہ برابر بھی فرق نہ آیا۔ ان صبر آزما حالات میں بھی انہوں نے تمیں مایۂ ناز شعرا کا کلام "مختارات البارودی" کے عنوان سے ترتیب دیا۔ ان کا انگریزی ادب سے استفادہ جاری رہا۔ ان کے کلام اور افکار میں کوئی تبدیلی نمودار نہیں ہوئی۔ صرف زمانے کی پیہم تلخی اور مسلسل رنج و الم سے دوچار ہونے کی وجہ سے باروری کے انقلابی عناصر اور جذبات کی حدت میں تھوڑے سے وقفے کے لئے کمی واقع ہوگئی تھی اور اسی کے سبب ۱۹۰۰ء میں انہیں مصر میں داخل ہونے کی اجازت ملی۔ باروری نے ایک جلیل القدر اور شریف النفس بہادر انسان کی طرح ظالمانہ رویے کی مخالفت کی۔ باروری کو عدل و انصاف کی مساوات اور جمہوری عناصر سے گہری محبت تھی۔ جبر و ظلم کے حرکات اور حق و انصاف کی راہ میں حائل ہونے والی رکاوٹوں کو وہ موت پر ترجیح دیتے ہیں۔

ومع الذل في الدنيا لمن خاف حتفه ‏ ‏ ‏ فلموت خير من حياة على الذل

ترجمہ: موت سے خائف انسان کے لئے دنیا کی ذلت ہے۔ ذلت و خواری کی زندگی سے موت بہتر ہے۔

باروری کو اپنے سیاسی افکار، آبائی عزت و جاہ اور انقلاب آفریں اشعار کی بدولت جگر خراش اذیت و صعوبت سے دوچار ہونا پڑا۔ تاہم ان کے سیاسی نظریات و خیالات میں کسی نوعیت کی کمی واقع نہیں ہوئی، بلکہ انہوں نے اپنی سیاسی شاعری سے عربی ادب کو ایک نئی جہت دکھائی اور اپنی مسلسل کاوشوں سے ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ عربی ادب میں متنبی نے بھی حکام اور ارباب اقتدار پر تنقید کی تھی اور اقتدار کے حصول کی خواہش کا بھی اظہار کیا تھا لیکن متنبی کے اشعار میں اشارے، تلمیحات اور کنایات اس قدر ہیں کہ شعر کا مقصد فوت ہو جاتا ہے اور صرف لفظی بازیگری رہ جاتی ہے۔ متنبی نے زمانے پر لعنت و ملامت ضرور کی ہے لیکن اس کے اشعار میں وہ رنگ و آہنگ نہیں جو باروری کے کلام میں ہے۔ باروری نے طلب اقتدار کے ساتھ ساتھ قوم کی آزادی، عدل و انصاف، مساوات، انسانی حقوق اور جمہوری طرز حکومت پر بہت زور دیا۔ یہ مسلمہ امر ہے کہ کسی بھی شاعر یا فنکار کو بین الاقوامی شہرت اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب وہ سماج کی خامیوں اور رسم و رواج کی تخریبی بندشوں کے خلاف مستقل مزاجی اور ایمانداری سے صدائے احتجاج بلند کرے۔ سماج اور معاشرے کی خرابیوں کی نشاندہی کرے اور اس کے کلام کا بنیادی مقصد انسانیت کی خدمت اور معاشرے کی اصلاح ہو۔ باروری کے کلام میں یہ خصوصیت پورے طور پر نمایاں ہے۔ انہوں نے مظلوموں کی آہ و فریاد، جبر و ستم، اختلاف و نفاق، خود غرضی اور ہوس پرستی پر اظہار تاسف کیا ہے ان خامیوں اور برائیوں کو دور کرنے کے لئے بہترین شاعرانہ اسلوب و انداز اختیار کیا ہے۔ معاشرے کی اس کیفیت پر اظہار افسوس کرتے ہوئے ایک قصیدہ میں باروری نے کہا ہے ؎

بئس العشير وبئست مصر من بلد ‏ ‏ ‏ أضحت مناخا لأهل الزور والخطل

أرض تأثل فيها الظلم وانقذفت ‏ ‏ ‏ صواعق الغدر بين السهل والجبل

ترجمہ: مصر کے لوگ اور یہ شہر بُرا ہے۔ جھوٹے اور فریب کار لوگوں کا اڈہ ہے۔ ظلم اس سرزمین پر جڑ پکڑ چکا ہے اور ہر جگہ بے وفائی کی بجلیاں کوند رہی ہیں۔

باروری کے کلام کے تنقیدی مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فطری شاعر تھے۔ ان کی عظمت اور کامیابی میں جہاں زندگی کے طویل و تلخ تجربات اور گہرے مطالعے کو دخل ہے۔ وہیں باروری کی شاعرانہ فطرت اور خاندان کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ فن شاعری سے صرف باروری ہی کا تعلق نہیں ہے بلکہ باروری کے خاندان کے بھی عربی ادب پر احسانات ہیں۔ باروری کے ماموں ابراہیم عربی ادب کے

مشہور شاعر تھے۔ بارودی نے خود بھی اس کا اعتراف کرتے ہوئے کہا ہے ؎

انا في الشعر عريق	لم ارثه عن كلالة
كان ابراهيم خالي	فيه مشهور المقالة

ترجمہ: شاعری ہمارے خاندان کا قدیم سرمایہ ہے۔ میں اپنے خاندان کا تنہا شاعر نہیں ہوں۔ میرے ماموں ابراہیم بھی اس میدان میں عظیم شہرت کے مالک تھے۔

بارودی کی شاعری ہر قسم کے تکلف و تصنع اور آورد سے پاک و صاف ہے۔ فطری شاعری کی یہ خصوصیت دنیا کی دیگر بڑی بڑی زبانوں کے بڑے شعراء میں پائی جاتی ہے، بارودی میں بھی پائی جاتی ہے۔ مصر کے شہرۂ آفاق نقاد اور عظیم المرتبت ادیب علامہ عباس العقاد[1] نے بارودی کی شاعری پر بحث کرتے ہوئے تحریر کیا ہے: "عربی شاعری کو مقامی اور بے جا تکلف سے نکال کر فطری اور مناسب رنگ دینے میں بارودی کی کوششیں سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ اُن کی شاعری جذبات کی صحیح ترجمانی اور فنّی لحاظ سے بے داغ ہے[1]"۔ اسی حقیقت پر اظہار خیال کرتے ہوئے بارودی نے بھی اپنی تخلیقی قوت اور شعری آمد کا تذکرہ کیا ہے ؎

اقول بطبع لست احتاج بعده	الى المنهل المطروق والمنهج الوعر
اذا جاش طبعي فاض بالدر منطقي	ولا عجب فالدر ينشأ في البحر

ترجمہ: میں آمد پر شعر کہتا ہوں۔ نہ تو کسی کی تقلید کی حاجت ہوتی ہے اور نہ بے تکلف شعر گوئی کی خواہش ہوتی ہے جب طبیعت میں جوش پیدا ہوتا ہے تو زبان سے اشعار کے موتی جھڑنے لگتے ہیں۔ یہ تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ موتی دریا ہی میں پیدا ہوتا ہے۔

جدید عربی شاعری کی کا بلا شک مقبولیت بارودی کی فطری صلاحیت، حیرت انگیز حافظے، شاعرانہ مزاج، طبیعت کی جولانی اور تخلیقی قوتوں ہی کا کارنامہ ہے۔ بارودی کو اس بات کا بھی احساس تھا کہ کلام صرف فطری صلاحیت اور تخلیقی قوت ہی سے حسین و جاذب نظر، شعریت سے معمور اور خامیوں سے پاک و صاف نہیں ہوتا ہے، بلکہ تنقیدی نکھار اور آرائش بھی اشعار کے لئے بے حد ضروری ہے۔ چنانچہ اس مقصد کے تحت بارودی اپنے کلام پر نظر ثانی ضرور کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عربی ادب کے ناقدین کے درمیان بارودی کے سلسلے میں اختلاف رونما ہو گیا ہے۔ شیخ موصفی نے "الوسیلۃ الادبیۃ" میں جو اشعار نقل کئے ہیں وہ اپنی اصلی شکل و ہیئت میں ہیں مگر بارودی نے ان اشعار کو ضروری ترمیم و تنقیح کے بعد اپنے دیوان میں شامل کیا ہے۔ مثال کے طور پر "الوسیلۃ" کا صرف ایک شعر ملاحظہ کیجئے:

اقاموا زمانا ثم بدد شملهم	اخو نكبات بالكرام اسمه الدهر

اور یہی شعر دیوان میں یوں درج ہے:

اقاموا زمانا ثم بدد شملهم	ملول من الأيام شيمته الغدر

بارودی کو ترمیم و اصلاح کی عادت تھی۔ وہ اپنے اشعار پر بار بار نظر ثانی کرتے تھے اور حتی الامکان شاعرانہ خامیوں اور عیوب سے احتراز کی کوشش کرتے تھے، اسی لئے ان کا کلام شاعرانہ عیوب و نقائص سے پاک ہے۔ یہ تنقید کی کسوٹی پر بے داغ آئینے کی طرح صاف و شفاف نظر آتا ہے۔ یہی ان کے فن کا سب سے بڑا کمال اور اُن کے کلام کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

---

[1] شعراء مصر و بيئاتهم في الجيل الماضي: عباس محمود العقاد

بارودی کی شاعری میں عشق و محبت کے جذبات بھی پائے جاتے ہیں لیکن جس نوعیت کا جذبہ عہد جاہلیت یا ما بعد کے شعراء کے کلام میں پایا جاتا ہے اس قسم کا جذبہ بارودی کے کلام میں نہیں ملتا۔ بارودی نے جدید انداز فکر کی روشنی میں ان عشق و محبت کو پیش کیا ہے۔ عشقیہ اور غزلیہ شاعری میں اپنے فن کے کمال کا نہایت دلکشی سے مظاہرہ کیا ہے۔ وہ عشق و محبت، زلف و رخسار، حسن و جمال، ہجر و وصال اور دیدار محبوب کے ساتھ بنت حریم کے سیمیں پیکر پر بھی گوہر افشانی کرتے ہیں۔

اذا نظرت او اقبلت او تهللت ... فنول مهارة الرمل والغصن والبدر

ترجمہ: نیل گائے کی طرح دیکھتی ہے۔ شاخ کی طرح بل کھاتی ہوئی چلتی ہے اور ماہ کامل کی طرح مسکراتی ہے۔

صنف نازک سے متعلق ایک اور شعر ملاحظہ کیجئے:

كالورد خد او البنفسج طرة ... والغصن قد او الغزالة ملفتا

ترجمہ: رخسار گلاب کے مانند، پیشانی بنفشہ جیسی، قد ٹہنی کی طرح اور نگاہ ہرنیوں کی طرح ہے۔

یاد محبوب کی لذت دیکھئے:

طربت وعادتني المخيلة والسكر ... واصبحت لا يلوي بشيمتي الزجر

كأني مخمور سرت بلسانه ... معتقة مما يجئ بها التجر

ترجمہ: حالت سرور میں ماضی کی یاد اور مدہوشی لوٹ آئی ہے اور پھر مجھے تنبیہ و ملامت کی پروا نہیں ہوتی۔ میں ایسے مدہوش کے مانند ہوں جسے پرانی اور قیمتی شراب پلادی گئی ہو۔

غم عشق بھی دیکھئے:

حامل الهوى تعب ... يستخفه الطرب

ان بكى يحق له ... ليس ما به لعب

ترجمہ: عاشق دردمند ہے، طرب اس کے غم کا بوجھ ہلکا کرتی ہے۔ اگر روئے تو حق بجانب ہے، اس کا مرض کھیل نہیں ہے۔

علاوہ ازیں بارودی کی شاعری کو عربی کی قدیم شاعری سے جو خوبیاں ممتاز کرتی ہیں ان میں منظر نگاری کو بھی خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ یہ بارودی کے کلام کا گرانقدر سرمایہ ہے۔ منظر نگاری اور وصف نگاری میں عربی کے سبھی شعراء سے بارودی کا مقام بہت بلند ہے اور اس نوعیت کا بارودی کا کلام عربی ادب کا قابل فخر سرمایہ ہے۔ شب کی سیاہی، بجلی کی چمک اور گرج، ہوا کے تند و تیز جھونکے، باد صبا کی اٹکھیلیاں، ریگ زار کی چاندنی، بارش کی مترنم آواز اور فلک کے آسمانی رنگ، صبح و شام کے کیف پرور ماحول پر بڑی فنکاری سے منظر کشی کی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

وليلة ذات تهتان واندية ... كأنما البرق فيها صارم سلط

لف الغمام اقاصيها ببردته ... وانهل في حجرتيها وابل سبط

ترجمہ: تاریک بھیگی رات میں بجلی تلوار کی طرح کوندتی ہے۔ بادل نے اپنی چادر میں اسے پوری طرح لپیٹ لیا ہے اور اس کے دونوں کناروں پر تیز اور موسلا دھار بارش ہوئی ہے۔

بہار کے موسم میں مصر کے دیہی علاقوں کی تصویر کشی کرتے ہوئے کہتے ہیں:

عم الحيا واستنت الجداول ... وفاضت الغدران والمناهل

وزينت نورها الخمائل ... وغردت في ايكها البلابل

وشمل البقاع خير شامل ... فصفحة الارض نبات نائل

ترجمہ: بارش کا زمانہ آیا، نالیاں بہنے لگیں، تالاب اور چشمے ابل پڑے۔ درخت کلیوں سے آراستہ ہوگئے اور ان کی شاخ

بے تکلفی کی۔ ہرطرف خیر دبرکت کے نشانات نمایاں ہیں۔ مردے تر تازہ ہیں ہریالی ہی ہریالی ہے۔

مختصر یہ کہ دورِ جدید کی عربی شاعری میں نئی روح پھونکنے والوں میں سب سے زیادہ کامیاب شاعر کی حیثیت محمود البارودی کی ہے جس کی انتھک کوششوں اور پیہم جدوجہد سے عربی شاعری کو ایک نیا موڑ ملا۔ تشبیہ، تلمیحات، صنائع و بدائع، تکلف و تصنع، فرسودہ اور قدیم ترین روش، بے جان اور مردہ تراکیب و اسالیب اور صدیوں پرانے طرزِ فکر میں ایک نئی حرارت اور ایک نئی زندگی پیدا کی۔ ایسا محسوس ہونے لگا جیسے شعر کے اندر انسانیت کو شعور عطا کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہو۔ بارودی کی نگاہ میں شاعری کا مقصد یہی ہے: تهذيب النفوس و تدريب الافهام و تنبيه الخواطر الى مكارم الاخلاق یعنی حیاتِ انسانی کو مہذب بنانا، فہم و ذہن کو مشّاق بنانا اور اعلیٰ اخلاقی قدروں کی جانب دلوں کو مائل کرنا۔

بارودی نے شعر و سخن کے علاوہ میدانِ کارزار میں بھی زور آزمائی کی۔ گو کہ اُن کی ملازمت وزارتِ خارجہ میں تھی۔ تاہم وہ جنگ میں شریک ہوئے۔ اسماعیل پاشا کے خلاف بغاوت رونما ہوئی تو مصری فوج نے باغیوں کو سرنگوں کیا اُس میں بارودی بھی شامل تھے۔ ۱۸۷۷ء میں ترکی کے خلاف روس نے اعلانِ جنگ کیا تو خلیفہ کی مدد کے لئے جو فوج تیار ہوئی اس میں البارودی بھی شریک تھے۔ لیکن بارودی نے شمشیر و سناں سے وہ کارنامہ انجام نہیں دیا جو کارنامہ اُنہوں نے قرطاس و قلم سے انجام دیا اور اُن کی شہرت و عظمت کا باعث شمشیر و سناں سے زیادہ شعر و کلام ہے اور اسی کی بدولت انہیں حیاتِ جاودانی حاصل ہوئی۔ افسوس کہ بارودی کی ہمہ گیر شخصیت کا جائزہ اس مختصر مقالے میں پیش کرنا ممکن نہیں —— جدید عربی شاعری کے اس امام اور شعر و ادب کے اس عظیم پیرو نے دسمبر ۱۹۰۴ء میں دارِ فانی سے کوچ کیا۔ اپنی تقریباً پچاس سالہ ادبی زندگی کے دوران ایک نئے اسکول، ایک نئے مکتبۂ فکر، ایک نئے زاویۂ نگاہ اور ایک نئے اندازِ فکر کی تاسیس رکھ کر ہمیشہ کے لئے روپوش ہو گیا۔ بارودی کی زندگی ہی میں مطران، شکری، مازنی، ابو شادی اور عقاد نے بارودی کی تقلید کی اور اُس کے بعد ابھرنے والے شعرا شوقی، حافظ، رافعی، صبری، عبدالمطلب، جارم، کاظمی، رصافی، احمد محرم، کاشف، نسیم، زین وغیرہم نے بارودی کے کلام سے براہِ راست استفادہ کیا۔ ▲

غزلیں

شاہد میر

زندگی ہے اگر خطا کی طرح
کاٹ لیں گے اسے سزا کی طرح

آرزو کے جھلس گئے گلشن،
تم نہ برسے کبھی گھٹا کی طرح

حال بربادیوں کا سنتے ہیں،
لوگ تقریرِ دیرپا کی طرح،

وہ بھی پتھر کا جسم رکھتے ہیں،
ہم نے سمجھا جنھیں خدا کی طرح،

یک بیک آج مل گیا وہ مجھے
ایک تحریرِ گمشدہ کی طرح

چند پھولوں کی آرزو لیکر
ہم بھٹکتے رہے صبا کی طرح

برق کڈپوی

طلوعِ مہر کا غم چھوڑیئے سحر کے لئے
اگا یئے کوئی مہتاب رات بھر کے لئے

جو چل پڑو کسی منزل کی آرزو لیکر
کھلے ہوئے ہیں کئی راستے سفر کے لئے

فضائیں دعوتِ پرواز دے رہی ہیں مجھے
طیور سارے پریشاں ہیں بال و پر کے لئے

جلا دیا ہے لہو جس کے واسطے ہم نے
وہ روشنی بھی کہاں ہے ہمارے گھر کے لئے

یہ جاہ و منصب و دولت کی جستجو کیا ہے
یہ اہتمام ہے کیوں عمرِ مختصر کے لئے

فضول قصۂ فن برق چھیڑتے کیوں ہو
ہے سازگار کہاں یہ صدی ہنر کے لئے

مختصر کہانی

مسعود شمس

اُڑان

..... یہ کیسی دنیا ہے ــــــ ؟ یہاں نہ آہیں ہیں، نہ درد ہے، نہ گھٹن ہے اور نہ کراہوں میں ڈوبی ہوئی صدائیں ہیں ــــــ بس خوشی ہے۔ چین ہے اور نشاط و عیش کے خوبصورت لمحے ہیں ..... اوہ ..... یہی تو وہ سپنے ہیں جو نوکیلے خاروں کی طرح ہر شب میری آنکھوں میں چبھتے رہتے تھے اور ہر رات میری آنکھوں کے لہو میری قبر کی شفاف زمین کو داغدار کرتے رہتے تھے۔ تو کیا ..... تو کیا آج وہ سپنوں کے حقیقت کے خوش رنگ پھولوں کے روپ میں میری نظروں کے سامنے رقصاں ہیں ؟ کیا مجھے میری منزل مل گئی ؟ یا کہیں یہ بھی خواب ہی تو نہیں ؟ لیکن ..... اگر یہ خواب ہے تو پھر میرے تصور کی وہ حقیقی اور واضح تصویر مجھے کیوں نظر آ رہی ہے ... وہ ..... وہی تو ہے میرا چھوٹا سا خوبصورت فلیٹ اور ..... وہ فلیٹ کی پہلی منزل کی کارنس پہ کھڑی میری حسین شریک زندگی، اپنی دلفریب مسکراہٹیں بکھیرے میری راہ دیکھ رہی ہے۔ میں جلد سے جلد دوڑ کر اس کے قریب پہنچ جانا چاہتا ہوں۔ اس کی آغوش میں سکون کی سانس لینا چاہتا ہوں۔ اس کی زلفوں کے سائے میں سو جانا چاہتا ہوں - !!

..... بہت تھک گیا ہوں میں۔ نہ جانے کب سے زندگی ایک ہی محور پر گردش کر رہی ہے۔ شب و روز کسی محنت کش مزدور کی طرح اسٹافوں اور فائلوں کے ساتھ ورزش کرنا۔ کون سے ٹنڈر کھلنے چاہئیں۔ کون سے منافع بخش ہیں ــــ کس ٹنڈر سے کتنا فائدہ ہوا۔ کس سے کتنا نقصان ہوا ؟ ــــ زندگی ایک خودکار مشین بن کر رہ گئی ہے ... نہ اپنی مرضی سے سو سکو اور نہ اپنی مرضی سے جاگ سکو !! شاید اس سے بہتر تو وہی زندگی ہوگی جہاں لوگ سوکھی روٹی سے پیٹ بھرنے کے بعد سکون سے اپنی مرضی کی نیند سو جاتے ہیں۔ جہاں نہ کوئی قید اور نہ کوئی بندش ہوتی ہے !!

عجیب دنیا ہے میری ــــ ایک پل کے لئے یکسانیت کا خوفناک پنجہ مجھے دبوچ لیتا ہے ... پھر اس سے پہلے کہ میں اڑ کر دور کہیں خاموش سی رنگین فضاؤں میں معلق ہو جاؤں۔ میرے وجود کے گرد بکھری ہوئی تاریکیاں مجھے اُجالوں کے گہرے سمندر میں اچھال دیتی ہیں اور تب ــــ سمندر کی شانت لہروں پر مجھے اپنی خوبصورت اور سلیقہ شعار بیوی کی تصویر نظر آتی ہے جس کے سرخ چہرے پر صرف خوشی ہے، سکون اور چین کی جھلکیاں ہیں۔ غم و اندوہ کا اس کے چہرے پر دُور دُور تک نام و نشان نہیں ..... (شاید یہی سپنے تھے اس کے جو آج حقیقت کے خوبصورت روپ میں اس کے سامنے ہیں) ..... اُجالوں کے سمندر کی خاموش لہروں پر جھلملاتی ہوئی ایک دلکش تصویر دیکھ کر میرے وجود کے گرد بکھری ہوئی تاریکیاں پگھلنے لگتی ہیں اور پھر میرا نصف ذہن سوچتا ہے۔ کیا سوکھی روٹیوں سے اس چہرے کی دلکشی برقرار رہ سکتی تھی ؟ سکون بخش بستر کی جگہ شکستہ کھاٹ کی کھردری اور تکلیف دہ گہرائی اسے اطمینان کا ایک پل بھی دے سکتی تھی ــــ ؟ کیا خالی پیٹ اُسے میرے پیار کی میٹھی اور دلچسپ باتیں بھلی لگتیں ــــ ؟ "ہرگز نہیں" بس تو پھر یہی میری چاہت ہے۔ یہی میری منزل ہے جہاں میرے سوا سب مطمئن اور خوش ہیں۔ مجھے ..... مجھے اب اس کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہیئے ... کچھ نہیں چاہیئے - !!

...... اچانک دُور بہت دور سے آتی ہوئی ایک آواز میری سماعت سے ٹکراتی ہے — بیٹا! اٹھو بھی — کیا تمام دن سوتے ہی رہوگے؟! یہی وہ مانوس سی آواز ہے جو میرے ارمانوں اور سپنوں کے شیش محل پر پتھر برسا سکتی ہے۔ بیٹا اٹھو نا۔ کیا انجینیر صاحب کے یہاں سے ٹیوشن کے پیسے نہیں لاؤ گے۔ کیسی نیند ہے تمہاری ..... لگتا ہے دن میں بھی سپنے ہی دیکھتے رہتے ہو !!!

..... میری آنکھیں جاگ جاتی ہیں — !!

ٹوٹے ہوئے چھپر کے سوراخوں سے چھن کر آتی ہوئی سورج کی کرنیں میرے چہرے پر پڑ رہی ہیں اور میں اپنی پرانی سی بوسیدہ چارپائی پر بیٹھا ہوا ہوں — میری نظروں کے سامنے میری پیاری بہن کا زرد، فاقہ زدہ، جوان چہرہ لہرا رہا ہے۔

بقیہ

ڈراما "لمحے کا فاصلہ" صفحہ ۸۳

ڈاکٹر۔ رہا ہونے کے بعد تمہارا کیا پروگرام ہے۔

فواد۔ میں ایک چھوٹا سا اسکول کھول لوں گا اور مفت تعلیم دوں گا۔

ڈاکٹر۔ ریحانہ کہاں ہے۔

فواد۔ سنا ہے اُس کی شادی ہو گئی ہے اور وہ دو بچوں کی ماں ہے۔

ڈاکٹر۔ کبھی تمہیں یاد آتی ہے۔

فواد۔ ڈاکٹر محبت دراصل ناپختہ شعور کی دین ہے۔ جب آدمی باشعور ہو جاتا ہے تو یہ سب کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ زندگی کی حقیقتیں بڑی تلخ ہوتی ہیں۔ عشق کا باب شعر و شاعری کی حد تک اچھا لگتا ہے۔

ڈاکٹر۔ یہ بات تو ہے۔

فواد۔ میں چلوں ڈاکٹر؟

ڈاکٹر۔ انجکشن تو لیتے جاؤ۔ (وہ کرسی سے اٹھتا ہے)

(پردہ)

کیا آپ ایک تنخواہ دار ملازم ہیں؟

کیا آپ نے

اپنی آمدنی کا گوشوارہ پیش کر دیا ہے؟

قانون کے تحت ہر اس شخص کے لئے (بشمول ایسے اشخاص جنھیں صرف تنخواہ ہی ملتی ہے) جس کی گذشتہ سال کی کل آمدنی، 1961ء کے انکم ٹیکس ایکٹ کے تحت ملنے والی مختلف قسم کی چھوٹ کو منہا کرکے 5000 روپئے سے زیادہ تھی، اپنی آمدنی کا گوشوارہ پیش کرنا لازمی ہے۔

اگر آپ اپنی آمدنی کا صحیح گوشوارہ پیش کریں گے۔ تو آپ کے انکم ٹیکس افسر کو درج ذیل اُمور کو یقینی بنانے میں مدد ملے گی۔

(۱) قانون کے تحت آپ جس چھوٹ کے مستحق ہیں، وہ آپ کو ملے۔

(ب) اگر ٹیکس کی کوئی زائد رقم ادا کی گئی ہے تو وہ آپ کو جلد از جلد واپس کر دی جائے۔

انکم ٹیکس کا گوشوارہ بھرنے کے لئے متعلقہ فارم یا مزید معلومات کے لئے براہ مہربانی تشخیص کرنے والے اپنے انکم ٹیکس افسر یا محکمہ انکم ٹیکس کے پبلک ریلیشنز افسر سے رابطہ پیدا کریں۔

براہ مہربانی اپنے گوشوارے پر اپنے مستقل کھاتہ نمبر کا حوالہ دینا نہ بھولیں۔

اگر آپ کو ابھی تک مستقل کھاتہ نمبر الاٹ نہیں ہوا تو آپ براہ مہربانی اپنے انکم ٹیکس افسر یا انکم ٹیکس کمشنر سے رجوع کریں۔ وہ آپ کو مستقل کھاتہ نمبر الاٹ کر دیں گے۔

جاری کردہ:- ڈائریکٹوریٹ آف انسپکشن
(ریسرچ، اسٹیٹسٹکس اینڈ پبلی کیشن) نئی دہلی

davp. 73/242

جمیل شیدائی

لمحے کا فاصلہ

افراد

۱۔ ڈاکٹر
۲۔ فواد۔ ایک قیدی
۳۔ ریحانہ
۴۔ شوکت اور دوسرے افراد

مقام۔ جیل اور دیہات
وقت۔ ۱۹۴۰ء

پہلا سین

(جیل کا اندرونی حصہ۔ ایک تنگ ہال ہے جس میں میز اور کرسیاں ہیں۔ کرسی پر ڈاکٹر بیٹھا ہوا ہے۔ اس ہال کے دونوں طرف قیدیوں کے کمرے ہیں۔ دن کے بارہ بجنے والے ہیں۔ قیدی اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہیں۔ ہال میں وہی قیدی نظر آتے ہیں جو بیمار ہیں۔ کچھ دیر بعد فواد ہال میں داخل ہوتا ہے۔ اس کے جسم پر قیدیوں کی وردی ہے۔ وہ صورت سے بیمار لگتا ہے۔ ڈاکٹر فواد کو دیکھ کر مسکراتا ہے۔)

ڈاکٹر۔ ہلو فواد

فواد۔ ہلو ڈاکٹر

ڈاکٹر۔ میں بس تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔

فواد۔ مجھے افسوس ہے ڈاکٹر کہ دیر ہو گئی۔ رات بخار کافی تیز رہا۔ اعضا شکنی سے دیر گئے تک سو نہ سکا۔ پچھلے پہر کہیں آنکھ لگی۔

ڈاکٹر۔ آج ایک اور انجکشن لے لو

فواد۔ پتہ نہیں آپ مجھے کب تک اچھا کریں گے

ڈاکٹر۔ یہ سمجھو کہ تم آج ہی سے صحت مند ہو جاؤ گے۔ تمہیں یاد ہوگا آج تم اپنے بارے میں مجھے بتلانے جا رہے ہو۔

فواد۔ ڈاکٹر میری زندگی کی کہانی کچھ اتنی غیر دلچسپ ہے کہ آپ اکتا جائیں گے۔

ڈاکٹر۔ ہو سکتا ہے ایسا نہ ہو۔ بیٹھو تو۔ (وہ بیٹھ جاتا ہے)

فواد۔ (اخبار کو الٹتے ہوئے) یہ تو آپ جانتے ہیں کہ میں یہاں قتل کی سزا پوری کر رہا ہوں۔

ڈاکٹر۔ کیا تم نے واقعی قتل کیا تھا؟

فواد۔ جی ہاں۔

ڈاکٹر۔ کس کا؟

فواد۔ ایک ایسے شخص کا جس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ جو میرا ہمدرد تھا۔

ڈاکٹر۔ لیکن کیوں؟

فواد۔ خاص بات تو یہ ڈاکٹر کہ قتل کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی۔

ڈاکٹر۔ پھر یہ سب کچھ ہوا کیسے؟

فواد۔ آپ کو تو علم ہے ڈاکٹر دماغ میں عجیب و غریب خیالات آتے ہیں اور وقت ان میں ہیجان برپا کرتا رہتا ہے۔ سچ پوچھئے تو وقت کی پیدا کی ہوئی ہلچل بعض اوقات انسان کو دیوانہ بنا دیتی ہے اور پھر وہ کر گزرتا ہے جس کو دنیا دیکھ کر یا سن کر مجبوراً نفرت کرنے

سکتی ہے۔ کوئی کسی قاتل کسی چور اُچکے کے ماتھے پر
نہیں چھپا سکتا۔ اُن واقعات کی کڑیاں نہیں ملاتا جن
سے متاثر ہو کر وہ ارتکاب جرم کرتا ہے۔

مرشد۔ تمہاری بات سے مجھے انکار نہیں۔ تم انسان کے مقام
سے واقف ہو۔ اُس میں کم سے کم اتنی اہلیت تو ہونی
چاہیئے کہ وہ دوسروں کے حقوق کو پامال نہ کرے۔

اَد۔ آپ جو بات کہہ رہے ہیں وہ بحث طلب ہے۔ میں
آپ سے صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ حالات عجیب
وغریب تماشے کرتے رہتے ہیں۔ اُن کی تہ میں بے قصور
بھی آجاتے ہیں۔ مثال کے طور پر احمد کو لیجیئے جس کو
میں نے قتل کیا ہے۔ (وہ رُک جاتا ہے اور خلا میں
گھورتا ہے۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں)
ڈاکٹر۔ میں اپنی سزا سے مطمئن نہیں ہوں۔ (وہ آنکھیں
پونچھ لیتا ہے)۔ میں جذباتی ہوگیا تھا ڈاکٹر۔ آپ
واقف نہیں میں دیہاتی ہوں۔ دیہات میں میرا
ایک چھوٹا سا مکان تھا اور گزر بسر وقت سے ہو جاتی
تھی۔ میں تنگدستی سے لڑتا ہوا گریجویٹ ہو گیا تھا۔
ان مرحلوں میں مقروض ہونا ضروری تھا۔ اُن دنوں
مجھے ٹیچر کی ملازمت مل گئی۔ تنخواہ معمولی سی تھی میں ٹیوشن
کرنے لگا۔ میری بدقسمتی کہیئے کہ میں تحصیلدار صاحب
کی لڑکی کو پڑھانے لگا۔ کچھ عرصے بعد مجھے یوں لگا
جیسے ہم ایک دوسرے کو چاہنے لگے ہوں۔

دوسرا سین

(چھ سال قبل — دیہات کا ایک مکان ہے۔ صدر
دروازے کے دونوں جانب فراخ کمرے ہیں جن کا
فرش لال مٹی سے لیپا ہوا ہے۔ داہنی جانب والے کمرے
میں فواد اور ریحانہ بیٹھے ہوئے ہیں۔ فواد ۲۳، ۲۴
سال کا ہے۔ مضبوط اعضا کے اس نوجوان کے چہرے
سے دیہاتی زندگی کی کشمکش عیاں ہوتی ہے۔

ریحانہ قبول صورت لڑکی ہے)

فواد۔ تو تم آج بھی دعوت میں نہیں گئیں؟
ریحانہ۔ نہیں اور کل بھی نہیں جاؤں گی۔
فواد۔ کیوں؟
ریحانہ۔ بس یونہی۔
فواد۔ واہ! یہ بھی خوب جواب رہا۔ دعوت میں شریک نہ
ہونے کی کوئی خاص وجہ تو ہوگی؟
ریحانہ۔ تم جان بوجھ کر اس قسم کے سوالات کرتے ہو تو مجھے
بھی اس طرح کے جوابات دینے نہیں بنتا۔
فواد۔ ٹھیک ہے کتابیں لے آؤ
ریحانہ۔ آج پڑھنے کا موڈ نہیں۔
فواد۔ کیوں
ریحانہ۔ پڑھ لیں گے۔ امتحان کو تو کافی دن ہیں۔ پھر مجھے
پڑھائی سے دلچسپی بھی نہیں رہی ہے۔ (وہ مسکرا کر
فواد کی طرف دیکھتی ہے)
فواد۔ (اس کا مطلب تاڑتے ہوئے) اگر تم ناکام ہو جاؤ گی
تو تحصیلدار صاحب میرا جینا دو بھر کر دیں گے۔
ریحانہ۔ ناکام۔ کامیاب جیسی ساری باتوں سے مجھے نفرت ہے۔
کیا ہم کوئی دوسری بات نہیں کر سکتے؟
فواد کیوں نہیں۔ فی الوقت میں تمہیں یہ بتاؤں گا کہ تم
بہت حسین ہو۔ جب ہنستی ہو تو یوں لگتا ہے...
ریحانہ۔ (جملہ پورا کرنے سے پہلے) جیسے پھول جھڑ رہے ہوں
یہی نا؟
فواد۔ ہاں۔
ریحانہ۔ میں نے آج تک ہنسی سے کسی کے پھول جھڑتے
ہوئے نہیں دیکھے۔
فواد۔ اور میں نے بھی نہیں۔
ریحانہ۔ پھر جھوٹ کیوں کہا؟
فواد۔ کیا کروں، شاعری کا موڈ سوار ہے۔
ریحانہ۔ ہنسی سے پھول جھڑنا اگر واقعی سچ ہوتا تو وہ منظر

کتنا عجیب ہوتا جب کوئی ہنس رہا ہو اور مختلف رنگوں کے چھوٹے بڑے پھول اس کے منہ سے جھڑ رہے ہوں ہے نا؟

فواد۔ یہ بات تو ہے۔ (وہ گھڑی دیکھتا ہے) اچھا میں چلوں۔

ریحانہ۔ بیٹھو نا ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ تم جاؤ گے تو میں پھر سے تنہا ہو جاؤں گی۔

فواد۔ مجھے تنہائی بہت پسند ہے۔

ریحانہ۔ کیوں؟

فواد۔ اس لئے کہ جب کبھی میں تنہا ہوتا ہوں تو تمہاری یاد آجاتی ہے اور تصور تمہیں لا کھڑا کر دیتا ہے۔ ریحانہ اگر تصور جیسی چیز دماغ کی خاصیت نہیں ہوتی تو زندگی کتنی بے رنگ ہوتی اور کسی انسان کے فرصت کے لمحات یوں گذرتے جیسے صدیاں گذر رہی ہوں۔

ریحانہ۔ تم نے درست کہا۔ میں سمجھتی ہوں تصور نیند میں خواب بن جاتا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟

فواد۔ تصور اور خواب کے درمیان حدِ فاصل کا تعین ہو چکا ہے۔ ویسے تم نے بڑی حد تک درست ہی کہا ہے کل رات تم میرے خواب میں آئی تھیں۔

ریحانہ۔ اچھا!

فواد۔ ہاں۔ عجیب لذت آفریں کیفیت چھائی رہی۔ بہرحال میں تمہارے احسانوں سے دبا چلا جا رہا ہوں۔

ریحانہ۔ میرے احسانات؟

فواد۔ ہاں۔ کسی نے خوب کہا ہے

چھپ کے دنیا کی نظر سے خواب میں آتے تو ہیں
یہ بھی کیا کم آپ کا احسان ہے میرے لئے

ریحانہ۔ اب شعر و شاعری رہنے دو۔ رات سے مجھے ایک فکر ستائے جا رہی ہے۔ رشتے کی بات شدت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ اگر اب بھی تم نے کوئی قدم نہیں اٹھایا تو میں سمجھتی ہوں کہ ہم کبھی ایک دوسرے کے نہیں ہو سکیں گے۔

فواد۔ تو آج ہی شادی کی بات چھیڑ دوں؟

ریحانہ۔ ہاں۔

فواد۔ مجھے یقین ہے کہ تحصیلدار صاحب میرے رشتے پر راضی نہیں ہوں گے۔

ریحانہ۔ تم کوشش تو کر کے دیکھو۔

فواد۔ اگر انہوں نے انکار کر دیا تو؟

ریحانہ۔ تم کیا کرو گے؟

فواد۔ تم کیا کرو گی؟

ریحانہ۔ سوائے صبر کے میرے لئے کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔

فواد۔ کیوں نہ ہم راہِ فرار اختیار کریں؟

ریحانہ۔ کوئی کام سیدھے طریقے سے ہو سکتا ہو تو اس کے لئے پیچیدہ طریق عمل اختیار کرنا کہاں کی دانشمندی ہے۔

فواد۔ انکار کا خدشہ میری ہمت پست کر رہا ہے۔

ریحانہ۔ میں ایکشن چاہتی ہوں۔ بس۔ ورنہ ایک دو دن کی تاخیر بھی ہم دونوں میں لامتناہی فاصلہ پیدا کر سکتی ہے۔

فواد۔ میں آج ہی سے کوشش شروع کرتا ہوں۔

ریحانہ۔ اگر کسی وجہ سے رشتہ نہ ہو سکا تو خدارا مجھے تم بے وفا نہ سمجھنا۔ لڑکیاں مجبور ہوتی ہیں۔

فواد۔ تم تو ابھی سے مایوس کرنے والی باتیں کرنے لگیں۔

ریحانہ۔ میں اپنی پوزیشن واضح کر رہی ہوں۔ وہ وقت میرے لئے تکلیف دہ ہوگا جب تمہارے ذہن میں یہ خیال آئے گا کہ میں بے وفا ہوں۔

فواد۔ ریحانہ۔ مجھے ایسا خیال نہیں آئے گا سمجھیں نا تم۔

ریحانہ۔ اچھا چائے کے بارے میں کیا خیال ہے؟

فواد۔ ایک پیالی گرم گرم مل جائے تو کیا کہنے۔

ریحانہ۔ میں ابھی بنا کے دیتی ہوں۔ (دونوں اندر کی طرف جاتے ہیں)

تیسرا سین

ایک ماہ بعد۔ فواد دولہا بنا بیٹھا ہے اور ہال میں

یں پراتی ہیں۔ سہرے کے بیچ اُس کا چہرہ بے حد دلکش لگ رہا ہے۔ ڈیزائنڈ کی شیروانی پہنے وہ مسند پر پائجامے کے اُس سوراخ کو چھپانے کی کوشش کر رہا ہے جو گھٹنے سے قریب ہے۔ شوکت جو ریحانہ کا باپ ہے کچھ دوستوں کو لئے دولہا کی طرف بڑھتا ہے۔ وہ صورت سے سخت گیر لگتا ہے۔ تعارف کے بعد وہ وہیں مسند پر بیٹھ جاتے ہیں۔ شوکت کی نظر اُس سوراخ پر پڑتی ہے۔

شوکت۔ ارے یہ کیا۔ پائجامہ بوسیدہ ہے۔ (فواد پریشان سا اپنے اطراف دیکھتا ہے۔ شوکت پائجامے کو ہاتھ لگا کر دیکھتا ہے) پرانا ہے۔ تم نے نیا پائجامہ کیوں نہیں پہنا؟

فواد۔ ہوا یوں میں نے جس درزی کے پاس کپڑے سلوائے ہیں اس کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ شیروانی اور قمیض تو وقت پر مل گئی، پائجامہ سلے بغیر رہ گیا۔

شوکت۔ برخوردار تم شادی کر رہے ہو۔ تمہیں قبل از وقت ان ساری باتوں کا خیال ہونا چاہئے تھا۔

فواد۔ میں نے بہت کوشش کی مگر وہ دوکان کو تالا لگا گیا اس دیہات میں کوئی اور درزی ہے نہیں اور نہ یہاں ریڈی میڈ کی دوکان ہی ہے۔

شوکت۔ میں نے کہا نا، کپڑے پہلے دے دئے ہوتے۔ یہ کوئی گڑیوں کا کھیل تو ہے نہیں اور پھر اس قسم کا عذر لنگ کم سے کم میں برداشت نہیں کر سکتا۔

فواد۔ بے چارے کے باپ کا انتقال ہو گیا ہے۔

شوکت۔ (غصّے سے) بیچارہ گیا جہنم میں۔

فواد۔ ویسے پائجامہ پرانا ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا قبلہ۔

شوکت۔ فرق! تم شاید میری عزت لینا چاہتے ہو۔ لوگ دیکھیں گے تو کیا کہیں گے۔

فواد۔ تو آپ کو لوگوں کا اس قدر خیال ہے۔

شوکت۔ مسٹر۔ اچھا ہوا کہ تم نے اپنی پوزیشن ابتدا ہی میں واضح کر دی۔ اب میں تم سے کیا امید کر سکتا ہوں کہ تم میری بیٹی کو خوش رکھ سکو گے۔

فواد۔ سنیئے۔۔۔۔

شوکت۔ اب سننے کے لئے رہ کیا گیا ہے۔

فواد۔ اس معمولی سی بات کو آپ غیر معمولی اہمیت کا حامل سمجھ رہے ہیں۔ دراصل۔۔۔۔

شوکت۔ جو کچھ بھی ہو۔ مجھے یہ رشتہ منظور نہیں۔ تم جا سکتے ہو۔ یہ شادی نہیں ہو گی۔ (شوکت اور اُس کے دوست و اٹھ جاتے ہیں)

پہلا سین

فواد۔ یہ تھی میری کہانی۔ زندگی میرا مذاق اڑا رہی تھی اور میں محض پرانے پائجامے کے لئے بے عزتی کے ساتھ محفل سے اٹھا دیا گیا۔ لوگ مجھ پر ہنس رہے تھے اور ایک نوجوان نے تو مجھے اتنی زور کا دھکا دیا کہ میں گرتے گرتے بچا۔ میری طرف سے کوئی نہیں تھا جو میری پشت پناہی کرتا۔

ڈاکٹر۔ یہ تو کچھ اور واقعات ہیں تم نے مجھے قتل کے بارے میں نہیں بتایا۔

فواد۔ ہاں ڈاکٹر۔ کئی دن تک میں اُداس اُداس رہا۔ پھر ایک دن میں چائے بنانے کے لئے لکڑی پھاڑ رہا تھا کہ احمد آیا اور اس نے میری حالت پر کوئی مضحکہ انگیز بات کہی۔ وہ تمام محرومیاں جو مجھ میں پرورش پا رہی تھیں ردعمل کی طالب ہوئیں اور میرا ہاتھ چل پڑا۔ کلہاڑی اُس کی گردن کو چیرتی ہوئی سینے تک اتر گئی۔ ڈاکٹر اس کا تڑپنا اب تک میری آنکھوں میں گھومتا ہے۔ وہ زمین پر گر کر یوں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا جیسے تیر رہا ہو اور پھر وہ بڑھتا ہوا کنوئیں کی منڈیر تک جا پہنچا اور وہاں پر سر رکھ کر بے ہوش ہو گیا۔ اُس کی گردن سے خون یوں ابل رہا تھا جیسے کسی چشمے سے پانی۔ سرخ اور گرم۔ (وہ خاموش ہو جاتا ہے)

(بقیہ صفحہ ۸۰ پر دیکھئے)

مکتوبات

نوٹ:- گزشتہ شمارہ میں چند ضروری خطوط شائع ہونے سے رہ گئے تھے۔ ان میں سے بعض اس اشاعت میں دئے جا رہے ہیں۔

(ادارہ)

اختر بستوی کے قطعات

● مئی اور جون کا مشترک شمارہ نظر سے گزرا۔ اختر بستوی پر مناظر عاشق ہرگانوی کا مقالہ اچھا ہے مگر آخری حصہ پر پہنچ کر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی پیار محبت کی باتیں کرتے کرتے یک بیک لڑ بیٹھے۔ انداز بیان کا یک بیک بدل جانا بُری طرح کھلتا ہے۔ دوسری اہم بات جو کوئی بھی پڑھنے والا محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا یہ ہے کہ مقالہ نقطۂ عروج پر پہنچ کر خود تردیدی (self contradiction) کے عیب کا شکار ہو گیا ہے۔ شروع میں فرماتے ہیں کہ قطعات کے ذریعے کسی نہ کسی حیات افروز پیغام کو براہ راست قاری تک پہنچانا ہوتا ہے اس لئے اس میں کنایاتی اور علامتی الفاظ کے بجائے وہ الفاظ پیش ہوتے ہیں جو خیال کو واضح طور پر پیش کر سکیں۔ اختر بستوی کے قطعات کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ واردات و کیفیات قلبی اور عام فہم زبان میں پیش کرنا ان کا طرۂ امتیاز ہے" اور بعد میں خود ہی نصیحت فرماتے ہیں "قطعہ اور رباعی کے چار مصرعے اعلیٰ درجے کے الفاظ و تراکیب کے متقاضی ہوتے ہیں .... اگر اختر اپنے قطعات میں اشاراتی زبان اختیار کرتے تو میں سمجھتا ہوں ان کے قطعات کا حسن و تاثر اور بھی بڑھ جاتا"۔ اختتام بھی اس جملے پر ہوتا ہے کہ "وہ اپنے فکر و اسلوب میں تبدیلیاں لائیں"۔ یہ بات تو اُس وقت کہی جاتی جب اس سے پہلے تنقید ہوتی مگر ایسا نہیں ہے پورا مضمون تو ستائش سے پُر ہے اور آخر میں کہتے ہیں کہ "وہ اپنے فکر و اسلوب میں تبدیلیاں لائیں"۔ یہ نہیں بتایا کہ کس سلسلے میں تبدیلیاں درکار ہیں۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آخری چھ سطریں بعد میں کسی دل جلے نے بڑھا دی ہیں۔

صبیح احمد — جارج اسلامیہ کالج گورکھپور

● آپ کا رسالہ شاعر میں ہمیشہ بہت ہی اشتیاق کے ساتھ پڑھتا ہوں اور اسے ہندوستان کا سب سے اچھا ادبی معیاری رسالہ سمجھتا ہوں۔ مئی جون کا مشترکہ شمارہ پڑھ کر طبیعت خوش ہوئی۔ حسب معمول تمام تخلیقات نفیس ہیں۔ خاص طور سے آپکا رپورتاژ متعدد بار پڑھنے کی چیز ہے۔ مناظر عاشق صاحب ہرگانوی کا مقالہ "اختر بستوی کے قطعات" بھی عمدہ ہے۔ لیکن اس کا آخری پیراگراف پڑھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ اس لئے نہیں کہ اس میں انہوں نے اختر بستوی کی کمزوریوں کی نشاندہی کی ہے۔ اختر بستوی ایک مشہور شاعر سہی لیکن ابھی نوجوان شعراء کی صف میں شمار کئے جاتے ہیں۔ اور پختگی و قادر الکلامی کی صفات بڑھاپے میں آیا کرتی ہیں۔ اسلئے اُن کی شاعری میں کمزوریوں کا ہونا ناگزیر ہے جس کی نشاندہی بھی ضروری ہے۔ میری حیرت کا سبب یہ ہے کہ مناظر صاحب نے آخری پیراگراف میں جس بات کو اختر بستوی کے قطعات کا عیب بتایا ہے اسی کو اپنے مقالے کے ابتدائی پیراگراف میں اس صنف سخن کی لازمی و بنیادی صفت قرار دیا ہے اور اس طرح گویا خود اپنی ہی کہی ہوئی بات کی تردید کر ڈالی ہے۔ تمہیدی پیراگراف میں وہ لکھتے ہیں کہ

"قطعات کے ذریعے کسی نہ کسی حیات افروز پیغام کو براہ راست قاری تک پہنچانا ہوتا ہے اس لئے اس میں کنایاتی اور علامتی الفاظ کے بجائے وہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں جو خیال کو واضح طور پر پیش کر سکیں"——

اور پھر آخری پیراگراف میں فرماتے ہیں کہ

"اگر اختر اپنے قطعات میں اشاراتی زبان اختیار کرتے تو میں سمجھتا ہوں کہ ان قطعات کا حسن و تاثر اور بڑھ جاتا"

کیا یہ دونوں باتیں متضاد نہیں ہیں۔؟ دوم یہ کہ مناظر صاحب کے مقالہ کا آخری جملہ حد درجہ قابل گرفت ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ

"اختر بستوی کی عمر شاعری بڑھ رہی ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ وہ اپنے فکر و اسلوب میں تبدیلیاں لائیں گے"—— اس جملہ کا مطلب یہ ہوا کہ اختر بستوی

کی موجودہ شاعری فکر و اسلوب کے اعتبار سے بالکل ہی خراب ہے، اس لئے انہیں تبدیلیاں لانی چاہئیں۔ مناظر صاحب نے خود ہی اپنے پورے مقالہ میں اختر بستوی کے قطعات کی دل کھول کر تعریف کی ہے پھر ان کا یہ ارشاد کیا معنی رکھتا ہے؟ شاید وہ آخر میں جو کچھ کہنا چاہتے تھے اُسے ٹھیک سے جملے میں ادا نہیں کر سکے۔ لیکن مجموعی حیثیت سے مناظر عاشق صاحب کا یہ مقالہ قابلِ تعریف ہے اور اُردو کے ایک ہونہار سخن گو کی شاعرانہ صلاحیتوں کو عام قاری کے سامنے لانے کی گراں قدر خدمت انجام دیتا ہے۔

رئیس نارودی (بی ایس سی) چمن گنج۔ کان پور

جناب صبیح احمد اور رئیس نارودی صاحب کو میرے مضمون کے آخری پیراگراف میں Self condradiction کا عیب نظر آرہا ہے، حالانکہ ایسی کوئی قابلِ گرفت بات نہیں ہے۔ جہاں تک فکر و اسلوب میں تبدیلی لانے اور اشاراتی زبان اختیار کرنے کی بات ہے، میں نے یہ کہا ہے کہ اختر کے "کچھ قطعات ایسے ہیں جنہیں محض برائے بیت کہا جا سکتا ہے جو جذبات اور گہری فکر سے عاری ہیں۔ سیدھے اور بے جان اسلوب کے حامل ہیں جن میں حشو و زوائد ہیں، بے تاثیری اور بے رنگی ہے"۔ اور ایسے ہی قطعات کے لئے میں نے فکر و اسلوب میں تبدیلی لانے اور اشاراتی زبان اختیار کرنے کی ضرورت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

مضمون کے شروع میں میں نے قطعات کے لئے یہ شرط ضرور بتائی ہے کہ "اس میں کنایاتی اور علاماتی الفاظ کے بجائے وہ الفاظ پیش ہوتے ہیں جو خیال کو واضح طور پر پیش کریں۔" لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اظہار میں جدّت نہ ہو اور خیال کو واضح کرنے کے لئے بالکل سیدھے سادے یا سپاٹ اور بے روح الفاظ پیش کئے جائیں۔

کسی بھی شاعر یا فنکار کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہر قسم کے تجربات، مشاہدات اور مطالعہ کے لئے خود کو کشادہ رکھے اور اُس میں خشک ریت کی سی قوتِ انجذاب ہو۔ لیکن اس کے اظہار کے لئے مؤثر الفاظ کے ذخیرے کا ہونا بھی لازمی ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو اس میں آورد اور Self conscious آرٹ کی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ کسی بھی شاعر یا فنکار کی اپنی تخلیقی ضروریات ہوتی ہیں جن کے تحت وہ چند اسالیب کے خلاف بغاوت کرتا ہے اور اپنے لئے نئے اسالیب ایجاد کرتا ہے اور سہل مفاہمتوں کے لئے آسانی سے رضامند نہیں ہوتا۔ ہر بڑا فن پارہ محض اس وجہ سے بڑا نہیں ہوتا کہ وہ اِن اقدار کا حامل ہوتا ہے جو بڑے ادب کی اقدار ہوتی ہیں۔ علامت پسندی، لاکمابیت، سرریلزم یا جدیدیت value Judgement نہیں ہیں۔ اصل بات تو بڑی شاعری پیدا کرنے کی ہے اور بڑی شاعری اُسی وقت پیدا ہوتی ہے جب خیالات میں جدت ہو اور شاعر اپنی تخلیقی ضروریات کے تحت نئے اسالیب ایجاد کرے۔

بڑا اور بہت بڑا قطعہ نگار بننے کے لئے ضروری ہے کہ اختر بستوی اپنے فکر و اسلوب میں تبدیلیاں لائیں اور مشاہدات، تجربات اور مطالعہ کو وسعت بخشیں۔ ابھی اختر کی شاعری کی عمر بہت تھوڑی ہے۔ وہ جس عمر سے گذر رہے ہیں یہ اکتساب کی عمر ہے اور خود کو زیادہ سے زیادہ کشادہ رکھنے کی عمر ہے۔ ویسے قطعہ نگاری میں اختر مجھے "دبیز" نظر آتے ہیں اور میری خواہش ہے کہ وہ "لسیم شمیم" بن جائیں لیکن صبیح احمد اور رئیس نارودی صاحب کے مراسلے سے مجھے ڈر ہے کہ اختر "خوش فہمی" میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ اسی لئے میرا مشورہ ہے کہ وہ میرے مضمون کے آخری پیراگراف کو ضرور پیشِ نظر رکھیں!

مناظر عاشق ہرگانوی ہرگانواں۔ بریکھہ (مونگیر)

ڈراما پیچ کی دیوار

● شاعر کے ماہ جولائی کے شمارے میں پسند آنے والی تخلیقات میں جمیل شیدائی کا ڈراما بھی ہے۔ ڈراما کافی خوب صورت اور جاندار ہے۔ مگر ڈراما پڑھنے کے بعد کافی مایوسی ہوئی۔ سوچا تھا جمیل صاحب پرانے ڈراما نویس ہیں، اپنے

مقام کا احترام کرتے ہوئے "مرکزی خیال ریڈیو سے" یا مرکزی خیال ماخوذ لکھنا نہ بھولیں گے ۔۔ مجھے افسوس ہے میں اس سلسلے کی کوشش میں ناکام رہا۔

ریڈیو سیلون سے روزانہ صبح پونے سات بجے "مسیح وندنا" پروگرام نشر کیا جاتا ہے جس کے تحت مذہب عیسائی کی تبلیغ کی جاتی ہے۔ اسی پروگرام میں دغالباً ماہ جون میں) بچوں کا پروگرام میں ایک کہانی "بیچ کی دیوار" سنائی گئی تھی جس کا پلاٹ وہی تھا جو جمیل صاحب کے ڈرامے کا ہے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ بچوں کا پروگرام ہونے کی وجہ سے مرکزی کردار میں ایک بچی تھی اور وہ ڈرامہ نہیں کہانی تھی۔ جمیل صاحب نے صرف اتنی محنت کی ہے کہ مرکزی کردار کی بچی کو جوان دکھا کر ڈرامے کا روپ دے دیا ہے ورنہ آغاز، درمیان اور اختتام کے واقعات کے ساتھ ساتھ عنوان میں بھی کوئی تبدیلی نہیں کی گئی ہے ۔۔۔ جمیل صاحب سے میری مخلصانہ گذارش ہے کہ وہ اپنا احترام کریں یا نہ کریں "شاعر" کا احترام کرنا تو نہ بھولیں۔ !

انور ادیب　　　　مظہر مینشن۔ جگسائی۔ جمشید پور

اقبال پر زرتشتیت کا اثر

● "نذر اقبال" کے تحت جتنے مضامین چھپے ہیں معیاری ہیں۔ "اقبال پر زرتشتیت کا اثر" البتہ نامکمل سا ہے۔ زرتشتیت کی صرف دو ایک مثالیں دیکر مضمون ختم کر دیا گیا ہے۔ مضمون کے اختتام میں زرتشتیت کے اثر کی تردید بھی کر دی ہے یعنی "کلی یکانگت پیدا ہو جانا کوئی لازم و ملزوم امر نہیں ہوتا"۔

لکشمی نارائن فارغ　　　　ملک نگر۔ جے پور

● "نذر اقبال" والا شمارہ دیکھ کر میں خوشی سے اچھل پڑی۔ مگر افسوس کہ صرف پانچ مضامین ہیں۔ سارا نمبر "اقبال" کے لیے وقف ہوتا تو اچھا تھا۔ بہرحال مضامین خوب ہیں۔ ڈاکٹر رستوگی کے مضمون میں لفظ "اُشا" کو "آشا" لکھا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کتابت کی غلطی ہو۔ اس لفظ سے "اُشو اُدّ اَشیم" بھی آئے ہیں اور مفہوم بھی وہی ہے۔ ڈاکٹر رستوگی کی خوش فہمی میں ہم بھی شریک ہیں خواہ وہ درست ہوں یا نہ ہوں۔ اقبال سے ہمارا بھی دُور کا ربط تو پیدا ہو جاتا ہے۔

پروین ویکاجی　　　　ریڈ ہلز۔ حیدرآباد

عشق اقبال کی نظر میں۔ تصحیح

● مضمون بغرض اشاعت روانہ کرنے کے دوسرے یا تیسرے ہی دن میں نے ایک اہم گذارش کی تھی کہ عبارت کا حسب ذیل ٹکڑا حذف کر دیا جائے:

"... کہ خود معشوق حقیقی نے بھی یہی ارشاد فرمایا ہے "لولاک لما خلقت الافلاک" ۔۔"

(ص ۲۶؛ س ۲۷، ۲۸)

کیونکہ اس سے غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ لولاک ۔۔۔ الخ کوئی آیت قرآنی ہے۔ آیات قرآنی کی کتابت میں بھی غلطیاں ہوئی ہیں:

— اَفْرَجِعِيْ لکھ دیا گیا ہے۔ الف پر زبر نہیں ہونا چاہیے۔

— يَذْكُرُونَ اللّٰهَ میں اللہ کی الف پر جزم سا دکھائی دیتا ہے جو غلط ہے۔

— جنوبہم کو جنو بہم لکھ دیا گیا ہے۔

— تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ میں اللہ کی ہ پر پیش غلط ہے۔

— خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اس طرح صحیح ہے۔

کتابت کی مزید غلطیاں:

— "اس شمارے میں" کے ناموں کی فہرست میں شاہ حسین نہوی درج ہو گیا ہے۔ "نہوی" غلط ہے۔ صحیح "نہری" ہے۔ میرا پورا نام سید شاہ حسین نہری ہے۔

— صفحہ ۲۳، سطر ۹ پر ادراک وتخیل ہونا چاہیے۔

— صفحہ ۲۳، سطر ۱۲ "تربیت" نہیں بلکہ "ترتیب" صحیح ہے۔

شاہ حسین　　　　عزیز پورہ۔ بیڑ۔ (مہاراشٹرا)

شاہ حسین نہری صاحب! پابندی خاکسار [illegible] ۔ (ادارہ)

آزاد غزل

● اگست کا شمارہ باصرہ نواز ہوا — آزاد غزل برادرِ محترم ظہیر غازی پوری کا مضمون خصوصاً پسند آیا۔ ذہن کے وہ گوشے روشن ہو گئے جو کئی برسوں سے تاریکی کو اپنا مقدر سمجھنے پر مجبور تھے۔ یہ اعلان دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ آپ لوگ "شاعر" کا قومی یکجہتی نمبر نکالنے والے ہیں۔ میری طرف سے مبارکباد قبول فرمائیے۔

پرویز رحمانی — ڈورنڈہ۔ رانچی ۲

● یقیناً یوسف جمال صاحب نے بجا کہا ہے کہ آزاد غزل لکھنے کے لئے مہینوں پیچ و تاب کھانا پڑتا ہے (اور اس کے بعد کسی پرچے میں چھپا کر ہمیں پیچ و تاب میں مبتلا کر دیتے ہیں مہینوں) ایک پابند غزل کی مٹی پلید کرنے کے لئے اتنا عرصہ تو درکار ہوتا ہی۔ حال ہی میں انہوں نے اپنی ایک غزل (جسے شب خون کے تازہ شمارے میں چھپوایا ہے) کو تیشہ کے ہاتھوں مجبور ہو کر کس طرح برباد کیا ہے ذرا آپ بھی دیکھئے۔

انہوں نے ایک پابند غزل تو لکھ لی پھر اس کو آزاد کرنے کے لئے کتنے پاپڑ بیلے ہیں اندازہ لگائیے۔

آزاد غزل

۱۔ خواب دیکھا کر روحوں کے دیار میں سارے اجسام مجرم کی صورت میں تھے
سوچ کر اپنا انجام وحشت میں تھے

۲۔ مختلف رنگ و بو کا تھا رشتہ سرابوں سے گہرا بہت
خواہشوں کا لہو دونوں مل کر ہمہ وقت پیتے رہے ایک عرصے سے ہم جس کی چاہت میں تھے

۳۔ اک تصور کے ٹھنڈے گھنے سائے میں بیٹھے ہیں صرف چھوٹی انا کی سکوں کے لئے
ورنہ روزِ ازل سے یہ دیکھا گیا ہے کہ ہم جلتے سورج کی غیظ و تمازت میں تھے

۴۔ دستِ شہکارِ فطرت کا ممنون ہوں ہر نمائش میں مجھ کو سجایا گیا
دیکھ کر میں بھی لوگوں کو حیرت میں ہوں مجھ کو بھی دیکھ کر لوگ حیرت میں تھے

۵۔ آج صدیوں کے زنداں میں بندی بنے صرف مرنے کی ضد میں وہ روتے رہے
بھاگتے لمحوں کی جو حراست میں تھے

۶۔ یہ زمیں سبز تھی آسماں سبز تھا دشت و صحرا سمندر سبھی سبز تھے۔
عشرتِ زندگی کی یہ پہچان تھی
سبز رنگت کی ہر چیز پہ مُہر تھی بس نمایاں ہمیں زرد رنگت میں تھے

پابند غزل

۱۔ سارے اجسام مجرم کی صورت میں تھے — سوچ کر اپنا انجام وحشت میں تھے
۲۔ تھا وہ رشتہ سرابوں سے گہرا بہت — ایک عرصے سے ہم جس کی چاہت میں تھے
۳۔ صرف چھوٹی انا کی سکوں کے لئے — جلتے سورج کی غیظ و تمازت میں تھے
۴۔ ہر نمائش میں مجھ کو سجایا گیا — مجھ کو بھی دیکھ کے لوگ حیرت میں تھے
۵۔ مرنے مرنے کی ضد میں وہ لٹتے رہے — بھاگتے لمحوں کی جو حراست میں تھے
۶۔ سبز رنگت کی ہر چیز پہ مہر تھی — بس نمایاں ہمیں زرد رنگت میں تھے

اب آپ ہی انصاف سے کہیے کہ آزاد غزل حشو و زوائد اور بھرتی کے الفاظ سے بچنے کے لئے کہی جا رہی ہے یا صرف انہی کو ٹھونسنے کے لئے۔ ایک اچھی غزل ہو گئی تھی خواہ مخواہ اس کو آزاد غزل کر دینے سے یوسف جمال صاحب کو نہ جانے کس انا کو تسکین ملی ہے۔ میرے خیال سے آزاد غزل پر یک قلم روک دی جائے ورنہ اچھے شاعر بھی حشو و زوائد اور بھرتی کے ہو جائینگے۔

حسن رضا اچھوری۔ نمبر ۳ کیال ڈویژن۔ کیمپ کرشنا پور۔ ڈاک خانہ دیجا پیجہ۔ ضلع گلبرگہ۔

شمارہ اگست ۷۳ء

● طویل انتظار کے بعد اگست ۷۳ء کا شمارہ ۲۰ اکتوبر کی شام کو ڈاک سے ملا۔ آخری سرورق پر "قومی یکجہتی نمبر" کے اعلان کو دیکھ کر مسرت ہوئی۔ قومی یکجہتی وقت کا اہم ترین موضوع ہے۔ خرابی صحت کے باوجود آپ مسلسل جو ادبی اور قومی خدمات انجام دے رہے ہیں، اس عہد میں اس حوصلہ صادق اور جذبۂ بے پایاں کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

اگست کے شمارے میں جناب جاں نثار اختر کی حسین و جمیل غزل پڑھ کر روح پھڑک اٹھی۔ یوں تو پوری غزل فکر و نظر کی آئینہ دار ہے مگر یہ اشعار تو کبھی بھلائے نہیں جا سکتے ؎

تمام عمر کی نقادگی کا حاصل ہے
وہ ایک درد جو آنکھوں میں ڈھل گیا ہے میاں
بس ایک موج تہہ آب کیا تڑپ اٹھی
لگا کہ سارا سمندر اچھل گیا ہے میاں
جب انقلاب کے قدموں کی گونج جاگی ہے
بڑے بڑوں کا کلیجہ دہل گیا ہے میاں
کوئی ثبوت نہ لا کر تو کیوں نہ مانیں گے
سنا تو ہے کہ برا وقت ٹل گیا ہے میاں
میں سوچتا تھا وطن جل کے پڑ رہیگا کبھی
مگر فساد میں وہ گھر بھی جل گیا ہے میاں

جناب نصر قریشی کی غزل کے ان شعروں نے بھی بہت متاثر کیا
یک لہر کا دریا، صاعقہ صفت صحرا، گرد بے ستوں ہر سو

لائیے عصا کوئی، دامن اماں کوئی، ورد ڈھونڈتے ہیں لوگ
رات خواب گاہوں میں چاند خون میں لتھڑا تاجدار کا چہرہ
نقرئی اجالوں کے شہر کے اندھیروں میں پارسا بنے ہیں لوگ

شوکت پردیسی — جمدہاں۔ جونپور

● اگست کا شمارہ دست ہوا۔ تازہ شمارہ جامع مقالات اور اثر انگیز منظوم تخلیقات کا ایک حسین گلدستہ ہے۔ قمر غازی پوری کا مقالہ "آزاد غزل۔ ایک تجزیہ" قاری کو بھرپور مواد پیش کرنے میں کامیاب ہے۔ اسی نوع کا ایک مقالہ علی احمد جلیلی نے "برگ آوارہ" میں لکھا تھا لیکن تشنگی باقی رہ جاتی تھی۔ نظموں میں نادم بلخی کی غزل نما احساس کے ایک ایک تار کو جھنجھوڑ گئی۔ موصوف کی یہ نظم داخلی کرب کی آئینہ دار ہے اور ایسے لوگوں کے منہ پر بھرپور طمانچہ ہے جنہوں نے ضمیر فروشی اور فن برائے تجارت کو اپنا شعار بنا رکھا ہے۔

نصر قریشی، اقبال ماہر اور کرشن کمار طور کی غزلیں معیاری ہیں۔ انور قمر ان دنوں بڑی اچھی کہانیوں کو جنم دے رہے ہیں۔ ان کی کہانی "دیگ کا زنگ" افلاس و غربت کی عمدہ تصویر کشی کرتی ہے۔ ساتھ ہی عنوان بھی سائنٹفک ہے۔ "قومی یکجہتی نمبر" کا انتظار ہے۔ امید کہ یہ ایک یادگار نمبر ہوگا جو ایک دستاویز کی حیثیت کا حامل ہوگا۔

رونق گیاوی — قصبہ پنچانپور۔ ٹکاری۔ گیا

● "شاعر" کا تازہ شمارہ (اگر اکتوبر میں اگست کے شمارے کو تازہ کہا جا سکے) ملا۔ یہ اعلان پڑھ کر مسرت ہوئی کہ ادارۂ شاعر عنقریب ایک قومی یکجہتی نمبر شائع کرنے والا ہے۔ مجھے امید ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ یہ خاص نمبر پچھلے تمام نمبروں کی طرح اپنی مثال آپ ہوگا اور تاریخی اور ادبی دستاویز کی حیثیت اختیار کریگا۔ بڑی بے صبری سے انتظار کر رہا ہوں۔ تازہ شمارے میں یوسف جمال اور ندا فاضلی کی جدید نظمیں بہت پسند آئیں۔ غزلوں میں جاں نثار اختر، نصر قریشی، رشید خیالی، آذر بلند شہری، نکوی دکار، الزبیر شاہانی اور عروج زیدی خوب ہیں۔ افسانوں میں دیگ کا زنگ اور شیشے کے پیچھے پسند آئے۔
لیکن اس شمارہ میں ظہیر صاحب کا مقالہ اور تجربات بہت خوب رہیں۔

خلیق الزماں نصرت — ۴۲/۱۰، کالی ماٹی روڈ، جمشید پور

نقد و نظر

تبصرے کیلئے کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں

چوپٹ راجہ

از ——— فکر تونسوی

"چوپٹ راجہ" فکر کا ایک طنزیہ ناول ہے، جس میں انہوں نے دلچسپ تمثیلی پیرائے میں ہندوستان کی موجودہ سیاست پر گہری چوٹیں کی ہیں اور جمہوریت کے نام نہاد علمبرداروں کا کچا چٹھا بیان کیا ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ پچیس سال پہلے یہاں حکومت کی باگ ڈور نوابوں، راجاؤں اور دولت مندوں کے ہاتھ میں تھی اور عوام بھوکے ننگے تھے۔ لیکن جب ملک آزاد ہوا اور یہاں جمہوریت کی بنیاد رکھی گئی تو عوام نے سوچا کہ اب ہمارے اچھے دن آئے ہیں، اب ملک سے غربت اور مفلسی کا دور دورہ ختم ہوگا۔ لیکن یہ سب کچھ نہ ہوا بلکہ وہی نواب، مہاراجے اور سرمایہ دار جمہوریت کا لبادہ اوڑھ کر دوبارہ آگے بڑھے اپنے حواریوں کا جمع کیا، اپنی پارٹیاں بنائیں، پریس اور ذرائع اشاعت پر قبضہ کیا، الیکشن لڑے اور جوڑ توڑ کر کے دوبارہ اپنی حکومت بنالی۔ اس طرح انہوں نے تاج شاہی اتار کر تاج جمہوریت پہن لیا، نظام جمہوری بن گیا اور تاج قائم رہا۔ رہے عوام تو وہ اب بھی اسی طرح بھوکے ننگے ہیں۔ ان کی قسمت میں سوائے کھوکھلے وعدوں کے اور کچھ نہیں۔

پچیس سال کی اس ساری اکھاڑ پچھاڑ کا نقشہ فکر نے اپنے اس مختصر سے ناول میں بڑی خوبی سے کھینچا ہے۔ اس کے سب کردار فرضی ہیں، لیکن آج کے بعض وزیروں، نیتاؤں اور سیاسی بازی گروں پر صادق آتے ہیں "چھوٹی رانی" اور "پروفیسر نشچل داس" کا کردار بڑا معنی خیز ہے۔ "چوپٹ راجہ" کہانی کا مرکزی کردار ہے اور کہانی کی پوری فضا پر چھایا ہوا ہے، جاگیردارانہ مزاج اس کو ورثہ میں ملا ہے۔ اس کا مقصد عوام پر حکومت کرنا ہے۔ چاہے وہ "سلطانی" کے نام سے ہو یا "جمہوریت" کے نام سے۔ جب جاگیردارانہ نظام ختم ہو جاتا ہے تو اس کو ذرا غم نہیں ہوتا۔ وہ جھٹ سے جمہوریت کا علمبردار بن جاتا ہے اور حکومت کے سارے ذرائع پر قبضہ کر کے "عوام کی طرف سے عوام کی خاطر، عوام پر حکومت کرنے لگتا ہے"۔ وہ ہمیشہ کی طرح اب بھی راج محل میں رہتا ہے اور عوام ہمیشہ کی طرح جھونپڑی میں۔ صرف "نیم پلیٹ" بدل گئے ہیں۔

فکر مقصدی ادیب ہیں، ان کی ساری زندگی ترقی پسند خیالات کی اشاعت میں گزری ہے۔ انھوں نے حقائق و احساسات کے "ہیولے" بھی تیار کئے ہیں اور شاعروں ادیبوں کے خدوخال کو بھی چھو کر دیکھا ہے۔ نظم اور نثر دونوں پر انہیں قدرت حاصل ہے۔ لیکن قاری کو ان کی نثر اچھی لگتی ہے۔ اور خاص طور پر ایسی نثر جس میں طنز و مزاح کی ہلکی سی چاشنی بھی ہو اسی لئے وہ طنز و مزاح کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ اُن کے طنزیہ مضامین اور افسانے وقتاً فوقتاً ہند و پاک کے اکثر رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ "چوپٹ راجہ" ان کی تازہ تخلیق ہے اور ہندوستان کے سیاسی حالات پر ایک بھرپور وار۔

ضخامت ۱۰۲ صفحات، کتابت و طباعت اچھی قیمت ۶ روپے ملنے کا پتہ، لاجپت رائے اینڈ سنز، اردو بازار دہلی

(حامد اللہ ندوی)

تنہائی

از ——— ساگر سرحدی

"تنہائی" ساگر سرحدی کا ایک نفسیاتی ڈرامہ ہے۔ جو ۱۹۶۱ء میں تیج پال ہال بمبئی میں اسٹیج ہو چکا ہے اور اب کتابی صورت میں پہلی بار منظر عام پر آیا ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ڈرامہ کا مرکزی خیال "تنہائی" ہے۔ اس تنہائی کی تصویر کشی کے لئے ڈرامہ نگار نے دو کرداروں کا سہارا لیا ہے (۱) دنیا دیوی، ایک ایکٹریس جو کسی زمانے میں بہت مشہور تھی اور اب بوڑھی ہو گئی ہے، ایک بڑے شاندار فلیٹ میں اکیلی اپنی زندگی کے دن کاٹ رہی ہے۔ (۲) جعرت "دنیا" کا لڑکا جس کے باپ کا پتہ نہیں، اس بڑے فلیٹ کا دوسرا باسی ہے۔ دن بھر اپنے روم میں بند رہنا اور تاش کے پتوں سے اپنا دل بہلانا اس کا واحد شغل ہے۔ دنیا اور جعرت ایک گھر

کی چھت کے نیچے۔ رہنے کے باوجود ایک دوسرے سے کوسوں دور ہیں۔ ونیتا کو دکھ ہے کہ بھرت اتنی بڑی ایکٹریس کا بیٹا ہو کر بھی زندگی میں کچھ نہ کر سکا۔ بھرت کو غم ہے کہ وہ اتنی امیر، اتنی بڑی ایکٹریس، اتنی شہرت یافتہ ماں کا بیٹا کیوں بنا۔ وہ ایک معمولی غریب سی عورت کا بیٹا ہوتا جو بچپن میں اسے گود میں بٹھاتی، اپنی ممتا اسے دیتی اسے مکمل آدمی بناتی۔

ونیتا اور بھرت کے کرداروں کو اور زیادہ نمایاں کرنے اور اُبھارنے کے لئے ڈرامہ نگار نے دو اور کردار تراشے ہیں (۱) گوری۔ ایک جوان، ہنس مکھ اور ذہین حسینہ جو ونیتا کی ایک ایسی سہیلی کی لڑکی ہے جو کسی وقت فلم میں اس کے ساتھ کام کر چکی تھی۔ لیکن اب اُس نے شادی کر کے اپنا گھر بسا لیا ہے اور نہایت سکھی ہے۔ (۲) نندی۔ ایک محنت کش، حقیقت پسند، پُرعمل نوجوان جو اپنی محنت سے اپنا روزگار پیدا کرتا رہا اور اب ایک چھوٹی سی پلاسٹک کمپنی کا مالک ہے۔

گوری نوکری کی تلاش میں دلّی سے بمبئی آکر ونیتا کے گھر رہنے لگتی ہے۔ ونیتا اُس کی آمد سے بے حد خوش ہے۔ اور اُس کو بہت چاہتی ہے، بھرت بھی آہستہ آہستہ اپنی ساری تلخی، سرد مہری اور بے رخی کو بھول کر گوری کے قریب ہونے لگتا ہے اور اُس کو چاہتا ہے۔ ونیتا اور بھرت دونوں ہی نے گوری سے اپنے اپنے طور پر کچھ اُمیدیں وابستہ کر لی ہیں۔ لیکن گوری کی دلچسپی اُن دونوں سے آہستہ آہستہ کم ہونے لگتی ہے۔ اُس کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ اندھیری رات میں ایک ایسی سرائے میں داخل ہو گئی ہے جہاں دو نیم پاگل رہتے ہیں، دونوں اُس کی محبت چاہتے ہیں۔ ایک بدمست، بدخو، سنکی ایکٹریس ہے اور ایک کینہ، خود غرض، کنویں کا مینڈک ہے۔ اِس گھر کی فضا سے اس کا جی متلانے لگتا ہے۔ آخر ایک دن نندی سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیتی ہے اور اس گھر کو خیرباد کہہ دیتی ہے۔ ونیتا اور بھرت پھر سے تنہائی کے اندھے کنویں میں بند ہو جاتے ہیں، جہاں

کوئی دھڑکن
نہ کوئی چاپ
نہ آنچل
نہ کوئی سوچ
نہ پائل
نہ کسی سانس کی گرمی
نہ بدن
ایسے سناٹے میں اک آدھ تو پتہ کھڑکے
کوئی پگھلا ہوا موتی
کوئی آنسو
کوئی دل
کچھ بھی نہیں
کتنی سنسان ہے یہ راہ گزر
کوئی رخسار تو چمکے، کوئی بجلی تو گرے (مخدوم)

ڈرامے کا پلاٹ تو بس وہی ہے جو اوپر دیا جا چکا ہے لیکن ڈرامہ نگار ایک منجھا ہوا قلم کار اور ماہر نفسیات ہے اُس نے کرداروں کی شخصیت کو مکالموں کی مدد سے اِس خوبصورتی کے ساتھ اُبھارا ہے کہ پورا ڈرامہ ایک متحرک تصویر میں بدل گیا ہے۔ ہر کردار اپنے رول میں کامیاب ہے۔ اور اُن کی زبانوں سے نکلے ہوئے الفاظ ان کرداروں کی دلی کیفیات کی خوب خوب ترجمانی کرتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ڈرامہ نگار "تنہائی" کی دردناک کیفیتوں سے نہ صرف آگاہ ہے بلکہ اُن کی تصویر کشی میں بھی اُس کو کمال حاصل ہے۔ بلاشبہ یہ ایک اچھا ڈرامہ ہے اور اردو دنیا کے لئے ایک دلچسپ تحفہ۔

ضخامت ۱۴۴ صفحات، کتابت و طباعت اچھی

قیمت ۳/۷۵ ملنے کا پتہ۔ مکتبہ جامعہ دہلی، بمبئی۔

(حامد اللہ ندوی)

شعاعوں کی صلیب

از ——— کرامت علی کرامت

"شعاعوں کی صلیب" کے ڈسٹ کور پر دونوں طرف فراق گورکھپوری اور سید احتشام حسین کی رائیں ہیں۔

"ذہن کلام کو لوگ اپنی آنکھوں سے لگائیں گے .... اِس مجموعہ میں ہر صورت کو ایسے واردات مل جاتے ہیں جو ہمیں فکر و تامّل پر مجبور کرتے ہیں" (فراقؔ)

"میرا خیال ہے کہ 'شعاعوں کی صلیب' نئی شاعری کا ایک فکر انگیز مجموعہ ہے" (احتشام حسین)

اس کے بعد پہلے ہی صفحہ پر کالی داس کا یہ جملہ دیا گیا ہے: "صرف وہی لوگ میرے شعر سننے کے مستحق ہیں جو اچھی اور بُری اشیاء میں امتیاز کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں"

پھر "میری شاعری" کے عنوان سے خود کرامت علی کرامت کا ایک طویل مضمون ہے، جس میں انہوں نے ہر طرح کے ایسے واقعات و متعلقات کو اپنے قلم سے پیش کیا ہے، جس سے وہ قاری کو متاثر کر سکیں۔ یہاں تک کہ اپنی رفیقۂ حیات اور ساس عابدہ خاتون کو بھی اپنی شاعری کا محور و مرکز بتانے سے گریز نہیں کیا ہے۔ ان گنت شخصیتوں کے نام دیئے ہیں اور اُن سے اپنے ربط و تعلق اور اپنی ادبی و شعری شخصیت کے بارے میں اُن کے اظہارِ خیال کا بھی ذکر کیا ہے۔ مضمون کا آخری جملہ ہے۔

"بہرحال آپ بھی 'شعاعوں کی صلیب' سے اپنی پسند کی کوئی چیز منتخب کر لیجئے۔ اِس مجموعہ میں اگر آپ کو کچھ خوبیاں نظر آئیں گی تو وہ محض آپ کی ہونگی، اُن کے لئے مجھے قابلِ تحسین تصور نہ کیا جائے" اگر اسے حصولِ تحسین کا چھپا ہوا جذبہ قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

گزشتہ چند سال میں کرامت علی کرامت کا نام بحیثیت نقاد کافی ابھر کر آیا ہے۔ وہ ریاضی کے پروفیسر ہیں۔ جب سائنس کی تعلیم حاصل کی ـــــ مشرق و مغرب کے ادب و شعر کے رجحانات اور اسالیب کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ ادبی تحریکات پر اُن کی نظر ہے۔ مواد، ہئیت اور اُسلوب کی خوبیوں اور خامیوں سے بھی واقف ہیں۔ قدیم و جدید شاعری اور فنی رموز و نکات سے آگاہ ہیں، اپنی شخصیت کے ساتھ ایک علمی پس منظر بھی رکھتے ہیں۔ وہ بعض ادبی مسائل پر بڑی بیباکی سے فکر انگیز مضامین لکھ چکے ہیں۔ اُن کی نثر پر جتنی توجہ دی گئی، اتنی ان کی شاعری کی طرف نظریں نہیں اٹھیں۔ شاید اسی لئے انہیں اتنا طویل مضمون اپنے مجموعۂ کلام میں لکھنا پڑا اور شعوری طور پر انہوں نے ایسا التزام اختیار کیا جس سے دوسرے لوگ بھی اُن کی توصیف کر سکیں۔ در اصل اُن کے اندر کا نقاد بھٹک گیا۔ وہ خود تنقیدی کا غیر جانبدارانہ حق ادا نہ کر سکے۔ اتنی بہت سی باتوں کے بجائے اگر وہ اختصار کے ساتھ صرف اپنے شاعرانہ نظریات و میلانات کی طرف کچھ اشارے کر دیتے، پسند و ناپسند کی بات قاری پر چھوڑ دیتے تو اس کا رد عمل بہت خوشگوار ہوتا۔

اس "دعوتِ مرعوبیت" اور فراقؔ و احتشام کی خلافِ حقیقت آرا سے ہٹ کر یہ عرض کرنا ہے کہ کرامت علی کرامت کی شاعری کی اپنی کچھ الگ خصوصیات ہیں۔ اُن کے مجموعہ کو "جدید شاعری کا فکر انگیز مجموعہ" کہہ دینے سے کام نہیں چلے گا۔ اِس لئے کہ اُن کی "غزلیہ شاعری" جدید شاعری کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتی۔ جہاں جدید شاعری کی معلوم و معروف روایات میں ذات کا المیہ، تنہائی، بیزاری، شکست و ریخت، معاشرے سے علیحدگی پسندی، بے یقینی، مایوسی، بے چہرگی اور زندگی سے فرار وغیرہ شامل ہیں، وہیں اِن "فارمولوں" سے ہٹ کر بعض پڑھے لکھے، ذہین اور قابلِ ذکر جدید شعراء کے یہاں جدید حسیت، نئی علامتوں، نئے تلازموں اور نئے اسالیب کی جو خوبیاں نظر آتی ہیں، وہ کرامت صاحب کی غزلیہ شاعری میں برائے نام ہیں۔ اُن کا خیال ہے۔

"جدید شاعری محض بے بسی، مایوسی اور بے یقینی کا راگ الاپنے کا نام نہیں۔ نامرادی، ناسازی، محرومی جیسے الفاظ عموماً میرے لغت میں نہیں ملتے۔ ممکن ہے بعض موقعوں پر میری شاعری دقیق معلوم ہو۔ لیکن میں عموماً پیچیدگی اور ابہام کے مقابلے میں سادگی اور ابلاغ کو پسند کرتا ہوں۔"

حالانکہ اچھی شاعری کیلئے رمز و کنایہ بہت ضروری چیز ہے۔ اُن کے ذیل کے اشعار جو بے پناہ تکرار آہنگ لئے ہوئے ہیں، اُن میں رمز و کنایہ کی کارفرمائی ہے ۔

حیات ہے کہ جھٹکتی ہوئی چٹان کوئی

شگفتہ سانسوں میں ہے کتنے حادثات کا کرب
مجھ کو تبسم کی کیا کم تھی سارے دن کی تھکن
کورے شہر میں پھیلا یا ہوا ہے رات کا کرب
ہر شخص سمٹ گیا ہوا اپنے ہی خول میں
اب دائروں کی قید میں سارا جہاں ہے
سونے کا اک جزیرہ تہِ آب جل گیا
تحلیل اب فضاؤں میں دیپک کی تان ہے
ٹوٹی کرچوں میں دھڑکتے ہوئے دل ملتے ہیں
قطرہ درد کا ہے ذرّۂ بیتاب کے ساتھ

اور بقول احتشام حسین مندرجۂ ذیل اشعار میں کچھ کچھ فکر انگیزی بھی ہے ؎

ہر ذرہ ہو گا رینۂ تنویر کا حریف
جب آرزوئے وسعتِ صحرا کریں گے ہم
دل کی تسکین کی خاطر نہیں کم موجِ سراب
دیکھئے اس کو ذرا پیاس کے آئینے میں

یہ جہاں خواب سہی پھر بھی حقیقت یہ ہے
ایک تعبیر بھی وابستہ ہے اس خواب کے ساتھ
میری نظروں میں وقت کا تودہ پگھل گیا
اے دل کرشمۂ تپشِ انتظار دیکھ

مگر غزلوں کا پورا حصہ پڑھ جانے کے باوجود اس نوع کے اشعار بہت ہی کم نظر آتے ہیں۔ ہاں ان سے کم تر درجہ کے اشعار غزل بڑی تعداد میں شاملِ مجموعہ ہیں۔ جو فکر و اسلوب دونوں اعتبا سے کرامت صاحب کو قدیم اور روایتی رنگِ شاعری سے قریب کر دیتے ہیں ؎

انگشت کس حسین کی آخر ہوئی شہید؟
قوسِ قزح کی کیوں یہ شکستہ کمان ہے؟

صدقے اُن نیم باز آنکھوں کے   آگیا بے پیئے خمار مجھے

جو پا سکے نہ جلوۂ شمس و قمر سے ہم
وہ پا گئے بس ایک تمہاری نظر سے ہم

ہائے مخمور آنکھوں کی محراب   میکدہ بھی حرم بن گیا ہے

زلفوں کے واسطے نہ مزاروں کے واسطے
گل مسکرا رہے ہیں بہاروں کے واسطے

نہیں جسے یہ خبر زخمِ عاشقی کیا ہے   وہ جانتا ہی نہیں لطفِ زندگی کیا ہے

دلِ آوارہ تجھے پھر کبھی سمجھا لیں گے
چھیڑ کر لیں تو ذرا جلوۂ بے تاب سے ہم

جب اعتبارِ دیدۂ بینا کریں گے ہم
دل کے قریب اُن کا نظارا کریں گے ہم

کرامت علی کرامت کی غزلیہ شاعری کا یہ رنگ ایسا نہیں ہے جسے اُن کے علم و آگہی اور ناقدانہ بصیرت یا اُردو کی قابلِ ذکر غزلیہ شاعری کے مقابلہ میں رکھا جا سکے۔ اُردو غزل فکر و اسلوب کے اعتبار سے بہت آگے نکل چکی ہے۔ یہاں مثالیں دینے یا آج کے بڑے غزل گو شعراء کے نام گنانے کی ضرورت نہیں۔ خود کرامت صاحب بھی اس بات کو بخوبی سمجھتے ہیں اور اپنی غزلیہ شاعری کی کمزوریوں کا احساس کر سکتے ہیں۔ پابند غزلوں کے ساتھ ساتھ مجموعہ میں ایک "آزاد غزل" بھی شامل ہے۔ اس سے قطع نظر کہ "آزاد غزل" کوئی مستحسن تجربہ ہے بھی یا نہیں، اس غزل میں اُن کی فکر کا رچاؤ کافی گہرا ہے۔

"شعاعوں کی صلیب" میں بڑا حصہ نظموں کا ہے اور یہ غزلوں سے کہیں زیادہ دعوتِ فکر و نظر دیتی ہیں۔ بیشتر نظمیں ہیئت و مواد کے اعتبار سے تازگی لئے ہوئے ہیں۔ ان میں داخلی اور خارجی عوامل کا فکری مگر خوبصورت امتزاج ہے۔ ان نظموں کی تخلیق میں اُن جدید علوم کی آگہی کو بھی دخل ہے جن سے کرامت صاحب کا گہرا تعلق ہے۔ اُنھوں نے اپنے طویل مضمون میں صفحہ ۱۰ سے صفحہ ۲۱ تک اپنی نظمیہ شاعری کا ایک حقیقت پسند تجزیہ کیا ہے۔ کاش وہ اپنے مضمون کو اسی حد تک رکھتے۔ نظمیہ شاعری کے اعتبار سے بلا خوفِ تردید کرامت صاحب کو ایک اچھا جدید شاعر کہا جا سکتا ہے۔ کئی نظموں سے اُن کی انفرادیت اُبھرتی ہے۔ ان میں تکنیک اور "امیجری" دونوں کا نیا پن ہے۔ پیرایۂ اظہار کے لحاظ، الفاظ و علامات و استعارات میں بانکپن ہے۔ اُنھوں نے بعض سائنسی صداقتوں کو اپنے شعور کا جزو بنا کر جو تجربے

کے گئے ہیں۔ وہ محض ماڈرنٹ لہجے نہیں۔ مثلاً ہوسکے گہرائی اور تجربے کی آنچ، شاعروں کی صلیب، سرگذشتِ سفر، تنائج عہد وزنی کا احساس، دریا کا شور رہا، تیجے کے اور کالا میں بطور خاص پایا جاتا ہے۔ بقیہ نظموں میں بھی کم و بیش تہذیب عصری حسیات اور آگہی ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ یہ نظمیں فارمولا ثابت نہیں ہیں اور چونکہ ان میں فنی رکھ رکھاؤ بھی ہے، اس لئے جدید تکنیک کے باوجود شاعری کا حسن ہے۔

مجموعے کے آخر میں "افق تا افق" کے باب میں غیر زبانوں کی ۱۲ نظموں کے منظوم تراجم ہیں۔ یہ ترجمے انگریزی، بنگلا اور کنڑ زبانوں کی نظموں کے ہیں۔ ان کا انتخاب اور ترجمہ دونوں اہمیت رکھتے ہیں۔ ان نظموں میں جدید ذہن بول رہا ہے۔ آزاد تکنیک کے باوجود ان کا آہنگ خوبصورت اور مربوط ہے۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ کرامت علی کرامت ایک اچھے جدید نظم نگار شاعر کہلانے کے مستحق ہیں۔ وہ اردو کی نظمیہ شاعری میں اپنے لئے ایک ممتاز مقام پیدا کریں گے۔

کتابت طباعت کے اعتبار سے مجموعہ خوبصورت ہے قیمت چھ روپے، ملنے کا پتہ:۔ شاخسار پبلیکیشنز بخشی بازار کٹک ۱ (اڑیسہ) (ادارہ)

شاعر کے تین گرانقدر خاص نمبر

ناولٹ نمبر:۔ مشہور ممتاز ناول نگاروں کے ۴ طویل و مکمل ناول۔ ۱۳ ناولٹ۔ ناولٹ نگاروں کی تصاویر زندگی کے حالات۔ بہر نوع اور ناولٹ کا فنکارانہ سرورق۔

۵۲۲ صفحات —————— قیمت صرف ۵ روپے

غالب نمبر:۔ ممتاز ادیبوں اور نقادوں کے فکر انگیز تنقیدی و تحقیقی مضامین۔ غالب نمبروں کی بھیڑ میں سب سے اہم خاص نمبر۔ گیارہ ابواب۔ چار رنگ کی غالب کی تصویر۔ مختلف ادوار کی تمام تصاویر۔ انتخاب کلام۔

ضخامت ۶۳۰ صفحات —————— قیمت ۱۰ روپے

گاندھی نمبر:۔ ہندوستان کے سب سے بڑے قائد مہاتما گاندھی کی شخصیت، زندگی اور سیاسی و سماجی کارناموں کا بھرپور جائزہ۔ ۲۸۲ صفحات۔ قیمت ۴ روپے۔

آئندہ شمارے میں

شاعر نومبر ۷۳ء

مقالات:

ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کی تحریرات —— ڈاکٹر سید عابد حسین
قدرا انشا نگاری کا فن —————— پروفیسر خواجہ امین
غالب کی انا —————— پروفیسر فاروق احمد صدیقی
ناول اور حقیقت پسندی —— آئن واٹ ——
مترجمہ و تلخیص پروفیسر ابراہیم

کہانیاں

نالائق کہیں کا —————— ابوالیث جاوید ——
پرماتما کا کتا —— (ہندی) —— موہن راکیش ——
ترجمہ سلام بن رزاق
شبنم کا پاسبان —————— قاسم یوسف ——
میں اور میرا اسپیکر —————— احمد عثمانی ——

طنز و مزاح

بیماریاں پیسے کی —————— مانک ٹالہ

نظمیں:

سلام مچھلی شہری۔ فصیح اکمل قادری۔ زرینہ ثانی۔ رشید عبدالسمیع جلیل۔ مومن خاں شوق۔ جاوید مہدی۔ اسحاق ملک

غزلیں:

سلام مچھلی شہری۔ غلام ربانی تاباں۔ شاد امام وی —— عظمت حسین خاں۔ کوثر مکش۔ سعید عارفی۔ اختر نظمی۔ ظفر غوری۔ —— عقیل شاداب۔ ڈی گمار۔ نازش انصاری۔ نسیم اجمل۔ عابد مناوری۔ فکری بدایونی۔ ڈاکٹر ایل بی رند صبیر۔ پرویز رحمانی۔

مکتوبات۔ نقد و نظر۔ رفتار۔

سلام مچھلی شہری
(چند تاثرات)

محفل اپنی

"شاعر" سخت مشکلات میں مبتلا ہے

۴۴ سال بعد خطرات کے سیاہ بادل

"شاعر" نے اپنی طویل زندگی میں کئی اچھے اور بُرے دَور دیکھے ہیں۔ لیکن گذشتہ چند ماہ سے وہ جن خطرات میں گھر گیا ہے، اُن سے نکلنے کے لئے اجتماعی تعاون، توجہ اور تبدیلیوں کی فوری طور پر ضرورت ہے۔ ملک ایک سخت ترمعاشی اور اقتصادی بحران میں مبتلا ہے۔ ہر چیز انتہائی گراں اور عنقا ہو چکی ہے۔ شہر بمبئی پر یہ ضرب سب سے گہری ہے۔ دیگر ضروریاتِ زندگی سے قطع نظر کتب و رسائل و اخبارات کے طباعتی و اشاعتی امور کے اخراجات میں مزید ۴۰ فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔

سب سے تشویشناک صورتحال اخباری کاغذ، اس کی گرانی اور نایابی کی ہے "شاعر" تو صرف چند ہزار ہی چھپتا ہے، بہت بڑی اشاعت والے اخبارات اپنی ضخامت کم کرنے اور قیمتیں بڑھانے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ بعض نے اپنی تعداد اشاعت تک کم کر دی ہے۔ اس کے باوجود اُن کے پڑھنے والوں کی وابستگیاں، اُن سے اُسی طرح مستحکم ہیں جیسے پہلے تھیں۔ دراصل یہ وقت جہاں مختلف زبانوں کے اخبارات و رسائل کی آزمائش ہے۔ وہیں اُن کے پڑھنے والوں کے رکھ رکھاؤ کا بھی امتحان ہے۔

گذشتہ چند ماہ میں "شاعر" کا بڑا سرمایہ قومی یکجہتی نمبر" کے بعض ابتدائی کاموں میں صرف ہو گیا اور بقیہ گرانی کی نذر۔ اب وہ عالم ہے کہ عام شماروں کے لئے دلِ لختِ لخت کو جمع کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ اسی لئے "شاعر" دوستوں کے گوش گزار کر دینا ضروری سمجھا گیا، تاکہ اُن کا پُرخلوص تعاون "شاعر" کو موجودہ مشکلات سے نکال سکے۔ ہم مندرجہ ذیل باتوں کی طرف تمام قارئین "شاعر" کو متوجہ کرنا چاہتے ہیں۔

۱۔ اب "شاعر" کا زرِ سالانہ دس روپئے کے بجائے بارہ روپئے ہوگا۔ اور فی کاپی ایک روپیہ۔

۲۔ جن لوگوں کو "شاعر" اعزازی طور پر جاتا ہے، اُن میں سے جو حضرات بغیر کسی جبر و اکراہ کے کوئی اعانت کی رقم یا زرِ سالانہ بھیج سکیں، وہ ادارے کے دلی شکریئے کے مستحق ہوں گے۔ اُن کا اعزاز بہرحال قائم رہے گا۔ کاغذ کی نایابی کی وجہ سے حکومت کی طرف سے اعزازی کاپیوں پر پابندی عائد کر دی گئی ہے۔

۳۔ تمام ہمدردانِ "شاعر" سے رقمی امداد یا دو دو چار چار نئے خریدار بہم پہونچانے کی بھی درخواست ہے۔

۴۔ سالانہ چندہ ختم ہونے کی اطلاع ملتے ہی بلا کسی تاخیر کے منی آرڈر سے بھیج دیا جائے۔

۵۔ "شاعر" کے ایجنٹ کسی صورت میں بھی وی پی واپس نہ کریں۔

۶۔ نئے اور ناپختہ قلم کار اپنی تخلیقات نہ بھیجیں کم حجم کی وجہ سے صرف درجۂ اوّل کی تخلیقات ہی کے لئے جگہ نکالی جا سکے گی۔

۷۔ طویل مضامین اور طویل افسانے بھی شائع نہ ہو سکیں گے۔

— ادارہ —

رفتار

(علمی، ادبی اور تہذیبی خبریں)

غلام ربانی تاباں کو نہرو ایوارڈ

دہلی ۱۸ر نومبر۔ اردو کے ممتاز غزل گو شاعر غلام ربانی تاباں کو ان کے مجموعۂ کلام "ذوقِ سفر" پر سنہ ۱۹۷۳ء کا نہرو ایوارڈ دیا گیا ہے۔

پروفیسر افتخار احمد فخر کو ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری

جلگاؤں۔ یکم اکتوبر۔ پروفیسر افتخار احمد فخر، صدر شعبۂ اردو ایم۔ جے کالج جلگاؤں کو ان کے تحقیقی مقالے "سیماب اکبر آبادی اور دبستانِ سیماب" پر پونہ یونیورسٹی نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری دی ہے۔

۱۰ر اکتوبر کی شام کو ڈاکٹر افتخار احمد فخر کو ایم جے کالج کے اسٹاف کی طرف سے جلگاؤں کے عالیشان ہوٹل "میراکو" میں شاندار پارٹی دی گئی۔ جلسۂ تہنیت کی صدارت کالج کے پرنسپل پروفیسر سی آر پٹ نیس نے فرمائی۔ صدر جلسہ کے علاوہ پروفیسر ایس کے جوشی (شعبۂ مراٹھی) پروفیسر ڈی آر چپلانی (شعبۂ انگریزی) پروفیسر ایس ایم بھاوسے (شعبۂ معاشیات) پروفیسر ادونت (صدر شعبۂ مراٹھی) نے علی الترتیب ڈاکٹر افتخار احمد فخر کی شخصی خوبیوں، ان کی تعلیمی خدمات، ادبیت اور شاعری نیز کاوش، جد و جہد محنت اور ریاضت کو سراہا۔ آخر الذکر نے ڈاکٹر فخر کو سیلف میڈ مین قرار دیا۔ ڈاکٹر فخر نے اپنی جوابی تقریر میں اظہار تشکر کے بعد اپنے موضوع کی وضاحت اور مشکلات کا ذکر کیا۔ ۹ بجے شب کو شاندار ضیافت کے بعد یہ جلسہ ختم ہوا۔

۱۴ر اکتوبر کو بلی۔ نریڈ ہائی اسکول بھساول میں ڈاکٹر فخر کو ایک استقبالیہ دیا گیا۔ کئی انجمنوں اور اداروں کی جانب سے گل پوشی کی گئی۔ اسکول کی انتظامیہ کمیٹی کے صدر جناب یعقوب سیٹھ صاحب نے جلسہ کی صدارت کی اور احمد کلیم فیض پوری نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔

اردو تھیٹر کا پہلا دستیاب ڈرامہ "خورشید"

ادبی حلقوں میں یہ خبر مسرت سے سنی جائے گی کہ بمبئی کے اردو تھیٹر کا پہلا دستیاب ڈرامہ خورشید ڈاکٹر مسیح الزماں کی ترتیب، تصحیح، مقدمہ اور حواشی کے ساتھ شائع ہو گیا ہے۔ اسے کتاب نگر، دین دیال روڈ لکھنؤ نے شائع کیا ہے اور قیمت پانچ روپے ہے۔

جرمن زبان میں کلامِ غالب کا ترجمہ

غالب کے اردو فارسی کلام کا جرمن زبان میں ایک ترجمہ حال ہی میں میونخ سے شائع ہوا ہے۔ اس کی مترجم اردو فارسی زبانوں کی ممتاز ادیبہ مس انی میری شمیڈن ہیں۔ جنہوں نے کئی سال ہندوستان اور پاکستان میں قیام کر کے تحقیقی کام کیا۔ اقبال پر بھی جرمن زبان میں ایک کتاب لکھی۔

جرمن زبان میں غالب کے کلام کا ترجمہ اتنا مقبول ہوا کہ کتاب اپنی اشاعت کے صرف ایک ہفتہ کے اندر اندر فروخت ہو گئی۔

غزل انسائیکلوپیڈیا کا دوسرا مکمل ایڈیشن

ذکی کاکوروی، غزل انسائیکلوپیڈیا کا دوسرا ضخیم ایڈیشن مرتب کر کے شائع کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ایڈیشن بڑے سائز کے ایک ہزار صفحات سے زیادہ کا ہوگا۔ شعرائے اردو اپنے کلام کے مجموعے یا زیادہ سے زیادہ تعداد میں غزلیں مع تعارف و تصویر انہیں ۱۴-۱۳ شاہ گنج لکھنؤ ۳ کے پتے سے جلد روانہ فرمائیں۔

احتشام حسین میموریل سوسائٹی کے عطیات پر انکم ٹیکس معاف!

دہلی۔ ۲ر ستمبر۔ کمشنر انکم ٹیکس دہلی نے اپنے خط نمبر جے ایل ۳(۱۳)/۷۳/۷۰-۹۴ کے ذریعے سکریٹری احتشام حسین میموریل سوسائٹی رجسٹرڈ کو مطلع کیا ہے کہ اس سوسائٹی کو دیئے جانے والے عطیات پر انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۶۱ء کی دفعہ ۸۰ جی کے تحت ٹیکس معاف کر دیا گیا ہے۔ یہ رعایت عطیہ دہندگان کو مذکورہ دفعہ کی حدود میں ملے گی اور اس کی مدت ۳۱ مارچ ۱۹۷۵ء تک ہوگی۔

احتشام صاحب کے تمام شاگردوں، احباب اور محبت کرنے والوں سے درخواست ہے کہ وہ اپنے عطیات بذریعہ کراس چیک یا پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر، شاہد ردولوی، سکریٹری احتشام حسین میموریل سوسائٹی رجسٹرڈ، ڈی ۱۵ ماڈل ٹاؤن دہلی نمبر ۹ کے پتہ پر جلد روانہ فرمائیں۔

داؤد فاضل بھائی مسلم ایجوکیشنل ٹرسٹ بمبئی کی طرف سے ترقی اردو بورڈ کا قیام

داؤد فاضل بھائی مسلم ایجوکیشنل ٹرسٹ جو سالہا سال سے تعلیمی امور میں زبردست حصہ لے رہا ہے اور اب یکم اور ۲ دسمبر ۱۹۷۸ء کو بمبئی میں اس کی طرف سے دو دن ایک شاندار کل ہند مشاعرہ منعقد ہوگا۔ اسی ٹرسٹ نے حال ہی میں ایک "ترقی اردو بورڈ" قائم کیا ہے۔ اس بورڈ کے صدر جناب ڈاکٹر رفیق زکریا ہیں جو اردو علیگڑھ، وزیر صحت و اوقاف حکومت مہاراشٹرا ہیں۔ بورڈ کی کمیٹی میں سلطان ڈوسل (چیرمین شاعرہ کمیٹی و ٹرسٹی داؤد فاضل بھائی ٹرسٹ) رقیہ ڈوسل، کرشن چندر، خواجہ عبد الغفور، ڈاکٹر ظ۔ انصاری، علی سردار جعفری، جاں نثار اختر، سید شہاب الدین دسنوی، گلشن جعفری اور ایم۔ اکرام الدین (سکریٹری داؤد فاضل بھائی ٹرسٹ) شامل ہیں۔

یہ بورڈ نثری ادب خصوصاً اچھی کہانیوں اور ادبی تنقید کی ہمت افزائی کریگا۔ یونیورسٹی سطح پر امتحانات میں امتیازی کامیابی پر اردو طلبا کو بورڈ کی طرف سے انعامات اور اسکالر شپ دینا طے کیا گیا ہے۔ نیز نمایاں صحافتی کاموں پر بھی مناسب ہمت افزائی کی جائے گی۔

مختلف اجتماعات کی تنظیم اور کاموں کی انجام دہی کے لئے ایک مجلس منتظمہ بھی قائم کی گئی ہے جس کے ممبران جناب سلطان ڈوسل (چیرمین)، شعیب صدیقی، حنیف خان، مسز مریم ڈوسل، مسز بی۔ اے جیکب، ابراہیم خان (پرنسپل فاروق ہائی اسکول) اور ایم اکرام الدین (سکریٹری) ہیں۔

اردو کے غیر مسلم مصنفین کی کانفرنس

۱۰ اور ۱۱ نومبر کو لکھنؤ میں اردو کے غیر مسلم مصنفین کی کانفرنس ہوئی۔ اس میں تقریباً کے لگ بھگ مصنفین ہندوستان کے مختلف گوشوں سے شریک ہوئے۔ ۱۰ کی صبح کو مجلس مضامین کا جلسہ ہوا۔ دو بجے ڈیلی گیٹ صاحبان کا اجلاس ہوا جس میں سات قراردیں منظور کی گئیں۔ اس کی صدارت پنڈت آنند نرائن ملا نے کی۔ رات کو ۹ بجے سے مشاعرہ شروع ہوا۔ اس کا افتتاح یو۔پی کے نئے وزیر اعلیٰ شری بنارسی داس گپتا نے کیا اور صدارت جناب شیام کرشن نرائن نگم نے کی۔ مشاعرے میں ساحر لدھیانوی، سردار جعفری، جگن ناتھ آزاد، مخمور سعیدی، کنور مہندر سنگھ بیدی، اور دوسرے ممتاز شعرا نے اپنا کلام سنایا۔ ۱۱ کی صبح پہلا مذاکرہ اردو سے ہمارے رشتے کے عنوان پر ہوا۔ اس اجلاس کا افتتاح پروفیسر آل احمد سرور نے کیا، اور صدارت جناب وی۔ شنکر نے۔ اس میں ڈاکٹر گیان چند جین اور گوپی چند نارنگ نے مقالات پڑھے، اور سردار جعفری، عرش ملسیانی، ڈاکٹر محمد حسن، دما کر راہی اور دوسرے حضرات نے بحث میں حصہ لیا۔ ۱۱ کی سہ پہر کو "ہم اردو کے طرفدار کیوں ہیں" کے عنوان پر مذاکرہ ہوا جس میں پنڈت آنند نرائن ملا اور فراق گورکھپوری کا نے تقریریں کیں، اور کرشن چندر نے خطبہ صدارت پڑھا۔ ڈیلی گیٹ اجلاس میں جو قراردادیں پیش ہوئی تھیں ان کو اس کھلے اجلاس میں منظوری کے لئے پیش کیا گیا، اور طے ہوا کہ کنور مہندر سنگھ بیدی قراردادوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے مناسب کارروائی کریں۔ یہ کانفرنس ان تنگ نظر حضرات کا مسکت جواب ہے جو اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان سمجھتے ہیں۔ اس نے اردو کے قومی کردار کو اور واضح کیا ہے۔ کانفرنس کے لئے اس کے کنوینر رام لعل سب اردو دوستوں کی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

ابر احسنی گنوری کا قتل!

(جنگ جنگ) ۸ رجب ۸ نومبر کی شب میں اردو کے مشہور شاعر حضرت ابر احسنی گنوری کو ان کے مکان واقع گنور میں نہایت بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ تفصیلات معلوم نہ ہو سکیں۔

ڈاکٹر تاراچند کا انتقال

ڈاکٹر تاراچند کا انتقال ہماری مشترکہ تہذیب کے ایک نہایت بلند منارۂ نور کے گر جانے کے مترادف ہے۔ انہوں نے ۹۰ سال کی طویل عمر پائی اور اپنی یاد، صفات اور علم و فضل کے اتنے گہرے ایسے تابناک نقوش چھوڑ گئے ہیں، جو کبھی دھندلے نہیں پڑ سکتے۔ وہ ہندوستان کی بڑی ہی مایۂ ناز شخصیت تھے۔ ایسی شخصیت جس کی دلنوازی، نکتہ سنجی، اور علم کی تہہ داری کا جواب مشکل سے ملے گا۔ وہ نئی پرانی اقدار کا سنگم اور اُس تہذیب و تمدّن کا آئینہ تھے، جس کا عکس اب کم ہی نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر تاراچند اُردو، فارسی اور انگریزی زبان کے ماہر اور عالم تھے، ہم بجا طور سے انہیں اہلِ زبان کہہ سکتے ہیں، اُردو ایسی لکھتے اور بولتے تھے جیسے کوئی دریا بہہ رہا ہو۔ اُن کی نثر شگفتہ، مگر عالمانہ فکر و نظر کی حامل ہوتی تھی۔ اُردو زبان کے سچّے عاشق اور اُس کے ممتاز ادیب تھے۔ وہ مورخ بھی تھے۔ انگریزی زبان میں بھی مرحوم نے بہت کافی لکھا۔ کئی اہم کتابوں کے علاوہ مختلف موضوعات پر ان کے مضامین بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اُن کی زندگی میں ایک تنظیم تھی۔ تمام عمر لکھتے پڑھتے رہے اور اعلیٰ عہدوں پر فائز رہ کر حُسن و خوبی کے ساتھ اپنے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔

وہ الہ آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ ایران میں ہندستان کے سفیر بنا کر بھیجے گئے۔ مرکزی حکومت کی وزارتِ تعلیم بھی رہے، انہیں راجیہ سبھا کا ممبر چنا گیا۔ متعدد سرکاری و غیر سرکاری اداروں کے اہم رکن تھے۔ اب سے پینتیس چھتیس سال پہلے ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کے سکریٹری تھے۔ رسالہ "ہندوستانی" اُن ہی کی ادارت میں نکلتا تھا۔ اور یہ اکیڈمی ممتاز قلم کاروں کو مدعو کر کے اُن کے تحریری لیکچر کراتی تھی۔

ڈاکٹر تاراچند کی ایک شاندار یادگار قائم ہونی چاہئیے۔ یہ نہ صرف اُردو کے اہلِ علم بلکہ پوری قوم کا فرض ہے کہ وہ اس جلیل القدر ہستی کو ہمیشہ یاد رکھے۔

سیدہ اختر کی وفات

۲/ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو بنگلور میں سیدہ حمیدہ بیگم اختر کا حرکتِ قلب بند ہو جانے سے یکایک انتقال ہوگیا۔ مرحومہ کو پیپٹک السر تھا، اِس کے باوجود وہ صبح سے رات تک اپنے فرائضِ منصبی نہایت تندہی سے انجام دیتی رہتی تھیں۔ بنگلور میں اُن کا اپنا ذاتی لبرٹی تعمیر شدہ ہے، جس کی وہ نگراں تھیں۔ اُن کے گرد مستفیدین کا ایک حلقہ رہتا تھا۔

سیدہ اختر نہایت بیباک اور آتش نوا شاعرہ تھیں۔ جنگِ آزادی میں اُن کا خاص حصہ تھا۔ سیاسی رہنماؤں نے انہیں خطیبۂ ہند مجاہدۂ وطن کا خطاب دیا تھا۔ اُردو کی شاعرات میں بھی وہ ممتاز درجہ رکھتی تھیں۔ اُن کی شاعرانہ صلاحیتوں کا بڑے بڑے سخنوروں نے اعتراف کیا اور انہیں "زہرۂ سخن" کے خطاب سے نوازا۔ غزلیہ شاعری کے علاوہ مرحومہ نے بے شمار قومی و وطنی نظمیں لکھیں۔ وہ مشاعروں میں بلائی جاتی تھیں۔ جلسوں میں تقریر کرنے کے لئے انہیں مدعو کیا جاتا تھا۔ صاحبِ ثروت اور بڑی مخیّر خاتون تھیں۔ سراپا عمل اور جہدِ حیات کا بہترین نمونہ۔

اُن کا قیام مستقلاً بنگلور (میسور) میں تھا۔ بنگلور کی سیاسی، سماجی، ادبی اور شعری زندگی میں وہ ہمیشہ نمایاں رہیں۔ اُن کے نام سے "زہرۂ سخن اکاڈمی" بھی قائم تھی۔ امید کہ بنگلور کے اہلِ علم اُن کے صحیح سوانحِ حیات مرتب کریں گے۔ اور اُن کی نظموں اور غزلوں کا انتخاب بھی شائع کریں گے۔ اِس سے بہتر مرحومہ کی کوئی یادگار نہیں ہو سکتی۔

ادارہ "شاعر" اُن کے پسماندگان سے دلی ہمدردی رکھتا ہے۔ سیدہ اختر کی ناوقت موت سے اُردو زبان اور قوم و ملک کو واقعی نقصان پہنچا ہے۔ (ادارہ)

آہ - سلام مچھلی شہری

(چھپتے چھپتے) ادبی و شعری حلقوں میں اِس اطلاع سے رنج و غم کی ایک زبردست لہر دوڑ گئی کہ ۱۹/ نومبر کو دہلی کے ولنگڈن نرسنگ ہوم میں مشہور شاعر پدم شری سلام مچھلی شہری کا انتقال ہوگیا۔ سلام چند ماہ سے شدید قسم کے یرقان میں مبتلا تھے۔ اُن کے جگر کا نہایت نازک آپریشن کیا گیا تھا۔ آخری تین دن بے ہوش رہے اور اُسی بے ہوشی کے عالم میں داعئ اجل کو لبیک کہا۔ اُن کی عمر ۵۲ سال تھی۔ دلی ریڈیو میں اُردو کے پروڈیوسر تھے۔ پسماندگان میں اُن کی بیوی کے علاوہ تین لڑکیاں اور دو لڑکے ہیں۔



مالک، پرنٹر و پبلشر [illegible] شائع کیا





بانی: علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم

اُردو کا چوالیس سالہ علمی ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

شاعر

بمبئی

نومبر ۷۳ء

جلد —— ۴۴
شمارہ —— ۱۱

مُدیر:
اعجاز صدیقی

مُعاونین:
ھندر ناتھ
ڈاکٹر محمد حسن

مُہتمم
ناظر نعمان صدیقی

زرِ سالانہ —— ۱۴ —— روپے
معاونین سے —— ۲۵ —— روپے
تاعمر خریداری —— ۱۲۵ —— روپے
ممالکِ غیر سے —— ۲۵ —— شلنگ

اِس شمارے میں

فون نمبر —— ۳۵۹۹۰۴

قیمت: ایک روپیہ

—— ترسیلِ زر کا پتہ ——

ماہنامہ شاعر قصر الادب بمبئی ۴۰۰۰۰۸

—— خط و کتابت کا پتہ ——

ماہنامہ شاعر، مکتبہ قصر الادب پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶ بمبئی ۴۰۰۰۰۸



جیتئے

32,50,000 روپے

کے انعامات

ڈاکخانے کے سیونگز بینک کے ذریعے

پہلا انعام 2,50,000 روپے			
دوسرے نمبر کے	3 انعامات	1,00,000	ہر ایک
تیسرے نمبر کے	10 انعامات	50,000	ہر ایک
چوتھے نمبر کے	100 انعامات	10,000	ہر ایک
پانچویں نمبر کے	1,000 انعامات	500	ہر ایک
چھٹے نمبر کے	10,000 انعامات	50	ہر ایک

[illegible]

[illegible]

نیشنل سیونگز کمشنر

[illegible]

فہرست

شاعر بمبئی

نومبر ۱۹۷۳ء

اہلِ اردو کی طرف سے فرقہ پرستی کے تابوت میں آخری کیل

یکجہتی کے روایتی اور مبہم تصور کو بامقصد و معنی خیز بنانے کی اوّلین کوشش

قومی یکجہتی پر اردو اور دیگر ملکی زبانوں کے

ممتاز ادیبوں، دانشوروں، ماہرینِ تعلیم اور مختلف الخیال سیاستدانوں کے عالمانہ و مفکرانہ مضامین

قومی یکجہتی نمبر

ماہنامہ **شاعر** بمبئی کا ضخیم اور مثالی

فروری ۱۹۷۴ء میں پیش کیا جا رہا ہے

موضوعات

۱ قومی یکجہتی کیوں اور کیسے؟
۲ قومی یکجہتی کا سماجی پس منظر
۳ قومی یکجہتی کا سیاسی پس منظر
۴ مذہبی پس منظر میں قومی یکجہتی
۵ قومی یکجہتی میں اکثریت اور اقلیت کا کردار
۶ ہندوستانی تاریخ اور تہذیب کے پس منظر میں قومی یکجہتی
۷ قومی یکجہتی میں زبانوں کا کردار
۸ اردو ادب میں قومی یکجہتی کا تصور
۹ قومی یکجہتی اور سیکولرزم
۱۰ رقص و موسیقی اور دیگر فنونِ لطیفہ کے ذریعہ قومی یکجہتی

اردو کے سیکڑوں ادیبوں، شاعروں، دانشوروں اور صحافیوں کا قومی یکجہتی منشور ان کے دستخطوں کے ساتھ

قومی یکجہتی پر تازہ ترین
نظمیں، افسانے، ڈرامے

بہترین اندازِ پیشکش
اعلیٰ کتابت و طباعت

ضخامت ۳۵۰ صفحات
قیمت چھ روپے

یہ عظیم قومی دستاویز مستقل سالانہ خریداروں کو صرف ۲ روپے میں پیش کی جائیگی

ہر اردو داں کا قومی فریضہ ہے کہ وہ یہ نمبر ضرور خریدے اور دوسروں کو خریدنے کی ترغیب دے

منیجر ماہنامہ **شاعر** مکتبہ قصر الادب پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶، بمبئی ۴۰۰۰۰۸

جریدات

اُردو ـــ دوسری سرکاری زبان

انجمن ترقی اُردو ہند کو آخری فیصلہ کرنا ہے

۱۰-۱۱ نومبر ۱۹۷۳ء کو لکھنؤ میں کل ہند غیر مسلم اُردو مصنفین کانفرنس ہو چکی ہے۔ اور اس کے فوراً بعد لکھنؤ ہی میں ۱۷-۱۸-۱۹ نومبر کو عظیم الشان پیمانہ پر اُردو ایڈیٹرز کانفرنس منعقد ہوئی۔ ان دونوں اہم کانفرنسوں کا سب سے اہم مطالبہ یہی تھا کہ ـــــــ

"اتر پردیش، بہار، مدھیہ پردیش، دلّی، راجستھان اور آندھرا پردیش وغیرہ میں

اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے۔"

یہ مطالبہ اُردو کنونشن بمبئی میں بھی کیا گیا تھا اور اس کی تائید و حمایت دوسری زبانوں کے ممتاز دانشوروں نے کی تھی ـــ اس سے پہلے بھی بے شمار کانفرنسوں اور کنونشنوں میں ذمہ داران اُردو اپنا یہ مطالبہ پیش کرتے رہے ہیں۔ بیس بائیس سال سے اُردو والوں کی زبان پر بس یہی ایک مطالبہ ہے۔ مگر یہ ہونٹوں سے نکل کر ہوا میں گم ہوتا رہا ہے۔ نہ مرکزی حکومت نے کبھی اسے درخورِ اعتنا سمجھا اور نہ ریاستی سرکاروں نے۔ اُردو والوں نے ہر موقع پر محض اپنا یہ مطالبہ دوہرا دینا ہی کافی سمجھا۔ اب یہ مطالبہ ایک مذاق، ایک احساسِ کمتری، ایک شرمندگی اور یوں کہئے کہ ایک لاحاصل خواب بن کر رہ گیا ہے۔ ذمہ دارانِ اُردو اگر اس مطالبہ کو نہیں منوا سکتے، ان میں اقدام کا عزم نہیں ہے، یہ آئین اور قانون کے سہارے آگے نہیں بڑھ سکتے، یہ مخالف اُردو گروہ کے دل میں اپنی بات نہیں اُتار سکتے، اور اسے عوامی رنگ نہیں دے سکتے تو "دوسری سرکاری زبان" کا راگ الاپنا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیں۔ جب یہ مطالبہ لاحاصل ہے تو کانفرنسوں اور کنونشنوں میں اسے رکھنے سے کیا فائدہ ـــ!

چودھری چرن سنگھ نے ایک حالیہ پریس کانفرنس میں صاف طور پر کہہ دیا ہے کہ

"اُردو کو دوسری زبان کا درجہ کسی قیمت پر نہیں دیا جا سکتا کیونکہ ہندوؤں کی اکثریت اس کے خلاف ہے"

گپتا وزارت کے دوران بھی اُتر پردیش میں اُردو کا یہ مطالبہ رد کر دیا گیا تھا۔ شری چودھری چرن سنگھ اور شری کملا پتی ترپاٹھی نے بھی اس مطالبہ کو دلاسوں کی حد سے زیادہ نہ سمجھا۔ اب یو۔پی کے نئے وزیر اعلیٰ شری ہیم وتی نندن بہوگنا کو یہ فیصلہ کرنا ہے۔ موصوف نے اُردو کے سلسلے میں اب تک جو بیانات دئے ہیں وہ بہت امید افزا اور ایسے ہیں جو آج تک یو۔پی کے کسی وزیر اعلیٰ نے نہیں دئے۔ انہوں نے کانگریس ایجنسی مورچہ کی اردو کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا کہ ـــ

"میرے نزدیک کسی ریاست کو دو لسانی قرار دینے سے نہ کوئی قباحت ہے اور نہ انتظامیہ کو کسی قسم کی دشواری ہو سکتی ہے۔
میں اس بات سے بھی خوفزدہ نہیں ہوں کہ اقلیتوں کو ان کے حقوق دینے سے ملک کی اکثریت ناراض ہو جائے گی۔"

خدا کرے شری بہوگنا اپنے اس قول کو اپنے فعل سے سچ کر دکھائیں۔ اگر وہ اپنے اس خیال کو عملی جامہ پہنا سکے تو لسانی فرقہ پرستی کو ختم کرنے والے ملک کے سب سے بڑے رہنما کہلائیں گے۔

کل ہند ... ۱۹۷۴ء ... دسمبر کو دہلی میں بہت بڑے پیمانے پر انجمن ترقی اُردو ہند کی کانفرنس ہو رہی ہے۔ اراکین انجمن اور کانفرنس میں شریک ہونے والے تمام ممتاز و مقتدر ذمہ داران اُردو سے ادارہ "شاعر" درخواست کرتا ہے کہ وہ "اُردو دوسری سرکاری زبان" کے مسئلہ پر سب سے زیادہ غور کریں۔ اب سب سے زیادہ وقت ہیں۔ کانفرنس کے روایتی کارگزاری اور نمائشی پہلوؤں کو بالکل الگ رکھ کر اسی مسئلہ کا آخری فیصلہ کریں۔ ملک میں اُردو پڑھنے والوں کی تعداد بہت بڑھ چکی ہے اور ہندی کے بعد پورے ملک میں اسی زبان کا دوسرا درجہ ہے۔

مقالہ

ڈاکٹر سید حامد حسین،

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی تحریریں

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری اُن یگانۂ روزگار ادیبوں میں سے ہیں جنہوں نے اپنی ایک تصنیف کی بنا پر اُردو ادب کی تاریخ میں اپنا مقام پیدا کر لیا ہے۔ غالب کے دیوان پر ڈاکٹر بجنوری کا وہ مقدمہ جو "محاسنِ کلامِ غالب" کے نام سے چھپا ہے، اُن چند تصانیف میں سے ہے جنہوں نے غالب شناسی کو نیا رنگ و آہنگ بخشا ہے۔ لیکن غالبیات سے اِس کے تعلق سے قطع نظر بھی اِس مقدمے کی اپنی اہمیت ہے۔ بجنوری کا یہ مقدمہ اردو نثر کے اسالیب میں ایک ایسا خوبصورت اضافہ ہے جس میں خطابت کے وزن نے انشا کے حُسن سے پیچ حاصل کیا ہے۔ اِس کے علاوہ اُردو تنقید کی تاریخ میں بھی یہ مقدمہ اُس تاثراتی تنقید کا بیش بہا نمونہ ہے جس میں تعقل کی گرانی کو تخیل سے قوتِ پرواز حاصل ہوئی ہے۔

بھوپال کے سرکاری ریکارڈ کے مطابق بجنوری نے ۱۹۱۸ء میں ۳۱ سال کی عمر میں انتقال کیا تھا۔ بجنوری کی قدیم ترین تصانیف ایم اے او کالج علی گڑھ میں اُن کی طالب علمی کے زمانے کی ملتی ہیں۔ بجنوری نے ۱۹۰۶ء میں بی اے پاس کیا تھا۔ اِس طرح وہ عرصہ جس میں انہوں نے تحریر و تصنیف کا کام کیا وہ مجموعی طور پر بارہ سے پندرہ سال کا ہے اور اس میں ۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۳ء تک کا وہ زمانہ بھی شامل ہے جس میں بجنوری یورپ میں رہے اور برطانیہ اور جرمنی میں قیام کے علاوہ اُنہوں نے یورپ کے دوسرے مقامات کی سیر بھی کی۔ چنانچہ بجنوری نے اپنے پیچھے جو منفرد ادبی سرمایہ چھوڑا وہ ان کی مصروف زندگی اور جوانمرگی کے پیشِ نظر اتنا کم بھی نہیں کہ اُسے درخورِ اعتنا نہ سمجھا جائے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ "محاسنِ کلامِ غالب" کے علاوہ ان کی دیگر تحریرات بے حد کم معروف ہیں۔

بجنوری کی تحریرات کے ابھی تک صرف دو مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ بجنوری کے صاحبزادے محمد فاتح فرخ نے پہلا مجموعہ "باقیاتِ بجنوری" ۱۹۴۲ء میں مکتبہ جامعہ دہلی سے شائع کیا تھا۔ اس میں تین مضامین، ۱۷ مکاتیب اور ۵ منظومات شامل ہیں۔ دوسرا مجموعہ "یادگارِ بجنوری" فاتح فرخ نے ۱۹۴۵ء میں مرتب کر لیا تھا لیکن وہ غالباً ۱۹۵۰ء میں سول اینڈ ملٹری پریس کراچی سے چھپ کر شائع ہوا۔ اس میں بجنوری کے دس مضامین، ۱۱ مکاتیب اور چار منظومات شامل ہیں۔ (آگے ان دو مجموعوں کا حوالہ بالترتیب "باقیات" اور "یادگار" کے ذریعے دیا جائے گا)۔ ان کے علاوہ بجنوری کی بعض دوسری متفرق تحریریں بھی ہیں جو ابھی تک یکجا نہیں کی گئی ہیں۔ بعض مضامین تحریر کرنے کا بجنوری نے منصوبہ بنایا تھا۔ اُن کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا کہ وہ انہیں مکمل کر سکے یا نہیں۔

ان تصانیف میں سے "باقیات" نسبتاً آسانی سے دستیاب ہو جاتی ہے لیکن دوسری تحریرات بہت کم ملتی ہیں۔ اِس لئے اُن کی تفصیل دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔ بجنوری کی تحریرات کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ تصانیف، نثر، مکاتیب

اور منظومات۔

تصانیفِ نثر

۱۔ "بیوی کا انتخاب": یہ مضمون انگریزی کا سے ترجمہ کیا گیا ہے اور بجنوری نے اُس زمانے میں لکھا ہے جب وہ کوئنٹہ میں تھے۔ یہ مضمون "یادگار" میں (ص ۳۸ تا ۴۲) شامل ہے۔

۲۔ "شگوفۂ زندگی": ایک خواب کی شکل میں یہ مختصر مضمون بھی بجنوری کے زمانۂ طالب علمی کی یادگار معلوم ہوتا ہے۔ یہ بھی ترجمہ ہے اور کوئنٹہ کے قیام کے دوران لکھا گیا ہے۔ "یادگار" میں (ص ۱۲۶) شامل ہے۔

۳۔ "بڑھاپا معشوق" یہ مضمون بھی غالباً ترجمہ ہے اور علی گڑھ میں لکھا گیا ہے۔ "یادگار" میں (ص ۴۴-۴۵) شامل کیا گیا ہے۔

۴۔ "مسئلۂ ارتقا اور مسئلۂ کون"۔ یہ مضمون علی گڑھ کی انجمن اُردوئے معلّٰی میں پڑھا گیا تھا اور پھر علی گڑھ منتھلی فروری ۱۹۰۷ء میں چھپا۔ یہ مضمون بھی "یادگار" میں (ص ۴۶ تا ۶۰) دوبارہ شائع ہوا اور علی گڑھ میگزین کے انتخاب نمبر (حصۂ نثر) ۱۹۷۱ء میں (ص ۳۳۶ تا ۳۴۸) بھی شامل ہے۔

۵۔ "مآخذ مذہب کی تحقیق"۔ یہ علی گڑھ منتھلی بابت مارچ و اپریل ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا اور بعد میں "یادگار" میں (ص ۱۱۳ تا ۱۲۵) چھپا۔

۶۔ "میل جول"۔ یہ مختصر مضمون بھی "یادگار" میں (ص ۱۰۱ تا ۱۰۳) شامل ہے۔ اسے بجنوری نے بی اے کر لینے کے بعد تحریر کیا تھا۔

۷۔ "لندن"۔ اس موضوع پر یہ مضمون "یادگار" میں (ص ۱۰۴ تا ۱۱۲) شائع کیا گیا ہے۔

۸۔ "مجوزہ مسلم یونیورسٹی"۔ یہ کتابچہ ۱۹۱۵ء میں بجنوری نے شمس المطابع مراد آباد سے چھپوا کر شائع کروایا۔ اس میں مسلم یونیورسٹی کے مسودہ ایکٹ، اسٹیچوٹ، ریگولیشنز وغیرہ پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ یہ تحریر بجنوری نے جولائی ۱۹۱۲ء میں جرمنی کے قیام کے دوران مکمل کر کے ہندوستان روانہ کر دی تھی۔ لیکن اس پر بحث کا موقع نہ آیا۔ ہندوستان واپسی پر بجنوری نے نواب مشتاق حسین وقارالملک کے ایماء پر اس کو شائع کیا۔

۹۔ "مذہب و علم"۔ اس مضمون کے بارے میں بجنوری نے آصف علی بیرسٹر کو ۱۷ر جنوری ۱۹۱۶ء کے ایک خط میں تحریر کیا ہے کہ وہ لکھنؤ کے رسالے "معلومات" میں چھپا تھا۔ (یادگار۔ ص ۱۳۳)

۱۰۔ "گیتان جلی"۔ یہ مضمون "باقیات" میں (ص ۱ تا ۱۷) شامل ہے۔ یہ ٹیگور کی شہرہ آفاق تصنیف کے اُردو ترجمے پر ایک ریویو ہے جسے بجنوری نے مارچ ۱۹۱۶ء میں مکمل کر لیا تھا۔ (ملاحظہ ہو مکتوب بنام آصف علی بیرسٹر مورخہ ۹ر مارچ ۱۹۱۶ء۔ یادگار۔ ص ۱۳۷)

۱۱۔ "ہندو یونیورسٹی ایکٹ اور مجوزہ مسلم یونیورسٹی"۔ ۱۹۱۶ء میں یہ کتابچہ بجنوری نے مطبع مفید عام آگرہ سے چھپوا کر شائع کیا۔ اس میں ہندو یونیورسٹی ایکٹ کی خامیوں کی جانب نشاندہی کے ساتھ ساتھ مسلم یونیورسٹی کی حدود کو بھی واضح کیا گیا ہے اور قوانین و ضوابط کا تفصیلی خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ مارچ ۱۹۱۶ء میں بجنوری اس کتابچے کی تکمیل میں مصروف تھے۔ (ملاحظہ فرمایئے مکتوب مورخہ ۲۰ر مارچ ۱۹۱۶ء بنام آصف علی بیرسٹر۔ یادگار۔ ص ۱۳۹)

۱۲۔ "اُردو زبان کی ترقی کے متعلق چند خیالات"۔ یہ مضمون مولوی عبدالحق کی فرمائش پر بجنوری نے انجمن ترقی اردو کے

آخر ہفتہ ۱۹۱۹ء میں لکھنؤ میں منعقد ہونے والے سالانہ اجلاس میں پڑھنے کے لئے لکھا تھا۔ لیکن مضمون ڈاک کی غلطی سے وقت پر نہ پہنچا اور اسے انجمن ترقی اُردو کے رسالے "اُردو" میں ۱۹۲۱ء میں شائع کیا گیا۔ یہ مضمون "یادگار" [illegible] (ص ۱ تا ۲۷) شامل ہے۔

[illegible] وضعِ اصطلاحاتِ علمیہ"۔ اِس موضوع پر ایک مضمون "باقیات" میں (ص ۱۸ تا ۴۵) شامل ہے۔ اِسمیں بجنوری نے اُردو میں جدید علمی مصطلحات تیار کرنے کے سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

۱۴۔ "خواب"۔ برگساں کے مضمون کا یہ ترجمہ بجنوری نے جولائی ۱۹۱۷ء میں مکمل کر لیا تھا۔ (مکتوب بنام مولوی عبدالحق مورخہ ۲۷ جولائی ۱۹۱۷ء۔ نقوش مکاتیب نمبر۔ جلد دوم۔ ص ۵۸) یہ مضمون انجمن ترقی اردو کے رسالے "سائنس" میں جنوری ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا۔ وہاں سے "یادگار" میں (ص ۶۱ تا ۹۰) نقل ہوا۔

۱۵۔ "سیرِ لکھنؤ"۔ "باقیات" میں (ص ۴۶ تا ۵۲) شامل اِس مضمون میں وزیران و شاہانِ اودھ کی دس تصاویر پر تاثرات کا اظہار ہے۔

۱۶۔ "حالی"۔ یہ مضمون "یادگار" میں (ص ۸۹ تا ۹۹) شائع کیا گیا ہے اور خواجہ الطاف حسین حالی کو ایک خراجِ عقیدت ہے۔

۱۷۔ "قانونِ تعلیمِ جبریہ شہر بھوپال"۔ ۱۹۱۶ء میں بجنوری بھوپال ریاست کے مشیرِ تعلیم کی حیثیت سے آئے تھے اور اُنہوں نے شہر میں جبری تعلیم کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس کو ایک قانون کی شکل دے کر ریاست کے غیر معمولی گزٹ مورخہ یکم جنوری ۱۹۱۸ء میں (ص ۲۸ تا ۴۳) شائع کیا گیا۔

۱۸۔ "مقدمۂ دیوانِ غالب"۔ یہ مقدمہ جو کہ ڈاکٹر بجنوری کی لازوال شہرت کا سرچشمہ ہے۔ اُنہوں نے غالب کے اُس دیوان کے لئے لکھا تھا جو کہ انجمن ترقی اردو شائع کرنا چاہتی تھی۔ انجمن کا یہ منصوبہ تھا کہ وہ دیوانِ غالب کا ایک ایسا مستند نسخہ شائع کرے جو کہ اغلاط سے پاک ہو اور جس میں غالب کا ایسا کلام بھی شامل ہو جو متداول مطبوعہ نسخوں میں شامل نہیں ہے۔ دیوان کے ساتھ ہی غالب کی زندگی اور شاعری پر اردو کے نامور اہلِ قلم سے مضامین لکھوا کر شائع کرنے کا بھی ارادہ تھا۔ دیوان سید ہاشمی ترتیب دے رہے تھے اور مضامین کے لئے نواب سعید الدین خاں طالب، نظم طباطبائی، وحشت کلکتوی، شبلی نعمانی، ڈاکٹر اقبال، وحید الدین سلیم، عبدالحلیم شرر، حسرت موہانی، عبدالحق اور مولانا حالی سے درخواست کی گئی تھی۔ لیکن سوائے وحشت کلکتوی کے کسی نے بھی مضمون روانہ نہیں کیا۔ ۱۹۱۵ء تک دیوان تیار ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر بجنوری کو جب اس کے بارے میں علم ہوا تو اُنہوں نے اس میں اپنی گہری دلچسپی کا اظہار کیا اور اُس پر مقدمہ تحریر کرنے کی ذمے داری بھی قبول کی۔ جنوری ۱۹۱۶ء میں اُنہوں نے اپنے ایک خط میں تحریر کیا کہ وہ ایک مضمون بحیثیت تقریظ کلامِ غالب پر لکھنا چاہتے ہیں۔ (یادگار ص ۱۳۲ و ۱۳۳)۔ اسی سال کے آخر میں مولوی عبدالحق نے انجمن کی سالانہ رپورٹ میں لکھا کہ بجنوری اپنا مقدمہ تحریر کر رہے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مقدمہ ۱۹۱۶ء کے بعد بھوپال کے قیام کے دوران ہی مکمل ہوا۔ مولوی عبدالحق کے نام ۲۷ جولائی ۱۹۱۷ء کو تحریر کئے گئے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ بجنوری دیوان کو چھپوانے کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے تھے۔ (نقوش۔ مکاتیب نمبر جلد دوم۔ ص ۵۸)۔ خیال ہوتا ہے کہ اسی زمانے میں بجنوری نے اپنا مقدمہ بھی مکمل کر لیا ہوگا۔ اگست ۱۹۱۸ء میں بھوپال کے سرکاری کتب خانے میں دیوانِ غالب کا ایک ایسا خطی نسخہ دریافت ہوا جس میں غالب کا محذوف کلام کافی مقدار میں موجود تھا۔ چنانچہ بجنوری نے اس خطی دیوان کی اشاعت کے منصوبے تیار کرنا شروع کر دیے۔ لیکن نومبر ۱۹۱۸ء میں ان کی وفات نے اس منصوبے کو پایۂ تکمیل نہ پہنچنے دیا۔

دیوان غالب پر بجنوری نے جو مقدمہ تیار کیا تھا اُس کی ایک نقل وہ انجمن ترقی اُردو کو غالباً پہلے ہی روانہ کر چکے تھے چنانچہ بجنوری کے انتقال کے بعد جب غالب کے خطی دیوان کی اشاعت کا کام بجائے انجمن کے ریاست بھوپال نے خود سنبھال لیا تو انجمن نے اپنے سہ ماہی رسالے "اردو" کے پہلے ہی شمارے (بابت جنوری ۱۹۲۱ء) میں اُس کو شائع کر دیا۔ اور اسی سال "محاسنِ کلام غالب" کے عنوان سے اسے علیحدہ کتابی شکل میں بھی چھاپ دیا۔ ۱۹۲۱ء ہی میں خطی دیوان اور متداول دیوان کو شامل کر کے بھوپال سے "دیوان غالب جدید المعروف بہ نسخۂ حمیدیہ" مفتی محمد انوار الحق نے شائع کیا۔ کیونکہ غالباً بجنوری اپنے مقدمے کو غالب کے دیوان کے ساتھ شامل کرنا چاہتے تھے اس لئے مفتی انوار الحق نے نسخۂ حمیدیہ کے ساتھ اس مقدمے کو بھی شائع کیا۔ لیکن نسخۂ حمیدیہ اور انجمن کے ذریعے مطبوعہ مقدموں کے متن میں بعض اختلافات ہیں۔ انجمن کا متن "نسخۂ حمیدیہ" کے متن سے طویل ہے۔ انجمن کے محاسنِ کلام غالب میں (اُس کے چھٹے ایڈیشن کو مدنظر رکھتے ہوئے) ۱۰ صفحے زیادہ ہیں۔ اس کے علاوہ بعض دوسرے جزوی اختلافات بھی ہیں۔

دیگر زبانوں میں تصانیف

۱۔ تحقیقی مقالہ: بجنوری نے جرمنی کی فرائی برش (بادن) یونیورسٹی میں اسلامی قانون کے مآخذ پر تحقیقی کام کیا تھا جس پر اُنہیں ڈی۔ اچ کی ڈگری دی گئی تھی۔ جرمنی زبان میں بجنوری کا یہ تحقیقی مقالہ ۱۹۱۴ء میں EINE KRITISCHE PRUFUNG DER QUELLEN DES ISLAMITISCHEN RECHTS — کے عنوان سے آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے شائع کیا تھا۔

۲۔ ایسٹ اینڈ ویسٹ کے مضامین: بجنوری نے انگریزی زبان میں بھی چند مضامین تحریر کئے جو کہ انگریزی رسالہ ایسٹ اینڈ ویسٹ میں شائع ہوئے تھے۔ ان میں سرویہ کی شاعری اقبال اور بہائی ازم پر ان کے مضامین شامل تھے۔

۳۔ "اسرار و رموز": اگست ۱۹۳۱ء کے ایسٹ اینڈ ویسٹ میں ڈاکٹر بجنوری کا، اقبال کی مثنویوں "اسرار خودی" اور "رموز بیخودی" پر تبصرہ شائع ہوا تھا جس کے بارے میں خود اقبال نے کہا تھا کہ "وہ نہایت قابلیت سے لکھا ہے"۔ اس مضمون کا ترجمہ جناب مالک رام نے "نیرنگ خیال" (لاہور) کے اقبال نمبر ۱۹۳۲ء میں شامل کیا تھا۔

۴۔ ترجمۂ قرآن پاک: یورپ سے واپسی کے بعد بجنوری نے کچھ عرصہ مرادآباد میں وکالت کی۔ کہا جاتا ہے کہ اُسی زمانے میں انہوں نے قرآن پاک کا جرمنی میں ترجمہ کیا تھا۔ (محمد قاسم صدیقی: "پہلا غالب پرست"۔ شبستان اردو ڈائجسٹ، غالب نمبر ۱۹۶۹ء، ص ۴۵)۔

نامکمل تصانیف

۱۔ دیوان غالب: انجمن ترقی اردو غالب کا جو دیوان شائع کرنا چاہتی تھی، اسے سید ہاشمی نے مرتب کیا تھا۔ لیکن مطبع نظامی سے ۱۹۱۵ء میں دیوان غالب کا نفیس ایڈیشن شائع ہو جانے کے بعد اس دیوان کی اشاعت کے لئے انجمن کے کارکنان میں اتنی سرگرمی نہ رہی۔ لیکن بجنوری نے اس دیوان کی اشاعت پر زور دیا اور اس پر مقدمہ لکھنے کی پیش کش کی۔ بجنوری نے دیوان پر بھی نظر ڈالی اور سید ہاشمی نے جو حیثیت اول کلام شامل کیا تھا اس کی غالب سے نسبت کے بارے میں بجنوری نے خاص طور پر چھان بین شروع کی۔ دیوان کی تکمیل کے بعد بجنوری اس کی خوبصورت طباعت کی جانب متوجہ ہوئے۔ اس دوران انہوں نے مولوی عبدالحق کو جو خط لکھے اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دیوان کی طباعت بلاک کے ذریعے کروانا چاہتے تھے اور دیوان کو مناسب تصاویر سے بھی مزین کرنے کا ان کا ارادہ تھا۔ جنگ کی وجہ سے اچھے کاغذ کی کمیابی اور اچھے پریس کی تلاش

کی وجہ سے اس دیوان کی طباعت میں تاخیر ہوتی رہی یہاں تک کہ بھوپال میں دیوان غالب کا خطی نسخہ دریافت ہوا۔ جس کی وجہ سے بجنوری کے منصوبوں نے ایک نیا رُخ اختیار کر لیا۔

۲۔ "نسخۂ حمیدیہ": بجنوری عام طور پر "نسخۂ حمیدیہ" کے مرتب کی حیثیت سے معروف ہیں لیکن یہ بات غلط فہمی پر مبنی ہے۔ نسخۂ حمیدیہ کے مرتب مفتی انوار الحق تھے اور انہوں نے غالب کا جو دیوان شائع کیا وہ بجنوری کے اپنے منصوبوں سے یکسر مختلف تھا۔ اگست ۱۹۱۸ء میں جب غالب کا خطی دیوان بھوپال میں دریافت ہوا تو بجنوری اس کو اس طرح طبع کرانا چاہتے تھے کہ کتاب کے ایک صفحے پر قلمی نسخے کے اشعار ہوں اور مقابل کے صفحے پر متداول دیوان کی وہی غزلیں جن کے اشعار جا بجا سے غالب نے خارج کر دئے تھے مگر اس قلمی نسخے میں محفوظ رہ گئے تھے۔ اگر کوئی غزل مطبوعہ یا قلمی کسی ایک دیوان میں موجود تھی مگر دوسرے میں نہ تھی تو اس کے سامنے کا صفحہ سادہ چھوڑ دیا جاتا۔ تاکہ قدیم و جدید کلام اور اصلاح و تنسیخ کا حال بلا دقت معلوم ہو جائے۔ اس نہج پر بجنوری نے دیوان کی کتابت کا کام شروع بھی کرا دیا تھا۔ اس نسخے کے آخر میں وہ قلمی دیوان کا عکس بھی شامل کرنا چاہتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ بعض اشعار کی تشریح کے لئے چابکدست مصوروں سے انہوں نے تصویروں کی بھی فرمائش کی تھی۔ علاوہ ازیں انہیں بعض ایسے نوادر اور فوٹوگرافس کی بھی تلاش تھی جنہیں دیوان کے ساتھ شائع کیا جا سکتا۔ ایک ایسی ہی چیز جو بجنوری کو ملی وہ خود غالب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے اپنے حالات تھے جو انہوں نے کسی تذکرہ نویس کی فرمائش پر لکھے تھے۔ مزید چیزوں کے لئے شعیب قریشی کوشاں تھے۔ لیکن خطی دیوان کے دریافت ہونے کے تین ماہ بعد ہی بجنوری کا انتقال ہو گیا اور ان کے ساتھ یہ سارے منصوبے بھی ختم ہو گئے۔ بعد میں مفتی انوار الحق نے "نسخۂ حمیدیہ" کے نام سے جو دیوان شائع کیا وہ بجنوری کے منصوبوں سے بالکل مختلف تھا۔

۳۔ "مقامات مان ٹسکو": بجنوری کے ذریعے کیا گیا مان ٹسکو کے مضامین کا یہ ترجمہ انجمن ترقی اردو ۱۹۱۸ء میں شائع کرنا چاہتی تھی۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ بجنوری نے ترجمہ مکمل کر لیا تھا یا نہیں۔

۴۔ "ہمارا ملک": اس عنوان سے ایک کتاب انجمن ترقی اردو ترتیب دینا چاہتی تھی۔ اس کے لئے مختلف لوگوں نے الگ الگ موضوعات پر مضامین لکھنے کے وعدے کئے تھے۔ بجنوری نے اس کتاب کے لئے باب "تعلیم" پر لکھنے کے واسطے آمادگی ظاہر کی تھی۔

۵۔ ارتقاء: اس موضوع پر بجنوری ایک کتاب لکھ رہے تھے۔ اس کا خاکہ انہوں نے یورپ کے بعض اچھے سائنسدانوں کے پاس رائے کے لئے بھیجا تھا۔ انہوں نے اس کو پسند کیا تھا اور اسی خاکے پر بجنوری نے یہ کتاب لکھنا شروع کر دی تھی۔

مکاتیب

۱۔ "باقیات" میں بجنوری کے جو مکاتیب شامل ہیں ان میں سے آٹھ ان کے والد کے نام، چار ان کے بھائی کے نام (ان میں ایک طویل خط "داشتہ آید بکار" بھی شامل ہے)، ایک ان کی بہن کے نام، ایک غالباً ان کے بہنوئی بدر الدین صاحب کے نام، ایک محسن صاحب کے نام ہیں۔ ایک خط کے مکتوب الیہ کا پتہ نہیں چلتا۔ والد صاحب کے نام خطوط سے بجنوری کے قیام یورپ کے حالات اور بالخصوص ترکی کی سیر کے دوران بجنوری کے تاثرات کا اظہار ہوتا ہے۔

۲۔ "یادگار" میں دس خط آصف علی بیرسٹر اور ایک خط مولوی عبدالحق کے نام ملتا ہے۔ آصف علی بیرسٹر کو لکھے گئے خطوط میں سے بعض میں خود بجنوری کی بعض تصانیف کے بارے میں کچھ مفید اشارے ملتے ہیں۔

۳۔ "نقوش" مکاتیب نمبر جلد دوم میں مولوی عبدالحق کے نام تین خطوط شامل ہیں جو کہ انجمن کے ذریعے مرتبہ دیوان غالب کی اشاعت اور اردو میں علمی اصطلاحات کی تیاری کے مسائل سے بحث کرتے ہیں۔

۴۔ "نیا دور" (لکھنؤ) کے اگست ۱۹۷۱ء میں ڈاکٹر اختر اورینوی نے بجنوری کے دو خطوط کا متن شائع کیا ہے۔ ان میں سے ایک شعیب قریشی کے نام ہے۔ اس خط کے ایک حصے کا عکس انجمن ترقی اردو کے شائع کئے ہوئے "محاسن کلام غالب" میں شامل ہے۔ دوسرا خط مولوی عبدالحق کے نام ہے۔ اس خط کا بھی اقتباس مولانا خیر بہوروی نے اپنے مضمون "کچھ رنگین تصویریں" بکلا میں مطبوعہ "شاعر" (بمبئی)، غالب نمبر ۱۹۶۹ء میں شامل کیا تھا۔

۵۔ غیر مطبوعہ خطوط۔ بجنوری کے دو غیر مطبوعہ خطوط جو ۲۱ر اگست ۱۹۱۷ء اور ۱۱ر ستمبر ۱۹۱۷ء کو والد صاحب کے نام لکھے گئے تھے راقم الحروف نے بجنوری کے بھانجے جناب محمد قاسم صدیقی کے پاس دیکھے ہیں۔ قاسم صاحب فرماتے ہیں کہ بجنوری کے بعض عزیزوں کے پاس اور بھی کئی ایسے خطوط موجود ہیں جو ابھی غیر مطبوعہ ہیں۔

منظومات

بجنوری کی منظومات جدید اردو شاعری میں ایک اہم تاریخی مقام رکھتی ہیں۔ حالانکہ ان کی تعداد اتنی کم ہے کہ ان کی بنا پر بجنوری کو بڑے شعرا کی صف میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ پھر بھی ان میں تخیل کی جو تازگی اور ہیئت میں جو جدت طرازیاں نظر آتی ہیں وہ اردو شاعری میں جدید رجحانات کے ابتدائی نقوش مہیا کرتی ہیں۔

۱۔ "صبح بنارس"۔ ۱۲ مصرعوں کی یہ مختصر نظم جوگی کی صدا کی شکل میں ہے اور "باقیات" میں شامل ہے۔ (ص ۲۲۳)

۲۔ "نیچے اور بڑے"۔ یہ اندلسی گیت جو کہ چھوٹی بحر کے آٹھ شعروں پر مشتمل ہے "باقیات" میں ملتا ہے (ص ۲۲۳ و ۲۲۴)۔

۳۔ "اجنبی"۔ ۱۹۱۴ء میں لکھی ہوئی یہ نظم لمبی بحر کے ۹ مصرعوں میں کہی گئی ہے جو کہ تین تین مصرعوں کے تین بندوں میں منقسم ہے۔ "باقیات" (ص ۲۲۴)

۴۔ "عالم الملکوت"۔ یہ طویل نظم "باقیات" ص ۲۲۵ سے ۲۲۷ تک پھیلی ہوئی ہے۔

۵۔ "قارون"۔ اس عنوان سے تین شعر باقیات میں ص ۲۲۸ پر درج ہیں

۶۔ "یادِ گل"۔ یہ تین شعر جو کہ جاپانی سے ترجمہ ہیں، بجنوری کے انتقال کے بعد "نیرنگ خیال" کے عید نمبر بابت ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئے۔ بعد میں یہ "باقیات" کے ص ۲۲۸ اور "سوغات" (جدید نظم نمبر) ص ۱۳۱ میں شامل کئے گئے۔

۷۔ "ہندوستان"۔ یہ تین شعر "باقیات" میں ص ۲۲۹ پر مندرج ہیں۔

۸۔ "تمنا"۔ یہ دو شعر "نیرنگ خیال" اگست ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئے تھے۔ بعد میں "باقیات" ص ۲۲۹ اور "سوغات" (جدید نظم نمبر) ص ۱۳۱ میں شامل کئے گئے۔

۹۔ "گیتان جلی" کا ترجمہ۔ غیر مقفی اشعار میں ٹیگور کے کچھ کلام کا بجنوری نے ترجمہ کیا تھا۔ ان میں سے تین شعر باقیات میں ص ۲۳۹ و ۲۴۰ پر درج ہیں۔ ۲۲ شعر اور ایک مصرع "یادگار" میں ص ۱۵۰ تا ۱۵۲ پر نقل کیا گیا ہے۔ بجنوری نے "گیتانجلی" کے اردو ترجمے پر ایک طویل ریویو لکھا تھا جو کہ "باقیات" میں (ص ۱۶۱ تا ۱۷۱) شامل ہے۔ اس کے بارے میں تحریر کرتے ہوئے بجنوری نے آصف علی صاحب بیرسٹر کو لکھا ہے: "میں چاہتا ہوں کہ کوئی شخص ٹیگور کے جملہ کلام کو نثر اردو میں ترجمہ کر دے۔ مجھ سے نہیں ہوتا اور ارادہ ترک کر دیا ہے۔ اتنا ترجمہ جو نظم معریٰ میں شروع کیا تھا وہ بھی مجھے غایت ناپسند تھا اور ایک ہفتہ ہوا میں نے چند اشعار بچا کر حوالۂ آتش کر دیا۔ جو اشعار بچا لئے تھے وہ ریویو میں درج کر دیئے ہیں۔" (یادگار ص ۲۷۔ مکتوب مورخہ ۹ر مارچ ۱۹۱۶ء)

۱۰۔ "موسیقی"۔ اس عنوان کے چار اشعار "باقیات" میں (ص ۲۴۰ پر) نقل کئے گئے ہیں۔

۱۱۔ "مجذوب" ۔ یہ دو شعر بھی "باقیات" (ص ۲۴۰) میں ملتے ہیں۔
۱۲۔ "نا امید" ۔ غزل کے یہ چار شعر "باقیات" (ص ۱۴۳) میں منتقل کیے گئے ہیں۔
۱۳۔ "شمع و پروانہ" ۔ اس عنوان سے چھ شعر "یادگار" (ص ۱۴۸) میں شامل کیے گئے ہیں۔ لیکن ان میں سے پہلے دو شعر "باقیات" (ص ۲۴۱) میں بھی موجود ہیں۔
۱۴۔ "بندے ماترم" ۔ یہ پانچ چھوٹے مصرعے "باقیات" (ص ۲۴۱) میں مندرج ہیں۔
۱۵۔ "ترکی قومی گیت" ۔ ۱۲ شعر کا چھوٹی بحر میں یہ گیت چھ بندوں میں منقسم ہے جن میں مصرع دوم اور مصرع چہارم ہم قافیہ ہیں۔
۱۶۔ "نٹ راجا" ۔ بجنوری کی یہ مشہور نظم پہلے انجمن ترقی اردو کے رسالے "اردو" کے جنوری ۱۹۲۹ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ بعد میں اسے "یادگار" (ص ۱۴۶ و ۱۴۷) اور "مسوفات" کے "جدید نظم نمبر" (ص ۱۲۹) میں بھی نقل کیا گیا۔ ۸ بندوں کی اس نظم میں یہ التزام رکھا گیا ہے کہ چار شعر کے بند میں پہلے اور آخری مصرعے طویل اور ہم قافیہ ہیں جبکہ درمیانی دونوں مصرعے مختصر اور ہم قافیہ ہیں۔
۱۷۔ "قانونِ فنا" ۔ یہ نظم "یادگار" (ص ۱۴۹) میں نقل کی گئی ہے۔

(نوٹ: ڈاکٹر بجنوری کی زندگی پر راقم الحروف کا مضمون "تحریر" (دہلی) جنوری، مارچ ۱۹۷۳ء میں اور "دیوان غالب اور ڈاکٹر بجنوری" کے عنوان سے ایک اور مضمون "شاعر" اپریل ۱۹۷۱ء میں ملاحظہ فرمائیں۔)

جگن ناتھ آزاد (سرینگر)

کل اور آج

کبھی وہ دن بھی تھے اے زندگی! کہ جب میرا
نفس نفس تھا نسیمِ بہار کی مانند

دمکتے رہتے تھے افکارِ نو مرے سر میں
ضیائے برقِ سرِ کوہسار کی مانند

مرے مجلۂ تخیل کا ہر ایک ورق!
چمک میں تھا ورقِ زرنگار کی مانند

یہ دن بھی دیکھ رہی ہے کہ سانس سانس مرا
دھوئیں کی طرح ہے گرد و غبار کی مانند

تری نگاہ میں کچھ بھی سہی، پر اپنے لئے
ہوں مشتِ خاکِ سرِ رہگذار کی مانند

مثالِ جوئے کہستاں کبھی تڑپتا ہوں!
کبھی خموش ہوں شمعِ مزار کی مانند

دیا سلائی کی صورت بھڑکتا رہتا ہوں
سلگتا رہتا ہوں اپنے سگار کی مانند

فصیح اکمل قادری (شاہجہانپور)

آتشیں دیار کا دِل

تم اس زمین کے زخموں کی سمت مت دیکھو
مسافروں کو گھنی چھاؤں ہے بڑی نعمت
یہ سبزہ زار بھی شعلے اُگلنے والے ہیں
یہ چند پھول، یہ جھاڑی کی اوٹ، یہ سایہ
یہ کل تلاش کروگے تو خون رو دوگے

تمہارے واسطے میں اجنبی سہی لیکن
تم اس زمین کے زخموں کی سمت مت دیکھو
میں اپنے دل کو ہتھیلی پہ رکھ کے پھرتا ہوں
جو ہو سکے تو ذرا غور سے اِسے دیکھو

یہ میری بیوی کا چہرہ، یہ میرے بھائی کے ہاتھ
یہ میرے باپ کا سینہ، یہ میرے بیٹے کا سر
یہ دھان کی فصل یہ شعلوں کا رقصِ آوارہ
یہ ریپ کیس کا منظر یہ چیختے بچے
دھواں دھواں سا یہ منظر یہ سُلگی سُلگی شام
یہ ایک قطرۂ خوں جو دکھائی دیتا ہے
ہر ایک گھر سے یہ سیلاب بن کے اُبلا تھا
زمیں تو پہلے ہی سیراب ہو چکی تھی بہت
یہ خون دل کے پیالے میں بھر لیا میں نے
کہ اس زمین کی تاریخ لکھنے والوں کو
یہ روشنی کی کرن بھی ہے روشنائی بھی
نہ جانے بچ گیا میں کیسے، سخت حیرت ہے
کہ زندہ رہنے کے امکان مٹ چکے ہیں یہاں
یہاں بجو رات کو سورج طلوع ہوتے ہیں
وہ اپنی کرنوں سے یہ بستیاں جھلستے ہیں
مری بھی سانس اُکھڑنے لگی ہے اب دیکھو
یہ میرا دل ہے اِسے اپنے ساتھ لیجاؤ
کسی کتاب کا عنواں اِسے بنا دینا
نئے سماج کے ماتھے پہ یا سجا دینا۔

موہن راکیش
ترجمہ: سلام بن رزاق

پرماتما کا کتا

آزادی کے بعد ہندی کہانی میں جو تین چار نام لئے جا سکتے ہیں یہ وہ ہیں جنہوں نے ہندی کہانی کو نئی جہتیں عطا کیں اور اُسے پر وقار بنایا۔ اُن میں موہن راکیش کا نام بہت اہم ہے۔ بلکہ بعض خصوصیات کی بنا پر انہیں جدید ہندی کہانی کا امام کہا جا سکتا ہے۔

افسوس کہ عین اُس وقت جب موہن راکیش کا قلم ہندی کہانی میں نئے امکانات کی سمتیں متعین کر رہا تھا۔ موت کے ظالم ہاتھوں نے انہیں ہم سے جدا کر دیا۔

موہن راکیش کی بے وقت موت نہ صرف ہندی کہانی بلکہ ہندوستانی ادب و کلچر کا نا قابلِ تلافی نقصان ہے۔

زیرِ نظر کہانی "پرماتما کا کتا" تقسیم کے بعد لکھی گئی اُن کی ایک طنزیہ کہانی ہے جس میں "دفتر شاہی" کے روایتی نظام پر ایک کھلی چوٹ ہے۔

یہ کہانی ہیئت کے لحاظ سے کچھ پرانی ضرور ہے۔ مگر موضوع اور مواد کے اعتبار سے آج بھی اُس کی تازگی اور نشتریت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ کیونکہ ہمارے سرکاری دفاتر کی رفتار جو پہلے تھی سو آج بھی ہے بلکہ بے ایمانی، رشوت خوری اور افراتفری میں کچھ اضافہ ہی ہوا ہے۔

(سلام بن رزاق)

بہت سے لوگ یہاں وہاں مُنہ لٹکائے بیٹھے تھے، جیسے کسی کا ماتم کرنے آئے ہوں۔ کچھ لوگ اپنی پوٹلیاں کھول کر کھانا کھا رہے تھے۔ دو ایک پگڑیاں سر کے نیچے رکھ کر کمپاؤنڈ کے باہر سڑک کے کنارے پسر گئے تھے۔ چھولے، کُلچے والے کا دھندا گرم تھا۔ اور کمیٹی کے نل کے پاس ایک چھوٹا موٹا کیو لگا تھا۔ نل کے پاس کرسی ڈال کر بیٹھا عرضی نویس دھڑا دھڑ عرضیاں ٹائپ کر رہا تھا۔ اُس کے ماتھے سے پسینہ بہہ بہہ کر اُس کے ہونٹوں پر آ رہا تھا۔ لیکن اُسے پونچھنے کی فرصت نہیں تھی۔ سفید داڑھیوں والے دو تین لمبے لمبے جاٹ اپنی لاٹھیوں پر جھکے ہوئے اُس کے خالی ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ دھوپ سے بچنے کے لئے عرضی نویس نے جو ٹاٹ کا پردہ لگا رکھا تھا۔ وہ ہوا سے اُڑا جا رہا تھا۔ تھوڑی دور مونڈھے پر بیٹھا اُس کا لڑکا انگریزی پرائمر کو رٹ رہا تھا۔ سی، اے، ٹی، کیٹ۔ کیٹ معنی بلی، بی، اے، ٹی، بیٹ۔ بیٹ معنی بلاّ۔ ایف۔ اے۔ ٹی۔ فیٹ، فیٹ معنی موٹا۔۔۔۔ قمیضوں کے نصف بٹن کھولے اور بغل میں فائلیں دبائے کچھ بابو ایک دوسرے سے چھیڑ خانی کرتے رجسٹر برانچ سے ریکارڈ برانچ کی طرف جا رہے تھے۔ سرخ بیلٹ والا چپراسی، آس پاس کی بھیڑ سے بے نیاز اپنے اسٹول پر بیٹھا دل ہی دل میں کچھ حساب کر رہا تھا۔ کبھی اُس کے ہونٹ ہلتے تھے اور کبھی سر ہل جاتا تھا۔ سارے کمپاؤنڈ میں ستمبر کی کھلی دھوپ پھیلی

تھی۔ چیونٹیوں کی کچھ ٹولیاں دیوار سے کمرے کے فرش اور پھر اوپر چڑھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اور کئی بڑے بڑے کمرے کے بیچ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چہل قدمی کر رہے تھے۔ ایک ستر پچھتر سال کی بڑھیا جس کا سر کانپ رہا تھا۔ اور چہرہ بے شمار جھریوں سے اٹا ہوا تھا، لوگوں سے پوچھ رہی تھی کہ وہ اپنے لڑکے کے مرنے کے بعد اُس کے نام الاٹ ہوئی زمین کی حقدار ہو جاتی ہے یا نہیں۔ اندر ہال میں فائلیں دھیرے دھیرے رینگ رہی تھیں۔ دو چار بابو درمیان کی میز کے پاس جمع ہو کر چائے پی رہے تھے۔ اُن میں سے ایک دفتری کاغذ پر لکھی اپنی تازہ غزل دوستوں کو سنا رہا تھا۔ اور دوست اس یقین کے ساتھ سُن رہے تھے کہ وہ ضرور اُس نے "شمع" یا "بیسویں صدی" جیسے کسی رسالے کے پرانے شمارے سے اڑائی ہے۔

"عزیز صاحب! یہ اشعار آپ نے آج ہی کہے ہیں، یا پہلے کے کہے ہوئے اشعار آج اچانک یاد آ گئے ہیں؟" سانولے چہرے اور گھنی مونچھوں والے ایک بابو نے بائیں آنکھ کو ذرا سا دبا کر پوچھا اس پاس کھڑے سب لوگوں کے چہرے کھل گئے۔

"یہ بالکل تازہ غزل ہے۔" عزیز صاحب نے عدالت میں کھڑے ہو کر حلفیہ بیان دینے والے انداز میں کہا۔ "اس سے پہلے بھی اسی وزن پر کوئی اور چیز کہی ہو تو یاد نہیں۔" اور آنکھوں سے سب کے چہروں کو ٹٹولتے ہوئے وہ ہلکی ہنسی کے ساتھ بولے "اپنا دیوان تو کوئی ریسرچ اسکالر ہی مرتب کرے گا۔"

ایک فرمائشی قہقہہ لگا۔ جسے شی، شی، شی۔ کی آوازوں نے بیچ میں دبا دیا۔ قہقہوں پر لگائی گئی اس بریک کا مطلب تھا کہ کمشنر صاحب اپنے کیبن میں تشریف لے آئے ہیں۔ کچھ دیر کا وقفہ رہا۔ جس میں سرجیت سنگھ ولد گرجیت سنگھ کی فائل ایک میز سے ایکشن کے لئے دوسری میز پر پہنچ گئی۔ سرجیت سنگھ ولد گرجیت سنگھ مسکراتا ہوا ہال سے باہر چلا گیا۔ اور جس بابو کی میز سے فائل گئی تھی وہ پانچ روپے کے نوٹ کو سہلاتا ہوا چائے پینے والوں کے جمگھٹ میں شامل ہوا۔ عزیز صاحب اب آواز ذرا پست کر کے غزل کا اگلا شعر سنانے لگے۔ صاحب کے کیبن سے گھنٹی ہوئی۔ چپراسی مستعدی سے اٹھ کر اندر گیا۔ اور اُسی مستعدی سے آکر پھر اپنے اسٹول پر بیٹھ گیا۔

چپراسی سے کھڑکی کا پردہ ٹھیک کرا کر کمشنر صاحب نے میز پر رکھے ڈھیر سارے کاغذات پر ایک ساتھ دستخط کئے اور پھر ریڈرز ڈائجسٹ کا تازہ شمارہ بیگ سے نکال لیا۔ لیٹیشیا بالڈریج کا مضمون کہ لے سے اطالوی مردوں سے کیوں پیار ہے وہ پڑھ چکے تھے۔ دیگر مضامین میں قلب کے آپریشن سے متعلق جے۔ ڈی۔ ریٹکلف کا مضمون انہوں نے سب سے پہلے پڑھنے کے لئے چن رکھا تھا۔ صفحہ نمبر ایک سو گیارہ کھول کر وہ دل کے نئے آپریشن کی تفصیل پڑھنے لگے۔

تبھی باہر سے کچھ شور سنائی دیا۔

کمپاؤنڈ میں پیڑ کے نیچے بکھر کر بیٹھے لوگوں میں چار نئے چہرے شامل ہوئے تھے۔ ایک ادھیڑ عمر آدمی تھا جس نے اپنی پگڑی زمین پر بچھائی تھی۔ اور ساتھ پیچھے کئے ٹانگیں پھیلا کر اُس پر بیٹھ گیا تھا۔ پگڑی کے دوسرے سرے کی طرف اُس سے ذرا بڑی عمر کی ایک عورت اور ایک جوان لڑکی بیٹھی تھی۔ اور ان کے پاس کھڑا ایک دبلا سا لڑکا ارد گرد کی ہر چیز کو استعجاب آمیز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ادھیڑ عمر کی پھیلی ٹانگیں دھیرے دھیرے پوری کھل گئی تھیں۔ اور آواز اتنی اونچی ہو گئی تھی کہ کمپاؤنڈ کے باہر سے بھی بہت سے لوگوں کا دھیان اُس طرف کھنچ گیا تھا۔ وہ زور زور سے اپنے گھٹنے پہ ہاتھ مار کر کہہ رہا تھا۔

"سرکار وقت لے رہی ہے۔ دس پانچ سال میں سرکار فیصلہ کر سکے گی کہ عرضی منظور ہونی چاہئیے یا نہیں۔ سالوا ملک الموت بھی تو ہمارا وقت گن رہا ہے۔ اُدھر وقت پورا ہوگا۔ تب اِدھر تم سے پتا چلے گا کہ ہماری عرضی منظور ہو گئی ہے۔"

چپراسی کی ٹانگیں زمین پر پیوستہ ہو گئیں۔ اور وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ کمپاؤنڈ میں بکھر کر بیٹھے اور لیٹے ہوئے لوگ اپنی اپنی جگہ پر کس گئے۔ کئی لوگ اُس پیڑ کے پاس آ جمع ہونے

"دو سال سے عرضی دے رکھی ہے کہ سالو! زمین کے نام پہ [illegible] گدھا الاٹ کر دیا ہے۔ اُس کے بدلے کوئی دوسری زمین [illegible] مگر دو سال سے عرضی یہاں کے دو کمرے ہی پار نہیں کر پائی ہے۔" وہ آدمی اب جیسے ایک مجمع میں بیٹھ کر تقریر کرنے لگا۔

"اِس کمرے سے اُس کمرے میں عرضی کے جانے میں وقت لگتا ہے۔ اِس میز سے اُس میز تک جانے میں بھی وقت لگتا ہے سرکار وقت لے رہی ہے۔ لو میں آگیا ہوں۔ آج یہیں اپنا سارا گھر بار لے کر لے لو جتنا وقت تمہیں لینا ہے۔ سات سال کی بھوک مری کے بعد سالوں نے زمین دی ہے مجھے، سو مرلے کا گدھا اُس میں کیا میں اپنے باپ دادوں کی ہڈیاں دفن کروں گا۔ عرضی دی تھی کہ مجھے سو مرلے کے بدلے پچاس مرلے دے دو لیکن زمین تو دو۔ مگر عرضی دو سال سے وقت لے رہی ہے میں بھوکا مر رہا ہوں۔ اور عرضی وقت لے رہی ہے۔"

چپراسی اپنے ہتھیار سے لیس آگے آیا۔ ماتھے پر تیوریاں اور آنکھوں میں غصہ۔ آس پاس کی بھیڑ کو ہٹاتا ہوا وہ اُس کے پاس آگیا "اے مسٹر، چل یہاں سے باہر!" آستین ہتھیاروں کی پھرتی چست کے ساتھ کہا: "چل۔۔۔۔ اُٹھ۔۔۔۔"

"مسٹر آج یہاں سے نہیں اُٹھ سکتا۔" وہ آدمی اپنی ٹانگیں تھوڑی اور چوڑی کر کے بولا "مسٹر آج یہاں کا بادشاہ ہے۔ پہلے مسٹر دیش کے بے تاج بادشاہوں کی جے بلاتا تھا۔ اب وہ کسی کی جے نہیں بلاتا۔ اب وہ خود یہاں کا بادشاہ ہے۔ بے لاج بادشاہ۔ اُسے کوئی لاج شرم نہیں ہے۔ اُس پر کسی کا حکم نہیں چلتا۔ سمجھے چپراسی بادشاہ!"

"ابھی تجھے پتہ چل جائے گا کہ تجھ پر کسی کا حکم چلتا ہے یا نہیں۔" چپراسی بادشاہ اور گرم ہوا۔

"ابھی پولیس کے سپرد کر دیا جائے گا تو تیری ساری بادشاہی نکل جائے گی۔"

"ہا۔۔۔ ہا۔۔۔ ہا" بے لاج بادشاہ ہنسا "تیری پولیس میری بادشاہی نکالے گی؟ تو بلا پولیس کو۔ میں پولیس کے سامنے ننگا ہو جاؤں گا۔ اور کہوں گا کہ نکال میری بادشاہی۔ ہم میں سے کس کس کی بادشاہی نکالے گی پولیس۔ یہ میرے ساتھ تین بادشاہ اور ہیں: یہ میرے بھائی کی بیوہ ہے۔ اس بھائی کی جسے سرحد پار ٹانگوں سے پکڑ کر چیر دیا گیا تھا۔ یہ میرے بھائی کا لڑکا ہے۔ ابھی تپ دق کا مریض ہے۔ اور یہ میرے بھائی کی لڑکی ہے۔ جواب بیاہنے لائق ہو گئی ہے۔ اِس کی بڑی کنواری بہن آج بھی پاکستان میں ہے۔ آج میں نے اِن سب کو بادشاہی دے دی ہے۔ تو بلوا کر اپنی پولیس کو۔ آ کر اِن سب کی بادشاہی نکال دے۔ کتا سالا۔"

اندر سے کسی ایک بابو نکل کر باہر آ گئے تھے "کتا سالا"

سُن کر چپراسی آپے سے باہر ہو گیا۔ وہ طیش میں آ کر اُسے بازو سے پکڑ کر گھسیٹنے لگا "تجھے ابھی پتہ چل جاتا ہے کہ کون سالا کتا ہے۔ میں تجھے مار مار کر۔۔۔۔" اور اُس نے اُسے پیٹنے لوٹنے ہوئے پیٹ کی ایک ٹھوکر دی۔ عورت اور لڑکی سہم کر وہاں سے ہٹ گئیں۔ لڑکا ایک طرف کھڑا ہو کر رونے لگا۔ بابو لوگ بھیڑ ہٹاتے ہوئے آگے بڑھ آئے۔ اور اُنہوں نے چپراسی کو اُس آدمی کے پاس سے ہٹا لیا۔ چپراسی پھر بھی بڑبڑا تا رہا۔

"کمینہ آدمی! دفتر میں آ کر گالی دیتا ہے۔ میں ابھی تجھے دکھا دیتا کہ۔۔۔۔"

"ایک تم ہی نہیں یہاں سب کے سب کُتّے ہو۔" وہ آدمی کہتا رہا "تم سب کُتّے ہو اور میں بھی ایک کُتّا ہوں۔ فرق اتنا ہے کہ تم لوگ سرکار کے کُتّے ہو۔ ہم لوگوں کی ہڈیاں چُوستے ہو۔ اور سرکار کی طرف سے بھونکتے ہو۔ میں پرماتما کا کُتّا ہوں۔ اس کی دی ہوئی ہوا کھا کر جیتا ہوں۔ اور اُس کی طرف سے بھونکتا ہوں۔ اس کا گھر انصاف کا گھر ہے میں اُس کے گھر کی رکھوالی کرتا ہوں۔ تم سب اُس کے انصاف کی دولت کے لٹیرے ہو [illegible] تم پر بھونکنا میرا فرض ہے [illegible] میرا حق ہے ازلی بیر ہے تم [illegible] ہو۔ میں تمہارا دشمن

ہوں۔ میں اکیلا ہوں۔ اس لئے تم سب مل کر مجھے مار دو۔ مجھے یہاں سے نکال دو۔ لیکن میں پھر بھی بھونکتا رہوں گا۔ تم میرا بھونکنا بند نہیں کر سکتے۔ میرے اندر میرے مالک کا نمک ہے۔ میرے واہگرو کی تجلّی ہے۔ مجھے جہاں بند کر دو گے میں وہاں بھونکوں گا۔ اور بھونک بھونک کر تم سب کے کان پھاڑ دوں گا۔ سالے، آدمی کے کتّے۔ اچھوتی ہڈی پر مرنے والے کتّے، دم ہلا ہلا کر جینے والے کتّے......"

"باباجی بس کرو۔" ایک بابو ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "ہم لوگوں پر ترس کھاؤ۔ اور اپنی یہ سنت بانی بند کرو۔ بتاؤ تمہارا نام کیا ہے؟ تمہارا کیس کیا ہے؟...."

میرا نام ہے بارہ سو چھبیس بٹا سات، میرے ماں باپ کا دیا ہوا نام کھا لیا کتوں نے۔ اب یہی نام ہے جو تمہارے دفتر کا دیا ہوا ہے۔ میں بارہ سو چھبیس بٹا سات ہوں۔ میرا اور کوئی نام نہیں ہے۔ میرا یہ نام یاد کر لو۔ اپنی ڈائری میں لکھ لو۔ واہگرو کا کتّا، بارہ سو چھبیس بٹا سات۔"

"باباجی! آج جاؤ، کل یا پرسوں آجانا۔ تمہاری عرضی کی کاروائی تقریباً تقریباً پوری ہو چکی ہے۔"

تقریباً، تقریباً پوری ہو چکی ہے۔ اور میں خود بھی تقریباً تقریباً پورا ہو چکا ہوں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ پہلے کاروائی پوری ہوتی ہے کہ پہلے میں پورا ہوتا ہوں۔ ایک طرف بکرے کا ہنر ہے اور دوسری طرف بہلتّا کا ہنر ہے۔ تمہارا تقریباً تقریباً ابھی دفتر ہی میں رہے گا اور میرا تقریباً تقریباً کفن میں پہنچ جائے گا۔ سالوں نے ساری پڑھائی خرچ کر کے دو لفظ ایجاد کئے ہیں۔ شاید اور تقریباً۔ شاید آپ کے کاغذات اوپر چلے گئے ہیں۔ تقریباً تقریباً کاروائی پوری ہو چکی ہے۔ شاید سے نکالو اور تقریباً میں ڈال دو۔ تقریباً سے نکالو اور شاید میں غرق کر دو۔ تقریباً تین چار مہینے میں تحقیقات ہوگی۔ شاید مہینے دو مہینے میں رپورٹ آئے گی۔ میں آج شاید اور تقریباً دونوں کو ہرا کر چھوٹ آیا ہوں۔ میں یہاں بیٹھا ہوں اور یہیں بیٹھا رہوں گا۔ میرا کام ہونا ہے تو آج ہی ہو گا اور ابھی ہو گا

تمہارا شاید اور تقریباً کے گاہک یہ سب کھڑے ہیں۔ یہ بھی انتظار کریں....."

بابو لوگ مایوس ہو کر اپنا سا منہ لئے ایک ایک کر کے اندر لوٹنے لگے۔ دو چار جھنجھلا بھی گئے۔

"بیٹھا ہے۔ بیٹھا رہنے دو۔"

"بکتا ہے بکنے دو۔"

"سالا بدمعاشی سے کام نکالنا چاہتا ہے۔"

"لیٹ ہم بارک ہمسیلف ٹو ڈیتھ۔"

بابوؤں کے ساتھ چپراسی بھی بڑبڑاتا ہوا اپنے اسٹول پر لوٹ گیا۔

"میں سالے کے دانت توڑ دیتا۔ اب بابو لوگ ہی حاکم ہیں۔ حاکموں کا کہا ماننا پڑتا ہے ورنہ...."

"لودے بابا شانتی سے کام لے۔ یہاں منّت چلتی ہے پیسا چلتا ہے۔ دھونس نہیں چلتی۔" بھیڑ میں سے کوئی اسے سمجھانے لگا۔ وہ آدمی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"مگر پرماتما کا حکم ہر جگہ چلتا ہے۔" وہ اپنی قمیض اتارتا ہوا بولا۔ "اور پرماتما کے حکم سے آج بے لاج بادشاہ ننگا ہو کر کمشنر صاحب کے کمرے میں جائے گا۔ آج وہ ننگی پیٹھ پر صاحب کے ڈنڈے کھائے گا۔ آج وہ بوٹوں کی ٹھوکریں کھا کر اپنی جان دے دے گا۔ لیکن وہ کسی کی منّت نہیں کرے گا۔ کسی کو پیسہ نہیں چڑھائے گا۔ کسی کی پوجا نہیں کرے گا۔ جو واہگرو کا پوجا کرتا ہے وہ کسی اور کی پوجا نہیں کرتا۔ وہ واہگرو کا نام لے کر......"

اور اس سے پہلے کہ وہ اپنے الفاظ کو عملی جامہ پہنانا، یعنی کہ حقیقی جامہ اتار دیتا۔ دو ایک آدمیوں نے بڑھ کر تہمد کی گانٹھ پر رکھے اس کے ہاتھ کو پکڑ لیا۔ بے لاج بادشاہ اپنا ہاتھ چھڑانے کی جدوجہد کرنے لگا: "مجھے جا کر پوچھنے دو کہ کیا وہ جانتا ہے کہ وہ صرف اسی لئے آزادی دلائی تھی کہ یہ آزادی کے ساتھ اسی طرح زنا کریں۔ اس کی مٹی خراب کریں۔ اس کے نام پر کلنک کا ٹیکہ لگائیں۔ اسے [illegible]

... بات اُن لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ شرم نہیں ... جو انسان ہوتے ہیں تو آپ کہتا ہوں کہ یہ انسان نہیں کا ... .

دفعتاً مجمع میں ایک دہشت سی پھیل گئی۔ کمشنر صاحب اپنے کمرے سے باہر نکل آئے تھے۔ وہ ماتھے کی تیوریوں اور چہرے کی جھریوں کو گہرا کئے مجمع کے قریب آگئے۔

"کیا بات ہے؟ کیا چاہتے ہو تم؟"

"آپ سے ملنا چاہتا ہوں صاحب!" وہ آدمی صاحب کو گھورتا ہوا بولا۔ "سو مرلے کا ایک گڑھا میرے نام الاٹ ہوا ہے۔ گڑھا آپ کو واپس کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ سرکار اس میں ایک تالاب بنوا دے۔ اور افسر لوگ شام کو وہاں جا کر مچھلیاں مارا کریں۔ یا اس گڑھے میں سرکار ایک ترخانہ بنوا دے اور ... سارے کتوں کو اس میں بند کر دے۔"

"زیادہ بک بک مت کرو۔ اور اپنا کیس لیکر میرے پاس آؤ۔"

"میرا کیس میرے پاس نہیں ہے صاحب! دو سال سے سرکار کے پاس ہے۔ آپ کے پاس ہے۔ میرے پاس اپنا شریر اور دو کپڑے ہیں۔ چار دن بعد یہ بھی نہیں رہیں گے۔ اس لئے انہیں بھی آج ہی اتارے دے رہا ہوں۔ اس کے بعد باقی صرف بارہ سو چھبیس بٹا سات رہ جائے گا۔ بارہ سو چھبیس بٹا سات کو مار مار کر پرماتما کے حضور میں بھیج دیا جائے گا....."

"بکواس بند کرو اور میرے ساتھ اندر آؤ۔"

کمشنر صاحب اپنے کمرے میں چلے گئے۔ وہ آدمی بھی ... کندھے پر رکھے اُن کے کمرے کی طرف چل دیا۔ "دو سال ... گذارا۔ کسی نے بات نہیں سنی۔ واسطے دیتا رہا کسی نے بات نہیں سنی۔ خوشامدیں کرتا رہا کسی نے......"

چپراسی نے اُس کے لئے چق ہٹا دی۔ اور وہ کمشنر صاحب کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ گھنٹی بجی، فائلیں چلیں۔ پاؤں کی پیشی ہوئی۔ اور نصف گھنٹے بعد ... بادشاہ مسکراتا ہوا باہر نکل آیا۔ شاندار آنکھوں کے مجمع نے اُسے آتے دیکھا۔ وہ مسکرانے لگا۔

"... تم بتوں کی طرح بڑبڑ دیکھنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ بھونکو۔ بھونکو۔ سب کے سب بھونکو۔ اپنے آپ سالوں کے کان پھٹ جائیں گے۔ بھونکو کتو بھونکو....."

اُس کی بھوجائی گیٹ کے پاس انتظار کر رہی تھی۔ لڑکے اور لڑکی کے کندھوں پر ہاتھ رکھے وہ سچ مچ بادشاہ کی طرح چلنے لگا۔

"غیرت مند ہو تو سالہا سال منہ لٹکائے کھڑے رہو۔ عرضیاں ٹائپ کراؤ اور نل کا پانی پیو۔ سرکار وقت لے رہی ہے۔ نہیں تو بے حیا بنو۔ بے حیائی ہزار برکت ہے۔"

ایک لمحہ کو وہ زور سے ہنسا۔

"یا بے حیائی تیرا آسرا....."

اُس کے چلے جانے کے بعد کپاؤنڈ میں اور کپاؤنڈ کے باہر ماتمی کیفیت اور گہری ہو گئی۔ رفتہ رفتہ مجمع منتشر ہو کر اپنی جگہوں پر چلا گیا۔ چپراسی کی ٹانگیں اسٹول پر دوبارہ جھولنے لگ گئیں۔ سامنے کے کینٹین کا لڑکا بابوؤں کے کمرے میں ایک سیٹ چائے رکھ گیا۔ عرضی نویس کی مشین چلنے لگی۔ اور ٹک ٹک کی آواز کے ساتھ اس کا لڑکا اپنا سبق دہرانے لگا۔

"پی۔ ای۔ این۔ پین ۔۔۔ پین معنے قلم۔"

"ایچ۔ ای۔ این۔ ہین ۔۔۔ ہین معنے مرغی۔"

"ڈی۔ ای۔ این۔ ڈین ۔۔۔ ڈین معنے اندھیری گپھا۔"

چندہ سالانہ ختم ہونیکی اطلاع

آپکا سالانہ خریداری نمبر ... ختم ہو چکا ہے یہ شمارہ آپ کی مدت خریداری کا آخری شمارہ ہے۔ براہ کرم آئندہ سال کے لئے چندہ /۱۲ روپے منی آرڈر کے ذریعہ بھیج کر ممنون فرمائیے ... خریداری منظور فرمائیے۔ اگر آپ منی آرڈر نہ بھیج سکیں تو تحریر کر دیں ... بھیجنے کی ہدایت کیجئے۔ اگر نئے سال کے لئے آپ خریداری منظور نہ ہو تو ایک خط کے ذریعہ اطلاع دیجئے ... (منیجر)

غزلیں

غلام ربانی تاباں

وہ خواب ہوں جسے تعبیرِ خواب بھی سمجھو
مجھے سوال بھی جانو، جواب بھی سمجھو

میں جی رہا ہوں کسی موجِ تہہ نشیں کی طرح
مرے سکون کو تم اضطراب بھی سمجھو

غمِ حیات کی یوں تو ہزار تاویلیں!
کسی کا لطف بھی جانو، عتاب بھی سمجھو

نہ قربتوں کی تمنا، نہ دوریوں کا گلا،
جہانِ شوق کو موجِ سراب بھی سمجھو

مرے خلوص کو میری شکست بھی جانو
مری وفا کو مرا احتساب بھی سمجھو

مسافروں سے بھی نازک ہیں راستوں کے مزاج
وہ پیچ و خم ہی سہی، پیچ و تاب بھی سمجھو

میں کون ہوں مجھے اس کا پتا نہیں تاباںؔ
مرے وجود کو میرا نقاب بھی سمجھو

نثار اٹاوی؎

بہت دن ہوئے "شاعر" کے لئے ایک غزل کہی تھی۔ مگر اُسے بطورِ خاص کسی مخصوص نمبر کے لئے رکھے ہوئے تھا۔ اب اُسکو رکھنا بیکار ہی نظر آتا ہے۔ لہٰذا ارسالِ خدمت ہے۔

میں چالیس سال تک "شاعر" کی خدمت کی۔ ممکن ہے یہ میری آخری غزل ہو۔ آپ جانتے ہی ہیں، یہ مرض اتنا موذی ہوتا ہے کہ جان لیکر ہی چھوڑتا ہے۔ اور اگر انسان بچ بھی جائے تو ناکارہ بنکر رہ جاتا ہے۔

(نثار اٹاوی)

ہنسو نہ مجھ پہ بڑا بدنصیب ہوں یارو
جہانِ جہلِ خرد کا ادیب ہوں یارو

ٹپک رہا ہے لہو انگلیوں کے ناخن سے
قلم بدست ہوں پھر بھی عجیب ہوں یارو

حریصِ لذتِ دنیا ہوں مجھکو قتل کرو
اٹھاؤ تیغ، تمہارا رقیب ہوں یارو

دل و جگر ہیں کہ سینے میں جھولتی لاشیں
میں اپنے دور کی زندہ صلیب ہوں یارو

مری نگاہ کا رُخ دیکھتی ہے صبحِ بہار
میں انقلابِ چمن کا نقیب ہوں یارو

ڈرو نہ حرفِ محبت کی تلخ گوئی سے
شکستِ دل کی صدائے عجیب ہوں یارو

مجھے پڑھو، مرا سینہ نشانِ منزل ہے
میں سنگِ میلِ دیارِ حبیب ہوں یارو

نگاہِ اہلِ محبت کی آزمائش ہے۔
وہیں سے دور، وہیں سے قریب ہوں یارو

کرو نہ اتنی تواضع کہ لوٹ بھی نہ سکوں
نیا اسیرِ قفس ہوں، غریب ہوں یارو

؎ نثار اٹاوی گلے کے کینسر میں مبتلا ہیں۔ ان کی صحت کے لئے اردو حلقوں سے دعا کی درخواست ہے۔ (ادارہ)

مقالہ

پروفیسر خواجہ امین

ڈرامہ نگاری کا فن

داستان، ناول اور مختصر افسانہ وغیرہ کی طرح ڈراما بھی نثری ادب کی ایک صنف ہے۔ ویسے ڈرامے شاعری کے قالب میں بھی پیش کئے جاتے ہیں جو منظوم POETIC ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں شیکسپیر کی مثال خاص طور پر دی جا سکتی ہے جس کے تمام ڈرامے نظم معریٰ (BLANK VERSE) کے نام سے ملتے ہیں۔ مگر دورِ حاضر میں منظوم ڈراموں کا رواج تقریباً ختم ہو گیا ہے۔ اس لئے ڈرامے سے ہماری مراد عام طور پر اُس کی نثری حیثیت سے ہوتی ہے۔

داستان، ناول اور مختصر افسانہ کے برخلاف ڈرامہ میں زندگی کو بیانیہ (NARRATIVE) انداز میں پیش کرنے کی بجائے عملی طور پر اُجاگر کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈراما کا نام آتے ہی ہمارا ذہن اسٹیج یا تھیٹر کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ فکر و شعور سے بھری ہوئی چلتی پھرتی، ہنستی روتی اور دوڑتی بھاگتی ہوئی زندگی کو تحیر اور تجسس (SUSPENSE + SURPRISE) کے رنگ میں پوری عملیت کے ساتھ پیش کرنے کا نام ڈراما ہے۔

لفظ ڈراما کا لغوی مفہوم بھی اس کی عملیت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ "دائرۃ المعارف" برطانیہ میں ایک مقالہ نگار موصوف نے لکھا ہے کہ ڈراما ایک یونانی لفظ ہے جس کا معنی "کر کے دکھانا" ہے۔ اس کا اطلاق "کی ہوئی چیز" پر ہوتا ہے۔ شبلی کا بھی کم و بیش یہی خیال ہے کہ ڈراما ایک یونانی لفظ سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں "میں کرتا ہوں"۔ ارسطو نے بھی ایک جگہ ڈرامے کا آغاز بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ڈورین لوگ خود کو ڈراما کا موجد ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ان کا استدلال ہے کہ ڈراما خود ایک یونانی لفظ کے مترادف ہے، جس کے معنی "کرنا" اور "عمل" کے ہوتے ہیں۔

ڈراما اور اسٹیج لازم و ملزوم ہیں کیونکہ ڈراما کی ابتدا ہی اسٹیج کے واسطے سے ہوئی ہے۔ بلکہ مغربی ادبیات میں ڈراما کی ارتقائی تاریخ ہی اسٹیج کی ارتقائی تاریخ سے جڑی ہوئی ہے۔ یہ اسٹیج ہی کا کرشمہ ہے کہ ڈراما ناظرین کی سماعت اور بصارت دونوں ہی کو بیک وقت اپیل کرتا ہے۔ اس لئے ڈرامے اسٹیج پر سماعی اور بصری (AUDIO VISUAL) ہوا کرتے ہیں۔ اسٹیج ڈراموں میں انسانی جذبات، کردار، مناظر، ماحول، پس منظر موسیقی اور دوسرے لوازم کے سہارے پیش کی جاتی ہے۔ جو ڈراما اسٹیج پر پیش نہیں کیا جا سکتا اُسے CLOSETT کہا جاتا ہے۔ اسٹیج پر پیش ہونے سے پہلے ڈراما کی تحریری شکل تکنیکی اصطلاح میں اسکرپٹ SCRIPT سے موسوم کی جاتی ہے۔ ڈراما کی ایک اہم خصوصیت اُس کا اختصار اور ارتکاز بھی ہے کیونکہ ڈراما نویس موضوع اور مواد کے مختلف پہلوؤں اور گوشوں میں کسی ایک پہلو یا گوشہ پر مرتکز ہو کر اسے مختصر مناظر کے ذریعے پوری آب و تاب کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ لیکن اس سے ہرگز یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ڈراما نگاری کوئی آسان تخلیقی عمل ہے۔ بلکہ فنی تقاضوں کے پیشِ نظر ڈراما نویسی کو چاول پر قل ہو اللہ لکھنے یا شمشیرِ دو دم پر چلنے کا ایک حوصلہ شکن عمل ہی سمجھنا چاہئے۔

قدیم کلاسیکی ڈراما نویسوں نے ڈراما کے لئے عمل، وقت اور مقام کی وحدتِ ثلاثہ (THRE UNITIES) کو ناگزیر ترکیبی عناصر قرار دیا ہے۔ ارسطو نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف POETICS میں ٹریجڈی پر بحث کرتے ہوئے زمان و مکان اور عمل کی ناگزیر ضرورت اور اہمیت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

وحدتِ عمل سے مراد یہ ہے کہ ڈراما کے تمام چھوٹے بڑے اعمال اور اُس کے کرداروں کی تمام چھوٹی بڑی حرکات ایک مرکزی حرکت و عمل میں ضم ہو جائیں۔ عمل کی کثرت وحدت میں بدل جائے تاکہ اختتام پر ڈراما کے ناظرین عملِ واحد کی کارفرمائی سے اثر پذیر ہوں۔ یہ سچ ہے کہ ڈراما میں فنی نقطۂ نظر سے ذیلی اور ضمنی عمل، بنیادی عمل کے گرد طواف کرتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ ڈراما نگاری میں UNITY OF ACTION کی اہمیت سے انکار یا اُس کی پیش کش سے گریز نہیں کیا جا سکتا۔

ارسطو نے المیہ سے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اُسے "آفتاب کی ایک گردش" کے اندر ختم ہو جانا چاہئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ڈراما کی میعادِ عمل چوبیس گھنٹے سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ڈراما نگار سالوں، صدیوں اور قرنوں میں پھیلی اور بکھری ہوئی زندگی کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ایک مختصر لیکن بسیط و بیکراں حیاتِ انسانی گرفت میں نہیں آ سکتی لہٰذا صنفِ ڈراما کے لئے وحدتِ وقت کی پابندی سرتاسر غیر ضروری اور غیر فطری معلوم ہوتی ہے۔

وحدتِ زماں سے ملتی جلتی باتیں وحدتِ مقام کے متعلق بھی کہی گئی ہیں۔ قدیم کلاسیکی ناقدین کا خیال ہے کہ ڈراما کے واقعات اور اعمال کا مظاہرہ اس طویل و عریض کائنات کے کسی ایک حصے یا ایک خطے، ایک گوشے ایک علاقہ ایک شہر یا ایک ہی ملک میں ہونا چاہئے اُن کے مطابق کئی مقامات کو ڈرامائی فضا کی تعمیر زمین نہیں بنایا جا سکتا۔ لیکن ایک ناقدانہ نگاہ ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ وحدتِ زماں کی طرح وحدتِ مکاں کی قید بھی کچھ مصنوعی اور دور از کار ہے۔

کلاسیکی و نو کلاسیکی (CLASSICAL & NEO-CLASSICAL) ڈراما نویسوں نے مذکورہ بالا وحدتِ ثلاثہ کی اچھی طرح پیروی کی ہے لیکن ان کے بعد رومانی ڈراما نگاروں کے ہیئتی تجربات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ایک وحدتِ عمل کے سوا دوسری وحدتوں کے اتباع کے بغیر بھی معیاری اور شہکار ڈرامے تخلیق کئے جا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر رومانی ڈراما نویسوں کے امام اور پیشرو شیکسپیئر نے ایک TEMPEST کے سوا شاید ہی کسی اور میں وحدتِ زماں و مکاں کی پیروی کی ہو۔ اس کے باوجود شیکسپیئر کے تقریباً تمام ڈرامے ادبِ عالیہ کی صف میں جگہ پانے کے مستحق ہو جاتے ہیں۔

ڈراما کا پلاٹ بھی مختصر افسانہ کی طرح مربوط اور منظم ہوا کرتا ہے۔ ارسطو کا یہ قول کہ ڈراما ایک ساعت کے لئے پیش ہوتا ہے اُس کے اسی اختصار اور ارتکاز کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ پھر ڈراما کی ماجرا نگاری میں مختصر افسانہ ہی کی طرح غیر ضروری واقعات اور طول بیانی سے اجتناب لازمی ہے۔ جسے تھامسن کے الفاظ میں ڈرامائی کفایت کا قانون (THE LAW OF DRAMATIC ECONOMY) کہا جاتا ہے۔

فکشن کی طرح ڈراما میں بھی ایک چابکدست فن کار کے ہاتھوں واقعات کی کثرت، وحدت میں بدل جاتی ہے۔ ماجرا یا مرکزی عمل تیزی سے اپنی ارتقائی منزلیں طے کرتا ہوا قارئین کے دل و دماغ میں "تذبذب کی کیفیت" بھر دیتا ہے جسے ای۔ ایم۔ فورسٹر کے الفاظ میں "THEN AND THEN" سے تعبیر کرنا چاہئے۔ کشمکش کا یہ عالم نقطۂ عروج کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ غرض فکشن ہو یا ڈراما، کامیاب ماجرا نگاری اجزائے قصہ کے درمیان ربط و اتحاد اور اُن کی فطری ترتیب و تنظیم میں مضمر ہوتی ہے۔

ماجرا کے پیشِ نظر ڈراما اپنے انجام کے اعتبار سے طربیہ (COMEDY) اور المیہ (TRAGEDY) کے دو خانوں میں تقسیم کیا گیا ہے لیکن اگر بہ نظرِ غائر تجزیہ کیا جائے تو یہ تقسیم سراسر میکانکی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ حیاتِ انسانی، سُکھ دُکھ اور راحت و کلفت کا مرکب ہے

شاہ و بچّی

کوئی انسان نہ ہمیشہ مسرور و شادماں رہتا ہے اور نہ ہی ہمیشہ افسردہ و ملول۔ بلکہ کبھی کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ فرطِ مسرت سے آنسو نکل پڑتے ہیں اور کبھی روتا ہوا انسان یک بیک ہنسنے بھی لگتا ہے۔ اس لئے بعض ڈرامے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو نہ ہم واضح طور پر طربیہ کہہ سکتے ہیں اور نہ المیہ ہی۔ کیونکہ ان میں دونوں متضاد عناصر کی آمیزش دھوپ چھاؤں کی طرح نظر آتی ہے۔ شاید ایسے ہی ڈرامے فنی طور پر TRAGI-COMEDY کہے جاتے ہیں۔

ڈراما کی اصلیت بالفاظِ دیگر اسے زندگی کی ایک عملی تفسیر کہتے ہوئے بعض اصحاب اس میں کردار نگاری کو خاص اہمیت نہیں دیتے جو فنی نقطۂ نظر سے قرینِ انصاف نہیں۔ کیونکہ واقعات کا عملی اظہار تو افراد قصہ ہی کے ہاتھوں انجام پاتا ہے۔ لہذا ہنری آرتھر جان کا یہ قول یکسر درست ہے کہ: "اگر ڈراما کے واقعات اور ماحول میں کردار نگاری کی آمیزش نہ ہو تو وہ ایک طفلانہ تخلیق ہوگی"۔

ڈراما میں کرداروں کا غیر شخصی (IMPERSONAL) اور مختصر ہونا ضروری ہے۔ جس کی بہترین مثال شیکسپیر کا MACBETH ہے جس میں عمل کے اختصار کے ساتھ ہی ساتھ کردار نگاری کا اختصار بھی موجود ہے۔ ڈراما نویس کا اپنے کرداروں سے کوئی براہِ راست اور بلاواسطہ تعلق نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ناول نگار یا مختصر افسانہ نویس کی طرح کردار نگاری کے تعلق سے چھوٹے بڑے راست بیانات سے کام نہیں لے سکتا۔ اسے اختتام پر وحدتِ اثر پیدا کرنے کی خاطر ہر لمحہ وحدتِ عمل اور انفرادی طور پر اپنے کرداروں کی تمام حرکات و سکنات پر کڑی نظر رکھنی پڑتی ہے۔ پروفیسر ٹالمین کا یہ قول سو فیصدی درست ہے کہ ڈراما نویس کو اپنے کرداروں کی وہی خصوصیات اجاگر کرنا چاہئیں جو ان کے اعمال پر اثرانداز ہو سکیں۔

ایک ڈراما نویس اپنی تخلیقات میں کردار نگاری کے کچھ ایسے اصولوں سے بھی کام لیتا ہے جو فکشن میں اتنی اہمیت نہیں رکھتے۔ یہ بات علوم فنی تقاضوں کی ہے۔

ڈراما نگاری میں اصلیت تمام اجزائے ترکیبی پر مقدم ہے کیونکہ ڈراما ایک عروضی اور عملی صنفِ نثر ہے۔ اس کی بنیاد ہی کرداروں کے اعمال اور ان کی حرکات پر استوار ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈراما کو دیگر اصنافِ ادب کی طرح زندگی کی ترجمانی محض کہنے کی بجائے ایک عملی تعبیر سے موسوم کیا جاتا ہے۔

مکالمہ نگاری بھی ڈراما میں ایک اہم ترکیبی عنصر کی حیثیت رکھتی ہے۔ بلکہ ارسطو نے تو مکالمہ کو ڈراما کی "ریڑھ کی ہڈی" سے تعبیر کیا ہے۔ ڈراما نویس اپنے کرداروں سے متعلق ذاتی اظہار رائے کی بجائے انہیں سماجی تعلقات کے پس منظر یا پیش منظر میں ایک دوسرے سے ہم کلام ہوتے ہوئے پیش کرتا ہے۔ یہ کردار اپنی گفتگو سے اپنے مزاج، فکر و نظر اور اپنی افتادِ طبع کا پتہ دیتے ہیں۔ کبھی کبھی کوئی کردار دبی زبان میں (UNDERTONE) سے دوسرے افراد سے متعلق ان کی موجودگی میں اپنی رائیں دیتا ہوا چلا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں کہنے والا اپنی باتیں اپنے مخاطب کو سنانا نہیں چاہتا۔ اسے فنی اصطلاح میں ASIDE کا طریقۂ کار کہتے ہیں۔

مکالموں سے نہ صرف کردار کے نقوش اجاگر ہوتے ہیں بلکہ رفتارِ واقعہ بھی تیز تر ہوتی جاتی ہے۔ مکالمے ہی ماجرا کو ارتقائی راستے بھی دیتے ہیں۔ فنی نقطۂ نظر سے مکالموں کو طویل اور تقریر نما ہونے کی بجائے مختصر، برجستہ، بے تکلفانہ، فطری اور پُر اثر ہونا چاہئے۔

ڈراما نگار اکثر کرداروں کی خود کلامی (SOLILOQUI) سے بھی مصرف لیتا ہے۔ انسان کا خود سے ہم کلام ہونا ایک فطری امر ہے۔ خود کلامی بڑی رازدارانہ ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ ڈراما میں خود سے بولتے ہوئے کردار ناظرین کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیتا ہے۔ خود کلام کردار اپنے قلب و ضمیر کی انتہائی گہرائیوں کے ساتھ بے نقاب ہو جاتا ہے۔ ڈراما نویس کو خود کلامی کا طریقۂ کار برت کر کسی کردار کے عملی محرکات کا سراغ لگانے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

خود کلامی کا طریقۂ کار الزبیتھ عہد کے انگریزی ڈراموں میں شدت کے ساتھ مروج اور مقبول رہا۔ لیکن عصرِ حاضر میں اسے ایک غیر فطری

"سمجھا جاتا ہے یہاں تک کہ جانسن خودکلامی کو ایک غیر فطری عمل قرار دیتا ہے۔ اُس کے خیال میں مکالمے خودکلامی کا نعم البدل ثابت ہو سکتے ہیں۔ ذیل کی سطور میں ڈرامائی کردار نگاری کے کچھ خاص اصولوں کی طرف اشارے کئے جا رہے ہیں:۔

متوازیت :۔ ڈراما نویس مرکزی عمل یا اپنے ماجرا کے بالکل مشابہ ایک زیریں قصہ یا عمل کی تخلیق کرتا ہے۔ کبھی کبھی پلاٹ کے علاوہ ملتے جلتے کرداروں کو پیش کر کے مرکزی عمل میں دلچسپ پیچیدگی کے عناصر بھر دیتا ہے جیسے شیکسپیر نے ——— THE COMEDY OF ERRORS میں دو جڑواں بھائیوں اور دو جڑواں غلاموں کو پیش کر کے پلاٹ کو انتہائی پیچیدہ لیکن دلچسپ بنا دیا ہے۔ یہ دونوں بھائی اور دونوں غلام ایک دوسرے سے اس قدر مشابہ ہیں کہ قارئین یا ناظرین ان میں آسانی سے تمیز نہیں کر سکتے۔

ڈراما نگاری کبھی کبھی دو باتوں، دو واقعوں یا دو کرداروں میں تضاد (CONTRAST) کا عنصر نمایاں کر کے ایک دلچسپ ڈرامائی فضا پیدا کر دیتا ہے۔ مثلاً کبھی کبھی ایک ہی کردار میں خیر و شر یا ظلم و انصاف وغیرہ کے دو متضاد جذبات پائے جاتے ہیں۔ ڈرامائی طنز (DRAMATIC IRONY) کا استعمال اس تضاد کو واضح کر دیتا ہے۔ یہ طنز بھی دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک لفظی یا مکالماتی (IRONY OF DIALOGUE) دوسرے عملی یا احوالی (IRONY OF ACTION) (الف) لفظی طنز اُس وقت وجود میں آتی ہے جب کوئی کردار اپنی گفتگو کے مقصود یا اُس کے عملی نتائج سے بے خبر رہتا ہے۔ پروفیسر مالٹن کے خیال میں یہ طنز اُس وقت رونما ہوتی ہے، جب کرداروں کی اپنی انجام سے بے خبری ناظرین کی واقفیت سے ٹکراتی ہے۔ سترہویں صدی عیسوی کے ہسپانوی ڈراموں میں اُس کا استعمال کثرت سے ہوا ہے۔ مثال کے طور پر ایک شہرۂ آفاق ہسپانوی کردار GRACIOSO اپنے مالک کے مضحکہ خیز جذبات، اُس کے مرصع فقروں اور اُس کی رومانی حرکات کی نقل اتارتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اُس کی یہی نقالی لفظی طنز کو اُجاگر کر دیتی ہے۔

(ب) عملی یا احوالی طنز اُس وقت معرضِ ظہور میں آتی ہے جب کوئی کردار اپنے عمل کے انجام سے بے خبر ہوتا ہے۔

یونانی المیوں میں احوالی طنز کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔ اُس کے علاوہ رومانی ڈراما نویسوں میں شیکسپیر نے " THE ... AS YOU LIKE اور TWELTH NIGHT میں اُس کے خوبصورت نمونے پیش کئے ہیں۔

ڈراما نگاری کے فن میں اخفا اور استعجاب (CONCEALMENT + SURPRISE) کو بھی ایک اہم مقام حاصل ہے۔ ڈراما نویس بعض واقعات کو صیغۂ راز میں رکھ کر قارئین کو حیرت و استعجاب کے عالم میں گرفتار کر دیتا ہے۔ جب چھپے ہوئے واقعات سے پردے اٹھائے جاتے ہیں تو قارئین کا تحیر عرفان میں بدل جاتا ہے لیکن عہدِ جدید میں یہ فنی طریقۂ کار کچھ زیادہ کشش نہیں رکھتا۔

ڈراما نویس اپنے تخلیقی عمل میں نہایت جانبدار ہوتا ہے۔ وہ کسی ناول نگار کی طرح اپنے کرداروں سے متعلق ذاتی طور پر کوئی رائے صادر نہیں کرتا۔ اُس کا اندازِ نظر خارجی اور معروضی ہوا کرتا ہے۔ وہ زندگی، فطرت اور کائنات سے متعلق کھلے لفظوں میں کوئی ذاتی نظریہ یا فلسفہ پیش نہیں کرتا۔ وہ اپنے تراشے ہوئے کرداروں کو اسٹیج پر آزادانہ عمل کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔ اُس کا حصہ "دور کا جلوہ" ہے۔ اس حقیقت کے باوجود اگر کسی ڈراما کے تمام کرداروں کا غور سے مطالعہ کیا جائے اور ان کی تمام حرکات و سکنات پر گہری نظر رکھی جائے تو اُن میں کوئی اپنے خالق کا نیم روشن نمائندہ ضرور ملے گا جس کے دل و دماغ یقیناً "مستعار" ہوتے ہیں۔ لیکن ایسے کردار کی تخلیق کچھ ایسی فنکارانہ مہارت اور صناعی کے ساتھ ہوتی ہے کہ ہم جا نگے کے اِس اُجالے کو آسانی سے پہچان نہیں سکتے کیونکہ وہ بیک وقت پردہ اور جلوہ دونوں سے وفاداری کا دم بھرتا ہے۔

رشید عبد السمیع جلیل (حیدرآباد)

فنکار حال کے آئینہ میں

یہ رسم شہروں میں عام ہے اب
کہ لوگ چہروں کو دیکھتے ہیں
نقاب اوڑھے ہوئے یہ چہرے
جو شہ نشینوں پہ آ سکتے ہیں محفلوں میں
شکار ہیں فی زمانہ بے چہرگی کا لیکن
ردائے دانش کو اوڑھ کر یہ
انا کی تسکین کا سہارا بھی ڈھونڈتے ہیں
غبارِ علم و فنون لے کر
یہ بادِ صرصر کے دوش پر اُڑ رہے ہیں کب سے
سیاہ کاغذ پہ سُرخیوں کو رواج دے کر
خلاء میں تقسیم کر رہے ہیں
تلاش جن کی ہے نامکمل
کہ آگہی کا دیار اُجڑا ہوا لگے ہے،
نقاب اُلٹ دو تو سارے چہروں کا نور غائب!

پسِ تمنائے داوری دلفگار ہیں سب
زمیں پہ بے اعتنائیوں کے شکار ہیں سب

ڈاکٹر زبیدہ ثانی (دہلی)

دیدۂ بینا

(ساجدہ زیدی کے نام)

غارِ ایلورہ میں اُتری جب میں
مجھ پہ جذبات کی یورش نہ ہوئی
سرسری سی تھیں نگاہیں میری
جانی پہچانی سی گلیاں جیسے
سردِ پتھر میں کہاں حُسن کی رنگینی ہے
بے زبانی میں کہاں شانِ کلیمانہ ہے
یوں ہی بے فیض بڑھی جاتی تھی
سامنے ایک حسینہ نظر آئی مجھ کو
گیروے رنگ میں ملبوس تھی وہ
حُسن و رعنائی کا زندہ پیکر
مُنہمک حُسن کے نظّارے میں
ہمہ تن محوِ عبادت جیسے
خود اُسے اپنا بھی احساس نہ تھا
کوئی فنکار تھی وہ، سوچ رہی تھی شاید
آج احساس کا تیشہ لے کر
کوہِ الفاظ سے کچھ سنگ تراشے جائیں
فن کی اِک نہر نکالی جائے
فن سے فنکار کا رشتہ کیا ہے؟
چشمِ بینا کی حقیقت کیا ہے؟
منکشف مجھ پہ ہوا
ہر طرف حُسن کا رعنائی و رنگینی کا سیلاب رواں
فن سے فنکار کی عظمت ہے عیاں
دستِ انساں کے تراشے پیکر
حُسن و جادو کا مرقع نکلے!

ابواللیث جاوید

نالائق کہیں کا

جب میں نے اندھیرے میں جب میرے پاؤں کی اُنگلی
کھری تو میرا کمرہ روشن ہوگیا اور اُس کی ہر چیز بالکل ننگی۔
روشنی سے اندھیرا شرمایا تو برہنگی نے شاید جنم لیا اور سڑکوں
پر بکھر کر بس جانے لگی۔ تنزّل کی عیاشی پر جب جوانی آئی ہو
تہذیب نے کفن پہنا ہے اور اچھائی کو بُرائی نگلتی چلی گئی ہے
رات شاید کالی ہوگئی تھی۔
امریکی چاند ——— نہیں، روسی چاند ——— یہ بھی نہیں ———
تو پھر دونوں ——— ہاں ہوں ——— تو پھر صرف چاند کی دھرتی
چمک رہی تھی اور میری آنکھوں کو ایک ٹھنڈک سی نصیب ہو رہی
تھی مگر دِل کا صحرا تپ رہا تھا۔ میں دیکھنے لگا تھا۔ دُور ———
بہت دُور ——— اُسی خواب کی طرف جو میں نے کبھی دیکھے تھے اپنی
زندگی کے لئے۔ اور خواب کی بھلا حقیقت ہی کیا!؟ دُور
آسمانوں میں اُڑتے ہوئے پانی سے بھرے کالے کالے بادلوں کا
تصور جو شاید برسیں تو تپتے ہوئے جسم کو ٹھنڈک مل جائے
اور نہ برسیں تو صرف آنکھوں کو ٹھنڈک کا احساس۔

شاید ——— احساس ——— خواب ——— سب لفظوں کا جال
ہے جس میں زندگی بُری طرح بندھی ہوئی ہے، مقید ہے۔ اگر یہ
لفظوں کی فصیل نہ ہوتی تو زندگی سے موت کتنی قریب ہوتی بلکہ
قریب تر۔ اور کبھی کبھی جب اِن لفظوں کا جادو ٹوٹ جاتا ہے
تو زندگی اور موت میں کوئی تمیز نہیں ہو پاتی۔ میں کسے زندگی کہوں
اور کسے موت۔ کچھ موتیں زندگی سے بہتر ہوتی ہیں اور کچھ زندگیاں
موت سے بدتر۔ اُس وقت ان لفظوں پر رونا آتا ہے اور اپنے
وجود پر بڑی طنزیہ سی ہنسی!

کھوکھلی سی ہنسی میرے کمرہ میں گونج گئی ہے اور میں نے ٹیپ کا
بٹن دبا دیا ہے۔ ہنسی پھر گھٹ کے مرگئی ہے اور مجھے اِس ہنسی
سے بڑا ہی خوف ہونے لگتا ہے۔ میں نے ٹیپ پھر آن کر دیا ہے
ہنسی کے بعد کی آواز آنے لگی ہے ——— آپ کا گھر ——— ہاں آپ
کا ہی ——— جسے میں نے اپنا بنانا چاہا مگر اب تک نہیں ہو سکا
ہے۔ آپ کو ہی مبارک ہو۔ میری قسمت میں اپنا گھر شاید نہیں
ہے۔ پہلے لوگ اپنے ہوتے ہیں، تب نا پھر گھر اپنا۔ لوگ مجھے
غیر سمجھیں تو بھلا گھر کیسے اپنا ہو سکتا ہے:

میری اُنگلیاں رینگنے لگی ہیں اور بٹن دبانے میں کامیاب ہوگئی ہیں
ٹیپ پھر بند ہوگیا۔ الفاظ کی تلخی سارے وجود پر پھیلتی گئی اور
میں نے ایک زوردار جمائی لی۔ جمائی ختم ہوئی تو آنکھوں میں بھولے
آنسو اُبل پڑے۔ آنسوؤں کے بہاؤ میں نہ جانے کتنی ارمانوں کی
لاشیں بہہ چکی تھیں۔ میں نے جو مڑ کر دیکھا تو دس سال کی مدت کا
کمزور جسم فرش پر پڑا کراہ رہا تھا۔ جسم گھائل تھا اور خوابوں کا
بچا کھچا ویران ویران سا۔ ننھی سی دنیا کے خواب کی لاش میرے سامنے
پڑی تھی۔ میں نے اُسے بڑی احتیاط سے اخبار میں لپیٹ کر اپنے
کاندھوں پر رکھ لیا تھا۔ تھوڑی ہی دور چل پایا تھا کہ لاش پھسل کر گر پڑی
میں نے اسے پھر کاغذی پیرہن میں چھپانے کی کوشش کی مگر وہ پھر پھسل کر
گرتی رہی۔ رشتوں کے کچے دھاگے شاید اسے باندھ پاتے مگر میں
اُنھیں کہاں کہاں ڈھونڈتا پھرتا۔ میرے ہاتھوں کی لکیروں میں چکنائی
نہیں تھی۔ لکیروں میں قسمت شاید نہیں ہوا کرتی ——— ہاں۔ ہاتھوں میں

قسمت خود بنتی ہے۔ پھر سوچتا ہوں جب ہاتھ میں ہی قسمت ہوتی ہے تو پھر انہیں میں لکیریں کبھی تو بسا کرتی ہیں۔ مگر شاید یہ لکیریں کسی سرحد کو پار کر لینا ہی جینا ضروری ہے۔ اور لکیروں سے اُس پار سکھ چین اور شانتی ہے اور اِس پار صرف مجبوریاں! صرف ناکامیاں!!

میں پہلی بار اپنے گھر آئی ہوں۔ اپنے نئے گھر ——— جہاں نئی صورتیں ہیں، نئی محبتیں ہیں ——— ایسا ہی ماحول رہ گیا تو اپنے گھر اپنے لوگوں کی کمی محسوس نہیں کروں گی۔ مینا کشی نے مجھے کہا تھا اور مجھے بے اختیار ہنسی آگئی تھی، اُس کے بھولے پن پر! اُس کی معصومیت پر۔ 'ہماری جی! یہ سسرال ہے آپ کی۔ ماحول ایسا نہ بھی رہ گیا تو اپنے گھر، اپنے لوگوں کو بھولنا ہی ہوگا ——— ! کیا سمجھیں؟!'

اور دوسرے دنوں میں ہی ماحول بدل گیا ——— ماں جی تو ماں جی ہی ٹھہریں۔ وہ بڑے پیار سے رہتی ہیں مگر آپ کی چھیتی بہن شکنتلا میرے پیچھے پڑی رہتی ہے۔ مجھے کچھ یہ اچھا نہیں لگتا۔ ہر بات میں نکتہ چینی اور طنز! میں اُس سے بڑی ہوں۔ اُسے میری عزت کرنی چاہیے۔ آپ کے سامنے مجھ سے کیسا اچھا سلوک کرتی ہے مگر آپ نے پیٹھ پھیری اور اُس کی شیطانی شروع ہو جاتی ہے۔

ہوا کا رُخ شاید بدل رہا تھا۔

آسمان پر کچھ گرد بھی تھی۔ مگر چاند صاف چمک رہا تھا۔ چاند کی بڑھیا نانی چرخہ کات رہی تھی۔ لاکھ طوفان آئے، بارش ہو، مگر بڑھیا نانی اپنا کام بند نہیں کرتی۔ وہ مسلسل چرخہ کاتے جا رہی ہے۔ صدیاں بیت گئیں ——— زمانے خاموشی سے نکل گئے مگر اُس کے کام میں کچھ بھی خلل نہ ہوا۔ اُس کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔

یہ گھن گرج کیسی تھی!

زلزلے کا زبردست جھٹکا میں نے محسوس کیا اور چہروں کا رنگ بدلنے لگا۔ اپنے ہی چہرے کو کبھی میں خود نہیں پہچان سکا تھا۔ بڑا دھوکا ہوتا رہا۔ فریب ہوتا رہا۔ قصور آئینے کا تھا یا اِن اَن گنت چہروں کا، اِن پر چڑھتے اُترتے رنگوں کا ——— دوش کس کا تھا ——— میرا، مینا کشی کا یا کسی اور کا ——— دوش کسی کا بھی ہو، میں اپنے آپ کو ہی دوشی سمجھتا رہا۔ یہ میری مجبوری تھی دنیا کیا کہتی رہی اُس کی مجھے فکر نہیں تھی، نہ پرواہی ——— میری گردن پہ زندگی کا بوجھ بڑھ رہا تھا۔ اور زندگی نئی دنیا کا خواب دیکھتے دیکھتے تھک چکی تھی ——— ہار چکی تھی۔ میں جنگلوں میں بھٹکتا پھر رہا تھا۔ غلامی کی زنجیریں میرے وجود کو جکڑے ہوئی تھیں۔ اگر ذہن آزاد ہوتا، شانوں پہ بوجھ کم ہوتا تو اِن زنجیروں کو توڑ سکتا تھا، مگر انہیں توڑ کر دوسرا دوشی نہیں کہلانا چاہتا تھا۔

ننھے قدموں نے ابھی تو چلنا ہی سیکھا تھا اور دنیا کا آنگن وشال تھا مگر زمین کی چھت تپ چکی تھی۔ چھاؤں ملتی تو تھوڑا دم لے سکتا تھا۔ چھاؤں تھی مگر ریکھا کے اُس پار ——— لکشمن ریکھا کے اُس پار جدھر جانا ممکن نہیں تھا۔ تنہا رہتا تو شاید پار کر جاتا اُس ریکھا کو مگر کندھوں پر بوجھ تھا اور بوجھ بنی ہوئی تھیں زندگیاں ——— میں نے سانس لینا چاہی تو دم گھٹنے سا لگا۔ اور جب جب میرا دم گھٹتا سا محسوس ہوا ہے، میں نے ممتا سے پیا ہے۔ ایک زخمی غزال بخشا ہے مل کو، ذہن کو، دماغ کو، اور فکر کو۔ ایک چھوٹا بہلاوا دیا ہے اپنی روح کو۔ مگر میں نے محسوس کیا ہے، زندگی کو جتنا بھی خوشنما بنانے کی کوشش کی ہے، اُلجھنوں کے جال میں پھنستا گیا ہوں۔ کبھی کبھی ایسا احساس جاگ اُٹھتا ہے میرے چاروں طرف حالات کے مکڑے نے جال بُن رکھا ہے، ناکامیوں کے پھندے جھول رہے ہیں، جدھر بھی قدم اُٹھتے ہیں اُلجھتے ہی گئے ہیں۔

دور سے ڈھول بجنے کی آوازیں متواتر میرے کانوں سے سر ٹکرا رہی ہیں۔ ڈھول دور کے بڑے سہانے ہوا کرتے ہیں۔ میں نے شادیانے بجتے بھی سُنے ہیں اور دل اکثر جھوم جھوم گیا ہے۔ شادی کا لفظ بھی بڑا ہی سہانا معلوم ہوتا ہے مگر اُس کی خوشگواری صرف لفظوں کی حد تک ہی قید ہے۔ لفظوں کے باہر معنی بہت ہی تلخ ہیں۔ میں نے بھی کچھ پھل چکھے تو منہ میں تیکھا سا مزہ پھیلتا چلا گیا اور شاید زندگی بھی تلخ سی محسوس ہوئی۔ اِس کا اثر [illegible] پر حاوی رہا اور جب احساس ہی وجود پر مسلط ہو تو سر [illegible] سا ہوتا معلوم ہوتا ہے۔ میں نے جب جب سر جھٹکا [illegible]

ہوا۔ یہ دنیا گھٹتا بھی تھیں۔ اور دنیا گھٹتا ہے میرے جسم کا ہیرا ٹوٹا تھا، میرے وجود کا میری شخصیت کا ——

زندگی کے پُرسکون تالاب کی سطح پر ایک کنکری گری اور پانیوں پر لہروں کا جال سا پھیل گیا۔ آرام کرتے ننھے مچھیوں نے ایسے پَر تولے جیسے اُن پر کوئی حملہ آور ہوا ہو۔ آسمان کی وسعتوں میں گنگھر چین کے پنچھی ڈھونڈتے رہے اور میری آنکھیں کھلی رہیں اور کنکری کی چوٹ میرے دماغ کو مجروح کرتی رہی —— ماں جی سارا گھر چھوڑ کر — میرے ذمہ — دتی پاپا کے پاس چلی گئی تھی۔ اور میں تو تنہا اتنی بڑی حویلی میں بیٹھ کر صرف رو رہی ہوں اپنی قسمت پر — اور کیا؟ اس حویلی کی دیکھ بھال میرے بس کی بات نہیں۔ آپ خود آئیے اور کوئی انتظام کیجئے — !'

ماں کی آنکھوں میں تیرتا ہوا آنسو۔ مجھے یاد آیا بہنوں اور بھائیوں کی محبتیں یاد آئیں اور پتا جی کی شفقت کے سائے یاد آئے، مگر کھوٹ کہاں پر تھی، سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ مجھے اپنی ذمہ داریوں کا کچھ احساس ہوا۔ مگر صرف احساس ہی تو سب کچھ نہیں ہوتا۔ اِس احساس کا سمندر بہت گہرا تھا۔ جو اس میں غوطہ زن ہوا، گہرائیوں نے اُسے صرف افکارِ پریشاں ہی بخشے۔ اور دن کا روشن سورج بھی مندمل ہو گیا تھا۔ دل دُھواں دُھواں اور آنکھیں نمناک سی!

کوئی تسکین پر بھلا کب تک جیئے۔ میں اِس قید سے باہر آگیا ہوں۔ اور اِس وسیع گرشتے لق و دق میدان میں تن تنہا کھڑا ہوں۔ جہاں چند سائے میرا ساتھ چھوڑ کر مجھ سے منہ موڑے دوسری طرف جاتے محسوس ہوتے ہیں۔ میں نے اپنا قدم جمالیا ہے اور سوچا ہے جب تمام سائے ہی سائے ہیں تو ان سایوں کے ساتھ کب تک کوئی بھاگتا پھرے گا۔ میں تو اس میدان میں اُمیدوں کے گل بوٹے اُگاؤں گا اور دیکھوں گا ان سایوں کا فرار۔ یہ بھلا کہاں تک مجھ سے بھاگ سکتے ہیں۔

میناکشی قصوروار بھی تو ہو سکتی ہے۔ اُس نے خلافِ تہذیب کوئی بات کہی ہوگی؟ میرے اندر ایک سوال اُبھرتا چلا گیا۔ زندگی بھی تو ایک سوال ہی ہے۔ اور شاید جس سوال کا جواب موت ہے، صرف موت۔ لوطی سی سوال و جواب کے درمیان کسمساتی ہوئی یہ زندگی کبھی جنت اور کبھی جہنم سی بن جاتی ہے۔ سوالوں کے حلقے سے نکل بھاگنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا سانسیں لئے بغیر زندہ رہنا ہر سُو سوال ہی سوال بکھرے پڑے ہوئے ہیں۔ میں نے ان سوالوں کے سینوں میں جھانک کر دیکھا تو میناکشی کا بے قصور چہرہ چمکا اور میرے اندر ایک عجیب سی جھینپ پھیلنے لگی۔ میں نے اپنی رفیقۂ حیات پر شک کیا۔ اُس کے خلوص کو داغدار بنایا۔ اس کی محبتوں کو دھوکا سمجھا، میں اپنے آپ کو کمینہ محسوس کرتا رہا۔ اور میرا ضمیر فلک شگاف قہقہے لگاتا رہا۔ آسمان کی بلندیوں سے کہیں ایک تارہ ٹوٹا۔ میں نے محسوس کیا جیسے میرا اپنوں پر بھروسے کا جھوٹا احساس فنا ہو گیا ہو، ایک روشنی مندمل ہو گئی ہو، ایک سپنا ٹوٹ چکا ہو جیون کی ڈور کا سمبندھ کسی کے پیار کے آنچل سے بڑا گہرا ہوتا چلا گیا۔ اور دُور بہت دُور بچپن کی کچی باتوں کی تنہائی دل و دماغ میں گشت کرگئی اور اُس کے تانے بانے پر بُنی زندگی کی چاہ بڑی حسین معلوم ہوئی۔ محلّے کے رسول چاچا نے گلی میں دوڑ کر میرے بازو کو پکڑ ہی لیا اور اکھڑی اکھڑی سانسوں کے درمیان سوالات شروع کر دئیے۔

'ارے —— تیرا نام کیا ہے؟'

'ظالم تولہ'

'کیا کھاتے ہو؟'

'گھی سا گولا'

'کہاں رہتے ہو ——؟'

'لال محل میں۔'

'کہاں سوتے ہو —؟'

'لال پلنگ پر۔'

'رانی کہاں ہے'

'ما گھر —'

'لاتے کیوں نہیں؟'

'بدمعاش ہے۔'

'مارتے کیوں نہیں؟'

'دل کی پیاری ہے۔'

میری ہنسی پھوٹ پڑتی اور سول چاچا کا نندہ طائفہ میری پیٹھ پر ہاتھ مارتا اور ان کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہوتا۔ ڈکنس کا قلم تو واقعی [illegible] کی مسافت کو پہلے ہی محسوس کر رہا ہے۔ جیسے یہ ہو زندگی کی حقیقت سے کسے انکار ہے۔ حقیقتوں سے فرار ممکن ہے۔ اور جو بُزدل ہو کر زندہ نہیں رہ سکتا شیکسپیر نے کہا ہے — "بُزدل اپنی موت سے قبل کتنی بار مرتا ہے مگر دلیر اس کا مزہ صرف ایک بار چکھتا ہے —"

مینا کشی میرے ساتھ ہے۔ میرین ڈرائیو کی خم دار سڑک کنارے کی جنت معلوم ہوتی ہے۔ اور سمندر میں بھی زندگی محسوس ہو رہی ہے۔ مگر اس زندگی میں بڑی بے چینی ہے۔ قرار نام کی کوئی چیز نہیں۔ مینا کشی اتنے بڑے شہر کو دیکھ کر زندگی کی تمام تلخیاں بھول گئی ہے۔ مگر مجھے راجندر سنگھ بیدی کی دستک یاد آ رہی ہے۔ بُری طرح۔ زندگی میں سکھ بھلا کہاں ہے۔ پریشانیاں اُلجھنیں اور فکر ہر جگہ تو ساتھ ساتھ ہیں۔ ایرانی ریستوران میں کباب کی خوشبو پھیلتی رہی اور میں نے کافی کی چسکی کے درمیان پاپا کے خط کے الفاظ یاد کئے — "اگر چلے آؤ تو اچھا ہوگا۔ تمہاری ماں کا آپریشن ہے۔ مگر یہاں تنہا آنا —" آخری جملہ پر میرے مُنہ میں کافی کی تلخی پھیل گئی۔ اور اس تلخی کو اپنے تمام وجود پر محسوس کرتا رہا۔ کافی کی پیالی میرے ہاتھ کی گرفت میں بڑی زور سے تھرتھرائی۔ مینا کشی نے مجھے غور سے دیکھا۔ اور میں سنبھل گیا۔ میں نے سوچا کہیں پیالی میں جلتی تلخی مینا کشی پر گر پڑی تو وہ اُس کی کڑواہٹ برداشت نہیں کر سکے گی۔ اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ اور میں نے دھیرے سے کہا۔

"میں نالائق ہوتا جا رہا ہوں —"

مینا کشی کی بھویں تنی رہیں۔ میں نے پھر کہا — "تم کچھ نہیں سمجھو گی۔"

اور وہ ایک عجیب سی کھسیانی ہنسی ہنستی رہی۔ ریستوران کے اندر دنیا سمٹتی آئی اور تھوڑی دیر کے بعد میں مینا کشی کو لے کر باہر نکل گیا اور روشنی کے سیلاب میں گم ہوتا چلا گیا۔ ▲

غزلیں

ڈاکٹر ایل۔ سی۔ نذیر (ناگپور)

منزل کے تقاضا کس موج میں کھویا ہے
منزل نے تو دریا کو ساگر میں ڈبویا ہے

مانا کہ سمندر میں ہر سمت ہے خاموشی
طوفان مگر اُس کی ہر موج میں سویا ہے

اے عشق جو ہم رُسوا ہوتے ہیں تو ہونے دے
دنیا نے فرشتوں کے دامن کو بھگویا ہے

ہر شاخِ گل افشاں پر شبنم کے نگینے ہیں
فطرت نے رگِ گل میں موتی کو پرویا ہے

ہر موجِ مخالف پر اک جوشِ تلاطم میں
ہم نے اِسی کشتی میں طوفان کو ڈبویا ہے

دیکھے ہوئے عارض پر ہے نذیر یہ شادابی
کس ہاتھ نے شعلوں میں شبنم کو سمویا ہے

فکری بدایونی (حیدرآباد)

وقت ہر لمحہ مری یاد دلائے ہے مجھے
دشتِ احساس میں کانٹوں پہ چلائے ہے مجھے

آتشِ ذہن پہ خیالوں کی جلا کر قندیل
میرا احساس نئی راہ دکھائے ہے مجھے

میں کئی بار ترے شہر سے گزرا لیکن
کوئی ہر بار غلط راہ بتائے ہے مجھے

جس طرح بچھڑے ہوئے دوست ملا کرتے ہیں
وقت سینے سے اِسی طرح لگائے ہے مجھے

دیکھ کر جاؤں گا اے وقت پکڑ لے مجھ کو
سر سے پا تک کوئی ہر لمحہ بلائے ہے مجھے

[illegible] اُٹھا [illegible] فکری
ہائے یہ کون [illegible] بلائے ہے مجھے

غزلیں

عظمت حسین خاں میکش (دہلی)

آگست کے شاعر میں جناب جان نثار اختر کی غزل کی ردیف نے میر صاحب کی یاد تازہ کر دی۔ میں بھی اس ردیف میں دو غزلیں پیش کر رہا ہوں۔ میر صاحب کے کلیات مرتبہ ظل عباس عباسی میں صفحہ ۴۲۹ : ۱۲۱ - ۴۲۸ اور ۴۲۶ پر چار غزلیں ہیں، چاروں کی ردیف میں میاں ہے تخفیف یا مشد" ہے میں نے پہلی غزل کی ردیف میں میر صاحب کی تقلید کی ہے۔ فرماتے ہیں:

عشق وہ تھا ستاں خراب ہے میاں
جس سے دل آگ چشم آب ہے میاں

یہ حقیقت ہے یا قیاس ہے میاں
کوئی شے دل کے آس پاس ہے میاں

نقصِ تقسیم کو سمجھ ساقی
جام دے اس کو جس کو پیاس ہے میاں

ہیں سبھی عہدِ بے حسی کا شکار
کون اپنا ادا شناس ہے میاں

مل کے بیٹھیں خوشی کی بات کریں
دیر سے جی بہت اداس ہے میاں

یہ نہ ہوتا تو پھر نہ ہوتا کچھ،
عشق پر زیست کی اساس ہے میاں

میرے بوسیدہ پیرہن پہ نہ ہنس
عاشقوں کا یہی لباس ہے میاں

آگے جو کچھ بھی ہو خدا کے سپرد
دل ابھی تک تو اپنے پاس ہے میاں

کیا کوئی انقلاب باقی ہے
پھر چمن میں لہو کی باس ہے میاں

صرف میکش ہی بدحواس نہیں
آج ہر شخص بدحواس ہے میاں

ہمارے دل کا اک افسانہ بن گیا ہے میاں
جبھی تو اور بھی دیوانہ بن گیا ہے میاں

فراز عشق نے توڑی ہیں بے خودی کی حدیں
جنوں تھا جس کو وہ فرزانہ بن گیا ہے میاں

چمن نہیں اسے فطرت کا میکدہ سمجھو
ہر ایک پھول ہی پیمانہ بن گیا ہے میاں

سوائے اس کے کوئی شوق ہی نہیں دل کو
خرابِ جلوۂ جانانہ بن گیا ہے میاں

نہ جانے لوگ محبت کو کیا سمجھتے ہیں،
ذرا سی بات کا افسانہ بن گیا ہے میاں

ہمیں تو اب بھی نہیں ہے کوئی گلہ تم سے
تمہارا رنگ حریفانہ بن گیا ہے میاں

کسی کے ہاتھ میں دامن، کوئی گریباں گیر
ہر ایک آدمی دیوانہ بن گیا ہے میاں

نہ جانے کس کی نگاہوں نے زہر گھولا ہے
کہ دل سا دوست بھی بیگانہ بن گیا ہے میاں

جہاں بھی بیٹھ گئے لیکے جام دمِ میکش
وہی مقام پہ میخانہ بن گیا ہے میاں

پروفیسر فاروق احمد صدیقی

غالبؔ کی انا

بلائے جاں ہے غالبؔ اس کی ہر بات — عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

غالبؔ نے یہ شعر ہو سکتا ہے اپنے محبوب کے جلوۂ صد رنگ سے متاثر ہو کر کہا ہو لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ شعر اپنی پوری معنویت کے ساتھ جتنا خود ان کی ذات پر منطبق ہوتا ہے کسی اور شخصیت پر نہیں۔ آج غالبؔ کی ہر عبارت، اشارت اور ادا ایک لامتناہی بحث کا موضوع بنی ہوئی ہے۔ ان کی عظمتِ فکر کی بات ہو یا ان کی پہلودار شخصیت کا قضیہ۔ عقائد سے متعلق گفتگو ہو یا ان کی نام نہاد خودداری کا مسئلہ۔ ان میں سے ہر ایک عنوان ایک مستقل اور مابہ النزاع مسئلے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان مسائل پر جب بھی گفتگو ہوتی ہے افراط و تفریط کا رنگ پیدا ہو ہی جاتا ہے۔ آج تک کوئی غالب شناس اپنے قارئین کو کسی نقطۂ مفاہمت پر نہیں پہنچا سکا۔ شاید یہ بھی غالبؔ کی عظمت ہی کی دلیل ہے مگر دراصل آج تک غالبؔ پر بے لاگ تنقید کم اور مدلل مداحی زیادہ ہوئی ہے اور ایسا اس لئے ہوا ہے کہ سخن فہم کم اور طرفدار زیادہ ہیں۔ نتیجے کے طور پر ان کی شخصیت اور افتادِ طبع کا تجزیہ کرنے میں حقیقت سے زیادہ کام لیا گیا ہے۔

(غالبؔ کے عظیم فنکار ہونے میں دو رائیں نہیں۔ اس امر سے کون کافرِ ادب انکار کر سکتا ہے کہ غالبؔ نے اپنی غزلوں کے ذریعہ اردو شاعری کو جو وقار، رچاؤ اور اعتبارِ نظر بخشا وہ کیفیت اور کمیت ہر دو اعتبار سے ایک عظیم ورثے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اردو غزل اپنے دو قدردانوں اور فنکاروں میرؔ و غالبؔ پر جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔ محترم رشید احمد صدیقی صاحب نے غزل کو اردو شاعری کی آبرو کہا ہے اور میں میرؔ و غالبؔ کو اردو غزل کی آبرو سمجھتا ہوں۔ قدرِ گوہر شاہ داند ..... کے بمصداق میرؔ کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف خود غالبؔ نے بھی بڑے دلکش و دل آویز انداز میں کیا ہے ؎

میرؔ کے شعر کا احوال کہوں کیا غالبؔ — جس کا دیوان کم از گلشنِ کشمیر نہیں

لیکن بقول مولانا محمد حسین آزاد میرؔ کی عظمت کے ضامن صرف بہتّر نشتر ہیں۔ آزاد مرحوم کی اس انتہا پسندانہ رائے سے قطع نظر دوسرے صاحبانِ نظر اور نباضانِ فن کا یہ فیصلہ ہے کہ میرؔ صاحب کے یہاں صرف ایک فنی پہلو ہے نشتریت اور غالب فکری عنصر ہے حزن و یاس۔ اگرچہ یہ ایک بڑا قیمتی اور جاندار پہلو ہے۔ بقول شیلےؔ

My sweetest songs are those that tell of saddest thought.

"ہمارے شیریں ترین نغمے وہ ہیں جو ہمارے شدید ترین غم کی ترجمانی کرتے ہیں۔"

بالمقابل اس کے غالبؔ کا دیوان [illegible] ایسا چمن زار ہے جس کی تزئین و آرائش میں باغباں نے [illegible] کا ثبوت پیش کیا ہے اور جہاں ہر رنگ کے خوش نما و خوش رنگ اور خوشبودار پھول بڑے سلیقہ سے ہر منزل سے آراستہ کئے گئے ہیں۔ [illegible]

شاعر مشرق

کلام غالب کا علاوہ دلفریب حسن ہے جس نے ان کی شخصیت کو تمام کمزوریوں اور کوتاہیوں سے منزہ کر دیا ہے اور ان کی بشریت کے خول پر ملکوتیت کا غلاف ڈال دیا ہے۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے "دیوانِ غالب" کو الہامی کتاب قرار دے کر ان کی مٹی پلید کی ہے اور اب کچھ حضرات خوش عقیدگی میں غالب کی شخصیت کو ایک الہامی شخصیت باور کرانے پر مصر ہیں۔ اب یہی ان کی انا یا خودداری کا مسئلہ اٹھایا جائے تو غالب کا ادنیٰ سے ادنیٰ قاری بھی اس سلسلے میں دو تین اشعار تو ایک ہی سانس میں پڑھ ڈالے گا ۔

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم　　الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے　　یار کا دروازہ پاویں گر کھلا

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک　　میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

اور اس کے علاوہ سب سے بڑا ثبوت دہلی کالج میں پروفیسر کی حیثیت سے ان کا تقرری کے لئے جانا اور کالج کے انگریز پرنسپل کے ذریعے استقبال نہ کئے جانے پر ازراہ خودداری و غیرت پلٹ کر چلا آنے کا واقعہ بڑے طمطراق کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ اس واقعہ سے ان کی بے پناہ خودداری کا اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن تصویر کا دوسرا رخ بڑا ہی بھیانک اور تاریک ہے۔ اگر صرف اس واقعہ سے ان کی خودداری کا ثبوت ملتا ہے تو دوسرے بےشمار واقعات سے ان خوش فہمیوں اور نعرہ بازیوں کی تردید ہوتی ہے۔ پھر کہا جاتا ہے کہ اس میں خود ان کا اور اس وقت کے نامساعد حالات کا زیادہ ہاتھ تھا۔ ٹھیک ہے آدمی مجبوری کے عالم میں اپنی سطح سے نیچے آجاتا ہے لیکن غالب نے جس لحاظ سے اپنی خودداری کا راگ الاپا اس کے پیشِ نظر کم از کم انہیں خودداری کی اس نچلی سیڑھی پر نہیں آنا چاہیے جہاں سے ذلت اور ہلکا پن کی سرحد شروع ہوتی ہے۔

معاشی مجبوریاں اور ناقدریٔ زمانہ کا رونا میر بھی روئے ہیں اور مفلسی و تنگدستی نے انہیں بھی اس حد تک پہنچا دیا تھا جہاں انہیں نہیں جانا چاہیے۔ وہ خود ایک مثنوی "شکایتِ روزگار" میں فرماتے ہیں ۔

جانا نہ تھا جہاں مجھے سو بار واں گیا　　ناطاقتی سے دستِ بدیوار واں گیا

اور اپنی طبعی خودداری کا میر کو بھی بڑا پاس تھا ۔

آگے کسو کے کیا کریں دستِ طمع دراز　　وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

لیکن انہوں نے اپنی خودداری کا کبھی ڈھنڈورا نہیں پیٹا اور معاشی بدحالی کے انتہائی بھیانک دور میں بھی اپنی عزتِ نفس کو سنبھالا۔ دوسری طرف حضرت غالب ہیں جن کی انا خدا سے بھی در کعبہ وا کرنے کی درخواست کرنا کسرِ شان سمجھتی ہے۔ مگر وہ انسانوں کے سامنے محض چند سکوں اور چند پیسوں کے لئے دستِ سوال دراز کرنے پر بلا تامل راضی ہو جاتی ہے۔

تسلیم کہ وہ ایک انسان تھے اور انسانی ضروریات سے مبرا نہیں تھے۔ وہ اس زمانے کے ان معزز ین و شرفا میں سے تھے جنہیں اپنی وضعداری کا بڑا لحاظ و پاس تھا لیکن ایک وضعدار اور خودداری پر ناز کرنے والا جب ایک بادشاہ کے تیور کو دیکھ کر اپنے اندازِ فکر اور موقف کو بدل لیتا ہے تو یہ خودداری کی کون سی قسم ہوتی ہے۔ ؎

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

شہزادہ جواں بخت کی شادی کے موقع پر غالب کی سہرا نویسی، مقطع کے شعر میں استاد ذوق کی کم مائگی اور خود بادشاہ کی سخن فہمی پر چوٹ کرنا اور پھر اس پر بادشاہ کا ردعمل جان کر "معذرت نامہ" پیش کرنا یہ سب کیا ہے ؟؟

سب سے زیادہ حیرت اس وقت ہوتی ہے جب غالب جیسا خوددار اور وضعدار شخص مفتی صدرالدین آزردہ کی تنخواہ دربار رامپور سے بند کرانے کی سازش میں رنگے ہاتھوں پکڑا جاتا ہے تاکہ وہ روپیہ کسی ڈھب سے ان ہی کو مل جائے۔ اس کو خودداری کہا"

* جلنے یا حد سے فزوں حرص و ہوس کا جنون تھا

یہی وہ کھوکھلی خودداری اور بے روح انا تھی جس نے مرزا قتیل جیسے انہیں رسوا کیا۔ مرزا قتیل سے ان کی لڑائی میں شہرت اور اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہوئے تھے لیکن خود رسوا ہوئے اور اس غریب کا کچھ نہ بگڑا۔ پہلے تو بڑے جوش و طمطراق سے اگرچہ وہ بے لاگ نادرا اور رکیک حملے کئے۔

"اصل فارسی کو اس کھتری بچہ علیہ ما علیہ نے تباہ کیا۔ رہا سہا غیاث الدین رامپوری نے کھو دیا" (عود ہندی ص ۳۱)

"غیاث اللغات اور چہار شربت کو میں حیض کا لتہ سمجھتا ہوں۔ ایسے گمنام چھوکروں سے کیا مقابلہ کروں گا" (اردوئے معلیٰ خطوط غالب ص ۱۹۴)*

"وہ نخاس اور عبد الواسع ہانسوی اور وہ الو کا پٹھا قتیل ...." اور اس طرح کی بیشمار مثالیں اُن کے خطوط میں ملتی ہیں جنہیں از راہ طرف داری نظر انداز کیا جاتا ہے۔

لیکن جب ان کی ادبی کوششیں شروع ہوئیں تو تو نوراً "مثنوی باد مخالف" لکھ کر معذرت چاہی اور جس میں اپنی انانیت کا گلا گھونٹ کر اکثر مقامات پر مرزا قتیل کی تعریف کی ہے۔ ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں ؎

می شوم تو لیش را بہ صلح دلیل   می سرایم نوائے مدح قتیل
گرچہ ایں انیش نخواہم گفت   سعدی ثانیش نخواہم گفت
لیک از من ہزار بار بہ است   از من و چوں من ہزار بہ است
من کفِ خاک و او سپہر بلند   خاک را کے رسد بہ چرخ گزند
مرحبا ساز خوش بیانیِ او   حبذا شور نکتہ دانیِ او

یہ اشعار کہتے وقت مرزا نے زہر کے کتنے تلخ جام نوش کئے ہوں گے اور چہرے پر غیظ و غضب کے کتنے رنگ آتے جاتے رہے ہوں گے یہ ذرا سوچنے کی بات ہے۔

جب تک بہادر شاہ ظفر تخت شاہی پر جلوہ افروز رہے غالب ان کی مبالغہ آمیز تعریف و توصیف کرتے رہے۔ حد تو یہ ہے کہ انہوں نے طغرل و سنجر جیسے ذی مرتبت سلاطین کو بھی محض جاہ و حشمت کی طلب میں بہادر شاہ کے سامنے نیچا کر دکھایا جب کہ ان دونوں نامور حکمرانوں کی نسلی برتری مؤخر الذکر پر مسلّم ہے اور خود غالب بھی جب خود کو اس قبیلہ کا ایک فرد تصور کرتے ہیں۔ ذیل کے اشعار کو سن کر عالم ارواح میں طغرل و سنجر کی روح غم و غصہ سے کتنی پیچ و تاب کھا رہی ہوگی۔

شاہ کے آگے دھرا ہے آئینہ   اب مآلِ سعیِ اسکندر کھلا
ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے   اب فریبِ طغرل و سنجر کھلا

اس پر بھی ان کی ہوس پرست طبیعت مطمئن نہ ہو سکی اور انہوں نے بہادر شاہ کے اسیر زنداں ہو جانے کے بعد انگریز بہادروں کی مدح سرائی شروع کر دی اور یکے بعد دیگرے ایک سے ایک مبالغہ آمیز قصیدہ نہایت خوشامدانہ انداز میں کہنا شروع کیا۔ چنانچہ اُن کی آخری تصنیف "سبد چین" انہیں قصائد کا مجموعہ ہے جو انہوں نے اپنے چار انگریز ممدوحین لارڈ الگن، لارڈ ڈلہوزی، منٹگمری اور میکلوڈ کی تعریف میں کہے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی بے شمار نوابوں، رئیسوں اور انگریز بہادروں کی تعریف میں قصائد کا دفتر موجود ہے۔ بات قابل اعتراض یہ نہیں ہے کہ انہوں نے کیوں کسی کی قصیدہ خوانی کی بلکہ قابل گرفت بات صرف اتنی ہے کہ [illegible] سطح سے نیچے کیوں اتر آئے؟ اور جب سطح سے نیچے آ گئے تو ادعائے خودداری بے معنی!! — اور غالب کی انا کا [illegible] تنقید نگاروں کے یہاں ذکر کیوں نہیں آتا۔ غالب کی کمزوریوں پر کیوں پردے ڈالے جاتے ہیں؟؟

بستر آ جاؤ گی۔ بتاؤ نا ابا! تم علاج کیوں نہیں کرواتے۔ بولو ابا! بولو کچھ تو بولو!"

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میرا سر گھوم رہا تھا۔ میں کچھ دیکھ نہ سکا۔ پھر میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اب میرے سامنے میرے بچے کھڑے تھے۔ ایک کہہ رہا تھا: "ابا مجھے فیس ادا کرنی ہے کل ہی آخری دن ہے۔" ایک کہہ رہا تھا۔

"ابا میرے کپڑے پھٹ گئے ہیں۔ سب لڑکے میرا مذاق اڑاتے ہیں۔" ایک کہہ رہا تھا۔ "ابا میری تختی ٹوٹ گئی ہے۔ نئی لا کر دو نا۔" چھوٹی منی بولی: "ابو! مجھے گڑیا کب لا دو گے۔" میرا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ اب میرے کانوں میں منیجر کی صلواتیں سنائی دینے لگیں۔ میں نے کان بند کر لئے مگر وہ بدستور برسے جا رہا تھا۔ مجھے زندگی سے نفرت ہونے لگی۔ یہ بھی کیا زندگی ہے؟ نہ سکون ہے نہ چین، نہ راحت نہ آرام، ہر وقت غم انگیز خیالات میں غرق ہونے کے سوا اس زندگی میں اور کیا ہے؟ ہر وقت ذلیل مسائل، دماغ میں طوفان اور دل میں فکر۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ یہ بھی کوئی جینا ہے۔ اے خدا۔ تو نے مجھے کیوں پیدا کیا؟ تو نے مجھے کیوں عقل دی؟ تو نے مجھے کیوں سوچنے کی صلاحیت دی؟ کیوں جذبات و خیالات عطا کئے؟ کیوں آرزوؤں کی دنیا اور امیدوں کی روشنی سے دل میں اجالا کر دیا مگر عمل میں اور حقیقی زندگی میں کیوں مجھے ان سے محروم رکھا ہے۔ اگر تو انہیں مجھے نہیں دے سکتا تو مجھے اس دنیا سے اٹھا لے" مجھے اس جہان کی ضرورت نہیں۔ میں یہاں جی نہیں سکتا۔ میں گھٹ گھٹ کر مر نہیں سکتا۔ میرے وجود کو ختم کر دے۔ مجھے اس دنیا سے اور اس کی محرومیوں سے نجات دے۔ مگر...

مگر... تو تو کچھ کرتا ہی نہیں۔ تجھ میں مجھے مارنے کی طاقت نہیں مگر مجھ میں تو ہے۔ میں خودکشی کر لوں گا۔ مجھے تیری مدد کی ضرورت نہیں۔ میں خود اپنے وجود کو ختم کر دوں گا۔ کل ہی میں نے خواب آور دوا خریدی تھی۔ کل ہی میں مرنا چاہتا تھا مگر کچھ امیدیں کچھ تمنائیں میرے راستے میں حائل ہو گئیں مگر اب مجھے پورا یقین ہے کہ یہ آرزوئیں، یہ امیدیں، یہ خواہشات پوری نہیں ہوں گی۔ اس لئے آج میں خود حیات سے آزاد ہو جاؤں گا۔ میں نے کاغذ نکالا اور استعفیٰ لکھ کر اردلی کے ہاتھ میں تھما کر آفس سے باہر نکل گیا۔

میرے قدم جلدی جلدی اٹھ رہے تھے کیونکہ میں اس دنیا سے دور جانا چاہتا تھا۔ یہ میرے آخری قدم ہوں گے جو اس فانی دنیا پر پڑ رہے ہیں اور میری منزل نزدیک تھی۔ مجھے ان لوگوں پر ترس آ رہا تھا جو سڑک پر چل رہے تھے، اپنے دلوں میں میری طرح حسرتوں کا جنازہ لئے ہوئے مگر انہیں کیا معلوم کہ یہ امیدیں کبھی بر نہیں آئیں گی۔ خوشی کبھی میسر نہیں ہو گی۔ ایسے ہی خیالات میں گم میں جلد اپنے گھر چلا گیا۔ گھر میں قدم رکھتے ہی راجو سامنے آئی۔ میں نے اس کو اپنی باہوں میں لے کر چوم لیا۔ وہ حیران رہ گئی کیونکہ ان بیس سالوں میں میں نے اسے اس طرح پیار نہیں کیا تھا۔ اس میں اب پہلی سی کشش نہ تھی۔ اس میں اب وہ نزاکت نہیں تھی، مگر چونکہ میں اب اس دنیا کو چھوڑ کر جا رہا ہوں اس لئے میں نے اسے چوم لیا۔ تھیلی اس کے ہاتھ میں تھما دی۔

"کپڑے بدل لو۔ میں چائے لاتی ہوں۔" کہتی ہوئی وہ باورچی خانہ میں چلی گئی۔ میں اپنے کمرے میں جا کر کپڑے بدلنے لگا اور میرے دماغ میں یہ خیال آیا کہ میرے بعد میری بیوی کا حال کیا ہو گا۔ بچوں کی خبر گیری کون کرے گا۔ مگر میں نے خود کو دلاسا دیا کہ وہ کہیں نوکری کر کے اپنا پیٹ بھرے گی۔ بچے یتیم خانہ میں پڑھیں گے اور شاید کسی سے عشق کر کے شادی کر لے گی۔ میرا دل بھی سخت ہوتا جا رہا تھا اس لئے اس نے یہ مشورہ مان لیا۔ میں نے کپڑے بدل لئے اور میز کی دراز میں ہاتھ ڈالا مگر وہاں کچھ نہیں تھا۔ میں نے اور اندر ٹٹولنے کی کوشش کی مگر وہاں بھی کچھ نہ تھا۔ میرا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ میں نے دراز کو باہر نکالا اور الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا مگر اس میں کاغذوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ کہاں گئی وہ نیند کی گولیوں کی شیشی۔ میں نے دوسری دراز میں دیکھا وہاں بھی کچھ نہیں تھا۔ اتنے میں راجو کے پیروں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے دراز کو اپنی جگہ پر رکھ دیا اور چپ چاپ بیٹھ گیا۔ راجو اندر آئی اور چائے کی پیالی ہاتھ میں تھما کر جانے لگی۔ میں نے

(باقی صفحہ [illegible] پر دیکھئے)

غزلیں

ظفر غوری (کوٹہ)

عکسِ ہستی قید کیسے بے نشاں گنبد میں ہے
آسماں کا وعدہ تو میری نظر کی حد میں ہے

سنگِ قامت میں تڑپتے ہیں کسی آمد کے خواب
نوجواں جذبوں کی حسرت میرے خال و خد میں ہے

قتل کرنے کے بہانے ڈھونڈتا ہوں رات دن
ایک عجب خواہش کا سایہ میرے ٹوٹے قد میں ہے

کل تری ہر بات ہوتی تھی مری تائید میں
آج ہر ہر لفظ میری گفتگو کے رد میں ہے

وقت سکھلانے لگا ہم کو عجب حرف و نوا
اسمِ اعظم زندگی کا اِس نئی ابجد میں ہے

سنگ بن کر بھی نہ پایا وقت کی ٹھوکر ظفر
وہ تو نازک پھول ہو کر آندھیوں کی زد میں ہے

اختر نظمی (گوالیار)

اب دل کا ذہن جانے کہاں رہبری کرے
اپنے ہی تجربوں کی طرف لوٹ آیئے

تنہائیاں بھی دین ہیں تقدیر کی ، مگر
تنہائیوں کا جشن کہاں تک منایئے

ہم کر سکے نہ خود کبھی انصاف اپنے ساتھ
اب اور کیا کسی کا خلوص آزمایئے ،

شاید کسی کے لب پہ تبسم چمک اٹھے
پتھر کے پیکروں کو ذرا گدگدایئے

لوگوں کا کرب ٹوٹ کے صدیوں میں بٹ گیا
نظمی یہ بات سچ ہے تو خوشیاں منایئے

سعید عارفی (الہ آباد)

عجیب بات ہے ساحل پہ تھا کھڑا خاموش
میں ڈوبتا ہی گیا اور وہ رہا خاموش

سکوتِ دشت کو دیتے ہو اِذنِ سرگوشی
ہوائے وقت کی شاید ہے ہر نوا خاموش

صلیبِ درد پہ لٹکا ہے جذبۂ تخلیق
خیال و فکر کا یہ جسم ہو گیا خاموش

تو اپنی ذات میں سیمابیت کو جذب تو کر
مری نگاہ میں ہے تیری ہر ادا خاموش

بپا ہے ذہن میں طوفان اک تلاطم خیز
یہ اور بات کہ ہے شہر کی فضا خاموش

عجیب شخص ہے ملئے تو گفتگو نہ کرے
بلایئے تو رہے اک چٹان سا خاموش

سعید دیر سے ویراں اداس کمرے میں
پڑا ہے اوڑھے ہوئے درد کی ردا خاموش

مومن خاں شوق (حیدرآباد)

نقش و رنگ

نقش روشن تھے
ہر تعبیر جو الٹی اب کے
سایہ سایہ کسی آسیب کے مانند حیات
ایک اک چہرہ کا منھ نوچ رہی ہے بڑھ کر
نور و ظلمت کی کشاکش سے جو معنی نکلیں،
ہاں، وہی شہر طلسمات کا مفہوم نہیں
رنگ نکھرے
تو یقیں ہے مجھے چہرہ بدل جائے
نقش روشن ہوں
سویرا ہو جائے،

جاوید مہدی

ایک نظم

تین نقطے بنا کے کاغذ پر
ایک تذبذب میں پڑ گئے تھے ہم
فکر یہ تھی کہ کوئی شکل بنے
تھا تو یہ کھیل کچھ لکیروں کا
پر لکیریں بھی رُخ بدلتی ہیں
جی میں آیا کہ زاویہ کھینچیں
یا مثلث کی شکل دے ڈالیں
فیصلہ کر نہ پائے تھے کوئی
دفعتاً ہاتھ کو ہوئی حرکت
اور ایک دائرہ بنا بیٹھے۔
وہ جو نقطے ابھی تھے کاغذ پر
پڑ گئے دائرے کے چکر میں
اور اپنا وجود کھو بیٹھے،

اسحاق ملک (حیدرآباد)

سوال

غریب لوگ تہی ہاتھ، بے طلب آنکھیں
بجھے بجھے کئی منظر
دھواں دھواں نقشے۔
سڑک پہ رینگتے سائے تلاش کرتے ہیں
برہنہ جسم اداسی کا پیرہن اوڑھے
اماں ملے تو یہ کشکول تج دیں اپنا
کوئی بتائے کدھر ہے فقیہہ شہر ستم

قاسم یوسف

شبنم کا پاسبان

میں جیسے ہی منیجر کے کمرے سے باہر نکلا۔ دفتر کا کام یکدم رُک گیا۔ ٹائپ کی کھٹ کھٹ بند ہو گئی، فائلوں کی سرسراہٹ ختم ہو گئی۔ سب کی نگاہیں مجھ پر مرکوز ہو گئیں۔ میں سر جھکائے اپنی کرسی کی طرف بڑھا۔ مجھ پر سوالات کی بوچھار ہونے لگی۔ میں نے کسی کی طرف نہیں دیکھا۔ کسی کو جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔ میرے وجود پر طنز ہونے لگا۔ میری آنکھیں غصے سے سُرخ ہو گئیں۔ مجھے ان لوگوں پر غصہ آنے لگا۔ یہ لوگ کیوں بھول جاتے ہیں کہ ایسا وقت اُن کی زندگی میں بھی کبھی آیا تھا اور آئندہ بھی آسکتا ہے۔ میں نے غصے کو ضبط کرنا چاہا کیونکہ اس کا اظہار بیکار تھا۔ میں کسی فرم کا مالک نہیں کہ اپنا غصہ کلرکوں پر اُتاروں۔ میں کوئی وزیر نہیں کہ اپنے غصے کا عتاب کسانوں کے پیٹ کو دوں۔ میں کوئی سیٹھ ساہوکار نہیں ہوں کہ اپنا غصہ اپنے نوکروں پر خرچ کروں۔ میں تو ایک حقیر کلرک ہوں جو اپنا غصہ معمولی اردلی پر بھی نہیں اُتار سکتا۔ کیونکہ وہ منیجر کا گُرگا ہوتا ہے۔ میں تو اپنا غصہ اپنی بےزبان فائلوں پر اُتار سکتا ہوں۔ چنانچہ میں نے فائلوں کو غصے سے میز پر پٹخ دیا مگر میرا غصہ ختم نہیں ہوا۔ میں نے اپنی مٹھیوں کو بھینچ لیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میری سُرخ آنکھوں میں پانی سا چھلکا۔ اور آنکھوں سے نکلنے والے شعلوں نے اُسے جھلسانا شروع کر دیا۔ میں اس بوند کو گرانا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور وہ چھلک ہی گئیں۔ میں نے ہاتھ سے اُس کو پونچھ دیا۔ اب میرا غصہ دھیرے دھیرے سرد پڑ گیا۔ میں نے پھر سے فائل اٹھائی۔ اُس میں ایک خط پڑا ہوا تھا جو دراصل جاوید کی پیدائش کی خوشی سے متعلق تھا۔ مجھے لگا تھا کہ حروف بڑے جاوید بابا کی آواز سے آ رہے ہیں۔ مجھے الفاظ کے بجائے گھر کی باتیں نظر آنے لگیں۔ میں نے فائل بند کر دی اور دونوں کہنیوں کو میز پر ٹیک کر سر کو ہاتھوں میں لے لیا۔ اور آنکھیں بند کر لیں۔ میرے سامنے میری بیوی آ کھڑی ہوئی۔ وہ شکایت کر رہی تھی کہ تم نے مجھے کیا دیا۔ نہ تم نے مجھے اچھے کپڑے دیئے، نہ اچھے زیورات دیئے، نہ کبھی فلم کا شو کرایا۔ اُوپر سے پانچ بچوں کا بوجھ سر پر لاد دیا جسے دیکھ دیکھ کر میں روتی رہتی ہوں۔ کسے چاہیے یہ بکھیڑا۔ مجھے تو تمہارا پیار چاہیے تھا۔ شادی کے بعد وہ پیار بھی دھیرے دھیرے ختم ہوتا چلا گیا جس کے لئے میں نے اپنا گھر بار چھوڑا۔ تم نے میرے لئے کیا کیا؟ کیوں اب بھی جھوٹی محبت جتاتے ہو؟ مجھ جیسی کے سامنے ایسی صورت لئے آتے ہو؟؟؟ میں نے اپنے بال نوچ لئے۔ میری بیوی چلی گئی۔ مگر اُس کی جگہ میری بیٹی انیتا آ گئی۔

"ابا! کیوں میری طرف اس طرح دیکھ رہے ہو۔ تم نے مجھے کیوں جنم دیا۔ پیدا ہوتے ہی مجھے مار دیتے تو اچھا تھا۔ میرے ارمانوں کا خون ہو رہا ہے۔ میرے خواب چکنا چور ہو رہے ہیں۔ میری آرزوؤں کا چراغ بجھ رہا ہے۔ میری انگلیاں مشعلیں بن کر میری ایڑیوں پر [illegible] ہو۔ کیا میرے ارمان [illegible] ہی کی [illegible] کے وہ جائیں گے۔ کیا میرے خواب [illegible] نہ جل سکیں گے۔ کیا میری آرزوؤں کا چراغ [illegible] بجھ جائے گا۔ کیا میری انگلیاں [illegible]

مقالہ

آئن واٹ

ترجمہ و تلخیص :- پروفیسر ابراہیم رنگلا

ناول اور حقیقت پسندی

کیا ناول ادب کی نئی صنف ہے ؟ اگر ہم اسے نئی مان کر چلیں اور یہ بھی مان لیں کہ DEFO، RICHARDSON اور FIELDING سے اس کی ابتدا ہوتی ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ عہدِ گذشتہ کے نثری قصوں سے کس اعتبار سے مختلف ہے ؟ اور یہ اختلافات خاص زمان و مکان میں کیوں ظہور پذیر ہوئے ؟

اِن اہم سوالوں کا جواب آسانی سے نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ ڈیفو، رچرڈسن اور فیلڈنگ کسی خاص ادبی مکتبِ خیال سے تعلق نہیں رکھتے۔ اِن تینوں کی تصنیفات ایک دوسرے سے اتنی مختلف ہیں کہ اِن میں باہمی اثرات کی تلاش لاحاصل ہوگی۔ ہمیں دوسری راہ اختیار کرنی ہوگی۔ یہ بات تسلیم کرتے ہوئے کہ ایک ہی نسل میں پہلے تین ناول نگاروں کا پیدا ہونا اتفاقی نہیں ہو سکتا اور حالات کچھ اِس قسم کے تھے کہ اُن کو اپنے تجربات کے اظہار کے لئے ایک نئی ہیئت بنانی پڑی۔ ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ سماجی اور ادبی فضا میں وہ کونسی خوش آئند تبدیلیاں تھیں اور کون سے حالات تھے اور ڈیفو، رچرڈسن اور فیلڈنگ نے اِن سے کس حد تک فائدہ اُٹھایا۔

اِن محرکات اور سماجی زندگی میں اِن تبدیلیوں سے بحث کرنے سے پہلے ناول کی خصوصیات کا سرسری جائزہ لینا ہوگا۔ ناول کی تعریف کچھ اِس طرح کرنی ہوگی کہ پرانی داستانیں اور قصے اس کے زمرے میں نہ آئیں، اور مختلف انداز کی تحریریں جن کو ناول سمجھا جا سکتا ہے اِس میں شامل ہو جائیں۔ اِس سلسلے میں ہمیں ناول نگاروں سے زیادہ مدد نہ مل سکے گی۔ یہ درست ہے کہ رچرڈسن اور فیلڈنگ دونوں کو اِس بات کا احساس تھا کہ اُنہوں نے ایک نئی ہیئت کو جنم دیا ہے اور روایتی قصوں اور داستانوں سے انحراف کیا ہے۔ لیکن جہاں تک اِس نئی ہیئت کی خصوصیات کا تعلق ہے یہ دونوں ناول نگار اور اُن کے معاصرین اِس سلسلے میں خاموش ہیں۔ دراصل لفظ ناول اٹھارویں صدی کے اخیر میں مروج ہوا۔

ناول کی سب سے اہم خصوصیت جو اٹھارویں صدی کی اُن تحریروں کو قصے کہانیوں اور داستانوں سے ممتاز کرتی ہے وہ ہے "حقیقت پسندی" (REALISM) یہاں اِس اِصطلاح کی تشریح ضروری ہے، اِس کے بغیر یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ تمام سابق مصنفین اور اُن کی ادبی تحریریں حقیقت سے دُور تھیں۔

حقیقت پسندی کی اِس اِصطلاح کو پہلی بار ۱۸۳۵ء میں فرانس میں اِستعمال کیا گیا اور یہ REMBRANDT کی تصویروں کو نیو کلاسیکی تصویروں سے الگ کرنے کے لئے اِستعمال ہوئی۔ بدقسمتی سے اِس نئی اِصطلاح کی افادیت فلابیر اور اُس مکتبِ فکر کے دوسرے ادیبوں کے ناولوں میں تمام ناول جنسی کجروی کے سلسلے میں بحث و مباحثہ کی نذر ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ "حقیقت پسندی" کا اِطلاق "عینیت پسندی" IDEALISM سے مختلف معنوں میں ہونے لگا۔ پست زندگی کے اظہار کا نام حقیقت پسندی رکھا گیا

اور اس طرح پرانے قصے کہانیوں اور داستانوں سے ناول کا تعلق قائم کیا گیا۔

ظاہر ہے کہ یہ خیال غلط تھا کیونکہ ناول انسانی زندگی اور تجربے کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کرتا ہے۔ ناول کی حقیقت پسندی ایک خاص قسم کی زندگی کو پیش کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ اُس کے انداز پیش کش کا نام ہے۔ یہی نقطۂ نظر فرانسیسی حقیقت پسندوں نے اپنایا تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ اگر اُن کے ناولوں میں زندگی کے تاریک گوشوں کی عکاسی کی گئی ہے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ زندگی کا مطالعہ سائنسی انداز اور غیر جذباتی طریقے سے پہلی بار کیا جا رہا تھا۔ فرانسیسی ادیبوں نے البتہ اس مسئلے کی وضاحت نہیں کی جو ادب کی دوسری قسموں کے مقابلے میں ناول میں بار بار اُبھر کر آتا ہے۔ یعنی زندگی کی حقیقت اور ادبی تحریروں میں اس کے اظہار کے درمیان کیا رشتہ ہے۔

ڈیکارتے DESCARTES کے نزدیک حقیقت کی تلاش کلّی طور سے انفرادی کوشش ہے اور یہ تلاش منطقی اعتبار سے ماضی کی روایتی فکر سے آزاد ہے اور اُسی وقت کامیاب ہے جب یہ ماضی سے پوری طرح انحراف کرے۔ ناول ایک ایسی ادبی صنف ہے جو بھرپور طریقے سے اس انفرادی جستجو کا اظہار کرتی ہے۔ پرانی ادبی اصناف اپنے کلچر کے عام رجحان کا اظہار کیا کرتی تھیں اور روایتی طور طریقوں سے ہم آہنگی حقیقت کی سب سے واضح کسوٹی تھی ــــ مثلاً کلاسیکی اور نشاۃ ثانیہ کے رزمیے گزشتہ تاریخ یا حکایات پر مبنی تھے۔ اس ادبی روایت پرستی سے پہلی بغاوت ناول کی صنف میں ظاہر ہوئی۔ کیونکہ ناول کا بنیادی مقصد انفرادی تجربے کی سچائی کا اظہار ہے۔ سچائی جو ہمیشہ نرالی اور اسی لئے جدید ہے۔ منطقی اعتبار سے ناول اس کلچر کے اظہار کا ایک وسیلہ ہے جس نے پچھلی چند صدیوں سے جدت پسندی کو تمام قدروں سے زیادہ اہم سمجھا ہے۔

اسی جدت پسندی کے نتیجے میں ناول کی تنقید اُلجھے ہوئے مسئلوں سے گھری رہی ہے۔ جب ہم کسی دوسری ادبی صنف کی قدر و قیمت کا تعین کرتے ہیں تو ہمارے پیش نظر اُس صنف کا اعلیٰ نمونہ ہوتا ہے اور ہم یہ دیکھتے ہیں کہ لکھنے والے نے اُس صنف کے روایتی تقاضوں کو کس حد تک پورا کیا ہے۔ لیکن ناول پر اس طریقے کا اطلاق یقیناً تباہ کن ہوگا۔ کیونکہ ناول کسی اور صنف کی نقّال نہیں ہے۔ ناول نگار کا اوّلین فرض انسانی تجربوں کو پیش کرنا ہے، اسلئے بندھے ٹکے اُصولوں کی پابندی اُس کے لئے خطرناک ثابت ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ ناول میں بکھری ہوئی ہیئت کا احساس ہوتا ہے۔

لیکن روایتوں کی غیر موجودگی سے زیادہ اہم بات ناول میں روایتی قصوں اور پلاٹ سے مکمل انحراف ہے۔ پلاٹ کی جدت کا تعین کوئی آسان مسئلہ نہیں، پھر بھی انگریزی کے اوّلین ناولوں کے مطالعے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان میں اساطیر، دیومالا اور حکایتوں سے دامن بچایا گیا ہے۔ یہ بات اہمیت رکھتی ہے کہ جدت طرازی کی تحریک کا نمودار اظہار اٹھارویں صدی کے انگلستان میں ہوا۔ ڈیفو نے جب لکھنا شروع کیا تو اپنے دور کے مروجہ تنقیدی نظریے کو بھلا کر اس میں آپ بیتی کے عنصر کو شامل کر لیا۔ ڈیفو کے بعد رچرڈسن اور فیلڈنگ نے اپنے انداز میں اس سلسلے کو جاری رکھا اور غیر روایتی پلاٹ کو جگہ دی۔ یہ پلاٹ یا تو اختراعی ہوتے تھے یا پھر کچھ ہم عصر کی زندگی کے کسی واقعہ پر اُن کی تعمیر ہوتی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ اٹھارویں صدی کے ناول نگاروں کے ہاں پلاٹ کردار اور اخلاقی موضوعات کا حسین امتزاج نظر نہیں آتا جو اچھے ناولوں کی پہچان ہے لیکن یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ ایک ایسے زمانے میں تخلیقی تخیل یک مسلّم تسلیم شدہ ادبی طریقہ کار میں اپنے لئے انفرادی مسلک بنانا اور پلاٹ سے عصری مسئلے کو اہمیت دینا کوئی آسان بات نہیں۔

دو اہم عناصر جن کی وجہ سے ناول دوسری اصناف سے ممتاز ہو سکا وہ ہیں ــــ کردار نگاری اور عمل کا پس منظر۔

پلاٹ کے علاوہ روایتی قصوں میں اور بہت سی تبدیلیاں لانی پڑیں جب کہیں جا کر ناول حقیقت کی انفرادی تلاش بن سکا۔ سب سے پہلے پلاٹ کے کردار اور ان کے عمل کو ایک مخصوص ماحول میں رکھنا تھا۔ یعنی پلاٹ میں خاص قسم کے لوگ خاص قسم کے

حالات میں حل ہوا ہیں۔ ناولوں میں انفرادی کرداروں کی عکاسی ہونے لگی اور اُن کے ماحول کو پیش کرنے میں جزئیات نگاری کا استعمال کیا گیا۔

فلسفیانہ نقطۂ نظر سے کردار کی جانب تخصیص کا رویہ دراصل فرد کو ایک کل شخصیت کے رُوپ میں پیش کرنے کا مسئلہ ہے فلسفہ کے اِس رجحان سے ناول نویسوں نے بہت کام لیا ہے۔ پُرانی داستانوں میں بھی کرداروں کو نام دیئے جاتے تھے۔ لیکن یہ نام اُن کی شخصیت کو بھرپور عکاسی کرنے سے قاصر تھے۔ "آزاد" اور "خوجی" فسانۂ آزاد میں اور امیر حمزہ، عمر عیار اور لقا داستانِ امیر حمزہ میں اِس کی مثالیں ہیں۔ اِن ناموں سے کردار کی خاص خوبی یا کمزوری اُبھر کر آتی ہے۔

اٹھارویں صدی کے ناول نگاروں نے اپنے کرداروں کو ایسے نام دیئے جس نے اُنہیں بھرپور شخصیت کے رُوپ میں اُس زمانے کے سماجی ماحول میں زندگی بسر کرنے والا گوشت پوست کا انسان بنا دیا۔ یعنی یہ کردار اب TYPE نہیں رہے۔ لاک نے ایک جگہ کہا ہے کہ فرد گذشتہ فکر اور عمل کی یادوں کے سہارے اپنی تغیر پذیر شخصیت سے سلسلہ جوڑے رہتا ہے۔ ہیوم کے الفاظ میں: "اگر ہم میں یادداشت کا مادہ نہ ہوتا تو ہم نتیجہ و علت کے مفہوم سے ناواقف رہتے۔ اور اِس لئے اپنی شخصیت سے ناآشنا رہتے" یہی نقطۂ نظر ناول میں جاری و ساری ہے۔ اِسٹرن STERN سے پروست PRVST اور پریم چند سے قرۃ العین تک اکثر ناول نگاروں نے شخصیت کی تلاش اور پہچان میں اسی نظریئے یعنی ماضی کی تشریح اور حال کی خود شناسی کو اپنایا ہے۔ کسی شئے کی انفرادیت کو قائم کرنے کے سلسلے میں وقت یا زمانے کی بڑی اہمیت ہے۔ لاک کے نزدیک اگر خیالات کو زمان و مکاں کی قیود سے آزاد کر دیا جائے تو اُن میں تعمیم آجاتی ہے۔ اسی طرح ناول کے کرداروں میں انفرادیت اُسی وقت پیدا ہوتی ہے جب اُنہیں خاص زمان و مکان کے پس منظر میں پیش کیا جائے۔

ناول کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ اُس نے گذشتہ ادبی روایت یعنی دائمی اخلاقی قدروں کی عکاسی کے لئے لازمانی کہانیاں لکھنے سے گریز کیا۔ ناول کا پلاٹ بھی پرانی کہانیوں سے اس اعتبار سے مختلف تھا کہ ناول میں حال کے اعمال کو ماضی کے تجربوں کا نتیجہ بتایا گیا۔ اس سے بھی زیادہ اہم اثرات شاید کردار نگاری پر پڑتے ہیں کیونکہ ناول نے وقت کے دھارے پر خصوصی زور دیا ہے۔ اس کی واضح مثال "شعور کی رَو" والے ناولوں کی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ اِن ناولوں کی خصوصیت یہ ہے کہ فرد کے ذہن میں جو خیالات ایک خاص وقت پر پیدا ہوتے ہیں اُنہیں لفظ بلفظ پیش کر دیا جائے۔ مگر ناول میں بحیثیت صنف، دوسری اصناف ادب کے مقابلے میں وقت کے بہتے دھارے میں کرداروں کی نشوونما پر زور دیا گیا ہے۔ روزمرّہ کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات کی جزئیاتی تفصیل اِس بات کا نتیجہ ہے کہ اس میں زمانے کے پھیلاؤ پر قید نہیں ہے۔ اور وقت کی جو برتری اُسے حاصل ہے [illegible] زمانہ قدیم، عہدِ وسطیٰ، اور نشاۃ ثانیہ کے ادب میں وقت کا کردار ناولوں میں اُس کے کردار سے بہت مختلف ہے۔ [illegible] میں تمام حوادث کا زمان UNITY OF TIME جس کی رُو سے ٹریجیڈی کے عمل پر ۲۴ گھنٹوں کی قید لگا دی گئی ہے۔ ایک اعتبار سے [illegible] زندگی میں وقتی حرکت کی اہمیت کو ختم کر دینے کے برابر ہے۔

زمان اور مکان میں منطقی رشتہ ہے۔ ٹریجیڈی، کامیڈی اور رومانس میں زمانے کا [illegible] رہا اور غیر واضح انداز میں استعمال کیا گیا ہے۔ ڈیفو، رچرڈسن اور فیلڈنگ نے کہانی کے اس پہلو پر پہلی دفعہ زور دیا ہے۔ بعد کے فرانسیسی ناول نگاروں نے خاص طور سے بالزاک اور اسٹندال نے گرد و پیش اور ماحول کو زندگی کی کل عکاسی کا ایک اہم جزو سمجھا ہے اور اُسے اِسی طرح برتا ہے۔

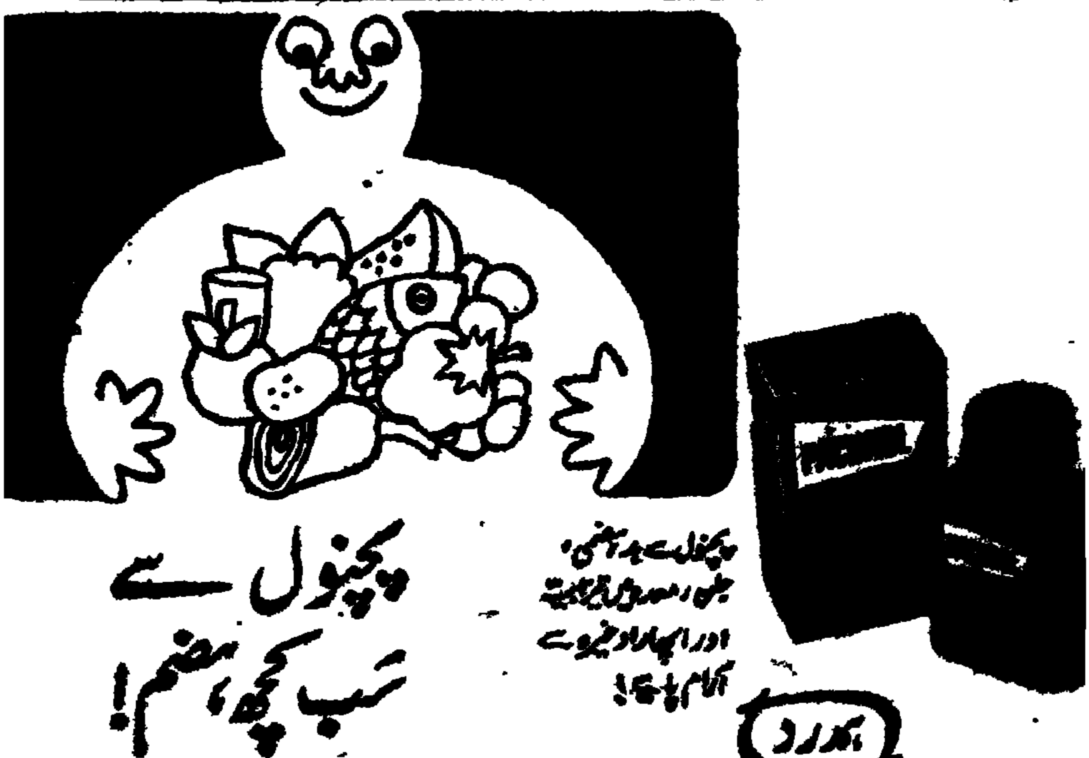
ناول کی تکنیکی خصوصیات جن کا بیان ہو چکا ہے ـــ سب مل کر ایک خاص مقصد کے حصول کے لئے استعمال ہوتی ہیں اور وہ مقصد

ناول نگار اور فلسفی میں مشترک ہے۔ یہ فرد کے واقعی تجربات کی پُرخلوص عکاسی ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ادبی بیان کی چند تبدیلیوں کے علاوہ روایتی تصوّروں سے ایک اور انحراف کی ضرورت پیش آئی یعنی ایسی زبان اور نثر استعمال کی جائے جس سے پوری فضا قائم کی جا سکے۔

قدیم طرزِ نگارش میں زبان کے چٹخارے کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔ اُردو میں اس کی مثالیں رتن ناتھ سرشار اور رجب علی بیگ سرور ہیں۔ اُس دور میں لفظوں کا رشتہ اشیاء سے قائم نہیں کیا جاتا تھا۔ ناول میں زبان کو زیبِ داستان کے لئے کم استعمال کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دیگر اصناف کے مقابلے میں ناول کا ترجمہ آسان ہے۔ اور بہت سے عظیم ناول نگار جیسے ڈکنس اور بالزاک سے ہارڈی اور دستوفسکی تک ہر ایک نے کئی جگہ زبان کی خوبصورتی پر کم توجہ دی ہے اور کہیں کہیں تو حالات کے تقاضے کے مطابق بازاری زبان بھی استعمال کی ہے۔ ناول کے مطالعہ میں ہمیں تاریخی اور ادبی تشریحوں اور تفسیروں کی ضرورت پیش نہیں آتی، کیونکہ اس کی ہیئت کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ یہ فٹ نوٹ خود پیش کرے۔

▲ ●

The Rise of the Novel : IAN WATT



دکاندار نے کہا۔ بہت آہستہ آہستہ [illegible]
[illegible] اُس نے [illegible]
دیا۔

شام [illegible]
[illegible]
[illegible] اُس وقت
اُس کا سینہ [illegible] باہر کل کی گھنٹی سنائی دی۔

"پھر کل آؤگے؟" دکاندار نے کہا۔

[illegible] اُس کی طرف دیکھا [illegible]
[illegible] دوسرا [illegible] طرف دیکھ رہا تھا۔
[illegible]

[illegible]

رانو چونک اٹھی۔ وہ [illegible] ہاتھ پکڑی گئی تھی [illegible]
[illegible] دکاندار نے کہا۔ باہر [illegible]
[illegible] آواز سُن [illegible]
[illegible]
[illegible] ہم لوگوں کی بھلائی ہے۔

دکاندار بہت ہی ہوشیار ہے۔ رانو اُس کی باتوں سے [illegible]
[illegible] اُس نے ہاتھ [illegible]
[illegible] دکاندار کی طرف [illegible] نگاہ سے دیکھا [illegible]
[illegible] بال سفید ہو چلے تھے۔ اُس کے چہرے [illegible]
[illegible]
[illegible]
تھا اُسی درمیان ٹپاٹپ ٹپاٹپ کی آواز آئی۔

"پولیس گیس جلا رہی ہے۔" دکاندار نے کہا۔

[illegible]

[illegible] ایک گلاس پانی دو گے۔" رانو نے کہا۔

[illegible]

آپ یہاں بیٹھ جائیے۔

"یہاں؟" ڈاکٹر کی آواز میں ابھی تک گھبراہٹ تھی۔

وہ گلاس میز پر رکھنے کے بعد ڈاکٹر کچھ مطمئن ہوئی۔ اُس نے گلاس دیکھ کر شکر ادا کیا کیونکہ اُس کے پاس اس سے بہتر کوئی لفظ نہیں تھا۔

مصیبت کے وقت اُس نے سہارا لیا۔ جان نکلی جا رہی تھی تو اُس نے پانی کا گلاس دیا تھا۔ پانی پلایا تھا۔ ورنہ سب کیلئے کچھ نہ کچھ تو کرنا چاہیے۔

کیا مجھے ڈاکٹر کی طرح رکھ سکی۔ اُسے اپنے ہر بڑا غصہ آ رہا تھا جو جاتے وقت کچھ نہ کچھ تو ضرور کہو گی۔ اور یہ کرتے ہوئے اپنے سامان کو لے کر آہستہ سے بیٹھ گئی۔

اور باہر سے آتش گیس چھوڑنے کی آواز آ رہی تھی۔ ڈکلا کی گھنٹیاں اور گاڑیوں کی آواز بج رہے تھے۔ ڈاکٹر نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ڈاکٹر کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ یہ آتش گیس اور باہر کی آواز اب اُسے بُری نہیں لگ رہی تھی۔ بلکہ ایک باجے کی طرح کانوں میں آ رہی تھی۔ ڈاکٹر اپنی آنکھیں کھولے رکھنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی لیکن اُسے کامیابی نہیں ہو رہی تھی جیسے وہ نشے میں ہو۔ اچانک اُسے خیال آیا کہیں اس عورت نے پانی میں کچھ ملا تو نہیں دیا تھا۔ پانی بہت اچھا تھا۔ وہ ہنس رہا ہے۔ اتنی دیر کے بعد اُس نے اُس کا اصلی چہرہ دیکھا تھا۔ اُسے ایسا لگا۔

"بچاؤ بچاؤ۔" لیکن ڈاکٹر کو ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کے گلے سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ ڈاکٹر نے گھبرا کر ایک دم لڑکھڑاتے ہوئے دیکھا۔ اُس کی چھوٹی لڑکی کی طرف تھی۔ ڈاکٹر نے سوچا یہی اچھا موقع ہے۔ اُس نے بیگ سے کانچ کا ایک گلاس نکالا اور اُس آدمی کی طرف پھینکا۔ سر پر لگتے ہی گلاس بم کی طرح پھٹا۔ پورے کمرے میں دھواں پھیل گیا۔ دھماکے کی آواز پر ڈاکٹر چونک پڑی۔ اُس کی تان ٹوٹ گئی۔ نہیں سامنے کوئی نہیں تھا۔ مڑ کر دیکھا وہ آدمی آنکھیں بند کئے نماز پڑھ رہا تھا۔ ڈاکٹر کو ایسا محسوس ہوا جیسے اُسے کرنٹ چھو گیا ہو۔

نماز پڑھنے والے کی طبیعت نہیں لگ رہی تھی۔ اور دن وہ اس وقت ... رہا تھا لیکن آج وہ ایسا نہیں کر پایا کیونکہ اُسے برا بھلا کہے جانے کا ڈر تھا۔ آنکھیں بند کر کے بھی اُس عورت کا چہرہ سامنے رینگ جاتا۔ حد سے زیادہ ڈاکٹر کو عورت سے نفرت تھی۔ ایسی حالت میں اپنے آپ کو کیسے بچا سکتا ہے۔ بڑے خراب سے پیچھے ہو آئی۔ ڈاکٹر نے اپنی سی کوشش کی۔ دیکھا اُس نے بچی کو عورت کے پہلو سے ہی ...

خطیب ہو گئے تھے۔ وہ بیچ نکلے تھے۔ بڑے خراب پیچھے ہو آئی۔ ڈاکٹر نے ناک پر سے کپڑا ہٹا لیا۔

عورت اُس سے جس طرح چپکی ہے اُس سے صیغۂ شیطانی ہے۔ اس فکر میں وہ نماز میں بھی اُلجھا رہا تھا۔ اس عورت کے گمان میں کتنا خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔ سامنے کچھ کر دیکھ لیا تو کیا شخصیت آ جائے گی۔ ملک سے باہر ہی سالوں سے اُس کا گمان ہے لیکن کہتے ہیں کہ دماغ میں غصہ اسی میں شک نہیں۔ ابھی ہماری تر کسی کی مجال نہیں۔ سکتا بھی نہیں۔ ملک میں نا حق پریشان کریں گے۔ وہ گھبرا اُٹھا۔

کسی بھی آدمی کا کیا بھروسہ۔ اچانک وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا کہ کرنے کے خیال سے پاس آ جائے تو اُسے روک کے لئے ہے کہ تیار رہنا ضروری ہے۔ وہ اُس کی طرف بیٹھ گئی۔ اس سے ڈاکٹر کا اچھا موقع مل جائے گا۔ اُس نے اپنے کو روک لیا۔

دیکھا وہ نماز پڑھ رہا تھا۔ شاید جانے کا کوئی مطلب نہیں۔ ڈاکٹر نے اپنے کو بھی روکا لیکن ہوشیار رہنے میں فرق ہی کیا پڑتا ہے۔

اُس کے کان نے کہا نماز پڑھ کر اپنے مطلب سے گا۔ اُس عورت کو باہر نکال دے گا۔ جس طرح مٹی ہے یہ ہو سکتا ہے اچانک پیچھے سے تو خواہ مخواہ کا اور بھی پھنس جائے گا۔

"تمس، تمس۔۔۔"

ٹھیک دروازے کے باہر آواز آئی۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپ کر رہ گئی۔ پھر وہ آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگی۔ وہ بچی کا انس رہا تھا۔ ڈاکٹر نے آنکھیں جلا گئیں۔ سامنے نکلے۔

"رومال دیجئے رومال۔" اُس کے کان نے طرف کہا۔ گیس بجھ چکی جا رہی ہے۔

ڈاکٹر نے آنکھیں بند کئے ہی رومال نکالا۔ اُس کا ہاتھ لمبا کر کے اُس کے ہاتھ سے لیا۔ اسے پانی میں بھگو کر رکھ دیا۔

"آنکھیں اچھی کیجئے۔ سارا بازار بھی جل جائے۔ گیس سے چونکہ یہ کوئی ترکیب ہے۔"

ڈاکٹر نے اُس گلاس کی ہدایت کے مطابق کیا۔ اچانک جلن اور ختم نہیں ہوئی۔ اُس نے مشکل سے آنکھیں کھولتے ہوئے دیکھا۔ رومال رکھے رہیے۔ اس سے ٹھیک ہو جائے گا۔ ڈاکٹر نے ... ڈاکٹر نے آنکھیں بند کئے محسوس کیا کہ شاید ...

احمد عثمانی

میں اور میرا پیکر

جب میں جاگا تو ایک خوبصورت جسم کا مالک بن گیا تھا۔

ابھی جسم میں انجانے جذبے پیدا ہو چکے تھے اور منہ زور گھوڑوں کی طرح میری ساری رگوں میں دوڑ رہے تھے۔ میں ان جذبوں کے ہاتھوں ایک شکست خوردہ قیدی بن گیا تھا۔ یہ جذبے مجھے جدھر چاہتے تھے بھٹکاتے تھے۔ میں ان جذبوں کے ساتھ آوارہ گردیوں کی طرح سات رنگوں کی ننھی شعاعوں میں سے گزر جانا چاہتا تھا کیونکہ اب میرا جسم مجھے غیر سا محسوس ہوتا تھا۔ زمین پر ایک بوجھ ایک فضول سی شئے۔ لیکن میرے اندر جینے کی خواہش سرکش دھارے کی مانند موجود تھی اور یہی خواہش مجھے در در اپنے جذبوں کا کشکول لئے ادھر سے ادھر بھٹکاتی تھی۔ سونے کی کوشش کرتا تو تمام جذبے مجھے جگا دیتے۔ جاگتا تو فضاؤں میں تحلیل ہونے کی خواہش ــــ مجھے ذرا بھی سکون نہ تھا۔

ایک بار مجھے احساس ہوا جیسے میرا جسم کسی رنگ سے ہو کر گزر گیا وہ کون سا رنگ تھا مجھے یاد نہیں لیکن ایک خواہش اور بڑھ گئی رنگ کو جان لینے کی۔ زندگی کا رنگوں سے کیا تعلق ہے؟

اب میری سمجھ میں آیا تھا۔ اِن رنگوں اور ان کو جان لینے کی شدید خواہش کی وجہ ہے کہ یہ لق و دق میدان جسے ہم زندگی کہتے ہیں نور میں تبدیل ہو گیا ہے۔ مختلف رنگوں کی وجہ سے اس میں تنوع پیدا ہو گیا ہے۔ اس تنوع کو جاننے کیلئے میں نے ساتوں رنگوں کو پا لیا۔ لیکن ان ساتوں رنگوں کو چکھنا چاہتا تھا۔ اِن رنگوں میں تحلیل ہو کر گزرنے کی جد و جہد میں مجھے زندگی کی ہر اونچ نیچ سے قریب تر کر دیا۔ اب میرے اندر ــــ میری رگوں میں منہ زور گھوڑوں کی طرح دوڑتے ہوئے جذبے بے قابو ہوتے جا رہے تھے میں نے ان جذبوں کو تابع رکھنے کیلئے اپنے آپ کو لذت سنگ میں ڈبو کر ایک پیکر تراشا جو میرے خیال کا عکس تھا۔ میرے خیال کا عکس حدوں کو پار کر گیا۔ میں نے ہر زاویئے سے دیکھا اُس کے چہرے پر ابدی سکون تھا۔ میں نے اپنے سارے پُرسکون لمحات اُس پیکر کو دے دیئے تھے۔ اب میرے اندر ایک اور خواہش نے سر ابھارا۔ وہ خواہش تھی کہ یہ پیکر صرف خیال میں قید نہ رہے بلکہ میرے ساتھ ہم کلام ہو، ہمقدم ہو۔ میں پیکر کے ابدی سکون سے مضطرب ہو گیا۔ میرے ذہن میں صبح کے نکلتے سورج کی نوکیلی شعاعوں کی طرح مختلف سوالات جھانکنے لگتے۔ اگر میں اپنا سکون دوسروں کو دے سکتا ہوں تو خود کیوں نہیں حاصل کر سکتا۔؟ لیکن میں اپنے ہی سوالوں کے جوابات پانے سے قاصر تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے زندگی کی حقیقتوں کو پانے سے انسان قاصر رہتا ہے۔

مجھے اپنی خواہشات اور جذبات بلکہ اس المیہ پر بڑا غصہ آیا کہ میں ایسا کیوں چاہتا ہوں کہ یہ پیکر مجھ سے ہم کلام ہو۔ مجھ سے کہے کہ آؤ کافی تھک گئے ہیں ذرا پاس کی جھاڑیوں میں آرام کریں پھر سفر پر روانہ ہو جائیں۔ ندی کے گنگناتے پانی میں ہاتھ ڈالیں اور ارتعاش پیدا کریں۔ لہروں کے بلبلے متوجہ کو اُٹھتے بیٹھتے دیکھیں۔ شام کے سورج کی پیلی شعاعوں میں ایک دوسرے کے لمبے سائے دیکھیں۔ میں نے پیکر کی طرف نظر اٹھائی اُس کے چہرے پر وہی پُرسکون کیفیت تھی جو میں نے اسے عطا کی تھی جسے میں خود اپنے لئے چاہتا تھا۔ لیکن میرے پاس اضطراب تھا

اور یہ بےچینی تھی جو مجھے ہر وقت اِدھر اُدھر دوڑاتی تھی۔ یہاں تک کہ

میرے اضطراب میں جب اضافہ ہونے لگا تو میں نے اس پیکر کو ایک کمرہ میں رکھ دیا اور اُس کا بدلا ڈھونڈنے نکل پڑا۔ بہت دور پہاڑیوں کی ترائی میں ۔۔۔ میں نے برف کی چوٹیوں کو شعاعوں سے دمکتے ہوئے بہت قریب سے دیکھا۔ کبھی کبھی سورج کی کرنیں برف کی ایسا دہ چوٹیوں کو تراش کر ان کو کس اور انوکھی شکلیں بنا دیتیں مجھے گمان ہوتا کہ اب کوئی پیکر بنے گا، لیکن تھوڑی دیر بعد برف پگھل کر پانی نیچے اتر آتا اور اپنے ابدی سفر پر روانہ ہو جاتا۔ میں نے کئی شکلوں کو گھٹتے دیکھا تو وہاں سے ہٹا۔ مجھے ڈر لگا کہ میرے خیال کا پیکر بھی کہیں اسی طرح پگھل کر ترائی سے نیچے نہ بہہ جائے میں نے پہاڑوں و شاخوں میں بکھر کر دیکھ لیا تھا۔ کہیں کچھ نہیں تھا جو کچھ تھا خیال تھا، عکس تھا۔ میں دوڑتا ہوا اُس پرانی کمرہ میں آگیا جہاں میرا اپنا خیال سویا ہوا تھا۔ میں نے اُسے باہر نکال کر دیکھا اُس کے چہرے پر وہی ابدی سکون تھا۔ میں اس سے یہ سکون چھین لینا چاہتا تھا۔ مجھے وہ غاصب نظر آیا۔ اس نے میرا سارا سکون سرمایہ چھین لیا تھا۔ میں ازل سے اس سکون کی تلاش میں تھا جو میرے خیال کے پیکر کے چہرے میں چھپا ہوا تھا۔ میں نے چاہا کسی ہتھیار نشتر سے سارا سکون کھرچ لوں تو میرے پاس ایسا نیشہ تھا جو سکون دے سکتا تھا۔ لے نہیں سکتا تھا۔ مجھے بہت غصہ آیا اپنی کمزوری پر کہ اپنے خیال کا سکون نہیں چھین سکتا۔ میرے دماغ میں سیال سی شے دوڑنے لگی۔ جسم کی ساری رگیں تن سی گئیں۔ سیال شے ایک سنسناہٹ کے ساتھ سارے جسم میں پھیل گئی۔ سارے وجود کو غصہ نے ڈھانپ لیا۔ عجیب سی وحشی دھند تھی جو چھاتی جا رہی تھی۔ پیکر کے چہرے پر کا ابدی سکون میری آنکھوں میں نشتروں کی طرح چبھ رہا تھا۔ میرے ہاتھ پوری قوت سے اٹھے اور پیکر کو اٹھا کر ایک چٹان پر دے مارا۔

ہوا میں ارتعاش پیدا ہوا اور ایک آواز گونجنے لگی۔ جیسے کوئی دو ٹکڑوں میں بٹ کر ترائی کی جانب لڑھک رہا ہو۔ تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا۔ نیچے ترائی میں پیکر دو حصوں میں بٹ کر پڑا ہوا تھا جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا۔ لیکن اُس کے چہرے پر وہی ابدی سکون تھا جیسے ٹوٹنے کے لیے میں نے اُسے پھینک دیا تھا۔ ▲

مانک ٹالہ

بیماریاں پیسے کی

پیسہ بذاتِ خود ایک بیماری ہے۔ بن پیسے کے زندگی کی گاڑی نہیں چلتی۔ چلتی بھی ہے تو اڑیل ٹٹو کی طرح۔

لیکن پیسے والوں کو بھی بہت سی بیماریاں ہوتی ہیں۔ بلکہ پیسے والوں کی بیماری کی جڑ بھی پیسہ ہوتا ہے۔ پیسے والوں کے پیچھے بیماریاں اس طرح کیو (QUEUE) میں قطار لگائے کھڑی ہوتی تھیں جیسے راشن اور گیس سلنڈر کی دکانوں پر ہوتا تھا۔ ان بیماریوں کے پیچھے ڈاکٹرز اور سپیشلسٹ لائن میں کھڑے ہوتے ہیں۔

یوں تو پیسے والوں کے پیچھے بہت سی بیماریاں پڑی ہوتی ہیں، لیکن وہ تین بیماریاں انہیں راہو اور کیتو (RAHU KETU) کی طرح گھیرے رہتی ہیں۔ مثلاً دل کی بیماریاں۔ پیٹ کی گیس اور دماغ کی گیس۔ پہلی دو بیماریوں کا تو ڈاکٹر لوگ پھر بھی الٹا سیدھا علاج کر لیتے ہیں۔ لیکن تیسری بیماری کا صرف ایک ہی علاج ہے ——— دیوالہ (اصلی دیوالہ — اداکاری والا دیوالہ نہیں) اسی سے دماغ کی گیس پنکچر ہو سکتی ہے۔

اردو کے شاعروں نے حسینوں پر مرنے کے ناٹک اکثر رچائے اور انہیں شباب کے جانے میں موت ہی آتی رہی۔ دل کی لگی اور دل کے درد پر شعر کے صفحے سیاہ کیے (زمانہ کی کیا بات اور گرانی کا سبب سے بڑا کارن بھی یہی ہے) لیکن یہ سب دل لگی یا دل لگی کی باتیں تھیں۔ نہ کوئی کسی کے ابرو کے خنجر سے قتل ہوا۔ نہ کوئی سیم تن ان کا دل لے کر بھاگا اور نہ کسی کا دل کسی کے غم سے ان کے دلوں پر زور سے پڑے بغیر رہ گیا ہے تو بلکہ شوہروں کی بے اعتنائی سے یا کثرت لذت سے۔

لیکن یہ جو آج کل ہمارے بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں پر پیسے والوں کی بیماری یعنی دل کے دورے پر دورے پڑ رہے ہیں، اس دورہ دورے کی آخر وجہ کیا ہے؟ انہیں یا تو دل کے دورے کی معقول وجہ بتانی پڑے گی یا پھر پیسے کا حساب کتاب دینا پڑے گا کہ یہ کم بخت آیا کہاں سے اور کیوں چلا آ رہا ہے۔

افراد کی طرح قوموں کو بھی پیسے کی بیماریاں لاحق ہوتی ہیں۔ پیسے والی قوموں کی ناک لمبی ہوتی ہے اس لئے انہیں اپنی ناک کے نیچے تک ہی نظر آتا ہے۔ اس لئے وہ دنیا کی دوسری قوموں کی ناک اور جیب دونوں کو کاٹنے کی فکر میں رہتے ہیں نتیجے میں اُن کی اپنی ناک کٹ جاتی ہے۔ لیکن وہ بھی بے شرمی کی حد کر دیتے ہیں کہ کٹی ناک کی نمائش کر کے دنیا میں ڈھنڈورہ پیٹتے پھرتے ہیں کہ نکٹے کو خدا نظر آتا ہے۔

پیسے والی قوموں میں امریکہ کا نام سرِ فہرست نظر آتا ہے۔ اس نے اپنی دھرتی کے سینے پر سب سے زیادہ حماقتیں بھی امریکہ سے سرزد ہوئی ہیں۔ امریکہ والے ابھی تک اپنے دل و دماغ اور روح کا خلا نہ پاٹ سکے (اور غریب قوموں کے پیٹ کے خلا کو بڑھاتے رہے) لیکن دھن سوار ہے کائناتی خلاؤں کو تسخیر کرنے کی۔

اب امریکہ سے کوئی پوچھے کہ اُس نے اپنی دھرتی پر ایٹم بم سے لے کر ویت نام کی تباہی تک کون سا تیر نہیں چلایا کہ اب وہ چاند کی سرزمین پر چاند ماری کر رہا ہے۔

چاند کی سطح پر گڑھوں اور گڑھوں (CRATERS) کو [illegible] بم باری [illegible] اب بالسب [illegible] گئے
[illegible] فرصت تھی۔ ہم اس معرکہ [illegible] کے [illegible] میں
[illegible] اور [illegible] پڑے [illegible]
[illegible] کر لیتے۔ اور [illegible]
چاند کی [illegible] کر کے اس کا
[illegible] ہم اپنے [illegible] کر
[illegible] کر بیٹھے۔ اور [illegible] امریکہ کی [illegible] پر پڑے
[illegible] لیتا۔ اور اگر اتنا
[illegible] بھی کرتا تو ہم اپنے جہازوں کے [illegible] کر
[illegible] کی [illegible] پر پڑے [illegible] کے [illegible]
[illegible] میں حساب کتاب
[illegible] کر لیتے۔

— امریکہ نے چاند کی سطح پر بھی [illegible] لیکن [illegible] تب [illegible]
[illegible] کی [illegible] پر [illegible] کر دکھاتا۔ [illegible] مال کا [illegible]
[illegible] ہو جاتا!

اور پھر امریکہ کو اگر چاند کی سطح پر پڑے ہوئے گڑھوں
کی مردم شماری کرنا تھی تو اسے ویت نام کی [illegible] کے
[illegible] سے [illegible] کی کیا فرصت تھی۔
چاند کی سطح پر ایک کروڑ گڑھے (CRATERS)
اور [illegible] کی کیا فرصت تھی [illegible] کی سطح پہ
[illegible] کرنا چاہتا تھا۔ لیکن کیا کیا جائے پیسے اور
[illegible] سے چلا گیا ہے۔

[illegible] سے [illegible] کہ صدر نکسن کو
[illegible] "واٹر گیٹ" کے [illegible] کے [illegible] میں
[illegible] مسٹر
[illegible] پانی [illegible] ہے۔ [illegible] کے لئے [illegible]
[illegible] بھی [illegible] ہے [illegible] کے لئے تو
"واٹر گیٹ" کا پانی [illegible] کا پانی بھی
[illegible] ثابت [illegible] لیکن اب [illegible] قدر

[illegible] "واٹر گیٹ" کے [illegible]
[illegible] انہیں [illegible] کی [illegible] کر کے
[illegible]
کا [illegible] کی [illegible] تھا۔
[illegible] سب [illegible] نے کام کیا
——— لیکن سوال کیا اب دعا کا وقت بھی [illegible] ہے
یعنی اب انا للہ پڑھنے کا وقت آ رہا ہے۔ ▲▲

بقیہ افسانہ شبنم کا پاسبان صفحہ [illegible] سے

اس نے [illegible] انیتا کو [illegible] کر [illegible] گئی
اور میں باہر [illegible] کی [illegible] کا [illegible] تھا۔
[illegible] کہاں گئی میں نے [illegible] کی دراز
ہی میں رکھا تھا۔ [illegible] کے [illegible] میں [illegible] کا [illegible]
[illegible] کی آواز [illegible] میں [illegible] کر [illegible] کی طرف دوڑا۔
انیتا کے کمرے میں [illegible] رہی تھی۔ انیتا بستر پر [illegible]
[illegible] تھی [illegible] ہے [illegible] میں [illegible] نے فرش
پر [illegible] کر دیکھ لیا۔ [illegible] کی [illegible]
تھی [illegible] ختم کرنے کے [illegible] اب [illegible] فرش
پر [illegible] تھی۔ [illegible] انیتا کی نبض دیکھی۔ نبض بہت
سست تھی۔ [illegible] نام [illegible] نے
[illegible]۔ اس کے جسم میں کوئی جنبش نہ ہوئی [illegible] آنکھیں نہیں
کھولیں۔ صرف اس کے ہونٹ ہلنے لگے۔ میں [illegible] کے
پاس [illegible] کان لے گیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔
"تم ... نے ... مجھے ... [illegible]۔ تم [illegible]
[illegible] دیا۔"
[illegible] کتاب کے [illegible] میں
[illegible]

سن الدین احمد

پروفیسر گاموــ جاپان کے بابائے اُردو

۱۹۵۸ء میں جب میں جاپان جا رہا تھا تو میرے کرم فرما جناب نصیر الدین ہاشمی نے مجھے ایک پتہ دیا اور مجھے ہدایت دی کہ میں اُن صاحب سے ضرور ملوں ـــ میں نے اس ہدایت پر عمل کرتے ہوئے وقت مقرر کرکے اپریل ۱۹۵۸ء میں پروفیسر آر گامو صاحب سے ملاقات کا شرف حاصل کیا۔ دورانِ گفتگو پروفیسر صاحب نے اپنی کارگزاریوں کے بارے میں کچھ زیادہ باتیں نہیں کیں لیکن انھوں نے مجھ سے آردو کتابیں بھیجنے کی خواہش یا فرمائش نہیں کی۔ اپنی مشکلات اور اُردو کی کتابوں کی عدم دستیابی سے پیدا شدہ صورتِ حال کا یوں ہی کچھ تذکرہ فرمایا۔ لیکن جو لوگ اپنے کام سے انہماک اور خلوص رکھتے ہیں۔ وہ اپنے مخاطب پر ضرور کچھ نہ کچھ اثر انداز ہوتے ہیں اور کم کہتے ہوئے بھی بہت کچھ کر لیتے ہیں پروفیسر آر گامو کی شخصیت اور اُردو سے اُن کے شغف نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ میں جب باہر آیا تو بیرونی ممالک کو اُردو کتابوں کی ترسیل کی تحریک جنم لے چکی تھی۔ آج یہ سوچتا ہوں کہ کیونکر چار ممالک جاپان، اسرائیل، چیکوسلواکیہ اور روس میں اُردو کتب خانے قائم ہو سکے تو میرا دل چاہتا ہے کہ اس تمام کام کا سہرا اس شخص کے سر ہے جس کی اُردو زبان سے محبت اور لگاؤ نے مجھے اس کام کو آغاز کرنے کے لئے بے چین کر دیا تھا۔

دورانِ ملاقات میں نے محسوس کیا کہ اُس شخص نے سوچ اور سمندر [illegible] زبان بولنے والوں [illegible] زبان [illegible]

کام ہے۔ اس میں اُستاد کا مقام حاصل کرنا اور اوّلیت حاصل کرنا یہ صرف گامو ہی کر سکتے تھے۔ زبان کو رہنے دیجئے، ہمارے رسم الخط کی مشکلات کا اندازہ کیجئے پھر ایک دور دیس کے یکہ و تنہا نوجوان کی مشکلات کا اندازہ کیجئے جسے نہ ماحول حاصل ہے نہ کوئی سکھانے والا، وہ جستجو کرتا ہے۔ نہ جانے کیسی دشواریوں کا سامنا کرتا ہے کیا کیا طریقے اختیار کرتا ہے۔ کیسی محنت کرتا ہے اور بالآخر جو کمال حاصل کرتا ہے وہ یقیناً محیر العقل ہے۔ گامو صاحب خوشخط ہیں۔ اُن کے خط کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا موتی پرو دیئے ہیں اگر پروفیسر گامو کو جاپان کا بابائے اُردو کہا جائے جیسا کہ میں نے کہا ہے یا خود اُن کے شاگرد سوزوکی تاکیشی نے کہا ہے تو اُس کی بنیاد محض عقیدت پر نہیں ہے۔ بلکہ حقیقت پر ہے۔ ہاں ہمیں گامو صاحب سے بے پناہ عقیدت ہے ـــ اور وہ ان کی اُردو زبان کی خدمت کی وجہ سے ہے۔

پروفیسر گامو صاحب ۱۰ نومبر ۱۹۰۱ء کو جاپان کے مغربی علاقے میں واقع صوبہ [illegible] میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۲۳ء میں ٹوکیو کے [illegible] اسکول میں بیرونی زبانوں کے مدرسے کے شعبۂ ہندوستانی کا امتحان پاس کرنے کے بعد نومبر ۱۹۲۵ء میں اسی اسکول میں لیکچرر ہو گئے تین سال کے بعد [illegible] پروفیسر اور [illegible] میں پروفیسر ہو گئے۔

ٹوکیو [illegible] اسکول ۱۸۹۹ء میں قائم کیا گیا۔ اسی اسکول میں [illegible]

گیا حال ہی میں دو سال کا اضافہ ہوا۔

شروع شروع میں شعبہ میں کوئی جاپانی پروفیسر نہیں تھا۔ ٹوکیو میں رہنے والے ہندوستانی اصحاب میں سے کسی ایک صاحب کو منتخب کر کے اُن کو پروفیسر بنایا گیا تھا۔ پروفیسر گامو صاحب شعبہ میں پہلے جاپانی پروفیسر تھے جن کو باقاعدہ استاد کی حیثیت سے نامزد کیا گیا۔ اسی بنا پر اُن کو شعبۂ ہندوستانی کے بانی اور جاپان کے بابائے اُردو فارسی کہہ سکتے ہیں۔

فی الحال جاپان میں اردو زبان و ادب، فارسی زبان و ادب کے جتنے پروفیسر اور معلم موجود ہیں، وہ سب کے سب بالواسطہ یا بلاواسطہ گامو صاحب کے شاگرد ہیں۔ اُن ہی کی محنت و مشقت سے جاپان میں اُردو اور فارسی کی باضابطہ تعلیم کا آغاز ہوا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد ۱۹۴۹ء میں ٹوکیو گائیکوگو کو اسکول کو بند کر کے ٹوکیو گائیکوگو یونیورسٹی یعنی جامعہ ٹوکیو برائے زبانہائے خارجی کا قیام عمل میں لایا گیا اور پروفیسر گامو صاحب اس نئی یونیورسٹی کے شعبۂ ہندوستان و پاکستان کے پہلے صدر مقرر ہوئے۔ طلباء کی تعداد میں بھی اضافہ کیا گیا اور ہر سال پندرہ طلباء و طالبات کو سخت امتحان کے بعد داخلہ ملتا تھا۔ گامو صاحب اواخر مارچ ۱۹۶۳ء تک شعبۂ صدارت پر رہے اور یکم اپریل کو مستعفی ہو گئے۔

یونیورسٹی بورڈ نے فوراً اُن کو اعزازی پروفیسر کا خطاب بخشیں کیا اور حکومت نے جاپان میں اُردو اور فارسی کی تعلیم میں اُن کی بیش بہا خدمات کے اعتراف میں تمغہ "طلوع آفتاب" درجہ سوم عطا کیا۔ علیحدگی کے بعد پروفیسر صاحب دو سال تک ٹوکیو کی سائی یونیورسٹی کے شعبۂ ادبیات میں پروفیسر رہے۔ وہ ٹوکیو یونیورسٹی، ٹوکیو نیو یونیورسٹی وغیرہ کئی جامعات میں علم اسلامیات، فارسی زبان و ادب پڑھانے کے لئے جا چکے تھے۔ وہ کئی سال سے جاپان اورینٹل سوسائٹی، ایشیاٹک سوسائٹی اور انجمن ایران کے رکن بھی ہیں۔ پروفیسر صاحب کی کتابوں میں ہندوستانی زبان، ہندوستانی اور فارسی، تاریخ و ثقافت ایران، تاریخ ایران اسلام، شعرائے ایران، باغ و بہار کا جاپانی ترجمہ، برگ سعدی کی گلستان کا ترجمہ وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ان کے علاوہ علمی مضامین کی تیاریاں ہیں۔

پروفیسر صاحب ۱۹۳۹ء اور ۱۹۴۰ء تک مطالعے کے لئے ایران، بھارت اور یورپ گئے اور ۱۹۶۶ء میں بھی حکومت ایران کی دعوت پر ایران کا دورہ کر چکے ہیں۔

پروفیسر گامو صاحب بڑے باوقار اور شاندار شخصیت کے حامل ہیں۔ کبھی بڑوں اور چھوٹوں میں تمیز نہیں کرتے۔ طالب علموں سے کمال شفقت اور محبت سے پیش آتے ہیں۔ سیاست سے دلچسپی نہیں اور بے ایمانی سے سخت نفرت ہے۔ میوزیم میں جا کر تصاویر اور مجسمے دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ ماہی گیری کا بھی شوق رہا ہے۔ افسوس ہے کہ صحت خراب ہونے کی وجہ سے آج کل گھر میں رہتے ہیں۔ اُن کی تین صاحبزادیاں ہیں، بیگم صاحبہ بھی بقید حیات ہیں۔

(از معز ماہر سبا حیدرآباد)

بقیہ نقد و نظر۔ صفحہ ۶۳

کم ہو رہا ہے۔ وہ پہلی پریس فوٹوگرافر تھی۔ سلام مچھلی شہری سلام کی غزل اور نظم۔ اُفکار شگفتہ کیس۔ ٹیبل ٹینس کی گمنام کھلاڑی۔ ٹیلی ویژن کیسے ایجاد ہوا۔ بریڈ سٹیفن کا دورہ۔ جنوبی افریقہ کی روح فرسا داستان۔ عورت گوریلا لیڈر کو سلام۔ علی مہدی نے خنجر کا تحفہ پیش کیا۔ عجیب و غریب سچا بیان۔ انگلینڈ کی شہزادی این کی محبت کی شادی میں تبدیلی۔ آل مسلم اُردو مصنفین کا نفرنس۔ قسمت کے ستارے۔ فلمی قلم نویسی پر پابندی لگائی جائے۔ یہ ہیں زیر نظر شمارہ کے مندرجات۔ اس میں ایک معمر شعراء کے کلام کا انتخاب بھی دیا گیا ہے اور چند دوسری نظمیں غزلیں بھی ہوتی ہیں۔ سرورق مسجد نبوی۔ خانۂ کعبہ اور زائرین کعبہ کی رنگین تصاویر۔

بڑے سائز کے ۸۴ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے۔ سالانہ اٹھارہ روپے۔ ملنے کا پتہ:-

پاکیزہ ۳۵۷ انصاری مارکیٹ۔ دریا گنج۔ دہلی ۶

تصحیح:- شاعر کے شمارہ ۶ نومبر میں حضرت شاد عظیم آبادی کی پہلی غزل کے مطلع میں پہلا مصرعہ چھوٹ گیا ہے۔ صحیح مصرعہ یوں ہے۔
"تر زمانہ چمن پہ گراں ہوا انہیں اس صاحبہ کا کیا خبر" (ادارہ)

مکتوبات

• شاعر کے ستمبر اور اکتوبر [illegible] کے مشترکہ شمارے میں ڈاکٹر شارب ردولوی کا ایک اہم مضمون "اُردو تنقید کے دس سال — ایک جائزہ" شائع ہوا ہے۔ فاضل مضمون نگار نے یہ مقالہ بڑی محنت سے لکھا ہے لیکن اس کے بیشتر حصّوں سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ موصوف لکھتے ہیں: "جدید اردو تنقید کو نظریات کے تحت مختلف خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یہ خانے مغربی تنقید میں جتنے واضح اور صاف ہیں اُردو میں نہیں ہیں۔ یہاں یہ خانے کہیں ایک دوسرے میں اُلجھے ہوئے نظر آتے ہیں اور کہیں تلے اُوپر، کہیں دھندلے اور کہیں نامکمل۔" اُردو تنقید نے اپنے ارتقائی منازل طے کئے ہیں اور اُسے خواہ مخواہ کے نئے خانوں میں نہیں بانٹا جا سکتا۔ خانوں میں بانٹنے کی [illegible] کی جا چکی ہے۔ لاکھ پردوں کے باوجود ہمارے قدیم تذکروں میں اُردو تنقید کا وجود موجود ہے جس کے "نکات الشعراء" سے لے کر احتشام حسین کے — "ذوقِ ادب و شعور"، مجنوں گورکھپوری کے "پردیسی کے خطوط" اور "غزل سرا" اور آلِ احمد سرور کی "تنقید کیا ہے" اور "نظر اور نظریے" تک اُردو تنقید نے ارتقا کی بہت سی منازل طے کی ہیں، اور اس راستہ میں ہمیں محمد حسین آزاد، حالی، مہدی افادی بھی ملتے ہیں۔

انگریزی شعر و ادب کا اثر حالی کے مقدمہ میں نمایاں ہے۔ آزاد نے "آبِ حیات" میں اُردو شعراء کی جو مورتیاں بنائی تھیں وہ اثرات زمانہ [illegible] کے باوجود اب بھی جیتی جاگتی معلوم ہوتی ہیں۔ مارکس، فرائیڈ اور ایڈلر کا اثر فطری طور پر اردو تنقید میں بھی ہوا اور اس سلسلہ میں احتشام حسین، ممتاز حسین اور مجنوں گورکھپوری کے تنقیدی مضامین پڑھے جا سکتے ہیں۔ کلیم الدین احمد نے ہمارے سارے نقادوں کا جو پوسٹ مارٹم "اردو تنقید پر ایک نظر" میں کیا ہے، وہ صرف تصویر کا ایک رُخ پیش کرتا ہے۔ آلِ احمد سرور، ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے تنقیدی فکر سے بہت متاثر ہوئے ہیں لیکن ان کے جدید تنقیدی مضامین کا مجموعہ جو گزشتہ ماہ میں "نظر اور نظریے" کے نام سے شائع ہوا ہے اُردو تنقید میں اُن کے نئے رجحانات کو واضح کرتا ہے۔ ڈاکٹر شارب نے تنقید کے مختلف ناموں کی ایک اچھی خاصی کھتونی بنا دی ہے۔ مثلاً تاریخی تنقید، توضیحی تنقید، تشریحی تنقید، تقابلی تنقید، تجزیاتی تنقید، رومانی تنقید، تاثراتی تنقید، نفسیاتی تنقید، تقابلی تنقید اور سائنٹفک تنقید۔ پڑھنے والے کا ذہن اِس بھول بھلیاں میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے۔

اِسی طرح ڈاکٹر صاحب نے تنقیدی کتابوں کا ایک اچھا کیٹلاگ دے دیا ہے۔ اگر صفِ اوّل کے تنقید نگاروں اور تنقیدی کتابوں تک مضمون کو محدود رکھا جاتا تو یہ اُلجھن پیدا ہوتی۔ تعجب ہے کہ پورے مضمون میں مجنوں گورکھپوری کے تنقیدی کارناموں کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ اور نہ کسی جگہ اُن کا نام آیا ہے۔ پھر بھی معلومات کے لحاظ سے یہ مضمون پڑھنے کے لائق ہے۔

[illegible] مبشر علی صدیقی — محلہ سوتھا۔ بدایوں

• محترمی شارب ردولوی کا مضمون "اُردو تنقید کے دس سال — ایک جائزہ" معاف کیجئے اِس کے ہماری معلومات میں کوئی اضافہ نہیں کرتا کہ اُنھوں نے بعض کتابوں کے نام ترتیب سے لکھ دیئے ہیں۔ ورنہ ۱۹۶۲ء میں شائع ہونے والے دو مضامین "رومانی تخلیقیت" اور "اشتراکی واقعیت" (پروفیسر ضیاء الحسن ایم۔ اے) اور "تنقید کا مارکسی نظریہ" (ممتاز حسین) اِس مضمون سے کہیں زیادہ وسیع اور معلوماتی ہیں اور جن بحث اور اُس سے اخذ شدہ نتائج سے ان ہر دو حضرات نے تنقید کے جدید رجحانات کا جائزہ لیا ہے، افسوس کہ اتنی کتابوں کا حوالہ دے کر بھی شارب ردولوی صاحب اِس سے زیادہ معلومات فراہم نہ کر سکے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے اُنھوں نے یہ مضمون نہایت بے دلی سے محض لکھنے کے لئے لکھ کر آپ کو روانہ کر دیا۔

آخر میں [illegible] نے آلِ احمد سرور، سلیم احمد، وزیر آغا اور

کہانی کی ... کے سلسلے میں جس تاثر کو ابھارنا چاہا ہے وہ کھل کر ابھر سکا۔ میرا خیال ہے کہ انھوں نے حسن عسکری کی "آدمی اور انسان"، "ستارہ یا بادبان"، یا سلیم احمد کی "نئی نظم اور پورا آدمی"، ضمیر آغا کی "اردو شاعری کا مزاج" اور "نظم جدید کی کروٹیں" اس طرح نہیں پڑھیں جس طرح پڑھنے کا حق ہے۔ محض کتابوں کے نام گنوا کر انھوں نے یہ ظاہر کیا ہے کہ وہ سب کچھ پڑھ چکے ہیں۔ دراصل ان کتابوں کی مثبت تنقید سے تھوڑا فائدہ اٹھاتے۔

ڈاکٹر یوسف سرمست کا "ناول کی تنقید" مختصر مقالہ ہونے کے باوجود بڑے اہم مسئلہ کی جانب توجہ مبذول کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ واقعی اس ملک میں "ناول کی تنقید" پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔

شعر و ادب میں شہریار کی دونوں نظمیں نہایت موثر ہیں ... "عصر حاضر" کا بہترین عکاس ہے۔ ... شاہد ماہلی کی غزل بھی خوب ہے۔ ایک دو شعر تو ذہن کے سلاخوں پر ثبت ہو گئے ہیں ۔۔

گزرے ہیں کتنے سوالوں کی راہ میں اشجار
بس ایک سکوت ہی سب کا جواب ہے یارو

نسیم اکمل قادری — ذیشان منزل، ہاشمی محلہ ...

● سب رس اکتوبر ۱۹۸۳ء کا شمارہ ملا۔ ڈاکٹر شارب ردولوی اور ڈاکٹر یوسف سرمست کے مقالات اس کی جان ہیں۔ مظہر ... کی کہانی "نئے دور کا ..." ... بالمیکی پر ... ہے۔ شہریار کی نظمیں اور ... فرخ آبادی کی غزل قابل تعریف ہیں۔ ... کا انتخاب بہت اچھا ہے اور موجودہ ... پر ... ہے۔ آخر میں اس شعر پر ختم کرتا ہوں ۔۔

جتنے ... زمانے میں ہیں جتنے ...
ان کو تسلیم شدہ ... سالار ہے تو ...

... سب کے تاثرات پڑھے۔ وہ واقعی گلستان ادب ... کے ... داستان تھے۔ اتنا علیم

... اردو افسانہ ...
اندور ... — ...

● "تازہ شمارہ" میں ... ڈاکٹر شارب ردولوی کا مقالہ "اردو تنقید کے دس سال — ایک جائزہ" خاصا اہم ہے۔ چونکہ یہ مختصر جائزہ ہے، اس لئے اس کے مطالعہ کے بعد تشنگی کا احساس ہونا فطری ہے۔ لیکن صاحب مضمون کی کوشش کی داد نہ دینا بھی سخت ناانصافی ہوگی۔

صاحب مضمون اپنے اس قول میں حق بجانب ہیں کہ "مضمون صرف فہرست ہو کر نہ رہ جائے" اور یہ کہ بعض ناموں کی کمی اس وجہ سے بھی محسوس ہو سکتی ہے کہ ۱۹۷۰ء سے ۱۹۸۰ء تک کی مطبوعات کا ہی جائزہ لیا گیا ہے۔

میں شارب صاحب کی توجہ ڈاکٹر ابو محمد سحر کے ان تنقیدی مضامین کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جو ۱۹۷۰ء اور بعد کے درمیان ادبی رسائل کی زینت بنے ہیں۔ ان کی کامل تصنیف "مطالعۂ امیر" (۱۹۷۵) بھی اسی درمیان طباعت و اشاعت کے مراحل سے گزری ہے۔ یقیناً سحر صاحب کے تنقیدی نظریات کا پتہ اس کتاب سے آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر کے نام کو نظر انداز کرنا ادبی دیانت داری اور انصاف پسندی سے سراسر گریز ہے۔

اسی طرح ڈاکٹر عبد الودود کی کتاب "اردو ادب میں انشائے لطیف" بھی صاحب مقالہ کی توجہ کی مستحق تھی۔

چلئے ادب میں یہ بڑی عجیب روایت رہی ہے کہ اس قسم کے جائزے میں خواہ ہم کتنے ہی غیر جانبدار رہیں، لیکن اپنے مخصوص دائرے (حلقے) سے باہر جا سکنے میں نہ جانے کیوں جھجکتے ہیں!

مختار عظیم — ...

"شاعر" ... شمارہ اکتوبر ... میں ...
...
ڈاکٹر ... کی ...

کمپ [illegible] ہیں
آزادی [illegible] کی ہے [illegible] ہوں تک [illegible] گئی
قابل [illegible] شاعروں کے [illegible] نمبر کی تحریک کے ہاں
برس آپ کا [illegible] بہت ... وفات کی گیارہویں ہے
علاوہ [illegible] اسانی [illegible] کے علاوہ
مکر [illegible] نمبر [illegible] نے
ہے [illegible] شعرا [illegible]
کو جاری رکھا [illegible]

قریشہ قریشی — موج پیہ تاکید

"شاعر" کا ... فارم ... "کلیکر قریشی"
بڑھ گئی ہے ... یہ بڑے ... کا بھی ... ہے زبانی
... بلکہ ... اردو والوں کو ... بھی
... "شاعر" کے خریدار ... کرنے
... ایک ... سالانہ روانہ کر چکا ہوں
وفیات میں ... اور سیدہ ... کے علاوہ
آبر احسن گنوری کے قتل کی خبر سے بھی دکھ ہوا اور پھر
تارا چند جیسے عظیم ادیب اور مشہور عالم کی وفات سے تو
اردو زبان و ادب کو بے حد نقصان پہنچا ہے۔ بلاشبہ ڈاکٹر
تارا چند کی یاد تازہ رکھنے کے لئے ایک شاندار یادگار
قائم ہونی چاہئے۔
... اردو ... کانفرنس کے مطالبات پر
... کرنا چاہئے ... گر ایسی قراردادیں پاس کرنے
سے نتیجہ کچھ نہ نکلے گا۔ آپ نے بالکل درست فرمایا کہ
کانفرنس ... کا ... اور ایک
ایجی ٹیشن ... چلائی جانی چاہئے۔
تری چند ... کے یہاں ... سید ... تبصرہ ...
بر کرشن ... تاثر ... کے
تاثرات ... ادبی جہاد کے علاوہ
[illegible]
[illegible]

سکے ... "بمبئی" ... ڈاکٹر ... تبصرہ
"نادیدہ کا تجزیہ" پر بہتر گرجا ہے۔ ڈاکٹر ...
صاحب ... اپنی ... فطرت کا ... ثابت کر ...
پہنچا ... سے انعامات کیا ہے۔ انشاء اللہ ... انشاء ...
سید نقی احمد ارشاد صاحب نے تاریخی ... کی ...
اور عربی فارسی سے آشنائی کی اچھی نشان دہی کی ہے۔ ڈاکٹر
بر فرقہ ... کے "فردوس نامہ" کا ہندی سے ترجمہ کر کے ایک
اچھے فنکار سے مترجم منقبت اعظمی نے روشناس کرایا ہے
مگر افسوس کہ ترجمہ رواں دواں نہیں ہے۔
حصہ نظم میں ... سرکش، ... شبلی اور یوسف جمال کی
غزلیں ... قابل ... ہیں۔ دونوں گیت بھی (سلوت ... و
سحر ... بلندی) بڑے رسیلے ہیں اور سہانے۔ نظموں میں
سید ... الاکرام کے حل کے "تاج ... مختلف ... کا
"سائنس ... کی ... " خالد شفائی کا ... اور
آنند ... (اعجاز) کا ... شاعر کی نظر سے "اچھی تخلیقات
ہیں۔ جناب رونق دکنی کی غزل کا یہ شعر خوب ہے ؎

بساطِ عالم ... پہ میں خود بکھیل جاؤں گا
بقدرِ ... شعور آگہی ... دو

جمیل ... کا ... "... کا فاصلہ" نفسیاتی ...
رکھتا ہے۔ نقاد کی زبان سے نکلے ہوئے جملے" ... سے
دراصل ... شعور کی ... ہے ---- عشق کا ... شعر ...
کی حد تک اچھا لگتا ہے۔ نفسیاتی ... سے پردہ اٹھانے
... ہیں۔

ڈاکٹر ... — ایم۔ جے کالج ...

• افسانہ ... [illegible]
[illegible] افسانہ [illegible]
[illegible]
... افسانے ... خیال ... کی ... [illegible]
[illegible]
[illegible]

یاں ملتا ہے۔ افسانے کے کینوس پر ایک گھر ہے،
جس میں مختلف کردار، مختلف طبیعتوں کے ساتھ رہتے
ہیں۔ [illegible] زندگی چھوٹا سا نقطہ ہے جس کے گرد اقتدار
کا ایک وسیع دائرہ پھیلا ہوا ہے۔ جس کو دوروں سے
[illegible] میں افسانہ [illegible] ہر [illegible] کر ہو چلا
ہیں۔ [illegible] اپنے گرد لپیٹنے میں مصروف
[illegible] ۔ محبت اور شفقت کی خواہش ایکار پر
[illegible] کی تھوڑی سی کوشش ضرور کرتا ہے، گو
کامیاب نہیں ہوتا۔ گڈو کا کردار ایک مکمل کردار ہے جس
سے حالات، اس کا سب کچھ چھیننا چاہتے ہیں۔ خوشحال
آزادی کا احساس، اس کی طفلانہ خواہشات — وہ
ہر لمحہ سہا ہوا ہے، مگر موت سے نہیں زندگی کے کرب
اور بکھر [illegible] ہے جس کو حالات نے وقت سے پہلے جوان
کر دیا ہے، وہ ہر لمحہ محسوس کرنے کی ایک بے پناہ قوت
کے زیر اثر ہے۔ افسانہ تقریباً پچاس برس پرانا ہے،
مگر آج اور کل بھی [illegible] زندگی پر نگاہ ڈالئے تو ایسے کتنے ہی
کردار مل جاتے ہیں — سیکڑوں، ہزاروں جنہیں وقت نے،
ماحول نے، حالات نے وقت سے پہلے جوان بلکہ ضعیف
کر دیا ہے۔ ان کا قصور بس یہی ہے کہ وہ حساس ہیں
مگر ان کرداروں پر کوئی افسانہ نگار قلم نہیں اٹھاتا۔ اور اگر
اٹھاتا ہے تو [illegible] الزام ہوتا ہے کہ یہ خیال نیا نہیں ہے۔
افسانوں میں "مرکزی خیال" نام کی کوئی چیز ہوتی ضرور ہے،
مگر اس مرکزی خیال کے علاوہ اس ماحول سے وابستہ ان
واقعات کی بھی وہی اہمیت ہوتی ہے جسے افسانہ نگار حقیقت
[illegible] کے تانے بانے کی شکل میں بنتا ہے۔
[illegible] افسانہ "فن" کو "تکنیک" کی تلاش میں آگے بڑھتا ہے
تو "فن" کی اہمیت کم از کم میں تسلیم نہیں کرتا۔
محترم کا یہ شکوہ بالکل بے بنیاد ہے کہ SO CALLED
ANTI-CLIMAX کے بعد افسانہ قاری کو متاثر نہیں کر پاتے گا
جبکہ حقیقت یہ ہے کہ آخر کے دو پیراگراف کہیں زیادہ [illegible]

[illegible] تک زندگی میں [illegible] کی اہمیت [illegible] تسلیم کر لینے میں [illegible]
ہو جاتا اور افسانہ موت کا ایک [illegible] پاس [illegible]
چھوڑ کر ختم ہو جاتا۔ نتیجتاً نامکمل رہ جاتا۔

انور رضا — [illegible]
جمشید پور

● ستمبر اکتوبر کے شمارے میں نثر کے مقابلے میں منظومات بہت اچھی ہیں۔ خصوصاً شاد عظیم آبادی کی معروف غزلیں ما فی اردو والوں کے لئے تبرکات ہی ہیں۔ سرورق پر سید سجاد ظہیر کا پنسل اسکیچ دیکھ کر یقین ہی نہیں ہو رہا تھا۔ کیونکہ میں نے آج تک کہیں بھی ان کی ایسی تصویر نہیں دیکھی۔ سرورق کو فریم کروا چکا ہوں۔

یعقوب احمد پریمی — ۱/۲ جے۔ کے [illegible] روڈ، [illegible]

● ستمبر اکتوبر کا شمارہ نظر سے گزرا۔ ڈاکٹر ظ۔ انصاری، رحمان جگدری اور ڈاکٹر شارب ردولوی کے مقالے اچھے ہیں۔ کہانیوں میں جوگندر پال، نظموں میں [illegible] شاد۔ خالد خنداں۔ حرمت الاکرام اور غزلوں میں تبرکات شاد کے علاوہ حنیف ترین [illegible] اور مظفر حنفی پسند آئے۔ مکتوبات میں حسن رضا واجدی نے یوسف جمال کی آزاد غزل کا خوب تجزیہ کیا ہے، جسے پڑھ کر بڑا لطف آیا۔

ہاں یعقوب راہی کی نظم میں "مری آنکھوں" کی جگہ "میرا آنگن" شاہد ماہلی کے پہلے شعر میں "کھڑے" کے بجائے "گھڑے" کتابت کی غلطیاں ہیں۔ اور سلیم صدیقی کا یہ مصرع ؎

"میں ایک بوجھ گرد بن پڑا"

نظر ثانی کے لائق ہے۔

ڈاکٹر اسلم رحیمی — رحیم پور [illegible]
[illegible] پرتاپ گڑھ

۱؎ کتابت کی غلطی [illegible] شکریہ [illegible] مصرع یوں ہے
[illegible] (ادارہ)

[illegible] ہی میں تنوع
[illegible] کہانی [illegible] بہت [illegible] اور مجموعی شاعری کی
بہاؤ کی کہانی سے معلوم ہوتا ہے، پسند کی گئی۔ "نئے دھان"
"ہندوستانی عورت" کے عنوان پر ایک بھرپور مضمون ہے
طنزیہ "خودکشی نامہ" اور مقالہ "فطرت کی آواز" شاعرہ بھی
بہت پسند آیا۔

قیوم خالد
مرادنگر، حیدرآباد

● میرے ڈرامے "بیچ کی دیوار" شائع شدہ "جولائی ۱۹۶۳ء کے بارے میں میرے دوست انور ادیب صاحب کو تسامح ہوا ہے کہ میں نے اس کا پلاٹ ہندی کہانی سے لیا ہے جو "مسیح وندنا" پروگرام سیلون سے نشر ہوئی ہے۔ میرے اس ڈرامے کے بارے میں مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ یہ ڈراما ۲۸ جون ۱۹۶۰ء کو آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد کے اردو پروگرام "نیرنگ" سے نشر ہوا تھا۔ اس کو اظہر افسر صاحب نے پروڈیوس کیا تھا اور [illegible] صداکار حصہ بھی لیا تھا۔ یہ ڈراما کافی مقبول ہوا اور اب تک "نیرنگ" سے متعدد بار اور [illegible] سے معیار نشر ہو چکا ہے۔ کسی نے میرے ڈرامے کو کہانی کا روپ دے دیا ہو تو اس سلسلے میں میں کیا کر سکتا ہوں۔

یہ معلوم کئے بنا کہ کوئی افسانہ یا ڈراما کن حالات میں لکھا گیا اور کب، اور اُس کو کسی اور افسانے یا ڈرامے سے بلا ثبوت حوالہ دئے بغیر منسوب دینا میں سمجھتا ہوں ادبی دیانت داری سے بعید ہے۔ اب میری انور صاحب سے "مخلصانہ گزارش" ہے کہ وہ سیلون کے "مسیح وندنا" پروگرام کو لکھیں اور پوچھیں کہ کیوں انھوں نے ڈرامے کو کہانی بنا ڈالا اور ڈرامے کا حوالہ بھی نہیں دیا اور انھیں تلقین کریں کہ وہ آگے [illegible] سے کم بالخصوص سامعین اور ریڈیو سیلون کا احترام کرنا شروع کریں۔

[illegible] ارشد
۱۶-۳-۷۵
امام باڑہ - حیدرآباد

● "شاعر" نمبر ۱۱ و ۱۲ کا مشترکہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ کاغذ کے اس بحرانی دور میں ماہنامہ شاعر کا اتنے تاخیر سے نکلنا کوئی معیوب بات نہیں ہے جبکہ بڑے بڑے رسالوں کے پرچے بند ہو چکے ہیں۔ اس کی قیمت میں معمولی اضافہ ہر باذوق شخص کیلئے قابلِ قبول ہوگا، اس وقت تو ہر قسم کے پرچے اور اخبارات پر دو سال کے مقابلہ میں قیمتیں دوگنی چڑھ گئی ہیں۔ نوری بھجتی نمبر کا شدت سے انتظار ہے۔

مرحوم سجاد ظہیر کے متعلق آپ نے چند تاثرات پر اکتفا کر لیا۔ ضرورت تو یہ ہے کہ ان کی ادبی خدمات پر ایک اچھا مقالہ لکھوائیے۔ اگرچہ ماہنامہ آجکل ایک اچھا خاصا سجاد ظہیر نمبر شائع کیا ہے۔

زیرِ نظر شمارہ بہت متنوع ہے۔ مقالات کافی اچھے ہیں۔ ڈاکٹر شارب صاحب ردولوی نے "اردو تنقید کے دس سال" کے عنوان سے اردو تنقید کی رفتار کا اچھا جائزہ لیا ہے لیکن ان کا مقالہ اختصار کی نذر ہو گیا۔ ڈاکٹر ظ۔ انصاری صاحب نے ہنگری کی زبان کی مشہور شاعرہ [illegible] کا خوب تعارف کرایا ہے۔ ان کی نظمیں پڑھ کر خوشی ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کا یہی مضمون تھوڑے سے الٹ پھیر کے ساتھ انگریزی کے کثیر الاشاعت ہفتہ وار السٹریٹڈ ویکلی ۱۰ نومبر ۱۹۷۳ء کے شمارہ میں دیکھنے کو ملا تھا۔ معلوم نہیں آپ نے اس پرچہ سے ماخوذ کیا ہے یا انھوں نے ہی دونوں جگہ بھیجا ہے۔

جناب حسن عبداللہ کی کوششوں سے جدید عربی شاعری کے امام بارودی کے متعلق پہلی بار کسی اردو پرچہ میں کچھ دیکھنے کو ملا۔ عبداللہ صاحب نے اپنے مختصر سے مقالہ میں بارودی کا تعارف کرایا ہے، ساتھ ساتھ جدید عربی شاعری کے ایک دور کا بھی مختصر جائزہ پیش کیا ہے۔

غزلیات اور نظموں کا حصہ بھی کافی اچھا ہے۔ جوگندر پال کی مختصر کہانی بہت اچھی [illegible] ہے۔ ایڈونس کی کہانی کے ترجمے پر آپ نے "شاعر" کے دس قیمتی صفحات ضائع کر ڈالے۔

آپ کی طرف سے بڑے محتاط انداز میں "شاعروں کی طلب" پر تبصرہ دیکھئے کو ملا جبکہ دوسری جگہ اس پر [illegible] کیا گیا ہے۔

رشید اختر
[illegible] ۔ دھنباد

نقد و نظر

(تبصرے کے لئے کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہے)

انگریزی ادب کی مختصر تاریخ

مصنف ——— ڈاکٹر محمد [illegible]

ایک زمانہ تھا جب اُردو زبان و ادب پر فارسی اور عربی زبانوں کے اثرات بہت نمایاں اور گہرے تھے۔ انگریزوں کی ہندوستان میں آمد اور پھر تسلط کے بعد [illegible] صورتحال بدلنے لگی [illegible] اُردو والوں کی [illegible] مغرب کی طرف [illegible]۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک طرف فارسی و عربی تعلیم کا چلن کم ہوا تو دوسری طرف انگریزی زبان و ادب کے توسط سے انگریزی ادبیات سے ہمارے تعلقات مستحکم ہوتے گئے۔ انگریزی سے اس تعلق نے نہ صرف ہمیں نئے اسالیب سے روشناس کرایا بلکہ فکر و احساس کی نئی جہتوں اور نئے موضوعات کی طرف بھی ہماری رہنمائی کی۔ ان حالات میں یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ جس زبان و ادب سے ہمارا اتنا گہرا تعلق رہا ہے، اُس کی تاریخ سے بھی ہم واقف ہوں۔

ڈاکٹر محمد [illegible] کی زیر تبصرہ کتاب "انگریزی ادب کی مختصر تاریخ" بڑی حد تک اس ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ مصنف نے اپنی کتاب کو سات مختلف ابواب میں تقسیم کر کے [illegible] انگریزی ادب اور اینگلو سیکسن ادب سے لے کر جدید دور [illegible] تک [illegible] جائزہ لیا ہے۔ اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انگریزی ادب کی بہت سی اصطلاحات کے مناسب اور موزوں اردو مترادفات [illegible] صرف اُردو لغت [illegible] [illegible] غلطیاں بھی [illegible] مثلاً مشہور [illegible]

[illegible]

[illegible] JONES: ENGLISH PRONOUNCING DICTIONARY, PAGE 233

کتاب کے مطالعہ سے [illegible] انگریزی [illegible] کے طالب علم [illegible] [illegible] مصنف نے [illegible] انگریزی ادب [illegible] [illegible] مصنف نے [illegible] (ANDREW YOUND) [illegible] مصنف [illegible] میں انگریزی کے ایسے [illegible] انگریزی ادب کی کوئی تاریخ [illegible] [illegible] (INDEX) [illegible] کتاب [illegible] انگریزی ادب کی [illegible]

قیمت [illegible] اُردو [illegible]

(شفیق [illegible])

تاج الحقائق

مرتب ——— ڈاکٹر [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] رسالہ الحقائق،
[illegible] نسائی [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] ڈاکٹر
[illegible] لقب ہے۔ [illegible] مقدمہ میں [illegible] نشاندہی کی
کر چکے تھے کہ تاج الحقائق نام سے ایک تصنیف [illegible]
ہے۔ ڈاکٹر [illegible] مرحوم نے تاج الحقائق کو مرتب بھی کیا تھا لیکن
[illegible] کی طباعت روک دی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ
خیال [illegible] مشکل تھا کہ یہ ایک کتاب [illegible] کی ہے۔ تاج الحقائق
کے متعدد نسخے ہند و پاک کی لائبریریوں میں محفوظ ہیں کتاب کا
اسلوب [illegible] کے اسلوب سے ملتا جلتا ہے اور شاید
یہ وجہ [illegible] سے منسوب کیا [illegible]
بات کا کوئی ثبوت داخلی یا خارجی ایسا نہیں ہے جس کی بنیاد پر اسے
[illegible] کی تصنیف قرار دیا جا سکے۔

جناب [illegible] نے تاج الحقائق کو بمبئی
یونیورسٹی کی [illegible] مختلف نسخوں [illegible] سے بہت
سلیقے سے مرتب کیا۔ زبان کے اعتبار سے [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

پڑھتا [illegible] کام ہے [illegible] متعدد [illegible]
میں [illegible]
ایک [illegible] کام ہے اور اس کا سہرا اختر صاحب [illegible]
تاہم افسوس ہے کہ طباعت خراب [illegible]
اور محنت سے مرتب کیا ہوا تاج الحقائق کا متن بھی [illegible]
ہو گیا ہے۔

تاج الحقائق اردو کے نثری ادب میں ایک اضافہ
ہے اور اسے ہر لائبریری میں ہونا چاہیئے۔

قیمت دس روپے۔ ناشر علوی بک ڈپو، محمد علی روڈ
بمبئی نمبر ۳

(ڈاکٹر عبدالستار دلوی)

سنچا ہوا البم

از ——— اقبال متین

سنچا ہوا البم اقبال متین کے متفرق افسانوں کا مجموعہ ہے
اس میں ان کے [illegible] افسانے ہیں جو سماج کے [illegible]
کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان افسانوں کا زیادہ تر ماحول ایک متوسط
طبقہ کا ماحول ہے اور ان کے کردار بھی ہماری ہی طرح اس دنیا
میں بسنے والے عام افراد ہیں۔ ان میں اچھے بھی ہیں برے بھی ہیں
دلچسپ بھی ہیں [illegible] بھی ——— ہر کردار اپنے اصلی رنگ
میں ہمارے سامنے آتا ہے اور ہمارے دل پر ایک گہرا اثر چھوڑ
جاتا ہے۔

ان افسانوں [illegible] حقائق کے [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] ہے - وہ شاعرہ بھی ہے جو اپنی ایک
[illegible] کی تربیت سے مالا مال کرنے کے لئے خود اپنی
[illegible] ہے - جس نے [illegible] بھی ہے جو شادی سے پہلے اپنے
[illegible] کی محبت ماں باپ کا پیار سب کچھ دیتی ہے لیکن
[illegible] خیال بھی نہیں کرتی وہ جیب سے بڑھ کر
[illegible] احمد بھی ہے جس کی ساری محبت اپنے [illegible]
[illegible] ہے جس کی تباہی کے ساتھ ہی ساتھ
[illegible] ختم ہو جاتی ہے

اقبال متین ایک کہنہ مشق ادیب ہیں۔ انھوں نے اپنے مشاہدات و تجربات کی عکاسی کے لئے افسانوں کو ذریعہ بنایا ہے۔ [illegible] خیالی باتوں کی جادوگری [illegible] اپنے افسانوں کے لئے کسی مخصوص فلسفے یا آئیڈیا [illegible] وہ اپنے افسانوں کا مواد زندگی کے حقائق سے حاصل کرتے ہیں اور اُسے اُس کے اپنے اصلی ماحول اور پس منظر کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

ان کے اسلوب میں بھی ایک انفرادیت ہے۔ انھیں جب [illegible] بات کہنا ہوتا ہے یا کسی جذباتی کیفیت کی ترجمانی [illegible] ہوتی ہے تو وہ افسانہ نگار سے شاعر بن جاتے ہیں [illegible] ایک ہی بات کو مختلف طریقوں سے کہہ کر [illegible] توقف اختیار کر کے اُس میں ایک خاص [illegible] پیدا کر دیتے ہیں۔

● ایک خاندان سفر کی تیاری کر رہا ہے۔ تمام افراد
[illegible] اپنی پسند کا سامان سفر [illegible] رہے ہیں
[illegible] کا نوجوان چشم و چراغ داخل ہوتا ہے
[illegible] اُس کو سنبھالنے کے لئے کوئی
چیز لینے کی فکر ہے، [illegible]
[illegible] ہے۔
[illegible]:

(شعورِ سفرِ منزل)

یہ سلسلہ شروع ہونے والا ہے۔ اُن کو خوش آئند [illegible]

[illegible] - تمام [illegible]
[illegible] ایک [illegible]
اپنا بھی [illegible] ہو چکا ہے۔
تمھیں میری [illegible] بن سکتی ہے۔
تمھیں میری [illegible] بن سکتی ہے۔
تمھیں میرا غم بن سکتی ہے۔

([illegible])

● [illegible] کے گھر سے لٹ کر
[illegible] آتا ہے اور
[illegible] پر سر رکھ کر رو رہی ہے۔
ماں میں آ گئی ہوں۔
ماں میں آ گئی ہوں۔

(پانی کے چراغ)

غرض کہ موضوعات کی رنگا رنگی، ماحول کا تنوع، کردار کا حقیقت پسندانہ عکس اور اسلوب کی انفرادیت، ان سب نے مل کر اقبال متین کے افسانوں کو بے حد جاندار اور دلکش بنا دیا ہے۔ آج لوگ اپنے تھکے ہوئے ذہنوں کو آسودہ کرنے کے لئے ناولوں کا سہارا لیتے ہیں، اُن کا رجحان افسانوں کی طرف بہت کم ہو گیا ہے۔ لیکن اقبال متین کے افسانوں میں بلا شبہ کشش اور تاثیر موجود ہے جو ناولوں سے دلچسپی رکھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکتی ہے۔

صفحات ۲۴۰، کتابت و طباعت اچھی، قیمت ۵/ [illegible] ملنے کا پتہ۔ نصرت پبلشرز، وکٹوریہ اسٹریٹ۔

([illegible] اللہ ندوی)

مزاج پُرسی

از ——— [illegible]

[illegible] لکھتے ہیں مگر اُن کے لکھنے میں انفرادیت ہے۔ اُردو کے علاوہ ہندی اور انگریزی میں بھی اُن کے [illegible] شائع ہو چکے ہیں۔ [illegible] طور پر [illegible] صاحب [illegible]

[illegible]

[illegible] ہے۔ بہ حیثیت ان کی آواز میں ہے، جو حقیقی ہنسی مسکراہٹ اُن کے چہرے پر کھیلتی رہتی ہے۔ وہی "مزاج پرسی" کے مضامین یا انشائیوں میں بھی ہے۔ ہلکا پھلکا مزاح اور چھپا ہوا طنز ان مضامین میں بکھرا ہوا ہے۔ بقول عصمت چغتائی۔

"چھوٹے چھوٹے نپے تلے جملے، زبان نہ بڑی ڈھنگ دوڑی، عام فہم، بھولی بھالی، گوری بی بی جیسی سوندھی سوندھی مٹھاس۔"

علی جواد زیدی کے خیال میں ——— "نریندر لوتھر ہمیشہ بڑے معصومانہ اور منکسرانہ لہجے میں بات شروع کرتے ہیں اور پڑھنے والوں کو فوراً ہی یاران خلوت میں شامل کر لیتے ہیں۔ جن سے نہ وہ کوئی راز چھپانا چاہتے ہیں اور نہ جھجکنے والی باتوں کے ظاہر کرنے میں جھینپتے ہیں۔"

سنہ ۱۹۶۳ء میں نریندر لوتھر کے افسانوں اور طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا پہلا مجموعہ "بند کواڑ" شائع ہوا تھا۔ کچھ ہی مدت بعد اسی کا دوسرا ایڈیشن طبع ہوا۔ ادبی حلقوں نے "بند کواڑ" کو کافی پسند کیا۔ "مزاج پرسی" میں سفارش۔ ٹیلی فون۔ حیدرآباد کے پھل۔ ستاروں کے کھیل۔ پانچواں کالم۔ مکان بنانا۔ پلاٹ۔ مزاج پرسی۔ ہم نے بچہ بٹھایا۔ بھوک ہڑتال۔ بیمہ۔ پرواز خیال۔ تصویر کھنچوانا۔ صنفِ نازک کوٹ۔ "میں اور میرا مزاح" کل پندرہ مضامین شامل ہیں۔ یہ نہ بہت طویل ہیں اور نہ بالکل مختصر۔ ہر موضوع کے ساتھ لوتھر صاحب نے انصاف کیا ہے۔ یہ مضامین نہ محض طنز کے لئے ہیں اور نہ محض مزاح کے لئے۔ ان کا زیریں لہر میں تلخیاں بھی چھپی ہوئی ہیں۔ لوتھر صاحب کا محتاط ہنسنا اور ہنسانا بے مقصد نہیں، اہم مسائل کو چھوتے ہوئے وہ اس طرح گزر جاتے ہیں کہ قاری رونے کے قریب آ کر مسکرا لیتا ہے۔ جذبات و حسیات کی ایسی درمیانی کیفیت پیدا کر دینا آسان کام نہیں ہے۔ طنز کے نشتر کو پھولوں کی چھڑی بنا دینا لوتھر صاحب جانتے ہیں۔ کسی ہنسنا کہنے میں افسانوی تسلسل [illegible] دلچسپ بنا دیا ہے۔ انہیں طنزیہ و مزاحیہ [illegible] کہا نیوں کا نام دیا جا سکتا ہے۔

"میں اور میرا مزاح" میں لوتھر صاحب نے جہاں بہت سی باتیں کہی ہیں وہیں یہ بھی کہا ہے (۱) "ہنسی پر حق ایک بہت بڑا تحفہ ہے (۲) تاریخی تناظر سے جماعتی ہنسی کو فروغ ملتا ہے۔ (۳) ہنسی اور مذاق سے اخلاق کو [illegible] جا سکتا ہے۔ تینوں باتیں اُن کے مضامین میں محور کی حیثیت رکھتی ہیں۔

کتاب کافی اچھی طبع ہوئی ہے۔ ۱۲۰ صفحات قیمت تین روپے پچاس پیسے۔

ملنے کا پتہ:۔ زندہ دلانِ حیدرآباد۔ ۲۷۔ مجرد گاہ معظم جاہی مارکیٹ۔ حیدرآباد۔ ۱

ماہنامہ پاکیزہ۔ دہلی

اُردو میں اچھے اچھے ماہنامے اور ہفت روزے نکل رہے ہیں، ایسے کہ انہیں دوسری زبانوں کے رسائل و اخبارات کے مقابلہ میں رکھا جا سکتا ہے۔ ماہنامہ "پاکیزہ" اپنے ڈھنگ کا بالکل انوکھا اخبار ہے۔ شروع سے آخر تک ہر مضمون کے ساتھ اس میں تصاویر یا تصاویر ہوتی ہیں۔ مضامین سیاسی، ادبی، تاریخی، ساجی اور سنسنی خیز، غرض ہر قسم کے ہوتے ہیں۔ کتابت، عمدہ ترتیب اور آفسیٹ کی طباعت سے اسے آراستہ کیا جاتا ہے۔ اس کے مدیر مشہور صحافی سلامت علی مہدی ہیں اور "بزم ادب" کے مدیر رحمٰن نیر کے حوصلوں کا بہترین مظہر ہے۔

جنوری سنہ ۱۹۷۴ء کا پاکیزہ ہمارے سامنے ہے۔ آتش فشاں کے دہانے پر۔ لکھنؤ میں آل انڈیا اردو ایڈیٹرز کانفرنس ناکام ہو گئی۔ عربوں کے پٹرول بم کے دھماکے۔ عرب اسرائیل جنگ کے مورچوں پر چار دن ستارا۔ خانہ کعبہ کی تاریخ۔ حج مسلمانوں کی اخلاقی اور سیاسی تربیت کا ذریعہ۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا ایثار اور قربانی۔ عید قرباں کی اہمیت کیوں ہے۔ سنسنی خیز فیچر "آدم خوروں کا قتل" کا افسانہ "کیا میں زندہ ہوں۔ ماڈل گرل اور ماڈل [illegible] عریاں تصاویر۔ روہیلہ پٹھانوں کے دیس میں۔ [illegible]

(باقی صفحہ ۵۴ پر دیکھئے)

محفل اپنی

گذشتہ شمارے میں اسی عنوان سے قارئین "شاعر" کو ... مشکلات سے آگاہ کیا گیا تھا جن میں "شاعر" گھر گیا ہے اور ... کے سیاہ بادل اس کے ارد گرد منڈلا رہے ہیں۔ اس ... اسباب اور ان کا تذکرہ اب تک بس اتنا ہوا ہے کہ ... کے خطوط آگئے ہیں اور چند "شاعر" دوستوں یا ... اردو نے کچھ خریدار بنا دیئے ہیں۔ اگر بڑے بڑے مسائل ... آسانی سے حل ہو جایا کریں تو پھر بات ہی کیا ہے؟ "شاعر" کو پیش آمدہ مشکلات کا مسئلہ ایسا نہیں ہے جس سے آنکھ چرا کر گذر جایا جائے۔ اس کے لئے بڑی رقمی امداد اور بیش پچیس ... اور دو چار سو نئے خریداروں کی ضرورت ہے ... زبان و ادب اور تہذیب ثقافت کے تحفظ کے لئے تمام زبانوں ... کوششیں ہو رہی ہیں۔ مختلف زبان والے اپنے گروہ ... نے ادبی، لسانی اور تہذیبی اداروں کی فلاح کے لئے ... ہیں۔ "شاعر" کے لئے اگر امداد و اعانت کا سوال اٹھایا ... تو یہ کسی طرح بے محل نہیں۔ اہل اردو پر "شاعر" کا حق ہے ... "شاعر" پر اہل اردو کا۔

... "شاعر" کی امداد و اعانت کا کام کچھ اتنا مشکل بھی نہیں ... "شاعر" ہر شہر میں جاتا ہے، لوگ اسے شوق سے پڑھتے ہیں اور ... کے ادبی رسائل میں اسے ممتاز جگہ دیتے ہیں۔ ہر شہر میں چند لوگ ... منظم طور پر خریدار اور سرپرست فراہم کر سکتے ہیں۔ کوئی وجہ نہیں ... ایک شہر میں بیس پچیس خریدار نہ بنائے جا سکیں۔ بارہ روپے سالانہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ ایسے لوگ بھی ہر شہر میں مل سکتے ہیں جو ... قبول کریں۔ ضرورت اردو دوستوں کے رضاکارانہ ... کام کرنے کی ہے۔ ہم ان حضرات کے تعاون کے ممنون ہیں۔ اب بالالتزام "شاعر" کے ہر شمارے میں معاونین شاعر کی فہرست دی جایا کرے گی۔

۱۔ ڈاکٹر ... احمد ... — ... خریدار
۲۔ جناب ... — ۳
۳۔ جناب ... — ...
۴۔ جناب سید منظور الحسن ... ٹونک — ۲

کیا آپ انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۶۱ کے تحت

جائز کٹوتیوں سے فائدہ اٹھا رہے ہیں؟

اس سلسلے کی کچھ کٹوتیاں درج ذیل ہیں:

- کسی [illegible] معذور [illegible] کی طرف سے اس پر انحصار رکھنے والے کسی معذور فرد کے طبی علاج پر خرچ کی گئی رقم۔
- بھارت میں رہنے والا کوئی شہری جسے کاروباری سروس دینے والی کسی رجسٹر شدہ فرم مثلاً چارٹرڈ اکاؤنٹنٹوں، وکیلوں، سالیسٹروں اور ماہرین فن عمارت سازی کی فرم کی آمدنی سے کمشنر آف انکم ٹیکس کی طرف سے منظور شدہ سالیانہ حاصل کرنے کے لئے کسی کنٹریکٹ کے تحت اپنے حصے کی آمدنی حاصل ہوتی ہو، اس کی طرف سے ادا شدہ پریمیم یا کوئی رقم۔
- کسی ایسے فرد کی طرف سے جو بھارت میں رہتا ہے لیکن بھارت کا شہری نہیں، اپنے پر انحصار رکھنے والے ۲۱ سال سے کم عمر کے بچے کی تعلیم پر بھارت سے باہر کسی تعلیمی ادارے میں خرچ کی گئی رقم۔
- گھر بار چھوڑ کر آنے والے افراد کو ملازم رکھنے والے کسی صنعتی ادارے سے ہونے والے منافع و فائدوں کا کچھ حصہ جن پر سیکشن ۸۰ - ایچ کا اطلاق ہوتا ہے۔
- کسی نئے قائم شدہ صنعتی ادارے، یا جہاز یا ہوٹل کے کاروبار سے ہونے والے منافع و فائدوں کا کچھ حصہ، جن پر سیکشن ۸۰ - جے کا اطلاق ہوتا ہے۔
- بھارت میں رہنے والے کسی فرد کی طرف سے بطور مصنف، ڈرامہ نگار، آرٹسٹ، سنگیت کار یا ایکٹر کے، کسی غیر ملکی حکومت یا بھارت میں نہ رہنے والے کسی فرد سے، حاصل شدہ اور فارن ایکسچینج ریگولیشن ایکٹ ۱۹۴۷ء یا اس کے تحت مرتب کردہ قواعد کے تحت بھارت میں لائی گئی آمدنی کا ۲۵ فیصد حصہ۔

براہ مہربانی انکم ٹیکس ایکٹ کے تحت جائز کٹوتیوں سے پورا فائدہ اٹھائیے!

جن شرائط کے تحت ان کٹوتیوں کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے ان کے بارے میں آپ اپنے ضروری تفصیلات اپنے تشخیص انکم ٹیکس افسر یا محکمہ انکم ٹیکس کے پبلک ریلیشنز افسر سے حاصل کر سکتے ہیں۔

براہ مہربانی اپنے ریٹرن پر اور محکمے کے ساتھ دوسری تمام خط و کتابت میں اپنے مستقل [illegible]

جاری کردہ

[illegible] ریسرچ [illegible]

رفتار

دلّی ادبی اور تہذیبی خبریں

اعجاز صدیقی مدیر شاعر بمبئی

کے اعزاز میں ادبی و شعری نشستیں

[illegible] مشہور و ممتاز شاعر جناب اعجاز صدیقی مدیر [illegible] بمبئی سے [illegible] چار دن کیلئے چنڈی گڑھ تشریف لائے۔ ان کی آمد سے یہاں کے ادبی و شعری حلقوں میں ایک بہار سی آگئی [illegible] پہلی بار کئی ادبی و شعری نشستیں ہوئیں۔ پہلی شعری نشست ڈاکٹر ست پرکاش سنگر کی رہائش گاہ پر ہوئی جس کی صدارت جناب ناگش نے فرمائی۔ نظامت کے فرائض جناب کشمیری لعل ذاکر نے انجام دیئے۔ کئی مقامی شعراء نے اپنا کلام سنایا اُردو کے [illegible] اس محفل میں اعجاز صاحب سے گفتگو رہی۔

دوسری ادبی نشست پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ انگریزی [illegible] ڈاکٹر [illegible] چندر صدر شعبہ کی صدارت میں منعقد ہوئی جس میں یونیورسٹی کے بہت سے ممتاز پروفیسروں نے شرکت فرمائی۔ ڈاکٹر ست پرکاش سنگر نے مہمان خصوصی کا تعارف کرایا۔

تیسری خصوصی نشست محفل [illegible] چنڈی گڑھ کی جانب سے گیسٹ ہاؤس پنجاب یونیورسٹی میں زیر صدارت پرنسپل پی ایل آنند منعقد ہوئی۔ اس میں اُردو۔ فارسی۔ ہندی پنجابی۔ [illegible] زبانوں کے ادیبوں اور شاعروں نے حصہ لیا نامور شاعر جناب رام لعل نابھوی نے سید سجاد ظہیر کی ناگہانی موت پر ایک تعزیتی قرارداد پیش کی۔ حاضرین نے دو منٹ [illegible] کھڑے ہو کر مرحوم کی روح کو خراج عقیدت پیش کیا۔

چوتھی شعری نشست چنڈی گڑھ سے [illegible] دور [illegible] کے [illegible] کلب میں منعقد ہوئی۔ اس میں [illegible] شعراء اور سامعین شریک تھے۔ جناب کشمیری لعل ذاکر نے ناظم مشاعرہ کے فرائض انجام دیئے۔

(مسکر [illegible] جنرل [illegible] چنڈی گڑھ)

[illegible] نشست [illegible] جناب ضیا فتح آبادی کی صدارت [illegible] راجوری گارڈن نئی دہلی میں منعقد ہوئی۔ اس نشست کے تین حصے تھے۔ پہلے حصے میں مولانا ابرار حسنی گنوری کے درد ناک قتل اور سلام مچھلی شہری کی ناگہانی وفات پر [illegible] رنج و افسوس کیا گیا اور ایک تعزیتی قرارداد منظور کی گئی۔

دوسرے حصے میں غالب کے متعلق ماہر غالبیات جناب مالک رام سے گفتگو کی گئی۔ اس گفتگو میں [illegible] موہن، ضیا فتح آبادی، مظفر ہوشیارپوری، راج [illegible] اشک، مہتہ درد۔ اور گوپال داس مسرور نے حصہ لیا مالک رام صاحب نے غالب کی شخصیت کا ہم عصر زمانے میں اُن کی [illegible] اُن کی زندگی میں ان کے دیوان کے پانچ ایڈیشنوں کی اشاعت۔ غالب کی اُردو فارسی شاعری، ایران میں غالب کی عدم مقبولیت۔ کلام میں فارسی الفاظ و تراکیب کی بھرمار، غالب کی عام فہم غزلوں کا زمانہ دستنبو کے واقعات۔ وظیفہ خواری، انگریزوں کی بہی خواہی، اُن کے بھائی یوسف کی موت پر غلط بیانی وغیرہ پر روشنی ڈالی۔

تیسری نشست میں مشاعرہ ہوا جس میں کرشن موہن، افسر [illegible] سرشار ہوشیارپوری، سلیم شہباز [illegible] مراری [illegible] فتح آبادی۔ اوم پرکاش بجاج۔ مظفر ہوشیارپوری، شباب [illegible] جگدیش مہتہ درد۔ [illegible] گوپال داس مسرور، پریم دت چاند اور [illegible] گوپال اشک نے اپنا کلام سنایا ضیا فتح آبادی نے مولانا ابرار حسنی مرحوم اور سلام مچھلی شہری کو منظوم خراج محبت پیش کیا۔ جلسے کے آخر میں جناب [illegible] نے خصوصی شعراء اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

(سکریٹری [illegible])

پروفیسر عنوان چشتی کو پی ایچ ڈی کی ڈگری

[illegible] جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]



राष्ट्रीय एकता अंक

قومی یکجہتی نمبر

NATIONAL INTEGRATION NUMBER

1972

